تاریخ پاکستان

۷۱۲ء تا ۱۷۰۷ء

محمد عبداللہ ملک ایم۔اے

صدر شعبۂ تاریخ و اسلامیات کالج ریلوے روڈ، لاہور

قریشی برادرز۔ اردو بازار۔ لاہور

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

58902

اشاعت ہشتم نوترمیم ..... سنہ ۱۹۷۹ء

قیمت آفسٹ سفید کاغذ .... ۱۸/۷۵ روپے

طابع ---------- عبدالصمد قریشی

مطبع ---------- مولا والا پریس لاہور

ناشر ---------- قریشی برادرز، چوک اردو بازار لاہور

۲۰۷ سرکلر روڈ

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ کتاب "تاریخ پاک و ہند" (۱۷۱۲ء تا ۱۷۰۷ء) بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور، ملتان اور سرگودھا کے مقرر کردہ سلیبس برائے انٹرمیڈیٹ کلاسز کے عین مطابق ہے۔

زیر نظر کتاب برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے اُس درخشندہ دور کے واقعات و حالات پر مشتمل ہے جو برصغیر میں اسلامی سلطنت کے قیام، اسلامی تہذیب و تمدن کے عروج و ارتقاء اور اسلام کی ترقی و اشاعت کا ایک تابناک اور مثالی دور تھا۔ اس دور کے مطالعہ سے طلبہ نہ صرف اپنے اسلاف کے زرین کارناموں سے آگاہ ہوتے ہیں بلکہ اُن میں اپنے آباؤ اجداد کے شاندار ماضی سے آگاہی کے بعد خود اعتمادی، حوصلگی اور بلند ہمتی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اگر کسی قوم کا ماضی درخشندہ ہو تو خواہ امتدادِ زمانہ نے اس قوم پر کیسے ہی اثرات مرتب کر دیئے ہوں، اُس کے افراد میں از سرِ نو فکر و عمل کی ایک زندہ و فعال تحریک پیدا کی جا سکتی ہے اور اُس کا مؤثر ترین ذریعہ یہ ہے کہ اُن کے آباء کے عظیم و پُرشکوہ کارناموں کو اُجاگر کیا جائے۔ اس اعتبار سے زیرِ مطالعہ دور کا مطالعہ پاکستانی طلباء کے لیے اشد ضروری اور بدرجۂ غایت مفید ہے۔

زیرِ نظر کتاب کو نصابی ضرورت کے عین مطابق اور جامع و مستند بنانے کے لیے انتہائی ممکنہ حد تک تاریخی حقائق کی چھان بین کی گئی ہے اور صحتِ واقعات کی تحقیق نیز اُس کی مربوط و مؤثر ترتیب و تدوین میں کوئی فروگذاشت نہیں کی گئی۔ اس میں عہدِ سلاطین اور عہدِ مغلیہ کے درخشندہ اسلامی ادوار کا کوئی واقعہ تشنۂ تفصیل نہیں رہنے دیا گیا۔ سلاطینِ دہلی اور مغلوں کے عہد کے تمدنی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ مسلم فرمانرواؤں کے شاندار کارناموں کو اُجاگر کرنے کے علاوہ زیرِ نظر کتاب کو طلباء کی درسی و نصابی ضروریات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئی ہیں، اُن کا اندازہ حسب ذیل خصوصیات سے کیا جا سکتا ہے:

۱۔ زیرِ نظر کتاب "تاریخ پاک و ہند" نہ تو اتنی مختصر ہے کہ معلومات و مواد کی کمی کی وجہ سے طلباء کو کسی اور کتاب کے مطالعہ پر مجبور ہونا پڑے اور نہ اتنی طویل کہ طلباء واقعات و بیانات کی کثرت میں گم ہو کر رہ جائیں۔ اس کا اسلوبِ بیان صاف، سادہ، عام فہم اور نہایت

Marfat.com

واضح ہے۔ نیز طلباء کی امتحانی ضروریات کو کماحقہٗ پورا کرنے کے لیے ہر موضوع پر مکمل معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

۲- ہر باب کے آغاز میں مستند محققین تاریخ کے ایسے اقوال اور تبصروں کے اقتباسات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو متعلقہ عنوان پر مناسب حد تک مکمل روشنی ڈالتے ہیں۔ ہر باب کے آخر میں متذکرہ عہد کے اہم ترین تاریخی واقعات کے سنین بھی دیئے گئے ہیں۔ جن کے سرسری مطالعہ سے طلباء کے لیے اُس عہد کے واقعات کو ذہن نشین رکھنے کی سہولت میسر آسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر باب کے آخر میں امتحانی سوالات بھی دیئے گئے ہیں تاکہ امتحان کی تیاری میں طلباء کو مکمل سہولت حاصل ہو سکے۔ مزید برآں سوالات کے جوابات کو آسانی سے تلاش کرنے کے لیے کتاب میں متعدد ذیلی عنوانات بھی قائم کر دیئے گئے ہیں۔

۳- کتاب میں تاریخی واقعات اور فتوحات کے ساتھ ساتھ ہر دور کے علوم و فنون، تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت اور نظامِ حکومت کے جملہ پہلوؤں پر نمایاں روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ طلبائے تاریخ میں برِصغیر پاک و ہند کے ثقافتی ورثے کا صحیح ادراک پیدا ہو سکے اور طلباء کے اذہان پر زیرِ مطالعہ دَور کے صحیح تاریخی واقعات کے علاوہ اس دَور کی اخلاقی اور روحانی اقدار کے نقوش بھی جامعیت کے ساتھ منقش ہو سکیں۔

متذکرہ بالا انفرادی خصوصیات کی بنا پر اس کتاب کا مطالعہ ایف۔اے کے طلباء کے علاوہ ڈگری و پوسٹ گریجوایٹس کلاسز کے طلباء اور شائقینِ علمِ تاریخ کے لیے بھی یکساں طور پر مفید معلومات افزا ثابت ہوگا۔

۵ شعبان ۱۳۹۵ھ
مطابق
۱۴ اگست ۱۹۷۵ء

محمد عبداللہ ملک
صدرِ شعبۂ تاریخ
اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور

Marfat.com

فہرس

حصّہ اوّل (عہدِ سلاطین)

پہلا باب	: مُسلمانوں کی آمد سے قبل کا برِصغیر پاک و ہند	۱
دوسرا باب	: سندھ میں عربوں کی آمد	۱۵
تیسرا باب	: فتح سندھ	۲۱
چوتھا باب	: سلاطینِ غزنہ	۴۴
پانچواں باب	: خاندانِ غور کا عروج	۸۲
چھٹا باب	: خاندانِ غلاماں	۱۰۱
ساتواں باب	: خاندانِ خلجی	۱۴۹
آٹھواں باب	: خاندانِ تغلق	۱۹۴
نواں باب	: خاندانِ سادات	۲۳۶
دسواں باب	: خاندانِ لودھی	۲۴۱
گیارہواں باب	: سلطنتِ دہلی کا نظامِ حکومت	۲۵۱
بارہواں باب	: علوم و فنون	۲۶۲
تیرھواں باب	: معاشرتی و اقتصادی حالات	۲۷۷
چودھواں باب	: عہدِ سلاطین کے صوفیائے کرام اور مبلّغین	۲۸۲

حصّہ دوم (عہدِ مغلیہ)

پہلا باب	: بابر کی آمد پر برِصغیر پاکستان و ہند کی حالت	۲۹۹

Marfat.com

دوسرا باب	:	ظہیر الدین محمد بابر	۳۱۴
تیسرا باب	:	نصیر الدین محمد ہمایوں	۳۴۲
چوتھا باب	:	شیر شاہ سوری	۳۶۷
پانچواں باب	:	جلال الدین محمد اکبر	۴۰۱
چھٹا باب	:	نور الدین محمد جہانگیر	۴۶۴
ساتواں باب	:	شہاب الدین محمد شاہجہاں	۵۰۰
آٹھواں باب	:	محی الدین محمد اورنگ زیب	۵۴۸
نواں باب	:	مغلیہ اقتدار کا دورِ انحطاط	۵۸۵
دسواں باب	:	برِ صغیر میں اہلِ یورپ کی آمد	۶۱۱
گیارہواں باب	:	مغلیہ عہد کی ثقافت	۶۲۱
بارہواں باب	:	معاشرتی اور اقتصادی حالات	۶۴۳
تیرھواں باب	:	مغلیہ نظامِ حکومت	۶۵۲

Marfat.com

عہدِ سلاطین

Marfat.com

Marfat.com

سکّہ جاتِ سلطنتِ دہلی



پیشکار: قریشی برادرز پبلشرز چوک اردو بازار لاہور
۲۰۷ سرکلر روڈ

Marfat.com


محمد بن قاسم (فاتح سندھ)
سلطان محمود غزنوی
سلطان قطب الدین ایبک
سلطان شمس الدین ایلتتمش
سلطان رضیہ
سلطان غیاث الدین بلبن
سلطان علاؤالدین خلجی
سلطان محمد تغلق
سلطان فیروز شاہ تغلق

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

مُسلمانوں کی آمد سے قبل کا برِصغیر پاک و ہند

"برصغیر کی تاریخ کا وہ دور جو ۶۴۷ء میں راجہ ہرش کی وفات کے بعد سے شروع ہوتا ہے، سیاسی انتشار اور عدم استحکام کا دور تھا۔ حصولِ اقتدار کے لئے ہر ریاست دوسری ریاست سے برسرِ پیکار رہتی اور ایسی حکمران قوت کا فقدان تھا، جو تخریبی اور انتشار پسند عناصر کو اپنے قابو میں رکھ سکتی۔ ہندوستان سولہویں صدی عیسوی کے جرمنی کی مانند تھا جو متعدد ریاستوں کا ایک جمگھٹا تھا، جن میں سے ہر ایک خود مختاری کی خواہاں تھی۔"[1]

سیاسی حالت

عربوں کے حملے سے قبل برصغیر پاک و ہند سیاسی لحاظ سے انتشار کا شکار تھا۔ ملک میں کوئی مرکزی مضبوط حکمران قوت موجود نہ تھی۔ سارا ملک متعدد چھوٹی چھوٹی آزاد حکومتوں (ریاستوں) میں منقسم تھا۔ جو ایک دوسری کی دشمن تھیں۔ قنوج کا راجہ ہرش وردھن جس کی وفات ۶۴۷ء میں ہوئی، ہندو برصغیر کا آخری عظیم حکمران تھا جس کا اقتدار شمالی برصغیر کے اکثر حصے پر قائم تھا۔ متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور حکومتیں اس کی باجگذار تھیں۔ جن ریاستوں کے حکمرانوں نے خود مختاری اختیار کر رکھی تھی، اُن میں اکثریت راجپوتوں کی تھی لیکن تمام راجپوت ایک ہی نسل سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ اُن میں سے بیشتر اپنا نسب اُن قدیم کھشتریوں سے ملاتے تھے، جو ویدوں کے زمانے میں برسرِ اقتدار تھے۔ راجپوت درحقیقت غیر آریائی تھے۔ وہ لوگ یونانیوں، کوشانیوں، ہنوں اور دوسرے گروہوں کی اولاد تھے جو اپنی جنگجویانہ خصلتوں کی بنا پر پہلے پہنچے اور جلد ہی ہندو معاشرہ میں جذب کر لئے گئے۔ انہیں راجپوتوں کا درجہ دے دیا گیا۔ راجہ ہرش کی وفات سے ورودِ اسلام تک پانچسو سال کی مدت میں بہت سے راجپوت خاندان کابل سے

---

[1] "ہسٹری آف میڈیول انڈیا" صفحہ ۱

Marfat.com

کا مُروپ تک حکمران تھے۔ تاریخ برصغیر کے اس زمانے کو راجپوتوں کا زمانہ بھی کہتے ہیں۔ عربوں کی آمد کے وقت پاک و ہند کے بیشتر علاقوں میں راجپوت حکمران برسر اقتدار تھے۔ عربوں کی آمد سے قبل جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے برصغیر پاک و ہند چار مختلف ریاستی گروپوں میں منقسم تھا، جن کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے

۱۔ ہمالیہ کی ریاستیں

۱۔ افغانستان

افغانستان چندر گپت موریہ کے دور سے برصغیر پاک و ہند کا ایک حصہ تھا ۳۰۵ ق م میں چندر گپت موریہ نے اسے سکندرِ اعظم کے جرنیل سلیوکس نکاٹار سے چھینا تھا۔ برصغیر میں چینی سیاح ہیون سانگ کی آمد کے وقت کابل کی وادی پر ایک کھشتری راجہ کی حکومت تھی یہ کھشتری خاندان نویں صدی کے آخر تک برسر اقتدار رہا حتیٰ کہ لالیہ کی سرکردگی میں ایک برہمن خاندان برسر اقتدار آگیا۔ مسلمان مؤرخین نے افغانستان کی اس ہندو حکومت کو حکومتِ کابل یا زابل لکھا ہے اس کو ہندو شاہی حکومت بھی کہا جاتا ہے۔ سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے کے وقت یہاں کے حکمران کے نام اور اس سلطنت کی حدود کے متعلق تاریخی مواد نایاب ہے۔ تاہم مؤرخین کی رائے میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یہاں کے باشندے ہندو یا بدھ تھے۔ اس زمانے میں کابل، قندھار اور پنجاب (مغربی پاکستان) کے علاقے ایک ہی حکمران کے ماتحت تھے۔ ازمنہ قدیم میں پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے اور کابل و قندھار کے علاقے کو گندھارا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ خطہ گندھارا آرٹ کا مرکز تھا۔ مشہور مؤرخ فخر مدبر مبارک شاہ کے قول کے مطابق ۹۰۰ء سے ۱۰۱۳ء تک یہاں بھٹی راجپوتوں کی حکومت تھی۔ اسی خاندان کے راجہ جے پال نے ۹۷۹ء میں غزنی کی نوزائیدہ سلطنت پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی سلطنتِ غزنہ کے حکمران سبکتگین کی وفات کے بعد اس کے بیٹے محمود نے بھی راجہ جے پال کو ۱۰۰۱ء میں شکست دی۔ راجہ نے شکست و ندامت کی زندگی پر موت کو ترجیح دی اور زندہ جل مرا۔ بعد میں محمود نے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا اور اس علاقہ کو سلطنتِ غزنہ میں شامل کر لیا۔

۲۔ کشمیر

کو کشمیر مہاراجہ اشوک اور کنشک کی سلطنت کا ایک حصہ تھا مگر راجہ ہرش کے عہد میں یہ ایک آزاد و خود مختار خطہ تھا۔ کشمیر کی تاریخ کا مستند ماخذ کلہانہ کی تصنیف 'راج ترنگنی' ہے۔ ۳۴، ۱۶۳۱ء میں جب چینی سیاح ہیون سانگ کشمیر پہنچا تو اُس وقت کارکوٹا خاندان کے بانی راجہ دُرلابھ وردھن کی حکومت قائم تھی۔ اس کا پوتا چندرا پیڈا، راجہ داہر والئی سندھ کا ہمعصر تھا۔ چندرا پیڈا کی وفات کے بعد مکتی پیڈا للتیہ دتیہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ وہ اس خاندان کا ایک عظیم المرتبت حکمران تھا۔ اس نے ۷۲۵ء سے ۷۵۵ء تک

Marfat.com

حکومت کی۔ وہ ایک عظیم فاتح اور جنگی مہمات کا شوقین تھا۔ اُس نے یشوورمن والئی قنوج کو شکست دے کر ہلاک کر دیا۔ اس نے مارٹنڈ (موجودہ مانٹن) کے مقام پر سورج دیوتا کا ایک عالیشان مندر تعمیر کروایا۔ جس کے کھنڈر آج بھی اس عہد کے ترقی یافتہ فن تعمیر کا پتہ دیتے ہیں لکتی پیڈ اللتیہ دنیہ کے بعد اُپتل خاندان سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس خاندان میں دو بڑے عظیم راجہ ہوئے۔ اُدنتی ورمن اور شنکر ورمن۔ آخرالذکر کی حکومت ۸۸۳ء سے ۹۰۲ء تک رہی۔ یہ بہت بہادر سپاہی تھا۔ ۱۳۳۹ء میں کشمیر پر ایک مسلمان خاندان کی حکومت قائم ہو گئی [1]

۳۔ نیپال پہاڑوں میں واقع نیپال کی ریاست اپنی الگ تھلگ پوزیشن کی بناء پر برصغیر کی تاریخ میں کوئی خاص کردار ادا نہ کر سکی۔ بہرحال یہ ریاست قدیم ہندوستان کا ہی ایک حصہ تھی اور ایک روایت کے مطابق مہاراجہ اشوک کی سلطنت میں شامل تھی۔ مہاراجہ اشوک کی بیٹی چارودا کی نے یہاں بدھ مذہب کی خوب تبلیغ کی۔ چنانچہ یہاں بدھ مت کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس کے باشندے آج بھی بدھ مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن بظاہر یہ فرقہ ہندو قومیت کا ہی ایک جزو معلوم ہوتا ہے۔ سندھ پر عربوں کے حملے وقت یہاں گورکھا خاندان کی فرمانروائی تھی۔ یہی خاندان آج بھی اس پر حکمران ہے۔ یہ خاندان آٹھویں صدی عیسوی سے نیپال پر حکمران ہے۔

۴۔ آسام آسام کا ملک دُور افتادہ اور انتہائی شمال مشرقی سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے برصغیر کے سیاسی اور مذہبی رجحانات سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ چندر گپت اور راجہ ہرش کے عہد کے دوران آسام (کامروپ) برصغیر کی حکومت کے زیر نگیں تھا۔ اس کے راجہ کا نام بھاسکر ورما تھا ہرش کی وفات کے بعد آسام بالکل خود مختار ہو گیا اور سالستمبا نے یہاں پر ایک غیر ملکی حکمران خاندان کی بنیاد رکھی جو تین سو سال تک برسر اقتدار رہا۔ یہاں بُدھ مت کو کوئی عروج حاصل نہ ہو سکا، اور صرف ہندو مت ہی رائج رہا:

۲۔ شمالی برّصغیر کی ریاستیں

۱۔ قنوج قنوج کی سلطنت پر چالیس سال سے زائد عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد ۶۴۷ء میں راجہ ہرش نے وفات پائی۔ ہرش کے دور اقتدار میں قنوج کو شمالی ہند کے مرکزی شہر کی حیثیت حاصل تھی۔ اگرچہ راجہ ہرش کی وفات کے بعد بھی ایک مدت تک اس شہر کی اہمیت

---

[1] عبدالمجید سالک "مسلم ثقافت ہندوستان میں" صفحہ ۲

Marfat.com

برقرار رہی، مگر یہ سلطنت مختلف حصوں میں بٹ گئی۔

آٹھویں صدی کے آغاز میں یشوورمن قنوج کے راج سنگھاسن پر بیٹھا۔ وہ پچاس سال تک برسر اقتدار رہا۔ وہ ایک عظیم اور کامیاب حکمران تھا۔ اس نے پایۂ تخت قنوج کو قدیم سطوت و شوکت سے ہمکنار کیا۔ راجہ یشوورمن علم و ادب کا بھی سرپرست تھا۔ یشوورمن سندھ کے راجہ داہر کا ہمعصر تھا۔ اس کی سلطنت کی حدود مشرق میں بنگال، شمال مغرب میں تھانیسر، مشرقی پنجاب، شمال میں ہمالیہ اور جنوب میں دریائے نربدا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بعض غیر ممالک بالخصوص چین سے اس کے سفارتی تعلقات قائم تھے۔ یشوورمن نے کشمیر کے راجہ للتیہ دتیہ سے لڑتے ہوئے وفات پائی۔ بعدازاں مدتِ دراز تک قنوج مختلف راجاؤں کے ماتحت عروج و زوال کی منزلوں سے گذرتا رہا۔ بالآخر راجہ دگرہ دیو المعروف بہ بسال دیو چوہان نے قنوج کے ساتھ دہلی فتح کی۔ پرتھوی راج اسی بسال دیو کا بھانجا تھا۔

۲۔ اجمیر و دہلی

اجمیر و دہلی پر چوہان خاندان کے راجپوت حکمران تھے، جو اگنی کل راجپوت کہلاتے تھے چھٹی صدی عیسوی میں جھیل سانبھر کے آس پاس کے علاقوں میں اس خاندان نے اپنی سلطنت قائم کی۔ چوہان خاندان کا مشہور راجہ اجے دیو بارہویں صدی عیسوی میں اجمیر پر قابض ہوگیا اور اسی خاندان کے ایک دوسرے راجہ وسل دیو نے محمود غزنوی کے خلاف جنگ میں راجہ آنند پال کی مدد کی۔ راجہ دگرہ دیو المعروف بہ بسال دیو چوہان نے تومار خاندان کے حکمران آنند پال کی مدد سے دہلی کو فتح کیا تھا مشہور راجپوت حکمران پرتھوی راج چوہان راجہ دگرہ المعروف بہ بسال دیو کا بھتیجا تھا۔ راٹھور اور چوہان راجپوت خاندانوں میں شدید باہمی آویزش تھی۔ پرتھوی راج سنجوگتا کی مشہور داستان اسی باہمی آویزش کی آئینہ دار ہے۔ پرتھوی راج ایک نہایت ہی بہادر اور خوددار حکمران تھا لیکن محمد غوری نے ۱۱۹۲ء میں اسے شکست دے کر ہلاک کر ڈالا۔

۳۔ بنگال

زمانۂ قدیم میں بنگال دو مختلف خود مختار خطوں پر مشتمل تھا۔ مغربی اور شمال مغربی خطہ گوڑ GAUR اور مشرقی خطہ وَنگا VANGA کہلاتا تھا۔ یہ دونوں خطے موریہ اور گپتا سلطنت کے زیر نگیں تھے لیکن گپتا سلطنت کے زوال کے بعد بنگال بالکل خود مختار ہوگیا۔ مہاراجہ ہرش کے دور میں گوڑ کے تخت پر ساسنکا SASANKA متمکن تھا۔ ساسنکا کی وفات کے بعد گوڑ پر راجہ ہرش کے حلیف آسام کے راجہ بھاسکر ورمن نے قبضہ کرلیا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں قنوج کے حکمران راجہ یشوورمن نے بنگال کو تاخت و تاراج کیا، جس کی وجہ سے کئی سال تک یہاں بدامنی اور انتشار کا دور دورہ رہا۔ حتیٰ کہ آٹھویں صدی کے وسط میں پال خاندان کے بانی گوپال نے بنگال کے گوڑ اور وَنگا دونوں خطوں کو متحد کرکے وہاں پال حکومت قائم کرلی گوپال سورج بنسی راجپوت تھا وہ ایک عظیم حکمران اور نامور فاتح تھا۔ متحدہ بنگال پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے بعد اس نے جلد ہی بہار، اڑیسہ اور آسام کے علاقوں کو فتح کرکے اور ان کو بنگال میں شامل کرکے اپنی حکومت کو وسعت دی۔

Marfat.com

پال خاندان کی حکومت چار سو سال تک قائم رہی اور اس کے زیر سیادت برصغیر کے مشرقی حصہ نے علم و ادب میں نیز اقتصادی اور مذہبی لحاظ سے حیرت انگیز ترقی کی۔ اس عہد میں بدھ مت کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ پال حکومت کا دارالخلافہ پاٹلی پتر تھا۔ راجہ مہی پال (۹۹۲ء تا ۱۰۴۰ء) جو سلطان محمود غزنوی کا ہمعصر تھا، پال خاندان کا آخری تاجدار تھا۔ اس کی وفات کے بعد مشرقی بنگال پر سین خاندان کا قبضہ ہو گیا۔ بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں بختیار خلجی نے پال اور سین خاندان کے مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔ اس نے لکھنوتی کو اپنا دارالسلطنت قرار دے کر بنگال اور بہار میں اسلامی حکومت قائم کر لی، جو ۱۲۰۷ء تک قائم رہی۔

مالوہ

ریاست مالوہ جسکا دارالخلافہ اجین تھا آٹھویں صدی عیسوی کی ایک اہم ریاست تھی اور یہاں پر مار راجپوت خاندان برسر اقتدار تھا۔ یہ خاندان گوجار (گوجر) نسل سے تھا اور جنگجوئی اور علم دوستی کیلئے مشہور تھا۔ پرماروں نے میواڑ (جودھپور) اداننتی (اجین) اور بڑودہ کے علاقوں پر اپنی حکومت قائم کی۔ "پرمار راجپوتوں کی حکومت کی جنوبی سرحد دریائے نربدا تک پہنچی ہوئی تھی۔ اسی خاندان کے ایک راجہ سیاک نے جسے شری ہرش بھی کہتے ہیں۔ ہن قوم کے حملہ آوروں کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دی تھی۔"[1]

اجین کے پرماروں کی سندھ کے فاتح عربوں سے بھی مڈبھیڑ ہوئی جو اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔ ۷۲۵-۲۵ء کے دوران عرب حاکم جنید نے پرمار حکومت کے مغربی حصے پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ناگا بھاٹا اول (۷۲۵ء - ۷۴۰ء) نے جلد ہی عربوں کو شکست دے کر چھینے ہوئے علاقہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کے جانشینوں کے عہد اقتدار کے دوران اجین نے ایک انتہائی مستحکم حکومت کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس خاندان کا سب سے مشہور و معروف راجہ بھوج تھا جس نے ۱۰۱۸ء سے ۱۰۶۰ء تک حکومت کی۔ وہ علم و ادب کا مربی اور ایک عظیم فاتح تھا۔ اس خاندان کے آخری حکمران بھوج ثانی کو ۱۳۰۵ء میں علاؤالدین خلجی کی افواج نے شکست دی۔

گجرات

گجرات کا صوبہ زمانۂ قدیم سے نہایت زرخیز تھا اور مغربی ساحل پر واقع ہونے کی وجہ سے بحری تجارت اور دولت کی فراوانی کے لئے مشہور تھا اس کا پرانا نام سوراشٹر تھا۔ گپت خاندان کے زوال کے بعد یہاں ہن قبائل کی ایک شاخ گرجر آباد ہوئی تو اس کا نام گجرات مشہور ہو گیا۔ گپت حکومت کے زوال کے بعد ایک گجر سردار بھٹیارک نے یہاں خود مختار حکومت قائم کی۔ یہ خاندان ۷۶۶ء تک برسر اقتدار رہا۔

۹۶۱ء میں چالوکیہ خاندان نے انہلواڑہ پر قبضہ کر کے یہاں چالوکیہ حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے راجہ مل راج نے گجرات کاٹھیاواڑ، سورت، بھڑوچ، کچ کے علاقوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت کو مستحکم کیا۔ چالوکیہ خاندان نے تین سو سال حکومت کی۔ یہ دور گجرات کی خوشحالی اور تجارتی ترقی کا دور تھا۔ ۱۲۴۲ء میں اس خاندان کے اقتدار کا خاتمہ ہوا اور انہلواڑہ کی سلطنت بگھیلوں کے قبضۂ اقتدار میں چلی گئی۔ بگھیلہ راجہ کرن دیو ۱۲۹۶ء تا ۱۳۰۴ء کے

---

[1] عبدالمجید سالک "مسلم ثقافت ہندوستان میں" صفحہ ۵

Marfat.com

دور میں گجرات کی سلطنت پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔

میواڑ میواڑ راجپوتانہ پر سسوڈیا خاندان کے راجپوت حکمران تھے۔ جو سورج بنسی راجپوت ہونے پر نازاں تھے۔ اس خاندان کا عظیم ترین فرمانروا بپا راول تھا۔ اس کے جانشین راجہ گوہیلا نے چتوڑ کو فتح کیا جو بعد ازاں میواڑ کا دارالحکومت مقرر ہوا۔ راجستھان کے مقتدر حکمران راجہ کنبھ، رانا سانگا اور رانا پرتاپ اسی نامور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے مسلم حکمرانوں کی یلغار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

سندھ کابل اور مغربی پنجاب کی ہندو شاہی سلطنت کے جنوب مغرب میں واقع خطہ سندھ ایک عرصہ دراز سے خود مختار اور آزاد حیثیت کا حامل تھا۔ ایک سو چالیس سال سے اس پر سودرا خاندان حکمران تھا۔ چین کا شہرۂ آفاق سیاح ہیون سانگ اسی خاندان کے دورِ اقتدار میں برصغیر آیا تھا۔ پربھاکر وردھن نے اس علاقہ کو تاخت و تاراج کیا اور اس کے بیٹے ہرش وردھن نے سودرا خاندان کو اپنا باجگذار بنائے رکھا۔ ہرش وردھن کی وفات کے بعد صوبہ سندھ نے پھر ایک بار خود مختار حیثیت اختیار کر لی۔ سودرا خاندان کے آخری فرمانروا رائے ساہسی کی وفات کے بعد اس کے برہمن وزیر چچ نے تخت حکومت پر قبضہ کر کے ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھی۔ چچ کی وفات کے بعد اس کا بھائی چندر سر یر آرائے سلطنت ہوا لیکن چندر کے بعد چچ کا لڑکا داہر تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ جسے ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے شکست دے کر اس خاندان کی حکومت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

۳۔ دکن کی ریاستیں

دکن، لفظ دکشنا کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ دکشنا سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'جنوب' ہے۔ اس کے مشرقی حصہ کو مہاراشٹر اور مغربی حصہ کو تلنگانہ کہتے ہیں۔ یہ علاقہ ہمیشہ شمالی ہند سے بالکل الگ تھلگ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تاریخ اور تمدن بھی شمالی ہند کے تمدن سے بالکل مختلف ہے۔ ابتدائی دور میں یہاں دراوڑ لوگ آباد تھے۔ آج بھی اس کی آبادی کا ایک حصہ دراوڑی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

ساتویں صدی قبل مسیح سے دکن میں آریائی تہذیب و تمدن کے اثرات پہنچنا شروع ہوئے اس وقت دراوڑی تمدن منتہائے کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ تیسری صدی قبل مسیح میں دکن کی سرزمین موریا سلطنت کا ایک حصہ تھی اشوک کے کتبوں میں اس کی سلطنت کے دو اہم دکنی قبیلوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک راشٹرا کوٹ تھا، جس کے نام پر مہاراشٹر کا نام ہے اور دوسرا آندھرا پردیش، آج بھی مدراس کا بیشتر حصہ آندھرا کے نام سے مشہور ہے۔ آندھرا ریاست دکن کی قدیم ترین ریاست تھی اور یہاں ست واہن خاندان برسر اقتدار تھا۔ جو ساڑھے چار سو برس تک حکمران رہا۔ تیسری صدی عیسوی کے ربع اول کے فوراً بعد یہ سلطنت زوال پذیر ہوئی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا جنوب مشرقی

Marfat.com

حصے میں کانچی کے ایک پلوا سردار نے پلوا خاندان کی حکومت قائم کرلی۔ چوتھی صدی عیسوی میں دکن میں دو طاقت ور ریاستیں قائم تھیں۔ شمالی حصے میں واکاٹاکا اور جنوبی حصہ میں پلوا۔ علاوہ ازیں کئی ایک اور ریاستیں بھی قائم تھیں جن کا جائزہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ واکاٹاکا شمالی دکن کی واکاٹاکا خاندان کی ریاست ایک طاقتور ریاست تھی۔ گپتا خاندان کے چندر گپت بکرماجیت کی اس خاندان سے قرابت داری تھی۔ کیونکہ اس نے اس خاندان کے راجہ رُدراسین ثانی سے اپنی لڑکی پربھاوتی کی شادی کی ہوئی تھی۔ رُدراسین کے جانشین کئی صدیوں تک دکن میں برسر اقتدار رہے

۲۔ پلوا پلوا حکومت ریاست واکاٹاکا کے جنوب میں واقع تھی۔ کانچی اس کا دارالسلطنت تھا۔ نرسمہا ورمن پلوا خاندان کا سب سے بڑا حکمران تھا۔ اس نے چالوکیہ خاندان کے راجہ کو شکست دی اور اس کے دارالحکومت وتاپی کو جلا کر راکھ کر دیا۔ وہ علم و فن کا بڑا مربی تھا۔ اس کے عہد حکومت میں مشہور چینی سیاح ہیون سانگ دورانِ سیاحت دکن آیا اور کچھ عرصہ دارالحکومت کانچی میں مقیم رہا۔

چوتھی صدی عیسوی کے وسط میں سمندر گپت نے پلوا حکمران وشنو گوپ کو شکست دیکر گرفتار کرلیا، لیکن بعد ازاں رہا کر دیا۔ پلوا خاندان میں کئی قابل اور لائق حکمران پیدا ہوئے، جن میں سمہا وشنو زبردست ترین حکمران تھا اس نے چھٹی صدی کے وسط میں اپنی جنوبی ہمسایہ سلطنتوں بالخصوص لنکا (سیلون) کو شکست دینے کے علاوہ چولا پر قبضہ کرلیا۔ بعد ازاں وتاپی کے چالوکیہ خاندان اور پلوا خاندان میں شدید اختلافات کی وجہ سے شدید دشمنی پیدا ہوگئی۔ بالآخر آٹھویں صدی کے ربع اوّل میں جب عرب سندھ میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کر رہے تھے، وتاپی کے بکرماجیت ثانی نے پلوا حکومت کو تاخت و تاراج کرکے کانچی پر قبضہ کرلیا۔ حتیٰ کہ نویں صدی کے آخر میں پلوا خاندان زوال پذیر ہوگیا۔

۳۔ چالوکیہ خاندان چالوکیہ خاندان کے حکمران اجودھیا کے چندر بنسی راجپوت تھے۔ اس خاندان کا پہلا مقتدر اور عظیم ترین حکمران پلک سین اوّل تھا۔ اس نے چھٹی صدی عیسوی میں موجودہ ضلع بیجاپور کے نواحی قصبہ وتاپی پر قبضہ کیا۔ چالوکیہ خاندان کا دارالحکومت بدامی تھا۔ پلک سین اوّل کا پوتا پلک سین ثانی چالوکیہ کا ایک اہم ترین حکمران تھا۔ اس نے اپنے عہد کے بیس سال ہمسایہ سلطنتوں کی تسخیر میں صرف کرکے اپنی سلطنت کو خوب وسعت دی اور دکن میں امن و امان قائم کیا۔ ۶۲۰ء میں شمالی ہند کا فرمانروا راجہ ہرش اس پر حملہ آور ہوا۔ لیکن پلک سین ثانی نے اسے شکست فاش دی۔ چنانچہ دونوں حکومتوں کے درمیان دریائے نربدا حدِ فاصل مقرر ہوا۔ بعد ازاں اس نے جنوب بعید میں واقع چولا، پانڈیا اور کرالہ کی ریاستوں کو باجگذار بنایا۔ اس طرح نربدا سے لے کر راس کماری تک چالوکیہ راجپوتوں کا طوطی بولنے لگا۔ پلک سین ثانی نے اپنے بھائی وشنو وردھن کو مشرقی علاقوں کا گورنر بنا کر بھیجا۔ لیکن اُس نے خود مختاری اختیار کرکے ہوئے مشرقی چالوکیہ سلطنت کی بنیاد رکھی جو ۱۰۷۰ء تک قائم رہی۔

پلک سین ثانی کو بیرونی ممالک میں بھی شہرت حاصل رہی۔ چنانچہ شاہ ایران خسرو ثانی سے

Marfat.com

اس کے سفارتی تعلقات قائم تھے۔ اس مشہور چینی سیاح ہیون سانگ کے بیان کے مطابق پلک سین ثانی برہمن مت کا پیرو تھا۔ مگر دوسرے مذاہب یعنی بدھ مت اور جین مت کے حامیوں سے اس کا سلوک روادارانہ تھا۔ ۷۵۴ء میں مہاراشٹر کے راشٹر کوٹیہ خاندان نے سلطنتِ مغربی چالوکیہ پر حملہ آور ہو کر چالوکیہ خاندان کا خاتمہ کر دیا لیکن مشرقی چالوکیہ سلطنت کئی سو سال قائم رہنے کے بعد چولا خاندان کے قبضہ میں چلی گئی۔

۴۔ راشٹر کوٹہ

راشٹر کوٹہ خاندان راجپوتوں کا ایک بہت ہی قدیم خاندان تھا۔ جو مہاراشٹر کے علاقہ میں آباد تھا۔ یہ لوگ مدتوں چالوکیہ خاندان کے ماتحت بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اس خاندان کے سردار دانتی دُرگا نے اپنے خاندان کو منظم کر کے ۷۵۴ء میں چالوکیہ خاندان کی بساط اقتدار اُلٹ کر راشٹر کوٹیہ حکومت کی بنیاد رکھی گئی اور مسلسل فتوحات حاصل کر کے اپنی سلطنت کو مستحکم اور وسیع کیا لیکن وہ اپنی وسیع و عریض مملکت میں امن و امان قائم نہ رکھ سکا۔ چنانچہ اس کے چچا نے اسے تخت سے محروم کر کے مسندِ اقتدار خود سنبھال لی۔ اس نے اپنے عہد حکومت کے دوران ایک چٹان کاٹ کر الورا میں شیو جی کا مندر تعمیر کروایا۔ اس مندر کو کیلاش مندر کہتے ہیں۔

راشٹر کوٹہ خاندان کے دیگر حکمرانوں میں گوبند سوم، امو گھ ورش اور کرشن سوم قابل ذکر ہیں۔ کرشن سوم نے چولا خاندان کو شکست دے کر کانجی ورم اور تنجور پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح دریائے کاویری اس کی جنوبی سرحد قرار پایا۔ ۹۷۳ء میں مالوہ کے حکمران پرمار راجہ نے دکن پر حملہ آور ہو کر راشٹر کوٹہ خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۵۔ یادو خاندان

یہ قدیم کھشتری خاندانوں میں سے ایک تھا۔ یہ خاندان ۱۱۸۰ء سے ۱۳۱۰ء تک برسر اقتدار رہا۔ دیوگری (موجودہ دولت آباد) اس کا پایۂ تخت تھا۔ اس خاندان کا مشہور ترین راجہ سنگھانہ تھا۔ جس نے ۱۲۱۰ء سے ۱۲۴۷ء تک حکومت کی۔ اس نے وندھیاچل کے سر بفلک پہاڑ عبور کر کے گجرات اور مالوہ کو زیرِ نگیں کیا۔ علاوہ ازیں شمال میں منظرا اور کاشی تک کا علاقہ زیرِ تسلّط کیا۔ ۱۲۹۴ء میں علاؤالدین خلجی نے اس خاندان کے راجہ رام دیو کو شکست فاش دے کر اپنا باجگذار بنا لیا۔ ۱۳۱۰ء میں رام دیو کے جانشین نے خراج ادا کرنا بند کر دیا۔ اس پر علاؤالدین کے حکم سے اس کے جرنیل ملک کافور نے شنکر دیو کو قتل کر دیا اور ہرپال کو باجگذار راجہ مقرر کر دیا۔ ۱۳۱۸ء میں ہرپال نے بھی سرکشی کی چنانچہ ملک کافور نے دیوگری پر دوبارہ حملہ آور ہو کر راجہ کو شکست دی اور اسے ہلاک کر ڈالا۔ ازاں بعد تمام ریاست کو خلجی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۶۔ ہوئے سالا

یہ خاندان بھی چالوکیہ خاندان کے حکمرانوں کا باجگذار تھا۔ اس کی سلطنت موجودہ میسور اور کرناٹک کے علاقہ پر مشتمل تھی اور دوار سمدر اس کا پایۂ تخت تھا۔ اس

Marfat.com

خاندان کا بانی وشنو ردھن تھا، جس نے مشہور ہندو زیفار مہارانا کو پناہ دی تھی اور جس کی تبلیغ سے وہ جین مت ترک کر کے وشنو کا پرستار بن گیا تھا۔ ویر بیلالہ دوم اس خاندان کا مشہور ترین اور قابل ذکر راجہ تھا۔ جس نے ۱۲۱۰ء میں وفات پائی اور جس نے حیرت انگیز فتوحات حاصل کر کے اپنی سلطنت کو بہت وسعت دی۔ اس خاندان کا آخری راجہ ویر بیلالہ سوم (۱۲۹۲ء تا ۱۳۳۱ء) تھا، جس کے عہد حکومت میں علاؤالدین خلجی کے جرنیل ملک کافور نے دکن پر حملہ آور ہو کر ہوئے سالا ریاست کو تاخت و تاراج کیا اور ترچناپلی کے قریب ایک جنگ میں راجہ کو شکست فاش دی۔ راجہ لڑتا ہوا مارا گیا اور ملک کافور نے اس ریاست کو خلجی سلطنت میں مدغم کر لیا۔

۷۔ کاکتیہ

کاکتیہ بھی چالوکیہ سلطنت کے باجگذار تھے۔ تری بھوانہ مالا اس خاندان کا پہلا حکمران شمار ہوتا ہے جو ۱۱۰۰ء میں تخت نشین ہوا۔ کاکتیہ دیوی کی پوجا کرنے کی بناء پر یہ خاندان کاکتیہ کہلایا۔ ورنگل کا شہر اسی خاندان کے ایک سردار نے زور دیو نے آباد کیا تھا جو بعد میں کاکتیہ سلطنت کا پایۂ تخت مقرر ہوا۔ ورنگل کے علاقہ پر ان کی حکومت قریباً چار سو سال تک قائم رہی، رانی رودرامہا اس خاندان کی ایک مقتدر حکمران تھی۔ مشہور سیاح مارکوپولو اسی کے عہد میں کارومنڈل کے ساحل پر آیا تھا۔ رانی نے ۱۲۹۱ء میں وفات پائی۔ اُس کی وفات کے بعد اس کا پوتا رودر دیو ثانی سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس خاندان کے ساتویں راجہ کرشن کے دورِ اقتدار میں بہمنی سلطنت نے ورنگل فتح کر کے راجہ کرشن کو اپنا اطاعت گذار بنایا۔ ۱۴۲۴ء میں اسے ریاست بہمنی میں شامل کر لیا گیا۔

۴۔ جنوب بعید (تامل علاقہ) کی ریاستیں

دکن کے انتہائی جنوبی علاقہ جسے تامل علاقہ بھی کہتے ہیں، میں تین اہم ریاستیں تھیں۔ اس علاقہ کا تمدن شمالی ہند کے آریائی علاقہ سے بالکل مختلف تھا۔ سمندر کے قریب ہونے کے باعث اس علاقہ کے لوگ زیادہ تر بحری تجارت ہی میں دلچسپی رکھتے تھے اور غیر ممالک سے ان کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ یہ تینوں ریاستیں چیرا یا کرالا پترا، چولا اور پانڈیا تھیں۔ جن کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

ریاست چیرا

یہ ریاست ساحل مالابار پر واقع تھی اور ونجی اس کا پایۂ تخت تھا۔ اس میں کوچین ٹراونکور اور مالابار کے علاقے شامل تھے۔ ماچوری اس ریاست کی مشہور بندرگاہ تھی۔ اس کے عوام بحری تجارت اور جہاز رانی کے بڑے شوقین تھے۔ تجارت کی غرض سے دور دراز علاقوں تک سفر اختیار کرتے تھے۔ اشوک کے کئی ایک کتبوں میں اس ریاست کا ذکر ملتا ہے اور جس سے اس ریاست کے بہت زیادہ قدیم ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ دکن کے جنوب بعید میں واقع ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے حملوں

Marfat.com

سے بچی رہی۔ اس ریاست کو کرالہ پترا بھی کہتے ہیں۔

ریاست چولا

چولا ریاست کے بانی راجہ اذنیہ چولا نے پلوا خاندان کے آخری راجہ کو شکست دے کر چولا ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہ ریاست مدراس اور میسور کے بیشتر علاقوں پر مشتمل تھی۔ ترچناپلی اس ریاست کا دارالحکومت تھا۔ راجہ اذنیہ نے ۹۰۷ء میں وفات پائی۔ چولا خاندان کے حکمرانوں نے انتہائی جنوبی ہند کے سارے علاقوں پر اپنی بالادستی قائم کی۔ حتیٰ کہ لنکا کا راجہ بھی اُن کا باجگزار بن گیا اس خاندان کے مشہور ترین حکمرانوں میں سے راجہ راجا، راجندر اول اور راجہ دھیراج خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ راجہ دھیراج فن تعمیر کا سرپرست تھا۔ تنجور کا مشہور راجہ راجیشور مندر اسی کی یادگار ہے۔ اس مندر کی دیواروں پر راجہ کے کارنامے پتھروں پر کندہ ہیں۔ اگرچہ وہ شِو کا پرستار تھا مگر بدھ اور جین مت کے پیروؤں سے بھی اس کا سلوک روادارانہ تھا۔ اس نے اپنی بحری طاقت کے بل بوتے پر لنکا دیپ اور مالدیپ کے جزیرے فتح کیے۔ اس کے جانشین راجندر (۱۰۱۲ء تا ۱۰۳۵ء) نے اپنی لڑکی کی شادی مشرقی چالوکیہ کے حکمران سے کر کے چالوکیہ خاندان سے تعلقات استوار کیے۔ راجہ راجندر کے ایک جرنیل نے بنگال کے راجہ کو شکست دی اور جزائر انڈیمان اور نکوبار پر قبضہ کیا۔ راجہ راجندر کی وفات کے بعد یہ ریاست زوال پذیر ہوئی۔ چولا حکمران، چالوکیہ فرمانرواؤں سے ہمیشہ برسرپیکار رہتے تھے۔ چنانچہ راجہ راجندر کا لڑکا راجا دھیراج مغربی چالوکیہ کے راجہ کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا گیا۔ بعد ازاں مشرقی چالوکیہ کے راجہ تولن نے جو راجہ راجندر کا نواسہ تھا، چولا سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اس کے جانشین ۱۲۷۰ء تک برسرِ اقتدار رہے۔ اس خاندان کے حکمران علم و ادب کے مربی تھے۔

اشوک کے کئی ایک کتبوں میں چولا سلطنت کا ذکر پایا جاتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چولا سلطنت کا نظامِ حکومت نہایت عمدہ تھا۔ یہ ریاست چھ صوبوں میں منقسم تھی۔ پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ بطور لگان وصول کیا جاتا تھا۔ کاشتکاروں کو جنس یا نقدی کی صورت میں لگان ادا کرنے کی اجازت تھی۔ حدود سلطنت میں جا بجا سڑکیں اور پل موجود تھے۔ ریاست میں سونے کے سکے رائج تھے سنسکرت کے علاوہ تامل زبانوں کی بھی سرپرستی کی جاتی تھی۔ درآمدی و برآمدی تجارت ترقی پر تھی، اور عوام خوشحال تھے۔ چولا ریاست کے کئی ایک غیر ممالک بالخصوص یونان اور روم سے بہت اچھے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ ریاست میں سلطنتِ روما کے سکے بھی چلتے تھے۔ اور شاہی فوج میں بھی کافی رومن سپاہی موجود تھے۔

ریاست پانڈیا

تامل علاقہ کی ریاستوں میں پانڈیا سب سے قدیم ریاست تھی۔ یہ ریاست موجودہ دور کے میڈورا اور تنیولی کے اضلاع تک محدود تھی۔ میڈورا اس کا پایۂ تخت تھا جو ایک متمول شہر تھا۔ اس ریاست کے حکمران شروع سے ہی پلوا سرداروں سے مصروفِ

Marfat.com

پیکار تھے اور ان کو زیر نگین کرنے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ انہوں نے چولا خاندان کی باگذاری قبول کرلی۔ بارہویں صدی عیسوی تک ریاست پانڈیا کے سردار چولا خاندان کے اطاعت گذار رہے۔ پانڈیا خاندان کا عروج پندرہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ اس خاندان کا مشہور ترین اور عظیم حکمران جتی ورمن سندر تھا۔ ابتدا میں وہ جین مت کا پیرو تھا۔ لیکن بعد میں اس کا مخالف ہو گیا اور اس نے جینیوں کو سخت سزائیں دیں۔ راجہ جتی ورمن سندر نے ۱۲۷۲ء میں وفات پائی۔ پانڈیا خاندان کے حکمرانوں نے لنکا کی حکومت سے بھی کئی ایک جنگیں لڑیں۔ ۱۳۱۰ء میں ملک کافور نے میڈورا پر حملہ کیا تو سندر پانڈیا اور ویر پانڈیا دونوں بھائی حصولِ اقتدار کے لئے ایک دوسرے سے پیکار آزما تھے۔ ملک کافور نے دونوں کو شکست دے کر ریاست پر قبضہ کر لیا۔ لیکن بعد ازاں وجے نگر کی ریاست نے اس پر اپنا تسلط جما لیا۔

مسلمانوں کی آمد پر برصغیر پاک و ہند کی سماجی و معاشی حالت

مسلمانوں کی آمد پر برصغیر کی سماجی اور معاشی حالت کے بارے میں قدیم کتبوں اور غیر ملکی سیاحوں بالخصوص عرب اور چینی سیاحوں کے سفر ناموں سے خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ جن کا تذکرہ حسبِ ذیل ہے :-

سماجی حالت

ہندو معاشرہ ذات پات کا شکار اور سماجی ناانصافیوں، عدم مساوات اور بندشوں کا مجموعہ تھا۔ پورا ہندو سماج چار ذاتوں میں منقسم تھا۔ ہر ذات رنگ و نسل، عقائد و رسوم اور پیشہ و ہنر کے لحاظ سے اپنی ایک جداگانہ امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ مسلمانوں کے زمانۂ ورود میں ذات پات میں بڑی شدت پیدا ہو چکی تھی۔ چاروں ذاتیں مزید ذاتوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی تھیں۔ مشہور مسلم مؤرخ ابو ریحان البیرونی جو سلطان محمود کے زمانے میں برصغیر پاک و ہند میں آیا اور جس نے ہندو معاشرہ کا بڑی دور بین نگاہوں سے مطالعہ کیا، لکھتا ہے کہ ہندو سوسائٹی میں بڑی ذاتوں کے علاوہ ذیلی ذاتوں کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے۔

ہندو سوسائٹی کی چار بڑی ذاتیں برہمن، کھشتری، ویش اور شودر تھیں[1]۔

---

[1] تاریخ الہند

Marfat.com

برہمن نہ صرف مذہبی امور کے نگران تھے بلکہ معاشرہ میں سب سے زیادہ با اختیار اور مقدس سمجھے جاتے تھے۔ جو ویدک علوم اور مذہبی رسومات کے ماہر تھے۔ انہیں سوسائٹی میں مقدس اور قابلِ احترام سمجھا جاتا تھا۔ ملک و قوم کا تحفظ اور امن و امان کو قائم کرنے والا طبقہ کھشتری کہلاتا تھا۔ راجے، امراء، فوجی جرنیل اور دیگر حکام اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ برہمنوں کی طرح کھشتریوں کو بھی معاشرہ میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ویش وہ تھے جو کاشتکار، تجارت پیشہ اور صنعت کار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور شودر وہ طبقہ تھا جو ان تینوں ذاتوں کی خدمت پر مامور تھا اور نہایت ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ یہ طبقہ بنیادی انسانی حقوق سے یکسر محروم تھا۔ حتیٰ کہ قانون کی نگاہ میں بھی وہ نیچ متصور ہوتا تھا۔ اگر کوئی شودر مقدس ویدوں کا کوئی لفظ سن پاتا تو یہ اس کا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا اور اس کی پاداش میں اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا۔ شودر طبقہ کے لوگ عام طور پر شہر کی چار دیواری سے باہر رہائش رکھتے تھے۔ اس کے برعکس برہمنوں کو سوسائٹی میں بلند مقام حاصل تھا۔ منوسمرتی اور منو کے شاستر کی رو سے اگر کوئی شخص برہمن کو ایک تنکا بھی مار دیتا تو اس کی سات پشتوں تک کو اس کی سزا بھگتنی پڑتی تھی۔

ہندو سوسائیٹی میں مختلف ذاتوں میں باہمی شادی بیاہ کا رواج نہیں تھا۔ کیونکہ ذات پات کا سلسلہ موروثی ہوتا تھا۔ اس لئے ان سے چھٹکارا پانا قطعی ناممکن تھا۔ باہمی نفاق اور حسد روز افزوں تھا۔ معاشرہ میں باہمی میل ملاپ یکسر مفقود تھا۔ ہر شخص طبقاتی تفریق کے باعث ذاتی روایات اور علیحدگی پسندی کے خول میں محصور تھا۔ عوام ایک دوسرے سے گھلے ملے نہ تھے۔ بلکہ ذات پات کی بنا پر مخصوص خاندانی پیشہ اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ چھوٹی ذاتوں یعنی ویش اور شودروں پر ترقی کے تمام دروازے بند تھے۔ صرف اعلیٰ ذات کے لوگ ہی تعلیم و تربیت حاصل کر سکتے تھے۔ نچلی ذات کے بیدار مغز اور مستعد نوجوان بھی تعلیم و تربیت حاصل کر کے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے سے معذور تھے۔ ذات پات کی اس لعنت کے علاوہ ہندو معاشرہ میں کئی ایک خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ سمندری سفر کو گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ نتیجۃً برصغیر ایشیا اور مغربی ممالک سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ اور اس کی یہ علیحدگی ثقافتی جمود کا باعث بنی ہوئی تھی۔ تمام سوسائٹی تنگ نظری اور تعصب کا شکار تھی۔ باہمی خلوص و محبت کا ماحول یکسر ناپید تھا۔ ہندو معاشرہ میں رقص و موسیقی کا عام رواج تھا۔ خوشی اور غمی بلکہ مذہبی رسومات میں بھی گانا ہندو معاشرے کا ایک جزو تھا۔

عورتوں کو مردوں کے مقابلہ پر حقیر اور کمتر سمجھا جاتا تھا۔ عورت اپنے خاوند کو دیوتا سمجھتی تھی۔ رسم ستی اور بچپن کی شادی کا رواج عام تھا۔ ستی ہونے والی عورت کو سماج میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ عورت کو دوبارہ شادی کی اجازت نہ تھی۔ طلاق کا رواج قطعی نہ تھا۔ پردہ کی شدید پابندی کی وجہ سے عورت کو گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر رہنا پڑتا تھا۔ راجپوتوں میں دختر کشی کا طریقہ بھی رائج

Marfat.com

تھا۔ امراء اور راجاؤں کی لڑکیاں سوئمبر رچا کر اپنا خاوند خود منتخب کرتی تھیں۔ راجپوت عورتیں خود دار اور غیور واقع ہوئی تھیں، اور اپنی عزت و ناموس پر کٹ مرتی تھیں وہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی بجائے چتا میں بیٹھ کر جل مرنے کو ترجیح دیتی تھیں۔

لوگ سادہ زندگی بسر کرنے کے خوگر تھے۔ دو چادریں اوپر نیچے اوڑھ لیا کرتے تھے۔ بادشاہ اور امراء زیورات پہنتے تھے۔ بادشاہوں کے سر پر مرصع تاج ہوا کرتے تھے۔ کھانا کھانے سے قبل غسل کرنے کا رواج عام تھا۔ دسترخوان سے بچے ہوئے کھانے کو ضائع کر دیا جاتا تھا۔ مٹی اور لکڑی کے برتن صرف ایک بار استعمال ہوتے تھے۔ لیکن دھات کے برتن صاف کر کے دوبارہ استعمال میں لائے جاتے۔ لوگ گوشت، مچھلی اور لہسن و پیاز کے استعمال سے اجتناب کرتے تھے۔ عام خوراک دودھ، مکھن، گھی، تیل اور اناج وغیرہ تھی۔ غرضیکہ وہ تمام سماجی رسومات اور رہن سہن کے طریقے جو ہندو سماج میں آج بھی رائج ہیں اس دور میں بھی موجود تھے۔

معاشی حالت

شہرۂ آفاق چینی سیاح ہیون سانگ کے بیان کے مطابق ملک کی معاشی حالت بہت اچھی تھی۔ عوام متمول و خوشحال تھے۔ شہروں میں مال دار تاجر رہا کرتے تھے۔ لوگوں کا عام پیشہ زراعت تھا۔ تجارت اپنے عروج پر تھی۔ جزائر شرق الہند لنکا، وسط ایشیائی ممالک، چین، مصر، یونان، روم و دیگر یورپی ممالک اور عرب کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم تھے۔ ہندی دست کار اپنے فن میں مہارت کاملہ رکھتے تھے۔ شہری باشندے امن و آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ٹیکسلا، پاٹلی پتر، بنارس، گیا، متھرا، الہ آباد، لاہور، ملتان، کوسمبھی، اجودھیا اجین اور دہلی اس دور کے مشہور شہر تھے۔ مگر ان میں اجودھیا، کوسمبھی، اجین اور ٹیکسلا اپنی قدیم عظمت کھو چکے تھے۔ قنوج کے شہر کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ شہروں میں بیشمار صنعتیں قائم تھیں۔ سلکی، سوتی اور اونی کپڑا بنا جاتا تھا۔ سونے اور چاندی کے سکے خرید و فروخت میں کام آتے تھے۔ ملک میں کئی ایک اچھی بندرگاہیں تھیں، جس کی وجہ سے برآمدی و درآمدی تجارت اپنے عروج پر تھی۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ مسلمانوں کی آمد پر برصغیر کی سماجی و معاشی حالت نہایت اچھی تھی۔ مختلف ریاستوں کا نظام حکومت بہتر اور عوام کی فلاح و بہبود پر مبنی تھا۔ لیکن سیاسی لحاظ سے ملک عدم استحکام اور لامرکزیت کا شکار تھا۔ ہر سو بدامنی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ملک متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا، جن کے حکمران حصول اقتدار کے لئے اپنی ہمسایہ ریاستوں سے برسرپیکار رہتے تھے۔

Marfat.com

اہم تاریخیں

۶۰۶ ء	ہرش وردھن کی تخت نشینی
۶۲۰ ء	پلک سین ثانی چالوکیہ کے ہاتھوں ہرش وردھن کی شکست
۶۲۹-۴۵ء	چینی سیاح ہیون سانگ کی سیاحتِ برصغیر
۶۴۱ ء	ایران پر عربوں کا قبضہ ۔ ہرش وردھن کا چین میں سفارت بھیجنا
۶۴۵ ء	ہیون سانگ کی چین کو واپسی
۶۴۷ ء	ہرش وردھن کی وفات
۶۶۴ ء	ہیون سانگ کی وفات

امتحانی سوالات

۱۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل کے برصغیر پاک و ہند کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا جائزہ لیجئے۔

۲۔ "برصغیر کی تاریخ کا وہ دور جو ۶۴۷ء میں راجہ ہرش کی وفات کے بعد سے شروع ہوتا ہے، سیاسی انتشار اور عدم استحکام کا دور تھا۔" تبصرہ کیجئے۔

۳۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے وقت شمالی ہند کی ریاستوں کی تاریخ مختصر طور پر بیان کیجئے۔

۴۔ پاک و ہند پر مسلمانوں کے حملہ کے وقت دکنی اور جنوبِ بعید (تامل علاقہ) کی ریاستوں کا حال اختصار سے قلم بند کیجئے۔

۵۔ سندھ پر عربوں کے حملہ کے وقت ہمالیہ کی ریاستوں کی سیاسی تاریخ مختصر طور پر لکھئے۔

۶۔ چینی سیاح ہیون سانگ پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیجئے۔

Marfat.com

دوسرا باب

سندھ میں عربوں کی آمد

"اسلام عرب کے لئے ایک رحمت بن کر آیا۔ اسلام کی اتحاد پرور تعلیمات نے صحرائے عرب کے مختلف النوع قبائل کو فاتح عالم قوم بنا ڈالا اور پیغمبرِ اسلامؐ کی وفات کے ایک سو سال کے اندر ہی اسلامی فتوحات کی ابھرتی ہوئی لہریں مشرق اور مغرب پر چھا گئیں، اور دریائے سائر کے کنارے اور بحیرۂ اوقیانوس کے ساحل اللہ اکبر کی صدا سے گونج اٹھے۔"[1]

ڈاکٹر محمد ناظم

طلوعِ اسلام

اسلام کا ظہور تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ اسلام کا آفتاب سرزمین عرب میں طلوع ہوا۔ جس نے اپنی ضیا پاشیوں سے تمام کائناتِ عالم کو منور کر دیا۔ سرزمین عرب دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ایک صحرائی خطہ ہے، جو بے آب و گیاہ ریگستان پر مشتمل ہے۔ یہ براعظم ایشیا میں واقع ہے اور تین اطراف سے بحیرۂ روم، خلیج فارس اور بحیرۂ عرب سے گھرا ہوا ہے۔ طلوعِ اسلام سے قبل یہ تمام ممالک جہالت، توہم پرستی اور لاقانونیت کا شکار تھا۔ اس کے باشندے خانہ بدوش اور صحرا نشین تھے اور تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے، نیز مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے بلکہ قمار بازی اور مے نوشی جیسی لعنتوں کے بھی شکار تھے۔ غرور و نخوت، بغض و حسد، جنگ و جدال اور کینہ و نفرت اُن کے خصائل تھے اور بت پرستی اُن کا شیوہ تھا۔ مکہ میں صدہا بتوں کا گہوارہ کعبہ اُن کا قدیم معبد تھا۔ وہ معبودانِ باطل اور ارواحِ خبیثہ پر ایمان رکھتے تھے۔

عرب قبائل میں قریش کو ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ چھٹی صدی عیسوی کے ربعِ آخر[2] میں شہنشاہِ

---

[1] "دی لائف اینڈ ٹائمز آف سلطان محمود آف غزنہ" صفحہ ۱۸

[2] پیر والہ ۱۲ ربیع الاوّل مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء

Marfat.com

کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔ گویا ایک ایسی ہستی عالم ظہور میں آئی جو دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب برپا کرنے والی تھی اور جس کی ضیائے نور دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچنے والی تھی۔

چالیس سال کی عمر میں آپؐ حق تعالیٰ کی طرف سے منصب نبوت پر مبعوث ہوئے۔ جب آپ نے قریش مکہ کے سامنے پیغام حق پیش کیا تو وہ آپ کے شدید دشمن اور درپے آزار ہو گئے۔ جب اہل مکہ کی عداوت انتہا کو پہنچ گئی تو بحکم خداوندی ۶۲۲ء میں آپؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ اسی سال سے سن ہجری کا آغاز ہوا۔ مدینہ میں آپؐ نے معاشرتی تنظیم و اصلاح کے ساتھ سیاسی تنظیم بھی شروع کر دی۔ ہجرت کے گیارہ سال بعد آپؐ نے مکہ کو فتح کر لیا اور رفتہ رفتہ سارا عرب اسلامی عظمت کے زیر نگیں آ گیا۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے دیگر ممالک میں بھی مبلغین دین بھیجے گئے۔ ۸ جون ۶۳۲ء کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا[1] آپ نے دنیا کے سامنے ایک مکمل و منظم نظام زندگی اور حکومت الٰہیہ کا تخیل پیش کیا اور خود ابتداء سے لے کر آخر تک ان اصولوں پر کاربند رہے جو تمام عالم کے لئے مشعل راہ ہو سکتے تھے۔ دین اسلام کی شکل میں آپؐ نے دنیا کے سامنے جو فلسفۂ حیات پیش کیا وہ ہر قوم اور ہر زمانے کے لئے ایک کامل نظام زندگی کا درجہ رکھتا ہے۔ جسمیں انسانی زندگی کے ہر شعبے کی مشکلات کا حل موجود ہے۔ اسلام کا پیغام کسی ایک ملک اور قبیلہ کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے تھا۔ جس کی اشاعت و تبلیغ کے لئے ایک تحریک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ جس کا مقصد اسلامی غلبہ کا قیام تھا۔ اس تحریک سے صرف مکہ اور مدینہ کے رہنے والے یا صحرانشین بدو ہی وابستہ نہ تھے بلکہ ہر ملک اور قوم کے لوگ جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے، خواہ وہ ہندی ہو یا افغانی ایرانی ہوں یا تورانی، سائبیریا کے رہنے والے ہوں یا ملک حبش کے باشندے، سب کے سب بلا کسی تخصیص و امتیاز کے اخوت و مساوات، حریت اور نصرت اسلام کے دلدادہ تھے۔ گویا ایک کعبہ، ایک رسولؐ اور ایک خدا کو ماننے والوں کا مقصد حیات بھی ایک ہی تھا۔ اور وہ ایک ہی مرکز پر جمع ہو کر ایک ہی نصب العین یعنی روئے زمین پر اسلامی غلبہ کے متمنی اور اس کے لئے کوشاں تھے۔

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز سے لے کر صرف ایک صدی کے عرصہ میں اسلام کے فدائیوں نے مغرب میں ایشیائے کوچک، شمالی افریقہ، جزیرہ نما ہسپانیہ اور مشرق میں عرب و عجم (ایران) افغانستان اور ترکستان کو زیر نگیں کر کے اور وہاں ہلالی پرچم لہرا کر اسلامی غلبہ و اقتدار کو قائم کر دیا۔ نیز بازنطینی اور ساسانی جیسی دو عظیم سلطنتوں کو ختم کر کے اسلام کی عظمت کو دوبالا کیا۔

---

[1] بروز پیر ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ

Marfat.com

اسلامی فتوحات کا یہ سلسلہ بنو امیہ کے دورِ اقتدار میں کمال کو پہنچا اور اسلامی سلطنت کی حدود ملتان اور کاشغر سے لے کر پرتگال تک پھیل گئیں۔ خلیفہ الولید اوّل (۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) کے دورِ اقتدار میں سندھ پر عربوں کا حملہ ہوا۔

عرب اور برصغیر کے تعلقات

ظہورِ اسلام سے بہت عرصہ پہلے ہی سے عربوں کے برصغیر پاک و ہند کے ساتھ تجارتی تعلقات استوار تھے۔ عرب تاجر مصر و شام کے شہروں سے چل کر خشکی کی راہ بحیرۂ احمر کے کنارے کنارے حجاز کو طے کر کے یمن تک پہنچتے تھے اور وہاں سے بادبانی کشتیوں میں بیٹھ کر کچھ تو افریقہ اور حبشہ کو چلے جاتے اور کچھ وہیں سے سمندر کے کنارے کنارے حضرموت، عمان، بحرین اور عراق کے کناروں کو طے کر کے خلیج فارس کے ایرانی ساحلوں سے گزر کر یا تو بلوچستان کی بندرگاہ تیز میں اتر پڑتے تھے یا پھر آگے بڑھ کر سندھ کی بندرگاہ دیبل (سندھ) میں چلے آتے تھے اور پھر مزید آگے بڑھ کر گجرات اور کاٹھیاوار کی بندرگاہ تھانہ اور کھمبائت چلے جاتے تھے۔ پھر اور آگے بڑھتے تھے اور سمندر سمندر کالی کٹ اور راس کماری پہنچتے تھے اور پھر کبھی ساحل معبر کے کنارے پر ٹھہرتے تھے اور کبھی سراندیپ (لنکا) اور انڈیمان ہو کر خلیج بنگال میں داخل ہو جاتے تھے اور بنگال کی ایک دو بندرگاہوں کو دیکھتے ہوئے برما اور سیام سے ہو کر چین چلے جاتے، پھر اسی راستے سے لوٹ آتے تھے[1] غرضیکہ عرب تاجران ممالک کے سامان تجارت کو مصر اور شام تک پہنچاتے، جہاں سے دوسرے تاجر اسے یورپ کے مختلف ملکوں تک لے جاتے تھے۔

عرب تاجر برصغیر سے صندل، کافور، لونگ، جائفل، کباب چینی، ناریل، سن کے کپڑے، روئی کے مخملیں کپڑے اور ہاتھی دانت، سراندیپ کے موتی، یاقوت، بلور اور مالابار سے سیاہ مرچ، گجرات سے سیسہ، دکن سے بکم، سندھ سے کٹھ بانس اور بید اور راس ہیلی سے الائچی بڑی بھاری مقدار میں لے جاتے تھے علاوہ ازیں نارنگی، لیموں، ریوند چینی، جاوتری، کیلے، دار چینی، توتیا، ساگوان کی لکڑی، تلواریں، کافور، سونٹھ، چھالیہ، ہلیلہ، بلیلہ، بھلانوہ، نیل، باریک کپڑا، گینڈے کی کھال اور بیشمار دوسری چیزیں برصغیر پاک و ہند سے برآمد ہوتی تھیں۔ اس کے بدلے میں برصغیر مصر سے زمرد کی انگوٹھیاں، مرجان، دھنج (ایک قیمتی پتھر) شراب، روم سے ریشمی کپڑے، سمور، پوستین اور تلواریں، فارس سے گلاب کا عرق، بصرہ سے کھجوریں اور عرب سے گھوڑے منگواتا تھا[2]

برصغیر پاک و ہند میں عربوں کے تجارتی مراکز میں سراندیپ، مالدیپ، مالابار، کارومنڈل، گجرات

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات،
[2] ایضاً

Marfat.com

اور سندھ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جنوبی ہند اور ساحلی علاقوں میں بھی جا بجا عرب تاجروں کی نوآبادیات موجود تھیں، جہاں عراق اور عرب کے تاجر موجود تھے۔

ظہور اسلام کے بعد عربوں کی سیاسی، مجلسی اور اقتصادی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں اور جنوبی ہند سے اُن کے تجارتی تعلقات بہت بڑھ گئے۔ اب وہ تبلیغ اسلام کے شوق سے سرشار، اخلاق و اطوار کے لحاظ سے بلند معیار کے حامل اور صداقت و دیانت کے پیکر تھے۔ اُن میں سے اکثر نے برصغیر میں ہی رہائش اختیار کرلی۔ آہستہ آہستہ جنوبی ہند کے اکثر مقامات پر مسلمانوں کی نوآبادیات قائم ہوگئیں۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرنا شروع کردیا۔ مقامی راجاؤں سے مسلمان تاجروں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور انہیں تبلیغ اسلام اور عبادات کی پوری آزادی حاصل تھی۔

ابتدائی جھڑپیں

سندھ اور ایران ازمنۂ قدیم سے ایک دوسرے کے ہمسائے ہیں۔ دونوں ہمسایہ ملکوں کے درمیان صلح و جنگ کی حالت اکثر پیدا ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ اسلام سے پہلے کبھی ایرانی دریائے سندھ تک کا علاقہ فتح کرلیتے اور کبھی سندھ کے راجے مکران کے پہاڑوں تک بڑھ جاتے۔ ظہور اسلام کے بعد ایران کے ایک صوبہ کا گورنر ہرمز اپنے جنگی بیڑے کی مدد سے ساحل سندھ پر حملہ آور ہوا اور یہاں کے بیشمار آدمیوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گیا، جو سب کے سب جاٹ تھے۔ چچ کے زمانے میں ایرانیوں اور عربوں میں جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ایرانیوں نے سندھیوں سے صلح کرلی اور ہرمز نے سندھی (جاٹ) قیدیوں کو عنایات سے نواز کر ایرانی فوج میں بھرتی کرلیا۔ عہد صدیقیؓ کی ایک جنگ ذات السلاسل میں سندھی جاٹ پاؤں میں زنجیریں باندھ کر ایرانی فوج کے شانہ بشانہ عربوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ اس جنگ میں خالد بن ولید نے ہرمز کو قتل کردیا۔ بعد میں جنگ قادسیہ میں بھی سندھی جاٹوں نے عربوں کے خلاف ایرانیوں کا ساتھ دیا۔ مگر شکست کھا کر عربوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور بعد ازاں برضا و رغبت مسلمان ہو کر عراق میں سکونت پذیر ہوگئے۔ عرب اُن کو زط کہتے تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں مکران تک اسلام کا علم لہرا چکا تھا۔ تسخیر مکران کے موقعہ پر بھی سندھیوں نے اسلامی لشکر کا مقابلہ کیا تھا۔ چونکہ سندھی سالہا سال سے مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار چلے آرہے تھے۔ اس لئے اصولاً مسلمانوں کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ ایران کی فتح سے فارغ ہونے کے بعد سندھ پر حملہ آور ہوں۔ لیکن فاروق اعظمؓ نے مناسب نہ سمجھا کہ انتقام کے طور پر فوج کشی کی جائے کیونکہ وہ دور دراز کی فتوحات بالخصوص بحری مہمات کے خلاف تھے۔ بحرین اور عمان کے حاکم عثمان بن ابوالعاص ثقفی نے ۶۳۶ء ۶۳۷ء میں ایک فوجی مہم تھانہ نزد بمبئی میں بھیجی اور پھر اپنی اس مہم کی اطلاع حضرت عمرؓ کو دی۔ آپ ناراض ہوئے اور لکھا کہ تم نے میری اجازت کے بغیر سواحل ہند پر فوج بھیجی۔ اگر ہمارے آدمی وہاں مارے جاتے، تو واللہ میں تمہارے قبیلہ کے اتنے ہی آدمی قتل کر ڈالتا۔

Marfat.com

عراق کے حاکم عبداللہ بن عامر نے حکیم بن جبلہ العبدی کو برصغیر کے سرحدی حالات کی تحقیق پر مامور کیا۔ واپسی پر انہوں نے حضرت عثمان رضؓ کو اپنی رپورٹ میں بتایا۔

"وہاں پانی کمیاب ہے۔ پھل نکمے ہیں۔ ڈاکو بہت دلیر ہیں اگر قلیل التعداد فوج بھیجی گئی تو ہلاک ہو جائے گی اور زیادہ لشکر بھیجا گیا تو بھوکوں مر جائے گا۔"

اس پر خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضؓ نے برصغیر کو مہم بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ چنانچہ ایک مدت تک کسی کشور کشا نے برصغیر کا رُخ نہ کیا۔

۳۹ھ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے عہد خلافت کے دوران حارث بن مرۃ العبدی کو مشرقی سرحد کی ایک شورش فرو کرنے کے لئے بھیجا جہاں پہلے تو حارث بن مرۃ العبدی کو کامیابی ہوئی لیکن تین سال بعد ۴۲ھ میں قیقان کے مقام پر وہ اور ان کے بہت سے ساتھی شہید ہو گئے[1]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد جب امیر معاویہ رضؓ مسند آرائے سلطنت ہوئے تو لشکر اسلام کے مشہور سپہ سالار مہلب بن ابی صفرہ نے برصغیر کی سرحد پر حملہ کیا اور لاہور تک بڑھ آیا۔ انہی ایام میں خلیفۂ اسلام نے ایک اور سپہ سالار عبداللہ بن سوار عبدی کو سواحل برصغیر کے سرکش لوگوں کی گوشمالی کے لئے چار ہزار کی عسکری جمعیت کے ساتھ بھیجا۔ اس نے قیقان کے باشندوں کو سخت شکست دی اور مال غنیمت لے کر واپس چلا گیا۔ اس نے حضرت امیر معاویہ رضؓ کی خدمت میں قیقانی گھوڑے پیش کیے، لیکن کچھ مدت کے بعد عبداللہ بن سوار عبدی واپس قیقان آ گیا۔ جہاں ترکوں نے یورش کر کے اسے قتل کر دیا[2]

اُموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے حجاج بن یوسف ثقفی کو بلادِ اسلامیہ کے مشرقی ممالک کا والی مقرر کیا۔ حجاج نہایت سخت گیر اور ایک جابر حاکم تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کے لئے شمشیر برہنہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ نہایت روشن دماغ اور قوی الارادہ تھا۔ جب حجاج بن یوسف نے کوفہ، بصرہ اور مکران کے بعض نشر پسند عناصر کی گوشمالی کی، تو دو بھائیوں محمد علافی و معاویہ علافی نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ پانچ سال کی مسلسل کشمکش کے بعد معاویہ علافی تو قتل ہو گیا لیکن محمد بن حارث علافی پانچ سو عرب سپاہیوں کو ساتھ لے کر مکران سے سندھ میں داخل ہو گیا۔ اور راجہ داہر والیٔ سندھ کے ہاں پناہ گزین ہوا۔ راجہ داہر نے اسے نہ صرف پناہ دی بلکہ باقاعدہ اپنے ہاں ملازم بھی رکھ لیا۔ اس پر حجاج نے خلیفہ عبدالملک کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ سندھ کا راجہ اسلامی سلطنت کی مخالفت میں حد سے بڑھ گیا ہے۔ اب اس نے سلطنتِ اسلامیہ کے باغیوں اور غداروں کو پناہ دے کر ان کی خاطر و مدارت بھی کرنی شروع کر دی ہے، اس لئے مجھے سندھ پر فوج کشی کی اجازت دی

---

[1] ابوالحسن احمد بن یحییٰ بلاذری "فتوح البلدان"

[2] ابن اثیر (جلد سوم) صفحہ ۳۶۶

Marfat.com

جائے۔ خلیفہ عبدالملک نے بھی حملہ کی اجازت دینے میں تامل کیا، لیکن ابھی یہ درخواست زیرِ غور تھی کہ عبدالملک کا انتقال ہوگیا۔ بعدازاں ولید بن عبدالملک مسندِ خلافت پر متمکن ہوا جس کے عہدِ خلافت میں تاریخ کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا جس نے عربوں کو تسخیرِ سندھ کی مہم پر مجبور کر دیا۔

اہم تاریخیں

۵۷۱ء	حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت
۶۲۲ء	سنِ ہجری کا آغاز، ہجرتِ مدینہ
۶۲۹ء	رسولِ کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں واپسی، چینی سیاح ہیون سانگ کی برصغیر میں آمد
۶۳۲ء	رسولِ کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال، حضرت ابوبکرؓ صدیق کا مسندِ خلافت پر متمکن ہونا۔
۶۳۴ء	حضرت ابوبکرؓ صدیق کا وصال اور حضرت عمر فاروقؓ کا خلیفۃ المسلمین بننا۔
۶۳۶ء	سواحلِ برصغیر پر عربوں کا پہلا حملہ، شام پر مسلمانوں کا قبضہ
۶۳۷ء	جنگِ قادسیہ اور ایران پر عربوں کا قبضہ
۶۳۸ء	یروشلم (بیت المقدس) پر حضرت عمر فاروقؓ کا قبضہ
۶۵۶ء	حضرت عثمانؓ خلیفہ ثالث کی شہادت اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا خلیفۃ الاسلام منتخب ہونا۔
۶۶۱ء	حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حضرت امیر معاویہؓ کا مسندِ خلافت پر بیٹھنا۔
۷۱۱ء	عربوں کا سپین فتح کرنا

امتحانی سوالات

۱۔ طلوعِ اسلام پر روشنی ڈالتے ہوئے، اسلام کے سیاسی اقتدار کا مختصراً جائزہ لیجئے۔
۲۔ عرب اور برصغیر کے ابتدائی تعلقات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔
۳۔ سندھ پر عرب حملہ سے قبل کی ابتدائی جھڑپوں کا حال قلم بند کیجئے۔
۴۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھئے۔
ا۔ برصغیر پاک و ہند کے ساتھ عربوں کے تعلقات ب۔ تھانہ (بمبئی) پر عرب حملہ
ج۔ محمد بن قاسم ثقفی

Marfat.com

تمہید باب

فتح سندھ

"سندھ میں اسلامی سلطنت کا قیام برصغیر اور اسلام کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے"[1]

ایم کیمبرج

"فتح سندھ اسلام اور تاریخ ہند کا محض ایک سانحہ تھا جس کے نتائج دور رس ثابت ہوئے"[2]

لین پول

سندھ کی وجہ تسمیہ

آریوں کی آمد سے قبل سندھ کے قدیم باشندے اس خطۂ زمین کو کیا کہتے تھے اس بارے میں ابھی تک تاریخ خموش ہے۔ مشہور مؤرخ ہنٹر کا قول ہے کہ آریہ قوم نے برصغیر پاک و ہند میں وارد ہونے کے بعد اس خطۂ زمین کو سندھ کا نام دیا۔ آریہ لوگوں نے جب دریائے سندھ کی وادی میں قدم رکھا تو انہوں نے اس کا نام "سندھو" رکھا۔ سندھو سنسکرت زبان میں بہت بڑے دریا کو کہتے ہیں۔ چونکہ دریائے سندھ اس زمانہ میں بھی ایک بہت بڑا دریا تھا، اس لئے انہوں نے اسکی مناسبت سے اس سرزمین کو پہلے سندھو اور پھر سندھ کہنا شروع کیا۔

سندھ کی تاریخ

سندھ کی قدیم تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ "چچ نامہ" سندھ کی قدیم تاریخ کا مستند ماخذ متصور ہوتا ہے۔ جسے سندھ میں عربوں کے عمل دخل کے بہت عرصہ بعد کسی تاریخ دان نے عربی زبان میں مرتب کیا اور جسے ناصرالدین قباچہ کے دور اقتدار میں فارسی زبان میں منتقل کیا گیا اور اس کا نام سندھ کے ایک سابق حکمران "چچ" کے نام پر "چچ نامہ" رکھا گیا۔ مصنف نے اپنے اس تاریخی شاہکار کا آغاز سندھ کے حکمران راجہ سہرس کے حالات سے کیا ہے۔ سندھ کا صدر مقام اروڑ (الور) تھا۔ راجہ سہرس سودرا خاندان کا چشم و چراغ اور بدھ مت کا پیروکار تھا۔ وہ ایک طاقتور حکمران تھا وہ ایک عرصہ تک امن و امان اور عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی کرتا رہا۔ ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول

---

[1] "اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان" جلد دوم صفحہ ۱۲

[2] "میڈیول انڈیا انڈر محمڈن رول" صفحہ ۱۱-۱۲

Marfat.com

میں ایران کے بادشاہ نیمروز نے اچانک سندھ پر حملہ کر دیا۔ مکران کے نواح میں راجہ سہرس اور شاہِ ایران نیمروز کے مابین گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ جسمیں راجہ سہرس تیر لگنے سے ہلاک ہوگیا۔ چنانچہ ارکینِ دولت نے راجہ سہرس کے لڑکے رائے ساہسی کو راج گدی پر بٹھا دیا۔ راجہ ساہسی کے درباریوں میں الور کے مندر کے برہمن بچارہی کا لڑکا چچ بھی تھا، جو بہت ہی زیرک اور باتدبیر شخص تھا۔ وہ اعلیٰ قابلیت، شیریں کلامی اور اخلاقِ پسندیدہ کی بنا پر پہلے دیوان اور پھر راجہ ساہسی کا وزیر بن گیا۔ راجہ نے اس کے اعلیٰ آداب اور شائستگی سے متاثر ہو کر اسے محل سرا میں بلا روک ٹوک آنے کی اجازت دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ دنوں بعد رانی سوہنن دیوی اس پر فریفتہ ہو گئی[1]۔ راجہ کی وفات کے بعد چچ نے رانی سوہنن دیوی کی مدد سے تخت پر قبضہ کر لیا اور رانی سے شادی کر لی۔ چچ ایک طاقتور حکمران اور مدبر سیاست دان تھا۔ اس نے بہت جلد باغی امراء اور گورنروں کو اطاعت گذار بنا کر ملک میں مکمل امن و امان قائم کیا۔ علاوہ ازیں ان تمام باجگذار راجگان کو جو راجہ ساہسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خود مختار ہو گئے تھے، از سرِ نو اپنا مطیع و منقاد بنایا اور مزید فتوحات حاصل کر کے حدودِ سلطنت کو کشمیر تک بڑھایا۔ چچ نے چالیس سال حکومت کرنے کے بعد ۶۹۰ء میں وفات پائی[2]۔

راجہ چندر ۶۹۰ء تا ۶۹۷ء

۶۹۰ء میں چچ کی وفات کے بعد اس کا بھائی چندر تختِ حکومت پر بیٹھا۔ یہ بدھ مت کا پیرو تھا اور اپنا زیادہ تر وقت عبادت اور برہمنوں کی صحبت میں گذارتا تھا۔ اس نے بدھ مت کو بزورِ شمشیر پھیلایا۔ اس سے اس کے خویش و اقارب جو ہندو مت کے پیرو تھے، اس کے خلاف ہو گئے اور باقاعدہ وفد کی شکل میں قنوج کے ہندو راجہ سہارس (بھیم سین) سے ملے اور اسے سندھ پر حملہ آور ہونے پر اکسایا۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا اور ناکام و نامراد واپس چلا گیا ۶۹۷ء میں راجہ چندر سات سال حکومت کرنے کے بعد اس دنیا سے چل بسا۔

راجہ داہر

راجہ چندر کی وفات کے بعد ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ الور کے تختِ حکومت پر چچ کا چھوٹا لڑکا داہر متمکن ہوا۔ اور برہمن آباد میں چندر کا لڑکا راج سرِ آرائے سلطنت ہوا۔ لیکن ایک سال بعد جب اس نے وفات پائی تو داہر کے بڑے بھائی دھر سنگھ نے برہمن آباد پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سندھ کے دو حصے ہو گئے۔ شمالی حصے پر داہر اور جنوبی پر دھر سنگھ قابض ہو گیا۔

راجہ داہر سخت گیر اور متشدد ہندو تھا۔ وہ اپنے ظالمانہ اور متکبرانہ رویہ کی وجہ سے اپنی رعایا میں غیر مقبول تھا۔ بدھوں سے اس کا سلوک انتہائی متعصبانہ اور غیر روادارانہ تھا۔ اس نے اپنی بہن رانی بائی سے شادی کر کے اپنے بھائی دھر سنگھ اور دوسرے رؤسائے سندھ کو اپنا دشمن بنا لیا، اور وہ اس کے خلاف صف آراء ہو گئے

---

[1] تاریخ سندھ صفحہ ۱۴

[2] چچ نامہ صفحہ ۲۳

58902

Marfat.com

مگر داہر نے اُن سب پر قابو پالیا۔ بعد میں رَن مل کے راجہ نے ایک لشکر جرار کے ساتھ قلعہ راوڑ پر حملہ کر دیا اور راجہ داہر کی مدافعت سے قبل ہی اس پر قبضہ کر لیا اور پھر دارالسلطنت الور کی طرف بڑھا۔ راجہ داہر سخت پریشان تھا کہ اس کے وزیر نے اسے محمد بن حارث علافی عرب سے مدد طلب کرنے کا مشورہ دیا جو یہاں سندھ میں پناہ گزین تھا۔ محمد بن حارث علافی عرب نے اپنے پانچ سو جانباز ساتھیوں کی مدد سے حملہ آور پر شبخون مار کر اسے بھگا دیا۔ داہر نے علافی کو اسکی خدمت کا صلہ دینا چاہا تو اس نے کہا کہ میرے کوئی بیٹا نہیں جس سے دنیا میں میرا نام چلے۔ آپ یہ حکم دیں کہ آئندہ آپ کی سلطنت میں جو سکے مضروب ہوں اُن پر ایک طرف میرا نام ہو اور دوسری طرف آپ کا۔ تاکہ ہند و سندھ میں میرا نام ہمیشہ یادگار رہے۔ چنانچہ یہ حکم دے دیا گیا[1] ۷۱۰ء میں خلافتِ اسلامیہ سے داہر کی ان بن ہوگئی اور محمد بن قاسم نے ایک جرار لشکر سے اس کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا۔ چنانچہ ۱۰ رمضان ۹۳ھ (۲۰ جون ۷۱۲ء) میں پندرہ سال حکومت کرنے کے بعد راجہ داہر عربوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سندھ میں ہندوؤں کی حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

سندھ پر عرب حملہ کی وجوہات

۱۔ ۷۰۳ء میں قبیلہ بنی آسار کے سردار محمد بن حارث علافی نے مکران کے گورنر سعید بن اسلم بن زرعہ کو قتل کر دیا اور پھر اپنے قبیلے کے پانچ سو آدمیوں کو لے کر عمان کی راہ سندھ پہنچ کر راجہ داہر کے ہاں پناہ گزین ہوگیا۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے ان باغیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن راجہ داہر نے اس مطالبہ کو رد کر دیا۔

۲۔ سندھ کی بیشتر آبادی بدھ مت کی پیرو تھی لیکن راجہ داہر اور ارکان حکومت ہندو مت کے پیرو تھے۔ راجہ کا سلوک بدھ مت کے پیروؤں کے ساتھ سخت ناروا تھا وہ اکثر انہیں مذہبی تعصب اور ظلم و استبداد کا شکار بناتا رہتا تھا۔ اس پر بدھ مت کے پیروؤں کے وفود حکومتِ اسلامیہ کے مشرقی ممالک کے والی حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس پہنچے اور اسے سندھ پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔

۳۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دورِ خلافت میں چہار دانگ عالم میں مسلمانوں کی فتوحات کا شہرہ تھا اور دنیا کا ہر فرمانروا خلیفۂ اسلام سے دوستی کا متمنی تھا۔ سراندیپ (لنکا) کا راجہ بھی انہی میں سے ایک تھا۔ سراندیپ کا روزافزوں تمول عرب تاجروں کا مرہونِ احسان تھا جو وہاں عرصہ سے آباد تھے۔ راجہ نے آٹھ جہازوں پر مشتمل ایک بیڑہ تیار کیا اور خلیفۂ اسلام کی خدمت میں بھجوانے کے لئے بیش بہا تحائف اُن جہازوں میں بار کئے۔ علاوہ ازیں سراندیپ کے رہنے والے بہت سے مسلمانوں کو ان جہازوں میں سوار کیا تاکہ وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوں اور ان کے ساتھ بعض مرحوم عرب تاجروں کی بیواؤں اور یتیموں کو بھی سوار کرا دیا۔ تاکہ وہ عرب پہنچ جائیں۔ راجہ کو اس اقدام سے خلیفۃ الاسلام

---

[1] چچ نامہ و تاریخِ معصومی

Marfat.com

کی خوشنودی اور دوستی حاصل کرنا مقصود تھا۔ یہ جہاز جب سندھ کی مشہور بندرگاہ دیبل کے قریب پہنچے تو سندھ کے بحری قزاقوں نے ان کو لوٹ لیا اور عورتوں، بچوں کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا۔ یہ سندھی قزاق "مید" کے قوم کے لوگ تھے۔ دیبل اُن کی جائے پناہ تھی۔

ان قیدیوں میں سے قبیلہ یربوع کی ایک عورت بے اختیار پکار اٹھی: "یا حجاج اغثنی" (اے حجاج! ہماری فریاد کو پہنچ) جب اسکی خبر حجاج کو ہوئی تو وہ جوشِ غضب سے بیتاب ہوگیا اور انتہائی جوش میں پکارا کہ "ہاں میں آیا"۔ تاہم اس نے نہایت نرمی سے ایک خط کے ذریعہ راجہ داہر سے سلمان کی واپسی اور قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ داہر نے نہایت گستاخانہ اور غیر ذمہ دارانہ جواب دیا کہ جہازوں کو لوٹنے والوں پر خود ہماری گرفت نہیں، تم خود آکر اپنے قیدی چھڑا لو اور اپنے تحائف و اموال واپس لے لو۔

"حجاج بن یوسف نے خلیفۂ وقت ولید بن عبدالملک سے سندھ پر فوج کشی کی اجازت طلب کی۔ خلیفہ نے اجازت دینے میں تذبذب کا مظاہرہ کیا تو حجاج نے وعدہ کیا کہ جس قدر رقم خزانۂ عامرہ سے اس مہم پر صرف ہوگی، میں اس کا دوگنا خزانہ میں داخل کروں گا"[1]

اجازت ملنے پر حجاج نے ۷۱۰ء میں ایک مہم عبیداللہ کی زیر سرکردگی روانہ کی جو دیبل تک حملہ آور ہوئی لیکن ناکام رہی اور سپہ سالار عبیداللہ میدان جنگ میں شہید ہوگیا[2]۔ ازاں بعد بدیل بن طہفہ بجلی کو اس مہم پر مامور کیا گیا۔ مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوسکا اور شہید ہوگیا۔

محمد بن قاسم

حجاج بن یوسف ثقفی کو سندھ کے خلاف فوجی کارروائیوں میں ابتدائی ناکامیوں کا سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اس نے اپنے بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم ثقفی کو جو سترہ سال کی عمر کا ایک صالح اور بہادر نوجوان تھا اور فہم و فراست، عسکری ذہانت اور جرأت و شجاعت کا پیکر تھا، سندھ کی مہم پر مامور کیا۔ چھ ہزار شامی اور چھ ہزار عراقی مجاہد اور تین ہزار بار برداری کے اونٹ اس کے سپرد کیے۔ علاوہ ازیں بصرہ سے جہازوں کا ایک بیڑا بھی دیبل کو روانہ کیا جو سامانِ رسد اور قلعہ شکن منجنیقوں[3] سے لدا ہوا تھا۔ حجاج نے اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے کوفہ سے سندھ تک برق سوار شتر سواروں کی چوکیاں بٹھا دیں تاکہ مہم کی پل پل کی خبریں اس تک پہنچ سکیں۔ اور اس کے مطابق مناسب احکامات جاری کئے جاسکیں۔ اس ذریعہ سے سات دن میں کوفہ سے محمد بن قاسم کے مراسلہ کا جواب سندھ تک پہنچ جاتا تھا۔

---

[1] یعقوبی (جلد اوّل) صفحہ ۳۴۸ (لیڈن)

[2] بلاذری صفحہ ۴۳۵ (لیڈن)

[3] منجنیق ایک قسم کی توپ تھی جسمیں پتھر رکھ کر پھینکے جاتے تھے۔ محاصرہ کے دوران قلعہ کی دیواروں اور دروازوں پر اس سے سنگ باری کی جاتی تھی۔

Marfat.com

فتوحات

فتح دیبل

(۱)

۷۱۲ء بروز جمعہ بمطابق ۹۳ھ میں محمد بن قاسم مکران اور ارمابیل کے راستے دیبل پہنچا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ دیبل سندھ کی ایک مشہور بندرگاہ تھی۔ یہ شہر میں بدھوں کا مرکز تھا۔ یہاں ایک پختہ قلعہ تھا جس کے وسط میں ایک مندر تھا۔ اس مندر کے کلس پر ایک سرخ رنگ کا جھنڈا ہر وقت لہراتا رہتا تھا جو ہوا کی گردش سے تمام شہر پر چاروں طرف گھومتا تھا۔ یہ سرخ پرچم عوام کا مرجع عقیدت تھا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ جب تک یہ جھنڈا مندر کے کلس پر لہراتا رہیگا دشمن ان کے شہر پر قابض نہیں ہو سکتا۔ حجاج نے محمد بن قاسم کو مشورہ دیا کہ منجنیق سے مندر پر سنگ باری کر کے کلس کو توڑ دیا جائے۔ چنانچہ عروس نامی ایک بہت بڑی منجنیق سے سنگ باری کر کے کلس کو توڑ کر جھنڈے کو گرا دیا گیا۔ اس سے ضعیف الاعتقاد محصورین کے حوصلے پست ہو گئے۔ آخر گھمسان کی جنگ کے بعد دیبل پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور اس پر اسلامی پرچم لہرا دیا گیا۔ یہ لشکرِ اسلام کی پہلی فتح تھی۔

مسلمان قیدیوں کو جن کے باعث جنگ شروع ہوئی تھی، قید و بند سے آزاد کر کے اُن کے آرام و آسائش کا انتظام کیا۔ جیل کے محافظ (جیلر) نے جس کا نام قبلہ تھا اور بدھ مت کا پیرو تھا دوران قید مسلمان قیدیوں سے نہایت اچھا سلوک کیا تھا۔ محمد بن قاسم نے اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ قبلہ بڑا ہنر مند اور لائق افسر تھا اس نے اسلام قبول کر لیا۔ محمد بن قاسم نے اسے دیبل کی نیابت اور انتظام پر مامور کیا۔ ابن قاسم نے یہاں (دیبل میں) ایک جامع مسجد کی بنیاد رکھی اور چار ہزار مسلمان گھرانے آباد کئے [1]

فتح نیرون

دیبل میں امن و امان اور نظم و ضبط قائم کرنے کے بعد محمد بن قاسم نیرون کی طرف بڑھا جو دیبل سے تین دن کی مسافت پر موجودہ حیدر آباد کے جنوب میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ نیرون کی آبادی بدھ مت کے ماننے والوں پر مشتمل تھی اور یہاں کا حاکم بھی بدھ مت کا پیرو تھا۔ جس نے بغیر دار کو خبر کئے ایک وفد حجاج کی خدمت میں بھیج کر اپنے لوگوں کے لئے امان کا پروانہ حاصل کر لیا تھا۔ اس لئے جب محمد بن قاسم کی فوج قریب پہنچی تو اس نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ محمد بن قاسم کا استقبال کیا اور اسے ہر طرح سے وفاداری کا یقین دلایا۔ نیز اسلامی لشکر کے لئے سامانِ رسد کا پورا انتظام کیا۔ محمد بن قاسم نے بھی اسے خلعت سے سرفراز کر کے اسکی عزت افزائی کی۔ نیرون میں بھی ابنِ قاسم نے ایک مسجد

---

[1] بلاذری، فتوح البلدان، صفحہ ۴۲۴ (لیڈن)

Marfat.com

تعمیر کروائی جس میں باقاعدہ امام مقرر کر کے پنجگانہ نماز کا اہتمام کیا اور حالات کی نگرانی اور احتساب کے لئے محمد ذہلی بصری کو کوتوالِ شہر مقرر کیا[1]

(3) فتح سیوستان

نیرون پر قبضہ کرنے کے بعد محمد بن قاسم سیوستان (سہوان) کی طرف بڑھا۔ ہبری کے لئے نیرون کا حاکم بھدرکن اس کے ساتھ تھا۔ نیرون اور سیوستان کے درمیان واقع بہرج کے عوام کو اطاعت گزار بناتا ہوا محمد بن قاسم سیوستان پہنچ گیا۔ جس پر اس وقت راجہ داہر کے چچا چندر کا بیٹا بجے رائے (بجرا) حکمران تھا۔ سیوستان کی بدھ آبادی نے حاکم شہر بجے رائے (بجرا) سے کہا کہ ہمارا مذہب امن کی تلقین کرتا ہے ہم لڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ حملہ آوروں کو حجاج کا فرمان ہے کہ جو بھی امان مانگے اُسے امان دو، تم کہو تو ہم اُن سے صلح کی گفت و شنید کریں۔ اہل عرب اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں۔ بجے رائے نہ مانا اور جنگ کے لئے تیاری کرنے لگا۔ محمد بن قاسم کو مخبروں کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ سیوستان کے لوگ جنگ کے لئے متفق نہیں۔ شہر کے عوام نے بھی اسے کہلا بھیجا کہ ہم لڑائی نہیں چاہتے۔ آخر حاکم شہر بجے رائے نے جب دیکھا کہ لوگ اس کے ساتھ نہیں ہیں تو ایک ہفتہ تک مقابلہ کرنے کے بعد رات کو قلعہ سے نکل بھاگا۔ اہل شہر نے محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کر لی۔ اس نے لوگوں سے روادارانہ سلوک کیا۔

(4) فتح سیسم

سیوستان کی حفاظت کے لئے تھوڑی سی فوج متعین کر کے محمد بن قاسم نے سیسم کا رخ کیا۔ راستے میں کاکو تک حاکم بدھیا اپنے تمام ماتحت سرداروں اور دوستوں کو ساتھ لے کر سپہ سالارِ اسلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا یقین دلا کر اطاعت گزار رہا۔ محمد بن قاسم نے بھی اسکی بہت عزت افزائی کی اور خلعت سے سرفراز کیا۔ آئندہ فتوحات میں اس کے مشوروں سے بڑی مدد ملی[2]

محمد بن قاسم بدھیا کا انتظام و انصرام کاکو تک کے سپرد کر کے قلعہ سیسم پر حملہ آور ہوا۔ سیسم میں بجے رائے پناہ گزین تھا اس نے اسلامی لشکر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن شکست سے دوچار ہو کر میدان جنگ میں کام آیا۔ اس کی افواج نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ سیسم کے لوگوں پر خراج عائد کر کے اور اُن کے اطمینان کے لئے ایک عہد نامہ انہیں لکھ کر دیا۔ حمید بن وداع اور عبدالقیس جارودی کو ان پر حاکم مقرر کیا گیا[3]

(5) راجہ داہر سے جنگ

فتحِ سیسم کے بعد محمد بن قاسم آگے بڑھنے ہی کو تھا کہ حجاج کا حکم پہنچا کہ نیرون واپس آ کر مہران (دریائے سندھ) کو عبور کر کے راجہ داہر کی

---

[1] سید ابوظفر ندوی، تاریخ سندھ، صفحہ ۵۰-۴۹

[2] ایضاً صفحہ ۵۵

[3] چچ نامہ صفحہ ۵۴

Marfat.com

طرف پیش قدمی کرو اور راجہ داہر سے فیصلہ کن جنگ کرو۔ چنانچہ لشکرِ اسلام نیرون واپس آگیا اور دریا کو عبور کرنے کے انتظامات میں مصروف ہوگیا۔ اسی اثنا میں کوفہ سے دو ہزار تازہ دم فوج کی کمک بھی پہنچ گئی۔ ساتھ ہی بیت کے راجہ موکا بسیا نے محمد بن قاسم کی مسلسل فتوحات اور حسنِ اخلاق کی وجہ سے متاثر ہو کر اطاعت قبول کرلی۔ اس نے لشکر کی رہنمائی اور دریا کو عبور کرنے کے لیے بیشمار کشتیوں کی فراہمی کا کام اپنے ذمہ لیا۔ داہر ابھی تک اسی گمان میں تھا کہ محمد بن قاسم واپس چلا جائے گا۔ اس لئے اس نے مدافعت کی بھی کوئی تیاری نہ کی تھی۔ محمد بن قاسم نے داہر کو آخری بار اطاعت گذاری کا مشورہ دیا لیکن اس نے حسب سابق اس مشورے کو ٹھکرا دیا۔ اب محمد بن قاسم نے کمال عجلت سے دریا پر کشتیوں کا ایک پل باندھ کر اپنی پوری فوج کو معہ ساز و سامان پار اتار دیا۔ اس سے پریشان ہوکر راجہ داہر راوڑ[1] سے باہر نکلا اور پانچ ہزار گھوڑ سوار، بیس ہزار پیادہ فوج جو سر سے پاؤں تک زرہ بکتر پہنے ہوئے تھی، اور ایک سو جنگی ہاتھیوں کی معیت میں مقابلہ پر آیا۔ محمد بن قاسم نے اپنی افواج کو اہم ناکوں پر اس طرح متعین کیا کہ راجہ داہر کو ملتان یا الور سے کوئی کمک نہ مل سکے

۱۰ رمضان المبارک ۹۳ھ کی صبح کو دونوں فوجیں میدان جنگ میں صف آرا ہوئیں۔ داہر کا لڑکا جَیسیہ (جے سنگھ) دس ہزار سواروں کے ساتھ قلب میں کھڑا ہوا۔ داہر جنگی ہاتھیوں کے جلو میں ایک کوہ پیکر سفید ہاتھی پر سوار تھا۔ محمد بن قاسم نے دشمن کی بھاری جمعیت کے پیش نظر اپنی فوج کو جدید طریقہ سے ترتیب دیا۔ میمنہ اور میسرہ پر علی الترتیب حنظلہ کلابی اور ذکوان ابن علوان نمری کو مقرر کیا۔ خود قلب لشکر میں موجود رہا۔ ابو صابرہ ہمدانی کو خصوصیت سے ہاتھیوں کے مقابل رکھا۔ سواروں کے تین حصے کئے۔ ایک قلب میں، دوسرا میمنہ اور تیسرا میسرہ میں رکھا۔ اسی طرح نفت (ایک آتش گیر مادہ) اندازوں کو جن کی تعداد نو سو تھی، تین حصوں میں تقسیم کیا۔ نماز صبح ادا کرنے کے بعد لشکرِ اسلام کے سپہ سالار نے اپنی افواج کو یوں مخاطب کیا۔

"اے عربی نژاد لوگو! تم اپنے وطن اور اہل و عیال سے علیحدہ ہوکر اس سرزمین میں آئے ہو، جہاں تمہارے دشمن تم سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے اس لئے سارا بھروسہ خدا پر رکھو، وہی کامیابی عطا کرنے والا ہے۔ جب جنگ شروع ہو تو ہر شخص کو اپنے فرائض کا خیال رکھنا چاہیئے"[2]

جنگ کا آغاز ہوا۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ عربوں نے جنگی ہاتھیوں سے بچنے کے لئے پچکاریوں سے اُن پر روغنِ نفت پھینکنا شروع کیا۔ ہاتھی اس سے ڈر کر پیچھے بھاگے اور راجہ پورس کے ہاتھیوں کی مانند

---

[1] ٹاکٹر داؤد پوتہ کی رائے ہے کہ راوڑ وہیں آباد تھا جہاں ہوتی حیدر آباد (سندھ) واقع ہے۔

[2] تاریخِ سندھ صفحہ ۱۷

Marfat.com

اپنے ہی لشکر میں تباہی مچانے لگے۔ اس افراتفری میں لشکر اسلام کے نیزہ باز اور تیر انداز دشمن پر پل پڑے۔ اسی اثنا میں ایک نفت بردار نے داہر کے ہاتھی پر روغن پھینکا جس سے وہ سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلا اور دریا میں جا گھسا۔ داہر بمشکل جان بچا کر قلعہ راوڑ میں پناہ گزین ہوا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ اس کے اکثر اعزّہ واقارب اور بڑے بڑے سردار مارے جا چکے ہیں، وہ قلعہ سے باہر نکل کر پیادہ پا ہی تلوار سونت کر عربوں سے لڑنے لگا آخر غروبِ آفتاب کے قریب ایک عرب نے تلوار کا ایک بھرپور وار کر کے اس کی گردن تن سے جدا کر دی اس طرح راجہ داہر کے اقبال کا آفتاب ۱۰ رمضان ۹۳ھ بمطابق ۲۰ جون ۷۱۲ء کو ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا۔

(۶) قلعہ راوڑ کی فتح

شکست خوردہ سندھی فوج نے بھاگ کر قلعہ راوڑ کی پناہ لی۔ داہر کے لڑکے جیسیہ (جے سنگھ) اور اس کی بیوی اور بہن رانی بائی نے قلعہ بند ہو کر لڑائی کو جاری رکھا۔ عربوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ جے سنگھ میں مقابلہ کی سکت نہ رہی تو موقع پا کر برہمن آباد بھاگ گیا۔ رانی کچھ عرصہ تک مقابلہ میں ڈٹی رہی لیکن عرب آتش بازوں اور سنگ اندازوں کی کوشش سے قلعہ کی فصیل میں شگاف پڑ گئے۔ اس پر رانی بائی اپنے آپ کو بے بس پا کر رسمِ جوہر[1] ادا کرتے ہوئے بہت سی دیگر عورتوں سمیت چتا میں بیٹھ کر زندہ جل مری اور قلعہ پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔

راجہ داہر کا وزیر بدھی ساگر (سیاگر) ایک عقلمند، دور اندیش اور مدبر انسان تھا۔ وہ پہلے ہی راجہ کے سلوک سے بد دل تھا۔ اس نے محمد قاسم کی اطاعت قبول کر لی۔ اسی کی وساطت سے باقیماندہ مغویہ اور گرفتار شدہ عرب عورتوں اور بچوں کو رہائی ملی۔ محمد بن قاسم نے اس کے طرزِ عمل کو بنظرِ استحسان دیکھا اور اسے اپنا معتمدِ خاص بنا لیا۔

(۷) برہمن آباد کی فتح

راجہ داہر کا لڑکا جے سنگھ (جیسیہ) چالیس ہزار سپاہ کے ساتھ برہمن[2] آباد میں مورچہ بند تھا۔ عربوں نے وہاں پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ چھ ماہ تک جاری رہا۔ شہر کے لوگ محاصرہ سے پریشان ہو چکے تھے۔ تجار نے خفیہ طور پر بات چیت کر کے غیر فوجی آبادی کے لئے امان مانگی۔ محمد بن قاسم نے موکا بسیا سے مشورہ کر کے اور حجاج سے اجازت لینے کے بعد ان لوگوں سے معاملہ طے کر لیا۔ چنانچہ لشکر اسلام نے جب حملہ کیا تو انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ محمد بن قاسم نے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور حکم جاری کیا کہ ہتھیار بند افواج کے علاوہ کسی کو تہ تیغ نہ کیا جائے۔ صنعت کاروں، تاجروں اور عام لوگوں کو امان دی گئی۔ قیدیوں کو آزاد کر دیا گیا۔

کئی ایک قدیم تاریخی کتب اور تاریخ سندھ میں چچ نامہ کے حوالہ سے راجہ داہر کی رانی لاڈی کے متعلق

---

[1] ایک راجپوتی رسم

[2] برہمن آباد موجودہ حیدر آباد سندھ سے پچاس میل دور شمال مشرق میں واقع ہے۔

Marfat.com

لکھا ہے کہ برہمن آباد میں جب رانی لاڈی گرفتار ہو کر محمد بن قاسم کے حضور پیش ہوئی تو محمد بن قاسم نے سیاسی مصلحت کی بنا پر اس سے شادی کر لینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ اس کی اطلاع حجاج بن یوسف کو دی گئی اور پھر حجاج اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کی اجازت سے محمد بن قاسم نے اس سے شادی کر لی۔ برہمن آباد کی فتح سے لشکرِ اسلام کے حوصلے بڑھ گئے اور بقیہ سندھ کی تسخیر کا کام اُن کے لئے آسان ہو گیا۔ برہمن آباد میں ہی راجہ داہر کی دو لڑکیاں محمد بن قاسم کے ہاتھ آئیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بعد میں اس بہادر جرنیل کی موت کا باعث ہوئیں۔

(۸)

اروڑ کی فتح

اروڑ[1] (الور) پر راجہ داہر کا لڑکا فونی (گوپی) قابض تھا جس نے لوگوں کو یقین دلا رکھا تھا کہ اس کا باپ داہر زندہ ہے اور راجگانِ ہند سے مدد لینے ہندوستان گیا ہوا ہے۔ عربوں نے آگے بڑھ کر شہر اُڑور کا محاصرہ کر لیا۔ خوب گھمسان کا رَن پڑا۔ اہلِ شہر کو جب راجہ داہر کی موت کا علم ہوا تو وہ لڑائی سے بددل ہو گئے۔ انہوں نے محمد بن قاسم کی رواداری اور وسیع القلبی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس پر فونی قلعہ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اہلِ شہر نے محمد بن قاسم کو صلح و امن کا پیغام بھیجا اور بدھ کے مندر کو نقصان نہ پہنچانے کی یقین دہانی چاہی جسے ابن قاسم نے قبول کر لیا۔ لشکرِ اسلام قلعہ میں داخل ہو گیا۔ مسلح فوجیوں کے علاوہ سب کو امان دی گئی۔

(۹)

فتح باتیہ[2]

اُڑور کی فتح کے بعد لشکرِ اسلام نے آگے بڑھ کر قلعہ باتیہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں کا حاکم گگسہ راجہ داہر کا چچازاد بھائی تھا۔ اس نے محمد بن قاسم کی خدمت میں اپنے چند امرائے خاص کو تحائف دے کر بھیجا اور اطاعت قبول کر لی۔ محمد بن قاسم نے کمال دانشمندی سے کام لیتے ہوئے گگسہ کو نہ صرف امان دی بلکہ اسے امورِ ملکی میں اپنا مشیر اور وزیر بنا لیا نیز اسے مبارک مشیر کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔ گگسہ نے شمالی سندھ (موجودہ جنوبی پنجاب) کی فتح میں محمد بن قاسم کی ویسی ہی مدد و اعانت کی جیسی سی ساگر نے جنوبی سندھ کی تسخیر میں کی تھی۔ اسی علاقہ میں محمد بن قاسم نے دریائے ستلج کو عبور کر کے سات روز کی خونریز جنگ کے بعد اسکلندہ پر قبضہ کیا جو موجودہ اُچ کے مقام پر واقع تھا۔ بعد ازاں اس نے سترہ روز کی جنگ کے بعد سکہ کو فتح کیا جو ملتان کے نزدیک دریائے راوی پر کنارے پر واقع تھا۔

(۱۰)

فتح ملتان

ملتان کا صوبہ بھی راجہ داہر کی سلطنت کا ایک حصہ تھا اور صنعت و تجارت کا ایک مشہور مرکز تھا۔ یہاں اسکلندہ کے حاکم کے علاوہ متعدد شکست خوردہ سردار پناہ گزین تھے۔ راجہ داہر کا چچیرا

---

[1] عربی کتابوں میں اسے الرور لکھا ہے۔ اس کے کھنڈرات موجودہ روہڑی کے قریب پائے جاتے ہیں۔
(داؤد پوتہ "چچ نامہ" صفحہ ۲۵۱)

[2] باتیہ موجودہ بہاولپور کے قرب و جوار میں واقع تھا۔

Marfat.com

بھائی گورسنگھ یہاں کا حاکم تھا۔ اس نے دو ماہ محصور رہ کر لشکر اسلام کا مقابلہ کیا۔ لیکن بالآخر بھاگ کھڑا ہوا اور مسلمانوں نے بزورِ شمشیر ملتان کو فتح کر لیا۔ قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد اہل شہر کو معافی اور امان عطا کی گئی۔ ملتان سے بیشمار مال و زر ابن قاسم کے ہاتھ لگا جس کا پانچواں حصہ کشتی کے ذریعہ دیبل کے راستے عراق روانہ کیا گیا، جسے دیکھ کر حجاج بہت خوش ہوا اور بیساختہ پکار اٹھا کہ اب ہمارا غصہ فرو ہوا کیونکہ صرف شدہ رقم کا دوگنا خزانہ میں داخل ہوا۔ چھ کروڑ درہم اور داہر کا سر ہم کو نفع میں ملا[1]

ملتان کے آگے دریائے جہلم پر ایک قلعہ برہمانپور کے نام سے مشہور تھا۔ وہاں کے حاکم نے ملتان کی حالت کو دیکھتے ہوئے خود بخود اطاعت قبول کر لی۔ محمد بن قاسم نے برہمانپور کے سرحدی مقام سمجھ کر حزیم بن عبدالملک تمیمی کو یہاں کا والی مقرر کیا۔ علاوہ ازیں ملتان کے گرد و نواح میں قلعوں پر مختلف معتبر آدمی بطور حاکم متعین کئے۔

ملتان کی فتح سے راجہ داہر کے تمام مقبوضات مسلمانوں کے تصرف میں آ چکے تھے۔ چنانچہ شمال میں کشمیر کی سرحد جنوب میں بحیرۂ عرب، مغرب میں بلوچستان (مکران) اور مشرق میں دریائے راوی تک کے علاقوں پر اسلامی پرچم لہرانے لگا مقبوضہ علاقوں میں امن و امان اور نظم و نسق بحال کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے

(۱۱) قنوج کی تسخیر کا عزم

قنوج کی تسخیر کا ارادہ کیا۔ یہاں کا راجہ رائے ہرچند مہاراجہ ہرش کی نسل سے تھا اور خود مختار تھا۔ محمد بن قاسم نے خلیفۂ اسلام کی اجازت سے دس ہزار فوج کے ساتھ ابو حکیم شیبانی کو سفیر بنا کر راجہ کے دربار میں روانہ کیا لیکن وہ اودے پور سے آگے نہ جا سکا۔ اگرچہ تاریخ اسکی وجوہ کے سلسلے میں خاموش ہے لیکن اغلب قیاس یہی ہے کہ وہاں کے راجہ نے غیر ملکی فوج کو اپنے ملک میں راستہ دینے سے انکار کر دیا ہوگا اس لئے اس نے وہیں قیام پذیر ہو کر اپنی طرف سے زید بن عمر کلابی کو سفارت پر مامور کیا۔ جس نے دربارِ قنوج میں پہنچ کر خلیفہ کا مکتوب پیش کرنے کے علاوہ راجہ کو قبول اسلام کی دعوت دی رائے ہرچند نے اس زعم میں کہ اس کا خاندان سینکڑوں سال سے برسرِ اقتدار ہے اور اسکی سلطنت شمالی ہند کی سب سے بڑی سلطنت ہے، اس دعوت کو رد کر دیا۔ محمد بن قاسم نے فوج کے چیدہ چیدہ افسران سے مشورہ کر کے قنوج پر فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ وہ تیاری میں مصروف تھا کہ اسے حجاج بن یوسف ثقفی جو اس کا مربی تھا کی وفات کی خبر پہنچی۔ اس سے اس نے قنوج کی تسخیر کا ارادہ ترک کر دیا اور ملتان سے اودے چلا گیا۔ تاکہ دارالخلافہ سے قریب تر رہے۔

محمد بن قاسم کا انجام

شوال ۹۵ھ (۷۱۴ء) میں حجاج بن یوسف نے وفات پائی۔ حجاج خلافتِ اموی کے تمام مشرقی صوبوں کا نائب السلطنت تھا۔ عراق، ایران، ترکستان، خراسان اور سندھ کے جملہ مفتوحہ علاقے اس کے زیر نگیں تھے۔ اس وقت عرب دو گروہوں (یمنی اور بنو قیس) میں بٹے ہوئے تھے۔ حجاج بنو قیس کا سرپرست تھا اور اس کے ہاتھوں یمنی گروپ کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ محمد بن قاسم کو فکر یہ تھی کہ دیکھئے، بلادِ

---

[1] بلاذری، فتوح البلدان، صفحہ ۴۴۰

Marfat.com

شرقیہ کی نیابت پر کون متعین ہوتا ہے۔ لیکن حجاج کی وفات کے آٹھ ماہ بعد جمادی الثانی ۹۶ ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا (۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) دمشق میں انتقال ہوگیا اور اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک (۷۱۵ء تا ۷۱۷ء) مسند خلافت پر بیٹھا نئے خلیفہ سلیمان کو حجاج سے بعض معاملات کے بارے میں اختلاف تھا۔ عنانِ خلافت سنبھالتے ہی اس نے اپنے مخالفین سے انتقام لینے کی ٹھانی۔ اس کا سب سے بڑا دشمن حجاج بن یوسف تو مر چکا تھا۔ البتہ اس کے دو معتمد گورنر قتیبہ بن مسلم گورنر ترکستان اور محمد بن قاسم گورنر سندھ زندہ تھے اس لئے ان دونوں کو انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ سلیمان بن عبدالملک نے یزید بن مہلب کو حجاج کی جگہ عراق کا والی مقرر کیا جو حجاج اور اس کے خاندان کا دیرینہ دشمن تھا۔ چنانچہ یزید بن مہلب نے حجاج کے اعزہ کو پکڑ کر قتل اور قید کرنا شروع کر دیا۔

اسی ضمن میں محمد بن قاسم بھی مجرم قرار پایا اور سندھ کی گورنری سے معزول کر دیا گیا۔ اسکی جگہ یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو سندھ کا والی مقرر کیا گیا۔ جس نے سندھ پہنچ کر محمد بن قاسم کو گرفتار کر لیا اور مجرموں کی طرح ٹاٹ کے کپڑے پہنا کر پابجولاں معاویہ بن مہلب کے ساتھ عراق روانہ کر دیا اور محمد بن قاسم نے افسوس کے لہجہ میں کہا:

اَضَاعُوْنِیْ وَاَیَّ فَتًی اَضَاعُوْا لِیَوْمِ کَرِیْهَةٍ وَسِدَادِ ثَغْرٍ[1]

لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کس جوان کو ضائع کیا جو مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کی مضبوطی کے لئے نہایت مناسب ہو۔

عراق میں اسے کوفہ اور بصرہ کے درمیان واقع واسط کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ قید میں محمد بن قاسم کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ بالآخر سندھ کے عظیم فاتح اور اسلام کے جواں سال سپہ سالار نے قید ہی میں وفات پائی محمد بن قاسم کی موت پر برصغیر پاک و ہند اور عرب کے لوگ خون کے آنسو روئے۔ چنانچہ اس کے مرثیہ میں ایک عربی شاعر حمزہ بن بیض الحنفی کہتا ہے۔

اِنَّ الشَّجَاعَةَ وَالسَّمَاحَةَ وَالنَّدٰی لِمُحَمَّدِ بْنِ الْقَاسِمِ اِبْنِ مُحَمَّدٍ

قَادَ الْجُیُوْشَ بِسَبْعَ عَشْرَةَ حِجَّةً یَا قُرْبَ ذٰلِکَ سُؤْدَدًا مِنْ مَّوْلِدٍ[2]

بہادری، دل کی بڑائی اور فیاضی محمد بن قاسم کے حصے میں تھیں۔ وہ سترہ ہی سال کی عمر میں فوجوں کا سردار بن گیا۔ یہ سرداری زمانہ ولادت سے کس قدر قریب تھی (کس قدر جلد سردار بن گیا)

محمد بن قاسم صرف حجاج کا قریبی رشتہ دار ہونے کی بنا پر نئے خلیفہ کے انتقام کا نشانہ بنا اسطرح تاریخ اسلام کی ایک نہایت ہونہار شخصیت کا رشتۂ حیات قبل از وقت منقطع ہوگیا۔ یہ امر خاص طور پہ قابل ذکر ہے کہ یہ جاننے کے باوجود کہ واپس جانا موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے، اس نے حکم امیر پہ بے چون و چرا عمل کر کے تاریخ

---

[1] بلاذری۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۰۴ لیڈن

[2] مولانا سید ابوظفر تاریخ سندھ صفحہ ۱۲۳

Marfat.com

میں اطاعتِ امیر کی ایک مثال قائم کر دی۔ جب اسے پابجولاں واپس لایا جا رہا تھا تو جس شہر یا قصبہ کے پاس سے گزرتا لوگ اس کا استقبال کرتے بلکہ زار و قطار روتے تھے وہ اس قدر ہر دل عزیز اور معروف تھا کہ اہلِ سندھ نے گیرج کے مقام پر اس کا مجسمہ (مورتی) بنا کر نصب کیا اور اسکی باقاعدہ پرستش کرنے لگے۔

محمد بن قاسم کا کردار

فاتح سندھ محمد بن قاسم سترہ سال کا ایک نوجوان تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں اسلامی عساکر کا سپہ سالار بنایا جانا ہی اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ محمد بن قاسم فہم و فراست کا پیکر اور زبردست عسکری قابلیت کا مالک تھا وہ ایک بلند حوصلہ سپہ سالار، ایک باکمال قائد اور ایک پختہ کار مدبر سیاستدان تھا۔ سندھ میں اسکی حیرت انگیز فتوحات نے بلاشبہ اسے دنیا کے عظیم فاتحین کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ فارس کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ وہ محض ایک فاتح ہی نہ تھا بلکہ ایک اعلیٰ درجے کا منتظم بھی تھا۔ فتوحات کے دوران اس نے سندھیوں کے ساتھ مہذبانہ اور مشفقانہ سلوک کر کے بڑی دانشمندی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا اس سے وہ اس کے نہ صرف گرویدہ ہو گئے بلکہ اسے نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقوں میں امن و امان اور نظم و ضبط کو بحال کر کے ایک ایسا مثالی نظامِ حکومت نافذ کیا جو عدل و انصاف اور فلاح و بہبود کے اصولوں پر مبنی تھا اور جو برصغیر کے ترک حکمرانوں کے لیے مشعلِ راہ بنا۔ اس نے اپنی انتظامی حکمت عملی کی وضاحت کرتے ہوئے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ راعی اور رعایا کے تعلقات دیانتداری پر مبنی ہونے چاہئیں۔ مالیہ استطاعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس نے سندھی عوام کو ظالم حکمران کی حکومت سے نجات دلا کر حقیقی آزادی اور مساوات عطا کی نیز اعلیٰ و ادنیٰ کے امتیاز کو ختم کر کے سب کے لئے اطمینان اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے مواقع پیدا کئے۔

محمد بن قاسم میدان کارزار کا محض ایک شہسوار ہی نہ تھا بلکہ وہ بلند پایہ شخصیت کا مالک ایک فرض شناس انصاف پسند اور آئین و ضبط کا خوگر انسان تھا۔ جب خلیفہ وقت سلیمان بن عبدالملک نے اسے ناجائز طور پر معزول کر دیا تو اس نے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ خلیفہ کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے اطاعت امیر کی ایک نہایت عمدہ مثال قائم کی۔ اگرچہ وہ سندھ میں صرف تین سال رہا مگر اس نے اپنے اعلیٰ و ارفع اخلاق و کردار کا سکہ اس حد تک سندھیوں کے دلوں پر بٹھا دیا کہ وہ اسے دیوتا سمجھنے لگے اور انہوں نے اسکی واپسی پر کیرج میں اس کا ایک خوبصورت مجسمہ بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ اس کی زندگی کا آغاز بہادرانہ تھا لیکن اس کا انجام نہایت ہی دردناک تھا۔ بقول مشہور مورخ لین پول، محمد بن قاسم کی مہمات کی کہانی تاریخ کا ایک رومانی باب ہے۔

محمد بن قاسم کی کامیابی کے اسباب

محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ کی تسخیر اسلام اور تاریخ برصغیر پاک و ہند کا ایک عظیم واقعہ ہے جس سرعت و تندہی سے ایک معمولی عرصے میں اس سترہ سال کے جواں ہمت فاتح نے سندھ اور ملتان کو مسخر کیا تاریخ اسکی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اس کی کامیابی کے اسباب حسب ذیل ہیں:۔

Marfat.com

۱۔ عسکری ذہانت

محمد قاسم ایک اولوالعزم اور تُند رَو سپاہی ہونے کے علاوہ خداداد عسکری ذہانت اور اعلیٰ فہم و فراست کا حامل جرنیل تھا۔ وہ فطری طور پر عسکری قیادت کی جملہ صلاحیتوں کا پیکر تھا۔ اس نے ہر معرکہ اور ہر مہم میں اپنی افواج کی قیادت اس قدر اعلیٰ طریق سے کی کہ کامیابی نے مسلمانوں کے قدم چومے وہ بلاشبہ ایک بلند حوصلہ سپہ سالار، ایک صاحبِ فراست قائد اور دور اندیش جنگی مدبر تھا۔ اس نے اہل سندھ سے برتاؤ میں بڑی دانشمندی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔ نتیجۃً سندھی اس کے حسن سلوک اور بلند اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

۲۔ حجاج کی راہنمائی

اگرچہ محمد بن قاسم ایک بہادر جرنیل اور زیرک و آزمودہ کار قائد تھا مگر اس کی کامیابی میں حجاج بن یوسف ثقفی کی مدبرانہ راہنمائی کو بھی بہت دخل تھا جس نے قدم قدم پر اپنی مفید تجویزوں اور مشوروں سے اس جواں سال سپہ سالار کی راہنمائی کی۔ وہ ہر مہم اور ہر اقدام پر اسے ہدایات ارسال کرتا تھا۔ جو ابن قاسم کے لئے بہت مفید ثابت ہوئیں۔ دیبل کی فتح کو صرف حجاج کی راہنمائی ہی کا کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ عربوں کا جذبۂ جہاد

عرب صرف مسلمان عورتوں اور بچوں کی بے عزتی کا بدلہ لینے اور قومی عزت کے تحفظ کے لئے میدانِ عمل میں آئے تھے۔ اسلام نے انہیں کچھ ایسا جوش و خروش اور مذہبی ولولہ عطا کیا تھا کہ وہ ملّی وقار اور حمیت اسلام کے تحفظ کے لئے بڑے سے بڑے حریف سے بھی برسرِ پیکار ہونا ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ سندھ میں وہ اسی جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر نبرد آزما ہوئے اور دیارِ غیر میں آکر اس جوش اور ولولہ سے لڑے کہ دشمن کہیں بھی اُن کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔

۴۔ برہمن راج سے دیگر فرقوں کی بیزاری

راجہ داہر برہمن مت کا پیرو تھا اور دیگر فرقوں یعنی بدھوں لوہانوں اور جاٹوں سے اس کا سلوک غیر روادارانہ تھا۔ سندھ کی آبادی کی اکثریت بدھ مت کی پیروکار تھی جو مذہبی آزادی سے یکسر محروم تھی اُن سے حکومت کا سلوک معاندانہ تھا اس لئے جب عرب سندھ پر حملہ آور ہوئے تو بدھوں نے حکومت کی مدد کرنے کی بجائے عربوں کا خیر مقدم کیا وہ عربوں کو اپنا نجات دہندہ تصور کرتے تھے۔ بدھوں نے تو باقاعدہ عربوں کو سندھ پر حملہ کرنے کی دعوت بھی دی تھی۔ چنانچہ جب محمد بن قاسم سندھ میں وارد ہوا تو اکثر مظلوم قبائل نے اظہارِ مسرت کے طور پر گھنٹیاں بجا بجا کر اس کا استقبال کیا۔ اُن میں سے اکثر محمد بن قاسم کی فوج میں شامل ہو گئے اور برہمن راج کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔

۵۔ راجہ داہر کی نخوت پسندی

راجہ داہر ایک مغرور اور لاپروا حکمران تھا وہ بجائے عسکری تیاری کے ہمیشہ مسلمانوں کو حقیر تصور کرتا رہا۔ وہ سیاسی بصیرت سے بے بہرہ مصلحت نااندیش اور ایک متکبر فرمانروا تھا۔ اس نے حجاج کے خط کا جواب بہت تلخ دیا جس سے

Marfat.com

وہ ناراض ہوگیا۔ بعدازاں اس نے محمد بن قاسم کے عملے کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دی، نہ ہی اس نے اپنی رعایا کے ناراض طبقوں کا تعاون حاصل کر کے قومی بنیادوں پر عربوں کا مقابلہ کرنے کی تدبیر کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۶۔ عربوں کی رواداری

محمد بن قاسم کی کامیابی کی اصل وجہ اسکی منصفانہ، مشفقانہ اور روادارانہ پالیسی تھی۔ جس نے غیر مسلم اقوام کو اس کا گرویدہ بنا دیا۔ وہ ہمیشہ مفتوحہ علاقوں کے عوام کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آیا اور انہیں مکمل امان اور مذہبی آزادی عطا کی۔ اس کا قائم کردہ نظامِ حکومت نہایت عادلانہ اور منصفانہ اصولوں پر مبنی تھا۔ اس لئے غیر مسلموں نے عربوں کی حکومت کو ایک نعمت تصور کیا اور تہ دل سے اس کے ساتھ تعاون کیا۔

عرب فتوحات کی وسعت میں ناکامی

برصغیر میں عرب فتوحات پر تبصرہ کرتے ہوئے "میڈیول انڈیا انڈر محمڈن رول" کا مصنف اور مشہور مؤرخ لین پول رقمطراز ہے:

"فتحِ سندھ اسلام اور تاریخ ہند کا محض ایک سانحہ تھا جس کے نتائج دور رس ثابت نہ ہوئے۔"

"The Arab conquest of Sind was an episode in the history of India and Islam—a triumph without results."

اسی طرح ایشوری پرشاد کی رائے ہے کہ:

"عربوں کی فتحِ سندھ تاریخ اسلام میں سیاسی لحاظ سے ایک غیر اہم واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔"[1]

"The Arab conquest of Sind, from the political point of view, was an insignificant event in the history of Islam."

ایل، سری واستوا کا قول ہے کہ:

"عربوں کی مہم سندھ بالکل ناکام رہی۔ اگرچہ ترکوں کے قابض ہو جانے تک سندھ عربوں کے زیر نگیں رہا لیکن دوسرے ممالک میں فتوحات کا شاندار اور درخشاں ریکارڈ رکھنے کے باوجود عربوں نے مزید کوئی صوبہ فتح کرنے کے لئے یکسوئی سے کوئی کوشش نہ کی۔ بلاشبہ ان کا آغاز نہایت کامیاب اور شاندار تھا لیکن وہ سندھ کی سرحد اور ملتان سے آگے پیش قدمی نہ کر سکے۔ بدیں وجہ مؤرخین کا یہ کہنا بجا

---

[1] ہسٹری آف میڈیول انڈیا صفحہ ۶۸

Marfat.com

ہے کہ فتحِ سندھ تاریخ اسلام میں محض ایک سانحہ کی حیثیت رکھتی ہے"[1]

یہ بیانات ایک حد تک غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ گو محمد بن قاسم کے جانے کے بعد فتوحات کا سلسلہ اچانک رک گیا اور مسلمان باہمی آویزشوں کے باعث مزید علاقوں پر کامیابی کے ساتھ فوج کشی نہ کر سکے، جس کی وجہ سے اسلامی سلطنت میں مزید اضافہ نہ ہو سکا۔ بہرحال عرب سندھ و ملتان پر دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک قابض رہے۔ چوتھی صدی ہجری تک خلیفۃ المسلمین والیانِ سندھ کا تعین کرتا رہا۔ اس کے بعد سندھ میں عربوں کی دو نیم آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ اُن میں ایک ملتان اور دوسری منصورہ تھی۔ خلافت عباسیہ کے کمزور پڑنے پر ان علاقوں میں قرامطی غالب آ گئے۔ عرب فتوحات کی وسعت مندرجہ ذیل وجوہات کی بناء پر ناکام رہی۔

۱۔ محمد بن قاسم ایک پیدائشی جرنیل تھا۔ اس نے اپنی خداداد عسکری ذہانت سے سندھ میں شاندار فتوحات حاصل کر کے اس سرزمین پر اسلامی پرچم لہرایا۔ وہ مزید فتوحات کے عزائم رکھتا تھا اور قنوج پر حملہ آور ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ اچانک اسے سندھ کی گورنری سے معزول کر کے واپس طلب کر لیا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کوئی ایسا جلیل القدر فاتح نہ آیا جو برصغیر کے بقیہ حصوں کو فتح کر کے اسکی آرزوؤں کی تکمیل کرتا۔

۲۔ سندھ کا بیشتر حصہ ریگستانی تھا اور اس کا ہمسایہ علاقہ راجپوتانہ بھی ایک لق و دق صحرا تھا اسی وجہ سے مرکزی حکومت کی توجہ ایسے علاقوں کی تسخیر کی جانب بہت کم رہی۔

۳۔ تسخیر سندھ کے بعد برصغیر کی سیاسی صورتحال مزید فتوحات کے لئے سازگار نہ تھی۔ سارا ملک راجپوتوں کی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور انہیں زیر کرنے کے لئے ایک لامحدود عسکری قوت کی ضرورت تھی۔ اگر ایک راجپوت ریاست مغلوب ہو بھی جاتی تو اس سے فتوحات کی وسعت پذیری میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑ سکتا تھا کیونکہ اس سے تھوڑا سا ہی علاقہ مسلمانوں کے زیر اقتدار آتا۔ شمالی ہند کی ریاستیں خاصی طاقتور تھیں اسلئے انکی تسخیر کیلئے مرکز خلافت کی پوری توجہ کی ضرورت تھی لیکن مرکز باہمی آویزشوں کا شکار ہو چکا تھا اس لئے عرب سندھ سے آگے بڑھ کر فتوحات کے دائرہ کو مزید وسعت دینے میں ناکام رہے۔

۴۔ محمد بن قاسم نے محکمہ مال گذاری کا انتظام و انصرام نہ صرف مقامی لوگوں کے سپرد کر دیا تھا بلکہ اس نے حساب کتاب بھی مقامی زبان (سندھی) میں رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ ٹیکسوں کی وصولی کا کام بھی برہمنوں کے سپرد تھا۔ چونکہ یہ لوگ دیانتدار نہ تھے اس لئے سندھ کے علاقہ سے خزانۂ عامرہ کو نہایت ہی قلیل آمدن ہوتی تھی۔ جسکی وجہ سے مرکزی خلافت بھی اس علاقہ کی طرف خصوصیت سے متوجہ نہ تھی۔ انجام کار سندھ کے عرب گورنر خود مختار ہو گئے۔ جو بعد ازاں صرف اپنی ہی خود مختاری کو برقرار رکھ سکے اور مزید فتوحات کے اہل نہ ہو سکے۔

۵۔ فتح سندھ بنو امیہ کے دور خلافت میں ہوئی تھی لیکن خاندان بنو امیہ کا اقتدار جلد ہی زوال پذیر ہو گیا اور ۷۵۰ء میں بنو عباس برسر اقتدار آ گئے۔ بنو عباس فتوحات کے مقابلے میں علوم و فنون کے دلدادہ تھے۔ حصولِ اقتدار

---

[1] دی سلطنت آف دہلی صفحہ ۲۵

Marfat.com

کے لئے ان دو خاندانوں کی باہمی آویزش سے اسلامی سلطنت کی سیاسی حیثیت بہت زیادہ اثر پذیر ہوئی اس سے مرکزِ خلافت کمزور ہو کر رہ گیا۔ رفتہ رفتہ سندھ کے معاملات میں مرکزی حکومت کی دلچسپی بہت کم ہو گئی نتیجتہً مرکزی حکومت کی تائید و تقویت ختم ہوتے ہی سندھ میں عربوں کی حیثیت کمزور ہو گئی اور سلطنت عثمانیہ میں مزید کوئی وسعت نہ ہو سکی۔

۶۔ سندھ اور عرب کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ تھا۔ عرب اگرچہ اعلیٰ جہاز ران تھے لیکن ذرائع آمد و رفت کے محدود اور غیر تسلی بخش ہونے کی وجہ سے وہ برصغیر کے معاملات کی طرف توجہ نہ دے سکے۔

۷۔ عرب فتوحات کا دائرہ اس وجہ سے بھی وسعت پذیر نہ ہو سکا کہ وہ برصغیر میں غلط راستے سے داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے شمالی ہند کے زرخیز میدانوں کی بجائے سندھ کے ریگزار کو فتح کیا تھا، جس کی اقتصادی حالت کمزور اور ذرائع آمدنی بہت ہی محدود تھے۔ بقول ڈاکٹر اے۔ ایل سری واستوا:

"سندھ ایک الگ تھلگ کونے میں واقع ہونے کی وجہ سے جغرافیائی لحاظ سے برصغیر کی کنجی کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ سندھ کو اپنا فوجی مستقر بنا کر اس سرزمین سے بقیہ برصغیر کی تسخیر کا آغاز کرنا ہر قوت کے لئے ناممکن تھا"[1]

عربوں کا نظامِ حکومت

محمد بن قاسم ایک عظیم فاتح اور کشور کشا ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ پایہ کا جہاندار بھی تھا۔ وہ سندھ میں صرف تین سال رہا، لیکن اس قلیل عرصہ میں بھی وہ جنگی مہمات میں مصروف رہا۔ تاریخ میں اس کے کارنامے عدیم المثال ہیں۔ اتنی کم عمر اور اتنے قلیل عرصہ میں کسی جرنیل نے ایسی عظیم فتوحات حاصل نہیں کیں۔ اس نے فتوحات کے ساتھ ساتھ مفتوحہ علاقوں میں امن و امان اور نظم و ضبط قائم کیا۔ اس نے اپنی بہادرانہ عسکری صلاحیتوں کو صرف فتوحات تک ہی محدود نہ رکھا، بلکہ مفتوحہ علاقوں میں ایک نئے نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی جو عدل و انصاف، رواداری اور اسلامی اصولوں پر مبنی تھا۔ اس نے غیر مسلموں سے روادارانہ اور مشفقانہ سلوک کر کے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ یہ اس کے روادارانہ سلوک اور حسن اخلاق کا ہی نتیجہ تھا کہ مقامی باشندوں کی اکثریت نے عربوں سے نہ صرف تعاون کیا اور اسلامی فوج میں بھرتی ہو گئے، بلکہ بہتوں نے اسلام قبول کر لیا۔

جزیہ[2]

ایک حکمران قوت کی حیثیت میں سندھ کے ہندوؤں (غیر مسلموں) سے مسلمانوں کا سابقہ پہلی مرتبہ پڑا لہٰذا قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ ان سے کیسا سلوک روا رکھا جائے؟ محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف

---

[1] دی سلطنت آف دہلی صفحہ ۲۷

[2] جزیہ ایک اسلامی ٹیکس تھا جو فوجی خدمت کی عدم ادائیگی کی صورت میں جان و مال کے تحفظ کے عوض آمدنی کے مطابق ہر ذمی یا غیر مسلم کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

Marfat.com

شقی سے ہدایات طلب کیں حجاج نے علماء کے مشورے سے لکھا کہ ہندوؤں سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے اور ان کو وہی درجہ دیا جائے جس سے اسلامی سلطنت میں مسیحی اور یہودی مستفید ہیں یعنی وہ جزیہ ادا کرتے رہیں تو ان کی جائیں آبروئیں اور مال و دولت محفوظ ہوں گے اور انہیں اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں پوری آزادی حاصل رہے گی۔ چنانچہ عرب فاتح کی طرف سے اسلامی دستور کے مطابق رعایا کے لئے حکومت کی اطاعت لازم قرار دی گئی اور غیر مسلموں پر جزیہ ٹیکس عاید کیا گیا۔ جزیہ کے تین درجے تھے دولت مند طبقہ اڑتالیس درہم، متوسط طبقہ چوبیس درہم اور نچلا طبقہ بارہ درہم یعنی علی الترتیب ۱۲ روپے، ۶ روپے اور تین روپے سالانہ ادا کرتا تھا۔ بوڑھے، اپاہج، عزبا، برہمن اور ذمی یا غیر غیر مسلم جو فوجی خدمات سرانجام دیتے تھے، اس ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ سندھی بہ رضا و رغبت جزیہ ادا کرتے رہے اس لئے کہ جزیہ ادا کرنے کے بعد ان لوگوں کی جان و مال اور مذہبی حقوق کی حفاظت حکومت کے ذمہ ہو جاتی تھی

محمد بن قاسم نے جزیہ کی وصولی پر برہمنوں کو مامور کیا۔ اس بات نے جزیہ کو بحیثیت محصول اور بھی قابل قبول بنا دیا۔ محمد بن قاسم کی طرف سے برہمن عاملوں کو خاص طور پر ہدایت تھی کہ ٹیکس کے تعین میں اصولِ انصاف اور محصول گذار کی استطاعت کو ملحوظ رکھیں۔

مذہبی آزادی محمد بن قاسم نے سندھ کے لوگوں کو اطاعت اور جزیہ کی ادائیگی پر مذہبی اور مجلسی آزادی عطا کی۔ شام کے عیسائیوں اور ایران کے مجوسیوں کی طرح سندھ کے ہندو بھی ذمی قرار پائے۔ چنانچہ اروڑ (الور) کی فتح کے بعد محمد ابن قاسم نے اعلان کیا کہ عیسائیوں کے گرجوں، یہودیوں کے ہیکل اور مجوسیوں کے آتشکدوں کی طرح بدھوں اور ہندوؤں کے مندروں کو بھی کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، بلکہ حکومت اُن کی حفاظت کی ذمہ دار ہوگی۔ علاوہ ازیں مقامی لوگوں کو ملک کے انتظامی شعبوں اور فوجی محکموں میں باقاعدہ ملازمتیں دی جائیں گی۔ نیز محمد بن قاسم نے ہنود کے مقدموں اور چوہدریوں کو بلا کر کہا کہ خلیفہ کا حکم ہے کہ تم اپنے مندروں کی تعمیر کرو مسلمانوں سے خرید و فروخت کرو، امن و اطمینان سے رہو، اپنی فلاح و بہبود کی سعی کرو اور برہمنوں کے حقوق قدیم دستور کے مطابق بجا لاؤ۔ اس کے علاوہ اس نے ان مقامی سرداروں اور جاگیرداروں کی جاگیریں اور سرداریاں بحال کر دیں۔ جنہوں نے لڑے بغیر اطاعت قبول کر لی تھی۔

محمد بن قاسم کی پالیسی اہل سندھ کی امیدوں سے بڑھ کر فراخدلی، رواداری اور شفقت پر مبنی تھی۔ اہل سندھ سمجھے بیٹھے تھے کہ اُن کے مندروں کی بے حرمتی ہوگی، اُن کی ثقافت کو ختم یا مسخ کر کے رکھ دیا جائے گا اور اُن کی جائیدادوں پر قبضہ کر لیا جائیگا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ نئی حکومت سابقہ ہندو حکومت کے مقابلے میں بدرجہا بہتر اور روشن خیال ہے۔

مفتوحہ علاقے کا انتظام سندھ کے مفتوحہ علاقہ کو صوبہ عراق کے ذیلی صوبے کی حیثیت حاصل تھی یہاں کا والی محمد بن قاسم، گورنر عراق حجاج بن یوسف کے تحت تھا۔ چونکہ

Marfat.com

سندھ کا علاقہ مرکز سے بہت دور تھا۔ اس لئے داخلی امور میں محمد بن قاسم کافی حد تک خود مختار تھا۔ اُس نے اپنے نظامِ حکومت میں ہمیشہ مقامی آبادی کے جذبات کا احترام ملحوظ رکھا اور انہیں کاروبارِ مملکت میں بھی بتدریج شریک کیا۔ اس نے راجہ داہر کے ذہین وزیر کک وزیر سی ساگر کو قلمدانِ وزارت سونپا۔ اسی طرح قلعہ بانیہ کے حاکم لگسہ کو بھی مشیرِ خصوصی مقرر کیا۔

جنگ کے خاتمہ کے بعد محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقہ میں نظم ونسق اور قیامِ امن کی طرف توجہ دی۔ اس نے انتظامی سہولت کے تحت تمام مفتوحہ علاقے کو چھوٹے چھوٹے حلقوں (اضلاع) میں تقسیم کر دیا، جن کو اقطاع کہا جاتا تھا اور اُن پر معتبر عرب فوجی نگران متعین کئے جن کے فرائض میں اپنے اپنے اقطاع میں امن وامان کے قیام کے علاوہ بغاوتوں کا انسداد اور والیٔ سندھ کے لئے فوجی خدمات کی بجاآوری شامل تھی۔ ہر اقطاع جو متعدد چھوٹے چھوٹے حلقوں (تحصیلوں) پر مشتمل تھا کے انتظام وانصرام پر سابق ہندو حاکموں کو رکھا۔ علاوہ ازیں دیہات کا انتظام بھی حسبِ سابق مقامی لوگوں کی سپرد داری میں رہنے دیا۔

برہمن آباد میں محمد بن قاسم نے جس قسم کا مدبرانہ نظم ونسق قائم کیا، وہ بلاشبہ اس کی دانشمندی اور مصلحت اندیشی کا مظہر تھا۔ اس نے سندھ کے اس عظیم شہر کو چار مساوی انتظامی حصّوں میں تقسیم کر کے ہر ایک حصہ پر ایک وفادار اور معتبر کو توال مقرر کیا جسے خلعت، گھوڑا اور تحائف سے بھی نوازا۔ یہ کوتوال ہندو تھے۔ نیز راجہ داہر کے بیشتر عہدہ داروں کو برقرار رکھا۔ دورانِ جنگ جن لوگوں نے جائدادوں کو نقصان پہنچایا تھا اُن کی فہرست مرتب کی گئی۔ اُنکی تعداد دس ہزار تھی۔ محمد بن قاسم نے ان میں سے ہر ایک کو دس درہم دینے کا حکم دیا تاکہ وہ از سرِ نو ایک پرامن اور مطمئن زندگی کا آغاز کر سکیں۔ اس کے اس اقدام سے مقامی باشندے عربوں کے حسنِ سلوک کے گرویدہ ہو گئے۔

محکمۂ عدل

عدل وانصاف کے لئے قاضی مقرر کئے گئے جو اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرتے تھے فوجداری مقدمات کے فیصلے بھی قاضی ہی کرتے تھے۔ دیوانی مقدمات کے لئے رعایا کو اپنے مقامی رواج کے مطابق پنچائتوں سے رجوع کرنے کی اجازت تھی۔ ہندوؤں کے مقدمات ہندوؤں کے قانون اور مذہبی رسم ورواج کے مطابق طے کئے جاتے تھے۔ حاکموں کو حکم تھا کہ ہر فرد کے ساتھ عدل وانصاف روا رکھا جائے۔

فوجی انتظام

محمد بن قاسم نے جو ایک اچھا منتظمِ سلطنت تھا، مفتوحہ علاقوں کے داخلی استحکام، قیامِ امن اور نظم وضبط کے لیے متعدد مقامات پر فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ ان چھاؤنیوں میں ہسپتال، عدالت، دفاتر اور اصطبل وغیرہ کا باقاعدہ اہتمام تھا۔ اس نے جاگیرداروں کی فوج کے علاوہ مستقل فوج کا بھی اہتمام کیا جو پیدل، اسپ سواروں، سانڈنی سواروں اور نفت اندازوں کے علاوہ منجنیق، تیر کمان، تلوار، ڈھال اور نیزہ وغیرہ اسلحہ جنگ تھے۔ سپاہیوں کو تنخواہ کے علاوہ مالِ غنیمت میں سے مقررہ حصہ بھی دیا جاتا تھا۔ محمد بن قاسم نے بہت سے عرب فوجیوں کو سندھ میں آباد ہونے اور انہیں سندھی عورتوں سے شادیاں کرنے کی اجازت دی۔ منصورہ، قصدار، کندہ، نبل، بیضہ، محفوظہ اور ملتان اس دور کی مشہور فوجی چھاؤنیاں تھیں۔

Marfat.com

محکمۂ مال کا انتظام

محمد بن قاسم نے محکمۂ مال کے انتظامی عہدوں پر خاص طور پر سندھیوں کو مامور کیا۔ برہمنوں سے عزت و احترام کا برتاؤ کرتے ہوئے انہیں محاصل کی وصولی کے لئے عامل مقرر کیا۔ انہیں خطابات سے نوازنے کے علاوہ قیمتی تحائف اور خلعتیں بھی بخشیں۔ نیز اُن کے حقوق میں مزید اضافہ کر دیا۔ سابقہ برہمن حکومت میں انہیں جو مناصب حاصل تھے، اُن پر انہیں نہ صرف مستقل کر دیا، بلکہ اُن مناصب کو اُن کے خاندانوں میں موروثی بنا دیا۔ سابقہ حکومت برہمنوں کو مالیہ کا تین فیصد حصہ دیتی تھی یہ حصہ بھی بحال کر دیا گیا۔

محمد بن قاسم نے برہمن عاملوں کو ہدایت کی کہ جہاں تک ممکن ہو، رعایا پر کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے اور اُن کی استطاعت سے زیادہ محصول، لگان اور جزیہ وصول نہ کیا جائے۔ عمّالِ حکومت کو یہ بھی تاکید تھی کہ رعایا کے لیے جو بات مفید ہو اسکی اطلاع حکومت کو دیں تاکہ اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ نیز رعایا اور حاکم کے درمیان اچھے تعلقات قائم کرنا اُن کا فرض منصبی ہے اور انہیں یہ اطمینان دلایا کہ اگر ادائیگی فرائض کے دوران انہیں کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچا تو حکومت ہر طرح سے اُن کی امداد اور حمایت کرے گی۔ اس سے تمام برہمنوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ برہمن اور ہندو افسروں نے سارے ملک کا دورہ کیا اور عوام کو بتایا کہ نئی حکومت کس قدر انصاف پسند اور رعایا پرور ہے انہوں نے رعایا کو بتایا کہ خلیفۂ اسلام ہم سب پر بہت مہربان ہے اور اس نئی حکومت کے آنے سے بڑے چھوٹے سب برابر ہو گئے ہیں اس سے بہت جلد ملک میں امن و امان قائم ہو گیا اور محاصل کی وصولی بڑی آسانی سے ہونے لگی۔

خلیفہ ولید کے زمانے میں محکمہ مال کا تمام حساب کتاب عربی زبان میں رکھا جاتا تھا لیکن محمد بن قاسم نے تمام حساب و کتاب سندھی زبان میں رکھنے کا حکم دیا۔ مقامی لوگوں سے لگان مالیہ، نہری زمین کی گندم اور جَو کی پیداوار پر ۵/۲ حصہ اور معدنیات پر ۵/۱ حصہ محصول مقرر کیا۔ علاوہ ازیں غیر مسلموں پر جزیہ ٹیکس عائد کیا گیا اور مسلمانوں سے زکوٰۃ اور صدقہ کے محاصل وصول کرنے کا حکم دیا۔ حجاج کی ہدایات کے تحت محمد بن قاسم نے کاشتکار طبقہ کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کا خاص خیال رکھا۔ عرب فاتحین کو بڑے بڑے قطعات اراضی جاگیر کے طور پر عطا کئے۔ جن پر لگان مالیہ معاف تھا لیکن جاگیردار اپنی سالانہ آمدنی پر زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔ وہ ملک میں امن و امان کے قیام اور بغاوتوں کو فرو کرنے کے لئے حکومت کو فوج مہیا کرنے کے ذمہ دار تھے بعد میں یہ جاگیردار امیرانِ سندھ کہلائے۔

الغرض محمد بن قاسم کا قائم کردہ نظامِ حکومت رواداری اور رعایا سے فیاضانہ سلوک کے اصولوں پر مبنی تھا۔ اس سے ایک ایسے نظامِ حکومت کی داغ بیل پڑی جس پر بعد ازاں برصغیر کے تمام مسلمان حکمران معمولی ترمیمات کے ساتھ کاربند رہے۔ محمد بن قاسم کے عادلانہ نظامِ حکومت کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ خلیفہ کے حکم پر معزول اور گرفتار ہو کر سندھ سے رخصت ہوا تو اہل سندھ نے اس رواداری، روشن دماغی اور انصاف پسند حاکم کے جانے پر آنسو بہائے اور اس کی یادگار میں مجسمے نصب کر کے اس کی پرستش شروع کر دی۔

Marfat.com

فتح سندھ کے اثرات

ہندو اور یورپین مورخین بالخصوص لین پول نے یہ کہہ کر کہ :

"فتح سندھ اسلام اور تاریخ ہند کا محض ایک سانحہ تھا جس کے نتائج دور رس ثابت نہ ہوئے"

عربوں کی فتح سندھ کو غیر مستقل بے نتیجہ اور ایک معمولی واقعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ فتح سندھ کے واقعہ سے یہ خطہ تہذیبی، سیاسی، علمی نیز مذہبی لحاظ سے بہت زیادہ اثر پذیر ہوا۔ بقول پروفیسر سید عبدالقادر و شجاع الدین :

"فتح سندھ کے بعد بیشمار علماء، مبلغین، تاجر اور صناع عرب سے آکر سندھ میں آباد ہوئے مقامی باشندوں میں اسلام رائج ہوا اور جلد ہی یہ زمین فرزندانِ توحید کا گہوارہ بن گئی۔ آج سندھ اسی طرح اسلامی خطہ ہے جس طرح عراق اور مصر۔ ان حالات میں ہم عربوں کی فتح سندھ کی عظمت، اس کی تاریخی اہمیت اور اس کے نتائج کے منکر نہیں ہو سکتے۔"

خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد مرکز خلافت دمشق سے بغداد منتقل ہو گیا جو برصغیر پاک و ہند سے نسبتاً زیادہ قریب تھا۔ عباسی خلفاء اور اُمراء سپہ گری اور ملک گیری کی نسبت علوم و فنون میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ بہت سے ہندوستانی اور سندھی علماء بغداد پہنچے جو مسلمانوں کا علمی، مذہبی اور سیاسی مرکز تھا۔ اُن سے مسلمانوں نے ہندی علوم سیکھے اور بعد ازاں انہیں ترقی دینے سے بھی گریز نہ کیا۔ اسی طرح ہندوستانیوں نے بھی عربی علوم سے اسلامی علوم و فنون کے بارے میں بہت کچھ حاصل کیا۔ چونکہ ہند اور عرب کے تجارتی اور تمدنی روابط مدتوں پہلے سے قائم تھے، قدرتی طور پر فتح سندھ کے بعد ان روابط میں نتیجہ خیز اضافہ ہوا۔ عربوں اور سندھیوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک دوسرے کے دوش بدوش حصہ لینا شروع کیا جس سے بتدریج ہر دو اقوام کے تمدن ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے۔ بلاشبہ" سندھ میں اسلامی حکومت کا قیام اسلام اور تاریخ برصغیر کا ایک اہمیت افروز واقعہ ہے"[1] فتح سندھ سے برصغیر کی تاریخ پر بڑے اہم اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے جو حسب ذیل ہیں :-

سیاسی اثرات

۱۔ محمد بن قاسم کے حملے سے برصغیر پاک و ہند کی عسکری اور سیاسی کمزوری عیاں ہو گئی چنانچہ دیگر فاتحین کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔

۲۔ عربوں نے سندھ میں عدل و انصاف، مساوات، رواداری اور فلاح و بہبود کے اصولوں پہ مبنی ایک مثالی نظامِ حکومت قائم کیا جو ترک حکمرانوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا۔

۳۔ عرب سپاہیوں کی ایک بھاری تعداد نے سندھ میں مستقل رہائش اختیار کر کے مقامی عورتوں سے شادیاں

---

[1] ایم کبیر کے شائع شدہ ہسٹری آف پاکستان (جلد دوم) صفحہ ۱۱-۱۲

Marfat.com

کرلیں۔ اس سے نہ صرف باہمی روابط اور خوشگوار تعلقات کی فضا پیدا ہوئی بلکہ مخلوط خاندانوں کی بنیاد پڑی

۴۔ عربوں نے سندھ میں متعدد چھاؤنیاں قائم کیں جو بعد ازاں ترقی پذیر ہو کر نہ صرف اہم اور بڑے شہروں میں تبدیل ہو گئیں بلکہ وہ علوم و فنون اور تمدن کے مراکز ثابت ہوئیں۔

۵۔ عرب اور سندھ کے درمیان خشکی کے راستہ سے آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا اور اس سے آئندہ اسلامی فتوحات کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

معاشرتی اثرات

۱۔ فتح سندھ سے قبل اہل سندھ نہ صرف خانہ بدوش اور راہزن تھے بلکہ غیر تہذیب یافتہ اور غیر متمدن بھی تھے۔ لیکن عربوں کے زیر اقتدار آنے کے بعد خطہ سندھ عربی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا تو اہل سندھ تہذیب و شائستگی سے بہرہ ور ہو کر مہذب و متمدن ہو گئے اور انہیں قانون کی اہمیت اور احترام سے بھی آگاہی ہوئی۔

۲۔ دو مختلف قوموں کے باہمی میل جول سے ایک نئی تہذیب عالم وجود میں آئی۔ جس کی زندہ یادگار سندھی زبان آج بھی موجود ہے۔

۳۔ کئی عرب ماہرین نے سندھ میں سکونت اختیار کر لی اور اسی طرح کئی ہندی ماہرین نے اسلام قبول کر کے عرب میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

۴۔ مسلمانوں نے سندھیوں کے ساتھ فیاضی اور انسانیت کا سلوک کیا۔ انہیں مکمل مذہبی آزادی عطا کی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے سندھی برہمن اور بدھ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

۵۔ عربوں نے سندھ میں بعض نئی صنعتیں جاری کیں۔ کئی ایک نئے پودے بھی لا کر یہاں کاشت کئے اس طرح دنیا سے اس برصغیر کی بے تعلقی ختم کر دی۔

۶۔ عربوں کی تقلید میں سندھ میں بھی اونٹ اور عربی گھوڑے پالنے کا رواج ہوا۔ چنانچہ آج تک دیہی اونٹوں سے کام لیا جاتا ہے۔

مذہبی اثرات

۱۔ عرب رواداری کی پالیسی کے حامی تھے۔ انہوں نے مفتوحہ علاقوں میں ہندوؤں کو مکمل آزادی عطا کی۔ نیز تباہ شدہ مندروں کی مرمت اور نئے مندروں کی تعمیر کی بھی اجازت دی

۲۔ مسلمانوں نے اپنے حسن اخلاق، بلند کردار اور شائستگی سے مقامی لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ کی آبادی کا بیشتر حصہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

۳۔ فتح سندھ کے بعد مبشرین، علما، مبلغین، تاجر اور صناع عرب سے آ کر سندھ میں آباد ہوئے، علما اور صوفیوں نے تبلیغ اسلام کو بہت اہمیت دی جس سے سندھیوں کی اکثریت مشرف باسلام ہوئی۔

علمی اثرات

فتح سندھ نے نئی تہذیب و ثقافت سے برصغیر کے باشندوں کی روشناسی کے لئے راہ ہموار کی۔ اگرچہ مسلمانوں نے ہندو دانہ علوم کو بڑی گہری دلچسپی سے سیکھا لیکن انہوں نے یہاں جا بجا

Marfat.com

مدرسے اور کالج کھول کر علم کی روشنی میں مزید پھیلایا بالخصوص دورِ عباسیہ میں جملہ علوم و فنون کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا بغداد میں دارالترجمہ قائم کیا گیا، جہاں سنسکرت کی متعدد کتب کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔ ہندی تہذیب پر عرب اقتدار کا یہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ہندی علوم سے بے اعتنائی اور تعصب برتنے کی بجائے اُن کی اشاعت و ترویج کی۔ جن ہندی علوم کی سرپرستی نے اشاعت کی وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ علمِ ہیئت و نجوم: ہندو علمِ ہیئت، نجوم، جوتش اور کیمیا میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے ان علوم پر سنسکرت زبان میں کئی ایک کتابیں موجود تھیں۔ خلیفہ منصور کے عہد میں سندھ کے ایک وفد کے ساتھ ایک متبحر عالم، علم ہیئت کی مشہور کتاب 'سدھانت' اپنے ساتھ لایا۔ ابراہیم فزاری نے عربی زبان میں اسکا ترجمہ کیا اور اس کا نام 'السندہند' رکھا۔ بعدازاں عربوں نے اس کی شرحیں لکھیں اور باقاعدہ تحقیق سے اس کی غلطیاں درست کیں۔ علاوہ ازیں سندھ سے دانشور پنڈت بھی بلائے گئے جنہوں نے عباسی دارالترجمہ میں کافی عرصہ ملازمت کی اور ہندی علوم پر مشتمل مختلف کتب کو عربی میں منتقل کیا

۲۔ علمِ طب: ہارون الرشید کے زمانے میں اہل عرب ہندی طب یعنی ویدک طریق علاج سے روشناس ہوئے۔ ایک بار خلیفہ بیمار ہوا تو اس کے علاج کے لئے برصغیر پاک و ہند سے مانک نامی ایک ہندی طبیب کو طلب کیا گیا۔ جس کے علاج سے خلیفہ کو صحت ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد بغداد کے ہسپتال میں علاج کے لئے ایک ویدک طبیب کا تقرر کیا گیا۔ نیز ہندوستانی جڑی بوٹیوں کا جائزہ لیا گیا۔ علم الادویہ کو توسیع دی گئی اور علم طب کی مشہور کتب سشرت اور چرک کے ترجمے کئے گئے۔

۳۔ علمِ ریاضی: ہندسے لکھنے کا طریقہ سب سے پہلے ہندوستانیوں نے ایجاد کیا۔ عربوں نے اس طریقے کو اپنایا۔ چنانچہ آج بھی عربی میں ایک سے لے کر نو تک ہندسے بالکل ہندی طریقے سے لکھے جاتے ہیں۔ اِن کو (ARABIC NUMERALS) کہتے ہیں۔ مشہور عرب ریاضی دان خوارزمی نے ہندی حساب کو عربی زبان میں منتقل کیا۔

۴۔ فلسفہ و ویدانت: ہندی فلسفہ اور ویدانت کی مشہور ترین کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ ترجمہ ہونے کے بعد ہندی علوم کے عربی علوم پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ اگرچہ اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اسلامی تصوف کے بعض نظریات و خیالات ہندی فلسفہ، ویدانت اور بدھسٹ تصوف کے متعدد خدوخال سے مماثل نظر آتے ہیں۔

دیگر علوم: عربوں نے ہندی علم موسیقی سے بھی استفادہ کیا۔ سنسکرت کی حکمت و دانش کی مشہور کتاب 'کلیلہ دمنہ' کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب دلچسپ اخلاقی کہانیوں پر مشتمل تھی۔ ہندوؤں کی مشہور کتاب مہابھارت کو بھی عربی قالب میں ڈھالا گیا۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر بعض مؤرخین کا یہ نظریہ درست نہیں کہ فتح سندھ اسلام اور تاریخِ ہند کا محض

Marfat.com

ایک واقعہ تھا اور اس کا برصغیر یا ک و ہند کی مجموعی تاریخ پر کوئی نمایاں اثر نہیں پڑا۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے سندھ میں اخلاق و کردار، نظم و نسق اور عادلانہ طرزِ حکومت کی ایسی مثال قائم کی جو بعد میں آنے والے مسلمان فاتحین کے لئے مشعلِ راہ بنی۔

اہم تاریخیں

۷۱۲ء سندھ پر عربوں (محمد بن قاسم) کا حملہ، دیبل، نیرون اور برہمن آباد پر عربوں کا قبضہ

۷۱۴ء حجاج بن یوسف ثقفی کی وفات

۷۱۵ء خلیفہ ولید بن عبدالملک کی وفات اور سلیمان بن عبدالملک کا مسندِ خلافت پر بیٹھنا
محمد بن قاسم کی سندھ کی گورنری سے معزولی اور سندھ سے واپسی

۷۱۷ء سلیمان بن عبدالملک کی وفات اور عمر بن عبدالعزیز کا سریرآرائے خلافت ہونا

۷۵۰ء بنوامیہ کا زوال اور خلافتِ بنوعباس کا آغاز

۷۸۶ء بغداد میں ہارون الرشید کا مسندِ خلافت پر بیٹھنا

۹۶۸ء مصر میں فاطمیوں کا عروج

اہم سوالات

۱۔ سندھ کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے اسکی تاریخ کا مختصراً جائزہ لیجئے۔

۲۔ سندھ پر عربوں کے حملے کی وجوہات بیان کیجئے۔

۳۔ محمد بن قاسم کی فتح سندھ کا حال قلمبند کیجئے۔ نیز اُن وجوہات پر روشنی ڈالئے جنکی بنا پر عرب اپنی سلطنت کو وسعت دینے میں ناکام رہے

۴۔ محمد بن قاسم اور راجہ داہر کی لڑائی کا مفصل حال لکھئے۔

۵۔ "فتح سندھ اسلام اور تاریخ ہند کا محض ایک سانحہ ہے جسکے نتائج دور رس ثابت نہ ہوئے" (لین پول) تبصرہ کیجئے۔

۶۔ سندھ میں عربوں کے نظامِ حکومت کے خدوخال بیان کیجئے۔

۷۔ سندھ میں محمد بن قاسم کی کامیابی کے اسباب قلمبند کیجئے۔

۸۔ محمد بن قاسم کے انجام اور کردار پر روشنی ڈالئے۔

۹۔ فتح سندھ کے اثرات واضح کیجئے۔

۱۰۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھئے: ا: فتح دیبل ب: حجاج بن یوسف ج: راجہ داہر د: جزیہ

Marfat.com

چوتھا باب

سلاطینِ غزنہ

"بنو امیہ کے عہد خلافت میں عربوں کے ہاتھوں سندھ کی تسخیر اسلامی فتوحات کے دلیں سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ برصغیر کی تسخیر کے دوسرے دور کا آغاز تقریباً تین صدی کے بعد ترکوں کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد ہوا، جنہوں نے پاک و ہند کی جانب مزید اسلامی فتوحات کا بیڑہ اٹھایا غزنی اور غور کے ترک حکمرانوں نے پاکستان اور شمالی ہند پر یلغار کر کے ان علاقوں کو زیر نگیں کیا۔[1]

(ڈاکٹر ایم۔ کبیر)

دولتِ غزنہ خلافتِ عباسیہ کی سیاسی قوت کے زوال و انحطاط کے بعد دور افتادہ صوبوں کے گورنروں نے خود مختاری اختیار کرنی شروع کی۔ چنانچہ اس طرح کئی ایک خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں ان نوزائیدہ ریاستوں کے حاکم سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر بظاہر خلیفۂ بغداد کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ لیکن درحقیقت وہ مختار مطلق تھے۔ ایسی ہی ایک نیم خود مختار سلطنت ۸۷۲ء میں اسمٰعیل سامانی نے خراسان، ماوراء النہر اور افغانستان کے علاقوں کو فتح کر کے قائم کی اور بخارا کے شہر کو دارالسلطنت قرار دیا۔

دولتِ غزنہ کا بانی الپتگین[2] سامانی حکمران امیر احمد بن اسمٰعیل کا ایک ترک غلام تھا جسے امیر نصر بن احمد نے اسکی خدمات جلیلہ کے پیش نظر آزاد کر دیا۔ الپتگین امیر نوح بن نصر کے عہد میں حاجب الحجاب کے عہدے پر متعین ہوا نوح بن نصر کی وفات کے بعد اس کے جانشین عبدالملک (۹۵۴ء تا ۹۶۱ء) نے ۹۵۶ء میں پہلے اسے بلخ کا حاکم اور پھر خراسان کا سالارِ لشکر مقرر کیا۔ ۹۶۱ء میں امیر عبدالملک کی وفات کے بعد اس کی جانشینی کے مسئلہ پر الپتگین اور وزیر کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ وزیر مرحوم امیر کے بھائی منصور کو تخت پر بٹھانا چاہتا تھا، جبکہ الپتگین اس کے کمسن بیٹے کے حق میں تھا تاہم دیگر امراء کی مدد سے منصور سریر آرائے سلطنت ہوا اس سے الپتگین کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوا۔ چنانچہ الپتگین نے دارالسلطنت سے دور رہنا زیادہ مناسب خیال کیا

---

[1] اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان۔ جلد دوم صفحہ ۱۵

[2] "الپ اور تگین ترکی زبان کے الفاظ ہیں۔ الپ کے معنی شیر اور تگین کے معنی بہادر کے ہیں یہ دونوں الفاظ عموماً ترکی ناموں کے آخر میں آتے ہیں۔

Marfat.com

اس نے اپریل ۹۶۲ء میں غزنی کے حاکم ابو بکر لادق کو شکست دے کر غزنی میں اپنی سلطنت قائم کرلی اس طرح دولتِ غزنہ عالمِ وجود میں آئی۔

سامانی حکمران امیر منصور نے اس نوزائیدہ سلطنت کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر ناکام رہا نتیجہ اسے الپتگین سے مصالحت کرنی پڑی۔ الپتگین نے آٹھ ماہ تک بڑی کامیابی سے حکومت کرنے کے بعد ۱۲ ستمبر ۹۶۳ء میں وفات پائی[1] الپتگین کی وفات کے بعد ۹۶۳ء میں اس کا فرزند ابو اسحاق ابراہیم تخت نشین ہوا، مگر وہ نااہل ثابت ہوا اور چند ماہ بعد ہی وفات پاگیا۔ اس کے بعد امیر الپتگین کے دو غلام بلکتگین اور پری تگین یکے بعد دیگرے مسندِ امارت پر بیٹھے۔ پری تگین کے دورِ اقتدار میں ابو بکر لادق نے تختِ غزنی پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ کر دیا، مگر الپتگین کے ایک ترک غلام سبکتگین جو اس کا داماد بھی تھا اور دولتِ غزنہ کا سپہ سالار بھی نے لادق کو شکست فاش دیکر دولت غزنہ کو تباہی سے بچالیا۔ اس پر امرائے سلطنت نے ۲۰ اپریل ۹۷۷ء میں پری تگین کو معزول کر کے سبکتگین کو اپنا امیر بنالیا۔

سبکتگین

سبکتگین ترکستان کے ایک سردار جُق کا فرزند تھا۔ اس کا اصل نام ابو منصور سبکتگین تھا۔ وہ ماں کی طرف سے ایران کے آخری تاجدار یزدجردِ شہریار (Yazidjurd-i-Shaharyar) کی نسل سے تھا۔ بارہ برس کی عمر میں نیشاپور کے مقام پر غلام کی حیثیت سے الپتگین کے ہاتھ فروخت ہوا۔ اس نے اپنی خداداد قابلیت اور ذہنی استعداد سے بہت جلد ترقی کی منازل طے کیں۔ چنانچہ امیر الپتگین نے نہ صرف اسے اپنی داماد میں لے لیا بلکہ اسے امیر الامراء کا خطاب بھی عطا کیا۔ وہ ایک بہادر سپاہی، اعلیٰ پایہ کا جرنیل اور ایک زیرک و مدبر سیاستدان تھا اسے خونریزی سے دلی نفرت تھی۔ اس کے برعکس وہ رحمدلی، شفقت اور مروّت کا پتلا تھا۔

سبکتگین ایک بیدار مغز اور انصاف پسند بادشاہ تھا۔ اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی ملغان اور سیستان کو فتح کر کے اپنی سلطنت کی حدود کو وسعت دی۔ بعد ازاں پنجاب کے ہندو شاہی حکمران جے پال کے ساتھ دو جنگیں لڑیں۔ ۹۸۶ء میں جے پال نے سبکتگین کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے سدِ باب کے لئے دولت غزنہ پر حملہ کر دیا لیکن شکست سے دوچار ہوا اور دس لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی بطور نذرانہ پیش کرنے کے علاوہ بعض سرحدی قلعے دینے کا وعدہ کر کے سبکتگین سے صلح کرلی، لیکن دارالحکومت (لاہور) پہنچ کر اپنے وعدے سے منحرف ہوگیا اور تاوانِ جنگ بھیجنے کی بجائے سبکتگین کے اُن نمائندوں کو قید میں ڈال دیا جو صلحنامہ کی رو سے دیئے جانے والے قلعوں کا قبضہ حاصل کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ ساتھ ہی اسے کہلا بھیجا کہ جبتک یہ یرغمال کے طور پر رکھے ہوئے میرے آدمیوں کو رہا نہیں کیا جائیگا تمہارے آدمیوں کو واپس جانے نہیں دیا جائے گا۔ اس پر جے پال کو وعدہ شکنی کی سزا دینے کیلئے سبکتگین یلغار کرتا ہوا پشاور تک آپہنچا جے پال بھی دیگر ہمسایہ حکمرانوں کی افواج کی معیت میں لاہور سے بڑھا، پشاور کے قریب

---

[1] ڈاکٹر ایم ناظم: دی لائف اینڈ ٹائمز اور سلطان محمود آف غزنہ: صفحہ ۲۶

Marfat.com

فوجوں کا مقابلہ ہوا جے پال کو ایک بار پھر شکست ہوئی۔ سبکتگین نے لمغان (جلال آباد) سے دریائے سندھ تک کے تمام علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا، کہ برصغیر کی عسکری کمزوری مسلمانوں پر عیاں ہو گئی اور سندھ پار کے علاقے میں ایک طاقتور اسلامی حکومت قائم ہو گئی؛ جو بعد ازاں پنجاب اور برصغیر کے دوسرے حصوں پر چھا گئی۔ نیز برصغیر کی فتح کے دروازے کھل گئے۔

سبکتگین کے عہد کا دوسرا اہم واقعہ افغان قوم کے معرضِ وجود میں آنے کا ہے جس کی وجہ سے دنیا کے نقشہ پر افغانستان ظہور پذیر ہوا۔ افغان پشاور اور غزنی کے درمیانی علاقے کے باشندے تھے اور متعدد قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ سبکتگین نے اُن کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اُن سے دوستانہ مراسم استوار کیے اور وہ تمام علاقے جو اُن کے قبضہ میں تھے، اُن کے سپرد کر دیئے۔ نتیجتاً افغان قومیت کی بنیاد پڑی نیز یہ قبائل نہ صرف حلقہ بگوش اسلام ہوئے بلکہ سلاطین غزنہ کی افواج میں بھرتی بھی ہو گئے اور انہوں نے برصغیر کے خلاف تاریخی معرکہ آرائیوں میں بڑھ چڑھ کر جوشی سے حصہ لیا۔

سبکتگین ایک معمولی حیثیت سے اپنی استعداد سے ترقی کر کے شہنشاہ غزنی کے منصب جلیلہ تک پہنچا تھا۔ اسے اپنی رعایا سے بے پناہ محبت تھی۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ بیس سال تک حکومت کرنے کے بعد اس نے اگست ۹۹۷ء میں وفات پائی۔ اس نے اپنے جانشین کے لیے ایک مضبوط سلطنت چھوڑی، جو مغربی و شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند میں پھیل چکی تھی۔ تاریخ میں اس کا یہ کارنامہ بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے غزنی کی چھوٹی سی ریاست کو وسعت دے کر اپنے جانشینوں پر تسخیر ہند کے دروازے کھول دیئے۔

Marfat.com

سُلطان محمُود غزنوی

(۹۹۷ء تا ۱۰۳۰ء)

"محمود کا شمار ایشیا کے عظیم ترین حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ اُس نے ایک ایسی وسیع و عریض سلطنت پر حکومت کی، جس کی حدود عراق اور بحیرۂ کیسپین سے دریائے گنگا تک پھیلی ہوئی تھیں اور جو خلیفہ بغداد کی سلطنت سے کہیں زیادہ وسیع تھی۔ وہ شعر و سخن کا دلدادہ، ادبی فضیلت کا پیکر اور علوم و فنون کا مربّی تھا۔ اس نے غزنی میں مکتب، درسگاہیں اور یونیورسٹی قائم کر کے نیز کئی ایک تاریخی عمارات بنا کر اسے عروس البلاد بنا دیا۔"[1]

(لے ایل سری واسنوا)

سبکتگین کی وفات کے بعد اس کا فرزند اکبر محمود سلطنت غزنہ کا بادشاہ بنا وہ نہ صرف بلا کا نڈر انسان تھا بلکہ ایک سلجھا ہوا دماغ رکھنے والا تجربہ کار جرنیل بھی تھا۔ اس نے اپنے دور اقتدار میں برصغیر پر سترہ حملے کئے لیکن اس نے سرزمین پنجاب کے علاوہ برصغیر کے کسی اور حصہ کا اپنی سلطنت سے الحاق نہ کیا۔

ابتدائی حالات

سلطان محمود، سبکتگین کا بڑا بیٹا تھا وہ یکم نومبر ۹۷۱ء کو پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے اُس کی پیشانی سے اقبال مندی اور فطری ذہانت کے آثار جھلکتے تھے۔ اس کی پیدائش کے متعلق روایت ہے کہ اس کے تولد ہونے سے ذرا قبل سبکتگین نے خواب میں دیکھا کہ اس کے گھر کے درمیان چولہے میں ایک درخت اُگ آیا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس قدر بڑا درخت بن گیا ہے کہ اس نے تمام دنیا کو اپنے سائے سے ڈھانپ دیا ہے۔ ابھی وہ یہ خواب بیان کر ہی رہا تھا کہ اسے محمود کی پیدائش کی خوشخبری ملی بعد ازاں یہی خواب ایک حقیقت بن کر سامنے آیا۔ جب محمود نے اپنی بہادری، سخاوت اور عدالگستری کی بدولت ایشیا بھر کے حکمرانوں میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔[2]

محمود نے کم عمری میں ہی اپنے باپ کے ساتھ اہم مہمات میں شریک ہونا اور امور سلطنت کی انجام دہی میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے ایام شہزادگی ہی میں نیشاپور کو فتح کر کے سلطنت غزنہ میں شامل کیا اور خراسان کی گورنری پر مامور ہوا۔ پنجاب کے ہندو شاہی حکمران جے پال کے خلاف دونوں مہموں میں سبکتگین کی کامیابی صرف محمود کی عسکری ذہانت ہی کی مرہون منت تھی۔

---

[1] "دی سلطنت آف دہلی" صفحہ ۶۰

[2] ایشوری پرشاد "ہسٹری آف میڈیول انڈیا"۔ صفحہ ۷۸-۷۷

Marfat.com

تخت نشینی ۹۹۷ء

بستر مرگ پر امیر سبکتگین نے اپنے چھوٹے بیٹے اسماعیل کو امارت غزنہ کا ولی عہد مقرر کیا۔ باپ کی وفات کے بعد محمود نے بلخ اور خراسان کی حکومت پیش کر کے امارت غزنہ خود سنبھالنے کی خواہش کی، مگر اسماعیل نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس پر محمود نے حصول تخت کیلئے اپنے بھائی کے خلاف فوج کشی کی ٹھانی۔ لڑائی سے پیشتر اس نے اسماعیل سے بارِ دیگر مصالحت کی کوشش کی لیکن اسماعیل نے اسکی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ بالآخر معرکہ کارزار گرم ہوا۔ محمود نے اسماعیل کو شکست دیکر اُسے نظر بند کر دیا اور ۹۹۷ء میں تخت نشین ہوا۔ محمود فطری طور پر فاتحانہ ذہنیت اور اعلیٰ عسکری صلاحیتوں کا مالک تھا۔ چنانچہ تخت نشین ہوتے ہی اس نے غزنہ کی چھوٹی سی سلطنت کو جو غالباً سامانی سلطنت کے زیر نگیں تھی، ایک عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کر دیا نیز اس نے سامانی حکمران فوج سے اپنی حکومت کو سیاسی طور پر تسلیم کروایا۔ ۹۹۹ء میں خانیہ کاشغر امیر امین خاں نے زوال پذیر سامانی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو محمود نے نہ صرف اس کے کامیاب اقدام پر اسے مبارکباد ہی دی بلکہ اُسکی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔

خلیفۂ بغداد سے تعلقات نومبر ۹۹۹ء

اس وقت خلیفہ بغداد القادر باللہ تھا اگرچہ اسکی سیاسی قوت ختم ہو چکی تھی مگر عالم اسلام کی ہر نئی حکومت اس سے اپنی حکومت کو تسلیم کرانا اور پروانۂ حکمرانی وصول کرنا اپنا دینی فرض سمجھتی تھی۔ محمود نے اپنے دربار کے ایک مقتدر عالم ابو منصور عبدالملک محمد بن اسماعیل الثعلبی کو سفیر بنا کر دربارِ خلافت میں بھیجا اور خلیفہ القادر باللہ سے تعلقات استوار کر کے غزنی، خراسان اور سیستان پر حکومت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ نومبر ۹۹۹ء میں خلیفہ نے محمود کو یمین الدولہ[1] اور امین الملت کے خطابات سے نوازا۔

اب محمود نے مختارِ مطلق ہو کر امیر کے قدیم لقب کو ترک کر دیا اور اپنی اعلیٰ قوت اور وسیع عملداری کے تحت "سلطان" کا لقب اختیار کیا۔ اس طرح محمود ایشیا کے مسلمان حکمرانوں میں پہلا حکمران تھا جس نے "سلطان" کا لقب اختیار کیا۔ پروفیسر برادن "تاریخ یمینی" کے مصنف ابو نصر محمد عتبی کے حوالہ سے رقمطراز ہے کہ محمود نے اپنے کو عثمانی سلاطین کی مانند بنایا، جن کا نظریہ تھا کہ سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہے۔

برِّصغیر پر محمود کے حملوں کے اغراض و اسباب

سلطان محمود غزنوی نے تخت نشینی کے مسئلے کو طے کرنے اور خلیفۂ بغداد سے اپنی حکومت کو آئینی طور

---

[1] خلیفہ القادر باللہ کی طرف سے عطا کردہ خطاب "یمین الدولہ" ہی کی نسبت سے مؤرخین سلطان محمود غزنوی کی حکومت کو "امارتِ یمینی" بھی کہتے ہیں۔

Marfat.com

پر تسلیم کروانے کے بعد برِ صغیر پاک و ہند کی تسخیر کا منصوبہ بنایا۔ اُسے فتوحات اور مہم جوئی کا ازحد شوق تھا۔ وہ فطری طور پر عسکری ذہانت کا پیکر، مستقل مزاج اور بلا کا نڈر انسان تھا۔ اُسکی عسکری قابلیت مسلّمہ تھی۔ برق رفتاری سے دشمن کے سر پر جا پہنچنا، دشمن کے کمزور پہلوؤں کو فوراً بھانپ جانا اور سرگرمی و تندہی سے اُس کے خلاف برسرِ پیکار ہونا اُس کی کامیابی کے اہم راز تھے۔ وہ عسکری لحاظ سے اس قدر دور اندیش تھا کہ لشکر کشی کے وقت موسموں تک کا لحاظ رکھتا تھا۔

محمود نے برِ صغیر پاک و ہند پر سترہ حملے کئے۔ کہا جاتا ہے کہ محمود نے برِ صغیر پاک و ہند پر ہر سال لشکر کشی کی قسم کھا رکھی تھی۔ لیکن محمود کے متعلق مشہور اور بہت سی باتوں کی طرح یہ بات بھی قطعی مبالغہ آمیز ہے۔ بعض مؤرخین اُس کے حملوں کی تعداد بارہ بتاتے ہیں۔ لیکن سر ہنری ایلیٹ نے اپنی کتاب میں محمود کے حملوں کی تعداد سترہ لکھی ہے جو بالکل صحیح ہے۔ اُس کے حملوں کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل تھے :۔

۱۔ **فوجی برتری :** یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ محمود کے حملوں کی غرض و غائت برِ صغیر میں مستقل حکومت کا قیام نہ تھا۔ کیونکہ ایسا کرنے کے کئی ایک مواقع میسّر آئے۔ لیکن محمود نے اُن سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا۔ اُس نے برِ صغیر کے مختصر حصّے (پنجاب) کا اپنی سلطنت سے جو الحاق کیا، وہ بھی فوجی نقطۂ نگاہ کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا۔ کیونکہ یہ علاقہ اُس کی افواج کو سستانے کا کام دیتا تھا۔ وسعت پذیری کے سلسلے میں محمود کی نگاہ وسطِ ایشیا اور ایران پر تھی۔ جن کو زیرنگیں کر کے وہ عظیم غزنوی سلطنت قائم کرنے کا خواہاں تھا۔ وسطِ ایشیا اور ایران کا علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم، مختلف امراء کے ماتحت تھا۔ محمود اُن امراء پر اپنی فوجی برتری قائم کرنے کے لیے انہیں اپنے زیرنگیں لانا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ فوجی برتری کے لیے فاتحانہ شہرت، عسکری دبدبہ اور وافر دولت کی اشد ضرورت تھی اور یہ مقصد صرف برِ صغیر پر حملوں سے ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔

۲۔ **عسکری شہرت :** محمود فوجی برتری کے ساتھ ساتھ عسکری شہرت کا بھی متمنی تھا۔ چنانچہ اُس نے برِ صغیر پر بار بار فوج کشی کر کے اور اپنے دشمنوں کو زیرنگیں کر کے ایک عظیم عسکری شہرت حاصل کی۔ جس کی صدائے بازگشت دور دراز ممالک میں سنی گئی چنانچہ وسطِ ایشیا اور ایران کے سلاطین پر اُس کی فوجی برتری اور شہرت کی دھاک بیٹھ گئی اور اُسے ایک غازی اور بت شکن سمجھا جانے لگا۔ خود خلیفۂ بغداد بھی اُس کی عسکری شہرت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

۳۔ **اقتصادی استحکام کی خواہش :۔** محمود کے حملہ آور ہونے کی ایک وجہ برِ صغیر

Marfat.com

میں بیم و زر کی فراوانی بھی تھی۔ مندروں کے مندروں میں زر و جواہر کے ذخائر جمع رہتے تھے۔ محمود مال و زر کے ان بے جا مصرف ذخائر کو حاصل کر کے امارت غزنہ کی اقتصادی حالت کو مضبوط بنانا چاہتا تھا، نیز اس مال و زر کو سلاطین عجم کے خلاف مقابلوں میں استعمال کر کے اپنی فوجی حیثیت کو مزید مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ مشہور مؤرخ الفنسٹن رقمطراز ہے کہ:

"ہندوستان پر محمود کے حملوں کی اصل وجہ محض شہرت و ناموری، حصولِ دولت، عسکری دبدبہ اور ملک گیری کی خواہش تھی۔"

اشاعت اسلام کے لئے فضا پیدا کرنا:

بعض مؤرخین محمود کو اسلام کی راہ کا مجاہد قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ایک سچا مسلمان اور مجاہد اسلام تھا اور اس نے صرف اشاعت اسلام کے لئے برصغیر پر بار بار حملے کئے لیکن ڈاکٹر ایم ناظم کی رائے میں:

"ایک فاتح کے نزدیک مذہبی مصلحتوں کو شاذ ہی وزنی سمجھا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمود بھی فتوحات کے منصوبوں میں ان مصلحتوں سے متاثر نہیں تھا۔"[1]

چنانچہ یہ کہنا بھی کہ محمود نے اشاعت اسلام کے لئے بار بار برصغیر پر حملے کئے تاریخی لحاظ سے غلط ہے کیونکہ کوئی ہمعصر کتاب بھی اس چیز کی طرف اشارہ نہیں کرتی کہ اس نے کسی غیر مسلم کو کبھی طاقت یا تبلیغ و تحریک سے مسلمان کیا ہو۔ تاہم یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ محمود نے برصغیر پر بار بار حملے کر کے جہاں بڑے بڑے اسلام دشمن ہندو راجگان کو شکست دی اور تھانیسر، کانگڑہ اور سومنات پر حملوں کے دوران بت شکنی کا مظاہرہ کر کے ہندوؤں کے خود ساختہ مذہبی تفوق اور انکی ضعیف الاعتقادی کو پاش پاش کیا وہاں اس نے بعض ہندو راجگان سے کشادہ قلبی اور فیاضی کا سلوک کر کے نہ صرف انہیں اپنا گرویدہ بنایا بلکہ ان کے دلوں پر ایک صالح مسلمان کے فیاضانہ کردار اور اسلام کی عظمت کے ایسے مستقل نقوش قائم کئے کہ جن کے نتیجے میں برصغیر میں اشاعت اسلام کے لئے فضا سازگار ہو گئی اور متعدد مبلغین اسلام سرزمین ہند میں وارد ہوئے جن میں حضرت سید اسماعیل بخاریؒ، حضرت سید فخر الدین حسین زنجانیؒ، حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ اور حضرت شاہ یوسف گردیزی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مبلغین اسلام کی آمد سے برصغیر میں اسلام کی شمع فروزاں ہو گئی۔

تبصرہ سلطان محمود غزنوی کے حملوں کی نوعیت کے بارے میں بہت بحثیں ہوئی ہیں مثلاً یہ کہ برصغیر پاک و ہند پر بار بار حملے کرنے سے سلطان کا اصل مقصد کیا تھا! کیا وہ مذہب کا داعی اور مبلغ اسلام بن کر آیا تھا!! کیا اسے مذہب نے اس بات پر اکسایا کہ وہ ہندوؤں کے مندروں اور شہروں پر حملے کرتا رہے، یا کیا دنیوی دولت کی حرص نے کھینچ کر مال و زر کے ان ذخائر تک لائی تھی جو ہندوؤں کے مندروں میں جمع تھے؟ دورِ حاضر

---

[1] "دی لائف اینڈ ٹائمز آف سلطان محمود آف غزنہ"

Marfat.com

کے مؤرخین اس بارے میں مختلف آراء رکھتے ہیں۔ بعض اس کی مہموں کو جہاد سے تعبیر کرتے ہیں اور سلطان کو اللہ کی راہ کا مجاہد قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس نے یہ تمام جنگیں اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے لڑیں لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ محمود کے ان حملوں میں دنیا داری کا عنصر غالب اور مذہب کا عنصر برائے نام تھا۔ غزنی کی حکومت گو مسلمانوں کی حکومت تھی مگر وہ اسلامی حکومت کے اصل معیار سے کم تر اور محض ایک سلطنت تھی۔ نیز محمود کی فوج کا بیشتر حصہ تنخواہ دار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ اس کے سپاہی اسلام کے لئے لڑائیاں لڑنے کیلئے نہ نکلے تھے اور نہ ہی وہ جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ محمود کا اصل مقصد اشاعت اسلام نہ تھا بلکہ اپنی نوزائیدہ سلطنت یمینی کا تحفظ تھا جسے پنجاب کے ہندو شاہی حکمران جے پال کی طرف سے حملے کا خطرہ لاحق تھا۔ علاوہ ازیں محمود کی جنگیں جہاد کی جملہ شرائط کو بھی پورا نہیں کرتی تھیں اس لئے انہیں جہاد کا نام دینا اسلامی تعلیمات کے روح کے منافی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ہندوؤں کے مندر سلطان کے حملوں کا نشانہ کیوں بنے؟ اس کا سبب سلطان کا مذہبی تعصب نہ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس زمانے میں ہندوؤں کے مکانات عموماً کچے ہوا کرتے تھے لیکن مندر پتھروں سے تعمیر کردہ قلعوں کی طرح مضبوط و مستحکم تھے۔ ان مندروں میں نہ صرف دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی تھیں بلکہ بعض راجے اپنے خزانے بھی حفاظت کیلئے ان قلعہ نما مندروں میں رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں مندروں اور پجاریوں کا مال و زر بھی ان میں جمع ہوتا تھا۔ بالفاظِ دیگر اس زمانے میں ہندوؤں کے مندر مال و دولت کے خزینے تھے اس لئے قدرتی طور پر ایامِ جنگ میں مسلمان لشکر کا رخ ان مندروں کی طرف ہوتا تھا تاکہ دشمن کا قلع قمع ہونے کے علاوہ مالِ غنیمت بھی زیادہ ہاتھ آئے۔ نیز برصغیر کے ہندو راجگان کی افواج ان مندروں کی حفاظت پر متعین ہوتی تھی۔ اس طرح ایک لحاظ سے دنیوی اغراض و مقاصد کے لئے دو قوموں کی لڑائی مذہبی جنگ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ ظاہر ہے، دو قوموں کے تصادم کی وجہ سے مندروں کو بھی نقصان پہنچتا تھا۔ ڈاکٹر محمد ناظم کی رائے حقیقت پر مبنی ہے کہ

"مال و زر کی احتیاج، نہ کہ اس کی طمع محمود کے ہندوستان پر حملوں کی بنیادی سبب تھی"

برِصغیر پاک و ہند پر محمود کے حملے

۱۔ درہ خیبر کے نواحی علاقوں کی تسخیر ۱۰۰۱ء

۱۰۰۱ء میں سلطان محمود غزنوی نے درہ خیبر کے نواحی علاقوں کی تسخیر کے لئے فوج کشی کی اور ان قلعوں کو زیر نگیں کیا جو قبل ازیں فتح نہیں ہوئے تھے۔

۲۔ جے پال سے جنگ

سبکتگین کی وفات کے بعد محمود امارت غزنہ کی مسند پر متمکن ہوا تو پنجاب کے ہندو شاہی حکمران جے پال نے دوبارہ پر پرزے

Marfat.com

نکلنے شروع کئے۔ اور اپنے کھوئے ہوئے علاقوں پشاور اور لمغان (جلال آباد) کو واپس لینے کے سلطنتِ غزنہ کے مقبوضات پر حملہ کر دیا۔

اس پر محمود پندرہ ہزار جنگ آزما سواروں کے ساتھ یلغار کرتا ہوا پشاور پہنچ گیا۔ ۲۷ نومبر ۱۰۰۱ء بروز جمعرات دی ہند (ہنڈ) کے مقام پر دونوں کی افواج کا مقابلہ ہوا۔ جے پال کی فوج تیس ہزار پیادہ سپاہیوں، بارہ ہزار سواروں اور تین سو جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ دن بھر گھمسان کا رن پڑا۔ میدانِ کارزار لاشوں سے اٹ گیا۔ بالآخر میدان محمود کے ہاتھ رہا۔ جے پال کو شکست ہوئی اور وہ مع اپنے پندرہ بیٹوں اور پوتوں کے گرفتار ہو کر محمود کے حضور پیش ہوا اور ڈھائی لاکھ دینار زرِ فدیہ (تاوانِ جنگ) کے طور پر دے کر رہا ہوا۔ لیکن لاہور پہنچ کر مسلسل ناکامیوں اور پیہم شکستوں کی خجالت کے سبب چتا میں بیٹھ کر اپنے آپ کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس فتح سے عالم اسلام میں محمود کے فوجی دبدبے کی دھاک بیٹھ گئی۔

۳: بھائیہ والے رائے سے جنگ

۴-۱۰۰۳ء

بھائیہ (بھیرہ) کے راجہ بجے رائے سے امیر سبکتگین کے دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ لہٰذا محمود کو امید تھی کہ جے پال کے خلاف جنگ میں راجہ بجے رائے اس کی امداد کو پہنچے گا۔ لیکن وہ خاموش تماشائی بن کر غیر جانبدار ہو کر بیٹھا رہا، اور محمود کی مدد کو نہ آیا۔ اس پر محمود نے اس کی گوشمالی کے لیئے ۴-۱۰۰۳ء میں بھائیہ (موجودہ بھیرہ) پر حملہ کر دیا۔ راجہ بجے رائے نے تین روز تک ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن چوتھے روز مقابلے کی سکت نہ پا کر قلعہ بند ہو گیا۔ محمود نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس پر راجہ نے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی۔ بعد ازاں جب پکڑا جانے لگا تو اپنے پیٹ میں خنجر بھونک کر خودکشی کر لی۔ قلعہ بھائیہ کی فتح سے بہت سا مالِ غنیمت محمود کے ہاتھ آیا۔

۴:- ملتان پر یلغار

۶-۱۰۰۵ء

ملتان کا حاکم شیخ حمید لوی[1]، امیر سبکتگین کا ہمعصر تھا اور امیر سے اس سے مراسم نہایت خوشگوار تھے۔ شیخ حمید لوی کا پوتا ابوالفتح داؤد لوی، سلطان محمود کا ہمعصر تھا۔ وہ اپنے باپ

---

[1] طبقاتِ ناصری کے مترجم مشہور محقق ریورٹی اور "مروج الذہب" کے مولف مسعودی کے قول کے مطابق لوی خاندان کا جدِ امجد اسامہ بن لوی بن غالب تھا۔ اس خاندان کا ہر حکمران اپنے نام کے ساتھ لوی لکھتا تھا۔ سر ڈبلیو ہیگ اور پروفیسر حبیب مشہور تاریخ دان محمد بن قاسم ہندو بیگ فرشتہ کی تائید میں رقمطراز ہیں کہ لوی خاندان کے حکمران قرامطی فرقہ کے پیروکار تھے۔ اور تمام اسماعیلی اور قرامطی، خلافتِ عباسیہ کے حریف تھے۔ اور عباسیوں کی خلافت کو برحق تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ملتان میں لوی خاندان کے برسرِ اقتدار آنے سے ریاست ملتان عباسیوں کے دشمنوں کی پناہ بن گئی تھی۔

Marfat.com

دادا کی پالیسی کے برعکس سلطان محمود کا مخالف اور بھیرہ کے راجہ بجے راے کا حلیف تھا چنانچہ جب سلطان محمود بھیرہ کی تسخیر کے بعد غزنی واپس جا رہا تھا، ابوالفتح داؤد لودی نے اس کا راستہ روک کر غزنوی فوج کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس پر سلطان محمود اس کی گوشمالی کی نیت سے ۶-۱۰۰۵ء میں ملتان کی طرف بڑھا۔

محمود نے ملتان پہنچنے کے لیے دریائے سندھ کو اٹک کے قریب سے عبور کرنا چاہا، مگر راجہ آنند پال والیٔ لاہور اس پر معترض ہوا اور اس نے محمود کا راستہ روک لیا۔ اس پر محمود نے اُسے شکست دے کر کشمیر کی طرف بھگا دیا۔ اور خود ملتان روانہ ہوگیا۔ ابوالفتح داؤد کھلے میدان میں مقابلہ کی تاب نہ لاکر ملتان کے قلعہ میں محصور ہوگیا۔ محمود نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر ابوالفتح داؤد ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگیا۔ بیس ہزار طلائی مُہر سالانہ خراج ادا کرنے اور قرامطی عقائد سے تائب ہونے کے وعدے پر محمود نے اُسے چھوڑ دیا، اور ملتان پر اسے بحال رکھا۔

محمود ملتان کی قرامطی حکومت کے کُلّی استیصال کے بعد ملتان اور سندھ کی مکمل تسخیر کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن جب دوران محاصرہ اسے امارتِ غزنہ کی شمالی سرحد پر ایلک خان والیٔ کاشغر (جو محمود کا خسر بھی تھا) کے حملہ آور ہونے کی خبر ملی تو وہ ابوالفتح داؤد سے شرائط صلح مذاکرات تیزی سے کاشغر کی طرف روانہ ہوگیا۔

۵ :- نواسہ شاہ کی گوشمالی

۷-۱۰۰۶ء

نواسہ شاہ کا اصل نام سُکھ پال تھا۔ وہ راجہ جے پال کا نواسہ تھا۔ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے دربارِ محمود میں نواسہ شاہ کے لقب سے مشہور تھا۔ تسخیر ملتان کے دوران سرحدِ کاشغر پر ایلک خان کے حملہ کی اطلاع پاکر محمود نے ابوالفتح داؤد سے جلدی جلدی صلح کی شرائط منوا کر سرحدِ کاشغر کی راہ لی۔ اُس نے نواسہ شاہ کو برصغیر میں اپنا قائم مقام اور ریاست ملتان کا نگران مقرر کیا تھا۔ محمود کو سرحدِ کاشغر پر مصروف پیکار دیکھ کر نواسہ شاہ نے اپنے ماموں آنند پال کی ترغیب و سازش سے مرتد ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا اور ملتان سے بھیرہ پہنچ کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

سلطان محمود کاشغر کی مہم سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اسے نواسہ شاہ کے باغی ہونے کی اطلاع ملی۔ اس پر وہ غضبناک ہو کر اس کی گوشمالی کی غرض سے فوراً بھیرہ پہنچا، اور نواسہ شاہ کو شکست دے کر گرفتار کر دیا اور اپنے ساتھ غزنی لے گیا۔ جہاں اُسے قید میں ڈال دیا گیا۔

Marfat.com

۶:۔ تسخیر پنجاب
۹ - ۱۰۰۸ء

پنجاب کا ہندو شاہی راجہ آنند پال اور اس کا ہمشیر زاد نواسہ شاہ (سکھ پال) دولتِ غزنہ کی سیادت قبول کرنے کے باوجود محمود کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ محمودؒ نے نواسہ شاہ کو نظر بند کرنے کے بعد آنند پال کی سرزنش کا مصمم ارادہ کرتے ہوئے زور شور سے فوجی تیاری شروع کر دی۔ آنند پال کو محمود کی لشکر کشی کی اطلاع ملی تو اس نے بھی وسیع پیمانے پر جنگی تیاریاں کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور کالنجر، قنوج، اُجین اور گولیار کے ہندو راجاؤں سے دھرم کے نام پر امداد کی درخواست کی۔ وہ آنند پال کو اپنی سرحدوں کا محافظ تصور کرتے تھے اس لیئے انہوں نے اس کی امداد کرنے میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کیا اور کثیر تعداد میں محمود کے مقابلے کے لیئے آنند پال کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ جہلم، راولپنڈی اور اٹک کے جنگجو کھوکھر اس کے علاوہ تھے۔ جو جنگلی درندوں کی مانند حملہ کرنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ اس ضمن میں ہندو عورتوں کا ایثار بھی قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے اپنے زیورات فروخت کر کے اپنے سپاہیوں کے لیے اسلحہ فراہم کیا۔ ہندوؤں کی اس متحدہ فوج کی قیادت آنند پال کے بڑے لڑکے تری لوچن پال کے ہاتھ میں تھی۔ یہ ٹڈی دل فوج لاہور سے چل کر حضرو کے میدان میں پہنچکر مورچہ بند ہو گئی۔

آنند پال کے حملے کی اطلاع پاکر ۱۴، دسمبر ۱۰۰۸ء کو محمود بھی غزنی سے وہند (ہنڈ) کی طرف چل پڑا، اور حضرو کے میدان میں پہنچ کر ہندو فوج کے سامنے خیمہ زن ہوا۔ چار روز کے بعد دونوں افواج کے درمیان معرکہ خیز جنگ ہوئی۔ سامانِ حرب اور تعداد کے لحاظ سے مسلمان فوج کی حالت مقابلتاً کمزور تھی۔ قریب تھا کہ کفر اور اسلام کی اس جنگ میں اسلامی لشکر ہزیمت سے دوچار ہو، سلطان محمود نے شمشیروں، بھالوں اور تیروں کے سائے میں خداوند تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو کر لشکرِ اسلام کی فتح و نصرت کی دعا مانگی۔ بعد ازاں فوج کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کر کے سپاہیوں کے جذبۂ حریت کو ابھارا اور دشمنوں کی صفوں پر شدید اور بھرپور حملے کا حکم دیا۔ لشکرِ اسلام کے غازیوں کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ جلد ہی آنند پال کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ آنند پال شاید کچھ وقت اور مقابلہ میں ٹھہرتا، مگر اس کا سواری کا ہاتھی سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ کشمیر کی طرف فرار ہو گیا اور گمنامی کی موت مر گیا۔

اس جنگ کے نتیجہ کے طور پر بے شمار مالِ غنیمت محمود کے ہاتھ آیا۔ اور تمام راجگان ہند کے دلوں پر اُس کی عسکری قوت کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور اسلامی ممالک میں محمود کی عزت و توقیر

Marfat.com

۷:۔ کانگڑہ اور نگرکوٹ کی تسخیر
۱۰۰۹ء

کانگڑہ ہندوؤں کا ایک مقدس مقام تھا۔ اور یہاں کا قلعہ جو پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا۔ ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے مندر نہایت متبرک متصور ہوتے تھے۔ اُن میں صدیوں سے بے اندازہ دولت جمع ہو رہی تھی۔ کانگڑہ، ہوشیارپور اور جالندھر کے علاقوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ریاست کانگڑہ کو تین علاقوں والی ریاست" تری گرتا بھی کہتے تھے۔

۱۰۰۹ء میں محمودؒ نے کانگڑہ کی تسخیر کا عزم صمیم کرتے ہوئے کانگڑہ کا رُخ کیا۔ اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ تین دن کی مسلسل جنگ کے بعد محصورین نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور قلعہ کانگڑہ پر ہلالی پرچم لہرانے لگا۔ یہاں سے بے اندازہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ جس میں چاندی کا بنا ہوا ایک ایسا چھرکھٹ بھی تھا جو ساٹھ فٹ لمبا اور پچاس فٹ چوڑا تھا۔ بعد ازاں محمودؒ نے قلعہ کے متصل دس میل پر واقع نگرکوٹ کے شہر پر بھی قبضہ کر لیا۔

۸:۔ ابوالفتح داؤد کی گوشمالی
۱۰۱۰ء - ۱۱

حاکم ملتان ابوالفتح داؤد نے عہد نامہ کی شرائط سے انحراف کرتے ہوئے قرامطی عقائد کو ترک نہ کیا۔ اس پر سلطان نے اس کی گوشمالی کی غرض سے ۱۰۱۰ء میں دوسری بار ملتان پر یلغار کی۔ قرامطی سردار شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ محمود نے اُسے قندھار کے شمال مغرب میں واقع قلعہ غورک غور میں قید کر دیا اور ملتان پر قبضہ کر کے وہاں اپنے حاکم متعین کئے۔ اور دوسرے قرامطیوں کو سخت سزائیں دیں۔

۹:۔ تسخیر تھانیسر
۱۰۱۴ء

۱۰۱۴ء کے موسم سرما میں سلطان محمود تھانیسر کی تسخیر کے لیئے روانہ ہوا۔ تھانیسر میں ہندوؤں کا ایک مقدس بت تھا۔ جس کی بہت پرستش ہوتی تھی اور جو چکر سوامی کے نام سے مشہور تھا مشہور مورخ فرشتہ کا بیان ہے کہ " ہندو شاہی حکمران آنند پال نے سلطان محمود سے استدعا کی کہ اگر تھانیسر کے قدیم اور مقدس شہر پر فوج کشی نہ کی جائے اور وہاں کے مندروں کو محفوظ رہنے دیا جائے۔ تو وہ اس کے عوض پچاس ہاتھی اور زرِ کثیر بطورِ باج ادا کرنے کو تیار ہے۔ مگر سلطان نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور تھانیسر کی راہ لی" تھانیسر کے راجہ نے دوسرے ہندو راجاؤں کو اپنے ساتھ ملانا چاہا لیکن اس نے یہ کوشش اس وقت کی جب کہ وقت گذر چکا تھا اور محمودؒ کی فوجیں سر پر آچکی تھیں۔ محمود عقاب کی مانند تھانیسر پر جھپٹا۔ مقامی فوجوں نے اگرچہ بڑی جرأت و بہادری کے ساتھ غزنوی افواج کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اس جنگ میں کثیر مالِ غنیمت

Marfat.com

محمود کے ہاتھ لگا۔ غزنی واپس جاتے ہوئے محمود چکر سوامی کا بت بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

۱۰۔ نندنہ کی فتح
۱۰۱۴ء

پنجاب کے ہندو شاہی راجہ آنند پال کی موت کے بعد اس کا لڑکا تری لوچن پال راج گدی پر بیٹھا۔ تری لوچن پال نے سلطان محمود کو اپنی وفاشعاری اور اطاعت گذاری کا یقین دلاتے ہوئے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک کمزور طبع اور نرم مزاج راجہ تھا۔ اس لیے امور سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں اصل کرتا دھرتا اس کا بڑا بیٹا بھیم پال ثانی تھا۔ جو ایک بے باک اور آزاد طبع نوجوان تھا، اور عوام میں نڈر بھیم کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے سلطنتِ غزنہ کی سیادت سے آزاد ہو کر خود مختار ہونے کی کوشش کی۔ محمود نے اس کے باغیانہ عزائم کے پیش نظر ۱۰۱۳ء کے موسم خزاں میں ہندو شاہی کی نئی راجدھانی نندنہ[1] پر یلغار کا ارادہ کیا۔ مگر شدید برف باری کے باعث اپنے عزائم کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ آخر ۱۰۱۴ء کے موسم بہار میں محمود نے نندنہ کا محاصرہ کر لیا۔

محمود کی آمد پر راجہ تری لوچن پال راجدھانی کا دفاع بھیم پال کے سپرد کر کے خود وادیٔ کشمیر راجہ سنگرام سے فوجی امداد حاصل کرنے کے لیے کشمیر روانہ ہو گیا۔ بھیم پال نے محمود کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مگر شکست سے دوچار ہوا۔ محمود نے قلعہ پر قبضہ کر کے وہاں اپنا گورنر متعین کیا۔ دریں اثنا محمود کو خبر ملی کہ راجہ تری لوچن پال وادیٔ کشمیر کی مہیا کردہ فوجی امداد کے ساتھ نندنہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس پر محمود نے جہلم کے نواح میں اسے جا لیا اور اسے شکستِ فاش دے کر واپس غزنی لوٹ گیا۔

۱۱۔ تسخیرِ کشمیر
۱۰۱۵ء

کشمیر کے حکمران پنجاب کے ہندو شاہی حکمرانوں کے حلیف تھے اور وقتاً فوقتاً محمود کے خلاف ان کی فوجی امداد کرتے رہتے تھے۔ ۱۰۱۵ء میں محمود نے سنگرام راجہ کی کوشمالی کے لیے کشمیر پر حملہ کر دیا اور لوہ کوٹ کے بلند ترین اور مضبوط قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن برفباری شروع ہو جانے کی وجہ سے محمود کو محاصرہ اٹھا کر واپس غزنی جانا پڑا۔ سفرِ مراجعت میں راستہ بھول جانے، دشوار گذار پہاڑی راستوں اور شدید برفباری کے باعث محمود کی بہت سی فوج ہلاک ہو گئی۔ ۱۰۲۱ء میں محمود دوسری بار کشمیر پر حملہ آور ہوا۔ لیکن اس بار بھی وہ ناکام رہا۔ اس کے بعد اس نے کشمیر کی تسخیر کا ارادہ ترک کر دیا۔

---

[1] بعض مستند مورخین کی رائے میں نندنہ کوہِ نمک یعنی کھیوڑہ کے قریب واقع تھا۔

Marfat.com

۱۲۔ تسخیرِ قنوج
۱۰۱۸ء - ۱۰۱۹ء

ہندو شاہی کو پامال کر کے محمود کے لیئے برِصغیر کا راستہ صاف ہو گیا۔ چنانچہ ۱۰۱۸ء میں سلطان غزنی سے روانہ ہوا اور پنجاب کے متعدد قلعوں پر قبضہ کرتا ہُوا ۲ر دسمبر ۱۰۱۸ء کو دریائے جمنا پار کر کے برن (بلند شہر) پر حملہ آور ہُوا۔ برن کے راجہ ہردت (ہرادتہ) نے مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے محمود کی نہ صرف اطاعت قبول کر لی۔ بلکہ اپنے دس ہزار ساتھیوں سمیت مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

بعد ازاں محمود نے مہابن اور متھرا جیسے اہم مقامات کو تاراج کیا اور بے اندازہ زر و جواہر سے مالا مال ہُوا۔ متھرا سے محمود نے قنوج کا رُخ کیا جو شان و شوکت کے لحاظ سے ایک عظیم شہر تھا۔ اس میں دس ہزار مندر تھے۔ قنوج کے راجہ راجپال نے اپنی عظیم فوج جو اسی ہزار زرہ پوشوں، تیس ہزار شہسواروں اور پانچ لاکھ پیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھی، کے ساتھ محمود کا مقابلہ کیا لیکن انجام کار مقابلہ کی تاب نہ لاکر میدانِ جنگ سے بھاگ گیا۔ محمود نے قنوج اور اس کے گرد و نواح کے تمام قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ جہاں سے اُسے زرِ کثیر مالِ غنیمت کی صورت میں ہاتھ لگا۔ اس کے بعد محمود جلد ہی منج، اسنی اور شروا کے اہم قلعوں پر بھی قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ محمود کے رعب اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ کئی مقامات کے راجے اس کی خبر سن کر حملہ سے پہلے ہی بھاگ گئے اور اپنی رعایا اور مندروں کے دیوتاؤں کو بے یار و مددگار چھوڑ گئے یہ حال دیکھ کر قنوج کے راجہ راجپال نے محمود کی سیادت قبول کر لی اور سالانہ باج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس عظیم الشان فتح کی خبر سارے عالم اسلام میں پھیل گئی چنانچہ خلیفہ عباسی نے محمود کے فتح نامہ کو وصول کرنے کے لیئے ایک دربار خصوصی منعقد کیا۔

۱۳۔ کالنجر پر یلغار
۱۰۱۹ء - ۱۰۲۰ء

ہندوستان سے محمود کے واپس جانے کے بعد ہندو شاہی حکمران تری لوچن پال اور کالنجر کے راجہ رائے نندہ کے مابین اتحاد ہو گیا۔ رائے نندہ نے قنوج کے راجہ راجپال کو محمود کے مقابلہ کے وقت راہِ فرار اختیار کرنے پر ملامت کی۔ اور گوالیار کے راجہ کی اعانت سے راجپال کے خلاف فوجی کارروائی کی اور اُسے قتل کر دیا۔ ان حالات میں محمود کو پھر فوج کشی کرنی پڑی۔

محمود کے حملہ کی اطلاع پاکر پنجاب کے ہندو شاہی حکمران، کالنجر، گوالیار اور کرد و نواح کے دوسرے راجاؤں نے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ پنجاب کے راجہ تری لوچن پال نے محمود کی پیشقدمی کو روکنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جونہی محمود نے دریائے ستلج کو عبور کیا، وہ دل ہار

Marfat.com

بیٹھا اور راجہ کالنجر کے ہاں جا پناہ گزین ہوا۔

کالنجر کا راجہ رائے نندہ اپنے جنگی حلیفوں کی معیت اور چھتیس ہزار سواروں، ڈیڑھ لاکھ پیادہ سپاہ اور ساڑھے پھ سو جنگی ہاتھیوں کے ساتھ بڑے طمطراق سے محمود کے مقابلہ پر آیا۔ لیکن محمود کے دبدبہ سے اس قدر ہراساں ہوا کہ راتوں رات فرار ہو گیا۔ محمود دور دراز علاقہ میں مزید قیام اور لشکر کشی کو مناسب نہ سمجھ کر مالِ غنیمت لے کر واپس غزنی چلا گیا۔

۱۴:- الحاقِ پنجاب
۱۰۲۱ء - ۱۰۲۲ء

محمود کو پنجاب پر قبضہ کرنے کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کی دور دراز کی مہمیں خطرہ سے خالی نہ تھیں۔ چنانچہ وہ پنجاب کے ہندو شاہی حکمران کی رلیشہ دوانیوں کے انسداد اور پنجاب کی مکمل تسخیر کی غرض سے غزنی سے روانہ ہوا۔ اور ۱۰۲۱ء کے موسمِ سرما میں پنجاب کی ہندو شاہی سلطنت پر حملہ آور ہوا۔ اس وقت تری لوچن پال کا لڑکا بھیم پال نڈر لاہور کا راجہ تھا۔ محمود نے اُسے شکستِ فاش دی۔ بھیم پال نے بھاگ کر اجمیر کے راجہ کے ہاں پناہ لی۔ اور وہیں ۱۰۶۶ء میں وفات پائی۔ اس کی موت سے پنجاب کے ہندو شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

پنجاب پر قبضہ کرنے اور اس کا باقاعدہ سلطنتِ غزنہ کے ساتھ الحاق کرنے کے بعد محمود نے پنجاب کے انتظام کے لیئے عوامل مقرر کیئے۔ لاہور کو پنجاب کا دار السلطنت قرار دیا۔ اور یہاں کی گورنری اپنے چہیتے غلام ایاز کے سپرد کی۔ اس علاقہ کے تحفظ کے لیئے اس نے اہم مقامات پر فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔

۱۵: گوالیار و کالنجر
۱۰۲۲ء - ۲۳

کالنجر کے چنڈیلہ راجہ رائے نندہ نے راجہ گوالیار کے ساتھ مل کر پھر پر پرزے نکالنے شروع کیئے اور اپنے جھنڈے تلے ایک بھاری فوج جمع کر لی۔ رائے نندہ کی ان جنگی تیاریوں کی اطلاع غزنی پہنچی تو ۱۰۲۲ء میں سلطان محمود اس کی گوشمالی کے لیئے ایک بار پھر عازمِ ہند ہوا

محمود نے کالنجر پر حملہ آور ہونے سے قبل گوالیار کا محاصرہ کیا۔ وہاں کے راجہ نے مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے پینتیس ہاتھی بطور نذرانہ بھیج کر امان طلب کی۔ اور آئندہ مطیع و منقاد رہنے کا وعدہ کیا۔ یہاں سے سلطان پورب کی طرف بڑھا اور کالنجر پر حملہ آور ہوا۔ راجہ رائے نندہ قلعہ بند ہو گیا۔ محمود نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ چند روز کے بعد ہی راجہ نے عاجز ہو کر نین سو ہاتھی نذر کر کے صلح کی درخواست کی۔ علاوہ ازیں محمود کی تعریف میں کچھ ہندی اشعار بھی لکھ کر بھیجے۔ محمود نے نہ صرف اس کی درخواستِ صلح قبول کر لی بلکہ پندرہ قلعے اپنی

Marfat.com

طرف سے راجہ کو بطور انعام عطا کئے۔ راجہ نے اس گرانقدر انعام سے مسرور ہو کر بہت سے قیمتی تحائف اور نذرانے سلطان کی خدمت میں پیش کئے۔ چنانچہ محمود برصغیر کے انتہائی مشرق میں واقع، ناقابلِ تسخیر قلعۂ کالنجر کو فتح کرنے کے بعد کامیابی و کامرانی کے شادیانے بجاتا ہوا ۱۰۲۳ء میں واپس غزنی چلا گیا۔

۱۶۔ حملہ سومنات
۱۰۲۵ء - ۱۰۲۶ء

برصغیر پر محمود کے حملوں میں اہم ترین، سومنات پر حملہ ہے۔ سومنات، جس کے لفظی معنیٰ چاند دیوتا ہیں۔ شیو جی کا بہت بڑا اور مشہور مندر تھا۔ شیو جی کو تمام دیوتاؤں سے افضل اور تمام بتوں کا سردار تصور کیا جاتا تھا۔ یہ کاٹھیا واڑ کے علاقے میں ساحلِ سمندر پر واقع تھا۔

۱۸۔ اکتوبر ۱۰۲۵ء کو سلطان محمود سومنات کو تسخیر کرنے کے لیئے غزنی سے روانہ ہوا[1] اُس کے ہمراہ سلطنتِ غزنہ کے لشکرِ جرار کے علاوہ خراسان، ترکستان اور غزنی کے تیس ہزار رضاکار بھی تھے جو محض جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر شاملِ لشکر ہوئے تھے۔ محمود ۹ نومبر ۱۰۲۵ء کو ملتان پہنچا اور یہاں سے سفر کی پوری تیاری کے بعد جیسلمیر، اجمیر اور نہروالہ کے راستے سومنات کی طرف روانہ ہوا۔ چونکہ سومنات پہنچنے کے لیئے راجپوتانہ کے دشوار گذار صحرا کو عبور کرنا ناگزیر تھا۔ اس لیے سلطان نے ہر سپاہی اور رضاکار کو حکم دیا کہ وہ اپنے اور اپنے گھوڑے کے لیئے کئی دن کی خوراک اور پانی کا بندوبست کرلے۔ اس کے باوجود حفظ ماتقدم کے طور پر ہزار اونٹوں پر سامانِ خوراک اور پانی سرکاری طور پر بھی لاد لیا گیا۔ محمود ۶ جنوری ۱۰۲۶ء کو سومنات جا پہنچا۔

اس قدیم اور پُرشکوہ قلعہ نما مندر کی عمارت بہت وسیع اور بلند تھی، اور چھپن ستونوں کے سہارے کھڑی تھی۔ یہ مندر سمندر کے کنارے واقع تھا۔ سمندر کی لہریں ہر وقت اس کی سیڑھیوں کو چھوتی رہتی تھیں۔ ہندوؤں کا اعتقاد تھا کہ موت کے بعد انسان کی روح اس مندر میں آجاتی ہے۔ بتوں کے سامنے بیش قیمت جواہرات سے مرصع پردے لٹکے رہتے تھے۔ مندر کی بڑی بڑی گھنٹیاں طلائی زنجیروں سے بندھی ہوئی تھیں، جو دو سو من وزنی تھیں۔ مندر کی نگرانی اور نگہداشت کے لیئے ایک ہزار برہمن متعین تھے اور پانچ سو حسین و مادہ جیسیں لڑکیاں (دیوداسیاں، شیولنگ کی خوشنودی کے لیئے آرتی اور رقص کرتی تھیں۔ مندر کی دیواریں جواہرات سے مزین تھیں جن کی روشنی سے مندر ہر وقت جگمگ جگمگ کرتا رہتا تھا۔ مندر کے اخراجات کے لیئے دس ہزار گاؤں وقف تھے اور شیولنگ کو غسل دینے کے لیئے ہر روز دریائے گنگا سے پانی لایا جاتا تھا۔ مندر میں تر

---

[1] ایس۔ ایم جعفر "میڈیول انڈیا انڈر مسلم رولرز" (جلد دوم) صفحہ ۸۷

Marfat.com

کے نذرانوں کے ذریعے کروڑ ہا روپے کا مال و زر جمع ہو چکا تھا۔

ہندو مؤرخین کا خیال ہے کہ سومنات کی بے پناہ دولت محمود کے حملے کا باعث ہوئی۔ لیکن ابنِ اثیر، ابنِ خلدون اور فرشتہ کی آراء اس کے بالکل برعکس ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ:

"جب محمود نے برصغیر پاک و ہند کے مختلف راجگان کو شکست دی اور ہندوؤں کے متعدد مندر اُس کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہوئے تو ہندوؤں نے کہنا شروع کر دیا کہ جن دیوتاؤں کے مندر برباد ہوئے ہیں، اُن سے شِوجی (سومنات) ناراض تھے۔ اگر محمود نے سومنات پر حملہ کیا تو وہ تباہ و برباد ہوگا اور منہ کی کھائے گا۔"

چنانچہ محمود نے ہندوؤں کے اس خیال کو باطل ثابت کرنے اور بتوں کی جھوٹی عظمت، اور وقعت ختم کرنے کے لیئے سومنات پر حملہ آور ہونے کا عزم صمیم کیا۔ تاکہ لوگوں پر بتوں کی بے بسی اور بے ثباتی واضح ہو جائے اور لوگ بُت پرستی اور شرک کو ترک کر دیں۔

محمود ۶ جنوری ۱۰۲۶ء کو سومنات پہنچا[1]۔ ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ مندر کے پجاری اور شہر کے لوگ قلعہ کی دیواروں پر کھڑے ہو کر مسلمان حملہ آوروں کا منہ چڑانے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ سومنات دیوتا اُن سب کو ٹھکانے لگا دے گا۔ مندر کی محافظ فوج کا سپہ سالار جو دوسروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ سمجھ دار اور دور اندیش تھا۔ محمود کی آمد کی خبر سنتے ہی فرار ہو گیا۔ لیکن مندر کے محافظ سپاہیوں اور پجاریوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مسلمان کمندیں ڈال کر فصیل پر چڑھ گئے لیکن محافظوں نے انہیں مار بھگایا۔ دوسرے روز مسلمانوں نے مندر پر سخت حملہ کیا۔ مندر کے دروازے پر خونریز جنگ ہوئی محافظوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور مندر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ شکست خوردہ فوج نے کشتیوں میں سوار ہو کر پانی کی راہ بچ نکلنے کی کوشش کی مگر مسلمانوں نے تعاقب کر کے کشتیوں کو غرقاب کر دیا۔ بہت سے سومناتی محافظ سمندر میں ڈوب گئے۔ ہمعصر مورخین کا کہنا ہے کہ سومنات کی جنگ میں پچاس ہزار کے لگ بھگ ہندو ہلاک ہوئے۔ فاتح سلطان محمود نے مندر میں داخل ہو کر شِولنگ (بُت) کو گُرز مار کر پاش پاش کر دیا۔ جس کے ٹکڑے بعد میں غزنی، مکہ اور بغداد روانہ کیئے گئے تاکہ انہیں مسجدوں کی سیڑھیوں میں نصب کیا جائے اور مومنوں کے پاؤں تلے روندے جائیں۔

سومنات میں دو ہفتے کے قیام کے بعد محمود نے اندازہ زر و جواہر کے ساتھ واپس غزنی روانہ ہوا۔ واپسی پر راجپوتانہ کے راجاؤں نے راجہ پرم دیو (ایلیئے آبو کی سرکردگی میں محمود کا راستہ روکنے کا ارادہ کیا۔ محمود کا لشکر مالِ غنیمت سے لدا ہوا تھا، اس لیے اس نے دشمنوں سے لے جا الجھنے کی بجائے اجمیر کا راستہ

---

[1] ڈاکٹر ایم ناظم "دی لائف اینڈ ٹائمز آف سلطان محمود آف غزنہ" صفحہ ۱۲۶

Marfat.com

ترک کر کے سندھ کا رخ کیا۔ چنانچہ خلیج کچھ کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا سلطان محمود سندھ پہنچا، اور ۲۵ اپریل ۱۰۲۶ء کو بھکر، ملتان سے ہوتا ہوا غزنی پہنچا۔ راستے میں سندھی جاٹوں نے اُسے بہت تنگ کیا اور اس کی فوج کو نقصان پہنچایا۔ "سومنات کی مہم میں کامیابی سے اسلامی دنیا میں محمود کا وقار و دبدبہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ اس کی اس کامیابی نے نہ صرف ہندو دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ بلکہ ان کے حوصلے اور قوتِ مدافعت بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو کر رہ گئی"[1] ڈاکٹر ایم۔ ناظم کی رائے ہے:

"سومنات کی مہم تاریخ اسلام میں بلاشبہ ایک عظیم عسکری کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس فتح کی خبر نے عالمِ اسلام میں مسرت کی لہر دوڑا دی اور خلیفہ بغداد نے خوش ہو کر سلطان محمود۔ اس کے بیٹوں اور بھائی کو خطابات و اعزازات سے نوازا ۔ سومنات کا بت تباہ و برباد ہو گیا۔ لیکن سلطان محمود کے نام کو شہرتِ دوام حاصل ہو گئی"[2]

سومنات کے متعلق حکایات

شوجی کے بُت کے بارے میں کئی حکایتیں مشہور ہیں:۔

شوجی کا بُت مندر کے عجائبات میں سب سے بڑا اور نمایاں تھا اور زکریا القزوینی کے بیان کے مطابق بغیر سہارے کے مندر کے وسط میں معلق تھا۔ اسے خلا میں معلق دیکھ کر سب لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ ہندوؤں کے نزدیک اس کی بے پناہ توقیر تھی۔ چاند گرہن کے موقع پر ملک کے دور دراز حصوں سے ہندو جوق در جوق اس کی یاترا کیلئے آتے تھے۔

جب محمود نے اپنے مصاحبوں سے اس بُت کے خلا میں معلق ہونے کی وجہ دریافت کی تو اُن میں اکثر نے رائے ظاہر کی کہ بُت کسی پوشیدہ سہارے کی بنا پر کھڑا ہے۔ چنانچہ ایک شخص کو حکم دیا گیا کہ وہ بُت کے چاروں طرف تلوار گھما کر دیکھے۔ تلوار کو گھما کر دیکھا گیا مگر کوئی چیز مانع نہ ہوئی۔ ایک مصاحب نے خیال ظاہر کیا کہ اس کا بالائی چتر مقناطیس کا بنا ہوا ہے۔ اور بُت دھات کا۔ اس لیے مقناطیس کی کشش کے زیرِ اثر خلا میں معلق ہے۔ مگر بعض مصاحب اس رائے سے متفق نہ تھے۔ بالآخر بادشاہ کی اجازت سے کچھ پتھر چتر سے ہٹائے گئے۔ اس سے مورتی ایک طرف کو جھک گئی۔ جب اور پتھر ہٹائے گئے تو یہ اور جھک گئی۔ حتیٰ کہ زمین پر آ رہی۔

دوسری حکایت جو بہت مشہور ہے اور موجودہ دور کی درسی کتب میں بھی اکثر ملتی ہے تاریخ فرشتہ سے لی گئی ہے۔ چونکہ انگریزی دور کے مورخین کا سب سے اہم ماخذ تاریخ فرشتہ ہی ہے اس

---

[1] اے کبیر۔ "اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان" جلد دوم۔ صفحہ ۱۹

[2] "دی لائف اینڈ ٹائمز آف سلطان محمود آف غزنہ" صفحہ ۱۲۱ - ۱۲۰

Marfat.com

لئے یہ حکایت بہت مشہور ہوگئی۔ اس حکایت کے مطابق محمود مندر میں پہنچا تو برہمنوں نے منت وسماجت کی کہ اس بُت کے ہموزن زر و جواہر وصول کر کے اُسے توڑنے سے گریز کیا جائے مگر محمود نے اُس پیش کش کو رد کرتے ہوئے کہا:

گفت ترسیدم کہ در روز شمار — بر سرِ آں جمع گوید کرد کار
آذر و محمود را دارید گوش — زانکہ ہست او بت تراش، ایں بُت فروش[1]

اور اس کے بعد بُت کو آگ لگادی گئی۔ جب وہ بت جلا تو اُس میں سے پیس من وزن کے برابر جواہرات برآمد ہوئے۔ موت کے بعد محمود کو اسلامی دنیا میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی ذات کے بارے میں بہت سی حکایتیں مشہور ہوگئیں۔ مسلمان آج تک سلطان کو قومی ہیرو اور مجاہد تصور کرتے ہیں۔ لیکن ہندو نہ صرف اس کے نام سے بدکتے ہیں بلکہ اُس کے خلاف نفرت کے گہرے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

بعض مورخین شوجی کے بُت کو سونے کا کھوکھلا مجسمہ تصور کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ برہمنوں نے اس بُت کو بچانے کے لئے بے انتہا زر و مال محمود کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر کہ میں بُت شکن ہوں، بُت فروش نہیں، اُن کی درخواست کو رد کر دیا اور گرز مار کر بُت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اندر سے بیشمار زر و جواہر برآمد ہوئے۔ دولت کی اس فراوانی کو دیکھ کر محمود حیران رہ گیا۔ کیونکہ یہ اُس دولت سے کہیں زیادہ تھی جو برہمن اُسے پیش کر رہے تھے۔ اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ اس مندر میں، شولنگ کی پوجا ہوتی تھی۔ محمود نے اس بُت کی اخلاق سوز شکل اور ہندوؤں کے مشرکانہ خیالات کو ختم کرنے کے لیئے اُس کو توڑنا ہی مناسب سمجھا۔

۱۷:۔ سندھی جاٹوں کی گوشمالی
۱۰۲۶ء

محمود کی آخری مہم ان سندھی جاٹوں کی گوشمالی کے لیئے تھی جنہوں نے سومنات کی مہم سے واپسی پر اُسے سندھ کے لق و دق صحرا میں بہت تنگ کیا تھا، اور اس کے مال و زر کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ محمود کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اور وہ خانگی مشکلات میں بھی گھرا ہوا تھا لیکن ۱۰۲۶ء میں وہ جاٹوں کی سرکوبی کے لیئے روانہ ہوا۔ جنگی اعتبار سے محمود کی یہ مہم بہت اہم ہے۔ اس میں اُس نے اپنی عسکری قابلیت کا خوب مظاہرہ کیا۔ اکس نے چودہ سو ایسی کشتیوں کی تیاری کا حکم دیا جن کی اگلی دونوں جانب لوہے کی نوکدار سلاخیں لگی ہوتی ہوں۔ ان کشتیوں میں ماہر تیر اندازوں کے علاوہ آتش باز سپاہ کو بھی متعین کیا۔ اور اس جنگی

---

[1] شیخ فریدالدین عطار (مثنوی منطق الطیر) مرقومہ در سال ۵۸۵ھ مطابق ۱۱۸۷ء

Marfat.com

بیڑے کو دریائے سندھ میں ڈال دیا گیا۔ وہ جنوب کی جانب روانہ ہوا۔ جاٹوں کو محمود کے حملہ کی خبر ہوئی تو انہوں نے اپنے بال بچوں کو کہیں دور محفوظ مقام پر بھیج دیا اور خود چار ہزار کے قریب کشتیوں کا بیڑا بنا کر محمود کے مقابلے میں آئے لیکن اس بحری جنگ میں جاٹوں کو شکست ہوئی۔ جاٹ سپاہ کے جن آدمیوں نے بھاگنے کی کوشش کی انہیں محمود کے ان فوجی دستوں نے ختم کر دیا جو دریا کے دونوں کناروں پر موجود تھے۔ اسی طرح سندھ کے جاٹوں کی گوشمالی کرنے کے بعد محمود غزنی واپس چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی ہندی مہمات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

محمود کی وفات

۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء

مہم سندھ کے دوران محمود ملیریا بخار میں مبتلا ہو گیا اور اس بخار نے اس کی وفات تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ شاہی طبیبوں نے علاج معالجہ میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کیا۔ لیکن سب بے سود۔ رفتہ رفتہ اس بیماری نے سل دق کی صورت اختیار کر لی۔ محمود نے اپنی جنگی مہمات کی طرح اس بیماری کا بھی مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور باقاعدہ امورِ سلطنت بھی انجام دیتا رہا۔ جس سے اس کی صحت مزید خراب ہوتی چلی گئی۔ آخر مسلسل چار سال تک بیمار رہنے کے بعد ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء کو اکسس عدیم النظر جرنیل فقید المثال سلطان اور اسلام کے عظیم مجاہد نے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی۔ اُسے اُس کے پسندیدہ فیروزی باغ میں دفن کیا گیا۔

محمود کے حملوں کے اثرات

محمود کے حملے مندرجہ ذیل اثرات پر منتج ہوئے۔

(۱) محمود کے متواتر حملوں سے برصغیر کے ہندو راجاؤں کے نظامِ حکومت کی خامیاں اور خرابیاں مسلمانوں پر آشکارا ہو گئیں اور ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ ہندو قوم ان کی عسکری قوت اور مہارت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس سے نہ صرف برصغیر کی شمال مغربی سرحد غیر محفوظ ہو گئی بلکہ آئندہ کے لیئے وسطِ ایشیا کے مسلمان فاتحین پر برصغیر کی تسخیر کے دروازے کھل گئے۔ علاوہ ازیں محمود کے متواتر حملوں سے شمالی برصغیر کی ریاستیں کمزور ہو گئیں۔

۲ :- برصغیر کی صنعت و تجارت پر تباہ کن اثر پڑا اور اہل ہند شدید اقتصادی بدحالی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ مندر اور قلعے جو عرصہ دراز سے زر و جواہر سے معمور چلے آ رہے تھے یکسر خالی ہو گئے۔ تھانیسر، متھرا اور قنوج کی دولت غزنی میں منتقل ہو گئی۔ اس طرح اگرچہ برصغیر اپنی دولت و ثروت کے ایک بڑے حصے سے محروم ہو گیا، مگر اس دولت سے محمود کا دارالحکومت غزنی عروس البلاد بن گیا۔ محمود نے بے اندازہ دولت سے کام لیتے ہوئے ایک ایسی عظیم فوج منظم کی، جس نے برصغیر کی بیسیوں قدیم و جدید ریاستوں کو ختم کر کے رکھ دیا۔ مزید برآں اس نے علم و ادب کے مراکز کھول کر غزنی کو علوم فنون کا گہوارہ بنا دیا۔

Marfat.com

۳:۔ برصغیر کے متعدد مشہور شہر اور قدیم مندر برباد اور مسمار ہو گئے۔ جس سے ہندوؤں کے اکثر قیمتی نوادرات اور آثارِ قدیمہ نیست و نابود ہو گئے۔

۴:۔ محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل ملاپ استوار ہوا۔ لیکن اس ملاپ کے اثرات ابھی تک ملتان سے آگے نہ بڑھے تھے۔ محمود کے حملوں کی وجہ سے برصغیر میں نہ صرف اسلامی تفوق مضبوط و مستحکم ہوا بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین میل ملاپ مزید بڑھا۔ جس کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے۔ لاہور کو اقتصادی، تجارتی اور تہذیبی لحاظ سے شہرت دوام ملی، اور وہ مسلمانوں کی سیاسی اور علمی تحریکوں کا مرکز بن گیا۔ عرب ممالک اور وسط ایشیا سے بڑے بڑے علماء صوفیائے کرام اور اولیائے عظام یہاں پہنچے، جن کی بدولت اشاعتِ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ بڑے بڑے جنگجو اور خود سر قبائل بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ علاوہ ازیں ہندی اور فارسی زبانوں کے قرب و امتزاج سے ایک نئی زبان اردو نے جنم لیا۔

سیرت و کردار

محمود کا شمار ایشیا کے عظیم ترین مسلم فرمانرواؤں میں ہوتا ہے۔ اس نے ایک وسیع و عریض سلطنت پر حکمرانی کی، جس کی حدود عراق اور بحیرۂ کیسپین سے دریائے گنگا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اگرچہ محمود کو ورثہ میں غزنی اور خراسان پر مشتمل ایک چھوٹی سی ریاست ملی تھی۔ لیکن اس نے اپنے تینتیس ۳۳ سالہ عہد حکومت میں اس سلطنت کو بہت وسعت دی۔ اس کی سلطنت خلیفۂ بغداد کی سلطنت سے بھی زیادہ وسیع تھی۔ وہ ایک مطلق العنان فرمانروا اور سلطنت کے جملہ اقتدار کا حامل تھا۔ مطلق العنان فرمانروا ہونے کے باوجود وہ عدل و انصاف کا پیکر اور امن و امان کا پاسبان تھا۔ اور لامحدود اختیارات کا مالک تھا۔ وہ بلاشبہ نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا منتظم تھا۔

خدوخال

محمود ایک مضبوط جسم اور متناسب اعضاء کا مالک تھا۔ اس کی صحت قابل رشک اور قد درمیانہ تھا۔ اس کی شکل و صورت کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے ابن اثیر اور ابن جوزی کا بیان ہے کہ وہ دلکش خدوخال کا ایک خوبرو انسان تھا۔ اس کی ٹھوڑی گول اور اس پر معمولی سی داڑھی بڑی خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ لیکن بعض مؤرخ اسے بدصورت بتاتے ہیں۔ نظام الملک طوسی لکھتا ہے کہ "سلطان روئے نیکو بنود"! تاریخ فرشتہ کا مصنف رقمطراز ہے کہ "سلطان از حسن و جمالِ ظاہری عاری بود" ساتھ ہی عام طور پر مشہور ہے کہ محمود کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ لیکن وہ بدصورت نہ تھا۔

Marfat.com

بحیثیتِ انسان

سلطان محمود کا کردار مثالی تھا۔ وہ بلا کا ہوشیار اور زیرک تھا۔ نیز قرض شناس، ہمت و استقامت کا پیکر اور جفاکش انسان تھا۔ سفر کی حالت اور ایامِ جنگ میں معمولی سپاہیوں کی مانند تمام صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتا تھا۔ وہ توکل برضا کا حامی تھا مگر دشمنوں کے خلاف سرگرمی اور تندہی سے کارروائی کرنے کا خوگر تھا۔ امورِ مملکت کی تشکیل و تکمیل اور انجام دہی کا ماہر تھا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور شعائرِ اسلامی کا سختی سے پابند تھا، اور رواداری کی حکمت عملی کا حامی تھا۔ غزنی میں سکونت پذیر ہندو رعایا کو اس نے مکمل مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ اگرچہ برصغیر پہ اسکے متواتر حملوں کے باعث ہندو مؤرخین اُسے ایک ظالم اور متعصب و حریص سلطان کہتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً وہ بے حد رحمدل، خداترس، روادار فیاض اور انصاف پسند تھا۔

بحیثیت فاتح

سلاطینِ اسلام کی تاریخ میں محمود کو ایک عظیم فاتح کی حیثیت سے بلند مقام حاصل ہے۔ اس کی بہادری اور سپہ گری فقید المثال تھی۔ میدانِ جنگ میں وہ ہمیشہ صفِ اول میں لڑا کرتا تھا۔ وہ اپنی افواج کی قیادت کرنے کے علاوہ دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر کشتوں کے پشتے لگا دیتا تھا۔ اس کی شمشیرِ خارا شگاف کا لوہا دشمن بھی مانتے تھے۔ مختلف معرکوں میں دادِ شجاعت دیتا ہُوا وہ اکثر زخمی ہُوا۔ اس کے جسم پر بہتر کے قریب زخموں کے نشان تھے ملتان کے معرکہ میں قرامطی سردار ابوالفتح داؤد کے مقابلہ میں اس نے شمشیر زنی کے وہ ناقابلِ فراموش جوہر دکھائے کہ خون سے اس کا ہاتھ تلوار کے دستہ میں جم گیا جس کو علیحدہ کرنے کے لیئے گرم پانی استعمال کرنا پڑا۔

بحیثیتِ جرنیل

محمود ایک پیدائشی جرنیل اور خداداد عسکری قابلیت کا مالک تھا۔ وہ ہر قسم کا نقشہ اور منصوبہ خود مرتب کرتا اور اس پر عمل درآمد اپنی نگرانی میں کراتا تھا۔ کوئی کام محض موقع و محل اور اتفاقات کے سہارے نہ چھوڑتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ سکندرِ اعظم کی مانند ہر مہم میں کامیابی و کامرانی نے اس کے قدم چومے۔ ایشیا کا کوئی عظیم فاتح اس کا ہم پلہ دکھائی نہیں دیتا۔ برصغیر پاک و ہند اور ترکستان جہاں کہیں بھی وہ نبرد آزما ہُوا، کامیابی اس کی ہم قدم رہی۔ اس کی فوج ترکی، افغانی، ہندی اور ایرانی قومیت رکھنے والے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ جسے اس نے اپنے غیر متزلزل نظم و ضبط اور ولولہ افروز عسکری راہنمائی سے رشتۂ تنظیم میں منسلک کر کے خوارزم سے سومنات دکاٹھیاواڑ، اور ایران سے گنگا و جمنا دوآب تک اپنی اعلیٰ قیادت میں لڑایا، اور ہر مہم سے کامران لوٹا۔ فنونِ حرب میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ لڑائی کے ہائیکس کن اور نازک ترین لمحات میں بھی وہ اپنے سپاہیوں کے حوصلے بلند رکھتا تھا۔

Marfat.com

بحیثیتِ حکمران

محمود کا شمار ایشیا کے عظیم المرتبت حکمرانوں کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ وہ ایک عادل اور حق شناس حکمران تھا۔ اس کے دربارِ عدل میں بلا تمیز ملک و ملت، رنگ و نسل اور منصب و مرتبہ ہر فریادی کی رسائی ممکن تھی۔ اگرچہ وہ ایک مطلق العنان فرمانروا تھا۔ مگر اس نے اپنی مطلق العنانی کے جملہ اختیارات زبردستوں اور ظالموں کے خلاف اور کمزوروں کے تحفظ کے لیے صرف کیے۔ اس نے جنگی مہمات میں مصروفیات کے باوجود ملکی نظم و ضبط کی باگ ڈور ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھی۔ عدلیہ کی زمامِ اختیار بھی کلی طور پر اسی کے ہاتھوں میں رہی۔ اس کا ہر لفظ اور ہر اقدام قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ سلطنت کے جملہ شعبے متعلقہ وزراء کے ماتحت ہونے کے باوجود براہِ راست اس کے زیرِ نگرانی تھے۔ امورِ سلطنت کے بارے میں وہ اکثر اپنی وزارتی کونسل سے صلاح و مشورہ کرتا، مگر وہ اس کے مشوروں کا قطعی پابند نہ تھا۔ محکمۂ مال کی وہ خود نگرانی کرتا اور اکثر آمد و خرچ کے حساب کی پڑتال کرتا رہتا تھا۔

ایک مصنف مزاج حکمران ہونے کی حیثیت سے اس کا عدل و انصاف مثالی تھا۔ عدل گستری کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اس نے ہر شہر اور ہر صوبے میں قاضی القضاۃ مقرر کر رکھے تھے۔ اس کے عدل کا یہ عالم تھا کہ ایک سوداگر کی شکایت پر شہزادہ مسعود کو بھی حاضرِ عدالت ہو کر اپنی صفائی پیش کرنی پڑی۔ اس کی انصاف پروری کی داستانیں تاریخ کے اوراق کی زینت ہیں۔ تاریخ فرشتہ میں مذکور ہے کہ ایک مسکین و حقیر فریادی کی شکایت پر اس نے اپنے بھانجے کے خلاف تعزیری کارروائی کی، اور جرم میں ملوث پا کر فوراً اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔

سلطان محمود ایک حقیقت پسند اور مشفق حکمران تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ اشیائے ضرورت بالخصوص اجناس کی قیمتوں پر اس کا احتساب تھا۔ تاکہ چور بازاری اور ناجائز منافع خوری عوام کی تکلیف کا باعث نہ بنے۔ وہ شہزادوں سے بھی عام رعایا کا سا برتاؤ کرتا، اور اپنے افسروں کی بھی نگرانی کرتا تھا۔ کبھی کسی حاکم کو عوام پر ظلم کرنے کا موقع نہ دیتا۔ وہ اکثر دورے کرتا اور ہمیشہ ملک کے معاملات اور عوام کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ عوام کی فلاح و بہبود اور صنعت و تجارت کی ترقی کے لیے اس نے سلطنت میں عمدہ سڑکیں تعمیر کروائیں اور ایسے انتظامات کا اہتمام کیا کہ لوگ بلا خوف و خطر سفر کر سکیں اور تجارت میں کوئی خلل نہ آنے پائے۔

بحیثیتِ مربی علوم و فنون

سلطان محمود غزنوی بلا شک و شبہ اپنے دور کا زیرک ترین اور صاحبِ علم و فضل حکمران تھا۔ اُس کے عہد میں فارسی علم و ادب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ وہ خود شعر و سخن کا رسیا اور علوم و فنون کا مربی تھا۔ اس کی علم

Marfat.com

پروری کی شہرت بہت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی - وہ اہل علم و اَدب کو بحال فیاضی و دریادلی انعام و اکرام سے نوازتا۔ اکثر و بیشتر اہلِ کمال محمود اس کے دربار کی زینت بنے۔ مشہور مورخ لین پول رقمطراز ہے کہ :

"غزنویوں نے مفتوحہ علاقوں سے آرٹ کے گراں بہا نوادرات کو جمع کرکے اپنے عجائب گھر کو مزین کیا، لیکن محمود نے مختلف ممالک کے باکمال اربابِ فن، شعراء اور علماء کو اپنے دربار کی زینت بنا کر اس سے بہتر کام کیا۔"[1]

برصغیر پاک و ہند سے جو بے اندازہ دولت محمود کے ہاتھ آئی، وہ شہر غزنی کی خوبصورتی اور علوم و فنون کی فراخدلانہ سرپرستی میں صرف ہوئی۔ چنانچہ اُس کے دور میں غزنی ایشیا بھر میں علم و فضل اور ثقافت کا ایک عظیم مرکز بن گیا۔ بڑے بڑے شاعر، علماء و فضلاء، مؤرخین، سائنسدان، ریاضی دان، علم نجوم کے ماہر اور حکماء دربارِ محمود کی زینت و دینت تھے۔ جن میں عنصری، فرخی، اسدی اور منوچہری جیسے بلند پایہ شعراء البیرونی جیسا ریاضی اور سنسکرت و ہندی علوم کا ماہر نجوم و علم ہیئت کا نکتہ دان فارابی اور عتبی و بیہقی جیسے مورخ و وقائع نگار قابل ذکر ہیں۔ سلطان محمود ہر سال چار لاکھ دینار اپنے دربار کے علماء و فضلاء کو بطور انعام دیا کرتا تھا۔

ڈاکٹر ایم ناظم مشہور تاریخی کتاب "چہار مقالہ" کے حوالہ سے رقمطراز ہیں :

"محمود اربابِ علم و دانش پر بے حد مہربان تھا۔ اس کا ادنیٰ ترین انعام بھی ہزار ہا دینار پر مشتمل ہوتا تھا۔ مشہور درباری شاعر عنصری کے صرف چند اشعار سے محظوظ ہو کر اُس نے بطورِ انعام اس کا (عنصری) منہ تین بار بیش قیمت جواہرات سے بھر دینے کا حکم دیا۔"[2]

محمود نے اپنی سلطنت میں ہزار ہا مکتب اور مدرسے قائم کئے اور مساجد و خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ علاوہ ازیں عجائب خانے اور کتب خانے قائم کئے۔ غزنی میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کروائی اور اس کے متصل ایک بہت بڑے کتب خانے اور عجائب گھر کا اہتمام کیا۔ عجائب گھر کو نوادرات سے بھر دیا اور کتب خانے میں ہر شعبۂ علم کی نادر اور بیش بہا کتابیں فراہم کیں۔ علاوہ ازیں محمود نے غزنی میں ایک بڑا تعلیمی ادارہ (یونیورسٹی) بھی قائم کیا، جس سے استفادہ کرنے کے لیئے دور دراز ممالک کے طلباء کھنچے چلے آتے تھے۔ محمود نے غزنی کو محلات و باغات اور مساجد سے اس قدر سجایا اور اُسے کچھ اس شان کا اسلامی تمدن اور علوم و فنون کا مرکز بنایا کہ یہ شہر عروس البلاد اور طلبائے علم و

---

[1] "میڈیول انڈیا انڈر محمڈن رول، صفحہ ۳۰ - ۲۹

[2] "دی لائف اینڈ ٹائمز آف سلطان محمود آف غ... صفحہ ۱۵۸

Marfat.com

ارباب فن کا گہوارہ بن گیا۔

مذہبی حکمتِ عملی

محمود راسخ العقیدہ سُنّی مسلمان تھا۔ اور مذہبی فرائض باقاعدگی سے ادا کرنے کا عادی تھا۔ اُسے صوفیاء اور اولیائے کرام سے والہانہ محبت تھی۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کی روحانی عظمت اور عارفانہ تعلیمات کا اُس پر بہت گہرا اثر تھا۔ سلطان محمود زندگی بھر مذہبی رواداری کا حامی رہا۔

محمود اُن مذہبی فرقوں کو ناپسند کرتا تھا جو خلیفہ بغداد القادر باللہ کی مرکزیت اور سیادت کے خلاف تھے۔ چنانچہ وہ ان کی گوشمالی کو اپنا فرضِ اوّلین سمجھتا تھا۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق محمودؒ نے غیر مسلموں سے ہمیشہ رواداری کا سلوک کیا۔ اس کی فوج میں تلک، تاتش اور سکھپال جیسے ہندو افسر موجود تھے۔ غزنی میں غیر مسلموں کا ایک الگ محلّہ تھا۔ جہاں انہیں مکمل آزادی کے ساتھ زندگی گذارنے اور مذہبی فرائض ادا کرنے کی اجازت تھی۔ برّصغیر کی مہمات کے دوران محمود نے کسی ہندو کو اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ امن و امان کے ایام میں اس نے کبھی کسی مندر کو مسمار نہ کیا۔ وہ رضائے الٰہی پر متوکل تھا اور مصائب و ابتلاء میں اسی کی طرف رجوع کرتا تھا۔ چنانچہ میدانِ جنگ میں جب کوئی مشکل درپیش ہوتی تو وہ خدا تعالیٰ کے حضور میں سربسجود ہو جاتا اور گڑگڑا کر فتح و نصرت کی دعا مانگتا تھا اور اکثر اہم پیچیدہ مسائل کے بارے میں قرآنِ حکیم سے فال نکالتا تھا۔

عہدِ محمودی کے چند نامور اربابِ علم و دانش

ابوالعبّاس فضل بن احمد اسفرائینی

ابوالعباس فضل بن احمد اسفرائین کا رہنے والا تھا۔ اور سامانی دربار میں دبیر کے عہدے پر فائز رہ چکا تھا۔ رموزِ حکومت کا ماہر اور علوم و فنون میں یکتائے روزگار تھا۔ امیر ناصرالدین سبکتگین نے اُسے وزارتِ عظمیٰ کے اہم ترین عہدے پر متعین کیا۔ جب سلطان محمود سریر آرائے سلطنت ہُوا تو اس نے بھی اس کے عہدے کو بحال رکھا۔ اس عہد کے علماء و فضلاء میں ابوالعباس فضل بن احمد ایک بلند مقام رکھتا تھا۔ اس نے پہلی بار فارسی کو غزنہ کی سرکاری زبان قرار دیا۔ یہ اس کی فارسی نوازپالیسی ہی کا نتیجہ تھا کہ فردوسی دربارِ محمود کی زینت بنا۔

ابوالقاسم احمد بن حسن میمندی

فضل بن احمد کے بعد وزارتِ اعلیٰ کا منصب ابوالقاسم احمد بن حسن میمندی کے سپرد ہوا۔ جس پر وہ اٹھارہ سال تک (تادمِ حیات) فائز رہا۔ اُسے محمود کا رضاعی بھائی، بچپنے کا دوست اور ہم مکتب ہونے کی وجہ

Marfat.com

سے سلطان کا بہت زیادہ قرب واعتماد حاصل تھا۔ وہ نہ صرف یکتائے روزگار مدبّر سیاستدان اور ماہر اسرارِ سلطنت تھا، بلکہ علم وادب کا سرپرست بھی تھا۔ وہ خود بھی عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا ایک بلند پایہ ادیب اور ماہر فن شاعر تھا۔

ابو نصر مشکان

وہ دیوانِ رسالت کا ناظم تھا اور دورِ محمودی کا ایک بلند پایہ مؤرخ اور مقتدر ادیب تھا۔ مشکان مشہورِ زمانہ مؤرخ ابوالفضل بیہقی کا استاد تھا۔

ابو محمد عبداللہ بن حسین الناصحی

ابو محمد عبداللہ عہدِ محمودی میں غزنی کا قاضی القضاۃ تھا۔ حدیث وتفسیر اور علم فقہ کا ایک مستند عالم اور مذہبِ حنفیہ کا مقتدر پیشوا ہونے کی حیثیت سے اُسے بے حد شہرت ومقبولیت حاصل تھی۔

ابو نصر محمد عتبی

ابو نصر عتبی جس نے عہدِ محمودی کے حالات پر مشتمل مشہورِ زمانہ تاریخ یمینی تصنیف کی، سلطان محمود کے دور کا ایک مشہور مورخ تھا۔ اس کی تاریخِ یمینی، تاریخی حقائق اور اپنے طرز واسلوب کے اعتبار سے علمی حلقوں میں از حد مقبول ہے اور اس عہد کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ متصور ہوتی ہے۔

ابو المنصور الثعلبی

ابو المنصور عبدالملک محمد بن اسماعیل الثعلبی ایک متبحر عالم، مقتدر دانشور اور ایک نامور مؤرخ تھا۔ وہ متعدد تحقیقی کتابوں کا مصنف تھا۔ جن میں سحر البلاغۃ، یتیمۃ الدہر، کتاب الغرر اور لطائف المعارف خاص طور پر مشہور ہیں۔ سلطان محمود نے اسے بطور سفیر دربارِ خلافت میں بغداد بھیجا۔ جہاں وہ ایک سال تک مقیم رہا۔ خلیفۂ بغداد سے سلطان محمود کے لیے یمین الدولہ، ولی امیر المومنین، اور امین السلطنت کے خطابات حاصل کر کے واپس غزنی آیا۔

ابو الخیر خمار مشرانی

منطق، فلسفہ اور علم طب کی بے شمار کتابوں کا مصنف ابوالخیر خمار بصرانی خوارزم کی فتح کے بعد دربارِ محمودی سے وابستہ ہوا۔ اس وقت اس کی عمر سو سال سے زیادہ تھی۔ وہ بغداد میں پیدا ہوا تھا اور عوام میں سقراطِ ثانی کے لقب سے مشہور تھا۔ اگرچہ مذہباً عیسائی تھا لیکن اس کی علمی فضیلت کے باعث سلطان محمود اس کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اس نے غزنی میں گھوڑے سے گر کر وفات پائی۔

ابو ریحان البیرونی

دربارِ محمودی کے باکمال علماء وفضلاء میں ابو ریحان البیرونی کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ وہ ۹۷۳ء کے قریب خوارزم کے نواح بیرون میں پیدا ہوا۔ چنانچہ اسی نسبت سے وہ بیرونی کہلایا۔ خوارزم کی فتح کے بعد ۱۰۱۷ء میں دربارِ محمودی سے وابستہ ہوا۔ عربی، فارسی، ترکی، عبرانی زبانوں کے علاوہ اسے سنسکرت زبان پر بھی غایت درجہ

Marfat.com

دسترس حاصل تھی۔ علم نجوم کا ماہر اور بے مثال ہیئت دان تھا۔ اس نے تاریخ، ریاضی، ہیئت، جغرافیہ، طبیعیات، کیمیا اور علم مدنیات پر قابلِ قدر کتابیں تصنیف کیں۔ البیرونی نے ہندی علوم کو بڑی محنت سے سیکھا۔ چونکہ برہمن اپنے علوم و فنون سے دوسری اقوام تو درکنار، خود اپنے ہموطن غیر برہمن ہندوؤں کو بھی آگاہ نہ کرتے تھے۔ اس لیئے البیرونی نے ہندو تہذیب و تمدن اور افکار سے اپنے ہم مذہب بھائیوں کو متعارف کرانے کے لیئے شہرہ آفاق کتاب 'کتاب الہند' تحریر کی۔ اس کی یہ تصنیف عالمانہ تنقید اور غیر متعصبانہ تحقیق کا ایک بلند پایہ شاہکار ہے۔

البیرونی کی دوسری شہرہ آفاق تصنیف 'قانون مسعودی' ہے جو علمِ نجوم اور ہیئت پر ایک مستند کتاب ہے۔ یہ کتاب سلطان محمود کے لڑکے اور جانشیں مسعود کے نام سے منسوب ہے۔ اس نادرِ زمانہ تصنیف پر شہزادے نے خوش ہو کر چاندی کے اس قدر سکے بطورِ انعام عطا کیئے کہ انہیں ایک ہاتھی ہی اٹھا سکتا تھا۔ مگر البیرونی نے بکمال استغنا، یہ رقم خزانہ شاہی میں واپس بھجوا دی۔ اس کی یہ شانِ استغنا، اس کی قناعت کی مظہر ہے۔ البیرونی بلاشبہ عہد محمود کا مقتدر عالم اور ایک عظیم مورخ تھا۔ جو نہ صرف مختلف علوم کا ماہر ہونے کی وجہ سے ہر فن مولا اور باکمال استاد تھا۔ بلکہ جس کی علمی شہرت دور دراز کے ممالک تک پھیلی ہوئی تھی۔

عنصری دربارِ محمودی کا ملک الشعراء ابوالقاسم حسن عنصری بلخ کا تاجر زادہ تھا۔ فنِ شعر گوئی میں یکتا اور بدیہہ گوئی کا استاد تھا اپنے کمالِ سخنوری کی بدولت ملک الشعراء کہلایا۔ نصر بن سبکتگین، صوبیدارِ خراسان کی وساطت سے دربارِ محمود سے وابستہ ہوا۔ جہاں اس کی قدر و منزلت یہاں تک بڑھی کہ جلد ہی بزم شعرائے دربار کا صدر بن گیا۔ سفر میں اس کا نقرئی اور طلائی سامان چار سو اونٹوں پر لادا جاتا تھا۔ روایت ہے کہ اس نے تیس ہزار سے زائد شعر کہے مگر اس کا دیوان "لباب" مطبوعہ طہران صرف تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اُس نے سلطان محمود کی وفات کے دس برس بعد وفات پائی۔

فرّخی ملکِ سیستان کا باشندہ ابوالحسن علی فرخی سلطان محمود کے خصوصی درباری شعراء میں اہم مقام رکھتا تھا۔ سخنوری میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ ایاز بھی اس کے قدر دانوں میں سے تھا۔ سلطان محمود کی وفات پر لکھا ہوا اس کا پُرسوز مرثیہ تاثیر اور الم انگیزی کے اعتبار سے بے مثال سمجھا جاتا ہے۔ اس نے صنائع و بدائع پر ترجمان البلاغۃ کے نام سے ایک شاہکار کتاب لکھی! جو آج بھی اس موضوع پر مستند سمجھی جاتی ہے۔ وہ صاحبِ دیوان بھی تھا۔

اسدی حکیم ابو نصر احمد بن منصور اسدی طوسی کا باشندہ تھا۔ اور شاہنامہ، کے مصنف فردوسی کا استاد اور بہنوی تھا۔ محمود کے درباری شعراء میں بلند مقام کا مالک تھا۔ اس کے لکھے ہوئے قصائد

Marfat.com

اس اعتبار سے فارسی شاعری میں منفرد رنگ رکھتے ہیں کہ اس نے اپنے تمام مدحیہ قصیدوں کی ابتدا تشبیبی مناظرات سے کی۔ اس کی یہ تنوع پسندی اور جدت طرازی آج بھی دنیائے شاعری میں مشہور ہے۔

منوچہری | دربارِ محمودی کا مشہور شاعر تھا اور سلطان محمود کا بہت مداح تھا۔ تشبیہات، چہرہ نگاری اور مناظرِ قدرت کی تصویر کشی اس کی شاعری کی نہایت ہی نمایاں اور قابلِ قدر خصوصیات ہیں۔

فردوسی | سلطان محمود کے دربار کا مشہور ترین شاعر اور 'شاہنامہ' کا مصنف فردوسی طوس کا باشندہ تھا۔ اس نے شاہنامہ لکھ کر شاہانِ عجم کے ساتھ ساتھ اپنے نام کو بھی شہرتِ دوام بخشی۔ پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات کے مطابق وہ ۳۲۲ھ اور ۳۲۳ھ کے قریب پیدا ہوا۔ محمود کی تخت نشینی کے بعد اس کی علم پروری اور فیاضی و زرپاشی کی شہرت سن کر غزنی چلا آیا۔ وزیر اعظم خواجہ ابوالعباس فضل بن احمد اس کا بہت قدردان تھا۔ فردوسی کی یہ بدقسمتی تھی کہ انتہائی بلند پایہ شاعر ہونے کے باوجود بعض بااثر امرا اور درباری شعرا کی مخالفت اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے دربارِ محمود میں وہ مقام حاصل نہ کر سکا، جس کا وہ مستحق تھا۔

روایت ہے کہ سلطان محمود نے فردوسی طوسی کو 'شاہنامہ' لکھنے کا حکم دیا اور ہر شعر پہ ایک طلائی ہر دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن جب شاہنامہ مکمل ہو کر محمود کے حضور پیش ہوا۔ تو اس نے سونے کے سکوں کی بجائے چاندی کے سکے دیئے۔ چنانچہ فردوسی سلطان کی اس عہد شکنی سے دل برداشتہ ہو کر چلا گیا۔ اور اس نے سلطان کی ہجو لکھی۔ بعد میں جب محمود نے کتاب کی قدر پہچانی تو اس نے حسبِ وعدہ ساٹھ ہزار طلائی سکے فردوسی کو بھجوا دیئے۔ مگر جب سلطان کا ایلچی رقم لے کر شاعر کے ہاں پہنچا تو اس کا جنازہ شہر سے باہر جا رہا تھا۔ فردوسی کی خود دار بیٹی نے یہ رقم وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس رقم سے ایک کاروان سرائے فردوسی کے نام پر تعمیر کر دی گئی۔ جدید تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ دلچسپ حکایت بالکل بے بنیاد ہے۔ جسے سلطان محمود کو بدنام کرنے کے لیے بڑی ہوشیاری سے گھڑ لیا گیا ہے۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی نے 'شاہنامہ' کے حوالوں اور شہادتوں سے اس مشہورِ زمانہ کہانی کو بے بنیاد اور غلط ثابت کیا ہے۔

محمود کے جانشین

مسعود اور محمد، سلطان محمود کے دو بیٹے تھے۔ دونوں ہمعمر تھے اور ایک ہی روز دو مختلف ماؤں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ قابلیت، فہم و فراست اور شاہی وقار کے لحاظ سے مسعود مقابلتاً محمد سے افضل تھا۔ مگر طبیعت کا تیز و تند اور درشت مزاج واقع ہوا تھا۔ اس کے برعکس محمد سلیم الطبع

Marfat.com

ملنسار، نرم دل اور شائستگی کا پیکر تھا۔

۱۰۳۰ء میں محمود کی وفات کے وقت مسعود دارالحکومت غزنی سے دُور اصفہان کے مقام پر تھا۔ چنانچہ امرائے دربار نے سلطان محمود کی وصیت کے مطابق محمد کو سلطنتِ غزنہ کے تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن مسعود نے فوجی کارروائی کے ذریعہ اور ملک ایاز کی اعانت سے محمد کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ نیز اُسے اندھا کر کے بلخ میں نظر بند کر دیا، اور خود تختِ غزنہ پر متمکن ہُوا۔ محمد صرف چھ ماہ برسرِ اقتدار رہا۔

سلطان مسعود
۱۰۳۰ء تا ۱۰۴۰ء

مسعود نے دس سال حکومت کی۔ اور خلیفۂ بغداد سے 'سلطان' کا لقب پایا۔ مسعود نے برسرِ اقتدار آ کر باغیوں کو قرار واقعی سزائیں دے کر ملک میں امن و امان قائم کیا۔ باغی وزیر حسنک کو ہلاک کر کے اس کا کٹا ہوا سر ایک طشت میں رکھا، اور تمام امراء کو مدعو کر کے دعوت کے دوران اُن کے سامنے پیش کیا: تاکہ انہیں عبرت حاصل ہو۔ اور وہ کبھی بغاوت کی جسارت نہ کریں۔ حسنک کے بعد خواجہ احمد میمندی کو قلمدانِ وزارت سپرد کیا۔ صوبۂ پنجاب کے نظم و انصرام پر ترک افسر اریارق اور قاضی ابوالحسن مشیرازی کو فائز کیا۔ بعد ازاں اریارق کو اس کے ظلم و تشدد کی بنا پر معزول کر دیا۔ اور احمد نیالتگین کو پنجاب کا ناظم مقرر کیا۔ لیکن وہ بہت ہی جاہ پسند ثابت ہوا۔ احمد نیالتگین کے بعد چنانچہ سلطان مسعود نے اپنے بیٹے مودود کو پنجاب کا صوبیدار اور اپنے باپ کے غلام ملک ایاز کو اُس کا اتالیق مقرر کیا۔

۱۰۴۰ء میں سلطان مسعود نے ترکوں کے مقابلے میں اپنے کو بے بس پا کر برصغیر پاک و ہند بھاگ جانے کا منصوبہ بنایا۔ ہر چند وزیر خواجہ حسن میمندی نے اسے روکنے کی کوشش کی، مگر اس نے اپنے حرم کی بیگمات، نابینا بھائی محمد اور ورثہ میں ملے ہوئے تمام خزانہ کو لے کر برصغیر کا رُخ کیا۔ لیکن حسن ابدال اور راولپنڈی کے قریب ہرکلہ کے مقام پر اس کے محافظ دستے اور ہندو فوج نے اس کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ باغیوں نے مسعود کو گرفتار کر کے اس کے نابینا بھائی محمد کے سامنے پیش کیا۔ محمد نے اسے کوئی ایذا پہنچائے بغیر اس کی خواہش کے مطابق گردھنی بھیج دیا، جہاں محمد کے بیٹے احمد نے اُسے قتل کر دیا۔

سلطان مسعود اپنے باپ محمود کی طرح نہایت بہادر اور جری تھا۔ بیہقی کے بیان کے مطابق کوئی شخص اس کا گرز اٹھا نہیں سکتا تھا۔ ایک دفعہ شکار کے وقت اس نے گرز کے ایک ہی وار سے ایک خونخوار چیتے کو ہلاک کر دیا تھا۔ وہ سلطان محمود کی طرح اہلِ علم و ادب کا مربّی اور قدردان تھا۔ خوندمیر کا بیان ہے کہ اس نے اپنی سلطنت میں بے شمار مکاتب، مساجد اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ اس نے اپنے دس سالہ عہدِ حکومت میں غزنی کی شان و شوکت نیز اپنے باپ محمود کی روایاتِ شاہی کو برقرار رکھا۔

مودود
۱۰۴۲ء تا ۱۰۴۹ء

مسعود کی موت کے وقت اُس کا لڑکا مودود بلخ میں تھا۔ اُس نے فی الفور غزنی پہنچ کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ازاں بعد محمد کو شکست دے کر گرفتار

Marfat.com

کر لیا اور اُسے اور اُس کے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تیز غزنی میں امن و امان کی بحالی اور اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے بعد مودود نے پنجاب کا رُخ کیا۔ جہاں اس کا بھائی مجدود گورنر تھا، اور خود مختار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ مودود کے لاہور پہنچنے سے دو دن قبل ہی اپنے بستر میں مردہ پایا گیا۔ اس کے احباب نے اس کی نعش کو جالندھر لے جا کر دفن کر دیا۔ چنانچہ پنجاب پر بھی مودود کا قبضہ ہو گیا۔ اُس کے عہد کے دوران دہلی کے راجہ مہی پال نے پنجاب سے سلطنت غزنہ کی بالادستی کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ اُس نے ہانسی، تھانیسر اور کانگڑہ کو فتح کر کے لاہور کا محاصرہ کر لیا، لیکن ناکام واپس لوٹا۔

پنجاب کے حالات کی دُرستی اور اپنے عاکم متعین کرنے کے بعد ۱۰۴۸ء میں مودود عازم غزنی ہوا اس نے اپنے دو بیٹوں محمود اور مسعود کو علی الترتیب لاہور اور پشاور کا گورنر مقرر کیا، اور برِصغیر کے باغی اور سرکش ہندوؤں کی گوشمالی کے لیئے بوعلی حسن کوتوال کی قیادت میں ایک مہم روانہ کی۔ سلطان مودود نے ۲۴ دسمبر ۱۰۴۹ء کو وفات پائی۔

مسعود ثانی
۱۰۴۹ء

مودود کی وفات کے بعد اس کے تین سالہ بیٹے مسعود ثانی کو جو سلجوق ملکہ کے بطن سے تھا۔ تخت نشین کیا گیا۔ لیکن امراء نے اسے سلطان تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ ایک ہفتہ کے بعد سلطان مسعود کے ایک فرزند ابوالحسن علی کو تخت پر بٹھایا گیا۔

ابوالحسن علی
۱۰۴۹ء تا ۱۰۵۱ء

ابوالحسن علی نے برسرِ اقتدار آتے ہی اپنے بھائی کی بیوہ سلجوق ملکہ سے، جو مسعود ثانی کی والدہ تھی، شادی کر لی۔ وہ کامیاب حکمران ثابت نہ ہوا۔ چنانچہ ۱۰۵۱ء میں سلطان محمود کے چھوٹے بیٹے عزّ الدولہ عبدالرشید نے ابوالحسن علی کو معزول کر کے تختِ غزنی پر قبضہ کر لیا۔

عزّ الدولہ عبدالرشید
۱۰۵۱ء تا ۱۰۵۲ء

سریر آرائے سلطنت ہونے سے قبل عزّ الدولہ عبدالرشید کو سلطان مودود نے بُست اور اسفرائن کے درمیان واقع ایک پہاڑی قلعہ میں بند کیا ہوا تھا۔ عبدالرشید درباری امراء تشتیگین حاجب اور عبدالرزاق بن احمد بن حسن میمندی کی مدد سے رہائی پا کر مسندِ غزنہ پر متمکن ہوا۔ عبدالرشید نے تشتیگین حاجب کو امیر الامرائے ہند کا خطاب دے کر پنجاب کا حاکم مقرر کیا۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس دور میں سلاطینِ غزنی مقتدر امرائے دربار کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے اور امراء حصولِ اقتدار کے لیئے سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔

Marfat.com

طُغرل
۱۰۵۳ء

طغرل، سلطان محمود کا پروردہ تھا۔ سلطان نے اس پر مہربان ہو کر اُسے امیر کا درجہ دیا اور اپنی لڑکی سے اُس کی شادی کر دی۔ سلطان عبدالرشید عزّ الدولہ نے اُسے سیستان کی فتح پر مامور کیا۔ مگر اس نے سیستان میں اپنی عسکری پوزیشن کو مستحکم کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا، اور غزنی پہنچ کر سلطان عبدالرشید اور شاہی خاندان کے نو شہزادوں کو قتل کر دیا۔ نیز مرحوم سلطان مسعود کی لڑکی سے زبردستی شادی کر کے تختِ غزنہ پر قابض ہو گیا۔ لیکن صرف چالیس روز غاصبانہ حکومت کرنے کے بعد نشتگین حاجب اور دیگر اُمراء کی سازش کا شکار ہو کر محل سرائے کے محافظوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ مسعود اوّل کے دو بیٹے فرّخ زاد کو تخت نشین کر دیا۔

سُلطان فرخ زاد
۱۰۵۳ء تا ۱۰۵۹ء

سلطان فرّخ زاد چھ سال تک مسند نشین اقتدار رہا۔ وہ حلیم الطبع، رحمدل اور انصاف پسند بادشاہ تھا۔ اُس نے اپنے دورِ حکومت میں سلطنت کا نظم و ضبط نشتگین حاجب کے قبضہ و اختیار میں رکھا۔ اُس کے عہد میں سلجوقی سردار الپ ارسلان غزنی پر حملہ آور ہوا۔ مگر ناکام واپس لوٹا۔ سلطان فرّخ زاد نے ۱۰۵۹ء میں دردِ قولنج سے وفات پائی

سلطان ابراہیم
۱۰۵۹ء تا ۱۰۹۹ء

سلطان فرخ زاد کی وفات کے بعد اس کا بھائی ابراہیم مسندِ حکومت پر بیٹھا۔ سلطان ابراہیم صاحب فہم و فراست اور ایک مدبّر بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے حسنِ تدبّر سے مکمل امن و امان قائم کر کے سلطنتِ غزنہ کے جسدِ مردہ میں از سرِ نو جان ڈال دی۔ اُس نے سلجوق ترکوں سے صُلح کر لی۔ ۱۰۷۹ء میں اس نے پنجاب پہنچکر باغیوں کی گوشمالی کی اور علاقہ کے امن و امان کو بحال کیا۔ اُس نے اجودھن (پاکپتن) اور دیپال (غالباً دیپالپور) کو بھی زیرِ نگیں کیا۔ اور اس طرح پنجاب میں یمینی خاندان کے وقار کو دوبارہ مستحکم کیا۔

سلطان ابراہیم بذاتِ خود صاحبِ علم و ادب تھا۔ اور علماء و فضلاء کی بہت قدر اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ سلطان خطاطی کے فن سے بھی بہرہ ور تھا، اور فرصت کے اوقات میں قرآن حکیم کی کتابت کیا کرتا تھا۔ اس نے 'دستور الوزراء' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ بالآخر چالیس سال تک کامیاب حکومت کرنے کے بعد ۱۰۹۹ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

سلطان مسعود سوم
۱۰۹۹ء تا ۱۱۱۴ء

سلطان ابراہیم کی وفات کے بعد اس کا لڑکا مسعود سوم تختِ یمینی پر جلوہ آرا ہوا۔ اس نے سلطان سنجر سلجوقی کی بہن سے شادی کی۔ امارتِ پنجاب پر اس نے نشتگین حاجب کو مامور کیا۔

Marfat.com

سلطان مسعود سوم کا شمار یمینی خاندان کے عظیم المرتبت سلاطین میں ہوتا ہے۔ اس نے سلطان ابراہیم کی مرتبہ کتاب 'دستور الوزراء' کی تصحیح کر کے ضابطۂ قوانین مرتب کیا۔ بحیثیتِ سلطان اس نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ لاہور میں گذارا۔ بالآخر سولہ سال حکومت کرنے کے بعد ۵۷ سال کی عمر میں وفات پا گیا۔

شبرزاد
۱۱۱۴ء - ۱۱۱۵ء

سلطان مسعود سوم کے انتقال کے بعد اس کا فرزند شبرزاد تخت نشین ہوا۔ لیکن اقتدارِ شاہی نے صرف ایک سال تک اس کا ساتھ دیا۔ اور وہ اپنے چھوٹے بھائی ارسلان کے ہاتھوں قتل ہوا۔

ارسلان
۱۱۱۵ء تا ۱۱۱۷ء

ارسلان نے برسرِ اقتدار آتے ہی تخت کے تمام دعویداروں اور مخالفین کو قید کر دیا۔ لیکن اس کا سوتیلا بھائی بہرام جان بچا کر اپنے ماموں سلطان سنجر کے پاس جا پناہ گزین ہوا۔ سنجر نے نظر بند شہزادوں کی رہائی کا مطالبہ کیا اور اس بہانے سے غزنی پر حملہ کر دیا۔ ارسلان نے شکست کھائی اور بھاگ کر لاہور (پنجاب) میں پناہ لی۔ سنجر نے بہرام کو تختِ یمین پر متمکن کیا۔ اس کے عوض بہرام نے سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

سلطان سنجر کی واپسی پر ارسلان نے غزنی پر حملہ کر کے تخت پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس پر ۱۱۱۷ء میں بہرام اپنے ماموں سنجر کی معیت میں غزنی پر دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اور ارسلان کو شکست دے کر اور اُسے قید میں ڈال کر تختِ غزنہ پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں جرم سازش کی پاداش میں ارسلان کو قتل کر دیا گیا۔

بہرام شاہ
۱۱۱۷ء تا ۱۱۵۲ء

ارسلان اور بہرام کے مابین حصولِ اقتدار کی کشمکش کے دوران پنجاب پر غزنی اقتدار کی گرفت بہت کمزور ہو گئی۔ نیز ارسلان کے حامی پنجاب کے حاکم محمد باہلم نے بہرام کی سیادت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر بہرام پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ چنانچہ ۵ دسمبر ۱۱۱۸ء کو محمد باہلم نے بہرام کی اطاعت قبول کر لی۔ بہرام نے خطا بخشی کرتے ہوئے اُسے امارتِ پنجاب پر بحال رکھا۔ لیکن بہرام کے واپس لوٹتے ہی محمد باہلم نے دوبارہ علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اس پر سلطان بہرام شاہ نے دوبارہ حملہ آور ہو کر ملتان کے قریب اُسے شکستِ فاش دی۔ باہلم نے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی۔ لیکن دریائے راوی کو عبور کرتے وقت اپنے دو بیٹوں اور چند جان نثار ساتھیوں کے ساتھ گہری دلدل اور ریت میں پھنس کر مر گیا۔ بہرام شاہ نے سالار حسین کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا اور غزنی واپس لوٹ گیا۔

خسرو شاہ
۱۱۵۲ء تا ۱۱۶۰ء

بہرام شاہ کی وفات کے بعد اس کا فرزند خسرو شاہ تخت نشین ہوا۔ علاؤالدین جہانسوز کی، غزنی سے واپسی پر خسرو شاہ نے دوبارہ غزنی پر قبضہ کر لیا۔ اس

Marfat.com

کے عہد میں ترکمانوں کے غزّ قبیلہ نے سلطان سنجر کو شکست دے کر قید کر لیا اور غزنی پر حملہ آور ہونے کے لیئے پیش قدمی کی۔ جس کی خبر پاکر سلطان خسرو شاہ غزنی سے بھاگ کر لاہور چلا آیا۔ اس نے ۱۱۶۰ء میں لاہور میں ہی وفات پائی۔

خسرو ملک
۱۱۶۰ء تا ۱۱۸۶ء

خسرو شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک لاہور میں تخت نشین ہوا۔ چونکہ غزنی پر ترکمان غزّوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی اس لیئے خسرو ملک نے پنجاب میں ہی اپنے اقتدار کو مستحکم کیا۔ خسرو ملک بہت ہی نرم دل اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ چنانچہ اس کی طبعی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف اضلاع کے حاکموں نے خود مختاری اختیار کر لی۔

۱۱۷۳ء میں غزنی پر غیاث الدین محمد غوری نے قبضہ کر کے اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین محمد غوری کا حاکم مقرر کیا۔ جس نے فوجی کارروائی کر کے پشاور اور سندھ پار کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۱۸۶ء میں وہ لاہور پر بھی قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ خسرو ملک اور اس کے بیٹے بہرام کو گرفتار کر کے فیروز کوہ میں غیاث الدین محمد کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس طرح پنجاب میں یمینی خاندان کی حکومت کا خاتمہ اور غوری خاندان کا آغاز ہوا۔ پانچ سال بعد غیاث الدین محمد نے خسرو ملک اور اس کے بیٹے کو ختم کر کے غزنوی خاندان کے چراغ کو ہمیشہ کے لیئے گل کر دیا۔

غزنوی عہد کا پنجاب

۱۰۲۱ء میں سلطان محمود نے پنجاب کو فتح کر کے دولتِ یمینی میں شامل کر لیا۔ یوں تو سلطان نے کالنجر، قنوج اور سومنات تک کے دور دراز علاقوں کو فتح کر ڈالا مگر اس نے اپنی سلطنت کا باقاعدہ حصہ صرف سرزمین پنجاب کو بنایا۔ پنجاب کا علاقہ تقریباً پونے دو سو سال تک غزنوی خاندان کے زیرِ عنان رہا۔ اُن کا اقتدار یہاں اس قدر مضبوط تھا کہ غزنی میں ان کا اقتدار پنجاب کی بہ نسبت پہلے ختم ہوا۔ پنجاب کو باقاعدہ اور مستقل طور پر سلطنتِ غزنہ کا جزو بنانے کا مقصد درحقیقت ہندو راجاؤں اور سلطنتِ یمینی کے درمیان ایک بفر سٹیٹ کا قیام تھا تاکہ سلطنتِ یمینی کے سرحدی علاقے ہندو راجگان کی دستبرد اور یلغار جارحانہ یورشوں سے محفوظ رہیں۔

پنجاب کو یمینی دورِ حکومت میں علمی، تمدنی، اقتصادی اور عسکری لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ اس علاقہ بالخصوص لاہور کی اہمیت و شہرت سے متاثر ہو کر عراق، خراسان، ایران، ترکستان، اور غزنی وغیرہ کے علاقوں سے بہت سے تاجر، عوام، مبلغینِ دین، سپاہی، جرنیل اور سیاح یہاں آکر آباد ہو گئے۔ علاوہ ازیں مبلغینِ اسلام کی مساعی سے مقامی باشندے جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ چنانچہ اس دور میں اشاعتِ اسلام کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

Marfat.com

اس دور میں ترکی، ایرانی، افغانی نو آبادکاروں اور مقامی نو مسلموں اور ہندوؤں کے باہمی میل ملاپ سے نہ صرف ایک نیا تمدن معرضِ وجود میں آیا۔ بلکہ مختلف زبانوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان بھی ابھری۔ بقول حافظ محمود شیرانی یہی زبان ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی موجودہ اردو کی شکل اختیار کر گئی۔

پورے دو سو سالہ دورِ اقتدار میں یمینی خاندان کے امرا اور سلاطین نے اپنی قدیم روایات اور فطری ذوق کے تحت پنجاب کے شہروں بالخصوص لاہور میں بے شمار مساجد، محلات، مقبرے کتب خانے، مدرسے، خانقاہیں، حمام اور باغات تعمیر کرائے۔ غزنوی سلاطین اکثر مقتدر سرداروں اور شہزادوں کو لاہور کا حاکم مقرر کیا کرتے تھے جن کی قدر افزائی اور دلچسپی کی بدولت لاہور تمدنی ترقی کا ایک منفرد اور مثالی گہوارہ بن گیا۔ تہذیبی اور علمی اعتبار سے غزنی کے بعد وہ اس یمینی سلطنت کا دوسرا اہم ترین شہر بن گیا۔ غزنوی دور میں جن امرا شعرا اور مبلغین صوفیائے کرام کو شہر سے خطۂ پنجاب بالخصوص شہر لاہور نے مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے شہرت دوام حاصل کی، ان کا مختصر حال ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

مسعود سعد سلمان: ان کا دورِ غزنہ کے مقتدر اور مایۂ ناز شعرا میں شمار ہوتا ہے ان کا دیوان ایران میں چھپ چکا ہے۔ ان کے والد خواجہ سعد سلمان ایرانی النسل تھے۔ جب امیر مودود حاکم پنجاب مقرر ہوا تو خواجہ سعد سلمان بھی لاہور میں آکر آباد ہو گئے۔ یہیں خواجہ مسعود سعد سلمان پیدا ہوئے۔ یہیں پر انہوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ سلطان ابراہیم کے فرزند سیف الدین محمود کے حاکم لاہور مقرر ہونے پر مسعود اس کے متوسلین میں شامل ہو گئے۔ مگر جب شہزادہ عتاب شاہی کا شکار ہوا تو مسعود سعد سلمان کو بھی قید میں ڈالا دیا گیا۔ دس سال کی قید کے بعد مسعود امیر ابوالقاسم کی خاص سفارش پر رہا ہوئے۔ بعد میں جب شہزادہ بیزاد لاہور کا حاکم اور ابونصر پارسی اس کا سپہ سالار مقرر ہوا، تو مسعود کو جالندھر کے علاقے میں منصف مقرر کیا گیا؛ کیونکہ ابونصر پارسی خود بھی فارسی شعر و سخن کا دلدادہ تھا۔ آخری عمر میں مسعود نے بہرام شاہ جو ایک علم دوست سلطان تھا، کی مدح میں قصائد لکھے۔ منصفی کے عہدے سے الگ ہونے کے بعد مسعود سعد سلمان لاہور میں ہی اقامت گزین ہوئے اور یہیں وفات پائی۔

ابوالفرج رونی: یہ عہد غزنہ کا ایک مشہور شاعر تھا۔ یہ نواح لاہور میں واقع ایک قصبہ رونہ میں پیدا ہوا۔ وہ فارسی شاعری کا استاد تھا۔ اس کا مجموعۂ کلام ایران میں چھپ چکا ہے، جس سے غزنوی دور کے لاہور کے تمدن پر بہت روشنی پڑتی ہے۔

Marfat.com

شاہ یوسف گردیزی: مشہور مبلغِ اسلام شاہ یوسف، گردیز کے رہنے والے تھے۔ بہرام شاہ کے عہد میں ملتان میں آکر آباد ہوئے۔ انہوں نے یہاں تبلیغِ اسلام اور علوم مروّجہ کی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ آپ نے ۱۱۵۲ء میں بمقام ملتان وفات پائی۔ آپ کا مقبرہ آج بھی ملتان میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

حضرت اسماعیل بخاری: آپ ایک عالم اور صوفی منش مبلغ تھے اور بخاری سیّد تھے۔ ۱۰۰۵ء میں جب کہ ابھی لاہور باقاعدہ اسلامی سلطنت میں شامل نہ ہوا تھا، آپ لاہور تشریف لائے۔ آپ محدّث اور مفسّر بھی تھے آپ کی تبلیغ اور زُہد و اتقاء سے ہزارہا لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ آپ کا مزار ہال روڈ لاہور پر ایک چھوٹے سے چبوترے پر واقع ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ چھوٹا سا مزار اس مردِ مومن کا ہے، جس نے پہلی بار اس کفرستان میں کلمہ حق کا نعرہ بلند کیا تھا۔

حضرت فخرالدین حسین زنجانیؒ: آپ صرف تبلیغِ اسلام کے لیئے لاہور تشریف لائے روایت ہے کہ آپ مخدوم علی ہجویری (داتا گنج بخش) کے پیر بھائی تھے۔ جب حضرت ہجویری لاہور تشریف لائے تو آپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ آپ کا مزار چاہ میراں لاہور میں آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔

حضرتِ مخدوم علی ہجویریؒ: مخدوم علی ہجویری، غزنی کے ایک محلہ ہجویر کے رہنے والے تھے۔ ۱۰۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک برگزیدہ عالمِ دین، عارف باللہ اور مبلغِ اسلام تھے۔ آپ اپنے پیر و مرشد کے ارشاد پر لاہور تشریف لائے۔ یہاں آپ نے زندگی بھر دینِ اسلام کی تبلیغ و تعلیم اور رشد و ہدایت کی شمع کو فروزاں رکھا اور ایک خانقاہ اور ایک مسجد کی بنیاد ڈالی۔ آپ غالباً سلطان مسعود بن محمود کے دَور میں واردِ لاہور ہوئے۔ یہاں آپ کی شخصیت کی کشش سے جو لوگ مشرّف بہ اسلام ہوئے اُن میں لاہور کا حاکم رائے راجو بھی شامل تھا۔ جس کو آپ نے "شیخ ہندی" کے نام سے موسوم کیا۔[1] یوں تو آپ نے طریقت اور تصوّف پر متعدد کتابیں لکھیں۔ مثلاً البیان اہل العیان، منہاج الدین، کشف الاسرار، لیکن آپ کی معرفت آموز تصنیف "کشف المحجوب" اسلامی تصوّف پر مستند ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ آپ ۱۰۷۲ء میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزارِ پُرانوار اب تک لاہور میں مرجع خاص و عام اور آماجگاہِ فیوض و برکات ہے آپ کے مزار مبارک پر بہت سے علماء و مشائخ نے زُہد و ریاضت کے مراحل طے کئے۔ جن میں بابا فرید

---

[1] مولانا عبد المجید سالک "مسلم ثقافت ہندوستان میں" صفحہ ۲۳۸

Marfat.com

گنج شکرؒ اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ برصغیر میں حضرت شیخ علی ہجویریؒ کی ذات گرامی داتا گنج بخش کے لقب سے مشہور ہے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کا یہ شعر آپ کی عظمت و فیض بخشی کے بارے میں زبان زد خاص و عام ہے:

؎ گنج بخشِ فیضِ عالم، مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را راہنما

ملک ایاز: ایاز[1] سلطان محمود کا مشہور غلام تھا۔ وہ علم و ثقافت کا بہت قدر دان تھا۔ روایت ہے کہ حسن و جمال اور فضل و کمال کے سبب محمود اس پر سو جان سے فدا تھا۔ وہ پنجاب کا پہلا مسلمان گورنر بیان کیا جاتا ہے۔

ایاز کا پورا نام ملک ابوالنجم ایاز اویماق تھا[2]۔ سلطان محمود کے اس عزیز ترین مقرب اور حاکم لاہور کی ابتدائی زندگی عجیب حالات میں گذری۔ وہ بچپن میں غزنی لا کر بحیثیتِ غلام فروخت کیا گیا۔ سلطان محمود نے اسے اعلیٰ تعلیم و تربیت اور فنونِ سپہ گری سے بہرہ ور کیا۔ بعد میں وہ سلطان محمود کے محافظ دستہ (باڈی گارڈ) جو ترک غلاموں پر مشتمل تھا۔ کا نگران مقرر ہوا۔ محمود کے انتقال کے بعد محمد بن محمود سربراہ سلطنت ہوا تو ایاز نے اُس کی تخت نشینی کی مخالفت کی۔ لہٰذا وہ اپنے ماتحت ترک دستوں کو لے کر سلطان محمود کے بیٹے مسعود کی خدمت میں روانہ ہوا۔ جو اُس وقت اصفہان سے غزنی کی طرف آ رہا تھا۔ چنانچہ مسعود ایاز کی مدد سے محمد بن محمود کو تاج و تخت اور بینائی سے محروم کر کے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ بعد میں سلطان مسعود نے اپنے فرزند مجدود کو امارتِ ہند پر مامور کیا۔ تو ایاز کو اُس کا نائب السلطنت اور اتالیق بنا کر روانہ کیا گیا۔ عملی طور پر ایاز ہی لاہور کا حاکم تھا۔ قاضی و سپہ سالار اس کے ماتحت تھے۔ اس لحاظ سے ہم اُسے پنجاب کا پہلا مسلمان حاکم کہہ سکتے ہیں۔

ایاز نے اپنے دورِ اقتدار میں لاہور کو از سرِ نو آباد کیا۔ مسعود کے بعد مودود برسرِ اقتدار آیا تو اُس نے لاہور پر قبضہ کیا۔ انہی ایام میں ایاز نے وفات پائی۔ ایاز اپنے زمانے کا ایک ذی اقتدار و با اختیار شخص تھا اور علوم و فنون کا مربی تھا۔ عنصری، فرخی اور روکینی

---

[1] ایاز ترکی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی خوشگوار دھوپ یا وہ شبنم ہے جو صاف راتکو پڑے

[2] اویماق ایک ترک قبیلہ کا نام ہے۔

Marfat.com

دیگر شعراء نے اُس کی مدح میں متعدد قصائد لکھے۔ اردو اور فارسی ادب میں ایاز سے محمود کی والہانہ محبت کا عام ذکر آتا ہے۔ لاہور میں ایاز کی قبر چوک رنگ محل میں بزاز ہٹہ کے متصل آج بھی موجود ہے۔

اہم تاریخیں

۹۷۱ء یکم نومبر - سلطان محمود کی پیدائش
۹۷۷ء - سبکتگین کی تخت نشینی
۹۴-۹۹۳ء - شہر دہلی کا قیام
۹۹۷ء - امیر سبکتگین کی وفات
۹۹۸ء - سلطان محمود کا سریر آرائے سلطنت ہونا۔
۱۰۰۵-۶ء حاکم ملتان ابوالفتح داؤد کی گوشمالی کے لیئے، ملتان پر محمود کی یلغار۔
۱۰۰۹ء نگرکوٹ اور کانگڑہ کی فتح (سلطان محمود کا ساتواں حملہ)
۱۰۱۴ء محمود کے ہاتھوں تھانیسر کی فتح۔
۱۰۲۱-۲۲ء پنجاب کا یمینی سلطنت سے الحاق۔
۱۰۲۵-۲۶ء محمود کا سومنات کو فتح کرنا۔
۱۰۲۶ء سندھ کے جاٹوں کی گوشمالی کے لیئے برصغیر پر محمود کا سترھواں (آخری) حملہ۔
۳۰-اپریل ۱۰۳۰ء - سلطان محمود کی وفات۔
۱۱۵۵ء علاؤالدین جہاں سوز کے ہاتھوں غزنی کی تباہی۔
۱۱۸۶ء یمینی خاندان کے اقتدار کا خاتمہ
۱۱۸۷ء یروشلم پر سلطان صلاح الدین ایوبی کا قبضہ۔

Marfat.com

امتحانی سوالات

۱ :- دولتِ غزنہ کے قیام کا حال بیان کرتے ہوئے سلطان سبکتگین کے حالات پر ایک مفصل مضمون تحریر کیجیے۔

۲ :- سلطان محمود کے ابتدائی حالات مختصراً بیان کیجیے۔

۳ :- برِصغیر پاک و ہند پر سلطان محمود کے حملوں کا حال قلمبند کریں۔ نیز اس کے حملوں کے اغراض و مقاصد اور اثرات واضح کیجیے۔

۴ :- سلطان محمود کی سیرت و کردار کا اجمالی جائزہ پیش کریں۔

۵ :- ایک فاتح حکمران اور علم و ادب کے مربّی کی حیثیت سے سلطان کو تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ تبصرہ کیجیے۔

یا

"سلطان محمود غزنوی بلاشبہ ایشیا کے عظیم ترین حکمرانوں میں سے تھا" وضاحت کیجیے۔

۶ :- سلطان محمود کے جانشینوں کا حال لکھیے۔

۷ :- عہدِ محمودی کے چند نامور اربابِ علم و دانش کا حال بیان کیجیے۔

۸ :- مندرجہ ذیل پر نوٹ تحریر کریں۔

(ا) الپتگین۔

(ب) سومنات پر محمود کا حملہ۔

(ج) سلطان مسعود۔

(د) جہان سوز۔

(ر) البیرونی۔

(س) حضرت مخدوم علی ہجویریؒ۔

(ص) ملک ایاز

Marfat.com

پانچواں باب

خاندانِ غور کا عروج

"غزنی میں ایک عظیم نسبی انقلاب برپا ہوا۔ اور سلطنتِ ایران، دولتِ ہند اور عملداریٔ خراسان شنسبانی سرداروں کے زیرِ نگیں آگئی۔ وہ (غوری ترک) ایک طوفان کی طرح غزنی میں وارد ہوئے اور محض جرأت وجسارت اور قوت کے بل بوتے پر انہوں نے اپنے حریف کو شکستِ فاش دی[1]۔"

(ایشوری پرشاد)

غزنی خاندان کے دورِ انحطاط میں غور کے شنسبانی[2] خاندان نے نمایاں حیثیت حاصل کی۔ غور کا علاقہ غزنی اور ہرات کی دشوار گذار وسطی پہاڑیوں میں واقع ہے۔ اسے غورستان بھی کہتے ہیں۔ مقامی ملک اور سردار یہاں کے حکمران تھے۔ فیروز کوہ[3] (ان غوری سرداروں کا مستقر ریا پایۂ تخت) تھا۔ ۱۰۱۰ء میں محمود غزنوی نے اس خطّہ کو زیرِ نگین کیا تو اس نے باج کی ادائیگی کے وعدے پر مقامی سرداروں کی حاکمیت کو برقرار رکھا۔ نتیجتہً غور کے بہادر اور جنگجو سپاہیوں نے محمود کی قیادت میں برِصغیر کی فوجی مہمّات کے دوران خوب دادِ شجاعت دی۔ بعدازاں جوں جوں یمینی (غزنہ) خاندان کا سیاسی اقتدار کم ہوتا گیا، غوری سرداروں کی سطوت و جبروت میں اضافہ ہوتا گیا۔ انہی غوری سرداروں کے ہاتھوں سلطنت غزنہ تباہی سے دوچار ہوئی۔ بہرام شاہ (۱۱۱۸ء تا ۱۱۵۲ء) کے دورِ اقتدار میں فیروز کوہ کا سردار عزّالدین حسین تھا، جو ملکُ الجبال کے لقب سے مشہور تھا۔ اس کا خاندان آلِ شنسب یا شنسبانی خاندان کہلاتا تھا۔

عزالدین حسین کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا سیف الدین امارتِ غور کا سردار بنا۔ جس کے دورِ اقتدار کے دوران غزنوی اور غوری امارتوں میں مخاصمت کا آغاز ہوا۔ جس کے نتیجہ میں کئی لڑائیاں

---

[1] "ہسٹری آف میڈیول انڈیا" صفحہ ۱۲۸

[2] غوریوں کے مورثِ اعلیٰ کا نام عباس شنسب تھا۔ اُسی نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا اور اسی کی نسبت سے اس کا خاندان شنسبانی خاندان کہلایا۔

[3] غورستان کی پہاڑیوں میں واقع ایک مشہور قلعہ۔

Marfat.com

ہوئیں حتیٰ کہ خاندانِ غزنہ اور خاندانِ شنسبانی کے مابین کش مکش نے سنگین صورت اختیار کر لی۔

علاؤالدین جہانسوز ۱۱۵۱ء میں غوری امارت کے امیر علاؤالدین نے غزنی پر حملہ کر دیا۔ اور غزنی کے حکمران بہرام شاہ کو شکست دے کر غزنی پر قبضہ کر لیا۔ اور اپنی سپاہ کو باشندگانِ غزنی کے قتلِ عام اور شہر کو نذرِ آتش کر دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ مسلسل سات روز تک غزنی کا خوبصورت شہر تاخت و تاراج ہوتا رہا اور اس سے آگ کے شعلے بلند ہوتے رہے اور عروس البلاد کہلانے والا یہ شہر جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ ہزارہا بندگانِ خدا غوری شمشیروں کے گھاٹ اتر گئے۔ اس پر بھی جب علاؤالدین کی آتشِ انتقام ٹھنڈی نہ ہوئی تو اس کے حکم پر سلطان محمود، مسعود اور ابراہیم کے سوا باقی تمام سلاطینِ غزنہ کی قبریں کھود ڈالی گئیں۔ اُن کی نعشوں کو جلا کر مقبروں کو مسمار کر دیا گیا۔ ان انتہائی سفاکانہ اقدامات کی بنا پر علاؤالدین کو تاریخ میں "جہانسوز" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

امیر غیاث الدین ۱۱۶۱ء میں علاؤالدین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سیف الدین فیروز کوہ کی مسندِ اقتدار پر بیٹھا، لیکن ۱۱۶۳ء میں اس نے بھی وفات پائی۔ چنانچہ اس کا بھتیجا امیر غیاث الدین امارتِ فیروز کوہ کا وارث بنا۔ اس نے غزنی پر فوج کشی کی۔ اور قبضہ کر کے غزنی کی امارت اپنے چھوٹے بھائی معزالدین سام عرف شہاب الدین محمد غوری کے سپرد کی۔ دونوں بھائیوں میں بے حد یگانگت اور محبت تھی۔ اور جس طرح انہوں نے باہمی اعتماد و تعاون اور یگانگت کی خوشگوار فضا میں زندگی بسر کی۔ اس کی نظیر مشکل سے تاریخ کے اوراق میں ملے گی۔ بڑا بھائی غیاث الدین تمام عمر فیروز کوہ کی مسندِ امارت پر متمکن رہا جب کہ چھوٹے بھائی شہاب الدین محمد غوری نے تمام شمالی برِصغیر کو زیرِ نگیں کر کے ایک وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ وہ جاہ و اقتدار کا حامل اور ایک وسیع سلطنت کا مالک تھا، مگر وہ ہمیشہ اپنے بھائی کا فرمانبردار رہا۔ اپنے آپ کو اس کا نائب ظاہر کرتا رہا۔ اور اسی کا نام سکوں پر کندہ کرواتا رہا۔ اگر بڑا بھائی فہم و فراست قابلیت اور دُور اندیشی میں بے مثال تھا تو چھوٹا بھائی شجاعت، بلند ہمتی اور مستقل مزاجی کا پیکر تھا۔

Marfat.com

شہاب الدّین محمد غوری

"محمد غوری کو بجا طور پر ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے نہ صرف راجپوتوں کی سیاسی طاقت کو کچلا، بلکہ اُن کی سطوتِ پارینہ کے کھنڈروں پر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ محمد غوری ایک عملی سیاستدان تھا۔ وہ نہ صرف ایک فاتح اور جنگجو ہی تھا، بلکہ تعمیری کام کرنے والا سیاست دان اور مدبّر بھی تھا۔[1]"

(سید عبد القادر و شجاع الدین)

شہاب الدین محمد غوری نے سریر آرائے سلطنت ہوتے ہی سلطان محمود کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کیا۔ وہ ایسا آدمی نہ تھا جو غزنہ کی امارت پر قناعت کر لیتا، کیونکہ بقول پروفیسر حبیب سلطنت غزنہ کا ذرّہ ذرّہ سلطان محمود کی فاتحانہ عظمتوں کے تصوّر سے معمور تھا، اور یہ امر ناممکن تھا کہ وہاں کے حکمران (شہاب الدین محمد غوری) میں یہ جذبہ عزم و استقلال کی نئی روح نہ پھونک دیتا۔ چنانچہ شہاب الدین نے غزنی کی مغربی جانب چند حملے کئے۔ لیکن جلد ہی اُس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ طاقتور خوارزم شاہیوں کے مقابلے میں مغرب کی جانب پیش قدمی ممکن نہیں۔ لہٰذا اس نے مشرق کا رخ کیا اور برّصغیر پاک و ہند کی تسخیر کا مصمم ارادہ کر لیا۔ سلطنت غزنہ کا فرمانروا ہونے کی حیثیت سے وہ پنجاب کو اپنی سلطنت کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔ محمد غوری تیسرا اہم حکمران تھا۔ جو برّصغیر پر حملہ آور ہوا۔

محمد غوری کی فتوحات

ملتان کی تسخیر ۱۱۷۵ء

غزنویوں کے زوال کے بعد ملتان میں قرامطی دوبارہ برسرِ اقتدار آ گئے۔ ۱۱۷۵ء میں سب سے پہلے محمد غوری نے ان کے خاتمہ کے لیئے ملتان پر فوج کشی کی اور قرامطیوں کو شکست دے کر ملتان پر قبضہ کر لیا اور اس

---

[1] "تاریخ پاکستان و ہند"، صفحہ ۴۷۸

Marfat.com

کے نظم ونسق پر اپنے عمّال مقرر کئے۔

فتح اُچ
۱۱۷۵ء

ملتان کی تسخیر کے بعد محمد غوری نے اُچ[1] کے بھٹی راجپوتوں کے خلاف فوجی کارروائی کی۔ کیونکہ ملتان کے مفرور قرامطہ نے اُن کے ہاں پناہ لے لی تھی۔ محمد غوری نے اُچ کے راجہ کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ 'طبقاتِ اکبری' کے مصنف خواجہ نظام الدین کے بیان کے مطابق طویل محاصرہ کے باوجود جب محمد غوری قلعہ اُچ کی تسخیر میں ناکام رہا تو اس نے ایک چال چلی اور راجہ کی رانی کو اس مضمون کا پیغام بھیجا کہ اگر وہ شہر پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں اس کی (محمد غوری) کی معاون بنے تو وہ وعدہ کرتا ہے کہ اس سے شادی کر کے اُسے اپنی ملکہ بنا لے گا۔ رانی نے جواب میں عرض کیا کہ میں تو بہت عمر رسیدہ ہوں لیکن میری لڑکی فہم و فراست اور خوبصورتی کا مجسمہ ہے اگر سلطان اس سے شادی کرنے کا وعدہ کرلے تو وہ راجہ کا کام تمام کر دے گی۔ سلطان نے اس تجویز کی حامی بھر لی۔ چنانچہ بے وفا رانی نے اپنے بوڑھے خاوند کو زہر خورانی کے ذریعہ ہلاک کر کے شہر پر سلطان کا قبضہ کروا دیا۔ شہاب الدین غوری نے وعدے کے مطابق اس کی لڑکی سے شادی کر لی، اور ملتان اور اُچ کا نظم ونسق علی کرماخ کے سپرد کر کے واپس غزنی لوٹ گیا۔

اس واقعہ کا ذکر سب سے پہلے ابن اثیر نے اپنی کتاب 'الکامل فی التاریخ' میں کیا ہے۔ ہمعصر مورخین کی کتابوں میں اس کہانی کا کوئی ذکر نہیں۔ بعد کے مورخین مثلاً فرشتہ اور یحییٰ سرہندی اور خواجہ نظام الدین احمد غالباً ابن اثیر کی ہی روایت کو بنیاد بنا کر اس واقعہ کو اپنی تاریخوں میں بیان کرتے ہیں۔ حقیقتاً یہ روایت درست نہیں، کیونکہ جدید تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سندھ اور اس کے نواحی علاقوں پر بھٹی راجپوت کبھی حکمران نہیں رہے۔ نیز محمد غوری کا صالح کردار ہمارے سامنے ہے۔ لہٰذا اس کی ذات سے اس قسم کی ذلیل حرکت کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں یہ روایت برصغیر کی ہندو بالخصوص راجپوت عورت کی جبلت و فطرت کے بھی سراسر منافی ہے کہ وہ ایک غیر مذہب قوم کے حملہ آور کی ایسی ترغیب میں آکر اپنے شوہر کو ہلاک کر دے، اور دشمن پر شہر کے دروازے کھول دے۔ اس لیئے ان مدلّل حقائق کی روشنی میں یہ واقعہ بالکل غلط اور ناقابلِ یقین ہے

سندھ اور گجرات پر حملہ
۱۱۷۸ء

۱۱۷۸ء میں محمد غوری سندھ پر حملہ آور ہوا اور دریائے سندھ کے کنارے تک کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اناں بعد اُس نے کچھ کے راستے نہروالا (گجرات) کی طرف پیش قدمی کی۔ لیکن انہلواڑہ

---

[1] ایک بہت ہی قدیم شہر جو پنجند کے قریب واقع ہے۔ روایت ہے کہ اسے سکندر اعظم یونانی نے آباد کیا تھا۔ یہاں بے شمار بزرگانِ دین کے مزارات ہیں۔

Marfat.com

کے قریب راجہ مولراج سے شکست کھائی اور پسپا ہو کر سندھ لوٹ آیا۔ اگرچہ محمد غوری گجرات کو فتح نہ کر سکا، تاہم ۱۱۸۲ء میں وہ دیبل اور سندھ کے دیگر علاقوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پنجاب کی تسخیر ۱۱۸۶ء

تسخیر سندھ کے بعد محمد غوری نے پنجاب کی غزنوی سلطنت کے خلاف فوج کشی کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۱۷۹ء میں اس نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ تاکہ اسے پنجاب کی غزنوی سلطنت کے خلاف فوجی کاروائی کے لئے فوجی مستقر بنایا جا سکے۔

۱۱۸۱ء میں سلطان محمد غوری نے پنجاب پر یلغار کر دی اور آگے بڑھ کر لاہور کا محاصرہ کر لیا امارت غزنہ کا آخری فرمانروا خسرو ملک مقابلہ کی تاب نہ لا کر صلح کرنے پر مجبور ہوا۔ چنانچہ اس نے باجگذار رہنے اور اپنے خورد سال فرزند ملک شاہ کو بطور یرغمال دینے کی شرط پر صلح کر لی۔
۱۱۸۴ء میں محمد غوری نے سیالکوٹ پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کے دفاع کو مستحکم کرنے کے بعد واپس عازم غزنی ہوا۔

۱۱۸۵ء میں شکست خوردہ غزنوی تاجدار خسرو ملک نے کھوکھروں کی مدد سے چھنا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے سیالکوٹ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن ناکام واپس لوٹا۔ اس پر ۱۱۸۶ء میں محمد غوری نے پنجاب پر دوبارہ حملہ کر دیا۔ خسرو ملک میں مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ لہذا وہ صلح کا متلاشی ہوا اور باہمی افہام و تفہیم کے ذریعہ اختلافات کے تصفیہ کے لئے شہر سے باہر آیا۔ لیکن سلطان محمد غوری نے اسے گرفتار کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح غزنوی اقتدار کا خاتمہ ہوا اور پنجاب و سندھ پر محمد غوری کی عمل داری قائم ہو گئی۔ اور تسخیر برصغیر کی راہ ہموار ہو گئی۔

تبر ہنڈہ کی تسخیر[1] ۱۱۹۱ء

پنجاب پر مکمل قبضہ کرنے کے بعد محمد غوری اپنی سرحدوں کے تحفظ اور ہندو علاقوں کی تسخیر کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ ۱۱۹۱ء میں اس نے آگے بڑھ کر تبر ہنڈہ پر قبضہ کر لیا۔ تبر ہنڈہ کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور فوجی نقطۂ نگاہ سے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اس پر دہلی اور اجمیر کے راجہ پرتھوی راج چوہان کا قبضہ

---

[1] تبر ہنڈہ کے متعلق مورخین متضاد آراء رکھتے ہیں ــــ محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ اسے بھٹنڈہ بیان کرتا ہے۔ (تاریخ فرشتہ صفحہ ۵۷) ڈاکٹر اے ایل سری واستوا اور پروفیسر ایم کبیر بھی اسے بھٹنڈہ بیان کرتے ہیں۔ جب کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد، پروفیسر سید عبدالقادر اور پروفیسر شجاع الدین اسے سرہند لکھتے ہیں۔ اور اکبری دور کے مشہور مورخ خواجہ نظام الدین نے بھی 'طبقاتِ اکبری' میں سرہند ہی لکھا ہے۔

Marfat.com

تھا۔ وہ اِس قلعہ کو اپنی جنگی سرگرمیوں کا مستقر بنا کر لاہور اور پنجاب کے دیگر حصوں مثلاً جالندھر، دوآب وغیرہ پر آسانی سے فوجی یلغار کر سکتا تھا۔ اس لیئے دفاعی مصلحت کے پیشِ نظر محمد غوری نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور ملک ضیاء الدین تولک کو بارہ سو شہسواروں کی معیت میں وہاں کا قلعہ دار مقرر کیا[1] اور واپس عازمِ غزنی ہُوا۔

ترائن[2] کی پہلی لڑائی
۱۱۹۱ء

پرتھوی راج چوہان کو جب تبر ہنڈہ پر محمد غوری کے قابض ہونے کی اطلاع ملی تو وہ تیزی سے ایک بھاری لشکر کے ساتھ قلعہ کی بازیابی کے لیئے بڑھا۔ "تاریخ فرشتہ" کے مطابق پرتھوی راج کی فوج دو لاکھ راجپوتوں اور تین ہزار جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ نیز اس کا بھائی کھانڈے راؤ (گوبند رائے) حاکم دہلی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ محمد غوری غزنی جاتے ہوئے ابھی راستہ ہی میں تھا کہ اسے پرتھوی راج کی پیشقدمی کی اطلاع ملی۔ چنانچہ وہ الٹے پاؤں تیزی سے واپس ہوا اور ترائن کے مقام پر دشمن کو جا لیا۔ اگرچہ غوری لشکر بے حد تھکا ہوا تھا اور قلیل تعداد میں ہونے کے باعث دشمن کے مقابل آنے پر آمادہ نہ تھا لیکن جنگ سر پر آ چکی تھی۔ اس لیئے اس نے راجپوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ راجپوتوں نے غوری فوج کو منتشر کر دیا۔ محمد غوری گھوڑے پر سوار، نیزہ ہاتھ میں سنبھالے مصروفِ پیکار تھا۔ کہ کھانڈے راؤ ہاتھی پر سوار اس کے سامنے آیا۔ سلطان نے نیزہ سے اس پر بھرپور وار کیا جس کی ضرب سے کھانڈے راؤ کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ کھانڈے راؤ نے بھی بھرپور وار کر کے محمد غوری پر تلوار کا بھرپور وار کیا، جس سے سلطان کے شانے پر شدید زخم آیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کے قریب تھا کہ ایک خلجی سردار نے پھرتی سے چھلانگ لگا کر اس کے پیچھے بیٹھ کر اسے تھام لیا اور میدان جنگ سے باہر نکال لایا۔ محمد غوری ہزیمت خوردہ فوج کے ساتھ بمشکل تمام لاہور پہنچا اور صحت یاب ہونے کے بعد غزنی چلا گیا۔ محمد غوری کی شکست کے بعد پرتھوی راج نے آگے بڑھ کر تبر ہنڈہ کا محاصرہ کر لیا۔

تبر ہنڈہ کے قلعہ دار ضیاء الدین تولک نے قلعہ بند ہو کر بکمال ہمت و جرأت قلعہ کا دفاع کیا۔ تیرہ[13] ماہ محصور رہنے کے بعد جب سامانِ رسد بالکل ختم ہو گیا تو اس نے اس شرط پر قلعہ پرتھوی راج کے حوالے کرنے کی حامی بھری کہ محصورین کو ساز و سامان سمیت چلے جانے کی اجازت دی جائے چنانچہ تبر ہنڈہ پر راجپوتوں کا قبضہ ہو گیا۔

---

[1] محمد عزیز احمد "دہلی ترکش ایمپائر آف دہلی" صفحہ ۷۷

[2] ترائن ایک قصبہ ہے جو تھانیسر اور کرنال کے درمیان واقع ہے۔ اور آج کل تراوڑی کے نام سے مشہور ہے۔

Marfat.com

ترائن کی دوسری لڑائی
۱۱۹۲ء

ترائن کی پہلی لڑائی کی ذلت آمیز ہزیمت کا محمد غوری کو شدید احساس تھا۔ اس کا عسکری دبدبہ اور وقار خاک میں مل گیا تھا۔ غزنی پہنچ کر سلطان نے ان سالاروں کو عبرتناک سزائیں دیں اور سخت شرمندہ کیا۔ جن کی غفلت سے اسے شکست ہوئی تھی۔ سلطان نے ان کے چہروں پر گھوڑوں کو دانہ کھلانے والے توبڑے باندھ کر انہیں شہر میں گھمایا تاکہ انہیں عبرت ہو۔ ۱۱۹۲ء میں سلطان پوری تیاری کے بعد ایک لاکھ بیس ہزار جنگجو فوج کی معیت میں برصغیر پاک و ہند کی جانب بڑھا۔

"پشاور میں ایک بوڑھے نے سلطان سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے سلطان نے جواب دیا کہ ہندوستان میں شکست کھانے کے وقت سے اس نے اپنے اوپر خواب و خور اور عیش و آرام حرام کر رکھا ہے۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھ کر اپنی گذشتہ شکست کا بدلہ لینے ہندوستان جا رہا ہے۔[1]"

لاہور پہنچ کر سلطان نے اپنے ایک امیر قوام الملک رکن الدین حمزہ کو اجمیر بھیج کر پرتھوی راج کو اسلام قبول کرنے اور باجگذار رہنے کی دعوت دی۔ لیکن پرتھوی راج نے اس کو بری طرح رد کر دیا۔ اور محمد غوری کی متوقع فوج کشی کے پیش نظر پرتھوی راج نے برصغیر کے تمام راجپوت راجگان سے مدد کی درخواست کی۔ قنوج کے راجہ جے چند راٹھور کے علاوہ تمام راجگانِ ہند نے اس کی مدد کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ، پرتھوی راج تین لاکھ سواروں تین ہزار جنگی ہاتھیوں اور لاتعداد پیادہ سپاہ کے جم غفیر کے ساتھ ترائن کے میدان میں خیمہ زن ہو کر غوری افواج کا انتظار کرنے لگا۔

محمد غوری لاہور سے سیدھا سرہند پہنچا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے تھانیسر کا رُخ کیا۔ تھانیسر کے قریب پہنچ کر اس نے فوج کے بیشتر حصہ، جنگی ہاتھیوں، چتر شاہی جھنڈوں کو ایک ایسی جگہ متعین کیا، جہاں سے وہ نہ صرف دشمن کی نگاہ سے پوشیدہ تھے۔ بلکہ بوقتِ ضرورت انہیں وہاں سے بلایا بھی جا سکتا ہے۔ باقی فوج کو دس دس ہزار پر مشتمل چار دستوں پر تقسیم کیا اور راجپوتی فوج پر حملہ کا حکم دے دیا۔ غوری فوج نے طے شدہ منصوبہ کے مطابق بار بار پسپا ہونے کا بہانہ بنا کر اور راجپوتوں کو تعاقب کی ترغیب دے کر ان کی صف بندی کو منتشر کر کے انہیں کافی نقصان پہنچایا۔ بالآخر جب راجپوتی فوج کافی تھک چکی تو محمد غوری نے اپنی تازہ دم فوج طلب کر کے یک لخت یلغار کرنے کا حکم دیا۔ جس سے میدانِ جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ بڑے گھمسان کا رن

---

[1] تاریخِ فرشتہ، صفحہ ۵۷

Marfat.com

پڑا۔ راجپوت اس اچانک حملے کی تاب نہ لاکر سکے اور سراسیمہ ہوکر میدانِ کارزار سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ متعدد راجپوت سردار مارے گئے۔ کھانڈے راؤ حاکم دہلی بھی مارا گیا۔ پرتھوی راج چوہان (رائے پتھورا) نے اپنے جنگی ہاتھی سے اتر کر اور گھوڑے پر سوار ہوکر میدان جنگ سے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن سرسوتی (سرسہ) کے قریب گرفتار ہوکر مارا گیا اور محمد غوری نے آگے بڑھ کر اجمیر، دہلی اور سرسوتی پر قبضہ کر لیا۔

نتائج

یہ جنگ برِصغیر کی تاریخ میں دُور رس نتائج کی حامل ثابت ہوئی۔ یہ نہ صرف ایک فیصلہ کن جنگ تھی جس نے برِصغیر کی تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا بلکہ اس کے نتیجہ کے طور پر برِصغیر پاک و ہند میں غوری خاندان کی سلطنت کی داغ بیل پڑی، مزید علاقوں کی تسخیر کے لیئے راستہ ہموار ہوا اور تمدنی لحاظ سے برِصغیر کی تاریخ ایک نئے دور میں داخل ہوئی علاوہ ازیں اجمیر کے چوہان خاندان کی عسکری عظمت پاش پاش ہوکر رہ گئی۔ بقول ڈاکٹر ایشوری پرشاد "ترائن کی دوسری جنگ نے "راجپوتوں کی اجتماعی قوت اور سطوت و شوکت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور ہندوستان کے تمام طبقوں میں بددلی اور شکست خوردہ ذہنیت کی فضا پھیل گئی۔ پرتھوی راج چوہان کی موت کے بعد راجپوتوں کے اتحاد و یگانگت کا شیرازہ بکھر گیا اور راجپوتوں سے کوئی ایسا راہنما دوبارہ نہ اٹھ سکا جو مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو منظم کر سکتا۔"[1]

اس جنگ کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ ترائن کی فتح کے بعد محمد غوری نے ہانسی، کہرام، سرسوتی، اجمیر اور گڑھ شوالک کے متصلہ فوجی اہمیت کے تمام علاقوں پر قبضہ کر کے پہلی بار برِصغیر میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی اور ملک قطب الدین ایبک کو مزید علاقوں کی تسخیر پر مامور کیا۔ نیز سلطان نے سیاسی بصیرت اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اجمیر کا علاقہ باجگذار و اطاعت گذار رہنے کے عوض پرتھوی راج کے بیٹے کے حوالے کیا۔ اسی طرح دہلی کی حاکمیت کھانڈے راؤ کے ایک رشتہ دار کو تفویض کی گئی جس نے بھاری تعداد میں خراج ادا کرنے کے علاوہ اطاعت گذار رہنے کا وعدہ کیا۔

قطب الدین بطور نائب السلطنت

۱۱۹۲ء تا ۱۲۰۶ء

ترائن کی لڑائی (۱۱۹۲ء) میں پرتھوی راج کی شکست اور اس کے مقبوضات قبضہ میں آنے

---

[1] ہسٹری آف میڈیول انڈیا۔ صفحہ ۱۳۸

Marfat.com

کے بعد محمد غوری نے برصغیر پاک و ہند میں غوری حکومت کی بنیاد رکھی۔ ملک قطب الدین ایبک کو اپنا نائب السلطنت مقرر کر کے واپس عازم غزنی ہوا۔ قطب الدین ایبک نے کہرام کو توز ائیدہ غوری حکومت کا دارالحکومت بنایا اور بعد ازاں مفتوحہ علاقوں کے نظم و نسق کی درستی اور امن و امان کی بحالی کیطرف متوجہ ہوا۔

قنوج کی فتح
۱۱۹۴ء

اگرچہ ترائن کی دوسری لڑائی میں محمد غوری کے ہاتھوں پرتھوی راج چوہان اور اس کے حلیف راجاؤں کی شکست سے راجپوتی سطوت پاش پاش ہو کر رہ گئی تھی، مگر ابھی قنوج اور بنارس میں ہندو اقتدار کے مضبوط مراکز قائم تھے۔ نیز قنوج کو شمالی ہند میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس لیے غوری سطوت و ثروت کے تحفظ کے لیئے اس کا فتح کرنا نہائیت ضروری تھا۔ اس وقت قنوج کا حکمران جے چند تھا، جس نے ترائن کی دوسری لڑائی میں محض اس وجہ سے پرتھوی راج کا ساتھ نہ دیا تھا کہ اس نے اس کی بیٹی سنجوگتا سے زبردستی شادی رچالی تھی۔ ۱۱۹۴ء میں سلطان محمد غوری برِصغیر پاک و ہند میں آیا اور اُس نے قنوج کی تسخیر کے لیئے فوج کشی کی۔ سلطان نے پچاس ہزار سواروں کی فوج کو قطب الدین کی کمان میں بطورِ ہراول آگے بھیجا۔ دریائے جمنا کے کنارے قنوج اور اٹاوہ کے درمیان چندواڑہ (موجودہ فیروز آباد) کے مقام پر جے چند اور غوری ہراول دستوں کے درمیان مقابلہ ہوا، جس میں جے چند سخت زخمی ہو کر ہلاک ہوا۔ اس کی ہلاکت کے بارے میں سری واستوا رقمطراز ہے کہ "دورانِ جنگ ایک تیر اس کی آنکھ میں آکر نزاد ہو گیا اور وہ اس کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہو گیا"[1] جب کہ پروفیسر ودیا کا قول ہے کہ جے چند نے ہزیمت اٹھانے پر بددل ہو کر دریائے جمنا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ محمد غوری کے آگے بڑھ کر قنوج پر قبضہ کر لیا۔ جہاں سے تین سو ہاتھیوں کے علاوہ بہت سا مالِ غنیمت اس کے ہاتھ آیا۔ بعد ازاں محمد غوری نے بنارس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح قنوج اور بنارس میں راجپوت قوت کو کچلنے کے بعد محمد غوری واپس عازمِ غزنی ہو گیا۔

شمالی اور وسطی ہند کی تسخیر
۱۱۹۴ء — ۱۲۰۲ء

اگرچہ فتح قنوج کے بعد محمد غوری واپس غزنی چلا گیا۔ مگر قطب الدین ایبک نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ ۱۱۹۴ء میں اس نے تھنکر (متصل بیانہ) گوالیار اور بدایوں جیسے اہم مرکزوں پر قبضہ کر لیا۔ ازاں بعد قطب الدین نے گجرات کے راجہ بھیم دیو رائے کو شکست دے کر انہلواڑہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۲۰۲ء میں اس نے کالنجر کو زیرِ نگین

---

[1] "دی سلطنت آف دہلی" صفحہ ۸۷

Marfat.com

کیا۔ اور اس طرح دہلی، میرٹھ، قنوج، بنارس، اجمیر، بیانہ، گوالیار اور کالنجر کی تسخیر سے شمالی اور وسطِ ہند کا بیشتر حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا، جس سے اسلامی حکومت کی بنیاد بہت مستحکم ہوگئی۔

۱۱۹۷ء میں بہار اور ۱۱۹۹ء میں بنگال کی تسخیر قطب الدین ایبک کے جرنیل بختیار خلجی کے ہاتھوں سرانجام پائی اور اس طرح شمالی ہند کی تسخیر پایہ تکمیل کو پہنچی۔

بختیار خلجی

جب قطب الدین ایبک شمالی اور وسطی ہند کی فتوحات میں مصروف تھا۔ تو اس کے متعدد جانباز جرنیل از خود مسلم مقبوضات میں توسیع کرنے میں مصروف تھے۔ اُن میں ایک ترکی النسل جرنیل بختیار خلجی بھی تھا۔ جس کا اصل نام اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی تھا۔ وہ ایک شہزور اور بہت ہی قوی ہیکل انسان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بازو اس قدر لمبے تھے کہ اس کی پنڈلیوں تک پہنچتے تھے۔ نیز وہ بہت ہی بدصورت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے غزنی اور دہلی میں فوجی ملازمت نہ مل سکی تھی۔ بالآخر وہ حاکم بدایوں بدرالدین حسن ادیب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جس نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن جلد ہی وہ قنوج کے علاقہ میں اپنے چچا محمد محمود کی وفات کے بعد اس کی جاگیر کشمنڈی کا مالک بن گیا۔ علاوہ ازیں حاکم اودھ ملک حسام الدین نے اسے دریائے گنگا اور سرون کے درمیان جاگیر عطا کر کے اپنی ملازمت میں لے لیا۔ جاگیردار بننے کے بعد اس نے اپنے ہم قبیلہ خلجی سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج قائم کر کے اپنی عسکری پوزیشن کو نہایت مستحکم بنا لیا۔ اس پر سلطان قطب الدین ایبک نے اُسے سرحد بہار کی حفاظت پر مامور کیا۔ لیکن بہت جلد اس نے اپنی مضبوط عسکری جمعیت کے بل بوتے پر بنگال اور بہار کے علاقوں پر تسلط جما لیا۔ ہمعصر مؤرخ منہاج سراج لکھتا ہے کہ "وہ تندرو، جانباز، مہم جُو، دلیر، شجاع، زیرک اور چابکدست واقع ہوا تھا۔ اور بیمثال جرأت کا مالک تھا۔ بہار اور بنگال کی فتح کا سہرا اسی کے سر ہے"[1]

بہار و بنگال کی فتح

۱۱۹۷ء - ۱۱۹۹ء

بہار میں حکمران پال خاندان رُوبہ زوال تھا۔ چنانچہ بختیار خلجی نے اپنے جانباز سرفروشوں کے ساتھ بہار کے سرحدی علاقوں پر بیباکانہ چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ بالآخر ۱۱۹۷ء میں وہ دو سو شہسواروں کے ساتھ بجلی کی طرح بہار پر جا گرا اور ایک ہی یلغار میں بہار کے زرخیز اور سرسبز و شاداب علاقہ کو تسخیر کر لیا۔ بہار کی فتح بختیار خلجی کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ اب وہ سلطان قطب الدین ایبک گورنر دہلی کے حضور حاضر ہوا، جس نے اس کی کارگذاری سے خوش ہو کر اسے نہ صرف خلعتِ فاخرہ

---

[1] 'طبقاتِ ناصری' صفحہ ۱۴۶

Marfat.com

سے نوازا بلکہ مفتوحہ علاقہ بہار کی حاکمیت سے بھی اُسے سرفراز کیا۔ اس پر بختیار کے حوصلے اور بلند ہو گئے اور اس نے بنگال کی تسخیر کا مصمم ارادہ کر لیا۔

۱۱۹۹ء میں بختیار خلجی اپنے ایک منتخب جیش کے ساتھ اپنی زندگی کے عظیم اور حیرت انگیز کارنامہ تسخیر بنگال کے لیئے روانہ ہوا۔ وہ جنوبی بہار کے تم آباد خطوں سے گذرتا ہوا بنگال میں داخل ہو گیا۔ بنگال پر سین خاندان کے راجہ لکشمن کی حکومت تھی جو ایک ضعیف العمر اور کمزور انسان تھا۔ نیز اسے امورِ سلطنت کی نسبت پوجا پاٹھ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ جس کی وجہ سے ملک بدنظمی اور انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔ مزید برآں راجہ اپنی مغربی سرحد کے تحفظ اور ملک پر ترکوں کے متوقع حملہ کی پیش بندی سے بالکل غافل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بختیار خلجی بغیر کسی مزاحمت کے بنگال کے دارالحکومت ندیا تک جا پہنچا۔ وہ جوشِ جہاد میں اس تیز رفتاری سے وہاں پہنچا تھا۔ کہ شہر ندیا کے قریب پہنچنے پر اس کے ہمراہ صرف اٹھارہ سوار تھے جب کہ باقی فوج عقب میں آ رہی تھی۔ بختیار خلجی بلاخوف وخطر شہر میں داخل ہوا اور شاہی محل کے سامنے جا اترا۔ لوگوں نے گھوڑوں کا سوداگر سمجھ کر اس سے کچھ تعرض نہ کیا۔ چنانچہ اس نے محل کے محافظ سپاہیوں کو تہہ تیغ کر کے حملے کا آغاز کر دیا۔ اس وقت راجہ لکشمن دسترخوان پر بیٹھا کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ اچانک جب محل کے صحن میں محافظوں کا شور وغل بلند ہوا اور اس نے بختیار خلجی کی آمد کی خبر سنی تو وہ اس قدر سراسیمہ ہوا کہ ننگے پاؤں محل کے عقبی دروازے سے نکل کر بھاگ گیا۔

اس سے پیشتر کہ راجہ کی فوج مقابلہ کے لیئے تیار ہوئی، بختیار خلجی کا باقی لشکر بھی آ پہنچا اور شہر پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ راجہ کا تمام خزانہ، حرم اور خدمت گار قبضہ میں آئے۔ متعدد ہاتھی اور بے پناہ مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ دارالحکومت ندیا کی فتح تمام بنگال کی تسخیر کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور بغیر کسی مقابلہ کے تمام بنگال زیرِ نگیں ہو گیا۔ مورخین کی متفقہ رائے ہے کہ بنگال کی فتح بختیار خلجی کی شہزوری، بہادری، بلند حوصلگی اور جانفروشی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ بختیار خلجی نے جنوبی بنگال میں ندیا جیسے دُور افتادہ مقام کی بجائے شمال میں واقع لکھنوتی[1] (لکشمناوتی) کو اپنا صدر مقام بنایا۔

۱۲۰۵ء میں بنگال میں حیرت انگیز کامیابی کے بعد بختیار خلجی نے بنگال و آسام کے راستے بھوٹان اور تبت کی فتح کا منصوبہ تیار کیا۔ اگرچہ راستہ بے حد دشوار گذار تھا۔ مگر وہ تیز رَو ندیوں اور دشوار گذار پہاڑی درّوں سے گذرتا ہوا دس ہزار شہسواروں کی معیت میں تبت پر جا حملہ آور ہوا۔ مگر وہاں خلافِ امید بری طرح شکست سے دوچار ہو کر واپس لوٹنے پر مجبور ہوا۔ لیکن واپسی کا مرحلہ

---

[1] گور کا ایک قدیم نام "دہلی ترکش ایمپائر آف دہلی" صفحہ ۱۱۰

Marfat.com

اور بھی پریشان کن ثابت ہوا۔ مقامی لوگوں نے دریا کا پل توڑ دیا تھا اور تبتی سپاہ تعاقب کرتی ہوئی سر پر پہنچ چکی تھی۔ لاچار خلجی سپاہ نے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے جس سے فوج کے بیشتر سپاہی دریا برد ہو گئے۔ اس صدمے سے بختیار کا دل ٹوٹ گیا اور وہ سخت بیمار ہو گیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اگست ۱۲۰۵ء میں دیو کوٹ کے مقام پر اپنے ایک خلجی افسر علی مردان کے ہاتھوں مارا گیا۔

کھوکھروں کی گوشمالی

۱۲۰۵ء

جب برِصغیر پاک و ہند میں قطب الدین ایبک اور بختیار خلجی اپنی حیرت انگیز فتوحات سے ترک سلطنت کو وسعت دینے میں مصروف تھے، سلطان محمد غوری وسطِ ایشیا میں خوارزم شاہ کے خلاف برسرِپیکار تھا۔ ۱۲۰۴ء میں خوارزم شاہیوں نے قراخطائیوں کی مدد سے اندخود کے مقام پر سلطان محمد غوری کو شکست دی۔ سلطان کی ہزیمت کی خبر سے نہ صرف ملک میں شدید افراتفری اور بدنظمی پھیل گئی بلکہ غوری اقتدار کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ غزنی کے گورنر نے اپنی خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے شہر کے دروازے سلطان پر بند کر دیے۔ اور جب یہ خبر برِصغیر میں پہنچی تو پنجاب کے علاقے میں افراتفری پھیل گئی۔ پنجاب کے کھوکھروں نے رائے سال کی سرکردگی میں شورش برپا کر کے صوبجات لاہور و ملتان میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ اور غزنی و برِصغیر پاک و ہند کے درمیان ذرائع آمد و رفت کو مسدود کر دیا۔ مگر محمد غوری نے کمال استقلال، فہم و فراست اور مستعدی سے کام لے کر تمام شورشوں کو کچل کر سلطنت میں امن و امان اور نظم و ضبط کو بحال کیا۔ اور از سرِ نو حکومت کا دبدبہ و وقار قائم کیا۔

۱۲۰۵ کے اختتام پر سلطان محمد غوری کھوکھروں کی گوشمالی کے لیئے غزنی سے ہند کی جانب روانہ ہوا۔ جہلم کے کنارے سلطان کا وفادار جرنیل قطب الدین ایبک بھی اس سے آ ملا اور دونوں نے مل کر باغی کھوکھروں کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کر کے ان کا مکمل استیصال کیا۔ قتل و غارت کے علاوہ کھوکھر اتنی تعداد میں گرفتار ہوئے کہ ایک ایک دینار میں پانچ پانچ کھوکھر فروخت ہوئے بعد ازاں فروری ۱۲۰۶ء میں سلطان نے لاہور پہنچ کر ایک شاندار جشن منعقد کیا، جس میں سلطان نے قطب الدین ایبک کو برِصغیر میں اپنا نائب اور ولی عہدِ سلطنت مقرر کیا۔

محمد غوری کی وفات

۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء

فروری ۱۲۰۶ء میں سلطان محمد غوری لاہور سے غزنی کے لیئے روانہ ہوا۔ وہ جہلم کے نواح میں واقع دھمیک کے مقام پر خیمہ زن تھا کہ بدھ کے روز ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء (مطابق ۳ شعبان ۶۰۲ھ)

لہ گودر کا ایک قدیم نام "ارلی ترکش ایمپائر آف دہلی" صفحہ ۱۱۰

Marfat.com

کو قرامطی فرقہ کے چند فدائیوں نے یا غیر مسلم کھوکھروں نے خیمۂ شاہی میں گھس کر سلطان کو اُس وقت شہید کر دیا جب کہ وہ نمازِ مغرب کی ادائیگی میں مصروف تھا۔ کسی ہمعصر شاعر نے یہ تاریخ وفات تحریر کی:۔

شہادتِ ملکِ بحر و بر معزّ الدّین　　کز ابتدائی جہاں شہ چو اُو نیامد یک
سوم ز عزّہ شعباں بسالِ شش صد دو　　فتاد در راہِ غزنی منزلِ دھمیک

سلطان کی شہادت کی خبر نے کیمپ میں افراتفری مچادی۔ امرا نے سلطان کی نعش کو فوراً اپنی تحویل میں لے لیا۔ غزنی میں لے جاکر پورے شاہی اعزاز سے تکفین و تدفین کی۔

سیرت و کردار

سلطان محمد غوری کو بجا طور پر برّصغیر پاک و ہند میں ترک سلطنت کا اصل بانی کہا جاتا ہے۔ اُس نے اپنی حیرت انگیز فتوحات سے نہ صرف راجپوتوں کی سیاسی قوت کو کچلا، بلکہ ان کی سطوتِ پارینہ کے کھنڈرات پر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ وہ بلاشبہ ایک زیرک سیاست دان، تنُدرَو فاتح، مہم جو جرنیل اور اعلیٰ معمارِ سلطنت تھا۔ اس نے ایک ایسی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جو پاک و ہند میں کم و بیش چھ سو سال تک قائم رہی

بحیثیتِ انسان محمد غوری بلند اخلاق و کردار کا مجسمہ تھا۔ وہ بیک وقت انصاف پسند، رعایا پرور اور ایک وفا شعار انسان تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے بڑے بھائی غیاث الدین سام کا احترام کیا اور زندگی بھر اُس کی وفاداری اور اطاعت گذاری کا دم بھرتا رہا۔ برّصغیر کی مہمات سے حاصل شدہ مالِ غنیمت کا ایک حصّہ باقاعدہ اپنے بھائی غیاث الدین کو فیروزکوہ بھیجتا رہا۔ اگرچہ اپنے بھائی کی وفات کے بعد وہ امارتِ غزنہ کا خود مختار حکمران بن گیا، مگر اپنے بھائی کی اولاد پر ہمیشہ مہربان رہا۔ اس کی زندگی مجاہدانہ تھی۔ وہ غازی کی زندگی جیا اور شہید کی موت مرا۔ ہمعصر اور زمانۂ حال کے تمام مؤرخین اس کی عدل گستری، رعایا پروری، علم نوازی اور خدا ترسی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ وہ پرلے درجے کا فیاض اور خدا ترس واقع ہوا تھا، غلاموں پر اس کی شفقت اور خدا ترسی ضرب المثل ہے۔ اس نے متعدد غلاموں کو علومِ مروّجہ اور فنونِ حرب کی تعلیم دے کر ذمہ دار سول اور فوجی عہدوں پر فائز کیا۔ ان غلاموں میں قطب الدین ایبک، ناصر الدین قباچہ اور تاج الدین یلدوز جیسے مقتدر سپاہستان اور اعلیٰ عسکری ذہانت کے جرنیل تھے۔ سلطان اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔

"ایک دفعہ ایک امیر نے اُسے کہا کہ کاش اللہ تعالیٰ آپ کو اولادِ نرینہ سے نوازتا۔ اس پر سلطان نے نہایت بے پروائی سے اپنے غلاموں کی طرف اشارہ

Marfat.com

کرتے ہوئے جواب دیا کہ دوسرے بادشاہوں کے ایک یا دو بیٹے ہوں گے، لیکن خدائے بزرگ و برتر نے مجھے بیسیوں فرزند عطا کئے ہیں یعنی ترکی غلام، جو میرے بعد میری سلطنت کے وارث ہوں گے اور سلطنت کے طول و عرض میں میرا نام خطبہ میں محفوظ رکھیں گے"[1]

محمد غوری ایک مستقل مزاج جرنیل اور آہنی عزم کا مالک تھا۔ وہ کسی ناکامی اور شکست کو آخری منزل قرار دے کر عمل سے دست بردار نہ ہوتا تھا۔ وہ زندگی کی جولانگاہ میں شکست و کم ہمتی کا سرے سے قائل نہ تھا۔ ہر ناکامی اس کے راہوار عمل کے لیے مہمیز کا کام دیتی تھی۔ وہ مہم جوئی کا دلدادہ اور شجاعت و جوانمردی کا پتلا تھا۔ ترائن کی پہلی لڑائی میں ہزیمت اٹھا کر بھی اس کے عزم و استقلال اور ہمت میں سرمو فرق نہیں آیا بلکہ اگلے سال ہی اس نے اپنی خداداد جرأت و پامردی سے کام لے کر ترائن کے اسی میدان میں اجپوتوں کے عسکری جاہ و جبروت کو کچل کر رکھ دیا۔ جس کا ثبوت اس کی وہ اعلیٰ عسکری ذہانت اور جنگی تدبر ہے جس کا اس نے ترائن کی دوسری جنگ میں بہترین طریق سے مظاہرہ کیا اور اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتور دشمن کو مات دے کر اپنے اعلیٰ جرنیل ہونے کا ثبوت دیا۔

وہ پیدائشی طور پر عسکری اور قائدانہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ سپاہیوں کو اس کی ذات پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اس کی قیادت پر فخر محسوس کرتے تھے۔ محمد غوری روادارانہ حکمتِ عملی کا حامی اور مذہبی تعصب سے بالاتر تھا۔ اگرچہ اس نے متعدد بار ہندوؤں کے خلاف جنگیں لڑیں مگر اس نے ہمیشہ ان سے بہتر سلوک روا رکھا۔ کئی ایک ہندو راجاؤں نے ہندی مہمات میں اس کا ساتھ دیا۔ شکست خوردہ ہندو راجگان کے خاندانوں سے محمد غوری نے ہمیشہ مشفقانہ سلوک کیا۔ پرتھوی راج کے لڑکے کو باجگذار رہنے کے وعدے پر اجمیر کا حاکم مقرر کیا۔ اسی طرح دہلی کی حاکمیت پر کھنڈے راؤ کے ایک رشتہ دار کو متعین کیا۔

محمود غزنوی اور محمد غوری کا موازنہ

محمود غزنوی اور محمد غوری دونوں کا تاریخ اسلام کے عظیم ترین فاتحین میں شمار ہوتا ہے۔ دونوں کی مہمات برِصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی فتح و نصرت، اسلام کی ترقی اور راجپوت سرداروں کی شکست و ناکامی کی روئیداد ہیں۔ دونوں نے برصغیر کی عسکری کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، برِصغیر میں اپنی حیرت انگیز فتوحات سے اسلام کی ترقی کے لیے راستہ ہموار کیا۔ تاہم کردار کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق تھا۔

سلطان محمود غزنوی، محمد غوری سے اعلیٰ تر جرنیل اور ایک عظیم فاتح تھا بحیثیتِ سپہ سالار

[1] 'طبقاتِ ناصری'۔ صفحہ ۱۳۲

Marfat.com

واقعی محمود کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کی تمام جنگی مہمات فنِ سپہ گری اور اس کی اعلیٰ عسکری صفات کا نادر نمونہ تھیں۔ اُسے میدانِ کارزار میں کبھی شکست و ہزیمت کا سامنا نہیں ہوا۔ اس کی مہمّ سومنات تاریخ میں ایک مثالی مقام کی مستحق ہے۔ اس کی برق رفتاری اور چابکدستی نے دشمنوں کو ششدر و متحیّر کر کے رکھ دیا۔

محمد غوری کا مقام اس معاملے میں محمود سے بہت کم ہے۔ بحیثیتِ جرنیل وہ سلطان محمود کا ہم پلّہ نہ تھا۔ اُسے برّصغیر میں ترائن اور گجرات کے مقامات پر دو دفعہ شکست ہوئی۔ مگر وہ سیاسی تدبّر اور فہم و فراست کے اعتبار سے محمود سے کہیں بلند تھا۔ شکست و ناکامی کے اوقات میں بھی وہ مایوس نہ ہوتا تھا۔ وہ عزم و استقلال کا پتلا تھا۔ اس کے عسکری اور فاتحانہ کارناموں میں خیرہ کر دینے والی آب و تاب تو نہ تھی، مگر اپنے مقاصد کے لیے وہ ہمیشہ بکمال عزم و استقلال سرگرمِ عمل رہا۔ وہ ہمیشہ جوش و خروش کے ساتھ دشمن کے مقابلے میں نکلتا اور کامیابی سے ہمکنار ہوتا تھا۔

برّصغیر پر محمود کے مسلسل حملوں کا مقصد حصولِ سلطنت نہ تھا بلکہ اس کے پیشِ نظر شہرت و ناموری اور دولت و ثروت کا حصول تھا۔ جس سے اس نے غزنی کی زیبائش و خوبصورتی کو دوبالا کیا اور اسے عروس البلاد بنا دیا، شعراء اور علماء کی سرپرستی کی۔ محمود کے نزدیک جنگ ایک آرٹ تھی، جس سے اُسے شہرت کے علاوہ علوم و فنون اور ارباب کمال ارباب علم و ادب کی سرپرستی کے لیے مال و زر حاصل ہوتا تھا۔ اس نے اکنافِ عالم سے اہل علم کو اپنے دربار میں جمع کیا۔ اس کے لمحاتِ فرصت ان اربابِ علم و فضل کی معیت میں گذرتے تھے۔ غزنی اُس کے دور میں علوم و فنون کا مرکز بن گیا تھا۔

محمد غوری اس لحاظ سے محمود پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس کے دماغ میں برّصغیر میں مستقل حکومت کا قیام تھا۔ چنانچہ اُس نے برّصغیر کے سیاسی انتشار سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور متعدد علاقوں کو مسخّر کر کے انہیں اپنی مملکت میں شامل کیا اور وہاں نظم و ضبط قائم کر کے اپنی سلطنت کو مستحکم کیا۔ اس طرح شمالی ہند میں اسلامی حکومت کی بنیاد پڑی جو صدیوں تک داخلی شورشوں اور خارجی حملوں کے باوجود زوال پذیر نہ ہو سکی۔ وہ ایک تعمیری اور نتیجہ خیز کام کرنے والا سیاست دان تھا۔ البتہ محمد غوری نے علماء و فضلاء کی سرپرستی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے عہد کا غزنی علمی اعتبار سے ایک بیابان دکھائی دیتا ہے۔

مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب

طلباء تاریخ کے لیئے ان اسباب و وجوہ کو جاننا ضروری ہے جو گیارھویں صدی کے رُبعِ اوّل میں محمود غزنوی کے ہاتھوں اور بارھویں صدی کے ربعِ آخر میں محمد غوری کے ہاتھوں ہندوؤں

Marfat.com

(جن کی غالب عسکری طاقت راجپوتوں پر مشتمل تھی) کی شکست کا باعث بنے۔ جب کہ ہندو راجپوت بہت بہادر اور جنگجو تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا معرکہ ہوگا جس میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو افواج کی زیادہ تعداد نہ ہوتی ہو۔ ہندو حکومتوں کے جنگی وسائل بھی مسلم حکومتوں کی بہ نسبت لامحدود تھے۔ اور بسا اوقات انہوں نے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ بھی قائم کیا۔ اس کے باوجود انہیں ہمیشہ ہزیمت و یاس کا سامنا کرنا پڑا۔ پروفیسر حبیب کے قول کے مطابق "ہندوؤں کی شکست ایک معمہ ہے۔" لیکن انگریز مورخین الفنسٹن، سٹینلے لین پول اور وی۔ اے سمتھ کا بیان ہے، کہ ہندوؤں کی شکست کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ بہتر سپاہی نہیں تھے۔ جب کہ ترک سرد علاقے سے تعلق رکھنے، گوشت کھانے اور فنونِ حرب کے ماہر ہونے کی بنا پر بہتر سپاہی تھے۔ تاہم اس کے علاوہ بھی ہندوؤں کی شکست کی متعدد وجوہ تھیں جو درج ذیل ہیں:۔

۱:۔ مذہبی اسباب

مسلم افواج ہندوؤں کے خلاف جنگوں کو جہادِ فی سبیل اللہ سمجھتی تھیں۔ مسلمان سپاہی قدرتی طور پر جذبۂ جہاد سے سرشار ہوتے تھے۔ اسی لیئے وہ ہمیشہ مذہبی جوش کے تحت اور شوقِ شہادت میں حیات و موت سے بے نیاز ہو کر لڑتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ جنگ میں کام آئے تو شہادت کا درجہ پائیں گے۔ اور زندہ رہے تو غازی کہلائیں گے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ تصور اور جذبہ مفقود تھا اور وہ مادہ پرست ہونے کے باعث روحانی جذبہ و تصورات سے نا آشنا اور محروم تھے۔ نیز وہ محض اپنے نام و نمود کے لیئے اور ملکی تحفظ کے لیئے صرف مدافعتی جنگ لڑتے تھے۔ ہندوؤں کی اکثریت بدھ مت اور جدید ہندو مت کی بدولت اہنسا کے اصول کی قائل تھی۔ اور جنگ و جدل کے خلاف تھی۔ نیز ہندو سوسائٹی توہمات پرستی کا بھی شکار تھی۔ وہ اس وہم اور غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ مسلمان برصغیر پر کسی طرح بھی غالب نہیں آسکتے۔ اس لیئے ان سے قرار واقعی جنگ کرنا فضول ہے۔ جب کہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ خدا پرست ہیں اور راہِ خدا میں لڑ رہے ہیں۔ اس لیئے وہ کامیابی سے ضرور ہمکنار ہوں گے۔

۲: سیاسی اسباب

ہندوؤں کی شکست کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی آمد پر برصغیر پاک و ہند سیاسی انتشار اور لامرکزیت کا شکار تھا۔ شمالی برصغیر چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں منقسم تھا۔ جن کے سربراہ حصولِ اقتدار کی خاطر باہمی آویزشوں اور عداوتوں میں الجھے ہوئے تھے۔ اور بالعموم ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتے تھے بالفاظِ دیگر ہندو راجگان میں استحادِ دیامی اور اشتراک عمل کی روح یکسر مفقود تھی۔

Marfat.com

راجپوت سلطنتیں باہمی خانہ جنگی اور رقابتوں کی بنا پر کمزور و ناتواں ہو چکی تھیں۔ راجپوت احساسِ برتری کی وجہ سے کسی دوسرے قبیلے کے جرنیل کے زیرِ کمان لڑنا، راجپوتی آن کے خلاف اور اپنی بے عزتی سمجھتے تھے۔ اس خود پسندی کے باعث ہی اُن میں اتحاد و یگانگت کا فقدان تھا۔ چنانچہ اُن کے باہمی نفاق اور ملک کے سیاسی انتشار سے مسلمانوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

۳: نظریاتی اور تمدنی اسباب

ہندو سوسائٹی ذات پات کی تقسیم کا شکار تھی جس کی بدولت حبّ الوطنی اور ملکی دماغ کا جذبہ بالکل ناپید ہو چکا تھا۔ اس عقیدے نے عوام کے ذہنوں میں گھر کر لیا تھا کہ ملکی سالمیت کا تحفظ اور دشمنوں سے لڑنا صرف کھشتریوں کا کام ہے۔ باقی طبقوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اس غلط اور خود غرضانہ نظریہ کی وجہ سے ہندوؤں کی فوجی طاقت صرف ایک طبقہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اس کے برعکس مسلمانوں میں ذات پات کی کوئی تمیز نہ تھی۔ مذہبی لحاظ سے مسلمان رواداری کے قائل اور اپنی رعایا کے افراد کو مساوی حقوق عطا کرنے کے خوگر تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ نظم و ضبط اور اتحاد و تعاون کے مجسمّے تھے، اور اپنے سپہ سالار خواہ وہ غلام ہی کیوں نہ ہو، کے وفادار اور فرماں بردار ہوتے تھے۔

مسلمان حملہ آور سرد علاقوں کے رہنے والے اور پہاڑی علاقوں کی زندگی کے خوگر ہونے کی وجہ سے جفاکش اور تنومند ہوتے تھے۔ اس لیئے وہ ہندوؤں کے مقابلے میں جسمانی طور پر زیادہ مضبوط اور چابکدست تھے۔ چنانچہ تُند روی اور گرمجوشی سے لڑتے اور فتح و نصرت سے ہمکنار ہوتے تھے۔

۴: فوجی اسباب

مسلمانوں کی آمد پر برِصغیر میں جاگیر داری نظام رائج تھا۔ چھوٹے چھوٹے نیم خود مختار امراء و رؤسا مقررّہ تعداد میں کچھ سپاہ رکھنے کے پابند تھے۔ جنگ کے وقت انہی کی بھیجی ہوئی افواج راجہ کی زیرِ کمان لڑتی تھیں۔ لیکن اس سپاہ میں یک جہتی، نظم و ضبط اور عسکری مہارت اور جنگی چالوں میں ہم آہنگی کا فقدان ہوتا تھا۔ یہ فوج راجہ کی بہ نسبت اپنے امراء اور جاگیرداروں کی زیادہ خیر خواہ اور وفادار ہوتی تھی۔

ہندوؤں کا طریق جنگ صرف تلوار سے لڑنا تھا۔ جو زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا تھا۔ مگر اس کے برعکس مسلمان وسط ایشیا میں متعدّد لڑائیاں لڑنے کی وجہ سے نہ صرف نئی نئی جنگی چالوں اور جدید اسلحہ کے استعمال سے پوری طرح واقف تھے، بلکہ برق رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر انتہائی تندی و تیزی سے دشمن پر حملہ آور ہوتے، جب کہ ہندو زیادہ تر جنگی ہاتھیوں پر انحصار

Marfat.com

کہتے تھے۔ یہ ہاتھی یوں تو بڑے مفید تھے۔ کیونکہ مسلمان ان کے سامنے بے بس ہو جاتے تھے۔ لیکن شور و غل اور آتشبازی سے ڈر کر یہ ہاتھی بدک اٹھتے اور اپنی ہی فوج کو روندتے ہوئے میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوتے تھے جس سے بھگدڑ مچ جاتی اور ہندوؤں کو ہزیمت اٹھانی پڑتی تھی۔

ہندو اس اعتبار سے بدقسمت واقع ہوئے تھے کہ ان میں محمود غزنوی اور محمد غوری کی سی جنگی مہارت و ذہانت کا مالک اور عزم و استقلال رکھنے والا کوئی سپہ سالار پیدا نہ ہو سکا تھا۔ ہندو راجے عسکری چالوں سے تو نابلد تھے ہی، وہ فنونِ حرب سے بھی عاری تھے۔ ہندو راجگان اپنے روایتی طریق جنگ کے مطابق اپنی فوج کو تین حصوں یعنی میمنہ، میسرہ اور مرکز میں منقسم کر کے یکدم اور اجتماعی طور پر سامنے کی جانب سے دشمن پر حملہ آور ہوتے۔ لیکن اس کے برعکس مسلمان حملہ آور اپنی فوج کو ہمیشہ پانچ حصوں رہ اول۔ میمنہ۔ میسرہ۔ مرکز اور محفوظ دستوں میں تقسیم کرتے اور لڑائی سے قبل ہمیشہ ہراول دستہ دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لیئے بھیجتے۔ اور پھر میمنہ۔ میسرہ اور مرکزی دستوں سے دشمن پر حملہ آور ہوتے۔ اور جب دشمن افواج کو بے بس اور تھکا ہوا پاتے، تو محفوظ دستے کو انتہائی تندی کے ساتھ حریف پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا جاتا۔ اس سے ہندو سپاہ بوکھلا کر رہ جاتی اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہتا۔ علاوہ ازیں ترک حملہ آور ہندو سپاہ کی سپلائی لائن کو بھی منقطع کرنے کی کوشش کرتے۔

ہندو راجے ملک کی سالمیت اور تحفظ کے لیے نہ تو فلاحی قلعہ بندیاں نہ کرتے تھے۔ چنانچہ بیرونی حملہ آور بلا روک ٹوک ملک میں پہنچ جاتے تھے۔ اور ہندوؤں کو ان کی آمد کا بالعموم اس وقت پتہ چلتا جب وہ سر پر آ جاتے تھے۔ علاوہ ازیں مسلم حملہ آوروں نے اپنی بہادری اور سپہ گری کی ایسی دھاک بٹھا رکھی تھی کہ ہندو راجے ان کے نام سے لرزتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ بغیر کسی مزاحمت اور جنگ کے بغیر ہی مسلم حملہ آوروں کی اطاعت قبول کر لیتے تھے۔

۵: محمد غوری کا ذاتی کردار

ہندوؤں کی مسلسل شکست اور مسلمانوں کی متواتر کامیابی و کامرانی میں محمد غوری کے کردار کو بہت دخل تھا۔ وہ بے حد مستقل مزاج، استقلال کا پتلا اور ایک مدبر سیاست دان تھا۔ شکست سے دوچار ہونے کے باوجود پست ہمت نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ناکامیوں کے بعد بھی اپنی پوری کوشش جدوجہد کو مسلسل جاری رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ فتح و نصرت اس کے قدم چومتی تھی۔ وہ مفتوحہ علاقوں میں نظم و نسق قائم کرنے اور امن بھی بحال کرتا تھا۔ نتیجتہً غیر مسلم رعایا اس کی گرویدہ ہو جاتی تھی

Marfat.com

اہم تاریخیں

۱۱۷۵ء — محمد غوری کا ملتان اور اُچ کو تسخیر کرنا۔

۱۱۷۸ء — محمد غوری کے ہاتھوں شمالی سندھ کی فتح اور گجرات کے مقام پر شکست کا سامنا۔

۱۱۸۶ء — سلطان محمد غوری کا لاہور کو فتح کرنا اور یمینی خاندان کا خاتمہ۔

۱۱۹۱ء — ترائن کی پہلی لڑائی۔

۱۱۹۲ء — ترائن کی دوسری لڑائی اور پرتھوی راج چوہان کی ہلاکت۔

۱۱۹۳ء — قطب الدین ایبک کا دہلی پر قبضہ کرنا۔

۱۱۹۴ء — چندواڑہ کی لڑائی اور جے چند والیٔ قنوج کی ہلاکت۔

۱۲۰۶ء — دھمیک کے مقام پر سلطان محمد غوری کی وفات

امتحانی سوالات

۱۔ غوری یا شنسبانی خاندان کی ابتدائی تاریخ پر روشنی ڈالیئے۔

۲۔ برصغیر پاک و ہند میں شہاب الدین محمد غوری کی مہمات کا مختصراً حال اور راجپوت حکمرانوں کے مقابلے میں اس کی کامیابی کے اسباب قلمبند کیجیے۔

۳۔ شہاب الدین محمد غوری کے کردار پر روشنی ڈالیئے نیز بتایئے کہ تاریخ پاک و ہند میں اُسے کیا مقام حاصل ہے۔

۴۔ بحیثیت فاتح اور معمارِ سلطنت محمد غوری اور محمود غزنوی کا موازنہ کیجیے۔

۵۔ "مسلمانوں کے ہاتھوں ہندوؤں کی شکست ایک معمہ ہے" اس مقولہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی ناکامی کے اسباب بیان کیجیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیے:

ا۔ علاؤالدین جہاں سوز

ب۔ ترائن کی دوسری لڑائی (۱۱۹۲ء)

ج۔ اختیارالدین محمد بن بختیار خلجی

Marfat.com

چھٹا باب

خاندانِ غلاماں

(۱۲۰۶ء تا ۱۲۹۰ء)

شہاب الدین محمد غوری لاولد فوت ہوا۔ چنانچہ امارتِ غزنی سلطان محمد غوری کے بھتیجے محمود بن غیاث الدین کے قبضے میں آئی۔ قطب الدین ایبک نے جو پہلے ہی سلطان محمد غوری کی طرف سے برصغیر پاک و ہند میں ولی عہدِ سلطنت متعین ہو چکا تھا، سریر آرائے سلطنت ہو کر ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈالی، جو خاندانِ غلاماں کے نام سے مشہور ہوا۔

سلطان محمود غوری بن سلطان غیاث الدین نے باقاعدہ طور پر قطب الدین ایبک کی تخت نشینی کو تسلیم کر لیا۔ اور اُسے علاماتِ شاہی یعنی چتر[1] اور دو باش بھیجنے کے علاوہ سلطان کا خطاب بھی عطا کیا۔ قطب الدین ایبک کے عہدِ حکومت میں برصغیر ایک خود مختار اسلامی ریاست بن گیا، جس کا دار السلطنت دہلی تھا۔ اس اعتبار سے قطب الدین ایبک برصغیر پاک و ہند کا پہلا مسلمان فرمانروا سمجھا جاتا ہے۔

سلطان قطب الدین ایبک، سلطان محمود غوری کا غلام رہ چکا تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا آرام شاہ تخت نشین ہوا۔ اس طرح وہ غلام ابن غلام تھا۔ آرام شاہ کے بعد ایلتتمش تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔ وہ قطب الدین ایبک کا غلام تھا۔ ایلتتمش کی وفات کے بعد اس کی لڑکی رضیہ سلطانہ اور چار بیٹے یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ آخری بیٹے ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد غیاث الدین بلبن نے برسرِ اقتدار آ کر تاجِ شاہی سر پر رکھا۔ بلبن ایلتتمش کا غلام تھا۔ بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد سریر آرائے سلطنت ہوا۔ وہ بھی غلام ابن غلام تھا۔ اس طرح یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس خاندان کے تمام بادشاہ یا خود غلام رہ چکے تھے یا غلاموں کی اولاد تھے۔ اسی بنا پر اس کو خاندانِ غلاماں کہا جاتا ہے، جو ۱۲۰۶ء سے ۱۲۹۰ء تک برسرِ اقتدار رہا۔ اس خاندان کے تمام فرمانروا سلطان کہلاتے تھے۔ مگر یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یہ غلام عالی نسب

---

[1] ایک قسم کا دو شاخہ نیزہ جسے جلوس شاہی کے آگے سے عوام کو ہٹاتے کے لیئے استعمال کیا جاتا تھا۔

Marfat.com

ترک خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ جن کو نامساعد حالات کی بناء پر آزادی سے محروم کر کے غلام بنا کر بیچ دیا گیا تھا۔ ان میں سے بعض نے مناسب موقع ملنے پر اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر اپنی اعلیٰ ذہنی استعداد اور جسمانی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے معاشرہ میں بلند مقام حاصل کیا۔ بعض نے اپنے آقاؤں کا قرب حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم اور فنون حربیہ کی تربیت پائی اور سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ اسی طرح بعض آقاؤں نے بھی اپنے غلاموں کو اولاد کی طرح اپنے سایہ عاطفت میں رکھا، اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا اور بسا اوقات خوش ہو کر انہیں اپنی فرزندی (دامادی) میں بھی لے لیا۔ مسلمان فرمانرواؤں کا اپنے غلاموں سے یہ مشفقانہ سلوک درحقیقت مسلم معاشرہ کا طرۂ امتیاز ہے جو ہر فرد کو خواہ وہ غلام ہی کیوں نہ ہو، ترقی کے مساوی موقع فراہم کرتا ہے۔

سُلطان قطب الدین ایبک

(۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء)

"قطب الدین ایبک محض اپنی قابلیت کی بنا پر غلام سے سلطان کے درجے پر پہنچا اور ہندوستان میں ایک مستقل اسلامی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ وہ مذہبی معاملات میں رواداری کا قائل تھا، اور ہندو رعایا کے ساتھ نیک سلوک روا رکھتا تھا۔ وہ اپنی سخاوت اور فیاضی کی وجہ سے 'لکھ بخش' کے نام سے مشہور تھا۔"[1]

(تاج الدین حسن بن نظامی)

ابتدائی حالات

برصغیر پاک و ہند کا پہلا مسلم فرمانروا قطب الدین ایبک[2] ترکی الاصل تھا۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ حاکم نیشاپور قاضی فخر الدین عبدالعزیز کوفی نے اُسے بطور غلام خریدا۔ قاضی فخر الدین نے قطب الدین کو اولاد کی طرح پالا پوسا اور پروان

---

[1] "تاج المآثر"

[2] طبقات ناصری کا مصنف منہاج سراج لکھتا ہے کہ قطب الدین کا پورا نام قطب الدین ایبک شل ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۳ پر)

Marfat.com

چڑھایا۔ قاضی فخرالدین کے ہاں قطب الدین نے قرآن پاک حفظ کیا اور علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ نیز شاہسواری اور تیر اندازی کی تربیت حاصل کی، قاضی موصوف کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں نے قطب الدین کو فروخت کر دیا۔ چنانچہ وہ غزنی میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھ فروخت ہوا۔

محمد غوری کی اولاد نرینہ نہ تھی۔ وہ اپنے ترکی غلاموں کو اولاد کی طرح پالتا اور انہیں تعلیم و تربیت اور فنون حرب سے بہرہ ور کرتا تھا۔ ان میں جو صاحب کمال نظر آتا، اُسے نہ صرف انعام و اکرام سے نوازتا بلکہ اہم منصب پر فائز بھی کر دیتا تھا۔ قطب الدین ایبک جلد ہی اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک مرتبہ کیف و نشاط کی ایک محفل میں سلطان نے خوش ہو کر اُسے بیش بہا انعام سے نوازا۔ ایبک نے وہ انعام اپنے ہم وطن ترکی غلاموں میں تقسیم کر دیا۔ اس کی اس فیاض دلی سے سلطان اس قدر خوش ہوا، کہ اُسے میر آخور یعنی شاہی اصطبل کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا۔

دائی خراسان کے مقابلے میں قطب الدین ایبک نے بہادری اور دلیری کے وہ جوہر دکھائے کہ سلطان اس کی شجاعت سے بے حد متاثر ہوا۔ برصغیر کی مہمات میں بھی قطب الدین ایبک نے اپنی عسکری صلاحیتوں سے سلطان محمد غوری کو متاثر کیا۔ چنانچہ ترائن کی دوسری لڑائی میں پرتھوی راج چوہان (رائے پتھورا) کے خاتمے کے بعد سلطان نے اسے اپنا نائب السلطنت مقرر کر کے برصغیر میں مزید فتوحات پر مامور کیا اور خود غزنی واپس چلا گیا۔ ایبک نے کہرام کو اپنا عسکری مستقر بنایا اور مفتوحہ علاقوں کے نظم و نسق کی درستی کے علاوہ مزید فتوحات کے لیئے جدوجہد کو بھی جاری رکھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲ کا)

ایبک ترکی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی 'انگلی' ہے۔ اور شل کے معنی ناکارہ یا مفلوج کے ہیں۔ چونکہ قطب الدین کی ایک انگلی ناکارہ تھی۔ اس لیئے وہ قطب الدین ایبک شل کہلایا۔ لیکن بعد میں قطب الدین ایبک کے نام سے مشہور ہو گیا۔ بعض محققین کا بیان ہے کہ ایبک 'ای' اور 'بک' کا مرکب ہے۔ 'ای' کے معنی چاند اور 'بک' کے معنی سردار ہے۔ یعنی چاند سا سردار۔ چونکہ ایبک بہت خوش شکل اور دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ اس لیئے لوگوں نے اُسے ایبک کہنا شروع کر دیا۔ عہد حاضرہ کے مورخین کا خیال ہے کہ ترکوں کے ہاں ایبک پیار کا لفظ تھا جو چاند کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ ترک عموماً خوبصورت انسان کو 'ایبک' کہتے تھے۔

Marfat.com

فتوحات قطب الدین ایبک نے اپنے آقا محمد غوری کے نائب السلطنت کی حیثیت سے ۱۱۹۲ء میں نہ صرف ہانسی کی بغاوت کو کچلا اور میرٹھ و بلند شہر پر قبضہ کر کے ترک اقتدار کو مزید مستحکم کیا، بلکہ دہلی کے باجگذار راجہ کی سرکشی کی اطلاع پا کر اسے شکست فاش دی اور دہلی پر قبضہ کر کے اُسے غوری مقبوضات کا دارالحکومت بنایا۔

۱۱۹۴ء میں ایبک نے کوئل (علی گڑھ) کو فتح کر کے ڈور راجپوتوں کی بغاوت کو فرو کیا۔ اُسی سال محمد غوری برصغیر میں وارد ہوا۔ اور ایبک نے اس کی ہمرکابی میں چندواڑہ کے مقام پر والئی قنوج راجہ جے چند کو شکست دے کر قنوج اور بنارس پر قبضہ کر لیا۔

۱۱۹۴ء میں ہی قطب الدین ایبک نے پرتھوی راج کے بھائی ہری راج کے دوبارہ علم بغاوت بلند کرنے پر اس کی سرکوبی کی۔ راجہ نے اپنے آپ کو نذرِ آتش کر کے ہلاک کر لیا۔

۱۱۹۷ء میں اجمیر میں پرتھوی راج کے بیٹے نے گجرات کے راجہ کی شہ پر بغاوت برپا کر دی۔ ایبک نے بغاوت کو فرو کر کے اجمیر پر مسلمان حاکم کو متعین کیا اور پرتھوی راج کے لڑکے کو رنتھمبور کا قلعہ دار مقرر کر دیا۔ بعد ازاں ۱۱۹۷ء میں اس نے گجرات، کاٹھیاواڑ کے راجہ بھیم دیو کو شکست دے کر انہلواڑہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ انہی ایام میں اس نے تھنکر، گوالیار اور بدایوں جیسے اہم مراکز پر قبضہ کر کے غوری اقتدار کو مزید وسعت و تقویت دی۔ ۱۲۰۲ء میں اس نے کالنجر پر قبضہ کر کے پورے شمالی ہند کے فاتح کی حیثیت اختیار کی۔ اس جنگ میں اس کا غلام شمس الدین ایلتتمش بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ان فتوحات کے علاوہ قطب الدین کے بہادر جرنیل بختیار خلجی نے حیرت انگیز فتوحات حاصل کر کے سارے بنگال اور بہار پر قبضہ کر کے تمام شمالی ہند کی تسخیر کو مکمل کر دیا۔

تخت نشینی ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو سلطان محمد غوری کی شہادت کے بعد قطب الدین ایبک سخت پریشان ہوا۔ چنانچہ اپنے آقا کی سلطنت کے تحفظ اور عوام کے امن و امان کی خاطر وہ لاہور واپس روانہ ہوا۔ ایبک ۲۵ جون ۱۲۰۶ء کو لاہور پہنچا جہاں اہالیانِ شہر نے اس کا شاہانہ استقبال کیا۔ ۲۶ جون ۱۲۰۶ء کو لاہور کے قصرِ ہمایوں میں شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ اس کی تاجپوشی کی تقریب منائی گئی اور امراء دولت نے اس کی بادشاہت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے حضور نذرانے اور تحائف پیش کئے۔ اس طرح ایبک برِصغیر پاک و ہند کا پہلا مسلم فرمانروا بنا۔ جشنِ تاجپوشی سے فارغ ہوتے ہی ایبک دہلی روانہ ہو گیا۔ اس وقت فیروز کوہ کی مسندِ امارت پر سلطان غیاث الدین غوری کا فرزند سلطان محمود غوری متمکن تھا۔ غزنی میں سلطان محمد غوری کا غلام تاج الدین یلدوز گورنر تھا۔ اور سندھ کی گورنری پر

Marfat.com

ناصرالدین قباچہ متبنیٰ تھا۔ یلدوز اپنے آپ کو سلطان محمد غوری کا اصل جانشین تصور کرتا تھا۔ اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے تخت غزنی پر قبضہ کر لیا۔ اس کی یہ بھی خواہش تھی، کہ قطب الدین ایبک بھی اس کی سیادت کو قبول کرے، لیکن قطب الدین ایبک کے اعلانِ خود مختاری پر وہ مشتعل ہو گیا۔ لہذا اُس نے پنجاب پر قبضہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

تاج الدین یلدوز نے فوج کشی کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اس پر قطب الدین ایبک ایک لشکرِ جرار کی معیت میں دہلی سے لاہور کی طرف بڑھا۔ شہر لاہور کے نواح میں ایبک اور یلدوز کی فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ جس میں یلدوز کو شکست ہوئی اور وہ غزنی کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ ایبک نے اس کا تعاقب کر کے غزنی پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن وہ غزنی میں جشنِ فتح کی خوشیوں میں اس قدر کھو گیا کہ یلدوز نے اچانک حملہ آور ہو کر اُسے غزنی سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

قطب الدین ایبک ۱۲۰۸ء تک خود کو ملک کہلاتا رہا۔ اس نے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ بھی جاری نہ کیا شاید وہ اپنے آپ کو اب بھی غلام تصور کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۲۰۸ء میں سلطان محمد غوری کے جانشین غیاث الدین نے اسے آزاد کرتے ہوئے نہ صرف اس کی تخت نشینی کو تسلیم کر لیا بلکہ شاہی علامات چتر اور دو ماہی بھیجے اور سلطان کا خطاب عطا کیا۔ اس طرح قطب الدین اور اس کے تمام جانشین کے تمام حکمران سلطان کہلائے گئے۔

قطب الدین کی خارجہ پالیسی

ایبک کا تمام عہد حکومت متعدد خارجی مسائل سے نمٹنے میں گذرا اولاً اسے اپنی شمال مغربی سرحد کے تحفظ کے لیئے اپنے سب سے بڑے دشمن حاکم غزنی تاج الدین یلدوز کا سدباب کرنا تھا۔ ثانیاً ناصرالدین قباچہ گورنر سندھ و ملتان کو اطاعت گذار بنانا تھا۔ ثالثاً ہندو سرداروں کو بھی باجگذار بنانا مقصود تھا۔ جو محمد غوری کی وفات کے بعد اپنے علاقوں کی بازیابی کے لیئے دوبارہ پر پرزے نکال رہے تھے۔ نیز بختیار خلجی کی وفات کے بعد بہار اور بنگال کا علاقہ انقلابی دور سے گذر رہا تھا۔ جہاں علی مردان نے خود مختاری اختیار کر لی تھی۔ رابعاً دہلی کی نوزائیدہ ترک حکومت کو سب سے بڑا خطرہ وسطِ ایشیا کی طرف سے تھا۔ جہاں کا حاکم خوارزم شاہ غزنی اور سلطنتِ دہلی کو ہڑپ کرنے کی فکر میں تھا۔ ان تمام خارجی مسائل کے پیشِ نظر قطب الدین ایبک نے دہلی کی بجائے لاہور کو اپنی سلطنت کا دارالحکومت قرار دیا اور اپنی وفات تک یہیں مقیم رہا۔

اگرچہ قطب الدین ایبک نے تاج الدین یلدوز کو شکست دے کر پنجاب سے نکال باہر کیا تھا۔ مگر وہ اب بھی سلطنتِ دہلی کے لیئے ہمہ وقت خطرہ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ قطب الدین ایبک

Marfat.com

نے اس سے خوشگوار تعلقات استوار کرنے کے لیئے اس کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس طرح دونوں حکمران یگانگت اور اتحاد باہمی کے رشتہ میں منسلک ہو گئے اور ملکی سرحدوں کا بھی تعین ہو گیا۔

سلطان قطب الدین ایبک نے فہم و فراست اور سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے دوسرے طاقتور اور ذی اثر امراء سے رشتے ناطے قائم کر کے انہیں اپنا ممد و معاون بنا لیا اور اپنے سیاسی اقتدار کو مزید مستحکم کر لیا۔ اس نے اپنی ایک بیٹی کی شادی ناصر الدین قباچہ حاکم ملتان و سندھ سے کر دی اور دوسری بیٹی کو اپنے غلام شمس الدین التمش سے بیاہ دیا۔ جو ذی اقتدار امراء کا سرغنہ ہونے کی وجہ سے کافی اثر و رسوخ کا حامل تھا۔ ان رشتوں سے قطب الدین کی سلطنت بہت مستحکم ہو گئی۔

ایبک کا نظامِ حکومت

قطب الدین ایبک نے صرف چار سال حکومت کی۔ اس عرصہ میں بھی وہ زیادہ تر شمال مغربی سرحد کی حفاظت میں مصروف رہا۔ قدرت نے اسے نظامِ حکومت کے میدان میں تنظیمی قابلیت اور فہم و فراست کے جوہر دکھانے کا موقع نہ دیا۔ اس کا نظامِ سلطنت خالصتاً فوجی نوعیت کا تھا۔ قطب الدین ایبک نے تمام سلطنت میں امن و امان قائم رکھنے کے لیئے اہم صوبوں اور شہروں میں فوج متعین کی اور انتظام و انصرام کے لیئے مقامی افسروں کو تعینات کیا۔ یہ افسر عموماً فوجی ہوتے تھے۔ عدل و انصاف کے لیئے ہر صوبہ میں قاضی مقرر تھے۔ جرائم کی سزائیں سخت تھیں۔ ایبک وقتاً فوقتاً رعایا کی فلاح و بہبود کے لیئے ضروری احکام بھی جاری کرتا رہتا تھا۔ نتیجتہً اس کے عہد میں مکمل امن و امان رہا۔ تمام ہمعصر مورخین اس کے اعلیٰ نظامِ حکومت کی تعریف کرتے ہیں اور تمام کا متفقہ قول ہے کہ "سلطان قطب الدین ایبک کے عہد میں کسی شخص کو اتنی جرأت نہ تھی کہ کسی سے برگِ کاہ یا ایک روٹی تک چھین سکے"۔

قطب الدین ایبک ایک منصف مزاج حکمران تھا۔ وہ احکامِ شریعت کا سخت پابند تھا۔ اس نے اقتصادی حالت کی بہتری کے لیئے متعدد ایسے ٹیکس معاف کر دیے جو شرعاً ناجائز تھے۔ قبل ازیں پیداوار کا پانچواں حصہ بطور لگانِ اراضی وصول کیا جاتا تھا۔ ایبک نے اسے خلافِ شریعت قرار دیتے ہوئے شرعی اصول کے تحت پیداوار کا دسواں حصہ سرکاری لگانِ اراضی مقرر کیا۔ اس سے رعایا فارغ البال اور خوشحال ہو گئی۔ ہمعصر مؤرخ حسن نظامی ایبک کے نظامِ حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اس کے پُرامن عہد میں خزانہ کی حفاظت کے لیئے کسی محافظ کی ضرورت نہ تھی۔ یہاں تک کہ بھیڑیوں کے گلے گڈریے کی نگرانی کے محتاج نہ تھے۔ اس

Marfat.com

کی سلطنت میں بھیڑیا اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے، چوری اور رہزنی کا نام و نشان تک نہ تھا۔[1]

قطب الدین ایبک کی وفات

قرونِ وسطیٰ میں چوگان کا کھیل امراء اور صاحب اقتدار لوگوں میں بڑا مقبول تھا۔ قطب الدین ایبک کو بھی چوگان کا بڑا شوق تھا وہ اوقاتِ فرصت میں اسی کھیل سے دل بہلایا کرتا تھا۔ یہی شوق اس کی موت کا باعث ہوا چنانچہ ۴ نومبر ۱۲۱۰ء کو لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر سخت زخمی ہوا۔ بقول مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی "قطب الدین ایبک کا گھوڑا سکندری کھا کر اس طرح گرا کہ سلطان گھوڑے کے نیچے دب گیا۔ گھوڑے کی زین کا پیش کوہہ سلطان کے سینہ میں گڑا اور فوراً مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔"[2] یہ بلند منزلت سلطان لاہور میں (انارکلی بازار کے قریب ایبک روڈ پر) ابدی نیند سو رہا ہے۔

سلطان شمس الدین التمش ۱۲۱۰ء میں سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد جب پہلی بار لاہور آیا۔ تو اس نے سلطان مرحوم کی آخری آرام گاہ پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کروایا جو صدہا سال تک زیارت گاہِ عوام رہا۔ بقول ملا عبدالقادر بدایونی، اکبر اعظم کے دور میں بھی یہ مقبرہ زیارت گاہ خاص و عام تھا۔

سلطان مرحوم کی قبر انارکلی بازار سے میو ہسپتال کی طرف جانے والی سڑک (جو اب ایبک روڈ کے نام سے مشہور ہے) پر ایک بغلی گلی میں واقع تھی۔ لیکن سابق صدر ایوب کے دورِ اقتدار میں محکمۂ آثارِ قدیمہ نے قبر سے متصل تمام مکانات خرید کر اور انہیں مسمار کر کے قبر کے احاطے کو واگذار کرایا۔ محکمۂ مذکور نے سلطان قطب الدین کے مقبرے کے آثار کی دریافت کے لئے کھدائی بھی کرائی۔ لیکن آثار نہ مل سکے۔ اس سے مقبرے کی از سرِ نو تعمیر کا کام کچھ عرصہ کے لئے کھٹائی میں پڑ گیا۔ مگر انجمن حمایتِ اسلام کی ڈائمنڈ جوبلی کے اجلاس منعقدہ ۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء میں جناب ابو الاثر حفیظ جالندھری نے اپنا کلام سناتے ہوئے صدرِ مملکت محمد ایوب خان کی توجہ مزارِ ایبک کی تعمیر کی جانب مبذول کرائی[3] چنانچہ اب یہ مقبرہ زیرِ تعمیر ہے۔

---

[1] تاج المآثر۔ صفحہ ۳۶ - ۳۳۸

[2] آئینہ حقیقت نما۔ صفحہ ۳۱۰

[3] روئیداد ڈائمنڈ جوبلی انجمن حمایت اسلام لاہور ۱۹۶۷ صفحہ ۱۶۰ - ۱۶۱

Marfat.com

ایبک کی سیرت و کردار

سلطان قطب الدین ایبک پہلا مسلم فرمانروا تھا جو تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔ اور جس نے برِصغیر پاک و ہند میں ایک ایسی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جو کسی بیرونی سیاسی مرکز کے ماتحت نہ تھی۔ ایبک اپنے دَور کے ایسے ہمعصر حکمرانوں میں بلند مقام کا مستحق ہے جو محض اپنی خداداد صلاحیتوں اور استعداد کی بدولت مسندِ شاہی پر فائز ہوئے۔ وہ مشفق و فیاض اور مہم جوئی و شجاعت میں بے مثل تھا۔ بہادر اور جنگجو فاتح ہونے کے علاوہ قطب الدین ایبک عدل گستر اور رعایا پرور بھی تھا۔ تمام مورخین اس کی سخاوت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ عوام میں وہ "لکھ داتا" کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا بانی ہونے کے باوجود تمام عمر اپنے آقا سلطان معزّالدین محمد غوری کا وفادار رہا۔ فتح دہلی کے بعد اس نے اپنی وفات تک بیس (۲۰) سال برِصغیر پر حکومت کی۔ ابتدائی سولہ سال میں وہ نائب السلطنت کی حیثیت سے حکمران رہا۔ صرف آخری چار سال خود مختار شہنشاہ کی حیثیت سے سریر آرائے اقتدار رہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کا الگ الگ جائزہ لیا جائے۔

بحیثیتِ انسان

قطب الدین ایبک گو شکل و شباہت سے خوشرو نہ تھا۔ مگر اعلیٰ ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں سے مزیّن تھا۔ شجاعت میں بے مثل تھا۔ بے حد فیاض اور حلیم الطبع واقع ہوا تھا۔ اُسے اپنے ہموطن اور ہم قوم ترکوں سے حد درجہ انس و پیار تھا۔

اگرچہ وہ ایک طالع آزما سپاہی اور جفاکش فاتح تھا۔ مگر وہ فنونِ حرب میں مہارت کاملہ رکھنے کے علاوہ اعلیٰ ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ اور اسے علومِ مروّجہ پر پورا عبور حاصل تھا۔

اگرچہ وہ ایک طالع آزما سپاہی اور جفاکش فاتح تھا مگر وہ فنونِ حرب میں مہارت رکھتا تھا قرآن حکیم کا حافظ اور اربابِ علم و دانش کا سرپرست بھی تھا۔ فخر مدبر مبارک شاہ نے لاہور میں اپنی تالیف "بحر الانساب"، اُس کی خدمت میں پیش کی تو اُسے انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ اس کے دَور میں بے شمار علماء و فضلاء شاہی سرپرستی سے بہرہ وَر ہوئے۔ قطب الدین ایبک ایک خدا ترس، پابندِ شریعت اور فیاض بادشاہ تھا۔ لوگ اسے "لکھ داتا" کہتے تھے۔ اس کی رعایا پروری اور عدل گستری کی وجہ سے رعایا کا ہر فرد اس کی ناگہانی وفات پر اشکبار تھا۔

بحیثیتِ جرنیل

جرنیل کی حیثیت سے قطب الدین ایبک کا مقام بہت بلند ہے۔ خراسان کی جنگ میں اس نے اپنی بہادری اور عسکری ذہانت کا مظاہرہ کر کے محمد غوری کو بہت متاثر کیا۔ برِصغیر کی تمام مہمات میں وہ محمد غوری کے ساتھ شمشیر زنی کے بے مثال کارنامے سرانجام دیتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی فوجی قابلیت اور اعلیٰ سپہ گری سے متاثر

Marfat.com

ہوکر محمد غوری نے اسے اپنا نائب السلطنت مقرر کیا اور مزید فتوحات پر مامور کیا۔ سلطان محمد غوری نے اسے ملک کا خطاب بھی دیا۔ بطور نائب السلطنت اس نے ہانسی، بلند شہر، میرٹھ، دہلی، اجمیر اور کول (علیگڑھ) انہلواڑہ، قنوج، بنارس، گوالیار اور کالنجر کو تسخیر کر کے نہ صرف ایک اعلیٰ سپہ سالار ہونے کا ثبوت دیا بلکہ اپنے آقا کی سلطنت کو بھی مزید وسعت دی۔ اخوند محمد عزیز احمد "سلطان قطب الدین ایک خوش نصیب سپاہی ہونے کے علاوہ ایک معمارِ سلطنت اور برِ صغیر پاک و ہند میں اسلامی سلطنت کا اصل بانی تھا۔"

بحیثیت حکمران

بحیثیت حکمران ایبک کو تاریخ برصغیر میں ایک بلند مقام حاصل ہے وہ ایک انصاف پسند رعایا پرور اور مشفق حکمران کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اُس نے سلطنت میں نظم و ضبط اور امن و امان کو برقرار رکھا۔ وہ بلند خیالات کا حامل ایک کامیاب فرمانروا تھا۔ تاج المآثر کا مصنف تاج الدین حسن بن نظامی نیشاپوری اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اُس نے نہ صرف فرائض جہانبانی بطریق احسن انجام دیئے بلکہ عدل و انصاف کا بول بالا کر کے ملک میں مکمل امن و سکون اور خوشحالی کو فروغ دیا۔" ڈاکٹر محمد عزیز احمد رقمطراز ہیں کہ۔

"قطب الدین ایبک برِ صغیر کا پہلا مسلم فرمانروا تھا جس کا نام خطبہ میں شامل اور سکوں پر کندہ ہوا۔ بہرحال یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنی فتوحات اور جدوجہد کے نتائج سے بہرہ ور ہونے کے لیے زیادہ دیر زندہ نہ رہا۔ لیکن برصغیر میں اس نے اپنے بعد ایک منظم اور طاقتور اسلامی سلطنت چھوڑی، نیز اسلام کی علمداری کا جو بودا اُس نے اِس سرزمین میں کاشت کیا تھا، وہ صدیوں تک سرسبز و شاداب رہا۔"[1]

قطب الدین ایبک ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ وہ اسلام کی اشاعت و ترقی کا خواہاں تھا اور مذہبی تنگ نظری اور تعصب سے بالاتر روادارانہ پالیسی کا حامی تھا۔

قطب شاہی عمارات

ایبک کو فن تعمیر سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ ۱۱۹۳ء میں اُس نے فتح دہلی کی یاد میں دہلی میں مسجد قبۃ الاسلام[2] تعمیر کرائی۔ قطب مینار جسے بعد میں سلطان التمش نے مکمل کیا، کی بنیاد رکھی۔ قطب مینار ۲۴۲ فٹ اونچا ہے اور فن تعمیر کا ایک نادر شاہکار ہے۔ یورپ کے بعض مورخین اسے ٹاور آف وکٹری کہتے ہیں۔ یہ مینار فتوحات کا مظہر ہے۔ علاوہ ازیں ۱۲۰۰ء میں اُس نے اجمیر میں بھی ایک مسجد تعمیر کرائی جو مسجد قبۃ الاسلام کی طرز پر ہے۔ روایت ہے کہ سلطان نے اُسے اڑھائی دن میں تعمیر کرایا۔ اس لیے اُسے اڑھائی دن کا جھونپڑا بھی کہتے ہیں۔ یہاں ایک میلہ بھی لگتا ہے جو اڑھائی دن تک رہتا ہے۔

---

[1] ارلی ترکش ایمپائر آف دہلی صفحہ ۱۵۱

[2] یہ مسجد قوۃ الاسلام کے نام سے بھی مشہور ہے۔

Marfat.com

آرام شاہ

۱۲۱۰ء تا ۱۲۱۱ء

برصغیر پاک و ہند میں ترکی سلطنت کے قیام کے چند ہی سال بعد سلطان قطب الدین ایبک نے ۴ نومبر ۱۲۱۰ء کو وفات پائی تو نوزائیدہ سلطنت سیاسی انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی۔ ایبک کی وفات کے بعد امراء سلطنت نے لاہور میں اس کے بیٹے آرام شاہ کو تخت نشین کر دیا۔

دہلی کے باشندگان نے آرام شاہ کو اپنا بادشاہ ماننے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ وہ اُسے کمزور اور نااہل سمجھتے تھے، اور عنان سلطنت کسی مضبوط اور تجربہ کار منتظم شخص کے ہاتھوں میں دینے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ انہوں نے قاضی القضاۃ کی سرکردگی میں بدایوں کے گورنر اور قطب الدین ایبک کے داماد شمس الدین التمش کو تاج و تخت قبول کرنے کی دعوت دی۔ آرام شاہ اپنے حق سے دستبردار نہ ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے التمش کا مقابلہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس گروہ بندی اور سیاسی انتشار سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُچ کے گورنر ناصر الدین قباچہ نے آگے بڑھ کر ملتان پر قبضہ کر لیا۔ بنگال کے حاکم علی مردان نے بھی اطاعت گذاری سے منہ موڑ لیا۔ اِس طرح آرام شاہ کے چند ماہ کے دورِ حکومت میں ہی نوزائیدہ ترک سلطنت چار خود مختار ریاستوں میں بٹ کر رہ گئی۔ آرام شاہ جسے لاہور کے مقتدر امراء کی حمائت حاصل تھی، التمش کے مقابلہ کے لیے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن شکست سے دوچار ہو کر ہلاک ہوا۔ آرام شاہ صرف آٹھ ماہ برسرِ اقتدار رہا۔

Marfat.com

سُلطان شمسُ الدّین ایلتتمش [1]

(۱۲۱۰ء تا ۱۲۳۶ء)

"سلطان شمس الدین ایلتتمش بجا طور پر ترکش ایمپائر کا عظیم فرمانروا تھا۔ بحیثیت ایک اعلیٰ انسان اور موزوں حکمران کے وہ تمام سلاطینِ دہلی میں بلند مقام رکھتا ہے" [2]

محمد عزیز احمد

ابتدائی حالات

شمس الدین ایلتتمش ترکستان کے البری قبیلہ کے سردار ایلم خاں کا بیٹا تھا۔ وہ اوائل عمر سے ہی بے حد خوبصورت، ذہین اور اعلیٰ فہم و فراست کا مالک تھا۔ چنانچہ اس کی اس اعلیٰ ذہانت اور خداداد صلاحیت کی وجہ سے اُس کے سوتیلے بھائی اُس کے دشمن ہو گئے اور انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرح اپنے والدین سے گھوڑے دکھانے کے بہانے لے جاکر اُسے بخارا کے ایک سوداگر کے پاس بطورِ غلام فروخت کر دیا۔ اس سوداگر نے اسے بخارا کے صدر جہاں (مذہبی امور اور اوقاف کا افسرِ اعلیٰ) کے ایک عزیز کے پاس بیچ دیا۔ یہ خاندان خدا ترس اور علم دوست تھا چنانچہ ایلتتمش اِس خاندان میں ایک فرزند کی طرح تعلیم و تربیت پانے لگا۔

بعد ازاں حاجی بخاری نامی ایک سوداگر نے ایلتتمش کو اس خدا ترس خاندان سے خرید کر جمال الدین محمد جُست قبا کے پاس فروخت کر دیا جو اسے غزنی لے آیا۔ جہاں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ایلتتمش اور ایک دوسرے غلام ایبک نامی کی ایک ہزار طلائی مہر قیمت ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی، مگر خواجہ جمال الدین نے اِس قیمت پر انہیں فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر شہاب الدین غوری نے ناراض ہو کر حکم جاری کر دیا کہ ان دو غلاموں کو کوئی شخص نہ خریدے۔ ایک سال تک غزنی میں قیام کے باوجود

---

[1] لفظ ایلتتمش کو مختلف طرح سے لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ مثلاً ایلتتمش، التمش، ایلتمش اور التمش۔ سلطان ایلتتمش کے سکوں پر اس کا نام التمش، ایلتمش، التمش لکھا ہے۔ قطب مینار دہلی کی دوسری منزل کے کتبہ پر سلطان شمس الدین کا نام ایلتتمش لکھا ہے۔ اسی طرح اس کی تیسری منزل کے کتبہ پر ایلتمش السلطان کندہ ہے۔ مشہور مؤرخ لین پول کی رائے میں اس لفظ کا صحیح تلفظ ایلتمش ہے جس کے معنی ممد و معاون یعنی مدد کر کے غیر ملک کا انتظام سنبھالنے والا ہیں۔ چونکہ اس نے خاندانِ غلاماں کے گرتے ہوئے اقتدار کو سنبھالا اس لیے وہ اس نام سے معروف ہوا۔ بعض مؤرخین کے نزدیک یہ ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چاند گرہن ہیں کیونکہ سلطان چاند گرہن والی رات کو پیدا ہوا تھا۔ اسی وجہ وہ اس نام سے مشہور ہوا۔ دورِ حاضرہ کے مؤرخین۔ وی اے سمتھ، ڈاکٹر بینی پرشاد، سر ولزلی ہیگ، ایشوری پرشاد، سر ولسلے ہیگ اور محمد عزیز ان سب نے ایلتتمش لکھتے ہیں۔

[2] آر لی ترکش ایمپائر آف دہلی صفحہ ۸۱

Marfat.com

مایوس ہو کر سوداگر واپس بخارا چلا گیا۔ تین سال کے بعد بہاء الدین محمد دوبارہ غزنی آیا۔ لیکن اس مرتبہ بھی ایک سال کے قیام کے باوجود کسی نے سلطان کے ڈر سے ان غلاموں کو نہ خریدا۔ اس اثنا میں گجرات کی فتوحات سے فارغ ہو کر قطب الدین ایبک غزنی آیا۔ اسے یہ دونوں غلام پسند آئے۔ چنانچہ اس نے سلطان سے ان غلاموں کو خرید لینے کی اجازت چاہی۔ سلطان محمد غوری نے کہا کہ چونکہ میں نے ان کی خرید پر پابندی لگا رکھی ہے، اس لیے تم انہیں غزنی میں نہیں خرید سکتے۔ البتہ انہیں دہلی لے جا کر خرید سکتے ہو۔[1] چنانچہ قطب الدین ایبک نے اپنے وزیر نظام الدین محمد کی وساطت سے سوداگر خواجہ جمال الدین چشت قبا کو دہلی بلوا کر دونوں غلاموں کو ایک لاکھ جیتل کے عوض خرید لیا۔ بقولِ مشہور مورخ فرشتہ، قطب الدین ایبک نے غلام ایبک کو طمغاج اور شمس الدین کو ایلتتمش کا نام دیا۔ ایلتتمش اپنی خداداد ذہانت سے پہلے سرجاندار (محافظ دستہ) کا سالار اور بعد میں امیر شکار کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوا۔ گوالیار کی تسخیر کے بعد سلطان نے اسے حاکم گوالیار مقرر کر دیا۔ بعد ازاں زیریں و بلند شہر، اور گرد و نواح کے علاقہ کا گورنر مقرر ہوا۔ لیکن جلد ہی بہادری اور جانفروشی کا مظاہرہ کرنے کے عوض اسے بدایوں کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔

سلطان محمد غوری پنجاب کے باغی کھوکھروں کی گوشمالی کے لیے برصغیر میں وارد ہوا۔ تو شمس الدین ایلتتمش نے سلطان قطب الدین کے ہمراہ افواج بدایوں کی معیت میں سرکش کھوکھروں کے استیصال میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ سلطان محمد غوری نے اس کی عسکری ذہانت اور اعلیٰ کارکردگی سے خوش ہو کر بقول مصنفِ "طبقات ناصری" "اسے نہ صرف خلعت فاخرہ سے نوازا بلکہ قطب الدین ایبک کو اس سے فیاضانہ و مشفقانہ سلوک کرنے کی تاکید کی۔ قطب الدین نے سلطان کے حکم پر اسے آزاد کرتے ہوئے امیر الامراء و امرائے چہلگانی کا سرغنہ بنا دیا۔

سلطان قطب الدین کی اچانک وفات اور آرام شاہ کے تخت نشین ہونے پر سپہ سالار امیر علی اسماعیل دہلی شہر کے امیر داد و قاضی القضاۃ، نے دیگر ملوک اور امراء سلطنت کے مشورے پر حاکم بدایوں شمس الدین ایلتتمش کو تاج شاہی قبول کرنے کی دعوت دی چنانچہ اس نے اپنی افواج کی معیت میں دہلی پہنچ کر ۱۲۱۰ء میں تختِ دہلی پر قبضہ کر لیا۔[2]

ابتدائی مشکلات

ایلتتمش کو تخت نشین ہوتے ہی مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور تخت دہلی اس کے لیے کانٹوں کا بستر ثابت ہوا کیونکہ جونہی وہ تخت نشین ہوا، دہلی کے ترک اور مقامی امراء نے آرام شاہ کے شاہی محافظ دستہ کے سردار سرجاندار کی سرکردگی میں علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ وہ ایلتتمش کو غلام ابن غلام سمجھتے تھے اور اس کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنے کو تیار نہ تھے۔ اسی طرح مختلف صوبیدار

---

[1] طبقات ناصری۔ صفحہ ۱۶۸۔

[2] محمد عزیز احمد۔ ارلی ترکش ایمپائرز، دہلی، صفحہ ۱۶۲، خلیق احمد۔ تواریخ، صفحہ ۱۹۰۔ اور کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ جلد سوم صفحہ ۱۵۱ پر ۱۲۱۱ درج ہے لیکن ہمعصر مؤرخین کے مطابق ۶۰۷ھ ہے یعنی ۱۲۱۰ء۔

Marfat.com

جو ایبک کے دور میں ہی نیم خود مختار تھے۔ اب مکمل طور پر خود مختار ہو گئے۔

بنگال میں علی مردان خان نے بغاوت برپا کر کے خود مختاری اختیار کر لی۔ سندھ اور ملتان کے حاکم ناصر الدین قباچہ نے آگے بڑھ کر لاہور پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ تاج الدین یلدوز حاکم غزنی نے تو دہلی ایلتتمش کو برِ صغیر پاک و ہند میں اپنا نائب السلطنت تسلیم کر لیا۔ کیونکہ وہ خود کو محمد غوری کا جانشین سمجھتا تھا، اور سلطانِ دہلی پر اپنی بالادستی کا دعویدار تھا۔ اس نے ایلتتمش کو اپنا ماتحت ظاہر کرنے کے لیے اس کے نام کئی ایک فرامین بھی جاری کیے۔ علاوہ ازیں راجپوت راجاؤں جنہیں محمد غوری اور قطب الدین ایبک نے زیرِ نگیں کیا تھا، نے بھی باغیانہ عزائم اپناتے ہوئے خراج بھیجنا بند کر دیا۔ حتیٰ کہ جلور، رنتھمبور، اجمیر، گوالیار، اور دوآب کے علاقے خود مختار ہو گئے۔

ایلتتمش کی پریشانیوں اور مشکلات میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب تاتاری فتنہ نے ان میں مزید اضافہ کر دیا۔ جلال الدین خوارزم شاہ چنگیز خان سے شکست کھا کر غزنی آ گیا۔ اس پر یلدوز غزنی سے بھاگ کر پنجاب آ گیا۔ اور دہلی پر قبضہ کرنے کے منصوبے باندھنے لگا۔ اسی اثنا میں چنگیز خان نے غزنی اور کابل کو تاخت و تاراج کر کے جلال الدین خوارزم شاہ کو برِ صغیر کی طرف فرار ہونے پر مجبور کر دیا اور خود اس کے تعاقب میں دریائے سندھ تک پہنچ گیا۔ اور مغربی کنارے پر خیمہ زن ہو کر دریا کو عبور کرنے اور دہلی کا رخ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اس صورتحال نے ایلتتمش کی مشکلات کو بے حد بڑھا دیا۔ لیکن اس نے اپنی فہم و فراست اور حسنِ تدبر سے بتدریج ان سب مشکلات پر قابو پا لیا۔ حتیٰ کہ اپنی وفات کے وقت وہ شمالی برِ صغیر کا بلا شرکتِ غیرے واحد مالک تھا۔ مؤرخین اسے خاندانِ غلاماں کا دوسرا بانی سمجھتے ہیں۔ خاندانِ غلاماں کا سب سے بڑا بادشاہ قرار دیتے ہیں

ترک امراء کی گوشمالی

سلطان شمس الدین ایلتتمش نے برِ سرِ اقتدار آتے ہی ترک امراء سے جارحانہ برتاؤ کیا اور انعام و اکرام سے نوازتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر اس کے باوجود اکثر ترک اور معزی امراء نے شاہی محافظ دستہ کے سردار سرجاندار اکی سرکردگی میں علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اور نواحِ دہلی میں فتنہ و فساد میں مصروف ہو گئے۔ اگرچہ سلطان ابتداء میں اس صورتِ حال پر خاموش رہا اور چند روز تک اس نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے کوئی سخت اقدام نہ کیا مگر بالآخر اس نے لشکرِ جرار جمع کر کے باغیوں کو دریائے جمنا کے کنارے شکستِ فاش دی اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے نہ صرف نواحِ دہلی میں امن و سکون قائم ہو گیا۔ بلکہ ہندوریا پر اس کے ابدیہ شاہی کی دھاک بھی بیٹھ گئی۔

تاج الدین یلدوز

سرکش ترک امراء کی گوشمالی کرنے اور دہلی میں حالات کو پرسکون بنانے کے بعد سلطان شمس الدین ایلتتمش اپنے سب سے بڑے دشمن تاج الدین یلدوز کی طرف متوجہ ہوا جس نے ناصر الدین قباچہ کو لاہور سے نکال کر پنجاب کے بیشتر حصے پر قبضہ کر لیا تھا اور سلطان ایلتتمش کو مکمل طور پر اس سرزمین پر اپنا تسلط تسلیم کرنے لیکن سلطان پنجاب میں یلدوز کی موجودگی کو اقتدارِ دہلی کے لیے بہت بڑا خطرہ تصور کرتا تھا

Marfat.com

تاج الدین یلدوز غزنی کا حاکم تھا۔ اور قطب الدین ایبک کی طرح وہ بھی محمد غوری کا غلام تھا اور اپنے آپ کو محمد غوری کا جانشین سمجھتا تھا۔ سلطان ایلتتمش تخت دہلی پر بیٹھا تو اس نے اسی خود ساختہ جانشینی کے زعم میں ایلتتمش کو برصغیر پاک و ہند میں اپنا نائب السلطنت تسلیم کرتے ہوئے اسے چتر اور دور باش بھیجا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سلطان ایلتتمش کا حاکم اعلیٰ سربراہ اور سرپرست ہے اور اسے علاماتِ شاہی کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ اُن ایام میں سلطان ایلتتمش مصائب میں گھرا ہوا تھا، اس لیے مصلحتِ وقت کے تحت اس نے اُن علاماتِ شاہی اور تحائف کو قبول کر لیا۔ لیکن ۱۲۱۴ء میں چنگیز خان (جو تاریخِ عالم میں قہرِ الٰہی کے نام سے مشہور ہے) نے جلال الدین خوارزم شاہ کو شکست دے کر اسے خوارزم سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر جلال الدین خوارزم شاہ نے غزنی پر قبضہ کر لیا۔ چونکہ تاج الدین یلدوز میں مقابلہ کرنے کی سکت نہ تھی، اس لیے وہ غزنی سے بھاگ کر پنجاب میں پناہ گزین ہوا۔ ۱۲۱۵ء میں اس نے ناصر الدین قباچہ کو لاہور سے نکال کر لاہور پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد پنجاب کے بیشتر علاقوں کو زیرِ نگین کر کے سلطان ایلتتمش کو اس کا تسلط تسلیم کرنے کو لکھا۔ اس پر سلطان ایلتتمش ایک بھاری لشکر کے ساتھ پنجاب کی طرف روانہ ہوا اور ترائن کے میدان میں یلدوز سے معرکہ آرا ہوا جس میں یلدوز کو شکست ہوئی اور اسے گرفتار کر کے بدایوں کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں اس نے دورانِ حبس ہی وفات پائی۔ یلدوز کی شکست سے ایلتتمش کو ایک بہت بڑے دشمن سے چھٹکارا ملا۔

چنگیز خان
(فتنۂ تاتار)

اپنے ابتدائی دور میں ترکش سلطنت کے وجود کو منگولوں کے حملہ سے سخت خطرہ درپیش رہا۔ منگول (تاتاری) اپنے سردار تموجن المعروف چنگیز خان [1] کی سرکردگی میں جلال الدین خوارزم شاہ کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے سندھ تک پہنچ گئے۔

وسط ایشیا میں دریائے جیحون کے پار خوارزم شاہیوں کی سلطنت تھی۔ جہاں علاؤ الدین خوارزم شاہ حکمران تھا۔ اس نے تاتاریوں (منگولوں) کے سردار چنگیز خان کو ناراض کر لیا۔ چنانچہ چنگیز خان نے خوارزم پر حملہ آور ہو کر اسے مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ علاؤ الدین خوارزم شاہ نیشاپور (یا قزوین) کی طرف بھاگ گیا لیکن ولیعہد شہزادہ جلال الدین منکبرنی نے پامردی سے منگولوں کا مقابلہ کیا، مگر شکست کھا کر غزنی کی جانب بھاگ گیا۔ جہاں اس نے تاج الدین یلدوز کو غزنی سے نکال کر وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ منگولوں نے اسے وہاں بھی آرام کا سانس نہ لینے دیا، چنانچہ وہ منگولوں سے شکست کھا کر پنجاب پہنچا۔ چنگیز خان نے دریائے سندھ تک اس کا تعاقب کیا۔ دریائے سندھ کے غربی کنارے پر چنگیز خان کے سامنے جلال الدین خوارزم شاہ کا آخری مقابلہ ہوا مگر شکست سے دوچار ہوا۔ تاریخ میں مذکور ہے کہ خوارزم نے پہاڑ کی چوٹی سے گھوڑے کو ایڑ لگا کر دریا کی تلاطم خیز موجوں میں چھلانگ لگا دی اور آنِ واحد میں دریا کو عبور کر گیا۔ چنگیز خان انگشت بدنداں یہ تمام منظر دیکھتا رہا۔

پنجاب میں پہنچ کر جلال الدین خوارزم شاہ نے سلطان شمس الدین ایلتتمش کو ایک عالم شہر کی مانند زندگی گذارنے

---

[1] چنگیز خان ۱۱۵۵ء میں دریائے اونن (روس) کے دائیں ساحل پر واقع ضلع ہولون بیرہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔

Marfat.com

کے لیے پناہ کی درخواست کی۔ ترکش امپائر کے لیے یہ ایک بڑا نازک مرحلہ تھا۔ التمش سلطنتِ دہلی کو وسط ایشیا کی سیاست میں الجھا کر اور جلال الدین خوارزم شاہ کو پناہ دے کر منگولوں کے حملے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لیے اُس نے کمال تدبر اور فراست سے کام لے کر شہزادہ جلال الدین خوارزم کو یہ دانشمندانہ جواب بھیجا کہ دہلی کی آب و ہوا آپ کے لیے نارساز گار ہوگی۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس طرف کا رُخ نہ کریں۔ چنانچہ خوارزم شاہ نے لکھڑوں کی مدد سے ناصرالدین قباچہ پر حملہ کر کے ملتان اور سندھ پر قابض ہونے کی کوشش کی مگر حالات کو سازگار نہ پا کر ملتان سندھ اور مکران سے ہوتا ہوا ایران چلا گیا۔ جہاں وہ منگولوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

چنگیز خان جلال الدین کے، دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب میں آنے کے بعد ایک غیر ذمہ دار سلطنت پر حملہ آور ہونا مناسب نہ سمجھتے ہوئے واپس افغانستان چلا گیا۔ اس طرح سلطنتِ دہلی ایک بہت بڑا طوفان کی زد میں آنے سے بچ گئی۔

ناصرالدین قباچہ

ناصرالدین، سلطان محمد غوری کا غلام تھا اور نہایت ہی زیرک اور دور اندیش انسان تھا۔ محمد غوری نے اسے حاکم اُچ مقرر کیا۔ اس نے سلطان قطب الدین ایبک کی دو لڑکیوں سے یکے بعد دیگرے شادی کی۔ ایبک کی اچانک موت کے بعد اس نے خود مختار رہنا پسند کرتے ہوئے نہ صرف سلطان شمس الدین التمش کی سیادت سے انکار کیا بلکہ خراج کا ادا کرنا بھی بند کر دیا۔ اس نے لاہور پر قبضہ کر کے پنجاب کے بیشتر حصہ کو بھی زیرِ نگیں کر لیا لیکن جلد ہی اس کا اقتدار زوال پذیر ہوا۔ جب تاج الدین یلدوز کو جلال الدین خوارزم شاہ سے شکست دینے کے بعد پنجاب پر تسلط قائم کرنے کا خیال آیا تو اس نے پنجاب میں پہنچ کر اور قباچہ کو شکست دے کر ملتان کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ قباچہ نے ملتان اور سندھ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اُچ اس کا دارالحکومت تھا۔

تاتاری سردار چنگیز خان نے خوارزم شاہی حکومت کو تاخت و تاراج کیا تو متعدد علماء و فضلاء اور اربابِ فن ایران، ترکستان اور خراسان سے بھاگ کر ملتان اور اُچ آ گئے۔ قباچہ نے فیاضی و فراخدلی سے ان کی سرپرستی کی۔ اس سے ملتان اور اُچ کے شہر علم و ادب کے گہوارے بن گئے۔

قباچہ کی طاقت کا جلد زوال شروع ہو گیا جب جلال الدین خوارزم شاہ چنگیز خان سے شکست کھا کر سلطان ایلتمش کے ہاں پناہ حاصل کرنے کی غرض سے پسپا ہو کر واپس آیا اور دہلی میں پناہ حاصل کرنے میں ناکام ہوا تو اس نے قباچہ کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ ملتان اور سندھ میں اپنی حکومت قائم کر سکے۔ اگرچہ بعد میں خوارزم شاہ ۱۲۲۴ء میں مکران کے راستے ایران چلا گیا لیکن خوارزم شاہ کی متواتر یلغاروں اور سندھ ساگر دوآب اور ملتان کے بعض علاقوں پر خوارزم شاہ کے کچھ لشکریوں کے قابض ہو جانے کی وجہ سے قباچہ کی طاقت بہت کمزور ہو گئی۔ چنانچہ جب ۱۲۲۸ء میں

Marfat.com

ایلتتمش نے قباچہ کو اطاعت گذار بنانے اور ملتان و سندھ کو سلطنتِ دہلی کے زیرِ نگیں کرنے کے لیے اُچ پر حملہ کیا تو وہ مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے اُچ سے فرار ہو کر بھکر کے قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ ایلتتمش نے تین ماہ کے محاصرے کے بعد ۵ جون ۱۲۲۸ء کو اُچ پر قبضہ کر لیا اور اپنے وزیر نظام الملک محمد جنیدی کو قباچہ کے تعاقب میں بھکر روانہ کیا۔ دریں اثناء قباچہ نے اپنے فرزند کو سلطان ایلتتمش سے صلح کی بات چیت کے لیے بھیجا اور خود اپنی عسکری پوزیشن کو کمزور پا کر کسی اور محفوظ مقام پر پناہ گزین ہونے کے لیے ایک کشتی کے ذریعہ بھاگ جانے کی کوشش کی، لیکن کشتی کے اُلٹ جانے کے باعث دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گیا۔ اُس نے سندھ اور ملتان پر بائیس ۲۲ سال تک حکومت کی۔ اُس کی وفات کے بعد اُس کے امراء نے سلطان ایلتتمش کی اطاعت قبول کر لی۔ چنانچہ سندھ اور ملتان کے علاقوں کا سلطنتِ دہلی سے الحاق ہو گیا۔ علاوہ ازیں قباچہ کے دربار سے وابستہ تمام علماء اور اربابِ فن سندھ سے ایلتتمش کے ہمراہ دہلی میں آ گئے، جن میں طبقاتِ ناصری کا مصنف منہاج سراج بھی تھا۔

بنگال کی فتح

بنگال پر سلطنتِ دہلی کا اقتدار قطب الدین ایبک کے دور میں قائم ہوا تھا لیکن ایبک کی وفات کے بعد علی مردان خلجی نے وہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ وہ بہت ظالم تھا۔ چنانچہ خلجی امراء نے اُس کے سخت رویہ سے تنگ آ کر اُسے قتل کر دیا اور امیر حسام الدین کو تخت نشین کر دیا۔ حسام الدین نے سلطان غیاث الدین کا لقب اختیار کیا۔ اُس نے نہ صرف بہار کو بنگال میں مدغم کیا بلکہ جاجنگر، ترہٹ، بنگ، رنگا اور کامروپ کی ہمسایہ ہندو ریاستوں کو زیرِ نگیں کر کے اپنا باجگذار بنایا۔

سلطان شمس الدین ایلتتمش بنگال کو پھر ایک بار سلطنتِ دہلی کے زیرِ نگیں کرنے کا خواہاں تھا۔ لیکن وہ شمال مغربی سرحد کی سیاسی پیچیدگیوں میں مصروف رہا۔ جونہی منگول فتنہ سے اُسے نجات ملی، اُس نے تسخیر بہار کے لیے ایک فوجی مہم بھیجی۔ ۱۲۲۵ء میں سلطان نے سرحدِ بنگال پر خود پہنچ کر اُس مہم کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس پر غیاث الدین عوض نے بغیر لڑے ایلتتمش کی اطاعت قبول کر لی، اور نہ صرف سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا اور سلطان کہلانے سے توبہ کی بلکہ ہمیشہ سلطنتِ دہلی کا فرمانبردار اور باجگذار رہنے کا بھی وعدہ کیا۔

سلطان ایلتتمش نے ملک عزّ الدین جانی کو صوبۂ بہار کا گورنر مقرر کیا۔ لیکن جونہی سلطان واپس عازمِ دہلی ہوا، غیاث الدین عوض نے وعدہ سے انحراف کرتے ہوئے خود مختاری اختیار کر لی اور ملک جانی کو بہار سے نکال کر اُس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس پر ایلتتمش نے اودھ کے گورنر شہزادہ ناصر الدین محمود کو اُس کی گوشمالی پر مامور کیا۔ ۱۲۲۶ء میں شہزادہ ناصر الدین محمود نے اچانک بنگال پہنچ کر لکھنوتی پر قبضہ کر لیا اور بعد ازاں شکست دے کر غیاث الدین عوض کو قتل کر دیا۔ اس طرح بنگال

Marfat.com

ایک بار پھر سلطنتِ دہلی کا صوبہ بن گیا۔ ۱۲۲۸ء میں شہزادہ ناصرالدین محمود کی اچانک وفات کے بعد خلجیوں نے لکھنوتی میں دوبارہ بغاوت برپا کر دی اور بالکا خلجی بنگال کے تختِ حکومت پر متمکن ہو گیا۔ مگر ۱۲۳۰ء میں ایلتتمش بہ نفسِ نفیس ایک بھاری فوج کی جمعیت لے کر وہاں پہنچا اور خلجیوں کی سختی سے تادیب کی۔ بالکا کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ نتیجتہً سلطنتِ دہلی سے بنگال کا باقاعدہ الحاق کر لیا گیا۔

منشورِ خلافت
۱۲۲۹ء

۱۲۲۸ء میں ناصرالدین قباچہ کو شکست دینے اور ملتان و سندھ کی تسخیر کے علاوہ ایلتتمش نے اُن سب علاقوں کو زیر نگیں کر لیا جو کبھی قطب الدین ایبک کی سلطنت میں شامل تھے۔ اس سے دُور دُور تک ایلتتمش کی عسکری شہرت اور شاہی وقار کی دھاک بیٹھ گئی۔ اب اُس نے اپنے سفیر کے ذریعہ خلیفۂ بغداد کے پاس کشورِ ہند کی سلطانی کی توثیق کے لیے درخواست بھیجی۔ ۱۸ر فروری ۱۲۲۹ء کو خلیفۂ بغداد ابوجعفر منصور المستنصر باللہ (۱۲۲۶ء تا ۱۲۴۶ء) کا سفیر اُس کے لیے فرمانروائی کی سند لے کر دہلی پہنچا۔ سفیر کا شایانِ شان استقبال کیا گیا۔ دارالحکومت دہلی کو دُلہن کی طرح آراستہ کیا گیا اور سرکاری طور پر مسرت و شادمانی کا مظاہرہ کرنے کے علاوہ دربارِ عام منعقد کیا گیا اور اس شاہانہ تقریبِ مسرت میں خلیفۂ اسلام کا جاری کردہ منشورِ سلطانی پڑھ کر سنایا گیا۔

اگرچہ اُس وقت خلیفۂ بغداد اپنی سیاسی اہمیت کھو بیٹھا تھا مگر اسلامی دنیا میں وہ اب بھی مذہبی پیشوا اور خلیفۃُ المسلمین سمجھا جاتا تھا۔ اور خلیفہ کی سندِ قبولیت کے بغیر کسی حکومت کی حیثیت کو آئینی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ خلیفۂ بغداد کا ایلتتمش کو ایک خلعت اور منشورِ سلطانی بھیجنا اس امر کا واضح ثبوت تھا کہ دربارِ خلافت نے ایلتتمش کی جداگانہ خود مختاری کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر سلطنتِ دہلی اور ایلتتمش کی آئینی حیثیت دنیائے اسلام کی نظر میں مستحکم ہو گئی۔

وفات
۳۰ر اپریل ۱۲۳۶ء

۱۲۳۵ء میں سلطان شمس الدین ایلتتمش نے سرکش گکھڑوں کی سرکوبی کے لیے بینین[1] (BANIAN) پر فوج کشی کی۔ لیکن اچانک بیمار پڑ جانے کی بنا پر اُسے مجبوراً مہم کو ترک کر کے واپس دہلی آنا پڑا۔ ۳۰ر اپریل ۱۲۳۶ء[2] کو ۲۶ سال حکومت کرنے کے بعد سلطان ایلتتمش اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اُس کا مقبرہ مسجدِ قبۃُ الاسلام کے شمال مغربی کونہ میں واقع ہے۔ ایلتتمش کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ پہلے مشہور صوفی خواجہ قطب

---

[1] یہ علاقہ سندھ ساگر دوآب میں واقع تھا۔

[2] ۱۴ر ماہِ شعبان ۶۳۳ھ

الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی سال رحلت فرمائی۔ آپؒ سلطان ایلتتمش کے نہایت گہرے مربی اور دوست تھے۔

کردار اور کارنامے

سلطان شمس الدین ایلتتمش بلاشبہ برِ صغیر پاک و ہند کا ایک عظیم مسلم فرمانروا تھا اور بحیثیت سلطان تمام سلاطینِ دہلی میں ممتاز تھا۔ ہمعصر مؤرخ قاضی منہاج سراج رقمطراز ہے کہ:

"وہ مشفق، غیر جانبدار، پُر جوش سپاہی اور بہادر، علم و ادب کا مربی، عدل گستر، فریدوں کی مانند شان و شوکت کا حامل، کیقباد جیسی شاہانہ صفات کا پیکر، سکندرِ اعظم کی سی عظمت و جلالت کا شہنشاہ اور بہرام کی سی سطوت رکھنے والا حکمران تھا۔ علاوہ ازیں اُس جیسا نیک، شفیق اور صوفیاء کرام و علماء کا مربی و قدر دان کوئی حکمران تختِ دہلی پر نہیں بیٹھا۔ وہ صوم و صلواۃ کا پابند اور نمازِ جمعہ جامع مسجد میں جا کر ادا کرنے کا عادی تھا۔"[1]

وہ اپنی خداداد صلاحیتوں اور استعداد و قابلیت کی بدولت بادشاہی کے رُتبہ پر پہنچا۔ اُس کی بادشاہت کا نصب العین اشاعتِ اسلام اور اسلامی حکومت کا استحکام تھا۔ سخاوت میں وہ اپنے آقا قطب الدین ایبک سے بدرجہا زیادہ فیاض تھا۔ سلطان ایلتتمش بلا تمیزِ مذہب و ملت اپنی رعایا کے ہر فرد سے فیاضانہ اور مشفقانہ سلوک روا رکھتا تھا۔ وہ ہر سال تقریباً دس کروڑ روپے علماء و فضلا، سادات اور ارکینِ دربار میں تقسیم کرتا تھا۔ اُس کی داد و دہش کی شہرت سُن کر وسطِ ایشیا کے متعدد اربابِ علم و دانش دارالسلطنت دہلی میں چلے آئے۔ جہاں اُن سے سلطان محمود اور سلطان سنجر جیسا فیاضانہ سلوک کیا گیا۔ صوفیاء کرام اور سادات کے ساتھ ایلتتمش نہایت احترام سے پیش آتا تھا۔ شیخ بہاؤالدین زکریاؒ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اُس کے مربی اور دوست تھے۔

ایلتتمش کی تخت نشینی کے وقت سلطنت غیر مستحکم اور بدنظمی و انتشار کا شکار تھی۔ متعدد ترک امراء اُسے غلام ابنِ غلام سمجھتے ہوئے اس کی اطاعت قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ بنگال کا صوبہ خود مختار ہو چکا تھا۔ سندھ اور ملتان میں ناصرالدین قباچہ نے خود مختاری اختیار کر لی۔ لاہور اور غزنی پر یلدوز کا قبضہ تھا۔ راجپوت راجگان سرکش و خود مختار ہو چکے تھے، لیکن ایلتتمش نے اپنی اعلیٰ عسکری صلاحیت اور خداداد ذہانت سے ان تمام مشکلات پر قابو پا لیا اور آہستہ آہستہ اُن تمام علاقوں پر قبضہ کر کے ترک امراء اور راجپوت راجاؤں کو اطاعت گذار بنایا۔ اس طرح ملک میں

---

[1] ۱۴ ربیع الاوّل ۶۳۳ھ۔ "انوارِ صوفیہ"، صفحہ ۵۲۔

[2] "طبقاتِ ناصری"

Marfat.com

امن و امان اور نظم و ضبط قائم کر کے سلطنت دہلی کو نہ صرف مستحکم بنیادوں پر استوار کیا بلکہ اس کی مرکزی سطوت و عظمت کو بحال کیا۔ جب وہ فوت ہوا تو سندھ سے لے کر بنگال تک تمام شمالی برِ صغیر سلطنت دہلی کے زیر نگیں تھا۔ ایلتمش نے اسی بنا پر خاندانِ غلاماں کا دوسرا بانی اور سلطنتِ دہلی کا عظیم فرمانروا کہا جاتا ہے۔ اُس نے اپنے حسنِ تدبر سے دہلی کی سلطنت کو مغلوں کے فتنہ سے محفوظ رکھا۔ اُس نے خلیفۂ بغداد سے سلطانی کی سند حاصل کر کے سلطنتِ دہلی کی وقعت کو بڑھایا اور اپنی مستقل حیثیت کو بھی تسلیم کروایا۔

ایلتمش پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے برِ صغیر میں پہلی دفعہ قدیم ہندو طرز کے سکوں کو یکسر ختم کر کے خالص عربی طرز کے سکے رائج کئے اور مرکزی ٹکسال بھی قائم کی۔ طلائی سکوں کے علاوہ اُس نے چاندی کا معیاری سکہ (تنکہ) جاری کیا، جس کا وزن ایک سو پچھتر گرین تھا۔ ایلتمش کے سکے بہت ہی خوبصورت اور معیاری تھے۔ اُن پر دیوناگری رسم الخط کی بجائے عربی رسم الخط میں خلیفۂ بغداد کے نام کے علاوہ سلطان کا لقب 'ناصر امیر المومنین' کندہ کروایا۔

ایلتمش کو فنِ تعمیر سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ اپنے آقا قطب الدین ایبک کے شروع کردہ قطب مینار (قطب صاحب کی لاٹھ) کی تعمیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ مخروطی شکل کا مینار اسلامی دور کی ایک عظیم الشان یادگار ہے۔ یہ مسجد قبۃ الاسلام کے متصل واقع ہے۔ قطب مینار دو سو چونتیس فٹ اونچا ہے۔ اُس کی پانچ منزلیں ہیں۔ پہلی تین منزلیں سنگِ سرخ سے تعمیر کی گئیں۔ اس کی آخری منزل جو چھتری نما تھی، بجلی گرنے سے تباہ ہو گئی۔ زمین پر اس مینار کا قطر اڑتالیس فٹ ہے۔ لیکن آخری منزل کا قطر صرف ۹ فٹ ہے۔ بعض مؤرخین اس مینار کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ بعض اس کو قطب صاحب کی لاٹ بھی کہتے ہیں، بعض مؤرخین کے نزدیک یہ مینار فتح کی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ سلطان قطب الدین ایبک نے اسے مسجد قبۃ الاسلام کے نزدیک اذان کے لیے تعمیر کروایا تھا۔

شمس الدین ایلتتمش کے جانشین

رکن الدین فیروز شاہ
۱۲۳۶ء

سلطان ایلتتمش کا بڑا لڑکا ناصر الدین محمود ۱۲۲۹ء میں وفات پا گیا تھا۔ اُس کے دوسرے بیٹے نااہل و تن آسان تھے اور رموزِ جہانبانی سے نابلد تھے۔ لہٰذا اُس نے اپنی بیٹی رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کیا کیونکہ وہ نہایت ہوشیار، عقلمند اور مردانہ اوصاف کی مالک تھی۔ رموزِ مملکت سے اچھی طرح واقف تھی اور دارالسلطنت سے سلطان کی غیر حاضری کی صورت میں جملہ کاروبار سلطنت انجام دیا کرتی تھی۔ لیکن امراء اور رضیہ کی سوتیلی والدہ ملکہ شاہ ترکان ہر قیمت کے خلاف تھے وہ ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہتے کہ ایلتمش اپنے

Marfat.com

نظرِ ثانی کرے۔ انہیں کسی قدر کامیابی بھی ہوئی۔ اسلئے ۱۲۳۵ء میں التتمش لاہور سے فیروز کو دہلی لے آیا لیکن قبل اس کے کہ وہ کسی تبدیلی کا اعلان کرتا، اُس کا انتقال ہوگیا۔ اگرچہ اہالیانِ دہلی رضیہ کے ہمنوا تھے لیکن شاہ ترکان اور فوجی افسروں نے مِل کر رضیہ کی بجائے رکن الدین فیروز کو جو سلطان کی اولاد میں سب سے بڑا تھا، تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن وہ بالکل نااہل ثابت ہُوا، کیونکہ اُس نے اپنے شب و روز عیش و نشاط کی محفلوں میں گذار نے شروع کر دئے اور خزانۂ شاہی بے دریغ لٹانا شروع کر دیا۔ اس سے ملکہ شاہ ترکان کا کاروبارِ سلطنت میں عمل دخل بڑھ گیا۔ وہ بے حد جاہ پرست تھی۔ وہ سلطان مرحوم کی بڑی لڑکی رضیہ کے خلاف اور اُسے گرفتار کرا کے قتل کروانے کے درپے تھی۔ ردِ عمل کے طور پر کئی ایک داخلی اور خارجی مسائل پیدا ہو گئے۔ سندھ اور اُچ پر غزنی، کرمان اور بینین کے حاکم حسن قرلغ نے حملہ کر دیا۔ وہی امراء جنہوں نے رکن الدین کو تخت پر بٹھایا تھا، اب اُس کے خلاف ہو گئے اور رُکن الدین کو تخت سے اتارنے کے لیے صوبوں میں جمع ہونے لگے۔ رُکن الدین فیروز باغیوں کی گوشمالی کے لیے دارالسلطنت دہلی سے ایک بھاری فوج کے ساتھ لہرام کی طرف روانہ ہُوا۔ دارالسلطنت سے فیروز شاہ کی غیر حاضری کے دوران رضیہ نے اہالیانِ دہلی کو فیروز شاہ اور اُس کی والدہ شاہ ترکان کے خلاف بھڑکا دیا۔ اُس نے جمعہ کے روز سُرخ لباس پہن کر قلعہ کے ایک جھروکہ سے عوام سے فریاد کی کہ اُسے بچائیں، کیونکہ شاہ ترکان اس کی جان کے درپے ہے۔ لوگوں کا بڑا اجتماع تھا۔ فیروز اور شاہ ترکان کی ٹولی سے عوام پہلے ہی بیزار تھے۔ رضیہ کے اس اچانک اور غیر معمولی مظاہرے کا فوری اثر ہُوا اور عوام نے بغاوت برپا کر دی۔ دارالسلطنت کے تُرک امراء اور فوج نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ چنانچہ اس سے قبل کہ فیروز شاہ واپس دہلی آئے، عوام نے شاہ ترکان کو حراست میں لے لیا اور رضیہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ رُکن الدین فیروز شاہ آیا تو اُسے بھی گرفتار کر کے ۹ نومبر ۱۲۳۶ء کو قتل کر دیا۔ وہ صرف چھ ماہ اُنتیس ۲۹ دن برسرِ اقتدار رہا۔

Marfat.com

سُلطان رضیہ

(۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۰ء)

"میرے بیٹے جوانی کے نشے میں مخمور، عیش و نشاط کے رسیا ہیں اور اُن میں کوئی بھی اُمورِ سلطنت کی انجام دہی کی اہلیت نہیں رکھتا۔ میری موت کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ میری اولاد میں سے رضیہ سے زیادہ کوئی بھی منصبِ جہانبانی کے لیے موزوں نہیں ہے۔"

(ایلتُتمش)

سُلطان رضیہ سُلطان ایلتُتمش کی بڑی لڑکی تھی۔ وہ پہلی مسلمان خاتون ہے، جس نے تاج شاہی پہنا۔ وہ اہالیانِ دہلی کی مدد سے نومبر ۱۲۳۶ء میں سریر آرائے سلطنت ہوئی۔ اُس نے سلطان جلال الدین کا لقب اختیار کیا۔ تخت نشینی کی رسم میں تختِ شاہی اور اہلِ دربار کے درمیان پردہ حائل تھا۔ ایلتتمش کی مانند وہ نہایت دانشمند اور دُور اندیش تھی۔ وہ حُسن و جمال کا پیکر اور شکل و صورت میں اپنے باپ سلطان ایلتتمش کے مشابہ تھی۔ وہ مضبوط قوتِ ارادی کی مالک تھی۔ عورت ہونے کے باوجود اُس نے شاہانہ جاہ و جلال برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی۔ ابتداء میں اُس نے پردہ میں رہ کر اُمورِ سلطنت کو انجام دیا اور سیاسی و انتظامی مسائل کو سُلجھایا، لیکن بعد میں اُس نے پردہ کے ساتھ ساتھ نسوانی لباس پہننا ترک کر دیا اور مردانہ لباس پہن کر دربار منعقد کرنا شروع کر دیا۔ وہ بازاروں میں بے نقاب ہاتھی پر سوار نکلتی اور میدانِ جنگ میں مردانہ لباس میں افواج کی قیادت کرتی تھی۔ طبقات ناصری کا مصنف منہاج سراج لکھتا ہے کہ

"رضیہ ایک عظیم، عاقل، عادل، کریم النفس، علم پرور، عدل گستر، رعیت پرور اور عسکری ذہانت کی حامل حکمران تھی۔ وہ ایک کامیاب اور لائق حکمران کی جملوں صلاحیتوں سے کما حقہٗ مزین تھی۔ لیکن ان تمام صلاحیتوں سے اُس کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔"

عورت ہونا اُس کے لیے مصیبت بن گیا۔ اُمرا اور قدامت پسند عوام جو پہلے ہی نسوانی اقتدار کے مخالف تھے، اب رضیہ کی بے پردگی اور بیباکی کو دیکھ کر اور بھی مخالف ہو گئے۔ اس سے ملک میں جا بجا بغاوتیں رونما ہوئیں۔ راجپوتوں نے بھی اس بدنظمی اور انتشار سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مرکز کی اطاعت سے منہ موڑ لیا۔ چنانچہ رنتھمبور اور گوالیار کے قلعے سلطنتِ دہلی کی سیادت سے آزاد ہو گئے۔ ان پُرآشوب حالات کے باوجود سُلطان رضیہ نے اپنی تنظیمی اور عسکری ذہانت کا مظاہرہ

۵ طبقات ناصری مصنفہ منہاج سراج

Marfat.com

کیا، اور جلد ہی باغیوں کی گوشمالی کر کے تمام ملک میں نظم وضبط اور امن وامان بحال کیا۔ سندھ اور بنگال کے حکام کو اطاعت گذار بنایا۔ اُس نے اپنے عہدِ حکومت میں نئے سکے جاری کئے، جن پر "السلطان اعظم رضیۃ الدنیا والدین اور عمدۃ النسوان" کندہ تھا۔ وہ تین سال تک تختِ دہلی پر متمکن رہی۔

قرامطہ کی فتنہ آرائی

۱۲۳۷ء

سلطان رضیہ کے عہد کے ابتدائی ایام میں قرامطی مذہب کے ایک پیشوا مولانا نور ترک نے اپنے ہم خیال لوگوں کو گجرات، سندھ اور دوآب کے دور ودراز علاقوں سے بلا کر نواحِ دہلی میں جمع کیا اور حنفی وشافعی علماء کے خلاف محاذ قائم کر کے ۴ مارچ ۱۲۳۷ء کو ایک ہزار قرامطیوں کی جمعیت میں نمازِ جمعہ کے وقت جامع مسجد دہلی پر دو جانب سے دھاوا بول دیا اور متعدد نمازیوں کو شہید کر دیا۔ لیکن امراء اور شاہی دستوں نے پہنچ کر انہیں گھیر لیا اور سب کو تہہِ تیغ کر دیا۔ لیکن مولانا نور ترک بچ گئے تھے اور آخری عمر میں مکہ مکرمہ میں جا بسے۔

امراءِ چہلگانی کی بغاوت

سلطان التمش کے زمانے سے امراءِ چہلگانی نے کافی زور پکڑ لیا تھا۔ وہ سلطنت کے اہم عہدوں پر متعین تھے۔ یہ ترک امراء جو معمولی غلاموں سے ترقی کر کے امارت کے درجے تک پہنچے تھے، بہت جاہ پسند واقع ہوئے تھے اور ذاتی اجارہ داری اور اقتدار کے خواہاں تھے۔ وہ اس امر کے متمنی تھے کہ حاکمِ وقت اُن کے زیرِ اثر کٹ پتلی بن کر رہے۔ ابتدا میں وہ سلطان رضیہ کے تابع فرمان اور وفادار رہے، لیکن بعد ازاں انہوں نے پے در پے بغاوتوں اور سازشوں سے ملکی امن وامان کو تباہ وبرباد کر کے رکھ دیا۔

رضیہ معمولی عورت نہ تھی۔ وہ ایک غیر معمولی شخصیت کی مالک، فہم وفراست، لیاقت اور بلند حوصلے کی پیکر تھی۔ وہ امراء کے سہارے حکومت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ اُس کی طبیعت کی اُفتاد ایسی تھی کہ وہ دوسروں کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بن کر رہے۔ وہ حکومت کے جملہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی تھی۔ اسی زمانے میں رضیہ نے جمال الدین یاقوت نامی ایک حبشی غلام پر کچھ خصوصی عنایات کیں۔ ڈاکٹر حبیب اللہ کی رائے ہے کہ اس امتیازی سلوک کی نوعیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ رضیہ نے اپنا اقتدار بڑھانے کی غرض سے ایک غیر ترک کو ترکوں پر فائز کیا۔ ترک امراء نے حکومت کو ایک اچھا خاصا اجارہ بنا رکھا تھا۔ اس اجارہ کو توڑنے کی یہی صورت تھی کہ غیر ترکوں کو آگے بڑھایا جائے۔ رضیہ نے یاقوت کو امیرِ آخور کا عہدہ دیا اور بعد ازاں امیر الامراء کے خطاب سے نوازتے ہوئے اُسے اپنا مشیرِ خاص بنا لیا۔

ترک اُمراء کو یاقوت کا روز افزوں اقتدار ناگوار گذرا اور انہوں نے رضیہ کی خفیہ طور سے مخالفت شروع کر دی۔ وزیرِ مملکت نظام الملک محمد جنیدی نے اطاعتِ شاہی سے منہ موڑتے ہوئے ملک

Marfat.com

علاؤالدین جانی، ملک سیف الدین کوچی، ملک عزّ الدین کبیر خاں عیاض اور ملک عزّ الدین محمد سالاری کو دہلی طلب کر کے رضیہ کے خلاف بغاوت برپا کر دی۔ اس پر رضیہ نے حاکم اودھ ملک تغیر الدین تغیانی کو اس بغاوت کو فرو کرنے کا حکم دیا لیکن جونہی اُس نے دریائے گنگا کو عبور کیا، باغی امراء نے اُسے گرفتار کر لیا۔ اب رضیہ سلطان دہلی سے نکل کر دریائے جمنا کے کنارے جیمور زن ہو گئی جہاں فریقین کے مابین کئی جھڑپیں ہوئیں۔ بالآخر رضیہ نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے باغی امراء کے مابین پھوٹ ڈال دی۔ ملک عزّ الدین محمد سالاری اور ملک عزّ الدین کبیر خاں عیاض کو اپنے ساتھ ملا لیا اور پھر اس بات کا اس زور شور سے اعلان کیا کہ دوسرے امراء پریشان ہو گئے اور انہیں ایک دوسرے پر اعتماد نہ رہا۔ اس پر طرہ یہ کہ اُن کی آپس کی رقابتیں بھڑک اٹھیں اور ان کی جمعیت جلد ہی منتشر ہو گئی۔ چنانچہ امراء بددل ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ شاہی فوج نے تعاقب کر کے ملک سیف الدین کوچی اور اُس کے بھائی فخر الدین کو گرفتار کر کے ہلاک کر دیا۔ ملک علاؤالدین جانی بھی مارا گیا۔ لیکن نظام الملک محمد جنیدی کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور سرمور کی پہاڑیوں میں جا چھپا۔ بالآخر وہیں فوت ہو گیا۔

اس بغاوت کے فرو ہوتے ہی رضیہ کا اقتدار دوبارہ قائم ہو گیا، اور لکھنوتی سے دیبل تک سب گورنروں نے اُس کی اطاعت قبول کر لی۔ اب سلطان رضیہ نے ملکی نظم و نسق کو سنوارنے کی طرف خاص توجہ دی۔ اُس نے خواجہ مہذب الدین کو نظام الملک کے خطاب سے نواز کر قلمدانِ وزارت سونپا، اور ملک عزّ الدین کبیر خاں عیاض کو لاہور کا صوبیدار مقرر کیا۔ اسی طرح ملک اختیار الدین اینگین کو امیر حاجب مقرر کیا۔ ۱۲۳۹ء میں حاکم لاہور ملک عزّ الدین کبیر خاں عیاض نے رضیہ کے مخالفین کے ساتھ مل کر بغاوت کر دی۔ لیکن رضیہ نے اپنی فراست سے کام لیتے ہوئے اُس کی بغاوت کو کچل دیا۔ نتیجتاً ملک عزّ الدین کبیر خاں نے معافی مانگ کر اطاعت قبول کر لی۔ رضیہ نے فیاضی سے کام لیتے ہوئے اُسے امارتِ لاہور کے منصب پر بحال رکھا اور مارچ ۱۲۴۰ء کو سلطان رضیہ واپس دہلی آ گئی۔

التونیہ کی بغاوت
۱۲۴۰ء

اب باغی امراء کی قیادت بٹھنڈہ کے حاکم ملک اختیار الدین التونیہ نے سنبھال لی کیونکہ وہ ملک یاقوت کے روز افزوں اختیار و اقتدار سے سخت نالاں اور برافروختہ تھا۔ چنانچہ اُس نے سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس پر رضیہ ۱۰ اپریل ۱۲۴۰ء کو لشکرِ کثیر کے ساتھ دہلی سے نکلی لیکن ابھی وہ بٹھنڈہ کے قریب ہی پہنچی تھی کہ شاہی فوج کے ترک امراء نے آغازِ جنگ سے قبل ہی بغاوت کر کے ملک جمال الدین یاقوت کو ہلاک کر دیا اور رضیہ سلطان کو قید کر کے ملک التونیہ کے حوالے کر دیا۔ اُس نے اُسے بٹھنڈہ کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔

Marfat.com

معزالدین بہرام شاہ
۱۲۴۰ء تا ۱۲۴۲ء

جب رضیہ کی گرفتاری کی خبر دہلی پہنچی تو امیر حاجب ملک اختیارالدین ایتگین اور دوسرے ترک اُمراء نے ۲۳ اپریل ۱۲۴۰ء کو ایلتتمش کے تیسرے بیٹے بہرام کو تخت پر بٹھا دیا۔ ایتگین نے تمام امورِ ملکی اپنے ہاتھ میں لے کر من مانی کارروائیاں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ وزیرِ سلطنت مہذب الدین بھی اُس کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا۔ اُس نے بہرام کی بہن سے شادی کر لی اور شاہانہ انداز اختیار کر لئے۔ بہرام کو ان باتوں پر سخت طیش آیا۔ چنانچہ اُس نے ۲۹ جولائی ۱۲۴۰ء کو اپنے دو معتمد ترکوں کے ذریعے ایتگین کو ہلاک کروا دیا، اور ملک بدرالدین سنقر کو امیر حاجب مقرر کیا۔ اُس نے بعض علماء کے تعاون سے بہرام شاہ کو معزول کرنا چاہا تو سلطان نے اُسے بدایوں میں گورنر مقرر کر دیا۔ مگر جب وہ شاہی اجازت کے بغیر دہلی چلا آیا تو سلطان نے اُسے قتل کروا دیا۔

رضیہ کا انجام
اکتوبر ۱۲۴۰ء

رضیہ کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے اور اُس کی جگہ تختِ حکومت پر بہرام شاہ کو بٹھانے میں سب سے زیادہ حصہ ملک التونیہ حاکم بٹھنڈہ کا تھا، مگر اُسے کچھ بھی نہ ملا۔ ایتگین کے قتل سے اُس کی رہی سہی اُمید بھی جاتی رہی۔ چنانچہ وہ حصولِ اقتدار کے لئے نئے منصوبے بنانے لگا۔ اِس دوران سلطان رضیہ بٹھنڈہ کے قلعہ میں نظر بند تھی اور سیاسی حالات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ التونیہ نے اُسے حکومتِ دہلی کے خلاف استعمال کرنے کی غرض سے باہمی تعاون اور حصولِ اقتدار کے لیے اُس سے بات چیت کی۔ بالآخر دونوں کے مابین ایک معاہدہ طے پایا۔ التونیہ نے اگست ۱۲۴۰ء میں رضیہ سے شادی کر لی۔ اور دونوں نے تختِ دہلی کی بازیابی کے لیے پھر ایک بار قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور کھوکھروں اور جاٹوں پر مشتمل ایک بھاری فوج کے ساتھ دہلی پر یورش کر دی۔ لیکن وہ آزمودہ کار شاہی فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ راستہ میں اُن کی سپاہ نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔ کیتھل (کرنال) کے قریب جنگل میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے کہ ہندو ڈاکوؤں نے اُن کے بیش قیمت لباس کے لالچ میں ۱۴ اکتوبر ۱۲۴۰ء کو انہیں مار ڈالا۔ شاہی فوج جو اُن کے تعاقب میں تھی، اُن کی لاشوں کو پہچان کر دہلی لے گئی۔

التونیہ کے متعلق تو معلوم نہیں کہ وہ کہاں سپردِ خاک ہوا۔ البتہ آثارُ الصنادید کے مصنف سرسید احمد خان کے بیان کے مطابق رضیہ سلطان کا مقبرہ دہلی (شاہجہان آباد) کے ترکمان دروازے کے اندر محلہ بلبلی خانہ کے ایک احاطہ میں واقع ہے۔

اِس طرح بلند ہمت اور مہم جو رضیہ سلطان کی زندگی کا خاتمہ ہوا، جو صرف تین سال چھ ماہ اور چھ دن تک برسرِ اقتدار رہی۔

Marfat.com

بہرام شاہ کا انجام
۱۲۴۲ء

ایتگین اور سنقر کے قتل کے بعد تمام ترک اُمراء بہرام شاہ سے برگشتہ ہو گئے۔ بہرام کی بے عنوانیوں سے علماء بھی نالاں تھے۔ چنانچہ ترک اُمراء اور علماء نے مل کر سلطان کے خلاف محاذ بنالیا۔ وزیر بھی خفیہ طور پر اُن کے ساتھ مل گیا۔ بہرام شاہ نے شیخ الاسلام قطبُ الدین کو مفاہمت کے لیے بھیجا، لیکن وہ بھی باغی فوج کے ساتھ مل گیا۔ باغی فوج نے دہلی پہنچتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مہذب الدین کے حامیوں نے شہر کے اندر بھی افراتفری اور ہڑبونگ مچادی۔ فوج نے شہر پر قبضہ کر کے بہرام شاہ کو گرفتار کر لیا اور ۱۹ مئی ۱۲۴۲ء کو اُسے قتل کر دیا۔ بہرام شاہ نے دو سال اور ڈیڑھ ماہ حکومت کی۔ وہ ایک نڈر اور خونخوار انسان ہونے کے باوجود اعلیٰ اخلاق کا حامل اور سادہ زندگی بسر کرنے کا خوگر تھا۔

علاؤالدین مسعود شاہ
۱۲۴۲ء تا ۱۲۴۶ء

بہرام شاہ کے قتل کے بعد ترک امرائے چہلگانی کا زور انتہا کو پہنچ گیا۔ چنانچہ انہی میں سے ایک سرکردہ امیر ملک عزالدین بلبن کشلو خاں سربرآرائے سلطنت ہوا۔ لیکن اکثر امراء نے باہمی حسد کی بنا پر اُس کی حکمرانی کو تسلیم نہ کیا۔ لہٰذا ۱۰ مئی ۱۲۴۲ء کو ایلتتمش کے پوتے اور سلطان رکن الدین فیروز شاہ کے کمسن بیٹے علاؤالدین مسعود شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔

مسعود شاہ محض برائے نام بادشاہ تھا، اصل اقتدار امرائے چہلگانی کے ہاتھوں میں تھا۔ اب مناصب کی دوبارہ تقسیم کی گئی۔ نجم الدین ابوبکر کو وزیر اور غیاث الدین بلبن کو امیر حاجب کے عہدے پر متعین کیا گیا۔ ابوبکر نیک منش انسان تھا اور ترک امراء کا تابعدار تھا۔ بلبن غیر معمولی قابلیت اور شخصیت کا مالک تھا۔ وہ جلد ہی امورِ سلطنت پر حاوی ہو گیا۔ اُس نے اپنی تنظیمی لیاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملکی نظم و نسق کو درست کیا اور سلطنت میں امن و امان قائم کیا۔ اُس نے امرائے چہلگانی کے زور کو کم کرنے اور حصولِ اقتدار کی باہمی کشمکش سے اُن کے دھیان کو ہٹانے کے لیے اُن کی توجہ کو سرکش راجپوتوں اور منگولوں کے استیصال کی طرف مبذول کر دیا۔ بلبن کی یہ پالیسی کامیاب ثابت ہوئی اور ترک سلطنت کے زوال اور دبدبہ میں اضافہ ہوا۔ نیز ملک میں امن و سکون کی فضا بحال ہو گئی۔

علاؤالدین مسعود شاہ نے اپنے عہد کے آخری ایام میں مشکوک العنان ہو کر تشدد کا رویہ اختیار کیا اور اُمورِ جہانبانی سے غافل ہو کر عیش و نشاط اور مے نوشی کا دلدادہ بن کر رہ گیا۔ نہایت معمولی الزامات کی بنا پر اُس نے کئی ایک ترک امراء کو قتل کروا دیا۔ اس پر امرائے چہلگانی سلطان سے بدظن ہو گئے اور انہوں نے دورِ جبر و استبداد کو ختم کرنے کے لیے ایک سازش کے تحت ۱۰ جون ۱۲۴۶ء کو اُسے گرفتار کر کے نظر بند کر دیا اور چند روز بعد اُسے قتل کر دیا۔ اس طرح اُس کا چار سال ایک ماہ اور ایک دن کا دورِ حکومت ختم ہوا۔ بعد ازاں امراء نے سلطان ایلتتمش کے سب سے چھوٹے بیٹے ناصرالدین محمود کو بدایوں سے دہلی بلا کر تختِ دہلی پر بٹھا دیا۔ اس کارروائی میں غیاث الدین بلبن کا بڑا ہاتھ تھا۔

Marfat.com

ناصرالدین محمود

(۱۲۴۶ء تا ۱۲۶۶ء)

"ناصرالدین محمود نہایت نیک، رحمدل اور خدا ترس بادشاہ تھا۔ وہ علم و ادب کا مربی، غریبوں اور ناداروں کا سرپرست، درویشانہ زندگی کا خوگر اور عیش و نشاط کی شاہانہ زندگی سے متنفر تھا۔ صرف قرآن حکیم کی کتابت کی اُجرت پر گذر بسر کرتا تھا۔"[1]

(ایشوری پرشاد)

ناصرالدین محمود[2] ۱۰ جون ۱۲۴۶ء کو قصرِ سبز (دہلی) میں تخت نشین ہوا۔ وہ نہایت شریف النفس، خدا ترس، اربابِ علم و دانش کا مربی اور منصف مزاج بادشاہ تھا۔ تخت نشینی سے قبل وہ بدایوں کا گورنر تھا۔ اُسے امورِ سلطنت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ زُہد و تقویٰ اور ریاضت و قناعت کا مجسمہ تھا۔ اُس کے شب و روز عبادتِ الٰہی، قرآن خوانی اور قرآن نویسی میں بسر ہوتے تھے۔ انتہائی سادگی پسند اور درویشانہ طبیعت کا مالک تھا۔ اُس کا رجحانِ طبع بادشاہی سے زیادہ فقیری کی طرف مائل تھا۔ اُسکی عکہ خود اپنے ہاتھ سے کام کاج کرتی تھی۔ بقول فرشتہ "شاہی خزانے سے پھوٹی کوڑی کا بھی روادار نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو بیت المال کا امین سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ کھانا پکاتے ہوئے اُس کی بیگم کے ہاتھ جل گئے تو اُسے ایک خادمہ تک کی سہولت میسّر نہ آسکی۔" ناصرالدین محمود کی سادہ مزاجی اور نیک طبعی کا ذکر کرتے ہوئے فرشتہ مزید لکھتا ہے کہ:

"ایک مرتبہ سلطان اپنے ہاتھ کا کتابت شدہ ایک قرآن کسی دوست کو دکھلا رہا تھا۔ اُس نے ایک غلطی کی طرف اشارہ کیا۔ سلطان نے فوراً اُس لفظ کے چاروں طرف ایک دائرہ کھینچ لیا تاکہ بعد میں غلطی درست کرلے۔ لیکن جب وہ شخص چلا گیا تو اُس نے چاقو کی نوک سے اُس دائرہ کو مٹا دیا اور لفظ کو صحیح نہیں کیا۔ ایک غلام جو یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، سلطان سے دائرہ بنانے کی وجہ اور غلطی درست نہ کرنے کا سبب دریافت کیا تو سلطان نے جواب دیا کہ اُس کا لکھا ہوا لفظ غلط نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنے ملاقاتی کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے دائرہ لگا دیا۔ کاغذ پر بنایا ہوا دائرہ آسانی سے

---

[1] "میڈیول انڈیا" صفحہ ۱۷۷

[2] ناصرالدین محمود ایلتتمش کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور اپنے سب سے بڑے بھائی کا ہمنام تھا، جس نے ۱۲۲۸ء میں عین عالمِ جوانی میں وفات پائی۔

Marfat.com

مٹایا جاسکتا ہے لیکن کسی کے دل پر سے نشان مٹانا مشکل ہوتا ہے۔"

سلطان اپنے باپ ایلتتمش کی مانند فیاض اور علم و ادب دوست بابِ علم و دانش کا بڑا سرپرست تھا منہاج سراج کی مشہورِ زمانہ تاریخ "طبقاتِ ناصری" اُسی کے دور میں مرتب ہوئی اور اسی کے نام سے منسوب ہوئی۔

اُس کی تخت نشینی پر اہالیانِ دہلی بہت خوش تھے۔ اُس کے سریر آرائے سلطنت ہونے سے حکومت اور ترک امرائے چہلگانی کے مابین حصولِ اقتدار کی کشمکش جو سلطان شمس الدین ایلتتمش کی وفات کے بعد سے شروع ہوئی تھی وقتی طور پر ختم ہوگئی۔ دگرگوں حالات کے پیشِ نظر ترک سلطنت کو ایک ایسے سلطان کی ضرورت تھی جو مخالف قوتوں کو سختی سے کچل کر ملک میں امن و امان اور نظم و ضبط بحال کر سکے۔ گو ناصرالدین محمود کا انتخاب اس منصب کے لیے غیر موزوں تھا، لیکن وہ خوش قسمت ضرور تھا کہ اُسے الغ خاں غیاث الدین بلبن کی صورت میں ایک ایسا وزیر مل گیا جس نے یہ کام بطریقِ احسن انجام دیا۔ بلبن امرائے چہلگانی کا سرکردہ لیڈر تھا۔ سلطان نے اسے وزیر اور اُس کے چھوٹے بھائی کشلو خاں کو امیرِ حاجب اور اُس کے چچازاد بھائی شیر خاں کو لاہور اور بٹھنڈہ کا گورنر مقرر کیا۔

بلبن بحیثیتِ وزیر
۱۲۴۶ء تا ۱۲۴۹ء

سلطان ناصرالدین محمود کی تخت نشینی کے وقت مُلک بدنظمی اور انتشار کا شکار تھا۔ شاہی دربار امرائے چہلگانی کی سازشوں کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ حصولِ اقتدار کی باہمی کشمکش اور آئے دن کی بغاوتوں نے سلطنت کے دبدبہ و وقار کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ دوآب کے ہندو اور مسلمان سرکش ہو کر بغاوت پر اُتر آئے تھے۔ شمال مغربی سرحد منگولوں کے پے در پے حملوں کی زد میں تھی۔ ان پُرآشوب حالات پر قابو پانا ناصرالدین محمود جیسے درویش طبع اور شریف النفس بادشاہ کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن اُس کے لائق اور مدبر وزیر بلبن نے ان تمام حالات پر قابو پا کر مُلک میں مکمل امن و سکون کی فضا قائم کی اور اس کے عہدِ حکومت کو ازحد کامیاب ثابت کر دکھایا۔

ناصرالدین ابھی تخت نشین ہوا ہی تھا کہ سرحد پر منگولوں کی آمد کی خبر ملی۔ اِدھر کھوکھروں نے بھی بغاوت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس پر مارچ ۱۲۴۶ء میں ناصرالدین اپنے وزیر غیاث الدین بلبن کو ساتھ لے کر دہلی سے روانہ ہوا۔ سرحدوں کے تحفظ کا انتظام کرنے کے علاوہ سرکش کھوکھروں کی سرکوبی کر کے واپس ہوا۔ اسی سال سلطان نے کشلو خاں (الہ آباد) میں خیمہ زن ہو کر ہندو کٹیہر کے باغی راجپوتوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ ۱۲۴۹ء میں بلبن کو ننھمیور اور میوات کے باغی راجپوتوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ ان مہمات سے نہ صرف ملک میں امن و امان قائم ہو گیا، ڈکیتی و راہزنی کا انسداد ہوا اور شاہراہیں محفوظ ہو گئیں بلکہ حکومتِ دہلی کا رعب و داب پھر سے بحال ہو گیا۔ اگست ۱۲۴۹ء میں سلطان ناصرالدین نے بلبن کی

Marfat.com

لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ اس سے بلبن کے وقار میں بے حد اضافہ ہوا۔ اور وہ امورِ سلطنت میں سیاہ و سپید کا مالک بن گیا۔

بلبن بحیثیت نائب المملکت
۱۲۴۹ء تا ۱۲۵۳ء

۱۲ اکتوبر ۱۲۴۹ء کو ناصرالدین محمود نے بلبن کو نائب المملکت کے معزز عہدے پر متعین کیا اور الغ خان اعظم کے خطاب سے نوازا۔ اس سے بلبن کا اقتدار منتہائے عروج کو پہنچ گیا۔ سلطان نے بلبن کے چچازاد بھائی شیر خاں کو خانِ معظم بناتے ہوئے پنجاب اور ملتان کا صوبیدار مقرر کیا۔ تاکہ حملہ آور منگولوں کی سرگرمیوں کا انسداد کیا جا سکے۔

۱۵ اکتوبر ۱۲۴۹ء کو سلطان نے بلبن کے بھائی ملک سیف الدین ایبک کشلو خاں کو امیرِ حاجب کے اہم عہدے پر متعین کیا۔ سلطنتِ دہلی کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوآب کے ہندوؤں نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ ۱۲۵۰ء میں بلبن نے اُن کی گوشمالی کی۔ اور دہلی سے کالنجر تک علاقے پر دوبارہ تسلط قائم کیا۔ ۱۲۵۱ء میں سلطان نے گوالیار، چندیری، نارواڑ اور مالوہ کے خلاف کامیاب فوجی کارروائی کی، اور مالوہ کے راجہ چاہڈ دیو کو شکست دے کر اطاعت گذار بنایا۔ اس مہم کے دوران بلبن نے اپنی بہادری اور عسکری ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلواڑ اور نارواڑ کے قلعوں پر قبضہ کیا۔ ۱۲۵۱ء میں ہی ملک عزالدین کشلو خاں نے ناگور میں علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ لیکن شاہی افواج نے بغاوت کو کچل کر اُسے اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

بلبن کی معزولی اور دوبارہ تقرری
۱۲۵۳ء

بلبن کے روز افزوں اقتدار اور اس پر سلطان ناصرالدین محمود کے بہت زیادہ اعتماد نے بعض امراء چہلگانی کو بلبن کا حاسد بنا دیا۔ اگرچہ وہ خود امرائے چہلگانی کا ایک سرکردہ لیڈر رہتا، لیکن درپردہ امرائے چہلگانی اُس کے مخالف ہو گئے تھے اور اس کے اقتدار کو ختم کر دینے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ بلبن کے مخالفین میں وہ ترک امراء پیش پیش تھے جنہیں کوئی اچھا منصب عطا نہیں کیا گیا تھا۔ اُن کے علاوہ غیر ترک امراء اور ہندی مسلمان امراء بھی اُس کے زوال کے خواہاں تھے، کیونکہ وہ ترکوں کی اجارہ داری اور تمام کلیدی عہدوں پر اُنہی کے تصرف کو ناپسند کرتے تھے۔ ۱۲۵۲ء کے دوران جب بلبن سلطان ناصرالدین محمود کے ہمراہ پنجاب کے علاقے میں شورش فرو کرنے گیا ہوا تھا، ان مخالف عناصر نے سازش کر کے اُسے ہلاک کرنا چاہا لیکن ناکام رہے۔ بہرحال وہ اس کے خلاف سلطان کے کان بھرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ اُن کے اُکسانے پر سلطان نے بلبن کے بھائی کشلو خاں اور شیر خاں کو معزول کر دیا اور بلبن کو اپنی جاگیر (ہانسی) میں جانے کا حکم دیا۔ لیکن مخالفین کی اس اُمید و توقع پر کہ بلبن حکمِ شاہی کی تعمیل نہیں کرے گا، اور وہ بغاوت کا الزام لگا کر اُسے

Marfat.com

قتل کرا دیں گے، پانی پھر گیا۔ کیونکہ بلبن سلطان کے حکم کی تعمیل میں بلا چون و چرا ہانسی چلا گیا۔

جولائی ۱۲۵۳ء میں آئین الملک نظام الملک ہندی کو وزیر اور مخالف گروہ کے سردار عمادالدین ریحان کو جو ایک نو مسلم خواجہ سرا تھا، بلبن کی جگہ نائب السلطنت مقرر کیا گیا۔ اور سلطنت کے کلیدی عہدوں پر بھی عمادالدین ریحان کے حامیوں کو متعین کر دیا گیا۔ اگرچہ بلبن اور اُس کے حامی بغاوت برپا کر سکتے تھے مگر انہوں نے خاموشی سے شاہی احکام کی تعمیل کی اور دوبارہ برسرِ اقتدار آنے اور مخالفین سے بدلہ لینے کے لیے کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگے۔

عمادالدین نائب السلطنت کی حیثیت سے اپنی منصبی ذمہ داریوں سے بطریق احسن عہدہ برآ نہ ہو سکا اور دو سال کے عرصہ میں ہی اُس کی نا اہلی کے نتائج سامنے آنے لگے۔ چنانچہ ملک میں انتشار و بدنظمی کی فضا عام ہونے لگی اور صوبوں میں بغاوتوں کے آثار نظر آنے لگے۔ سلطان ناصرالدین محمود کشت و خون کے خلاف تھا اسلئے ۱۲۵۴ء میں اُس نے بلبن کو دوبارہ نائب السلطنت کے عہدے پر بحال کر دیا۔

زمامِ اقتدار دوبارہ سنبھالتے ہی بلبن نے اپنے حریفوں کا خاتمہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اُس نے حریف ترک امراء کا قلع قمع کرنے، منگول حملوں سے سرحدوں کے تحفظ اور ہندو راجپوت راجاؤں کی شورشوں کا انسداد کر کے اُن پر حکومت کا رعب و داب قائم کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کی۔ اُس نے سب سے پہلے اپنے جرنیل تاج الدین سنجر کو ریحان کی گوشمالی پر مامور کیا، جس نے اُسے شکست دے کر اور گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

ابھی بلبن مخالف امراء کی سرکوبی سے بمشکل فارغ ہوا تھا کہ منگولوں نے نوئین ساری کی سرکردگی میں ملتان پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے شہر کا محاصرہ کر کے نہ صرف فصیلِ شہر کو نقصان پہنچایا بلکہ کچھ لوٹ مار بھی کی۔ مگر جب اُن کی سرکوبی کے لیے شاہی لشکر شیر خاں کی زیرِ قیادت ملتان پہنچا تو وہ میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

ازاں بعد ۱۲۵۹ء میں اُس نے دس ہزار فوج کی معیت میں سرکش میواتیوں کے خلاف فیصلہ کن فوجی کارروائی کی کیونکہ انہوں نے لوٹ مار اور راہزنی سے دہلی کے قرب و جوار میں امن و امان کو غارت کر دیا تھا۔ بلبن نے انہیں شکست دے کر بیشتر کو قتل کرا دیا اور ڈھائی سو کو قیدی بنا کر اور بہت سے گھوڑے اور اکیس لاکھ چاندی کے ٹنکے لے کر واپس دہلی آ گیا۔

منگول حملوں کا سدِ باب کرنے اور سرحدوں کو محفوظ بنانے کے لیے بلبن نے بلوچستان کی سرحد پر بہت سے مضبوط قلعے تعمیر کروائے اور اُن میں ایک بھاری فوج متعین کی نیز اندرونِ ملک بغاوتوں کے خلاف مؤثر اقدامات کئے گئے۔ سلطنتِ دہلی کے کھوئے ہوئے دبدبہ و وقار کو دوبارہ بحال کرنے کی پوری کوشش کی۔

ناصرالدین محمود کی وفات
۱۸ فروری ۱۲۶۶ء

سلطان ناصرالدین محمود نے ۱۸ فروری ۱۲۶۶ء کو وفات پائی۔ ہمعصر تواریخ اس نیک دل اور درویش منش بادشاہ کی

Marfat.com

موت کے اسباب کے بارے میں خاموش ہیں ۔ بلکہ وہ ۱۲۶۰ء سے ۱۲۶۶ء تک کے وقوع پذیر ہونے والے واقعات پر بھی روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں۔ ناصرالدین کے انتقال کے بعد امراء نے متفقہ طور پر بلبن کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ چونکہ ناصرالدین محمود لاولد تھا، اس لیے بلبن کا تختِ دہلی کا وارث قرار پانا ایک قدرتی امر تھا۔

Marfat.com

سُلطان غیاثُ الدّین بلبن

(۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء)

"بلبن ایک عظیم سپاہی، اعلیٰ درجے کا حکمران اور مدبر سیاستدان تھا۔ اُس نے نوزائیدہ مسلم حکومت کو نازک ترین وقت میں سنبھالا دیا۔ قرونِ وسطیٰ کی تاریخِ ہند میں اُسے ہمیشہ بلند مقام حاصل رہے گا۔"[1]

(ایشوری پرشاد)

ابتدائی حالات

سلطان غیاث الدین بلبن کا اصل نام بہاؤ الدین تھا۔ وہ سلطان ایلتتمش کی طرح البری ترک تھا۔ اس کا باپ ایک خان (سردار) تھا۔ منگولوں نے ترکستان پر حملہ کیا تو بلبن کا سارا خاندان منتشر ہوگیا۔ بلبن اور اُس کا بھائی کشلوخاں منگولوں کے ہاتھوں گرفتار ہوکر بغداد کے بازار میں بطور غلام فروخت ہوئے۔ بلبن کو خواجہ جمال الدین بصری نامی ایک تاجر نے خرید لیا اور کشلوخاں کو بغداد کے دربارِ خلافت میں متعین سلطان ایلتتمش کے سفیر اختیار الملک رشید الدین ابوبکر نے خرید لیا اور دہلی لے آیا۔ اس طرح دونوں بھائی ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ خواجہ جمال الدین بصری نے بلبن کو اولاد کی طرح پالا اور اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ ۱۲۳۲ء میں اُسے دہلی میں لاکر ایک سو غلاموں کی معیت میں سلطان ایلتتمش کے حضور پیش کیا۔ بقول فرشتہ، سلطان نے سب غلاموں کو خرید لیا لیکن بلبن کو اُس کی بدصورتی کی وجہ سے نہ خریدا۔ اس پر بلبن نے سلطان سے پوچھا کہ یہ غلام آپ نے کس لیے خریدے ہیں؟ سلطان نے جواب میں کہا: اپنے لیے۔ بلبن نے کہا کہ اتنے غلام اپنے لیے خریدے ہیں تو ایک خدا کے لیے بھی خرید لو۔ چنانچہ سلطان مسکرایا اور اُسے بھی خرید لیا۔ یہاں اپنے بھائی کشلوخاں کو سلطان کے غلاموں کے زمرے میں پاکر بلبن بہت خوش ہوا اور سجدۂ شکر بجالایا۔

سلطان ایلتتمش نے بلبن کی ذہانت سے متاثر ہوکر اُسے چہلگانی غلاموں میں شامل کرلیا۔ ابتداء میں اُسے فوج میں بطور بہشتی ملازم رکھا گیا۔ لیکن جلد ہی خاصہ دارِ سلطانی (KING'S PERSONAL ATTENDANT) مقرر ہوا۔ اور دو سال تک سلطان کی خدمت پر مامور رہا۔

بلبن سلطان مرحوم ایلتتمش کے چہلگانی غلاموں کی جماعت کا ایک سرکردہ رکن تھا۔ اس جماعت کے تمام ترک غلام ترقی کرکے حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز ہوئے اور امراء کہلائے۔ بلبن نے بھی بہت جلد ترقی کی منازل طے کیں اور چہلگانی امراء کا سرکردہ لیڈر بن گیا۔ اس نے امرائے چہلگانی کی طاقت کو توڑ کر اپنے شخصی اقتدار کے لیے راہ ہموار کی۔ رضیہ کے دورِ حکومت میں وہ میرِ شکار کے عہدہ پر متعین ہوا اور سلطان معزالدین بہرام شاہ کے دورِ اقتدار میں امیرِ آخور (LORD OF THE IM-PERIAL STABLES) مقرر ہوا۔ سلطان معزالدین بہرام کے خلاف ترک امراء نے

[1] ہسٹری آف میڈیول انڈیا صفحہ ۱۹۹

Marfat.com

علمِ بغاوت بلند کیا تو بلبن اِس میں پیش پیش رہا۔ ۱۲۴۴ء میں اُسے سلطان علاؤالدین مسعود شاہ کا امیرِ حاجب مقرر کیا گیا۔ اِسی اثنا میں منگول، سرحدِ برِّصغیر پر حملہ آور ہوئے تو بلبن نے اُن کا مناسب تدارک کیا۔ ۱۲۴۶ء میں سلطان ناصرالدین محمود تخت نشین ہُوا تو بلبن کو نہ صرف خانِ اعظم الغ خاں کا خطاب ملا بلکہ وہ نائب المملکت کے اہم ترین عہدہ پر بھی متعین ہُوا۔ جس پر وہ پورے اٹھارہ سال فائز رہا۔ بحیثیتِ نائب المملکت اُس نے نہ صرف نوزائیدہ ترک سلطنت کو استحکام بخشا اور سرکش ہندو راجگان اور سرداروں کا زور توڑ کر مُلک میں امن و امان کی فضا پیدا کی بلکہ ملکی دفاع کو مضبوط اور حکومت کے دبدبہ و وقار کو بحال کیا۔ سلطنتِ دہلی کے لیے اُس کی خدمات فقید المثال تھیں۔

تخت نشینی ۱۲۶۶ء

فروری ۱۲۶۶ء میں سلطان ناصرالدین محمود لاولد فوت ہُوا تو امرائے دربار نے متفقہ طور پر غیاث الدین بلبن کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ دربار میں اُس کی کوئی مخالفت نہ تھی۔ کیونکہ اُس نے پہلے ہی اپنے حریف اور رقیب اُمراء کے زور کو ختم کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں سلطان مرحوم شمس الدین ایلتتمش کے خاندان سے اُس کی قرابتداری بھی قائم ہو چکی تھی۔ بلبن کی تخت نشینی کے وقت مُلک بدنظمی کے دَور سے گذر رہا تھا۔ مرکزی حکومت کی قوت میں کمی آ گئی تھی۔ حکومت کا دبدبہ اس قدر کم ہو گیا تھا کہ لٹیروں کے گروہ کے گروہ ملک کی شاہراہوں پر دندناتے پھرتے تھے اور اتنے منہ زور ہو چکے تھے کہ دہلی کے قرب و جوار میں بھی لُوٹ مار مچانے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ دارالحکومت کی طرف آنے والے سوداگروں کو اکثر لوٹ لیا جاتا تھا۔ لوگ سرِشام اپنے گھروں سے باہر قدم رکھتے ڈرتے تھے۔ اس لئے بلبن نے حکومت کے انتظامی ڈھانچے کو بدلا اور حکومت کی پالیسی کو مندرجہ ذیل اہم امور پر استوار کیا:۔

۱۔ مرکزی حکومت کا استحکام، شاہی اقتدار اور وقار کی سربلندی اور اُمراء کی قوت کا خاتمہ۔

۲۔ ہندو راجاؤں اور سرداروں کی سرکشی اور باغیانہ عزائم کا مکمل استیصال کر کے ملک میں امن و امان کی فضا پیدا کرنا نیز ذرائع آمد و رفت کو قزاقوں اور راہزنوں کی دست بُرد سے محفوظ کرنا۔

۳۔ منگولوں کے حملوں کی روک تھام کر کے ملکی دفاع کو مضبوط تر بنانا۔

بلبن کا نظریۂ بادشاہت

بادشاہت اور حکومت کے متعلق بلبن کے افکار و نظریات خاص نوعیت کے تھے۔ جن کا اظہار وہ بقول ہمعصر مؤرخ ضیاءالدین برنی اکثر اپنے وزراء اور بیٹوں سے بھی کرتا رہتا تھا۔ بلبن کے نظریۂ بادشاہت اور سیاسی افکار پر عجمی اثر غالب تھا۔

بادشاہت کا مقام بلبن کی نگاہ میں عام سطح سے بہت بلند تھا۔ بلحاظِ اہمیت وہ امورِ سلطنت کی انجام دہی کو ایک عظیم ترین کام سمجھتا تھا۔ اُس کے نزدیک بادشاہ نائبِ خدا تھا۔ اور بادشاہت ایک خدائی عطیہ۔ اس کا قول تھا کہ بادشاہ کو کرۂ ارض پر خدا کے نمائندہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا

Marfat.com

دل خدا کی عظمت کا مظہر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بادشاہ کو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کارہائے نمایاں ادا کرنے کی ترغیب دیتا اور اُسے اپنی نوازشوں سے نوازتا ہے۔ ایک ناشکرا بادشاہ جلد ہی اپنی حیثیت کھو بیٹھتا ہے اُس کی جگہ خدا تعالیٰ ناتجربہ کار اور ناپسندیدہ شخص کو مسندِ اقتدار پر بٹھا دیتا ہے۔ ایک تابعدار اور متشکر بادشاہ کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے بادشاہ کو رحمتِ خداوندی کی خوشنودی کے لیے ہمیشہ اچھے کام کرنے چاہئیں کیونکہ اسی میں اُس کی فلاح ہے۔

بلبن کا قول تھا کہ بادشاہت سراپا اختیار و اقتدار، شان و شوکت اور عزت و جلال ہے۔ بادشاہ کی شخصیت کو وہ ایسی بلند حیثیت دینے کا قائل تھا کہ عوام کی گردنیں خود بخود اطاعت شعاری کے لیے جھک جائیں۔ اُس کا قول تھا کہ قتل و عقوبت سے عوام کو اپنا مطیع کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ پُرشکوہ شاہانہ خصوصیات سے اُن کے دلوں میں خوف و احترام کا جذبہ پیدا کر دیا جائے۔ لہٰذا ایک بادشاہ کو ہمیشہ مہم جو، انصاف پرور اور مشفق ہونا چاہیے۔ بادشاہت کے تحفظ کیلئے اُسے ہمیشہ اپنا وقار قائم رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ سطوت و شوکت، جاہ و جلال اور وقار و دبدبہ ہی بادشاہت کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور اگر وقارِ شاہی دوستی اور تعلقات کی بنا پر ختم ہو کر رہ جائے تو پھر حاکم اور محکوم میں کوئی حدِ امتیاز باقی نہیں رہتی۔ نتیجۃً رعایا خود سر اور باغی ہو جاتی ہے۔ اور مُلک میں نہ صرف انتشار اور بدنظمی پھیل جاتی ہے۔ بلکہ ملکی نظم و نسق تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ بادشاہ کا ذاتی کردار بلند ہونا نہایت ضروری ہے۔

تخت نشین ہونے سے قبل بلبن راگ و رنگ کا رسیا اور شاید و شراب کا شائق تھا، لیکن تختِ شاہی پر بیٹھتے ہی اُس میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔ اُس نے رقص و سرود اور مے نوشی کی محفلیں ایک دم ترک کر دیں۔ اُس کے سامنے جو صورتِ حال تھی۔ اُس کے پیشِ نظر عوام کو مطیع و فرمانبردار بنانا اور طبقۂ اُمراء کے دل میں قانون کے لیے عزت و اطاعت کا جذبہ پیدا کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ بلبن نے عوام کے دلوں میں اقتدار کے لیے عزت پیدا کر دی اور سرکش امراء پر دبدبۂ شاہی اور قانون کا خوف قائم کر کے بادشاہت کو عوام کے لیے ایک محافظ قوت کی شکل میں پیش کیا۔ اُمراء کو یقین ہو گیا کہ اگر وہ راہِ راست سے اِدھر اُدھر ہوں گے تو سلطانی قوت انہیں دبائے گی اور قرار واقعی سزا دے گی۔

بلبن کا نظریہ تھا کہ بادشاہ کو عوام کے ساتھ مخلوط و بے تکلف ہونے کی بجائے صاحبِ امتیاز ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اُس نے اپنا طریقِ حیات بالکل بدل دیا اور اپنی زندگی کو نیکی اور وقار کا ایک نمونہ بنا کر پیش کیا۔ دربارِ شاہی میں کبھی کسی شخص نے اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں دیکھی اور نہ ہی کسی فرد کو اُس کے حضور بے تکلف و متبسم ہونے یا ایک دوسرے کو مذاق کرنے کی جرأت تھی۔ وہ محل میں بھی بڑی شاہانہ تمکنت اور کروفر سے رہتا تھا۔ ذاتی وضعداری اور وقار کو اس درجہ ملحوظ رکھتا تھا

Marfat.com

کہ عام لوگ تو درکنار، اپنے خصوصی ملازمین کے سامنے بھی نہایت اعلیٰ شاہی لباس پہنے بغیر نہ آتا تھا۔
بلبن نے اپنا شاہانہ وقار بلند کرنے کی غرض سے دعویٰ کیا کہ وہ توران کے افسانوی بادشاہ افراسیاب کی اولاد سے ہے۔ دربار کی شان و شوکت اور ترتیب میں اُس نے ہمیشہ قدیم ایران کے درباروں کے نمونہ کو پیشِ نظر رکھا اور خود سرامیروں کے دلوں میں یہ حقیقت بٹھادی کہ اُن کا درجہ سلطان کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ شاہی دبدبے اور وقار کو قائم رکھنے کے لیے اُس نے سیستان سے قوی ہیکل پہلوان منگوائے جو دیکھنے میں بڑے خوف ناک معلوم ہوتے تھے، وہ دربار میں چمکتی ہوئی تلواریں سونتے ہوئے سلطان کی حفاظت پر مامور رہتے۔ خود بلبن مرصع تخت پر جلوہ گر ہوتا۔ اُس کا چہرہ پُرجلال و منوّر اور اُس کی داڑھی کافور کی طرح سفید تھی۔ دربارِ شاہی میں اُس کے رُعب اور جاہ و جلال کا یہ عالم ہوتا کہ دیکھتے ہی دل پر ہیبت طاری ہوجاتی۔ غیر ملکی سفیر دربار میں داخل ہوتے تو سطوتِ شاہی سے اُن کے حواس اور اوسان خطا ہوجاتے۔

عوام کے دلوں میں تاج کے لیے عزت و وقعت اس وجہ سے بھی بڑھ گئی کہ بلبن نے عدل گستری میں کامل غیر جانبداری کی رَوش اختیار کی۔ اُس کے نزدیک ایک مسلمان بادشاہ کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ عدل و انصاف کا پُتلا، علوم و فنون کا مربّی اور شریعتِ اسلامی کے نفاذ کا علمبردار ہو، سزائیں اس قدر سخت ہوں کہ جرائم خود بخود ختم ہوکر رہ جائیں اور عوام خوشحال ہوجائیں۔ اُس کا یہ بھی قول تھا کہ تخت و تاج کے وقار کے لیے خزانہ پُر، فوج مضبوط، دربار شان و شوکت کا مظہر اور عُمدہ نظامِ حکومت لازمی ہیں۔ بلبن اِس فرض کو مذہبی جوش و محبت کے ساتھ انجام دیتا رہا۔ اُس نے اپنے فرزندوں اور امیروں پر بھی یہ حقیقت واضح کردی تھی کہ قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں کسی قسم کی رُو رعائت اور نرمی کی اُمید نہ رکھیں۔ بلبن نے عملاً اپنے اس قول کو سچ کر دکھایا۔ بدایوں کے گورنر ملک باربک نے اپنے ملازم کو قتل کردیا تھا۔ اس پر بلبن نے برسرِ عام اُسے اسقدر کوڑے لگوائے کہ وہ مرگیا۔ محکمۂ جاسوسی کے آفیسر کو جس نے اس واقعہ کی اطلاع نہیں دی تھی، سولی پر لٹکا دیا۔ اِسی طرح اودھ کے جاگیردار ہیبت خاں نے نشہ کی حالت میں کسی شخص کو قتل کردیا۔ مقتول کی بیوہ نے شاہی دربار میں شکایت کی تو بلبن نے ہیبت خاں کو بیوہ کے حوالے کردیا اور بیوہ کو پورا اختیار دیا کہ مجرم سے جو سلوک چاہے کرے۔ چنانچہ جاگیردار ہیبت خاں نے بیس ہزار تنکہ بطور قصاص دے کر رہائی پائی۔ لیکن اس کے باوجود ندامت کے مارے ایسا روپوش ہُوا کہ پھر کبھی نہ دیکھا گیا۔ بلبن کے عدل و انصاف نے جب شہرتِ عام حاصل کی تو قانون کے لیے عزّت و احترام کا جذبہ خود بخود پیدا ہوگیا۔

Marfat.com

استحکامِ مرکز کے سلسلہ میں بلبن کے کارنامے

استحکامِ مرکز کے لیے سب سے مقدم چیز دبدبۂ شاہی اور وقارِ سلطانی کی بحالی تھی۔ سلطان شمس الدین التمش کے جانشینوں کی نالائقی اور امرا چہلگانی کی نخوت و جاہ پرستی کی وجہ سے نہ صرف بادشاہ کا رعب و داب اور حکومت کا احترام و وقار ختم ہوگیا تھا بلکہ مرکزی استحکام بھی بُری طرح سے متاثر ہُوا تھا۔ بقول مصنفِ "تاریخِ فیروز شاہی" "حکومت کا خوف جو سلطنت کے وقار و دبدبہ کی علامت ہوتا ہے، عوام کے دلوں سے اُٹھ گیا تھا۔ اور مُلک میں بڑی بدنظمی پھیل گئی تھی۔" سلطان غیاث الدین بلبن نے حکومت کے وقار کو بحال کرنے اور نظامِ سلطنت کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے حکومت کے جملہ اختیارات کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور ایک مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے مناسب اقدامات کئے۔ اس سے مرکزی حکومت بہت مضبوط ہوگئی۔ اور اہل کاروں پر شاہی رعب بیٹھ گیا۔ مرکز کے استحکام کے سلسلے میں بلبن نے مندرجہ ذیل کارنامے سرانجام دئے۔

فوج کی تنظیم

بلبن کو احساس ہوچکا تھا کہ مرکزی استحکام اور مُلکی امن و امان کے لیے منحرف امیروں اور آبادی کے باغی و خود سر عناصر کو راہِ راست پر لانا نہایت ضروری ہے۔ اور اس کے بھرپور خزانہ اور زبردست و مستعد فوج کی اشد ضرورت ہے۔ بلبن نے فوج کی از سرِ نو تنظیم کے کام پر عماد الملک کو مامور کیا۔ اور اُسے وزیرِ دفاع (دیوانِ عارض) مقرر کیا۔ عماد الملک نے فوج میں نظم و ضبط بحال کرنے اور اُسے اعلیٰ درجے کی مؤثر قوت بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اُس نے سپاہیوں کی تنخواہوں میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کی بھرتی، خبر گیری، سالانہ ترقی اور پوری تنخواہ کی باقاعدہ ادائیگی کا مناسب انتظام کیا۔ اس سے فوج میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ اور فوج ایک مؤثر قوت بن گئی۔ فوج کی کمان کے لیے بڑے بڑے تجربہ کار جرنیل مقرر کئے۔ پُرانے قلعوں کی مرمت اور نئے قلعوں کی تعمیر کا انتظام کیا۔ بلبن نے قدیم اقطاع داران کو ختم کرتے ہُوئے اُن کی جاگیریں ضبط کرلیں۔ اگرچہ بعد ازاں عماد الملک کی سفارش پر اُن کی جاگیریں بحال کردیں۔ مگر ان کے لیے فوجی خدمت لازمی قرار دی۔

محکمۂ جاسوسی

بلبن نے نظامِ حکومت کے استحکام اور شاہی وقار کی بحالی کے لیے ایک مؤثر و مستعد محکمۂ خبر رسانی منظم کیا۔ جس کے اہل کار مملکت کے دُور دراز کے صوبوں اور اہم شہروں میں متعین تھے اور گورنروں، سپہ سالاروں اور اعلیٰ حکام کے حالات سے حکومت کو باخبر رکھتے تھے تاکہ اُن لوگوں کے اعمال پر احتسابِ سلطانی قائم رہے۔ یہ محکمہ براہِ راست مرکز کے ماتحت تھا اور اس محکمہ کے افسر صرف سلطان کے سامنے جوابدہ تھے۔ اس محکمہ کی وجہ سے گورنر سلطان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرسکتے تھے۔ محکمۂ جاسوسی کے پرچہ نویسوں کو فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں تساہل پر سخت سزا دی جاتی تھی۔

Marfat.com

عدل و انصاف

محکمۂ عدل و انصاف کی خوش تنظیمی حکومت کے وقار اور رعایا کے اطمینان کا باعث بنتی ہے۔ بلبن نے نظامِ عدل میں اصلاح کی غرض سے سلطنت کے جملوں قاضیوں کو حکم دیا کہ مقدمات کے فیصلوں میں کامل غیر جانبداری سے کام لیں، کیونکہ قانون کی نظر میں سب باشندے برابر ہیں۔ اُس نے ملک میں اعلان کرا دیا کہ انصاف کے معاملہ میں ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ ایک جیسا سلوک ہوگا۔ کسی سے مروّت و لحاظ کا برتاؤ نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ جب بدایوں کے حاکم باربک خاں نے اپنے ایک ملازم کو پیٹتے پیٹتے جان سے مار دیا تو بلبن نے اُس ملازم کی بیوی کے سامنے باربک کو کوڑے لگوائے اور بدایوں کے محکمۂ جاسوسی کے پرچہ نویس کو اس معاملہ کی اطلاع نہ بھیجنے کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا۔ اودھ کے گورنر ہیبت خاں نے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ اُس کی بیوی نے فریاد کی تو بلبن نے ہیبت خاں کو بیوہ کے سپرد کر دیا کہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔

امراءِ چہلگانی کا خاتمہ

ایلتتمش کے چالیس غلام جو بعد میں امرائے چہلگانی کہلائے، کاروبارِ حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ مرکزی اقتدار کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے اور مُلک میں بے آئینی پیدا کرنے میں اُن کا بہت ہاتھ تھا۔ یہ چالیس ایلتتمشی امراء جب باہم مل کر کوئی کام کرتے تو قصرِ سلطنت کی بنیادوں تک کو ہلا دیتے تھے۔ کمزور اور نااہل سلاطین اُن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ مگر وہ حصُولِ اقتدار کے لیے ایک دوسرے کے خلاف حسد اور عناد رکھتے تھے اور کوئی کسی کا کہا نہ مانتا تھا اور نہ کسی کی حاکمیت کو تسلیم کرتا تھا۔ بقولِ ہمعصر مؤرخ ضیاء الدین برنی، وہ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے: "تو چیستی کہ من نیستم و تو چہ باشی کہ من نہ باشم۔"

دربارِ دہلی اُن کی وجہ سے سازشوں کا اڈا بن چکا تھا۔ چونکہ سلطان بلبن خود بھی اُنہی میں سے تھا، لہٰذا وہ بہ آسانی اُس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ بلبن نے زمانۂ خانی ہی میں جب وہ سلطان ناصرالدین محمود کا نائب السلطنت تھا۔ ان میں سے اکثر سرکش امرائے چہلگانی کا زور توڑ دیا تھا۔ اب برسرِ اقتدار آتے ہی اُس نے باقیماندہ ایلتتمشی امراء، جو بادشاہ کو برابر کا ساتھی سمجھ کر خاطر میں نہ لاتے تھے، کی جمعیت کو منتشر کرنے کا عزمِ صمیم کیا۔ چنانچہ اُس نے اُن پر خاص جاسوس مقرر کر کے اُن کی تمام سرگرمیوں کی نگرانی کا انتظام کیا۔ جو امراء راہِ راست پر چلنے کے لیے آمادہ نہ ہوئے، اُنہیں سخت سزائیں دی گئیں۔ بعض کو یا تو زہر دے کر یا خنجر سے چپکے سے ٹھکانے لگا دیا گیا اور باقیماندہ کو دُور و دراز کے صوبوں میں بھیج دیا گیا۔ اس طرح بلبن نے اُن امرائے چہلگانی کا صفایا کر کے دربارِ دہلی کو اُن کی سازشوں سے یکسر پاک کر دیا، اور انہیں اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ سلطنت کو اپنے اغراض و مقاصد کا شکار بنا سکیں۔

Marfat.com

بغاوتوں اور بے آئینی کی بیخ کنی

سلطنت کے باغی اور سرکش عناصر کے خلاف بلبن نے زبردست کارروائیاں کیں۔ ایلتتمش کی وفات اور بلبن کی تخت نشینی تک تیس سال کے عرصہ میں مرکزی اقتدار کی نااہلی کے باعث انتظام حکومت کا ڈھانچہ قطعی بے حیثیت اور غیر مؤثر ہو کر رہ گیا تھا، حکومتِ دہلی کا وقار و دبدبہ عوام کے دلوں سے اُٹھ چکا تھا اور ہندو زمینداروں نے راہزنی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ دہلی اور مشرقی صوبوں کے درمیان ذرائع آمد و رفت کا سلسلہ درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا، جس کی وجہ سے مرکزی حکومت تک غذائی اجناس کی بہم رسانی پر بھی بُرا اثر پڑا تھا۔ خود دارالحکومت دہلی میں زندگی محفوظ نہ رہی تھی۔ بلبن نے تخت نشین ہوتے ہی فوج کو از سرِ نو منظم کیا اور اُسے مضبوط و مستعد بنا کر یکے بعد دیگرے ان تمام باغی عناصر کی گوشمالی کی اور پنجاب سے لے کر بنگال تک امن و امان قائم کیا۔

میواتیوں کی گوشمالی

۱۲۶۶ء

میواتی جن کی اکثریت زیادہ تر دارالحکومت دہلی کے آس پاس آباد تھی، ڈاکہ زنی اور رہزنی کو جائز ذریعۂ معاش سمجھتے تھے۔ انہوں نے غارتگری اور رہزنی سے دہلی اور اُس کے نواحی علاقوں کا امن و چین غارت کر رکھا تھا۔ اُن کے خوف کے باعث شاہراہیں غیر محفوظ اور نواحِ دہلی کی بستیاں بے چراغ ہو گئی تھیں۔ خود دارالحکومت بھی اُن کی غارتگری سے محفوظ نہ تھا۔ یہ لوگ شہر کے اندر گھس آتے اور قتل و غارت کر کے جنگلات میں چھپ جاتے۔ چنانچہ دارالسلطنت کے دروازے سرِ شام ہی بند کر دئے جاتے۔ اہلِ شہر اور تجار ان کے ہاتھوں سخت نالاں تھے۔ سوداگروں اور بنجاروں نے باہر سے سامانِ تجارت لانا ترک کر دیا تھا۔ بلبن نے میواتیوں کی گوشمالی پر پورا ایک سال صرف کیا اور ان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرتے ہوئے اُن کی بستیوں کی بستیاں تباہ و برباد کر دیں اور اُنہیں بے دریغ تہہ تیغ کیا۔ اُن کے مکمل انسداد کے لیے جنگلات کو صاف کروا کر گوپال گر کا قلعہ تعمیر کروایا اور دہلی کے گرد و نواح میں کئی ایک تھانے قائم کئے، جن کے آس پاس ملک اور افغان جاگیردار آباد کئے۔ اس فوجی کارروائی سے ایک لاکھ میواتی ہلاک ہوئے، اور ایک بڑی تعداد قید ہوئی۔ جنہیں بعد میں ہاتھیوں کے آگے ڈال دیا گیا۔ بعض کی کھالیں کھنچوا دی گئیں۔ اس طرح دارالحکومت اور اُس کے نواحی علاقوں میں امن و سکون بحال کیا گیا اور شاہراہیں محفوظ کی گئیں۔

دوآب کے ہندوؤں کی تادیب

۱۲۶۷ء

دوآب میں ہندو زمینداروں اور راجپوتوں نے علمِ بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ دہلی اور بنگال کے تمام درمیانی راستے اُن کی بغاوت کی وجہ سے مسدود ہو چکے تھے۔ بلبن نے دوآب کے علاقے کو مختلف امراء کے مابین بطور جاگیر تقسیم کر دیا۔ ان

Marfat.com

اُمراء نے اپنی اپنی جاگیر میں پہنچ کر جنگلات صاف کرائے اور سرکشوں کو تہہ تیغ کر کے امن قائم کیا۔ بلبن خود بھی اس علاقہ میں کئی ماہ مقیم رہا۔ اور کمپل، پٹیالی، بھولپور اور جلالی میں قلعے تعمیر کر کے وہاں افغانوں کو آباد کیا۔ ان انتظامات سے دہلی اور مشرقی صوبوں کے درمیانی راستے اور شاہراہیں محفوظ ہو گئیں۔

کٹھر میں بغاوت
۱۲۶۷ء

کٹھر (KATHER) (روہیل کھنڈ) میں کٹھریہ راجپوتوں اور ہندوؤں نے سرکشی اختیار کرتے ہوئے بدایوں، امروہہ، پٹیالی اور کمپل کے علاقوں میں افراتفری اور بدامنی پھیلا رکھی تھی۔ وہ اس قدر دیدہ دلیر اور زور آور ہو گئے تھے کہ بدایوں اور امروہہ کے گورنر بھی ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہ کر سکے۔ ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ "بلبن چند منتخب تادیبی فوجی دستوں کے ساتھ ایسے راستہ سے اچانک کٹھر میں جا پہنچا کہ وہاں کے لوگوں کو اس کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ سخت تادیبی کارروائی کر کے تمام مردوں کو تہہ تیغ اور بچوں اور عورتوں کو غلام بنا لیا گیا۔ کارزار میں اس قدر کشتوں کے پشتے لگ گئے کہ لاشوں کے سڑنے کی بدبو دریائے گنگا کے کنارے تک آتی تھی۔"[1]

کھوکھروں کی گوشمالی
۱۲۶۸ء — ۱۲۶۹ء

بعد ازاں بلبن نے کوہ جودی (کوہسارِ نمک پنجاب) کے علاقہ میں فوج کشی کی اور وہاں کے باغی قبائل کھوکھر سرداروں کی سخت سرزنش کی۔ یہ لوگ سلاطینِ دہلی کے لئے مسلسل پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ بلبن دو سال تک ان کے خلاف تادیبی کارروائی میں مصروف رہا۔ اُس نے اُنکے گھروں کو لوٹ مار کا نشانہ بنایا۔ نیز سخت قتل و غارت کر کے اُن کا مکمل استیصال کیا۔ اس مہم میں بیشمار گھوڑے بلبن کے ہاتھ آئے۔ چنانچہ فوج میں تیس یا چالیس تنکہ میں اچھا گھوڑا فروخت ہونے لگا۔[2]

بلبن کی سرحدی پالیسی

نیم وحشی منگولوں نے ماوراء النہر، خراسان اور غزنہ کے علاقوں پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ ۱۲۵۸ء میں انہوں نے ہلاکو خاں کے زیرِ سرکردگی بغداد کو تاخت و تاراج کر کے عباسیوں کی پانچ سو سالہ عظمت و سطوت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ ترکستان سے لے کر شام تک تمام اسلامی ممالک میں بے گناہ مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ صرف سلطنتِ دہلی ہی اُن کی بربریت سے محفوظ تھی۔ اس لیے اسلامی ممالک کے متعدد اربابِ علم و فن اور شعراء کے علاوہ بے شمار تاجدار اور شہزادے دہلی میں بلبن کے دربار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ لیکن جلد ہی منگولوں نے برِ صغیر پر بھی حملے شروع کر دئے۔ بلبن حالات کی نزاکت سے خوب واقف تھا۔ اُس نے منگول حملوں کے سدِ باب کے لیے ایک عمدہ اور منظم سرحدی پالیسی وضع کی۔ جو مندرجہ ذیل اہم نکات پر مشتمل تھی:۔

---

[1] "تاریخِ فیروز شاہی" صفحہ ۵۹
[2] "طبقاتِ ناصری" صفحہ ۵۸

Marfat.com

۱۔ **سرحدوں پر بہترین حاکموں کا تقرر:** سلطنتِ دہلی کی مغربی و شمال مغربی حد دریائے سندھ تھا۔ جس کی وجہ سے سرحد کا دفاعی مسئلہ قدرے مشکل ہو گیا تھا کیونکہ غزنہ وغیرہ سے چل کر منگول فوجیں کسی پایاب مقام پر دریا کو عبور کر لیتی تھیں اور سرحدی علاقوں کے امن و امان کو تباہ و برباد کر دیتی تھیں۔ چنانچہ بلبن نے سرحدی علاقوں پر بہترین جرنیل کو محافظِ سرحد مقرر کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ بلبن نے اس سرحدی محافظ کی زیرِ کمان ایک زبردست فوج کا اہتمام کیا۔ پنجاب و سندھ کے صوبوں کو متحد کر کے اپنے چچا زاد بھائی شیر خاں کو وہاں کا حاکم اور محافظِ سرحد مقرر کیا۔ شیر خاں ایک بہادر اور تجربہ کار جرنیل تھا۔ اُس نے سرحد کے تحفظ کا مناسب بندوبست کیا۔ جسکے نتیجے کے طور پر اُس کے ہاتھوں منگولوں کو ہر بار ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ شیر خاں کی وفات کے بعد بلبن نے اپنے بڑے لڑکے شہزادہ محمد کو محافظِ سرحد کے اہم عہدے پر مامور کیا۔ اور اُس کے قتل کے بعد اپنے دوسرے لڑکے بغرا خاں کو اس اہم عہدے پر متعین کیا۔

۲۔ **قلعوں کی تعمیر:** بلبن نے منگول حملوں کی روک تھام اور سرحدی دفاع کو مستحکم بنانے کی غرض سے دہلی سے لے کر سرحد تک کے تمام پُرانے قلعوں کی مرمت کروائی اور اہم فوجی ناکوں پر نئے قلعے تعمیر کرائے۔ اُن میں سامانِ رسد کے علاوہ بھاری مقدار میں سامانِ حرب کا بھی اہتمام کیا۔

۳۔ **تین دفاعی لائنوں کا قیام:** بلبن خداداد عسکری قابلیت کا مالک اور فنونِ حرب کا ماہر تھا۔ اُس نے دفاع کو مضبوط تر بنانے کے لیے تین دفاعی لائنیں قائم کیں، اور ہر لائن میں قلعوں، چھاؤنیوں اور فوجی مورچوں کا اہتمام کیا۔ تاکہ سرحد سے دہلی تک آنے میں دشمن کو تین جگہ سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے۔ پہلی لائن آچ اور ملتان پر تھی، دوسری دیپالپور اور پاکپتن پر اور تیسری سامانہ، سنام اور ہانسی کے مقامات پر ہر لائن دفاعی لحاظ سے مضبوط تھی اور اُس کے قلعوں، چھاؤنیوں اور فوجی ناکوں میں سامانِ حرب اور خوراک کے وافر ذخائر موجود تھے، تاکہ دشمن کی آمد پر راستوں کے مسدود ہو جانے اور محاصرہ کی صورت میں شاہی فوج سامانِ حرب و رسد سے محروم نہ ہو سکے۔ علاوہ ازیں مؤثر دفاع کے پیشِ نظر ہر ایک چھاؤنی اور قلعہ کو سڑکوں کے ذریعہ ملا دیا گیا۔

۴۔ **سرحد پر بہترین فوج کا تعین:** بلبن نے سرحدی قلعوں، چھاؤنیوں اور فوجی ناکوں میں بہترین جرنیلوں کی زیرِ کمان اعلیٰ تربیت یافتہ اور جدید سامانِ حرب سے مسلح فوج مقرر کی۔ اُس نے مُلک کے تمام حصّوں

Marfat.com

کی فوج کا تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سرحدوں پر تعیناتی کا بھی انتظام کیا: تاکہ ہر سپاہی کو سرحدی جنگ کی تربیت، اور تجربہ حاصل ہو۔ بلبن کی طرف سے محافظِ سرحد کو اجازت تھی کہ وہ موقع و محل کے مطابق اگر مزید فوج کی ضرورت محسوس کرے تو اندرونِ ملک سے طلب کر سکتا ہے۔

۵۔ مرکزی شاہی فوج کا قیام:۔

اپنی سرحدی پالیسی کو کامیاب بنانے اور ملک کو داخلی بدانتظامی اور انتشار سے محفوظ رکھنے کے لیے بلبن نے ایک زبردست مرکزی شاہی فوج کا اہتمام کیا، جو فنونِ حرب میں ماہر، سامانِ جنگ سے لیس اور اعلیٰ کارکردگی کی مظہر تھی، اور ہر وقت دارالسلطنت دہلی میں موجود اور مستعد رہتی تھی۔ اسی شاہی فوج سے ہر مقام پر کمک پہنچائی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں اگر دشمن راستے کی تمام دفاعی لائنوں کو روندتا ہوا دہلی پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاتا، تو یہ مرکزی شاہی افواج بخوبی اس کا سر کچلنے کی استطاعت رکھتی تھیں۔ شاہی محافظ دستہ اسی فوج کا ایک حصہ ہوتا تھا، جو بہترین اور نامور سپاہیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

۶۔ منگولوں سے سفارتی تعلّقات کا قیام:

بلبن نے منگولوں کے حملوں کا سدِّباب کرنے اور سلطنت کے دفاع کا مناسب انتظام کرنے کے علاوہ اُن سے دوستانہ مراسم اور سفارتی تعلقات استوار کرنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۲۵۸ء میں اپنا ایک سفیر منگول سربراہ ہلاکو خاں کے دربار میں بھیجا۔ اگلے سال ہلاکو خاں کا سفیر دربارِ دہلی میں آیا۔ جس کا شایانِ شان استقبال کیا گیا۔ اس طرح دونوں حکومتوں کے مابین متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا، اور باہمی اعتماد و دوستی کی فضا قائم ہو گئی۔

بلبن کی سرحدی پالیسی نہایت کامیاب رہی۔ اُس نے دفاعی انتظامات پر بہت زیادہ روپیہ خرچ کیا۔ اس سے منگولوں کو ہر بار شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بلبن برِّصغیر کا پہلا حکمران تھا جس نے دفاعی مسئلہ کی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھا اور اُس کے لیے ضروری اقدامات کیے۔

منگولوں کے حملے

بلبن کے زمانۂ وزارت اور ابتدائی عہدِ حکومت کے دوران شیر خاں پنجاب و ملتان کا حاکمِ اعلیٰ تھا۔ اُس نے منگولوں کے حملوں کا بڑی مستعدی سے مقابلہ کیا۔ اور انہیں ہر حملہ میں شکست دی۔ چنانچہ جب تک شیر خاں محافظِ سرحد رہا، منگولوں کو حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ مگر شیر خاں کی وفات کے بعد منگول حملوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ اس پر سلطان غیاث الدین بلبن نے نزاکتِ حالات کے پیشِ نظر

Marfat.com

ملتان، سندھ، دیپالپور اور لاہور کے علاقوں کا حاکمِ اعلیٰ اور محافظِ سرحد، ولیعہد شہزادہ سلطان محمد کو مقرر کیا۔

شہزادہ سلطان محمد خان شہید ایک روشن خیال نوجوان تھا اور بہادری، فہم و فراست، علم پروری اور اربابِ علم و دانش کی سرپرستی میں اپنی مثال نہ رکھتا تھا۔ جب ملتان میں اس کا تقرر ہوا تو بہت سے اربابِ علم و دانش بھی اُس کے ساتھ گئے۔ جن میں مشہور صوفی شاعر امیر خسرو اور امیر حسن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سلطان بلبن نے کئی ایک تجربہ کار مشیر بھی شہزادہ کی خدمت پر مامور کئے۔ اسی طرح سلطان نے سامانہ اور سنام کے علاقوں پر شہزادہ بُغراخاں ناصرالدین کو متعین کیا۔ اور منگولوں کے حملوں کے پیشِ نظر اُسے مزید فوج بھرتی کرنے کی ہدائیت کی۔

۱۲۷۹ء میں منگولوں کے لشکرِ جرار نے پنجاب پر یلغار کردی، اور انہوں نے دریائے بیاس کو بھی عبور کر لیا۔ لیکن بلبن کے حکم پر خانِ شہید نے ملتان سے، بُغراخاں نے سامانہ سے اور مبارک بلتارس نے دہلی سے پہنچ کر دیپالپور کے نزدیک منگولوں کو بُری طرح سے شکست دے کر بھگا دیا۔

۱۲۸۵ء میں منگولوں نے پھر ایک بار پوری تیاری کے ساتھ منگول جرنیل قمر خاں کی سرکردگی میں پنجاب پر یورش کی اور تاخت و تاراج کا بازار گرم کر دیا۔ شہزادہ محمد نے دریائے راوی کے کنارے پر منگولوں کو عبرتناک شکست دی۔ شہزادہ نے دور تک منگولوں کا تعاقب کیا۔ منگولوں کی پسپائی کے بعد شہزادہ ایک تالاب کے کنارے پانچ سو سپاہیوں پر مشتمل اپنے محافظ دستے کی معیت میں نمازِ ظہر ادا کرنے میں مصروف تھا کہ ایک منگول سردار جو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ گھات میں چھپا بیٹھا تھا، اس موقعہ کو غنیمت جان کر شہزادہ پر حملہ آور ہوا۔ نماز سے فارغ ہو کر شہزادہ نے اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن ایک مہلک تیر شہزادے کو ایسا لگا کہ وہ وہیں شہید ہو گیا[1]۔ شہزادہ کی نعش کو دہلی لایا گیا اور اُسے قطب بدایوں کے مضافات میں دفن کیا گیا۔ سلطان محمد کو زندگی میں "قاآن الملک" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ لیکن مرنے کے بعد شہزادہ شہید کے لقب سے مشہور ہوا۔

منگول متعدد شاہی فوجیوں اور امراء کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ اُن میں مشہور صوفی شاعر امیر خسرو بھی تھا جو دو سال تک منگولوں کی قید میں رہا اور بعد میں آزاد ہو کر دہلی پہنچا۔ اُس نے اپنے سرپرست شہزادہ شہید کا ایک مرثیہ لکھا۔

طغرل بیگ کی بغاوت

۸۰ء - ۱۲۷۹ء

سلطان غیاث الدین بلبن اب پیرانہ سالی اور بیماری کے سبب جسمانی اعتبار سے کمزور ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں شمال مغربی علاقوں کے دفاع میں اس کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ اس صورتِ حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حاکمِ بنگال ملک طغرل بیگ نے جو

[1] محمد عزیز احمد "ارلی ترکش ایمپائر"، صفحہ ۸۶ - ۲۸۵

Marfat.com

سلطان کا غلام تھا۔ سلطنتِ دہلی کی سیادت سے منہ موڑتے ہوئے خود مختاری اختیار کرلی۔ اس نے جاج نگر (اڑیسہ) کی ہندو ریاست کو پامال کرکے بہت سا مالِ غنیمت حاصل کیا، اور اپنی معاشی حالت کو مستحکم بنایا۔ اُس نے اپنے نام کا سکّہ اور خطبہ جاری کرتے ہوئے سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کیا۔ بلبن یہ خبر سن کر سخت برافروختہ اور غضبناک ہُوا اور ملک الپتگین موئے دراز امین خاں کو اُس کی گوشمالی پر مامور کیا۔ امین خاں ایک بھاری فوج کے ساتھ طغرل پر حملہ آور ہُوا، مگر شکست کھاکر واپس لوٹنے پر مجبور ہُوا۔ اس پر بلبن کو بہت غصّہ آیا اور اُس نے شکست خوردہ امین خاں کو اجدھیا کے دروازے کے باہر پھانسی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ اِسی طرح ایک دو مہمیں اور بھیجیں لیکن وہ بھی ناکام رہیں۔ اس پر بلبن کے غم و غصّہ کی انتہا نہ رہی اور اُس نے خود بنگال پر فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ طغرل بیگ نے جب بلبن کے آنے کی خبر سنی تو وہ فوج اور خزانہ لے کر جنوب مشرق کی طرف روانہ ہوگیا۔ لکھنوتی پہنچ کر بلبن طغرل کے تعاقب میں روانہ ہُوا، اور جستجوئے بسیار کے بعد اُسے جالیا۔ طغرل بیگ کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہوکر مارا گیا۔

بلبن لکھنوتی واپس آیا اور طغرل کے تمام ساتھیوں اور رشتہ داروں کو برسرِ بازار سُولیوں پر لٹکا دیا۔ سلطان نے اپنے بیٹے بغرا خاں کو لکھنوتی کا گورنر مقرر کیا اور خود دہلی روانہ ہُوا۔

بلبن کی وفات
۱۲۸۷ء

۱۲۸۵ء میں شہزادہ محمد خان شہید کی موت کے صدمے نے بلبن کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ وہ ایک نامور اور جابر سلطان تھا۔ جس نے تختِ دہلی کے استحکام کے لیے لاکھوں انسانوں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا، لیکن اپنے جواں سال ولیعہد کی موت کا صدمہ برداشت نہ کرسکا۔ اُسے اپنے جذبات پر اس قدر قابو تھا کہ جب شہزادے کی وفات کی خبر پہنچی تو وہ خاموش رہا۔ اور کاروبارِ سلطنت میں حسبِ سابق مصروف رہا۔ لیکن جونہی تخلیہ میں آیا، بآوازِ بلند رونا شروع کردیا۔ باوجودیکہ وہ دن میں کاروبارِ سلطنت انجام دینے میں مصروف رہتا، لیکن راتوں کی تنہائی میں کپڑے پھاڑ پھاڑ کر رویا کرتا تھا۔ اُسے مسئلہ جانشینی کے متعلق بھی بہت فکر اور پریشانی تھی۔ چنانچہ اُس نے لکھنوتی سے اپنے چھوٹے بیٹے بُغرا خاں کو طلب کیا۔ اور اُسے کہا کہ تمہارے بھائی کی موت نے مجھے تباہ و برباد کردیا۔ میری موت نزدیک ہے۔ اب صرف تم ہی میرے وارث اور ولیعہد ہو۔ اس لیے تمہیں چاہیئے کہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ تمہارا بیٹا کیقباد اور تمہارا بھتیجا کیخسرو بہت کمسن اور ناتجربہ کار ہیں۔ بغرا خاں دو ماہ تک مرکز میں رہا۔ لیکن موقع ملتے ہی لکھنوتی واپس چلا گیا۔ بُغرا خاں کے جانے سے بلبن سخت پریشان ہُوا، اور بیمار پڑ گیا۔

موت سے تین روز قبل اُس نے وزیر ملک الامراء خواجہ حسن بصری اور دوسرے امراء کو بُلا

Marfat.com

کر کہا کہ بُغرا خاں مکھنوتی چلا گیا ہے لیکن مَیں تخت خالی نہیں چھوڑ سکتا۔ میری موت قریب ہے اس لیے میں کیخسرو کو اپنا ولیعہد نامزد کرتا ہوں۔ آخرِ کار ۱۲۸۷ء کے وسط میں اپنے ولیعہد کی نامزدگی کے تین روز بعد اسّی سال سے زائد عمر میں اُس نے وفات پائی۔ بلبن نے بحیثیت شہنشاہ بائیس سال حکومت کی۔

بلبن کا کردار و کارنامے

بلبن ایک نہایت زیرک اور مدبّر سلطان تھا۔ وہ برّ صغیر پاک و ہند کے عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے۔ اُس نے نوزائیدہ ترکش ایمپائر کو نازک ترین وقت میں سنبھالا دیا۔ قرونِ وسطیٰ کی تاریخ برصغیر میں اُسے ہمیشہ بلند مقام حاصل رہے گا۔ اُس نے کم و بیش چالیس سال بحیثیت وزیر اور سربراہِ سلطنتِ دہلی، حکومت کی۔ اُس کا انتظامِ سلطنت بجائے خود اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ وہ جابر و ظالم حکمران نہ تھا بلکہ خدا ترس اور نیک دل بادشاہ تھا۔ رعایا کی فلاح و بہبود اور امن و امان کا قیام ہمیشہ اُس کے پیشِ نظر رہتا تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا منتظم اور ایک عظیم المرتبت فرمانروا تھا وہ تختِ سلطانی پر بیٹھنے سے قبل اٹھارہ سال تک وزارت کے عہدے پر فائز رہا۔

اُنیسویں صدی کے یورپی سیاستدان بسمارک کی طرح بلبن خون اور آہن کی حکمتِ عملی پر کاربند تھا۔ جس کی بدولت اُس نے ملک کو داخلی و خارجی مخالف عناصر سے نجات دلائی، اور ملک میں مکمل امن و امان بحال کیا۔ اُس نے میواتیوں، کھوکھروں، راجپوتوں اور سرکش ترک امراء کی گوشمالی کر کے ملک کو باغی عناصر سے پاک کیا۔ نیز بنگال اور اودھ کی بغاوتوں کو فرو کیا۔ بلبن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے سلطنتِ دہلی کو منگولوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھا۔ اُس نے منگول حملوں کے سدِ باب کے لیے باقاعدہ طور پر ایسی پالیسی وضع کی، جس کے تحت اُس نے شمال مغربی سرحد پر جا بجا نئے قلعے، چھاؤنیاں اور فوجی ناکے تعمیر کروائے، اور پرانے قلعوں کی مرمت کا اہتمام کیا۔ نیز اُن میں سامانِ رسد اور سامانِ حرب وافر تعداد میں رکھنے کے علاوہ آزمودہ کار فوجی جرنیلوں کی زیرِ قیادت ایک بھاری تربیت یافتہ فوج متعین کی۔ بلبن کی اس پالیسی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اس سے منگول حملوں کا بڑی حد تک سدِ باب ہو گیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ بلبن برّ صغیر پاک و ہند کا پہلا حکمران تھا جس نے بیرونی حملہ آوروں کے سدِ باب کے لیے شمال مغربی سرحدی پالیسی کی بنیاد رکھی۔ بعد میں مغلیہ اور برطانوی حکومتوں نے بھی اُسی کے اصولوں پر اس علاقے سے متعلق اپنی پالیسیاں مرتب کیں۔

بلبن کا تصورِ بادشاہت بہت دلچسپ تھا۔ وہ منصبِ بادشاہت کو ارفع و ممتاز رکھنے کے لیے رعایا کے دلوں پر شاہی رعب و داب طاری کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے بڑی شان و شوکت اور جاہ و جلال سے حکمرانی کی، اور شاہی اقتدار کی بنیادیں مستحکم کر دیں۔ اُس نے بادشاہت کا دبدبہ و وقار

Marfat.com

قائم کیا اور تختِ دہلی کی عظمت کو بحال کیا - ایک مدبر کی طرح دور اندیشی اور فہم و فراست سے کام لے کر اُس نے شاہی اقتدار کو پورے نظم و نسق کا مرکز بنا دیا۔ اور حکومت کے پورے کارخانے میں زندگی کی ایک نئی روح پیدا کر دی۔ بلبن کی اس پالیسی میں کچھ خامیاں بھی تھیں - وہ حکومت کے کلیدی عہدوں پر تُرک اجاری کا قائل تھا۔ وہ ہمیشہ ترکوں سے امتیازی سلوک روا رکھتا اور غیر ترکوں سے ملاقات تک نہ کرتا تھا۔ حقیقتاً اُس کی یہ پالیسی بہت غیر دانشمندانہ تھی، کیونکہ ترکوں کی تعداد مقامی لوگوں کی بہ نسبت آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ غیر تُرک اُس کے اس امتیازی سلوک سے سخت نالاں تھے۔

بلبن نہایت متقی و پرہیزگار اور صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ تہجد، اشراق اور چاشت کی نماز کبھی قضا نہ کرتا اور کبھی بے وضو نہ رہتا تھا۔ مسجد میں عام لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر وعظ سنتا اور درس عبرت سُن کر رویا کرتا تھا۔ علماء اور فضلاء کی محفلوں کا شائق تھا، دسترخوان پر ہمیشہ علماء کے ساتھ کھانا کھاتا۔ وہ نہایت نرم دل واقع ہُوا تھا۔

وسطِ ایشیا اور دُنیائے اسلام کے دوسرے حصے منگولوں کی بربریت کا شکار ہوئے تو سلطنتِ دہلی کو محفوظ دیکھ کر مختلف ممالک کے پندرہ تاجدار اور شہزادے بلبن کے دربار میں پناہ گزین ہوئے۔ بلبن نے اُن کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کیا، اور اُنہیں دربار میں موزوں عہدوں پر متعین کیا۔ وہ اربابِ علم و دانش کا مربی تھا۔ اُس کی شہرت سُن کر مسلم ممالک کے بے شمار علماء و فضلا برِ صغیر پہنچ کر اُس کے دربار کی زینت بن گئے تھے۔

بلبن ایک دُور اندیش اور سیاسی بصیرت کا حامل 'ترکش ایمپائر' کا ایک عظیم فرمانروا تھا۔ جب امرائے سلطنت نے اُسے مزید فتوحات کا مشورہ دیا تو اُس نے نہایت مدبرانہ جواب دیا کہ وہ بھی فتوحات کا آرزومند ہے۔ مگر حالات کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے نوزائیدہ سلطنت کو مضبوط و مستحکم بنایا جائے اور امن و امان اور نظم و ضبط کو بحال کیا جائے، تاکہ منگول، سلطنت کی کمزوری سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔ چنانچہ اُس نے برِ صغیر کی اسلامی سلطنت کو منگولوں کے حملوں سے بچایا، اور علاؤ الدین خلجی کی فوجی اور انتظامی اصلاحات کے لیے راستہ ہموار کیا۔

بلبن کے جانشین

معزّ الدین کیقباد
۹۰ - ۱۲۸۷ء

بلبن کی وفات کے بعد اُس کی وصیت کے برعکس فخر الدین کوتوالِ دہلی اور بعض دیگر اُمراء نے کیخسرو کی بجائے بغرا خاں کے بیٹے معزّ الدین کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا۔ وزیر حسن بصری اور دوسرے ایسے امراء کو جو خانِ شہید کے حامی تھے،

Marfat.com

برطرف کر دیا گیا اور تمام کلیدی آسامیوں پر فخر الدین کوتوال کے ہمنواؤں کو متعین کیا گیا۔ فخر الدین کے داماد ملک نظام الدین کو دہلی کا داد بک (مجسٹریٹ) مقرر کیا گیا۔

کیقباد جس کی تربیت بلبن کی کڑی نگرانی میں ہوئی تھی، اٹھارہ سال کا ایک ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ وہ بڑا خوبصورت، خوش مزاج اور با اخلاق تھا۔ خود غرض درباریوں نے اُس کی نوعمری سے فائدہ اٹھا کر اُسے عیش و نشاط کے غلط راستے پر لگا دیا، اور خود اُس کی آڑ میں سیاہ و سپید کے مالک بن بیٹھے چنانچہ معز الدین کیقباد جلد ہی فرائضِ مملکت کو فراموش کر کے عیش و عشرت کا رسیا بن گیا۔ اُس نے دریائے جمنا کے کنارے کیلوگڑھی میں ایک عالیشان محل بنوایا، جہاں اُس کے شب و روز شراب و رباب کے ماحول میں شاہدانِ مرغولہ خُو اور حسینانِ شعلہ رُو کی صحبت میں گذرنے لگے۔ شاہی دربار مسخروں، رقاصوں اور مغنیوں کا مرکز بن گیا اور بلبن کے دَور کی تمام درباری پابندیاں اور آداب ختم ہو گئے۔

بُغرا خاں اور کیقباد کی ملاقات

بُغرا خاں حاکمِ بنگال نے سلطان ناصر الدین کا لقب اختیار کر کے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ لیکن اُسے دہلی کے معاملات اور اپنے بیٹے کیقباد کے حالات سے اب بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ اُس نے متعدد نصیحت آموز خطوط لکھ کر کیقباد کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ لیکن شاید وہ شراب کی رنگینیوں میں مستغرق کیقباد پر اپنے باپ کے پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بالآخر بُغرا خاں نے اس سے خود مل کر اُسے راہِ راست پر لانے کا ارادہ کیا۔ باپ اور بیٹے کے مابین ۱۰۸۷ء کے دریائے سرجو کے کنارے ملاقات طے پائی۔ باپ بیٹے کے مابین کئی ملاقاتیں ہوئیں۔

باپ نے اُسے سمجھایا اور ساتھ ہی ملامت کرتے ہوئے نصیحت کی کہ عیش و نشاط کی زندگی سے کنارہ کر کے ملکی معاملات میں دلچسپی لے۔ آخری ملاقات میں بُغرا خاں نے بیٹے کے رخسار پر بوسہ دینے کے بہانے چپکے سے اُس کے کان میں کہا کہ نظام الدین ایک عیار سے ہوشیار رہے اور اُسے جلد از جلد اپنے راستے سے ہٹا دے۔[1] لیکن دہلی پہنچ کر کیقباد نے تمام نصیحتوں کو فراموش کر دیا اور حسبِ معمول شاہد و شراب کی محفلوں میں کھو گیا۔ تاہم نظام الدین پر اُس نے نگاہ رکھی۔

نظام الدین نے اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے کئی ایک مخالف بلبنی امراء کو ہلاک کروا دیا۔ اُس کے اس اقدام نے کیقباد پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ وہ اُسے صاف کرنے کے لیے راستہ ہموار کر رہا ہے۔ لہٰذا اُس نے نظام الدین کو ملتان جانے کا حکم دیا۔ نظام الدین نے تعمیلِ حکم میں ٹال مٹول سے کام لینا چاہا تو اُس کے مخالفین نے سلطان کے اشارے سے اُسے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اُس کی ہلاکت سے کیقباد کو اپنے خلاف سازشِ قتل کا خطرہ تو نہ رہا

---

[1] اس ملاقات کا مفصل حال امیر خسرو نے اپنی مثنوی "قران السعدین" میں منظوم کیا ہے۔

Marfat.com

لیکن اس واقعہ سے سلطنت سب سے زیادہ ذی فہم اور مدبر افسر سے محروم ہوگئی۔ چنانچہ اس کے بعد کیقباد کی رہی سہی آن بان ختم ہوگئی۔

خاندانِ غلاماں کا خاتمہ

ملک نظام الدین نے بے شمار ترک امراء کو اس لیے ہلاک کروا دیا تھا کہ اپنے اقتدار کی راہ ہموار کر سکے۔ اس سے ترک پارٹی کمزور ہو کر رہ گئی اور خلجیوں کے اقتدار کے لیے راستہ صاف ہوگیا، جنہیں بلبن نے کبھی کلیدی آسامیوں پر فائز نہ کیا تھا۔

کیقباد کے زمانے میں ملک فیروز خلجی نامی ایک سردار سامانہ کا حاکم تھا۔ یہ شخص ملتان اور سندھ کے گورنر کی حیثیت سے منگولوں کے خلاف معرکوں میں کافی نام پیدا کر چکا تھا۔ کیقباد نے اُسے عارضِ ممالک کے اہم عہدے پر متعین کر دیا۔ اس بات کو بلبنی عہد کے ترک امراء نے سخت ناپسند کیا اور انہوں نے خلجیوں کے زور کو توڑنے کے لیے جہد و جہد کا آغاز کیا۔ ترک اپنے آپ کو برِ صغیر پاک و ہند کا فاتح سمجھتے تھے اور غیر ترک یا نیم ترک کو کاروبارِ سلطنت میں شریک نہیں ہونے دیتے تھے۔ سلطنت کے تمام کلیدی عہدے اُن کے پنجۂ اختیار میں تھے۔ اس لحاظ سے خاندانِ غلاماں کی حکومت مسلمانوں کے ایک خاص طبقہ کی حکومت بن کر رہ گئی تھی۔ بلبن نے شاہی وقار کی بحالی کے لیے ترک امراء کا زور توڑ دیا تھا۔ اب اُن میں کوئی ایسا شخص نہ رہا تھا جو اس وسیع سلطنت کی ذمہ داری کو اُٹھا سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ترک بالخصوص خلجی دہلی کے تخت و تاج پر قبضہ کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے جن کا سردار جلال الدین خلجی تھا۔

جب سلطان کیقباد فالج کا شکار ہوا تو ترک امراء نے اُس کے تین سالہ بیٹے کیومرث کو تخت نشین کر دیا۔ تاکہ زمامِ اختیار ترکوں کے ہی ہاتھ میں رہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے نیم ترک اور خلجی امراء کو جو کلیدی عہدوں پر قابض تھے، قتل کر دینے کی سازش کی۔ جن میں جلال الدین خلجی کا نام سرِ فہرست تھا۔ جلال الدین خلجی کو جب اس سازش کا علم ہوا تو وہ اپنی فوج لے کر دہلی سے باہر چلا گیا۔ اور اپنی عسکری قوت میں مزید اضافہ کرنے لگا۔ ترک امراء نے اُسے پھانسنے کے لیے بڑی تدابیر اختیار کیں، لیکن وہ ان کے قابو میں نہ آیا بلکہ اُس نے موقع پا کر ننھے بادشاہ کیومرث کو دہلی سے اُٹھوا کر اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس سے ترک امراء میں دہشت پھیل گئی۔ اس طرح سلطنت کا جملہ اقتدار جلال الدین خلجی کے ہاتھ میں آگیا۔ اور اُس نے نائب الممالکت کا عہدہ سنبھال لیا۔

فالج زدہ کیقباد بے یار و مددگار کیلوگڑھی کے محل میں بسترِ مرگ پر پڑا تھا اور کسی کو اُس کے علاج تک کی فکر نہ تھی۔ ۱۲۹۰ء کے آغاز میں ایک روز کسی خلجی سپاہی نے اُسے ٹھوکریں مار مار کر ختم کر دیا اور اسی کے بستر کی چادر میں لپیٹ کر دریائے جمنا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ شیر خوار سلطان

Marfat.com

کیومرث کی حکومت کا ڈھونگ چند روز اور۔ باقی رہا حتیٰ کہ جلال الدین فیروز خلجی نے تختِ شاہی پر قبضہ کر لیا اور خاندانِ غلاماں کا خاتمہ کر کے خاندان خلجی کی بنیاد رکھی۔

اہم تاریخیں

۱۲۰۶ء قطب الدین ایبک کے ہاتھوں سلطنتِ دہلی کا قیام (خاندانِ غلاماں کی حکومت کا آغاز)

۱۲۱۰ء سلطان شمس الدین ایلتتمش کی تخت نشینی۔

۱۲۲۱-۲۲ء برِ صغیر پر چنگیز خاں کا حملہ۔

۱۲۲۷ء چنگیز خاں کی وفات۔

۱۲۲۹ء ایلتتمش کے لیے بغداد سے منشورِ خلافت کا پہنچنا۔

۱۲۳۶ء ایلتتمش کی وفات اور رکن الدین فیروز شاہ کے بعد سلطان رضیہ کی تخت نشینی۔

۱۲۴۰ء (اگست) سلطان رضیہ اور حاکم بھٹنڈہ التونیہ کی شادی اور بعد میں ہندو ڈاکوؤں کے ہاتھوں دونوں کی ہلاکت۔

۱۲۴۶ء ناصر الدین محمود کا سریر آرائے سلطنت ہونا۔

۱۲۶۶ء (فروری) ناصر الدین محمود کی وفات اور غیاث الدین بلبن کا تختِ دہلی پہ بیٹھنا۔

۱۲۷۱-۹۶ء مشہور سیاح مارکو پولو کا سفرِ دنیا۔

۱۲۸۵ء شہزادہ محمد خانِ شہید کی منگولوں کے ہاتھوں ہلاکت۔

۱۲۸۷ء سلطان غیاث الدین بلبن کی وفات اور معز الدین کیقباد کا تختِ دہلی پر متمکن ہونا۔

۱۲۹۰ء معز الدین کیقباد کی وفات اور جلال الدین فیروز خلجی کی تخت نشینی۔

امتحانی سوالات

۱۔ خاندانِ غلاماں کی وجہ تسمیہ بیان کیجئے۔

۲۔ سلطان قطب الدین ایبک کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے اُس کے عہدِ حکومت

Marfat.com

کے اہم واقعات کا ذکر کیجئے۔

۳۔ قطب الدین ایبک کے نظامِ حکومت پر روشنی ڈالئے۔

۴۔ "سلطان قطب الدین ایک خوش قسمت سپاہی اور معمارِ سلطنت تھا۔ وہ برِ صغیر پاک و ہند میں اسلامی سلطنت کا اصل بانی تھا۔" اس مقولے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایبک کے کردار اور کارناموں کا تذکرہ کیجئے۔

۵۔ سلطان شمس الدین ایلتتمش کے ابتدائی حالات اور اُس کے عہدِ حکومت کے واقعات مختصراً بیان کیجئے۔ اُسے سلطنتِ دہلی کا اصل بانی کیوں کہا جاتا ہے؟

۶۔ تخت نشین ہونے کے بعد ایلتتمش کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

۷۔ ایلتتمش کے کردار اور کارناموں کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

۸۔ شمس الدین ایلتتمش کے جانشینوں میں سے آپ کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

یا

"ناصر الدین محمود نہایت نیک، خدا ترس اور رحمدل بادشاہ تھا۔ وہ علم و ادب کا مربی، غریبوں اور ناداروں کا سرپرست، درویشانہ زندگی کا خوگر اور عیش پرور شاہانہ زندگی سے متنفر تھا۔ صرف قرآنِ حکیم کی کتابت کی اُجرت پر گذر بسر کرتا تھا۔" (ابشوری پرشاد) اس مقولہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سلطان ناصر الدین محمود پر ایک مدلل مضمون تحریر کیجئے۔

۹۔ بحیثیت وزیر اور نائب المملکت غیاث الدین بلبن کے کارناموں کا اجمالی خاکہ پیش کیجئے۔

۱۰۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے اُس کے نظریۂ بادشاہت پر روشنی ڈالئے۔

۱۱۔ حکومت کے استحکام کے سلسلے میں سلطان بلبن کے کارنامے قلمبند کیجئے۔

۱۲۔ منگولوں کے حملوں کے سدِ باب کے سلسلے میں سلطان غیاث الدین بلبن کی شمال مغربی سرحد کی پالیسی کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

۱۳۔ بلبن کے کردار اور کارناموں کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

۱۴۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھئے:۔

۱۔ سلطان رضیہ۔ ۲۔ امرائے چہل گانی۔ ۳۔ خانِ شہید۔ ۴۔ کیقباد

Marfat.com

ساتواں باب

خاندانِ خلجی

"خلجیوں کا برسرِ اقتدار آنا محض ایک حکمران خاندان کی تبدیلی نہ تھا بلکہ یہ ایک نئے عہد کے آغاز کا پیش خیمہ تھا۔ ترکوں کے نسلی تفوق کا دور بلبن کے ساتھ ختم ہو چکا تھا۔ ترکوں کی رہی سہی آن کیقباد کے ساتھ جہناں فنا ہو گئی۔ خلجیوں کے برسرِ اقتدار آتے ہی ترکوں اور غیر ترکوں کا امتیاز مٹ گیا۔"

(ڈاکٹر ریاض الاسلام)

خلجیوں کی ابتدا

تختِ دہلی پر خاندانِ خلجی کا متمکن ہونا تاریخِ پاک و ہند کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس خاندان کو نسبی شرافت حاصل نہ تھی۔ ترک امرا خلجیوں کو غیر مہذب اور مخلوط نسل کے لوگ سمجھتے تھے، اور انہیں خاطر میں نہ لاتے تھے جبکہ خلجی سردار ترکی النسل ہونے کے مدعی تھے۔ عوام انہیں افغان یا پٹھان شمار کرتے تھے۔ خلجیوں کے حسب و نسب کے متعلق مورخین متضاد آرا رکھتے ہیں: "تاریخ فیروز شاہی" کا مصنف ضیاء الدین برنی اُن کو افغان بیان کرتا ہے؛ "طبقات اکبری" کا مصنف نظام الدین احمد بخشی خاندانِ خلجی کے پہلے سلطان جلال الدین فیروز شاہ کو ترکی النسل بیان کرتے ہوئے اُسے چنگیز خاں کے داماد قایلج خاں کا پوتا بیان کرتا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ خلجیوں کی ابتدا چنگیز خاں کے داماد قایلج خاں سے ہوئی۔ قایلج خاں کی نسبت سے اُس کا خاندان پہلے قلجی اور بعد میں کثرتِ استعمال کی وجہ سے خلجی مشہور ہو گیا اور جب خاندانِ غور نے برِصغیر پاک و ہند کی تسخیر کی تو خلجیوں کی ایک بڑی تعداد نے برِصغیر میں آکر سلاطینِ دہلی کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ انہی خلجیوں میں دہلی کے سلطان جلال الدین خلجی اور مالوہ کے سلطان محمود کے آباؤ و اجداد بھی تھے۔[1]

محققین کا خیال ہے کہ خلجی ترکی النسل تھے اور علاقہ خلج کے باشندے تھے۔ یہ علاقہ افغانستان کے دریائے ہلمند کے دونوں طرف واقع ہے۔ مشہور عرب جغرافیہ دان ابن حوقل بھی خلجیوں کو ترک بتاتا ہے۔ بقول اُس کے وہ قدیم زمانے سے ہندوستان اور سیستان کے

---

[1] "تاریخِ سلطنتِ دہلی"، صفحہ ۱۱۶ - ۱۱۷

Marfat.com

درمیانی علاقے میں آباد ہیں۔ اُن کی بود و باش اور روایات ترکوں کی مانند ہیں۔ دیگر مؤرخین کے علاوہ "حدود العالم" اور "دیوانِ لغات الترک" کا مصنف اصطخری بھی خلجیوں کو ترک لکھتا ہے۔ اسی طرح طبقاتِ ناصری کا انگریز مترجم ریورٹی رقمطراز ہے کہ خلجی ترک قبائل تھے، جو ازمنۂ قدیم سے افغانستان میں آباد تھے اور مقامی لوگوں سے اس قدر مشابہت رکھتے تھے کہ ترکوں کی بہ نسبت زیادہ تر افغان دکھائی دیتے تھے۔ [1]

وسط ایشیائی تاریخ کے نامور ترین جدید مورخین میں سے مؤرخ برتھولڈ (BARTHOLD) کی رائے بھی یہی ہے کہ خلجی ترک قبائل تھے، جو چوتھی صدی عیسوی میں جنوبی افغانستان میں آباد ہو گئے تھے اور مقامی لوگوں سے عادات و روایات اور شکل و صورت میں مشابہت رکھتے تھے۔ اُن میں سے کچھ غزنوی اور غوری افواج میں شامل ہو کر واردِ ہندوستان ہوئے، اور بعض افغانستان اور وسطِ ایشیا میں منگولوں کی غارتگری کے دوران ہجرت کر کے ہندوستان میں آ گئے۔ یہاں حکمران البری ترکوں کی بہ نسبت اُن سے مختلف سلوک کیا گیا، اور وہ مخلوط نسل کی قسم کے لوگ شمار ہوئے۔ البری تُرک اُن سے رشتہ و قرابت کے تعلقات استوار کرنا اپنے رُتبہ و شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ نیز وہ انہیں نَو دولتیے اور چھچھورے سمجھ کر حقیر جانتے تھے۔

خلجی انقلاب

تُرک اپنے آپ کو ہندوستان کا فاتح سمجھتے تھے اور غیر ترک اور نیم ترکوں کو معاملاتِ حکومت میں اپنے پاس تک نہ پھٹکنے دیتے تھے۔ بلبن کے دورِ اقتدار میں ترکوں اور خلجیوں کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ خلجیوں کی قیادت جلال الدین فیروز کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۲۹۰ء میں سلطان کیقباد کی ہلاکت کے بعد جلال الدین فیروز خلجی سریرآرائے سلطنت ہوا۔

اس خلجی سردار کا تختِ حکومت پر متمکن ہونا صرف ایک حکمران خاندان کی تبدیلی نہ تھی بلکہ یہ واقعہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے ترکوں کے نسلی تفوق کا خاتمہ کر دیا اور ہندی مسلمانوں اور نیم ترکوں پر ترقی کے وہ تمام دروازے کھول دیئے جو ترک امراء نے نسلی تعصب کی بنا پر بند کر رکھے تھے۔ ملک ایک نئے دور میں داخل ہوا اس سے ملک نہ صرف ترقی کے راستے پر گامزن ہوا، اور تمام رعایا بالخصوص مسلم رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے حکومت نے ایک لائحہ عمل مرتب کیا، بلکہ ہندی مسلمانوں کا تمدن بھی فروغ پانے لگا اور آہستہ آہستہ سلطنتِ دہلی ایک غیر ملکی فوجی حکومت کی بجائے ایک قومی

---

[1] "طبقاتِ ناصری" (ریورٹی) جلد اوّل و دوم صفحہ ۵۳۹ - ۱۰

Marfat.com

حکومت کی صورت اختیار کرنے لگی۔ ترکی بالادستی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اس طرح سلطان جلال الدین کی تخت نشینی برصغیر کی سیاسیات میں ایک اہم انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ معاشرتی اور سیاسی انقلاب تھا جس کی بنا پر خلجی خاندان کے برسرِ اقتدار آنے کو بعض مؤرخین نے خلجی انقلاب کا نام دیا ہے۔

سُلطان جلال الدّین فیروز خلجی

۱۲۹۰ء تا ۱۲۹۶ء

"جلال الدین فیروز شاہ ایک نیک انسان اور اپنے وقت کا ایک پکا پرہیزگار مسلمان تھا۔ وہ یاوری بخت اور استحقاق کے بل بوتے پر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ وہ حد سے زیادہ خدا ترس اور رحمدل تھا۔ عوام اور امرا سے دوستوں کی مانند پیش آتا تھا۔ اگرچہ اُس کا عہدِ بادشاہت بہت مختصر تھا لیکن اُس نے اپنی رعایا پر اس طرح حکومت کی، جیسے ایک باپ اپنے خاندان پر کرتا ہے" [1]

(کشوری سرن لال)

جلال الدین فیروز کی تخت نشینی

۱۳ر جون ۱۲۹۰ء

۱۳ر جون ۱۲۹۰ء کو ملک فیروز جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے لقب سے ۷۰ سال کی عمر میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس سے پہلے وہ سلطان غیاث الدین بلبن کے معتمد امراء میں شمار ہوتا تھا۔ اور بعد ازاں سلطان معزالدین کیقباد کے عہد میں عارضِ ممالک (وزیر دفاع) کے عہدے پر متعین رہا۔ چونکہ ابتدا میں ترک امراء خلجیوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ اس لیے عام لوگ بھی جلال الدین کے برسرِ اقتدار آنے کو ناپسند کرتے تھے، اور وہ شہر میں نئے سلطان کے خیر مقدم پر آمادہ نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جلال الدین خلجی کو تخت نشینی کے لیے دہلی جانے کی جرأت نہ ہوئی جو ترک امراء کا مرکز تھا۔ بلکہ اُس نے اپنی تاجپوشی کی رسم دہلی سے کچھ فاصلے پر واقع کیلوگڑھی میں ادا کی۔ جسے دریائے جمنا کے کنارے کیقباد نے آباد کیا تھا۔ جلال الدین

---

[1] ہسٹری آف خلجیز صفحہ ۱۸ [2] ایضاً صفحہ ۱۵

Marfat.com

فیروز شاہ نے کیلوگڑھی کو اپنا صدر مقام مقرر کیا اور تقریباً ایک سال تک وہیں مقیم رہا۔

دریں اثنا سلطان جلال الدین خلجی کی فیاضی، حلم، حسنِ سلوک اور خدا ترسی کی خبریں پھیلنے لگیں، اور ترک امراء بھی رفتہ رفتہ اُس سے مانوس ہو گئے۔ چنانچہ اہلِ دہلی نہ صرف اُس کی بادشاہت پر راضی ہو گئے بلکہ اُس کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ دہلی میں اُس کے استقبال پر آمادہ ہو گئے۔ اس پر فیروز شاہ خلجی کیلوگڑھی کو چھوڑ کر بڑی دھوم دھام سے شہر دہلی میں داخل ہوا۔ جب وہ اُس کوشک میں پہنچا، جہاں سلطان بلبن دربار منعقد کرتا تھا تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے مرحوم سلطان پورے جاہ و جلال سے دربار سجائے بیٹھا ہے۔ اُس پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ گھوڑے سے اُتر کر پیدل چلنے لگا۔ جب ایک درباری نے اُسے بتایا کہ یہ طریقہ آدابِ شاہی کے خلاف ہے تو فیروز نے اُسے بتایا کہ اُس پر بوڑھے سلطان کا رعب اور خوف طاری ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ پیدل ہی کوشک تک پہنچا اور اُس مقام پر جا بیٹھا، جہاں وہ اس سے پہلے امیر کی حیثیت سے بیٹھا کرتا تھا۔ تخت پر بیٹھتے ہی حکمران خاندان کے انجام پر اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ فیروز خلجی بزدل نہیں تھا اُس نے منگولوں کے حملوں کا سدِباب کرنے میں خاصی شہرت حاصل کی تھی۔ وہ بڑا بہادر اور دلیر تھا مگر جونہی وہ بادشاہ بنا، اُس میں ایک بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ بحیثیت ماتحت کے وہ بہت کامیاب رہا مگر بحیثیت بادشاہ ناکام۔ شاید وہ اپنے کو غاصب سمجھتا تھا۔

جلال الدین فیروز خلجی نے برسرِ اقتدار آتے ہی ہندی مسلمانوں اور نیم ترکوں پر ترقی کے تمام دروازے کھول دیئے اور انہیں سلطنت کے اہم عہدوں پر تعینات کیا۔ اس لحاظ سے سلطان فیروز شاہ کا سریر آرائے اقتدار ہونا ہندی سیاست میں ایک عظیم انقلاب کا باعث سمجھا جاتا ہے۔

ملک چھجّو کی بغاوت

جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے تخت نشین ہوتے ہی ترک امراء اور سلطان بلبن کے خاندان کے افراد سے فیاضانہ اور مصالحانہ سلوک روا رکھا۔ اُس نے بلبن کے ایک رشتہ دار ملک چھجّو کشلی خاں[1] کو کڑہ (الہ آباد) کا گورنر بنا دیا، جہاں ترک امراء جو خلجیوں کو اپنے سے فروتر سمجھتے اور خلجی اقتدار کے خلاف تھے۔

---

[1] "ہسٹری آف دی خلجیز" صفحہ ۱۹

Marfat.com

ملک چھجو کے گرد جمع ہو گئے۔ ملک چھجو نے فیروز شاہ کی کمزوری اور ترک امراء کی انگیخت سے شہ پاکر علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اور سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ حاکم اودھ بھی اُس سے مل گیا۔ اس پر سلطان فیروز شاہ نے اُس کی گوشمالی کے لیے فوج کشی کی۔ بدایوں کے قریب مقابلہ ہوا۔ ملک چھجو کی ناتجربہ کار اور نوآموز فوج لشکر شاہی کے حملوں کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ملک چھجو گرفتار ہو کر سلطان کے حضور پیش کیا گیا۔ محسن کشی اور بغاوت کے جرم کا تقاضا تو یہ تھا کہ ملک چھجو اور اُس کے ہمنواؤں کو تہِ تیغ کر دیا جاتا مگر سلطان جلال الدین اُن کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آیا اور اُنہیں خلعت فاخرہ سے نواز کر رہا کر دیا۔ سلطان نے، بلبن کے اُن کے جذبۂ عقیدت کو سراہا۔ اس پر ایک خلجی امیر احمد چپ نے اعتراض کیا تو سلطان نے کہا کہ وہ کسی مسلمان کے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔ جسے خونریزی کا شوق ہو میں بخوشی تاج و تخت اُس کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔ سلطان نے ملک چھجو کو ملتان بھجوا دیا جہاں اُس کے آرام و آسائش کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا۔ کڑہ (الہ آباد) کی گورنری پر اپنے بھتیجے علاؤالدین کو مامور کر کے سلطان واپس عازمِ دہلی ہوا۔

ملک تاج الدین کوچی

سلطان کی کمزور حکمتِ عملی اور نرم مزاجی اس حد تک بڑھی کہ اُس نے مجرموں سے بھی نرم سلوک کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ملک میں فتنہ و فساد کے واقعات رونما ہونے لگے اور امن و امان تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ ترک امراء جو پہلے ہی سرکش تھے، اب اور بھی کھل کھیلے اور سلطان کے خلاف بغاوتیں برپا کرنے لگے۔

ملک تاج الدین کوچی نے امراء کی ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی، جہاں شراب و شاہد کی رنگینیوں سے مدہوش ہو کر سب امراء نے سلطان کو گالیاں دیں۔ ایک سردار نے تو یہاں تک کہا کہ میں سلطان کا سر خربوزے کی طرح کاٹ کر پھینک دوں گا۔ جب سلطان کو اس کا علم ہوا تو اُس نے سب امراء کو طلب کر کے ناراضگی کا اظہار کیا۔ لیکن بعد ازاں نرم دلی سے کام لے کر سب کو معاف کر دیا۔

سیدی مولے کا قتل

نرم مزاجی اور بردباری کے باوصف اور خونریزی سے گریزاں رہنے کی حکمتِ عملی کے باوجود، پیرانہ سالی میں سلطان کا دامن ایک درویش سیدی مولے کے خون سے داغدار ہو گیا۔ سیدی مولے ایران کے علاقہ برجان کا باشندہ تھا۔ اُس نے برصغیر پاک و ہند میں وارد ہو کر اجودھن (پاک پتن) میں شیخ

Marfat.com

فریدالدین گنج شکرؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور کچھ دن کے روحانی فیض سے مالامال ہو کر دہلی کا رُخ کیا۔ دہلی میں اُس نے ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی، جہاں عوام کے علاوہ امرا، اور ارکینِ سلطنت کی آمد بھی شروع ہو گئی۔ اُس کا دسترخوان بہت پُرتکلف ہوتا تھا۔ حالانکہ اُس کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا اور نہ ہی وہ لوگوں سے نذر نیاز لیتا تھا۔ مگر اُس کا اندازِ زندگی انتہائی شاہانہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب کبھی اُسے روپے کی ضرورت پیش آتی، مقررہ رقم اُس کے بوریے کے نیچے سے دستیاب ہو جاتی تھی۔ کوئی غلام یا خادم اُس کی خدمت پر مامور نہ تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر قاضی جلال الدین کاشانی جو ایک بہت بڑا قاضی تھا، بھی اُس کے معتقدین میں شامل ہو گیا۔ اسی طرح بلبن کے امراء کے بیٹے جن کی جاگیریں چھین لی گئی تھیں اور وظیفے بند کر دیئے گئے تھے، سیدی مولے کے پیروکار بن گئے اس طرح اُس کے مریدوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ قاضی جلال الدین جو سیدی مولے کا بہت معتقد تھا، نے سلطان فیروز خلجی کو قتل کرا کے سیدی مولے کو تخت نشین کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جب سلطان کو اس سازش اور سیدی مولے کے ساتھ فوجی افسروں اُمراء اور ارکینِ سلطنت کے اختلاط کا پتہ چلا تو وہ خود بھیس بدل کر اس حقیقت کی تصدیق کے لیے گیا۔ چنانچہ سلطان کے حکم سے سیدی مولے اور اس کے مرید گرفتار ہو کر سلطان کے حضور پیش ہوئے۔ سیدی مولے کے ہمنواؤں کو مختلف سزائیں دی گئیں اور اُسے ایک بے باک قلندر بحری نے اُسترے سے پے در پے وار کر کے شدید زخمی کر دیا۔ اور بعد میں سلطان کے تند مزاج فرزند ارکلی خاں کے حکم سے اُسے مست ہاتھی کے پاؤں تلے روندوا کر مروا دیا گیا۔ ہمعصر مؤرخ ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی میں رقمطراز ہے کہ جس روز سیدی مولے کو ہلاک کیا گیا۔

"اس زور کی سیاہ آندھی آئی کہ لوگ پناہ مانگنے لگے۔ اُس سال بارش بھی نہ ہوئی اور خوفناک قحط پڑ گیا۔ غلّہ ایک پیسہ (جیتل) کا ایک سیر بکنے لگا۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ سب کچھ بے گناہ درویش کے خون کا نتیجہ ہے"۔

رنتھمبور کی مہم ۱۲۹۱ء

راجپوتوں نے کیقباد کے دورِ حکومت میں سرکشی اختیار کرتے ہوئے پھر سے خود مختاری اختیار کر لی تھی۔ ۱۲۹۱ء میں اُن کی گوشمالی کے لیے سلطان جلال الدین فیروز شاہ نے ایک بھاری فوج کے ساتھ گجرات اور مالوہ کا رُخ کیا۔ چند ایک راجاؤں اور جاگیرداروں کو زیرِ نگیں کرنے کے بعد سلطان نے اُجین پر قبضہ کر لیا۔ اور بعد ازاں قلعہ رنتھمبور کا محاصرہ

Marfat.com

کیا۔ محاصرہ نے جب طول کھینچا تو سلطان نے واپسی کا ارادہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ قلعہ تلوار خدا کے کشت و خون کے بغیر فتح نہ ہوگا۔ میں اس جیسے دس قلعوں کے لیے بھی کسی مسلمان کا خون بہتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس پر احمد چپ نے کہا: "جہاں پناہ! جب بادشاہ کسی مہم کو سر کرنے کا عزم کرتے ہیں تو اُسے اُدھورا چھوڑ کر واپس نہیں جایا کرتے کیونکہ اس سے رعایا کے دل سے دبدبۂ سلطانی اور رعبِ حکومت اُٹھ جاتا ہے" لیکن سلطان نے اُس کی رائے کو کوئی وقعت نہ دی، اور دہلی واپس چلا گیا۔ اس سے فوجی مہمات میں سلطان کی کمزوری عیاں ہو گئی۔

منگولوں کا حملہ
۹۲-۱۲۹۱

۹۲-۱۲۹۱ء میں منگولوں نے ہلاکو خاں کے پوتے عبداللہ اور الغو خاں کی قیادت میں برصغیر پر حملہ کر دیا۔ سنام کے قریب شاہی فوج سے اُن کی مڈبھیڑ ہوئی۔ منگولوں کو شکست ہوئی۔ مزید معرکہ آرائی کو نامناسب سمجھتے ہوئے سلطان نے شکست خوردہ منگولوں سے فیاضانہ سلوک کیا، اور اُنہیں حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ الغو خاں اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ سلطان نے ان نو مسلموں کو دہلی میں آباد کیا اور الغو خاں سے اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ الغو خاں کو برصغیر کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ چنانچہ وہ جلد ہی اپنے ہمراہیوں سمیت اپنے وطن کو واپس چلا گیا۔

دیوگڑھی کی مہم
۹۶-۱۲۹۵ء

دکن کے جنوب میں واقع مرہٹہ ریاست دیوگڑھی ایک نہایت ہی متمول سلطنت تھی۔ بھلیسا (مالوہ) کی مہم کے دوران سلطان کے بھتیجے علاؤ الدین نے جب دیوگڑھی کے بے اندازہ زر و جواہر کے ذخائر کا حال سُنا تو اُس نے اُس پر حملہ آور ہونے کی ٹھان لی۔ چونکہ دیوگڑھی بہت دُور تھا اور اُس کا سفر انتہائی خطرات و مشکلات کا باعث تھا اس لیے اس امر کا اندیشہ تھا کہ سلطان دیوگڑھی پر حملہ کرنے کی اجازت نہ دے۔ چنانچہ اُس نے سلطان سے چندیری پر فوج کشی کی اجازت حاصل کی اور کڑہ اور اودھ کا انتظام علاؤ الملک کے سپرد کر کے ۲۶ فروری ۱۲۹۵ء کو آٹھ ہزار سواروں کی معیت میں عازمِ دکن ہوا۔ اُس وقت دیوگڑھی کا حکمران راجہ رام چندر دیو تھا۔ اس مہم کے بارے میں اُس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ چندیری جا رہا ہے۔ ایلچ پور (دکن) پہنچ کر اُس نے مشہور کیا کہ وہ سلطنتِ دہلی کا ایک باغی اور مغرور سردار ہے، اور تلنگانہ کے راجہ کے ہاں پناہ اور ملازمت کی غرض سے جا رہا ہے۔ اس طرح وہ راستے میں کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر دکن کے دارالحکومت دیوگڑھی پر جا

Marfat.com

حملہ آور ہوا۔ یہاں پہنچ کر بھی اس نے ایک نئی چال چلی اور یہ بات پھیلا دی کہ وہ صرف ہزار دستوں کا سردار ہے، اصل فوج سلطان کی سرکردگی میں پیچھے آرہی ہے۔ اس سے دیوگڑھی میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ولیعہد سلطنت راجکمار شنکر دیو بھاری فوج کے ساتھ کسی مہم پر گیا ہوا تھا۔ راجہ رام چندر دیو ایک کمزور طبع انسان تھا۔ اُس نے کبھی مسلمانوں سے مقابلہ نہ کیا تھا۔ تاہم اُس نے اِدھر اُدھر سے کچھ فوج اکٹھی کر کے دیوگڑھی سے بارہ میل دور لاسورہ کے مقام پر لشکرِ اسلام سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور قلعہ بند ہو گیا۔

قلعہ بند ہونے کے بعد راجہ نے صلح کی درخواست کی۔ علاؤالدین نے بھی خزانہ وصول کر کے واپس چلے جانے کو قرینِ مصلحت سمجھا۔ لیکن اسی دوران راجہ کا لڑکا اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ پہنچ گیا۔ اُس نے طے شدہ شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا اور جنگ شروع کر دی۔ معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ جس میں علاؤالدین کو پھر کامیابی حاصل ہوئی۔ مجبور ہو کر فرمانروائے دیوگڑھی کو پہلے کی بہ نسبت زیادہ سخت شرائط پر صلح کرنا پڑی۔ چنانچہ علاؤالدین چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من لعل و جواہر اور یاقوت، الماس، زمرد، ایک ہزار من چاندی، چار ہزار ریشمی پارچات و دیگر سامان، غلّہ، ہاتھی اور گھوڑے لے کر واپس عازمِ دہلی ہوا[1]۔ علاوہ ازیں راجہ نے ایلچ پور کا مالیہ بطورِ سالانہ خراج ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ یہ ایک عظیم فتح تھی، جس سے علاؤالدین کے وقار اور دبدبہ میں بے پناہ اضافہ ہوا اور وہ تختِ دہلی پر قابض ہونے کے بھی خواب دیکھنے لگا۔

سلطان جلال الدین کا قتل

جلال الدین فیروز شاہ گوالیار کے نزدیک ایک مہم میں مصروف تھا جب اُسے دیوگڑھی کی مہم میں علاؤالدین کی حیرت انگیز کامیابی اور بے اندازہ مالِ غنیمت لانے کی خبر ملی۔ علاؤالدین ابھی کڑہ کے راستے ہی میں تھا کہ ملک چھجو نے سلطان کو چندیری میں خیمہ زن ہونے کا مشورہ دیا تاکہ علاؤالدین کو مالِ غنیمت کے ساتھ کڑہ جانے کا موقع نہ مل سکے۔ مبادا وہ کڑہ پہنچنے پر بغاوت برپا کر دے۔ جلال الدین کو اپنے بھتیجے سے والہانہ محبت تھی۔ اسے علاؤالدین کے خلاف ملک چھجو کی بات پسند نہ آئی۔ بالآخر طے پایا کہ دہلی واپس جایا جائے اور وہاں علاؤالدین کی طرف سے مالِ غنیمت کے پہنچنے کا انتظار کیا جائے۔

کچھ عرصہ علاؤالدین اس سکیم کو دل میں لیے رہا کہ دیوگڑھی سے حاصل کردہ مالِ غنیمت

---

[1] تاریخ فرشتہ، صفحہ ۹۶

Marfat.com

سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بنگال کو زیر نگیں کرے اور وہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کرے مگر جب اُسے سلطان کی طرف سے کوئی خدشہ نہ رہا تو اُس نے سلطنت دہلی پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی۔ اور ایک خط کے ذریعہ اعترافِ گناہ اور عفو طلبی کے علاوہ مال غنیمت روانہ کرنے کا وعدہ کیا۔ نیز سلطان کو یقین دلایا کہ وہ (علاؤالدین) حد درجہ خوفزدہ ہے۔ اور اُس کے اطمینان کی صورت صرف یہی ہے کہ سلطان خود کڑہ پہنچ کر اُسے یقین دلا دے کہ وہ علاؤالدین سے ناراض نہیں۔ سلطان نے مشیروں کی رائے کے عین خلاف کڑہ جانا منظور کر لیا۔ چنانچہ ۲۰ جولائی ۱۲۹۶ء بروز جمعہ بمطابق ۱۷ رمضان المبارک ۶۹۵ھ کو سلطان کڑہ پہنچا۔ جہاں علاؤالدین کے بھائی الماس بیگ آخور بیگ (خانِ سامان) نے سلطان کو یہ سمجھانا شروع کر دیا کہ آپ لاؤ لشکر سمیت آگے نہ بڑھیں۔ میرا بھائی نافرمانی پر عتابِ سلطانی سے بے حد خوف زدہ ہے۔ مبادا وہ خودکشی کر لے۔ چنانچہ سلطان نے لشکر کو دریا کے پار چھوڑا اور خود چند مصاحبوں کی معیت میں، کشتی میں سوار روانہ ہوا۔ دریا کے دوسری طرف علاؤالدین استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ الماس بیگ نے کمال مکر و فریب اور حیلے بہانے سے سلطان اور اُس کے ہمراہیوں کے ہتھیار بھی رکھوا لیے۔ سلطان کشتی میں بیٹھا تلاوت قرآن کر رہا تھا۔ جونہی کشتی کنارے لگی، علاؤالدین کا لشکر صف بستہ دکھائی دیا۔ سلطان عسکر کے قریب کشتی سے اترا۔ بھتیجا آگے بڑھ کر آداب بجا لایا۔ سلطان نے اُسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے اُس کے منہ پر ہلکا سا طمانچہ مارا۔ اُس کے رخسار اور آنکھوں کو بوسہ دیا اور پیار و شفقت کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں علاؤالدین کے ایک محافظ محمود سلیم نے موار سے سلطان پر وار کیا۔ سلطان زخم کھا کر یہ کہتا ہوا کشتی کی طرف بھاگا: "اے علا، بدبخت چہ کردی"۔ ایک دوسرے محافظ اختیار الدین ہڈ نے عین افطار کے وقت روزہ دار سلطان کو گرا کر اُس کا تن سے جدا کر دیا۔ سلطان کے سب مصاحب بھی تہہ تیغ کر دیے گئے اور سلطان کے سر کو نیزہ پر چڑھا کر کڑہ، مانک اور اودھ کے صوبوں میں پھرایا گیا تاکہ ہر خاص و عام کو معلوم ہو جائے کہ جلال الدین فیروز شاہ کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ یہ خونی سازش ۲۰ جولائی ۱۲۹۶ء کو وقوع پذیر ہوئی[1]

سیرت و کردار

جلال الدین فیروز شاہ ایک ہمدرد، نیک طبع، خوش اخلاق اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ وہ سلطنت دہلی کا پہلا ترک سلطان تھا جس نے بادشاہت کی بنیاد محبت و شفقت اور عوامی بہبود کے اصولوں پر رکھی۔ اگرچہ وہ

---

[1] کے ایس لال۔ "ہسٹری آف دی خلجیز"۔ صفحہ ۵۶

Marfat.com

ایک اعلیٰ تربیت یافتہ بھاری فوج رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے پیش روؤں کی محض عسکری قوت کے بل بوتے پر حکومت کرنے کی پالیسی اختیار نہ کی۔ وہ شعائرِ اسلامی کا خوگر اور صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ علم و ادب کا شائق اور اربابِ علم و دانش کا قدردان تھا۔ اُس کے دربار میں علماء و مشائخ، اور بڑے بڑے نامور ادیب موجود تھے جن میں امیر خسرو، تاج الدین عراقی، خواجہ حسن، امیر ارسلان قلی، اختیار الدین یاغی اور باقی خطیر جیسی فاضل شخصیتیں بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اپنی ہندو رعایا سے اُس کا سلوک ہمیشہ روادارانہ رہا۔ غیر مسلموں کو اپنی مجلسی اور مذہبی رسوم و روایات کی بجا آوری میں پوری آزادی حاصل تھی۔

وہ بے حد نرم دل اور خلیق و متواضع تھا۔ بعض اوقات اُس کی رحمدلی کمزوری کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک بار کچھ بدمعاش لوگ گرفتار ہو کر اُس کے حضور لائے گئے جنہیں اُس نے محض اپنے گناہوں سے تائب ہونے پر چھوڑ دیا۔ اُس میں مستقل مزاجی کا فقدان تھا، وہ مفاہمت اور دلجوئی کی پالیسی کا قائل تھا۔ اُس کا برسرِ اقتدار آنا ترکوں کی برتری کے خاتمے کا پیش خیمہ تھا۔ مگر اُس نے سابقہ حکومتوں کے اکثر ترک امراء کو اُن کے عہدوں پر بحال رکھا۔ اُس کی کمزور حکمتِ عملی کے باعث انتشار پسند عناصر کی حوصلہ افزائی ہوئی اور ہندو اپنے اقتدار کی بحالی کے لیے زیادہ جرأت و جسارت سے جدوجہد کرنے لگے۔

سُلطان علاؤالدین خلجی

۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء

محرم الحرام ۶۹۵ھ تا ۷ شوال ۷۱۵ھ

"یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علاؤالدین خلجی غیر معمولی قابلیت، لامتناہی جرأت اور آہنی عزم رکھنے والا ایک عظیم حکمران تھا۔ وہ برصغیر کا پہلا فرمانروا تھا جس نے اسلامی سلطنت کی حدود کو برِصغیر کی انتہائی جنوبی سرحد تک وسعت دی۔ بحیثیت جرنیل، سکیمسٹ اور ڈپلومیٹ وہ بے مثل تھا۔ اگرچہ وہ بالکل اَن پڑھ تھا۔ مگر معاملات کی تہہ تک پہنچنے اور تمدنی و انسانی مسائل کو سمجھنے میں بڑا زیرک تھا۔ اُس کی فوجی اصلاحات، اشیا کے نرخ پر

Marfat.com

کنٹرول اور نظامِ مالیہ اُس کی اعلیٰ فہم و فراست کی آئینہ دار ہیں"۔ [1]

(ایم کبیر)

ابتدائی حالات

علاؤالدین جو علی یا گرشاسپ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، سلطان جلال الدین فیروز شاہ کے بھائی شہاب الدین مسعود خلجی کا بیٹا تھا۔[2] اور سلطان جلال الدین فیروز خلجی کا حقیقی بھتیجا اور داماد تھا۔ سلطان کو اُس سے بے حد محبت تھی۔ اس لیے اُس نے اُسے حقیقی اولاد کی مانند پالا پوسا۔

۱۲۹۰ء میں سریر آرائے سلطنت ہونے پر علاؤالدین کو امیر تزک کے عہدے پر متعین کیا گیا اور ۱۲۹۱ء میں ملک چھجو کی شکست کے بعد اُسے کڑہ، مانک پور کا گورنر مقرر کیا گیا۔

علاؤالدین بالکل اَن پڑھ تھا مگر بلا کا ذہین، صاحبِ عزم و استقلال اور خدا داد عسکری قابلیت کا مالک ایک بہادر اور بلند ہمت سپاہی تھا۔ ایک کامیاب منتظم کی جملہ صفات اس میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

علاؤالدین اپنی نجی زندگی میں اپنی بیوی اور اپنی چچی ملکہ جہاں کے سخت ردّیہ کی وجہ سے پریشان رہا کرتا تھا۔ لیکن اپنے چچا کے مشفقانہ سلوک کی وجہ سے چُپ سادھے ہوئے تھا اور اس تگ و دَو میں تھا کہ کسی طرح مرکز سے کہیں دور چلا جائے۔ کڑہ کی صوبیداری پر متعین ہونے سے اُسے اپنے مقصد میں قدرے کامیابی ہوئی۔ نیز اُسے اپنی طاقت کو مستحکم کرنے کا بھی موقعہ مل گیا۔ عروج و اقتدار کے خواب دیکھنے والے، مہم جو اور طالع آزما کئی ایک سردار اُس کے گرد جمع ہو گئے، جو اُسے عظمت و شہرت کے حصول کے لیے توقعات اور تختِ دہلی پر قابض ہونے کے لیے اُکسانے لگے۔ یہ سردار جلال الدین فیروز کو نہ صرف غاصب تصوّر کرتے تھے بلکہ اس کی کمزور پالیسی سے سخت نالاں تھے۔ وہ اُس کی جگہ علاؤالدین کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ علاؤالدین بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک تھا اور جلد بازی کی بجائے حالات کے مطابق عمل پیرا ہونے کا حامی تھا۔ اُس نے اپنے چچا اور بوڑھے سلطان پر اپنے بھائی الماس بیگ کے ذریعہ اعتماد کو قائم رکھا اور حصولِ اقتدار کے لیے اپنی طاقت کو مستحکم کرنے کے علاوہ مناسب موقع کی تلاش میں رہا۔

۱۲۹۲ء میں علاؤالدین نے سلطان کی اجازت سے مالوہ کے شہر بھلیسا پر فوج کشی کی

---

[1] اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان جلد دوم (مسلم رُول انڈر دی سلاطین) صفحہ ۶۸

[2] کے۔ ایس۔ لال "ہسٹری آف دی خلجیز" صفحہ ۳۳

Marfat.com

جہاں سے اُسے بے انتہا مال و زر بطور مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ جس کا بیشتر حصّہ اُس نے سلطان کے پاس بھجوا دیا۔ علاؤ الدین کے اس کارنامے اور دیانتداری سے سلطان اس قدر خوش ہوا کہ اُس نے اُسے "عارضِ ممالک" کے اہم ترین عہدے پر متعین کرنے کے علاوہ اودھ کی گورنری بھی عطا کر دی۔ اس طرح کڑہ مانک پور اور اودھ کے دو اہم ترین صوبے اُس کے زیرِ اقتدار آگئے[1] اس کے بعد علاؤ الدین کی ہوسِ اقتدار اور بڑھ گئی۔

دیوگڑھی کی مہم (جس کا تفصیلی جائزہ ہم پہلے لے چکے ہیں) میں علاؤ الدین کی شاندار کامیابی نے اس کے وقار اور شہرت میں اس قدر اضافہ کیا کہ وہ تختِ دہلی پر قابض ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔ اُس کے گھریلو حالات مزید خراب ہو چکے تھے کیونکہ اُس کی بیوی اور اُس کی خوش دامن ملکہ جہاں دربار میں اُس کے خلاف زہر اُگلنے اور سلطان کو اُس سے بدظن کرنے میں مصروف تھیں۔ اِن حالات میں علاؤ الدین نے اپنے چچا کو جس کی کمزور حکمتِ عملی کی وجہ سے خلجی خاندان بدنام ہو رہا تھا، راہ سے ہٹا کر خود تختِ دہلی پر قابض ہونے کا منصوبہ بنایا اور سلطان کو کڑہ بلا کر ۲۰ جولائی ۱۲۹۶ء کو اپنے دو آدمیوں سے قتل کروا دیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کروا دیا (تفصیل پہلے آچکی ہے)

تخت نشینی
۲۰ اکتوبر ۱۲۹۶ء

سلطان جلال الدین فیروز شاہ کے قتل کی خبر دہلی پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ عوام علاؤ الدین کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے لگے سلطان مرحوم کا بڑا لڑکا ارکلی خان شجاعت اور عسکری قابلیت میں مشہور تھا اور ملتان و سندھ کی سرحد پر منگولوں کے استیصال پر مامور تھا باپ کے قتل کی اطلاع پا کر دہلی کی طرف بڑھا۔ مگر دریں اثنا سلطان کی بیوہ ملکہ جہاں نے سلطان کے چھوٹے لڑکے قدر خاں کو رکن الدین ابراہیم کے لقب سے تختِ دہلی پر بٹھا دیا۔ ملکہ جہان نے سلطنت کے جملہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ نیز کوشکِ سبز میں آکر عہدے اور منصب تقسیم کیے اور اُمراء سے نئے سلطان کو نذرانے اور تحائف دلوائے۔

ارکلی خاں کو قدر خاں کے سریرآرائے تخت ہونے کی خبر ملی تو وہ دل برداشتہ ہو کر راستہ ہی سے واپس ملتان لوٹ گیا۔ علاؤ الدین نے جسے بادشاہت کا اعلان کرنے کے باوجود دہلی کی طرف بڑھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، نزاکتِ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دہلی کی جانب کوچ کیا۔ اُس نے اپنے عزیز و اقارب اور اُمراء کو اعلیٰ مناصب، جاگیروں اور

---

[1] اے۔ ایل سری واستوا "دی سلطنت آف دہلی" صفحہ ۱۴۷

Marfat.com

انعامات سے نوازا۔ نیز کڑہ سے دہلی تک تمام راستے میں ہر پڑاؤ پر پانچ من طلائی سکوں (اختر زر) کی لوگوں پر بارش کرتا آیا۔ اُس نے ہاتھی پر ایک چھوٹی سی منجنیق رکھوا رکھی تھی جو طلائی سکے اِدھر اُدھر پھینکتی تھی اور خلقِ خدا اُن سے اپنی جھولیاں بھرتی تھی۔ اس زر پاشی کی بدولت سپاہی علاؤالدین کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور عوام اس کے غاصبانہ اور سفاکانہ کردار کو بھول کر اُس کی فیاضی کی تعریفیں کرنے لگے۔ حتیٰ کہ بدایوں تک پہنچتے پہنچتے اُس کی فوج کی تعداد چھپن ہزار سواروں اور ساٹھ ہزار پیادہ سپاہیوں تک پہنچ گئی۔ بدایوں کا صوبیدار بغیر لڑے بھاگ کھڑا ہوا۔

علاؤالدین کی پیش قدمی کی خبر سن کر ملکہ جہان اور سلطان قدر خاں رکن الدین دہلی چھوڑ کر ملتان کی طرف بھاگ گئے۔ چنانچہ ۲۰ اکتوبر ۱۲۹۶ء کو علاؤالدین بڑی شان و شوکت سے دارالسلطنت دہلی میں داخل ہوا، اور تخت پر متمکن ہوتے ہی اُس نے امراء کے مناصب میں اضافہ کیا اور اپنی فیاضانہ داد و دہش اور زر پاشی سے خواص و عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ چنانچہ لوگ بہت جلد فیروز خلجی کے دردناک انجام کو بھول گئے۔ بقول ضیاء الدین برنی دہلی پہنچ کر علاؤالدین نے وسیع پیمانے پر مال و زر کی بارش کی۔ لوگ جشنِ تاجپوشی کی رسوم اور زر پاشی کی دھوم میں اس قدر کھو گئے کہ اُس کی محسن کُشی اور غداری کا کسی کو خیال تک نہ آیا۔

تخت نشین ہوتے ہی علاؤالدین نے اپنے بھائی الغ خاں (الماس بیگ) کو ملتان روانہ کیا۔ جس کی آمد پر ارکلی خاں اور رکن الدین دونوں بھائیوں نے اطاعت قبول کر لی۔ الماس بیگ دونوں شہزادوں اور دیگر امراء کو لے کر دہلی روانہ ہوا۔ راستے ہی میں اُس نے ارکلی خاں، رکن الدین اور الغ خاں (سلطان جلال الدین کے داماد) کو اندھا کر کے قلعہ ہانسی میں قید کر دیا۔ اسی طرح دہلی میں ملکہ جہان اور ملک چجّو کو بھی قید میں ڈال دیا گیا۔ اس طرح تخت کے تمام دعویداروں کا صفایا کر دیا گیا۔ نئے بادشاہ علاؤالدین نے ابوالمظفر سلطان علاؤالدنیا والدین محمد شاہ خلجی کا لقب اختیار کیا اور کوشک لال جہاں پہلے سلطان بلبن رہا کرتا تھا، قیام پذیر ہوا۔

منگولوں کے حملے
۱۲۹۶ء تا ۱۳۰۸ء

سلطان علاؤالدین خلجی کے سریر آرائے تخت ہوتے ہی منگول حملوں نے شدت اختیار کر لی۔ چنانچہ پنجاب، ملتان اور سندھ کے علاوہ دارالسلطنت دہلی اور دوآبہ (وادیٔ گنگا و جمنا کا علاقہ) بھی اُن کی دست برد سے محفوظ نہ رہا۔ مجبوراً سلطان کو اپنی تمام تر توجہ منگول حملوں کے انسداد کے لیے مبذول کرنی پڑی۔ بالآخر بعض دُور رس عسکری اصلاحات کے ذریعے اُس نے اپنی عسکری قوت کو مستحکم کیا اور بلبن کے نقشِ قدم پر

Marfat.com

چلتے ہوئے ایک مؤثر سرحدی پالیسی وضع کی۔ جس کے نتیجے کے طور پر نہ صرف ٹڈی دل منگول حملہ آوروں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا بلکہ سلطانی افواج نے منگول علاقوں میں گھس کر اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کی۔ تاریخی روایات کے مطابق علاؤالدین نے ایک درجن سے زائد منگول حملوں کو پسپا کیا۔

پہلا حملہ ۱۲۹۶ء

۱۲۹۶ء میں تبدیلیٔ اقتدار کی وجہ سے دہلی میں بدنظمی اور افراتفری کا دور دورہ ہوا تو منگول یلغار کرتے ہوئے دریائے چناب کے پار تک چلے آئے۔ شاہی افواج نے ظفر خاں کی زیرِ کمان جالندھر سے آگے بڑھ کر انہیں روکا اور شکست دے کر مار بھگایا۔ جالندھر سے ہزیمت اٹھانے کے بعد یہ حملہ آور جنوب کی طرف بڑھے اور سندھ و بلوچستان کے علاقوں میں لوٹ مار کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن افواجِ شاہی کے سپہ سالار ظفر خاں نے وہاں پہنچ کر اُن کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی اور بہت سے منگولوں کو گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا، جہاں اُنہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

دوسرا حملہ ۱۲۹۷ء

منگولوں کا دوسرا حملہ ۱۲۹۷ء میں ہوا۔ اس مرتبہ انہوں نے دہلی کے نواحی قلعہ سری پر قبضہ کر لیا۔ لیکن شمال مغربی سرحد کے محافظ، علاؤالدین کے بہادر جرنیل ظفر خاں نے نہ صرف قلعہ مذکور پر دوبارہ قبضہ کر لیا بلکہ منگول سردار کو بمع اُس کے سترہ سو سپاہیوں اور اُن کے اہل و عیال کے، گرفتار کر کے دہلی بھجوا دیا۔

تیسرا حملہ ۱۲۹۹ء

۱۲۹۹ء کے اواخر میں برصغیر پر منگول حملوں کا براہِ راست نگران قتلغ خاں المعروف بہ قتلغ خواجہ تھا۔ جو منگول سلطنتِ ایران کی طرف سے خراسان کا حاکم تھا۔ اُس نے سلطنتِ دہلی کی مکمل تسخیر کا منصوبہ بنایا، اور کامل تیاری کے بعد ۱۳۰۰ء میں ایک کثیر التعداد فوج کے ساتھ برصغیر پر حملہ آور ہوا۔ اس دفعہ منگولوں کے راستے میں کسی شہر اور بستی کو تاراج نہ کیا۔ بلکہ براہ راست دہلی پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ کوتوالِ شہر علاء الملک نے سلطان علاؤالدین کو مشورہ دیا کہ مال و زر دے کر حملہ آوروں کو ٹال دے۔ مگر اُس نے اس مشورے کو حقارت سے رد کر دیا، اور تین لاکھ فوج لے کر الغ خاں، غازی ملک تغلق اور ظفر خاں جیسے آزمودہ کار سالاروں کی معیت میں شہر سے باہر نکلا۔ دہلی کے مغربی نواح میں مہرولی کے مقام پر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ منگول شکست کھا کر اور شدید جانی نقصان اٹھا کر واپس بھاگ گئے۔ اس جنگ میں

Marfat.com

علاؤالدین کے بہادر جرنیل ظفر خاں نے اپنے منظم اور شدید حملوں سے دشمن کی صفوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا، مگر تعاقب کے دوران خود بھی مارا گیا۔

چوتھا حملہ ۱۳۰۳ء

منگولوں نے برصغیر پر چوتھا بڑا حملہ اس وقت کیا، جب سلطان علاؤالدین چتوڑ کی تسخیر میں مصروف تھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل منگول لشکر جرار نے دہلی پہنچ کر دارالحکومت کا محاصرہ کر لیا۔ اس مرتبہ وہ اس نیت سے آئے تھے کہ دارالحکومت پر قبضہ کر کے تمام برصغیر پاک و ہند کو زیر نگیں کر لیا جائے۔

حالات اس قدر خراب تھے کہ سلطان کے پاس نہ اتنی فوج تھی کہ منگولوں کا خاطر خواہ مقابلہ کیا جا سکے اور نہ ہی ذرائع نقل و حمل ٹھیک تھے کہ بیرونی صوبوں سے فوجی کمک پہنچ سکے۔ چنانچہ علاؤالدین کو مجبوراً قلعہ سری میں پناہ گزین ہونا پڑا۔ منگولوں نے دہلی کے نواحی علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے کے علاوہ دہلی کے گلی کوچوں کو بھی تاراج کیا۔ بالآخر تین ماہ خیمہ زن رہنے کے بعد یہ ٹڈی دل خود بخود ہی واپس لوٹ گیا، اور لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی۔ منگولوں کی اس غیر متوقع واپسی کو عوام نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دعاؤں اور کرامات پر محمول کیا۔

علاؤالدین کی سرحدی پالیسی

منگولوں کے پے در پے حملوں سے برصغیر کے سرحدی علاقے برباد ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ تقریباً ہر سال سرحدوں پر جمع ہو جاتے اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے تھے۔ اب دارالحکومت بھی اُن کے حملوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ چنانچہ اُن کے حملوں نے سلطان علاؤالدین کو سخت پریشان کر دیا۔ برصغیر کا کوئی حصّہ اب اُن کی دست برد سے محفوظ نہ رہا تھا۔ بالآخر سلطان نے بلبن کی سرحدی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے بلبنی عہد کے دفاعی انتظامات کو از سر نو درست و مضبوط کیا۔ علاوہ ازیں متعدد نئے قلعے تعمیر کرائے۔ ان قلعوں اور سرحدی چوکیوں میں تربیت یافتہ فوج کو بہترین جرنیلوں کی زیر کمان متعین کیا اور سامانِ حرب و رسد کے ذخائر جمع کیے تاکہ محاصرہ کی صورت میں محصورین بغیر کسی دقت کے حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکیں۔

علاؤالدین نے دہلی اور سرحد کے درمیان بلبن کی قائم کردہ تین دفاعی لائنوں کو بھی بدستور قائم رکھا اور دفاعی لائنوں کے قلعوں اُچ، ملتان، دیپالپور، پاکپتن، پٹنیر، بھٹنڈہ، سامانہ، سنام اور ہانسی کو دفاعی لحاظ سے مزید مضبوط کیا۔ ان قلعوں میں مستقل فوج متعین کرنے کے علاوہ ایک علیحدہ سرحدی محافظ فوج بھی قائم کی جو منگولوں کی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت مستعد اور تیار رہتی تھی بلکہ دشمن کے راستے پر گشت کرتی رہتی تھی۔ علاؤالدین نے سرکاری کارخانوں میں جدید ترین اسلحہ تیار کرنے کا اہتمام کیا۔ ان اقدامات نے شمال مغربی

Marfat.com

سرحد کو محفوظ کر دیا اور رعایا نے چین اور اطمینان کا سانس لیا۔

پانچواں حملہ ۱۳۰۵ء

علاؤالدین ابھی سرحد کے دفاعی انتظامات میں مصروف ہی تھا کہ منگول ایک بار پھر علی بیگ کی سرکردگی میں حملہ آور ہوئے اور سرحدی چوکیوں کو تہس نہس کرتے پنجاب کو اپنی وحشت و بربریت سے تاراج کرتے ہوئے امروہہ کے مضافات تک بڑھ آئے، اور غارتگری کرنے لگے۔ علاؤالدین نے ملک کافور اور غازی ملک کو اُن کی گوشمالی کے لیے بھیجا۔ ہر دو سپہ سالاروں نے لشکرِ جرار کے ساتھ برق دَم پہنچ کر حملہ آور منگولوں کو شکست دی اور دو منگول سرداروں علی بیگ اور ترتاق کو فوج کی بھاری تعداد سمیت گرفتار کر کے دہلی روانہ کر دیا گیا جہاں ان حملہ آوروں کو عبرت دلانے کے لیے ان دونوں سرداروں کو ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندوا دیا گیا اور قیدیوں کو بڑی بے دردی سے تہہ تیغ کر دیا گیا۔ اُن کے سروں کو قلعہ بری کے برجوں اور فصیل میں اینٹوں اور چونے کے ساتھ چُن دیا گیا۔ منگولوں کے اس حملہ کے بعد علاؤالدین نے اپنے آزمودہ کار جرنیل غازی ملک کو پنجاب و سندھ کا گورنر مقرر کیا جس نے بطریقِ احسن شمال مغربی سرحد کا دفاع کیا۔

چھٹا حملہ ۱۳۰۶ء

۱۳۰۶ء میں منگول سپاہ نے امیر کبک کی زیرِ قیادت ملتان کے قریب دریائے سندھ کو عبور کر کے حسبِ سابق علاقوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا۔ لیکن غازی ملک نے بڑی کامیابی سے اُن کی پیش قدمی کو روک کر اُنہیں نہ صرف شکست دی بلکہ پچاس ہزار منگولوں کو مع اُن کے سردار کبک کے گرفتار کر لیا۔ بعدازاں اُنہیں قتل کر دیا گیا۔ اور اُن کے بیوی بچوں کو دہلی کے بازاروں میں بطور غلام فروخت کر دیا گیا۔

ساتواں حملہ ۸-۱۳۰۷

منگولوں کا آخری حملہ ۸-۱۳۰۷ء میں منگول سردار اقبالمند کی سرکردگی میں ہوا۔ ابھی اُس نے دریائے سندھ کو عبور ہی کیا تھا کہ علائی افواج نے غازی ملک کی زیرِ کمان اسے جا گھیرا اور وہ شکست کھا کر اپنی فوج سمیت گرفتار ہوا۔ دہلی میں تمام منگول قیدیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اس کے بعد منگولوں کے دل میں اس قدر دہشت بیٹھ گئی کہ اُنہوں نے علاؤالدین کے دورِ اقتدار میں پھر کبھی برصغیر کا رخ نہ کیا۔ اور لوگ امن و سکون کی زندگی بسر کرنے لگے۔ محافظِ سرحد غازی ملک نے اپنی دفاعی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ اُس نے منگولوں کے مقبوضات پر بھی جارحانہ حملے کیے اور اپنی عسکری قوت اور بہادری کا ایسا تاثر چھوڑا کہ منگولوں نے ایک عرصہ تک برصغیر کا رُخ کرنے کی جرأت نہ کی۔

Marfat.com

علاؤالدین کے خیالی منصوبے

ابتدائی کامرانیوں اور سامرانیوں اور شادمانیوں نے علاؤالدین کا مزاج بگاڑ دیا۔ وہ قطعی اَن پڑھ اور کتابی علوم سے بے بہرہ تو تھا ہی، اُس کے دماغ میں غرور و نخوت کی ہوا بھی بھر گئی اور اُس نے ایسے بڑے بڑے منصوبے سوچنے شروع کر دیئے جن کی تکمیل کسی طرح بھی ممکن نہ تھی۔ اُس کا ایک منصوبہ ایک نیا مذہب رائج کرنے کا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میرے بھی چار بہترین دوست ہیں ظفر خاں، الغ خاں، نصرت خاں اور الپ خاں۔ جن میں ہر ایک صاحبِ سیف ہے۔ وہ میرے مذہب کو چار دانگ عالم میں پھیلا دیں گے۔ اُس کا دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ سکندر اعظم کی طرح اپنی سلطنت کسی وزیر کے سپرد کر کے، ایک عظیم فوج کی معیت میں تمام دنیا کی تسخیر کے لیے نکلے اور کُل اطرافِ عالم پر اپنی شمشیر زنی کا سکہ بٹھائے۔ چنانچہ اُس نے سکندرِ ثانی کا لقب بھی اختیار کر لیا۔ وہ علی الاعلان بھرے دربار میں اپنے ان منصوبوں کا ذکر کرتا۔ مگر چونکہ نہایت خودسر، شقی القلب اور خودرائے تھا۔ اس لیے کسی کو اُسے صحیح حقیقت سے آگاہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ بلکہ سب درباری طوعاً و کرہاً اُس کے منصوبوں کی تائید پر مجبور ہوتے۔ اہالیانِ شہر میں بھی علاؤالدین کے ان منصوبوں پر رائے زنی اور رد و قدح ہونے لگی۔ لیکن غضبِ سلطانی کے خوف سے کسی میں سلطان کے حضور لب کشائی کی ہمت نہ تھی۔

بالآخر معصر مورخ ضیاء الدین برنی کے چچا علاء الملک (کوتوالِ دہلی) نے سلطان کو راہِ راست پر لانے کی جرأت کی۔ وہ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو بارگاہِ سلطانی میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ سلطان نے جبکہ وہ اپنے مقربینِ خاص کے ساتھ مے نوشی کی محفلِ خاص میں مصروفِ نشاط تھا، کوتوال سے اپنے منصوبوں کے بارے میں رائے پوچھی۔ کوتوال دہلی علاؤالملک ایک صاف گو اور حقیقت پسند انسان تھا۔

اُس نے محفلِ میںنوشی برخواست کرا کے تخلیہ میں اُس کے چاروں خصوصی مقربین کی موجودگی میں اُس کے ظنِ باطل کو دور کرتے ہوئے کہا کہ :۔ مذہب اور شریعت خدا کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔ یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ پیغمبر خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے ہیں۔ مسلمان آنحضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو خاتم النبیین مانتے ہیں۔ آپ اپنی مذہبی بڑائی اور نئے مذہب کے خیال کو دل سے نکال دیں ورنہ تمام مسلمان آپ سے بگڑ جائیں گے اور وہی مسلمان جن کی تلواریں آپ کے دشمنوں کا صفایا کر رہی ہیں، آپ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ علاؤالملک نے چنگیز خاں کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اُس نے

Marfat.com

اسلامی ممالک اور شہروں کو تاخت و تاراج کیا۔ مگر تمامتر جبروت و اختیار کے باوجود کوئی نیا مذہب رائج کرنے کی جرأت اُسے بھی نہ ہو سکی۔ نیز کسی مسلمان نے چنگیز خاں اور اُس کے منگولوں کا مذہب قبول نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس بے شمار منگولوں نے دینِ اسلام کو قبول کر لیا۔ علاؤالدین یہ سُن کر سناٹے میں آگیا۔ اور بعد ازاں علاء الملک سے مخاطب ہوتے ہوتے کہا علاء الملک تم نے بہت اچھا کیا جو بے دھڑک سچی بات میرے منہ پر کہہ دی۔ میں نئے مذہب کے اجراء کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دل سے نکالتا ہوں۔

علاء الملک نے علاؤالدین کے دوسرے منصوبے کے بارے میں کہا کہ جہاں تک تسخیرِ عالم کے شوق کا تعلق ہے۔ جہانگیری و کشور کشائی سلاطین ہی کا کام ہے مگر ارسطو جیسا زیرک، قابلِ اعتماد اور وفادار وزیر آپ کہاں سے لائیں گے۔ جو آپ کی غیر حاضری میں امورِ سلطنت کو دیانتداری سے انجام دے سکے۔ نیز کم از کم تین لاکھ فوج کا ہونا بھی لازمی ہے اور اسی قدر فوج اِس ملک میں بھی موجود ہونی چاہیئے تاکہ آپ کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھا کر اہل ملک علمِ بغاوت بلند نہ کر سکیں۔ ابھی بیشتر ایسے علاقے اس ملک میں موجود ہیں جو اب تک تسخیر نہیں ہو سکے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تسخیرِ عالم کی بجائے اس برصغیر کی ہی تسخیر کو مکمل کیا جائے۔ علاوہ ازیں منگول آئے دن برصغیر کی شمالی سرحدوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ بدیں وجہ سلطان کو غیر مفتوحہ علاقوں کی تسخیر اور منگولوں کے حملوں کی روک تھام کا مناسب بندوبست کرنا چاہیئے۔ ان امور سے فارغ ہو کر سلطانِ معظم کو رعایا پروری اور عدل گستری جیسے اہم امور کی جانب متوجہ ہونا چاہیئے تاکہ پوری دنیا میں آپ کی شاہانہ عظمت اور عدل گستری کا شہرہ ہو۔ کوتوالِ شہر نے کچھ ایسے مدبرانہ اور معقول انداز میں دلائل پیش کیئے کہ سلطان قائل ہو گیا۔ علاء الملک نے اُسے تمام برصغیر کو فتح کرنے کی ترغیب دلائی اور ساتھ ہی سلطان کو متاثر و مہربان پا کر جرأت مندی سے کام لیتے ہوئے مشورہ دیا کہ ان اہم امور کی انجام دہی کے لیے مے نوشی اور عیش و نشاط سے اجتناب لازمی ہے۔ علاء الملک کے ان بے باکانہ مشوروں کا سلطان پر گہرا اثر ہوا اور اُس نے سوائے فتوحات کے باقی سب عزائم ترک کر دیئے۔

علاؤالدین خلجی کی فتوحات

گجرات ۱۲۹۹

۲۴ فروری ۱۲۹۹ء کو سلطان علاؤالدین خلجی نے اپنے دو عظیم جرنیلوں الغ خاں اور نصرت خاں کی سرکردگی میں ایک بھاری فوج گجرات

Marfat.com

کاٹھیاواڑ کی تسخیر کے لیے روانہ کی [1] جو دوآبہ کے بعد برصغیر کا زرخیز ترین علاقہ ہونے کے علاوہ بحری تجارت کا مرکز تھا۔ بھڑوچ، کھمبایت اور سوپارہ اس کی مشہور ترین بندرگاہیں تھیں۔ بگھیلہ راجپوت راجہ کرن رائے جو گجرات کاٹھیاواڑ کا فرمانروا تھا، شاہی فوج کے حملہ کی تاب نہ لاتے ہوئے فرار ہو کر اپنی بیٹی دیول دیوی کی معیت میں دیوگڑھی کے راجہ رام چندر دیو کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ گجرات کے دارالحکومت انہلواڑہ پر شاہی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ کثیر مالِ غنیمت کے علاوہ راجہ کی بیوی رانی کملا دیوی گرفتار ہو کر سلطان علاؤالدین کے حضور دہلی بھیج دی گئی۔ سلطان نے کملا دیوی کو حرمِ شاہی کی زینت بنا لیا۔

نصرت خان نے آگے بڑھ کر گجرات کی مشہور بندرگاہ کھمبائت کو خوب تاخت و تاراج کیا جہاں سے بھاری مال و زر بطور مالِ غنیمت اور ایک ہندو سوداگر سے ایک حبشی نژاد خواجہ سرا ملک کافور (ہزار دیناری) ہاتھ لگا جس نے بعد ازاں علاؤالدین کے دربار میں پہنچ کر بہت ترقی کی۔ اور بالآخر فاتحِ دکن کہلایا۔

رنتھمبور
۱۳۰۰ء

گجرات کاٹھیاواڑ کی فتح کے بعد سلطان علاؤالدین نے ۱۳۰۰ء میں گجرات کے فاتح اور آزمودہ کار جرنیل الغ خاں اور نصرت خاں کی سرکردگی میں ایک مہم رنتھمبور کی فتح کے لیے روانہ کی۔ اس مہم کا مقصد نہ صرف راجپوتانہ کی ریاستوں کا زور توڑنا اور گجرات پر اپنے تسلط کو مستحکم بنانا تھا۔ بلکہ رنتھمبور کے راجہ حمیر دیو کی گوشمالی کرنا بھی تھا جس نے سلطنتِ دہلی کے نومسلم باغی منگولوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی۔ راستے میں واقع قلعہ جھائن کو فتح کرنے کے بعد سلطانی لشکر نے آگے بڑھ کر رنتھمبور کے قلعہ پر یلغار کر دی۔ والیٔ رنتھمبور رانا حمیر دیو نے نہایت جانبازی سے علائی لشکر کا مقابلہ کیا۔ اسی دوران نصرت خاں ایک حادثہ کا شکار ہو کر مر گیا اور لشکرِ شاہی کو قلعہ جھائن میں پناہ گزین ہونا پڑا۔ اس پر سلطان بہ نفسِ نفیس مزید کمک کے ساتھ رنتھمبور روانہ ہوا۔ بالآخر جولائی ۱۳۰۱ء میں رنتھمبور کی خندق کو ریت کے بوروں سے پاٹ کر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ راجہ حمیر دیو اور اُس کے کنبہ کے افراد اور ساتھیوں کو تہہِ تیغ کر دیا گیا۔ اِس مہم کے دوران علاؤالدین کو متعدد بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

چتوڑ
۱۳۰۱ء

رنتھمبور کی تسخیر کے بعد سلطان نے راجپوتانہ کی مرکزی ریاست میواڑ کا رُخ کیا۔ رتن سنگھ والیٔ میواڑ نے سلطان کے باغی نومسلم منگولوں کو پناہ دے

---

[1] کے۔ ایس۔ لال "ہسٹری آف دی خلجیز" صفحہ ۶۸

Marfat.com

رکھی تھی اور انہیں اپنے لشکر میں شامل کر کے سلطان کے خلاف معاندانہ کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ جس کا قلعہ چتوڑ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے منارے بہت بلند تھے پہاڑیوں اور جنگلوں نے اُسے مزید محفوظ بنا دیا تھا۔ وہاں کا حکمران سیسوڈیا راجپوت رانا رتن سنگھ بہادر اور شہرت کا مالک تھا۔ لیکن یہ تمام مشکلات بھی علاؤالدین کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکیں۔ سلطان نے وہاں پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ راجپوت بکمال بہادری و جرأت نبرد آزما ہوئے۔ لیکن شکست سے دوچار ہو کر مارے گئے عورتوں نے رسم جوہر ادا کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ سلطان نے قلعہ پر قبضہ کر کے اپنے فرزند اور ولیعہد خضر خاں کو چتوڑ کا حاکم متعین کیا اور اس شہر کا نام خضر آباد رکھا۔ لیکن بعد میں مقتول راجہ کے بھانجے رتن سین کو جو سلطان کا وفادار تھا، میواڑ کی راجگدی پر بٹھا دیا۔[1]

جالور ۱۳۰۵ء

اگرچہ ۱۳۰۵ء میں جالور کے راجہ کنر دیو نے سلطان علاؤالدین کی اطاعت قبول کر لی تھی مگر اپنے درباریوں کے سامنے شیخی بگھارتا تھا کہ اگر علاؤالدین اُس کے مقابلہ میں آئے تو کبھی کامیاب نہ ہو۔ علاؤالدین کو اُس کی خبر ہوئی تو اُس نے ایک فوج راجہ کے خلاف اپنی ایک کنیز گل بہشت کی سرکردگی میں بھیجی جس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ فتح ہوا ہی چاہتا تھا کہ گل بہشت بقضائے الٰہی سے وفات پا گئی بہرحال دوسرے سرداروں نے قلعہ فتح کر لیا۔

مالوہ ۱۳۰۵ء

۱۳۰۵ء میں ایک فوج عین الملک ملتانی کی سرکردگی میں مالوہ کی تسخیر کے لیے روانہ کی گئی۔ اُس نے رائے مہلوک دیو اور اُسکے

---

[1] سلطان علاؤالدین خلجی کی مہم چتوڑ کے متعلق عموماً بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان نے چتوڑ پر حملہ وہاں کی خوبصورت رانی پدمنی کو حاصل کرنے کے لیے کیا تھا کیونکہ وہ اُس کے حسن و جمال کی شہرت سے بہت متاثر تھا۔ یہ قصہ سراسر بے بنیاد ہے اور ہمعصر تاریخوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا حقیقت یہ ہے کہ شیر شاہ سوری کے دور میں ملک محمد جائسی نے ہندی زبان میں ایک مثنوی "پدماوت" نامی لکھی جس میں مصنف نے رانی پدمنی سے علاؤالدین کے عشق کی داستان کو منظوم کیا۔ لیکن بعد میں مصنف نے خود ہی تصریح بھی کر دی کہ یہ افسانہ محض طبعزاد ہے اور حقیقت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض مؤرخین بالخصوص انگریز مؤرخین اور شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے اس کہانی کو تاریخوں میں درج کر دیا۔

Marfat.com

وزیر رائے کرن کا شکست دیکر مالوہ پر قبضہ کر لیا۔

ان فتوحات سے شمالی ہند کا سارا علاقہ سلطنتِ دہلی کے زیرنگیں آگیا۔ سلطنت کی اس توسیع کے باوجود علاؤ الدین کی ہوسِ ملک گیری اور فتوحات کی خواہش ختم نہ ہوئی۔ اُس نے سکندر ثانی کا لقب تو اختیار کر ہی لیا تھا اب وہ ساری دنیا نہیں تو کم از کم برصغیر کا سارا علاقہ ضرور فتح کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے جنوبی برِصغیر کو زیرنگیں کرنے کا منصوبہ بنایا۔

ماروا ڑ ۱۳۰۸ء

۱۳۰۸ء میں سلطان نے گجرات کے شمال میں واقع ریاست ماروا ڑ کی تسخیر کا منصوبہ بنایا۔ شاہی فوج نے ماروا ڑ کے اہم قلعہ سیوانہ کا محاصرہ کر لیا، محاصرہ نے طول کھینچا تو علاؤ الدین بہ نفسِ نفیس خود وہاں گیا۔ راجہ سیتل دیو نے مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے بذاتِ خود سلطان کے حضور حاضر ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ سلطان نے قلعہ سیوانہ اُسی کے قبضہ میں رہنے دیا۔ مگر باقی تمام علاقوں کا سلطنتِ دہلی سے الحاق کر لیا۔

مہمّاتِ دکن

شمالی ہند کی فتح کے بعد سلطان علاؤ الدین نے جنوبی ہند کی تسخیر کی ٹھانی۔ وہ سلطنتِ دہلی کا پہلا تاجدار تھا جس نے بندھیا چل کے سلسلۂ کوہ کو عبور کر کے جنوبی ہند (دکن) کو زیرِنگیں کرنے کے لیے یلغار کی۔ وہ دکن کی عسکری کمزوری اور دولت و ثروت کی فراوانی سے بخوبی واقف تھا۔ ۱۲۹۴ء میں سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے عہد میں اُس نے کڑہ اور ارد ھ کے گورنر کی حیثیت سے دیوگڑھی پر یلغار کر کے بے اندازہ مالِ غنیمت حاصل کیا تھا اور اسی مال و زر کی مدد سے وہ تختِ دہلی پر قابض ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ دیوگڑھی کے راجہ نے اطاعت قبول کرتے ہوئے مالِ غنیمت کے علاوہ ایلچ پور کے محاصل بطور خراج دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب راجہ مسلسل تین سال سے خراج کی ادائیگی میں پس و پیش سے کام لے رہا تھا۔ اس بہانہ سے علاؤ الدین نے تسخیرِ دکن کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اُس کے حملے کے وقت دکن میں چار بڑی ریاستیں قائم تھیں:

۱۔ دیوگڑھی جو مہاراشٹر کے علاقہ پر مشتمل تھی اور جس کا صدر مقام دیوگڑھی (موجودہ دولت آباد) تھا۔

۲۔ سلطنتِ تلنگانہ جس کا دارالسلطنت ورنگل تھا۔

۳۔ ریاست ہوئے سالا جس میں میسور کا علاقہ شامل تھا اور جس کا دارالحکومت دوار سمدر تھا۔

Marfat.com

۴۔ جنوب بعید کی سلطنت پانڈیا (معبر) جس کی راجدھانی مدورا تھی۔

دارالسلطنت دہلی سے بہت دُور واقع ہونے اور اپنے جغرافیائی حدود کی وجہ سے یہ ریاستیں قدرتی طور پر اس وقت تک مسلم فاتحین کی یلغار سے بچی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ علاؤالدین کی قوتِ تسخیر سے نہ بچ سکیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ علاؤالدین کی دکن پالیسی کا نصب العین وسعت پذیری نہ تھا بلکہ وہاں کے راجاؤں کو زیرِ نگیں کرکے اطاعت گذار بنانا تھا، تاکہ وہ اُس کی سیادت کو قبول کرتے ہوئے سالانہ خراج بھیجتے رہیں۔ اسی لیے وہ انہی راجگان کو اُن کی ریاستوں پر بحال رکھنے کا حامی تھا۔

دیوگڑھی کی فتح
۱۳۰۸ء

دیوگڑھی کے راجہ رام چندر دیو نے اپنے وعدہ سے منحرف ہوتے ہوئے تین سال سے باج ادا کرنا ترک کر دیا تھا۔ اس پر راجہ کی گوشمالی کے لیے ۱۳۰۸ء میں نائب الملکت ملک کافور کی قیادت میں ایک مہم روانہ کی گئی۔ اس مہم کا دوسرا بڑا مقصد گجرات (کاٹھیاوار) کے راجہ کرن کی بیٹی دیول دیوی کو حاصل کرنا بھی تھا، جس کی والدہ کملا دیوی سلطان کے حرم کی زینت بن چکی تھی اور جو اپنی بیٹی کی محبت میں بے قرار تھی۔ اس لیے اس کی فرمائش پر علاؤالدین نے ملک کافور کو حکم دیا کہ وہ دیوگڑھی کی تسخیر کے ساتھ ساتھ دیول دیوی کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

تسخیر گجرات سے قبل راجہ کرن نے راجکماری دیول دیوی کی شادی دیوگڑھی کے ولیعہد شنکر دیو سے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کے نزدیک شنکر دیو راجپوت نہ تھا، بلکہ پنچ قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن شکست کے بعد جب اُسے مہاراشٹر (دیوگڑھی) میں پناہ گزین ہونا پڑا تو وہ دیول دیوی کی شادی شنکر دیو سے کرنے پر راضی ہو گیا مگر یہ شادی نہ ہو سکی۔ علاؤالدین نے حاکم گجرات الپ خاں کو ملک کافور کی امداد پر متعین کیا تھا۔ اُس کی فوج کا ایک دستہ ایلورا کے غار دیکھنے گیا ہوا تھا۔ یہاں دیول دیوی بھی اپنے محافظوں کے ساتھ موجود تھی جو اُسے شنکر دیو کے پاس دیوگڑھی لے جا رہے تھے۔ شاہی دستہ نے اسے گرفتار کر لیا اور الپ خاں نے اُسے فوراً دہلی روانہ کر دیا، جہاں اُس کی شادی ولیعہد شہزادہ خضر خاں سے کر دی گئی۔ [1]

---

[1] خضر خان اور دیول دیوی کی شادی کے حالات امیر خسرو نے ایک دلچسپ فارسی مثنوی "خضر خاں دیول رانی" میں منظوم کیے ہیں۔ یہ مثنوی اس عہد کے واقعات اور معاشرتی زندگی پر بھی کافی روشنی ڈالتی ہے۔

Marfat.com

دریں اثنا ملک کافور نے ایلچ پور پر قبضہ کر لیا اور اُس پر ایک ترک گورنر مقرر کیا۔ اُس کے بعد آگے بڑھ کر دیوگڑھی کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ رام دیو لڑنے کی سکت نہ رکھتا تھا۔ اُس نے شہر سے باہر نکل کر ملک کافور کی اطاعت قبول کر لی۔ جس نے اُسے اپنی خصوصی سفارش کے ساتھ دہلی روانہ کر دیا۔ سلطان علاؤالدین سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آیا اور وسعتِ قلب کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف اُسے معاف کر دیا بلکہ 'رائے رایان' کے خطاب اور چتر سفید سے نواز کر اپنی طرف سے دیوگڑھی کا حاکم مقرر کیا۔ نیز ایک لاکھ ٹنکہ اور نواسری کا ضلع بطور جاگیر عطا کیا۔[1]

رام چندر دیو ۱۳۰۸ء کے اواخر میں واپس دیوگڑھی پہنچا۔ اور مرتے دم تک علاؤالدین کی نوازشوں کا معترف و ممنون اور سلطنتِ دہلی کا وفادار رہا۔

فتح ورنگل ۱۳۰۹ء

دیوگڑھی کی فتح کے بعد ملک کافور نے کاکتیہ خاندان کی ریاست تلنگانہ کا رُخ کیا، جس کا صدر مقام ورنگل تھا۔ اور راجہ پرتاپ رُدر دیو یہاں کا حکمران تھا۔ اس سے قبل بھی ۱۳۰۲ء میں اس ریاست کی تسخیر کے لیے علاؤالدین نے ایک مہم ملک فخرالدین جونا خاں کی سرکردگی میں روانہ کی تھی۔ اگرچہ اس مہم کی تفصیلات ہمعصر تاریخوں میں موجود نہیں ہیں۔ تاہم تاریخی اعتبار سے یہ امر مصدقہ ہے کہ یہ مہم ناکام رہی۔ اور حملہ آور فوج کافی نقصان اُٹھا کر واپس لوٹی۔ سلطانی علاؤالدین اس ناکامی کو بھولا نہ تھا اور شکست کے اس دھبے کو دھونے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا چنانچہ دیوگڑھی کی تسخیر کے بعد سلطان نے ملک کافور اور خواجہ حاجی کی قیادت میں ایک مہم ورنگل پر حملہ آور ہونے کے لیے بھیجی۔[2]

راجہ پرتاپ رُدر دیو شاہی فوج کی اچانک یلغار سے گھبرا گیا اور قلعہ بند ہو گیا۔ مگر جلد ہی اُس نے صلح کی درخواست کر کے اطاعت قبول کر لی۔ راجہ نے سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا اور تین سو ہاتھی، سات ہزار گھوڑے اور بے اندازہ مال و زر ملک کافور کو پیش کیا۔ جس میں دنیا کا مشہور ہیرا کوہِ نور بھی شامل تھا۔[3]

بقول امیر خسرو راجہ نے اپنا سونے کا مجسمہ جس میں سونے کی زنجیر بطور طوق غلامی پڑی ہوئی تھی، علاؤالدین کو بھیجیں۔ مال و دولت کی مقدار کا یہ عالم تھا کہ ایک ہزار اُونٹ اُس

---

[1] کے ایس لال: "ہسٹری آف دی خلجیز" صفحہ ۲۵۶

[2] کے ایس لال: "ہسٹری آف دی خلجیز" صفحہ ۲۳۸

[3] خزائن الفتوح مترجمہ ڈاکٹر حبیب صفحہ ۷۷۔ اور "اورنگ زیب" لین پول صفحہ ۱۵۰

Marfat.com

کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔

دوار سمدر کی فتح
۱۱-۱۳۱۰ء

دیوگڑھی اور ورنگل کی مہمات میں کامیابی کے بعد علاؤالدین کے حوصلے بڑھ گئے۔ لہٰذا اُس نے دکن کی تیسری بڑی سلطنت دوار سمدر اور معبر کو زیرِ نگیں کرنے کا منصوبہ مرتب کیا۔ چنانچہ ۱۳۱۰ء کے آخر میں ملک کافور اور خواجہ حاجی کو تیسری بار بندھیاچل کے سلسلۂ کوہ کے پار جنوبی ہند کی مہم پر ایک بھاری فوج کی معیت میں روانہ کیا۔ دیوگڑھی میں پہنچ کر ملک کافور نے دریائے گوداوری کے کنارے جلنا کے مقام پر فوجی دستہ متعین کیا تاکہ سپلائی لائن محفوظ رہے۔ اس کی بڑی وجہ دیوگڑھی کے راجہ رام چندر دیو کی وفات کے بعد شنکر دیو کا سریر آرائے تخت ہونا تھا۔ جس کی وفاداری قدرے مشکوک تھی۔ دیوگڑھی سے بڑھ کر ملک کافور اس تیزی و تندی سے دوار سمدر پر حملہ آور ہوا کہ ہوئے سالار راجہ ویر بلال سوم جنگ کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ چنانچہ اُس نے شاہی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور چھتیس ہاتھی۔ اور کثیر مقدار میں سونا چاندی اور قیمتی جواہرات دے کر سلطنتِ دہلی کی سیادت قبول کر لی۔

مدورا (معبر) کی فتح
۱۳۱۱ء

مدورا سلطنت پانڈیا (معبر) کا دارالحکومت تھا، جہاں ویر پانڈیا اور سندر پانڈیا دو بھائیوں کے درمیان تاج و تخت کے لیے کشمکش جاری تھی۔ سندر پانڈیا نے اپنے بھائی ویر پانڈیا سے ہزیمت اٹھانے کے بعد دہلی دربار میں حاضر ہو کر سلطان علاؤالدین خلجی سے فوجی امداد کی درخواست کی۔ اس پر ملک کافور ریاست پانڈیا کی راجدھانی مدورا پر حملہ آور ہوا۔ یہ برصغیر پاک و ہند کی انتہائی جنوبی ریاست تھی اور یہ معبر (موجودہ کرناٹک) کہلاتی تھی۔ ویر پانڈیا کو مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی اور وہ راجدھانی کو دہلی فوج کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ملک کافور نے بلا مزاحمت مدورا میں داخل ہو کر شہر پر قبضہ کر لیا۔

مدورا سے ملک کافور جنوبی ساحل کی طرف بڑھا اور برصغیر کی انتہائی جنوبی سرحد کے شہر رامیشورم پر قبضہ کر لیا۔ جہاں ملک کافور نے ایک مسجد تعمیر کی۔ جس کا نام علائی مسجد رکھا۔ ان فتوحات کو مکمل کر کے ملک کافور ۱۸ اکتوبر ۱۳۱۱ء کو دہلی پہنچا۔ جو مالِ غنیمت وہ اپنے ساتھ لایا، وہ پانچ سو بارہ ہاتھیوں، پانچ ہزار گھوڑوں اور پانچ سو من وزنی (دس کروڑ تنکہ کی مالیت) سیم و زر اور جواہرات پر مشتمل تھا۔ [1]

---

[1] امیر خسرو "خزائن الفتوح" مترجمہ ڈاکٹر حبیب۔ صفحہ ۷-۱۰۵

Marfat.com

مالِ غنیمت کی مقدار چھ سو بارہ ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے اور چھیانوے ہزار من سونا بتاتا ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ لکھتا ہے کہ دہلی پر مسلمانوں کے زمانۂ تسلط سے لے کر آج تک اتنا زر و مال بطورِ مالِ غنیمت کبھی ہاتھ نہیں لگا۔

ملک کافور کے استقبال کے لئے علاؤالدین نے قلعہ سری کے محل میں ایک عالیشان دربار منعقد کیا اور برسرِ دربار ملک کافور کے کارناموں کو سراہا اور اُسے بیش قرار انعام واکرام سے نوازا۔ نیز فتح کی خوشی میں امراء اور اکابر میں چار سو ساڑھے اکیس من سونا تقسیم کیا۔[1]

دکن کی آخری مہم ۱۳۱۲ء

دیوگڑھی کے راجہ رام چندر دیو کی وفات کے بعد اُس کے جانشین شنکر دیو نے سلطنتِ دہلی کی سیادت سے مُنہ موڑتے ہوئے خراج بھجوانا بند کر دیا۔ اور دوار سمُدر اور رامیشورم کی مہمات میں شاہی افواج کی کوئی مدد نہ کی۔ اس پر ملک کافور کو راجہ شنکر دیو کی گوشمالی کے لیے تادیبی مہم پر روانہ کیا گیا۔ یہ دکن کی طرف ملک کافور کی آخری مہم تھی۔ ملک کافور نے شنکر دیو کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ اور بعد ازاں اُسے ہلاک کروا دیا۔ دیوگڑھی کا تمام علاقہ براہِ راست سلطنتِ دہلی کے تحت آگیا۔

بعد ازاں ملک کافور جنوب کی طرف گلبرگہ کی جانب بڑھا اور اُسے زیر نگیں کیا۔ نیز دریائے کرشنا اور تنگ بھدرا کے درمیانی علاقے کو فتح کیا۔ یہاں سے وہ جانبِ مغرب روانہ ہُوا اور دھول اور چول کی بندرگاہوں کو فتح کیا۔ اس کے بعد وہ ایک بار پھر سلطنت ہوئے سالہ پر حملہ آور ہُوا اور ویر بلال سوم کو شکست دی، اور اُسے اطاعت گذار بنایا۔ ان فتوحات سے دکن کی تسخیر پایۂ تکمیل کو پہنچی اور وہ بے اندازہ مالِ غنیمت سے لدا ہُوا واپس دہلی پہنچا۔

علاؤالدین کے عہد کی بغاوتیں

علاؤالدین خلجی کے ابتدائی عہدِ حکومت میں پے در پے چار بغاوتیں رُونما ہوئیں جن کا مختصر حال درج ذیل ہے۔

نومسلم منگولوں کی بغاوت

مہمِ گجرات (۱۲۹۹ء) کے دوران بے اندازہ مالِ غنیمت علائی فوج کے ہاتھ لگا۔ نومسلم منگول (تاتاری) سپاہی جنہیں سلطان جلال الدین خلجی نے حلقہ بگوشِ اسلام کیا تھا، مالِ غنیمت کی تقسیم سے مطمئن نہیں تھے۔ مہم سے واپسی پر انہوں نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ گو اس بغاوت کو سختی سے کچل دیا گیا، مگر یہ لوگ رنتھمبور کے راجہ ہمیر دیو اور والئی چتوڑ کے ہاں جا کر پناہ گزین ہو گئے۔ اور ہندو راجگان سے ساز باز کر کے حکومتِ دہلی کے خلاف تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہو گئے۔ سلطان علاؤالدین کو اس بغاوت کی خبر ہوئی تو اُس نے رنتھمبور

---

[1] کے ایس لال "ہسٹری آف دی خلجیز"۔ صفحہ ۲۵۴

Marfat.com

اور چتوڑ کے راجگان سے ان باغیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ہندو راجاؤں نے انہیں واپس کرنے سے انکار کیا تو اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی۔ اور قلعہ رنتھمبور اور چتوڑ کو فتح کر لیا گیا۔ نومسلم منگول سردار محمد شاہ گرفتار ہوا، اور سلطان کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ علاؤ الدین نے ان باغیوں کو قرار واقعی سزا دینے کے لئے اُن کے بیوی بچوں کو جو اس وقت دہلی میں موجود تھے، قید میں ڈال دیا۔

اس بغاوت کے دوران شاہی افواج کے جرنیل نصرت خاں کا بھائی ملک عزّ الدین بھی باغیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ نصرت خاں نے اپنے بھائی کا انتقام باغیوں کے بیوی بچوں سے لیا۔ انہوں نے باغیوں کی عورتوں کو تلنگوں کے سپرد کر دیا۔ جنہوں نے بہت بُری طرح سے اُن کی بے آبروئی کی۔ اُن میں سے بیشتر خواتین کو بازارِ حُسن کے چوہدریوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ بچوں کو اُن کی ماؤں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ اس سے دہلی کے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔

آکت خاں کی بغاوت

۱۳۰۰ء میں سلطان علاؤ الدین خلجی رنتھمبور کی مہم پر جاتے ہوئے راستے میں تلہٹ کے مقام پر شکار کی غرض سے مقیم تھا کہ ایک روز دورانِ شکار اُس کے بھتیجے سلیمان شاہ المعروف آکت خاں نے تخت و تاج کی ہوس میں سلطان کو تنہا پا کر اُس پر اچانک قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اس غیر متوقع اور اچانک حملہ سے سلطان سخت زخمی ہوا۔ آکت خاں نے سمجھا کہ سلطان کا خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ اُس نے شاہی کیمپ میں آکر سلطان کی موت کا اعلان کرتے ہوئے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ درباری، سلطان کی اچانک موت اور آکت خاں کے اعلانِ بادشاہت پر بڑے شش و پنج میں تھے۔ آکت خاں نے حرمِ شاہی کا رُخ کیا۔ لیکن "وہ اپنے چچا کی حرم سرا میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ داروغۂ محل ملک دینار نے مزاحمت کی اور کہا کہ جب تک سلطان کا سر پیش نہ کیا جائے گا، وہ حرم سرا کے اندر داخل نہ ہو سکے گا۔"[1] اسی اثناء میں سلطان کو ہوش آیا اور وہ کیمپ میں پہنچ گیا۔ سب لوگ سلطان کو زندہ پا کر خوش ہوئے اور آداب و تسلیم بجا لائے۔ آکت خاں نے افغانستان بھاگ جانے کی کوشش کی مگر گرفتار ہو کر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اور اُس کے سر کو نوکِ نیزہ پر رکھ کر تمام کیمپ میں پھرایا گیا۔

ملک عُمر خاں اور منگو خاں کی بغاوت

سلطان علاؤ الدین خلجی قلعۂ رنتھمبور کا محاصرہ کئے ہوئے تھا کہ اُس کے ہمشیرزاد بھائیوں ملک عمر خان اور منگو خاں نے سلطان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر بغاوت برپا کر دی۔ یہ دونوں علی الترتیب بدایوں اور اودھ کے حاکم تھے۔ سلطان نے اُن کی گوشمالی کے لیے ایک تادیبی مہم روانہ کی۔ عُمر خاں اور منگو خاں گرفتار ہو کر سلطان کے حضور رنتھمبور لائے گئے۔ سلطان نے اُن کی آنکھیں نکلوا کر انہیں قتل کروا دیا، اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا۔

---

[1] کے ایس لال "ہسٹری آف دی خلجیز۔" صفحہ ۸۸

Marfat.com

حاجی مولا کی بغاوت

سلطان ابھی رنتھمبور کی مہم میں مصروف تھا کہ دہلی میں داتل کی سرکاری اراضی کے ناظم حاجی مولا نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ حاجی مولا دہلی کے سابق کوتوال ملک فخر الدین کا آزاد کردہ ایک غلام تھا۔ وہ بے حد چالاک اور فتنہ پرداز واقع ہوا تھا خلجی خاندان سے اُسے سخت نفرت تھی۔ اُس نے نائب کوتوال کو دھوکے سے مروا کر شاہی خزانہ اور محلات پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے ایلتتمش کے خاندان کے ایک گمنام نوجوان کو تخت پر بٹھا دیا۔ مگر ایک ہی ہفتہ میں امیر حمید الدین نے باغیوں کو تہہِ تیغ کر کے اس بغاوت کو فرو کر دیا اور حاجی مولا کا سر کاٹ کر سلطان کے پاس بھیج دیا۔

ہندوؤں کی سرکشی

دار السلطنت سے سلطان کی عدم موجودگی اور بغاوتوں کی وجہ سے انتظامِ سلطنت متاثر ہوا تو ہندوؤں نے بھی سرکشی اختیار کرتے ہوئے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے اور ٹیکسوں کی ادائیگی میں پس و پیش کرنے لگے۔ مگر جلد ہی اُن کی قرار واقعی گوشمالی کر کے اُنہیں اطاعت گذار ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔

بغاوتوں کے اسباب

بغاوتیں فرو تو کر دی گئیں، مگر علاؤ الدین اُنہیں محض فرو کر دینے پر مطمئن نہ ہوا۔ وہ ان بغاوتوں کے اصل اسباب سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ تاکہ آئندہ اُن کی روک تھام کے لیے مؤثر تدابیر کی جا سکیں۔ اُس نے اُمراء اور اکابرِ حکومت پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ بغاوتوں کے بنیادی اسباب کا کھوج لگائے۔ کافی غور و خوض اور بحث و گفتگو کے بعد کمیشن نے مندرجہ ذیل وجوہات کی نشاندہی کی:

۱۔ اُمورِ مملکت سے سلطان کی بے خبری:

سلطان کو اُمورِ مملکت اور رعایا کے عام حالات نیز عوام کے سیاسی رجحانات کی مناسب اطلاعات نہیں ملتیں، اور سلطان کا نظامِ جاسوسی ناقص ہے۔

۲۔ اُمراء کی مے نوشی کی محفلیں:

اُمراء کی شراب نوشی اور میلوں اور تقریباتِ مسرت میں مے نوشی کی محفلوں کا انعقاد ہے۔ جن میں وہ نشۂ شراب میں مدہوش، اور احتسابِ حکومت سے بے نیاز ہو کر حکومت کے خلاف نہ صرف باغیانہ خیالات کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں بلکہ سازشوں اور بغاوتوں کے منصوبے سوچتے ہیں۔

۳۔ امراء کے تعلقاتِ باہمی اور رشتہ داریاں:

امراء سلطنت باہمی تعلقات استوار کرتے اور ایک دوسرے سے قرابت داریاں قائم کر کے ذاتی اثر و رسوخ بڑھاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن میں اتحاد پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ متحد و ہم خیال ہو کر حصولِ اقتدار کے لیے بغاوت برپا کر دیتے ہیں۔

۴۔ دولت کی فراوانی اور رعایا کی خوشحالی:

حکومت کی خوش انتظامی اور اشیائے ضرورت

Marfat.com

کی ارزانی کی وجہ سے دولت کی عام ریل پیل ہے اور رعایا خوشحال و فارغ البال ہے۔ کثرتِ زر اور خوشحالی کے نشہ سے مخمور ہو کر عوام خود سر، باغی اور تخریب پسند ہو جاتے ہیں۔

بغاوتوں کے انسداد کی تدابیر

سلطان علاؤالدین خلجی نے تحقیقاتی کمیشن کی پیش کردہ اس رپورٹ کی روشنی میں بغاوتوں اور شر انگیزیوں کی تدارک کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل سیاسی و انتظامی اصلاحات (تدابیر) نافذ کیں:

۱۔ محکمۂ جاسوسی کی تنظیمِ نو:

رعایا اور اُمراء پر احتساب رکھنے اور امورِ سلطنت سے باخبر رہنے کے لیے محکمۂ جاسوسی کی از سرِ نو تنظیم کی گئی۔ اس سے محکمۂ جاسوسی اور فرض شناس ہو گیا۔ سلطان نے امراء اور بڑے بڑے افسروں پر جاسوس اور واقعات نگار مقرر کر دئے۔ اس طرح دارالسلطنت یا صوبوں میں جو خصوصی تقریبات ہوتیں، اُن کی تمام روئداد باقاعدہ سلطان کو پہنچ جاتیں۔ جاسوس، بھیس بدل کر اُمراء کے گھرانوں میں ملازم ہو گئے اور امراء کی تمام خفیہ سرگرمیوں اور حرکات و سکنات کی خبریں بہم پہنچانے لگے۔ اس سے امراء خوف زدہ اور محتاط ہو گئے اور سلطان کے خلاف بغاوت کے متعلق کچھ سوچنا تو درکنار، ہنگامِ ملاقات ایک دوسرے سے عام گفتگو کرتے ہوئے بھی گھبرانے لگے۔

۲۔ منشیات پر پابندی:

سلطان نے ایک حکم کے ذریعہ شراب اور دوسری منشیات کی تیاری فروخت اور استعمال کی ممانعت کر دی۔ نیز میلوں، جلوسوں اور شادی بیاہ کے مواقع پر شراب نوشی کی محفلوں کے انعقاد کو قطعاً ممنوع قرار دیا، اور قمار بازی پر سخت پابندی عائد کر دی۔ سلطان نے بذاتِ خود بھی مے نوشی سے توبہ کر لی، اور اپنے طلائی جام و مینا کو دہلی کے بدایونی دروازے کے باہر برسرِ عام توڑ پھوڑ دیا۔ علاوہ ازیں شراب کے تمام برتن توڑ کر اُن میں جس قدر شراب موجود تھی، بے دریغ بہا دی اور اعلان کروا دیا کہ مقررہ تاریخ کے بعد اگر کوئی مے فروش، مے ساز یا مے خوار نظر آیا تو اُسے اندھے کنوؤں میں ڈلوا دیا جائے گا۔

۳۔ اُمراء کے باہمی تعلقات:

اُمراء کے باہمی میل جول اور تعلقات کو ختم کرنے کی غرض سے سلطان نے ایک فرمان کے ذریعے بغیر اجازت جلسے، دعوتیں اور محفلیں منعقد کرنے پر پابندی لگا دی۔ نیز اُن کے لیے باہمی رشتہ داری اور بیاہ شادی کے لیے بھی شاہی اجازت کا حصول لازمی قرار دیا گیا۔ اِن پیش بندیوں سے نہ صرف امراء کی سازشیں اور شر انگیزیاں ختم ہو گئیں بلکہ وہ اس قدر ہراساں اور خوفزدہ ہوئے کہ تخلیہ میں بھی سلطان کے خلاف کوئی بات زبان پر لانے کی جرأت نہ کرتے۔

۴۔ دولت کی فراوانی:

سلطان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ دولت کی فراوانی اور خوشحالی رعایا

Marfat.com

بالخصوص ہندوؤں کو بغاوت پر آمادہ کرتی ہے چنانچہ اُس نے چند ایک ایسی تدابیر اختیار کیں، جن کے نتیجے کے طور پر رعایا خود بخود زیادہ سے زیادہ روپیہ خزانۂ شاہی میں جمع کرانے پر مجبور ہو جائے، اور لوگوں کے پاس محض گزر اوقات کے سوا کوئی چیز وافر نہ ہو۔ نیز ہندو نمبرداروں اور چوہدریوں کا زور بھی ٹوٹ جائے اور اُن پر حکومت کا احتساب مستحکم ہو جائے۔ مثلاً اُس نے :

ا۔ محکمۂ بندوبستِ اراضی قائم کر کے تمام مزروعہ زمین کی پیمائش کروائی اور کُل پیداوار کا نصف حصہ سرکاری لگان مقرر کیا۔ نیز سرکاری ٹیکسوں کی وصولی پر چوہدریوں اور نمبرداروں کی بجائے سرکاری عہدیدار مقرر کئے۔

ب۔ ہر دیہاتی کے لیے خواہ وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ چار بیل، دو بھینسیں، دو گائیں اور بارہ بکریوں سے زائد جانور رکھنے کی ممانعت کر دی۔

ج۔ دیہاتی لوگوں کے لئے گھوڑے کی سواری ممنوع قرار دی۔ تاکہ وہ بغاوت کے وقت فی الفور گھوڑوں پر سوار ہو کر متعینہ جگہ پر نہ پہنچ سکیں۔

د۔ دیہاتوں کے لئے ہتھیار پاس رکھنا قانوناً ممنوع قرار دیا۔

تبصرہ : سلطان علاؤ الدین کے مندرجہ بالا اقدامات سے ترک اور دیگر اُمرار کا زور ٹوٹ گیا۔ اور اُن کی سازشوں اور فتنہ پردازیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اب وہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے کوئی منصوبہ بناتے ڈرتے تھے۔ کیونکہ اب محکمۂ جاسوسی بڑا مستعد، اور فرض شناس ہو چکا تھا۔ سلطان کے ان اقدامات سے ہندو چوہدریوں اور نمبرداروں کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ اُن کی فارغ البالی اور خوشحالی کا زمانہ ختم ہو گیا۔ دولت کی کثرت کا سدِ باب کرنے سے رعایا میں حکومتِ وقت کے خلاف سازشیں کرنے کی سکت نہ رہی۔ غرضیکہ علاؤ الدین کی انتظامی تدابیر کا خاطر خواہ اثر ہوا، اور ملک میں نہ صرف امن و امان اور سکون بحال ہو گیا بلکہ کسی میں بھی علمِ بغاوت بلند کرنے کی ہمت نہ رہی۔

علاؤالدین کی اصلاحات

سلطان علاؤالدین خلجی نے اپنی وسیع و عریض سلطنت کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے، ملکی دفاع کو مضبوط بنانے، داخلی طور پر ملک میں امن و امان قائم رکھنے اور اقتصادی لحاظ سے ملک مستحکم اور خوشحال بنانے کے لئے متعدد اصلاحات نافذ کیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے :

فوجی اصلاحات

ا۔ سلطان علاؤالدین نے ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے بلبن کی سرحدی پالیسی کو مزید بہتر بنا کر از سرِ نو نافذ کیا۔ سرحدوں پر جس قدر پرانے قلعے تھے، سب کی مرمت کا مناسب بندوبست کر کے انہیں ہر لحاظ سے مضبوط و

Marfat.com

مستحکم بنایا اہم مقامات پر مزید نئے قلعے تعمیر کرائے اور اُن میں تربیت یافتہ اور چاق و چوبند فوج کا انتظام کیا۔ نیز اُن پر آزمودہ کار قلعہ دار مقرر کئے۔ قلعوں میں سامانِ حرب اور رسد کا خاطر خواہ انتظام کیا اور اسلحہ سازی کے لیے تجربہ کار انجینئروں (اسلحہ سازوں) کی خدمات حاصل کی گئیں۔

۲۔ علاؤالدین سے قبل سلطنتِ دہلی کی فوج اُمراء اور جاگیرداروں کے مہیا کردہ فوجی دستوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ جنہیں وہ بادشاہ کے حکم سے منظم کرتے اور بوقتِ ضرورت بادشاہ کو مہیا کرتے تھے۔ مگر جاگیرداروں کی مہیا کردہ اس فوج میں نظم و ضبط اور اشتراکِ عمل کا فقدان ہوتا تھا۔ نیز وہ بادشاہ کی بہ نسبت اپنے سرداروں کی زیادہ وفادار ہوتی تھی۔ علاؤالدین پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے جاگیرداری سسٹم ختم کرتے ہوئے تمام فوج کو براہِ راست مرکز کے ماتحت منظم کیا اور اس طرح پہلی بار ایک مستقل شاہی فوج قائم کی۔ یہ فوج پیادہ اور سواروں پر مشتمل تھی۔ ہاتھی بھی جنگ میں استعمال کئے جاتے تھے۔

۳۔ اُس نے سپاہیوں اور فوجی افسروں کو مرکزی شاہی خزانہ سے نقد تنخواہیں دینے کا طریقہ نافذ کیا۔ اور تمام فوج کو دیوانِ عارض کی سپردگی میں دے دیا، جو فوجی بھرتی کا براہ راست ذمہ دار تھا۔ دیوانِ عارض ہی ہر سپاہی کا حلیہ اور اُس کے متعلق جملہ معلومات رکھنے کا ذمہ دار تھا۔

۴۔ سلطان علاؤالدین نے برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں پہلی بار فوج کے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ رائج کیا تاکہ وہ عام گھوڑوں سے ممتاز رہیں اور معائنہ کے وقت جاگیردار حکومت کو کسی قسم کا دھوکا نہ دے سکیں۔ علاوہ ازیں افواج، اسلحہ اور گھوڑوں کی جانچ پڑتال کرنے کا سختی سے اہتمام کیا۔ امیر خسرو کا بیان ہے کہ ورنگل کی مہم پر جانے والی فوج کی پڑتال پر چودہ دن لگے[1]

۵۔ بقول مشہور مؤرخ فرشتہ، علاؤالدین کی فوج چار لاکھ پچھتر ہزار شہسواروں پر مشتمل تھی جو جدید اسلحہ سے پوری طرح لیس تھی۔ علاؤالدین نے فوج کو ترکوں کے طرز پر منظم اور مختلف درجوں میں منقسم کیا۔ ہمعصر مؤرخ ضیاء الدین برنی فوج کی تقسیم کے بارے میں یوں لکھتا ہے کہ ایک سرخیل کے تحت دس شہسوار، ایک سپہ سالار کے ماتحت دس سرخیل، ایک امیر کے زیرِ کماں دس سپہ سالار ایک مَلک کے تحت دس امیر اور ایک خان کے زیرِ قیادت دس مَلک۔"[2]

۶۔ سُلطان نے ہر مجاہد (سپاہی) جو یک اسپہ کہلاتا تھا، کی دو سو چونتیس (۲۳۴) تنکہ خواہ مقرر کی۔ اور اگر کوئی مجاہد دو گھوڑے رکھتا تو اُسے اٹھہتر (۷۸) تنکہ زائد ادا کئے جاتے۔

نظامِ مالگذاری

علاؤالدین خلجی سلطنتِ دہلی کا پہلا فرمانروا تھا جس نے مالگذاری کی اصلاحات میں سیاسی اور فوجی مقاصد کارفرما تھے، تاہم یہ اصلاحات عوام کے لیے بھی بہت مفید ثابت ہوئیں۔ علاؤالدین سے قبل قطب الدین ایبک سے لے کر جلال الدین خلجی تک

---

[1] "خزائن الفتوح امیر خسرو" مترجم ڈاکٹر حبیب۔ صفحہ ۵۸
[2] "تاریخِ فیروز شاہی" صفحہ ۱۴۵

Marfat.com

کسی بادشاہ نے نظام مالگذاری کی اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔ بلکہ قدیم نظام مالگذاری پر ہی اکتفا کیا۔

علاؤالدین ایک بلند پایہ منتظم اور اصلاح کار سلطان تھا۔ وہ نہ صرف ایک جامع نظام سلطنت کے نفاذ کا خواہاں تھا بلکہ ملکی ذرائع پر کنٹرول کے لیے بنیادی تبدیلیاں کر کے سلطنت کے ذرائع آمدن کو انتہائی حد تک بڑھانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اُس کی پالیسی کا مقصد یہ بھی تھا کہ حکومت کی آمدن بڑھ جائے تاکہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک بھاری مستقل فوج قائم کی جا سکے، کثرتِ دولت کا تدارک ہو سکے، طبقۂ خاص کا اقتدار ختم ہو جائے جو فراوانیٔ دولت اور خصوصی اختیارات کے باعث آئے دن حکومت کے خلاف بغاوتیں اور سازشیں کرتے رہتے ہیں نیز ٹیکسوں میں مساوات پیدا ہو جائے۔ علاؤالدین نے مالگذاری کے نظام کے تحت مندرجہ ذیل اصلاحات جاری کیں:۔

۱۔ **جاگیروں کی ضبطی:** علاؤالدین نے پہلی کاری ضرب طاقتور مسلمان اُمراء اور علماء پر لگائی اور اُن سے وہ تمام زمینیں چھین لیں جو انہیں فوجی خدمات کے عوض یا بطورِ انعام یا پنشن یا وقف کے طور پر دی گئی تھیں۔ ان تمام جاگیروں کو خالصہ (شاہی اراضی) میں شامل کر لیا گیا۔ اس سے نہ صرف سلطنت کی آمدن میں اضافہ ہوا، بلکہ اُن امراء کی آمدنی کا انحصار سلطنت کی خیر خواہی، خدمتِ شاہی کی انجام دہی اور بادشاہ کی مہربانی پر منتج ہو کر رہ گیا۔ نتیجۃً وہ سلطنت اور سلطان کے وفادار ہو گئے۔

۲۔ **ہندو رؤسا کا زور توڑنا:** جاگیروں کی ضبطی کے بعد سلطان نے دیہات کے ہندو رؤسا کی طرف توجہ کی۔ یہ لوگ کبھی بھی حکومتِ دہلی کے وفادار و خیر خواہ نہیں تھے۔ بلکہ بسا اوقات بغاوت برپا کئے رکھتے تھے۔ یہ طبقہ زیادہ تر دیہات کے سرپنچوں اور مالیہ جمع کرنے والوں پر مشتمل تھا۔ جو پشتہا پشت سے یہ فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ یہ لوگ کہیں کھوٹ، کہیں مقدم (نمبردار) اور کہیں چوہدری مشہور تھے۔ مالیہ کی وصولی میں حکومت سے تعاون کرنے کے عوض عام ٹیکسوں اور مالیہ سے مستثنیٰ تھے۔ یہ لوگ خاصے دولتمند اور طاقتور تھے۔ کسانوں سے مالیہ وصول کرتے تو بالعموم زیادہ رقمیں وصول کرتے تھے۔ وزارتِ مالیہ کے کارکن وقتاً فوقتاً دورے پر جانچ پڑتال کے لیے آتے تو یہ ہندو مقدم اور چوہدری اُن کا کچھ پاس نہ کرتے تھے اور جمع کئے ہوئے مالیہ میں سے کم از کم، حکومت کے حوالے کرتے۔ یہ لوگ زرِ مالیہ وصول کرنے کا محنتانہ الگ وصول کرتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ خاصے مالدار تھے اور آرام و آسائش اور ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بعض نے پیادہ ملازم بھی رکھے ہوئے تھے، جن کے ذریعہ کسانوں پر دباؤ ڈالتے تھے اور سرکاری حکام کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بلکہ موقع پا کر اور اپنے اثر و رسوخ اور وقار سے کام لے کر مقامی لوگوں کو اکسا کر حکومت کے خلاف

Marfat.com

بغاوت برپا کروا دیتے تھے۔

سُلطان نے ان ہندو مقدموں اور چوہدریوں کا زور توڑنے کے لیے ان کی تمام مراعات منسوخ کر دیں اور عام لوگوں کی طرح اُن پر مساوی ٹیکس عائد کئے۔ مالیہ کی وصولی کا حق بھی اُن سے چھین لیا تاکہ ان کا اور معمولی کاشتکاروں کا فرق مٹ جائے اور کاشتکاروں پر اُن کے حقوق کا بار نہ پڑے۔

۳۔ شرحِ لگان: سلطان نے حکومت کی آمدنی بڑھانے کے سلسلے میں لگان کی شرح کل پیداوار کا نصف حصّہ یعنی پچاس فیصد مقرر کی۔ علاوہ ازیں ہاؤس ٹیکس، جانور چرانے کا ٹیکس اور درآمدی و برآمدی ٹیکس بھی نافذ کئے۔ نیز ہندوؤں پر جزیہ ٹیکس نافذ کیا۔

۴۔ پیمائشِ اراضی: علاؤالدین سے قبل قدیم زمانے سے برّصغیر میں لگانِ اراضی کی وصولی کے دو طریقے رائج تھے۔ 'حُکمِ حاصل' جس کی رو سے ہر فصل کے موقع پر فصل کی مقدار کے مطابق حکومت سرکاری مطالبہ وصول کر لیتی۔ دوسرا طریقہ 'حکمِ مساحت' تھا، جس کی رُو سے زمین کی پیمائش کر کے فی بیگھہ پیداوار کی اوسط مقرر کر لی جاتی۔ اور مقرر شدہ اوسط کے مطابق لگان وصول کر لیا جاتا۔ علاؤالدین سے قبل پہلے طریقے 'حکمِ حاصل' کے ذریعہ لگان کی وصولی ہوتی تھی۔ علاؤالدین خلجی برّصغیر میں پہلا مسلمان بادشاہ تھا، جس نے پیمائش کا طریقہ اپناتے ہوئے کل پیداوار کا نصف حصّہ یعنی پچاس فیصد سرکاری حصّہ مقرر کیا۔ اس طرح حکومت کی سالانہ آمدنی مستقل طور پر دوگنی ہو گئی، مگر عوام کے لیے یہ طریقہ نقصان دہ تھا۔ کیونکہ فصل کی کمی کے زمانے میں بھی عوام کو لگان کی مقررہ مقدار ادا کرنی پڑتی تھی۔ عوام کی اس شکایت کے تدارک کے لیے علاؤالدین نے زمین کو "بُود و نابُود" میں تقسیم کیا، اور حکم دیا کہ جو علاقے یا کھیت 'نابود' یعنی قحط زدہ قرار دئے جائیں اُن کا لگان وصول نہ کیا جائے۔

۵۔ لگان کی وصولی: علاؤالدین نے ہندو مقدموں اور چوہدریوں کی بجائے لگان کی وصولی پر کثیر تعداد میں دیانتدار عہدیدار متعین کئے۔ علاوہ ازیں اُس نے محکمۂ مال کے تمام عہدیداروں کی تنخواہیں بڑھا دیں تاکہ وہ خیانت اور طمعِ زر سے محفوظ رہیں۔ اس پر بھی جن ملازموں نے سرکاری روپیہ کی وصولی یا خزانہ میں ادائیگی اور حساب ہی میں گڑبڑ کی، علاؤالدین نے انہیں بڑی سخت اور عبرتناک سزائیں دیں۔

۶۔ نظامِ مالیہ کا نفاذ: سلطنت کے تمام حصّوں میں ان اصلاحات کا نفاذ ناممکن تھا۔ اس لیے ان کا اطلاق صرف دہلی، پالم پور، دیواری، افغان پُور، امروہہ بدایوں اور کوئل (موجودہ علیگڑھ) نیز شمال مغرب میں دیپالپور، لاہور، سامانہ، سنام کے علاوہ شمالی روہیلکھنڈ کے علاقوں پر کیا گیا۔ علاوہ ازیں جنوب میں مالوہ اور راجپوتانہ کے کچھ حصّہ

Marfat.com

بیانہ اور جھائیں میں نافذ کیا ۔ یعنی یہ نظامِ مالیہ صرف سلطنت کے مرکزی حصّے میں نافذ کیا گیا۔
نظامِ مالیہ کی اصلاحات میں علاؤ الدین خلجی کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی ۔ اس سے نہ صرف حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوا اور وہ مستقل اور یقینی ہوگئی بلکہ ہندو مقدمین (زمینداروں) اور چوہدریوں کا زور ٹوٹ گیا، اور آئندہ کوئی قابلِ ذکر بغاوت نہ ہوئی ۔

اقتصادی نظام

نظامِ مالیہ کی اصلاحات کی طرح اقتصادی نظام میں بھی سیاسی اور فوجی مقاصد کارفرما تھے ۔ منگولوں کے پے در پے حملوں سے تنگ آکر جب سلطان علاؤ الدین خلجی نے مستقل فوج رکھنے کا ارادہ کیا تو اُس کے اخراجات کے لیے روپیہ کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ اس میں شک نہیں کہ علاؤ الدین کے پاس بے انتہا دولت تھی، لیکن اندازہ لگانے سے معلوم ہوا کہ اگر سلطان مناسب تنخواہ پر ایک بھاری فوج کا اہتمام کرتے تو موجودہ تمام خزانہ صرف پانچ چھ سال میں ہی ختم ہو جائے گا۔ سپاہیوں کی تنخواہ کم بھی نہیں کی جا سکتی تھی ۔ کیونکہ اس سے ایک طرف تو فوج میں بددلی اور بے اعتمادی پیدا ہونے کا احتمال تھا اور دوسری طرف لوگوں کا معیارِ زندگی گر جاتا تھا ۔ آخر کافی غور و خوض کے بعد علاؤ الدین اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر اشیائے ضرورت کی قیمتیں کم کر دی جائیں، تو یقیناً سپاہیوں کو کم تنخواہ دینے میں کوئی عذر نہ ہوگا ۔ گو اشیاء کے کم نرخ مقرر کرنے اور اس سلسلے میں قواعد و ضوابط نافذ کرنے میں بہت سی مشکلات درپیش تھیں ۔ لیکن علاؤ الدین کے مزاج کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ مشکلات سے کبھی نہ گھبراتا تھا ۔ چنانچہ جب اُسے یقین ہوگیا کہ یہ منصوبہ مفید بھی ہے اور ممکن العمل بھی، تو اُس نے اپنی اقتصادی حکمتِ عملی کے لیے متعدد ضابطے تشکیل کیے :

اولاً منڈیوں میں اشیاء کی فراہمی کا موزوں نظام ۔ ثانیاً اشیاء کو وافر پیداوار والے علاقوں سے دُوسرے خطّوں میں منتقل کرنے کا مناسب انتظام ۔ ثالثاً اشیائے ضروری کی کمیابی و نایابی کی صورت میں اُن کی حسبِ ضرورت راشن بندی اور تقسیم کا بندوبست ۔ رابعاً خفیہ پولیس کے مخبروں کے ذریعے منڈیوں اور بازاروں میں نرخوں پر کڑی نگرانی اور ناجائز نفع اندوزی اور منڈیوں سے متعلقہ دیگر جرائم کے لیے سخت سزائیں ۔ ان اصولوں کی بنیاد پر علاؤ الدین نے جو اقتصادی نظام استوار کیا، وہ بلاشبہ تاریخ میں بے مثال ہے ۔ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے ۔

اشیاء کی قیمتوں کا تعین

علاؤ الدین خلجی ایک عظیم فاتح اور اعلیٰ درجہ کا ناظم ہونے کے علاوہ ماہرِ اقتصادیات بھی تھا ۔ وہ ہر کام کی انجام دہی میں اس قدر مستعد اور محنتی تھا کہ کسی کام کو ادھورا چھوڑ دینے کا ہرگز قائل نہ تھا ۔ اشیاء کی قیمت بندی میں بھی اُس نے اپنے اسی اُصول کو پیشِ نظر رکھا اور خود بہ نفسِ نفیس اشیاء کی قیمتوں کا تعین کیا ۔ اور تمام مُلک میں

Marfat.com

ان کے نفاذ کا خصوصی اہتمام کیا۔ بعض خاص خاص اشیاء کی قیمتوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱	گندم	فی من[1]	۷½ جتیل[2]
۲	چنا	〃	۵ 〃
۳	دھان	〃	۵ 〃
۴	دال ماش	〃	۵ 〃
۵	جو	〃	۴ 〃
۶	موٹھ	〃	۳ 〃
۷	نمک	۵ سیر	۱ 〃
۸	تلوں کا تیل	۳ 〃	۱ 〃
۹	مصری	فی سیر	۲ 〃
۱۰	شکر سفید	〃	〃
۱۱	شکر سُرخ	〃	〃
۱۲	گُڑ	〃	½ 〃
		〃	⅓ 〃

سبزی، پھل، کلاہ (ٹوپی) کنگھی، جُوتا، سوئی، کوزہ گویا سب اشیاء کی قیمتیں مقرر تھیں۔ حتیٰ کہ غلاموں اور لونڈیوں تک کی قیمتیں مقرر تھیں۔ سلطان علاؤالدین نے ملک قبول کو جو اعلیٰ درجہ کا منتظم دیانتدار اور منصف مزاج تھا، شحنۂ منڈی یعنی غلّہ منڈی کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا۔ جس کا فرض تھا کہ ہر معاملے پر نگاہ رکھے، اور کسی شخص کو مقررہ نرخ سے زائد قیمت وصول نہ کرنے دے۔

فراہمیٔ غلّہ

(۱) خالصہ اراضی (سرکاری زمین) کی کُل پیداوار جنس کی صورت میں جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ علاوہ ازیں علاقہ دوآب میں تمام تر سرکاری لگان بھی نقدی کی بجائے جنس کی شکل میں وصول کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ یہ تمام غلّہ شاہی گوداموں میں جمع ہوتا، نیز دہلی اور اس کے علاقے سے سرکاری لگان کا نصف حصّہ غلّہ کی صورت میں وصول کر کے غلّہ کے تاجروں کے سپرد کر دیا جاتا تاکہ وہ اسے دہلی میں لاکر فروخت کریں۔

(۲) زمینداروں کو صرف اپنی ضرورت کے مطابق سال بھر کے لیے غلّہ جمع رکھنے اور زائد غلّہ کو مقررہ

---

[1] علاؤالدین خلجی کے زمانے میں بھی گو موجودہ زمانے کی طرح ایک من چالیس سیر کا ہوتا تھا، لیکن ایک سیر اکیس تولے کے برابر تھا۔ بہ الفاظِ دیگر آج کے حساب سے ایک من بارہ سیر کا تھا۔

[2] جتیل تانبے کا سکہ تھا۔ ایک تنکہ جو پچاس جتیل کا ہوتا تھا، وزن میں ایک تولہ چاندی کا ہُوا کرتا تھا اور موجودہ زمانے کے ایک روپیہ کے برابر ہوتا تھا۔

Marfat.com

نرخوں پر فروخت کرنے کا حکم دیا۔ محکمۂ مال کے عمال کو ہدایت تھی کہ وہ کاشتکاروں کو زیادہ سے زیادہ غلّہ فروخت کرنے پر مجبور کریں۔

(۳) اگر کبھی خشک سالی یا کسی اور سبب سے تاجر پورا غلّہ شہر میں نہ لا سکتے۔ تو شاہی ذخیروں سے اُنہیں دیا جاتا، تاکہ بہم رسانی میں کوئی خلل نہ واقع ہو، اور قیمتیں اعتدال پر رہیں۔ قحط سالی یا خشک سالی کے زمانے میں ہر روز ہر محلّہ کی ضرورت کے مطابق وہاں کے بقال کو غلّہ فراہم کر دیا جاتا۔ کسی شخص کو اپنی ضرورت سے زائد خریدنے کی اجازت نہ تھی۔

نقل و حمل

(۱) دیہات سے دارالسلطنت دہلی تک غلّہ لانے کا ایسا مؤثر بندوبست کیا گیا کہ کبھی اس میں خلل نہ پڑا۔ تمام بنجاروں اور غلّہ فروشوں کو دریائے جمنا کے ساحلی دیہات میں آباد کیا گیا اور اُن سے باقاعدہ اقرار نامہ لیا گیا کہ وہ مُلک کے مختلف حصّوں سے غلّہ خرید کر منڈیوں میں لایا کریں۔ اُن کی نگرانی شحنۂ منڈی کے سپرد کی گئی۔

(۲) نقل و حمل اور غلّہ منڈی کے نرخوں سے باخبر رہنے کے لیے ایک کلرک اور کئی خفیہ مخبر مقرر کئے گئے تاکہ وہ سلطان کو بازار اور منڈی کے نرخوں سے باخبر رکھیں۔ ہر روز شحنۂ منڈی اور مخبر الگ الگ سلطان کو بازار کے حالات کی رپورٹ دیتے۔ رپورٹوں میں تفاوت ہونے پر اُن کو جوابدہ ہونا پڑا۔

(۳) ذخیرہ اندوزوں اور بلیک مارکیٹ کرنے والوں کے لیے سخت سزائیں مقرر تھیں۔ ان پیش بندیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی شخص کو سرکاری نرخ سے سرِمُو تجاوز کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ خشک سالی کے دنوں میں بھی جب غلّہ کمیاب ہوتا تھا تو قیمتیں بدستور اعتدال پر رہتیں اور غلّے کی فراہمی میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔

راشن بندی

دہلی میں سرکاری گوداموں میں غلّہ وافر مقدار میں جمع رہتا۔ سخت قحط کے ایام میں راشن بندی کر دی جاتی۔ سرکاری ڈپو کھول دئے جاتے، جہاں غلّہ سرکاری گوداموں سے سپلائی کیا جاتا۔ راشن بندی کے باوجود بھی اگر کوئی شخص غلّہ حاصل نہ کر سکتا تو متعلقہ حکّام سے سخت باز پُرس کی جاتی۔

قحط سالی کا مقابلہ کرنے کے لیے، نیز غلّہ اور دیگر اشیاء کی چور بازاری کے سدِّ باب کے لیے علاؤالدین نے سخت اقدامات کئے۔ تمام بنجاروں اور تاجروں کے نام رجسٹر کئے گئے، اور اُنہیں ایک دوسرے کی ضمانت دینے کا پابند کیا گیا تاکہ وہ ہر وقت احتسابِ حکومت سے خوفزدہ رہیں، اور تمام اشیاء راشن بندی کے تحت مہیّا کرتے رہیں۔

قیمتی اشیاء اور کپڑے کا کنٹرول

اشیائے خوردنی کے علاوہ قیمتی اشیاء مثلاً عمدہ کپڑا نبات، عمدہ شکر، میوہ جات، گھی، جلانے کا تیل وغیرہ کی قیمتوں کا بھی کنٹرول کیا گیا۔ کیونکہ ان کی فروخت میں بے حد چور بازاری سے کام لیا جاتا تھا۔ سلطان کے

Marfat.com

حکم سے ان چیزوں کی فروخت کا انتظام دہلی کی ایک خاص منڈی میں کیا گیا، جسے سرائے عدل کہتے تھے جو بدایونی دروازہ کے اندر کوشکِ سبز (شاہی محل) کے متصل واقع تھی۔ انواع و اقسام کے کپڑوں کے نرخ مقرر کئے گئے۔ زائد قیمت وصول کرنے والے تاجر کو سخت سزا دی جاتی تھی۔

کپڑے کے تمام تاجر 'دیوانِ ریاست' میں اپنے نام درج کراتے تھے اور ایک اقرار نامہ پر دستخط کرتے تھے کہ وہ کثرت سے کپڑا سرائے عدل میں بغرضِ فروخت لایا کریں گے۔ ملتانی ہندو تاجروں کو جو دور و دراز سے قیمتی اشیاء اور کپڑا لاتے تھے، بیس لاکھ تنکہ کی رقم بطور امدادی قرضہ دی گئی تاکہ انہیں مختلف اقسام کا کپڑا اور قیمتی اشیاء دہلی لانے میں سہولت ہو۔

سرائے عدل میں خرید و فروخت کے اوقات صبح سے ظہر کی نماز تک مقرر تھے۔ سرائے عدل کا افسر اعلیٰ رئیسِ بازار کہلاتا تھا۔ جس کے ماتحت قیمتوں کی نگرانی کرنے والے متعدد عمّال تھے۔ امراء تک کو عمدہ اور ریشمی کپڑا رئیسِ بازار کے جاری کردہ اجازت نامہ (پرمٹ) پر ملتا تھا۔

گھوڑوں کی قیمت بندی

قرونِ وسطیٰ میں گھوڑے فوج کا ایک اہم حصہ ہوتے تھے۔ اور سلاطین کی عسکری قوت کا انحصار بڑی حد تک عمدہ نسل کے برق رفتار گھوڑوں پر ہوتا تھا۔ اس لیے اُن کی قیمتیں وقتاً فوقتاً بڑھتی رہتی تھیں۔ چنانچہ سلطان نے گھوڑوں کی قیمت بندی بھی ضروری خیال کی اور مختلف انواع کے گھوڑوں کی قیمتیں مقرر کیں علاوہ ازیں گائے بھیڑ وغیرہ کی قیمتیں بھی مقرر کیں، جو درجِ ذیل ہیں :-

۱-	گھوڑا اعلیٰ قسم	سو سے ایک سو بیس تنکہ تک
۲-	گھوڑا درمیانی قسم	۸۰ سے ۹۰ تنکہ تک
۳-	گھوڑا	۶۵ سے ۷۰ تنکہ ،،
۴-	یابو (ٹٹو)	۱۲ سے ۲۰ تنکہ ،،
۵	گائے	۲ تنکہ سے ۴ تنکہ ،،
۶	بھیڑ	۱۰ جتیل سے ۱۴ جتیل تک

تبصرہ

قیمت بندی میں سلطان علاؤالدین خلجی کو خاصی کامیابی ہوئی۔ سلطان کے ہمعصروں اور عوام کو سب سے زیادہ اچنبھا اس بات پر تھا کہ خشک سالی اور خراب فصل ہونے پر بھی کسی چیز کی قیمت مقررہ نرخ سے ایک پیسہ بھی نہ بڑھتی تھی۔ بعض خوش اعتقاد مسلمان اسے شیخ نظام الدین اولیاء کی دعا کی برکت قرار دیتے تھے۔ علائی عہد کی ارزانی اور فراوانیٔ اشیاء دہلی میں مدتوں ضرب المثل رہی۔ فی الواقعی یہ امر سلطان کی اقتصادی سمجھ [illegible] ہے کہ اُس کا رائج کردہ نظام خشک سالی، خرابیٔ

Marfat.com

تھا۔ لیکن اس سے عام رعایا کو بھی بہت آسائش اور آسانی ہوئی۔

اشیاء کی ارزانی اور اس انتظامی نظام کی کامیابی کی بدولت سلطان علاؤ الدین نے معمولی تنخواہوں پر ایک بہت بڑی فوج تیار کر کے منگول حملہ آوروں کے منہ پھیر دئے۔ گھوڑ سوار سپاہی کو ۲۳۷ تنکہ سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ پیدل سپاہی ۸۷ تنکہ حاصل کرتا تھا۔ غلہ، اسلحہ اور سامانِ زندگی کی فراہمی کی بدولت سب لوگ ان تنخواہوں پر فارغ البالی اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

آخری ایام اور موت

علاؤ الدین خلجی کے آخری ایام مایوسیوں اور مشکلات سے بھرپور تھے۔ اُس کی صحت کثرتِ کار کی وجہ سے روبہ زوال تھی۔ نیز جوانی خون کے تیز ہو جانے کی وجہ سے اُس کی طبیعت میں خود رائی، درشتی اور غیظ و غضب پیدا ہو گیا تھا اور مزاج میں چڑچڑا پن آ گیا تھا۔ اُسے کسی شخص پر اعتماد نہ رہا تھا۔ چنانچہ اُس نے حکومت کے جملہ اختیارات اپنے محبوب غلام ملک کافور کو سونپ دئے تھے۔ لیکن ملک کافور خاندانِ خلجی کی بربادی کا موجب ہوا۔ کیونکہ وہ در پردہ خود سر برآرائے سلطنت ہونا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ تخت کے تمام دعویداروں کو ایک ایک کر کے راستے سے ہٹاتا رہا تھا۔ گجرات کا صوبیدار الپ خاں جو اپنے دور کا ایک عقلمند جرنیل، ملکہ جہاں کا بھائی اور ولیعہدِ سلطنت خضر خاں کا ماموں اور خسر تھا، کافور کی نظروں میں بہت کھٹکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ خضر خاں کا پشت پناہ تھا۔ کافور نے سلطان کو بہکایا کہ ملکہ جہاں، خضر خاں اور الپ خاں حضور کی جان کے درپے ہیں اور انہوں نے سازش کی ہے کہ جہاں پناہ کو ہلاک کر کے خضر خاں کو بادشاہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ سلطان نے الپ خاں کو گجرات سے بُلا کر قتل کروا دیا۔ ولیعہدِ سلطنت خضر خاں اور ملکہ جہاں کو قید میں ڈال دیا اور اپنے سب سے چھوٹے اور نابالغ لڑکے شہاب الدین کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔

اسی اثنا میں الپ خاں کی موت کے بعد گجرات میں بغاوت برپا ہو گئی۔ چتوڑ پر رانا ہمیر دیو اور دیوگڑھی پر رام چندر دیو کے داماد ہر پال دیو نے قبضہ کر لیا۔ اور انہوں نے اسلامی افواج کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ ان واقعات کی وجہ سے سلطان کی ہمت ٹوٹ گئی۔ بالآخر اُس نے ۲ جنوری ۱۳۱۶ء کو بیس سال حکومت کرنے کے بعد اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔[1]

سلطان علاؤالدین کا مدفن دہلی کی مسجد "قوۃ الاسلام" کے صحن میں ہے۔ جو اُس کی سطوتِ شاہانہ اور بے مثال عظمت و جلالت کا نوحہ خواں ہے۔

علاؤ الدین کا نظریۂ بادشاہت

سلطان علاؤ الدین خلجی نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن کے نظریۂ بادشاہت کو بحال کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ علامہ [illegible] بادشاہت کو عام سطح [illegible] تصور کرتا تھا، اور اپنے

[1] [illegible]

Marfat.com

آپ کو کرۂ ارض پر اللہ تعالیٰ کا نمائندہ سمجھتا تھا۔ وہ اس امر کا یقین کی حد تک قائل تھا کہ بادشاہ کو دوسرے انسانوں کی بہ نسبت عقلِ سلیم کا وافر حصہ ملتا ہے۔ اس لیے اُس کی مرضی کو قانون کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اس مقولے کا حامی تھا کہ بادشاہت کے نزدیک رشتہ داری ہیچ ہے، ملک کے جملہ باشندے یا تو اُس کی رعایا ہیں یا خادم۔

تیرھویں صدی عیسوی کے دوران، سلطنتِ دہلی کے کاروبار میں امراء اور علماء کے دو مضبوط گروہوں کے اثر و نفوذ کو دخل رہا۔ علاؤالدین خلجی امراء کی بالادستی کا قائل نہ تھا اور نہ ہی اپنی حکمتِ عملی کو اُن کے زیرِ اثر رکھنے کا قائل تھا۔ بلکہ وہ انہیں محض خادموں کی حیثیت دینا بہتر سمجھتا تھا، کہ جن کو سلطان اپنی مرضی سے بحال اور معطل کر سکے۔ اس نے دربار میں اس قدر رعب و دبدبہ طاری کیا، کہ درباریوں کو اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھی مشورہ دینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ صرف کوتوالِ دہلی علاء الملک کو ہی یہ جرأت حاصل تھی کہ بادشاہ کو برملا کچھ کہہ سکے۔

علماء کے متعلق سلطنتِ دہلی کی تاریخ میں پہلی بار علاؤالدین نے یہ واضح کیا کہ امورِ سلطنت میں وہ اُن کا کوئی مشورہ قبول کرنے کو تیار نہیں، اور وہ روحانی پیشواؤں کی بہ نسبت رعایا اور سلطنت کی فلاح و بہبود کے متعلق بہتر جانتا ہے۔ اُس نے اپنی پالیسی واضح کرتے ہوئے کہا:

"میں قانون اور لاقانونیت کے متعلق کچھ نہیں جانتا، اور جو کچھ میں مُلک کی بہتری اور ہنگامی حالات کے لیے موزوں سمجھتا ہوں، کرتا ہوں۔ روزِ قیامت مجھ سے کیا سلوک ہوگا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

علاؤالدین کے نزدیک سیاست سے مذہب کو کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُس کے خیال میں بادشاہ کا فرض ملک کا نظم و نسق چلانا ہے، اور شرع پر عمل پیرا ہونا صرف علماء اور روحانی پیشواؤں کا فریضہ ہے۔ اس طرح سے علاؤالدین دہلی کی ترکش سلطنت کا پہلا سلطان تھا، جس نے حکومت کو مذہب سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ بلکہ اُس نے حکومت کو سیکولر نظریہ کے تحت استوار کیا۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ علاؤالدین عقائدِ اسلامی سے ہٹ گیا تھا، اور مسلمان نہ رہا تھا۔ حقیقتاً وہ اپنے پیشروؤں کی مانند پکا مسلمان تھا۔

علاؤالدین اپنے حقِ بادشاہت کی توثیق کے لیے سندِ خلافت کا بھی قائل نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے منشورِ خلافت کے حصول کے لیے کوئی کوشش نہ کی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو خلیفہ کا نائب، یمین الخلافۃ ناصر امیر المومنین کہلاتا تھا۔ امیر خسرو اپنی منظوم تصنیف خزائن الفتوح، میں علاؤالدین کے خطابات اس طرح بیان کرتا ہے: سلطانِ جہاں، سلطانِ شہنشاہاں، فاتحِ وقت اور رعایا کا نگہبان۔ ان خطابات سے بھی صاف واضح ہے کہ سلطان مطلق العنان تھا، اور اُس کا عہد مطلق العنانی کا عہد تھا۔

Marfat.com

کردار اور کارنامے

مورخین سلطان علاؤالدین خلجی کے کردار اور کارناموں کے متعلق متضاد آراء رکھتے ہیں۔ مشہور مؤرخ الفنسٹن کا قول ہے کہ علاؤالدین کا عہدِ حکومت باوجود بغاوتوں، سازشوں اور بیرونی حملوں کے نہایت شاندار تھا۔ بلاشبہ اُس نے ایک کامیاب حکمران کی طرح اپنی قوت کو عدل گستری کے لیے استعمال کیا۔ لین پول کی رائے میں "علاؤالدین اعلیٰ ذہانت اور عزم و استقلال کا مالک تھا۔ وہ ہمیشہ صورتِ حالات کو بھانپ کر تدابیر اختیار کرتا، اور اُن پر تندہی سے عمل پیرا ہوتا تھا۔" فرشتہ کا بیان ہے، کہ "وہ سختی سے انصاف پر کاربند تھا۔ چوری اور راہزنی جو پہلے عام تھی، اب قطعاً مفقود تھی۔ مسافر سفر میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے اور سوداگر خلیج بنگالہ سے کابل تک اور تلنگانہ سے کشمیر تک اپنا سامان بحفاظت لے جاتے تھے۔ سلطان صوم و صلوٰۃ کا پابند نہ تھا۔ اُس نے نئی دِلّی آباد کی، جو سری کے نام سے مشہور تھی۔ اُس نے قطب الدین ایبک کے دَور کی عمارتوں میں کئی ایک نئی عمارتوں کا اضافہ کیا۔ اگرچہ وہ خود صاحبِ علم نہ تھا مگر علم و ادب کا سرپرست اور اہلِ علم و دانش کا قدردان تھا۔ اُسے خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ساتھ گہری عقیدت تھی۔ امیر خسرو اُس کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ علاؤالدین ہر کام اپنی عقل اور مرضی کے مطابق سرانجام دیتا تھا۔ علماء بھی اُس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔"

لیکن اِن آراء کے بخلاف عہدِ جدید کا مشہور مؤرخ وی۔ اے۔ سمتھ لکھتا ہے کہ "علاؤالدین ظالم و جابر تھا اور اُس میں انصاف کرنے کا جذبہ نہ تھا۔"

سلطان علاؤالدین کا شمار تاریخِ عالم کے عظیم المرتبت فرمانرواؤں میں ہوتا ہے۔ اُس نے غیر معمولی ذہانت و استعداد کا مظاہرہ کرکے ملک میں مکمل امن و امان قائم کیا اور سارے برِصغیر کو زیرِ نگیں کرکے اپنا اقتدار قائم کیا۔ وہ تمام سلاطینِ دہلی میں بلند مقام رکھتا ہے اور جہانگیری و جہانبانی دونوں میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ اُس کی تخت نشینی کے وقت منگولوں نے شمال مغربی سرحد پر قیامتِ صغریٰ برپا کر رکھی تھی۔ مُلک میں انتشار اور طوائف الملوکی کا دَور دَورہ تھا۔ بلبن کی نسلی تفوق کی پالیسی نے خلجیوں کو عوام کی نگاہ میں بہت پست کر دیا تھا۔ علاؤالدین نے ان سب مشکلات اور نسلی عصبیت کے باوجود کمال اولوالعزمی سے سب مشکلات کا انسداد کرکے اپنا اقتدار قائم کیا۔ اگرچہ بعض مؤرخین اُسے ظالم و جابر بتاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جبر و تشدد کے بغیر وہ اپنے ماحول پر غالب نہیں آسکتا تھا۔

علاؤالدین کو بلاشبہ برِصغیر میں ترکش ایمپائر کا معمار کہا جاسکتا ہے۔ اُس کے دورِ حکومت میں ترک بادشاہت اپنے عروج کو پہنچی۔ اُس کے تمام پیشروؤں نے منگولوں کے آنے دن کے تمام سلطنت دہلی کے تحفظ کے لیے مؤثر اقدامات کرنے، اور اندرونِ مُلک فتوحات سے پہلوتہی کی۔ لیکن علاؤالدین نے سلطنتِ دہلی میں زندگی کی نئی رُوح پھونک دی۔ سلطان معزّالدین محمد غوری اور قطب الدین ایبک نے تسخیر و توسیع کا جو کام جہاں چھوڑا تھا، علاؤالدین نے اُسے وہیں سے از سرِ نو شروع کیا۔ اُس نے

Marfat.com

ایک طاقتور عظیم فوج منظم کر کے نہ صرف گجرات، مالوہ اور جنوبی ہند تک اپنی فتوحات کے دائرے کو وسیع کیا، بلکہ ایک منظم و مستحکم سرحدی پالیسی اپنا کر منگولوں کے حملے کا مستقل سدِ باب کیا۔ وہ طبعی طور پر فتوحات کا شیدائی تھا۔ وہ برِ صغیر پاک و ہند کا پہلا مسلمان حکمران تھا، جو فاتح کی حیثیت سے دکن میں گیا، اور وہاں اسلامی سطوت و ثروت کی بنیاد ڈالی۔ وہ آہنی عزم و استقلال کا انسان تھا۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتا، دنیا کی کوئی طاقت اُسے اس سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ اگرچہ خود میخوار تھا۔ لیکن جب شراب بندی کے احکام نافذ کئے تو خود بھی شراب خوری سے توبہ کی اور تمام جام و سبو توڑ ڈالے۔ دیوگڑھ کی مہم نہ صرف اس کے عزم و استقلال عسکری ذہانت اور مضبوط ارادے کی غمازی کرتی ہے، بلکہ اُس کے ایک بہادر سپاہی اور اعلیٰ جرنیل ہونے کا بھی واضح ثبوت ہے۔

اُس کا قائم کردہ نظامِ حکومت بالخصوص اقتصادی نظام اپنی مثال آپ تھا۔ مرکزی حکومت کے استحکام کے لیے اُس نے ایک مرکزی فوج منظم کی۔ اور اپنے لامحدود اختیارات کو سلطنت کی سیاسی اور معاشی تنظیم کے لیے استعمال کیا۔ اُس نے علماء پر اُمورِ مملکت میں مداخلت کا دروازہ بند کر دیا۔ سلطان کی اپنی ذات ایک محور کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس کے گرد نظامِ حکومت کی تمام مشینری گھومتی تھی۔ اُس کا عزم سب سے بڑا قانون ساز ادارہ تھا۔ مقامی آبادی کو اطاعت گذار بنانا، منگولوں کے حملوں کا سدِ باب کرنا اور ایک فقید المثال اقتصادی نظام کا نفاذ ایسے کارنامے ہیں جو اُسے ایک عدیم النظیر ناظم کی حیثیت سے تاریخِ برِ صغیر میں زندۂ جاوید بنائے ہوئے ہیں۔

علاؤالدین کے جاہلِ محض اور شعر و ادب سے بیگانہ ہونے کے باوجود، اُس کا عہدِ حکومت ادبی اور تمدنی لحاظ سے نہایت ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ سلطان کو خود علوم سے دلچسپی نہ تھی لیکن اُس نے ایسے حالات پیدا کئے، جن میں تہذیب و تمدن کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور علوم کو ارتقاء میسر آتا ہے۔

علاؤالدین کو فنِ تعمیر سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ اُس نے مسجدِ قبۃ الاسلام، کو وسعت دی اور اُس کے لئے سنگِ مرمر اور سنگِ سُرخ کا ایک ایسا عمدہ اور عالیشان دروازہ بنوایا، جو دیکھنے میں انتہائی خوبصورت تھا۔ اُس کا نام علائی دروازہ، رکھا گیا۔ یہ مسجد کے صدر دروازہ کے طور پر بنوایا گیا تھا۔ اس کا تناسب اتنا مکمل، گنبد اتنا سڈول اور اس کی تزئین و آرائش کا کام اتنا متوازن تھا کہ اُسے اسلامی فنِ تعمیر کا بیمثال شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علاؤالدین نے مسجدِ قبۃ الاسلام میں بڑی خوبصورت اور جالی دار محرابوں کا بھی اضافہ کیا۔

اُس کے لڑکے خضر خاں نے جو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا مرید تھا، اپنے مُرشد کی زندگی میں ہی اُن کے مدفن کے لیے ایک عالیشان گنبد تعمیر کروایا، لیکن خواجہ نظام الدینؒ اتنے سادگی پسند اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے کہ انہوں نے اس میں اپنے جسدِ خاکی کو دفنائے جانے کی مخالفت کر دی۔ اس پر شہزادے

Marfat.com

نے اس کے دونوں طرف کمرے بنوا کر اُسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ جواب تک 'مسجدِ جماعت خانہ' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد ساری کی ساری سُرخ پتھر سے بنی ہوئی ہے۔ اس میں بڑی بڑی جھالردار محرابیں بھی ہیں۔ بعد میں اس مسجد کے صحن میں خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کو دفن کیا گیا، اور اُن کے مزار پر ایک عالیشان گنبد تعمیر کرا دیا گیا۔ مسجد قُبۃُ الاسلام کے شمال کی جانب سلطان علاؤالدین نے قطب مینار کی طرز کا ایک نیا مینار تعمیر کرانا شروع کیا۔ لیکن ابھی اس مینار کی ایک ہی منزل تعمیر ہوئی تھی کہ اُس کا انتقال ہو گیا اور یہ مینار ادھورا رہ گیا۔

علاؤالدین خلجی کے جانشین

۱۔ مَلک کافور

جنوری ۱۳۱۶ء میں علاؤالدین کی وفات کے بعد ملک کافور نے اُس کے چھ سالہ بیٹے عمر و خاں کو شہاب الدین کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔ اور اُس کے نائب کی حیثیت سے زمامِ اختیار خود سنبھال لی۔ اُس نے علاؤالدین کے دونوں بڑے لڑکوں خضر خاں اور شادی خاں کو اندھا کرا دیا اور ملکہ جہاں کو قید میں ڈال دیا۔ ملک کافور نے علاؤالدین کی ایک اور بیوہ سے شادی کر لی۔ اُس نے علاؤالدین کے تیسرے بیٹے مبارک خاں کی آنکھیں نکلوانے کے لیے کئی بار 'محلِ ہزار ستون' میں اپنے آدمی بھیجے۔ مگر وہ ہر بار کسی نہ کسی طرح بچ جاتا رہا۔ خاندانِ علائی کے پُرانے نمکخواروں اور وفادار امراء کو اُس نے ایک ایک کر کے الگ کرنا شروع کیا۔ اِس صورت حال کو دیکھ کر علاؤالدین کے چند وفادار سپاہیوں کو غیرت آئی اور ایک رات اُنہوں نے محل میں گھُس کر ملک کافور کو قتل کر دیا۔ ملک کافور صرف پینتیس روز تک برسرِ اقتدار رہا۔

۲۔ سلطان قطبُ الدین مبارک خلجی

۱۳۱۶ء تا ۱۳۲۰ء

ملک کافور کے قتل کے بعد امراء نے علاؤالدین کے تیسرے بیٹے مبارک خان کو قید سے نکال کر نائب السلطنت مقرر کیا۔ کچھ عرصہ تک وہ اس عہدے پر کام کرتا رہا۔ بالآخر اُس نے اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین کو قید کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں اُس نے شہاب الدین کو اندھا اور اپنے بڑے بھائیوں خضر خاں اور شادی خاں کو قتل کرا دیا، اور دیول رانی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔

قطبُ الدین مبارک خلجی نے تخت نشین ہوتے ہی عفوِ عام کا اعلان کرتے ہوئے اپنے باپ کے عہد کے ستّر ہزار سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا اور امراء کے وظائف اور اُن کی جاگیروں میں اضافہ کر دیا۔ نیز اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے افواج کو چھ ماہ کی تنخواہ بطورِ انعام عطا کی۔ علاوہ ازیں اُس نے باج و خراج کی رقم بھی کم کر دی اور قید و بند کی صعوبتوں کو نرم کر دیا۔ اس سے وہ جلد ہی عوام میں

Marfat.com

مقبول ہوگیا۔ مبارک خلجی نے علاؤ الدین کے نافذ کردہ ضوابط و قوانین اور مالگذاری و اقتصادی نظام کو بھی منسوخ کر دیا۔ اس سے تجارت پیشہ طبقہ میں اس کے اس اقدام سے خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، اور وہ من مانی قیمتوں پر اشیائے ضرورت فروخت کرنے لگے۔ شراب کی دکانیں از سرِ نو کھل گئیں۔ رشوت ستانی اور دھوکہ و فریب کا بازار گرم ہوگیا۔ عمالِ حکومت رشوت سے اپنے ہاتھ خوب رنگنے لگے۔ ہندوؤں پر عائد شدہ ٹیکسوں کی شرح بھی کم کر دی گئی۔ نتیجتہً ہندو بڑے ٹھاٹھ سے رہنے لگے۔ الغرض سارے ملک میں فسق و فجور اور لہو و لعب کا ماحول عام ہوگیا۔ تاہم ہر طرف بادشاہ کی تعریفیں ہونے لگیں۔

دکن کی مہم

قطب الدین مبارک خلجی نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے آپ کو سلطان کیقباد کی طرح عیش و عشرت میں ڈال دیا۔ دربارِ شاہی مسخروں اور بھانڈوں کا اڈا بن گیا۔ شہر والے بھی دربار کی تقلید میں پیچھے نہ رہے اور عہد علائی کا اخلاقی معیار خواب و خیال ہو کر رہ گیا۔ فراوانیٔ دولت اور عیش کوشیوں کے باعث امراء اور خواص میں باندیوں اور غلاموں کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی۔ خود قطب الدین گجرات کے ایک کم ذات نومسلم پر بہت مہربان تھا جسے اس نے خسرو خاں کا خطاب عطا کیا جو خلجی خاندان کے لیے دوسرا ملک کافور ثابت ہوا۔

دیوگڑھی میں راجہ رام دیو کی وفات کے بعد راجہ ہرپال دیو نے بغاوت برپا کر دی چنانچہ سلطان قطب الدین مبارک، خسرو خاں کی معیت میں راجہ ہرپال کی گوشمالی کے لیے دکن روانہ ہوا اور ملک شاہین نامی ایک غلام کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا۔ بغاوت جلد فرو ہوگئی۔ اور ہرپال کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سلطان نے دیوگڑھی میں ملک یک لکھی کو حاکم مقرر کیا۔ اسی دوران مرہٹوں کا علاقہ مہاراشٹر بھی فتح ہو کر سلطنتِ دہلی میں شامل ہوا۔ وہاں مسلمان حاکم متعین کئے گئے۔ اس مہم کی کامیابی سے سلطان اس قدر خوش اور بدمست ہوا، کہ اس نے خسرو کو چتر شاہی بخشا، اور اسے تمام دکن کا نائب السلطنت مقرر کیا۔ دکن سے دہلی کے سفرِ مراجعت میں سلطان علاؤالدین کے چچا زاد بھائی ملک اسد الدین نے مبارک خلجی کو قتل کر کے خود برسرِ اقتدار آنے کی سازش کی لیکن ناکام ہوا۔ سلطان نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرا دیا۔ اور دہلی پہنچ کر اس کے کمسن بچوں اور عزیزوں کو قتل اور عورتوں کو بے خانماں کر دیا۔

قطب الدین مبارک خلجی کا انجام

دہلی پہنچ کر قطب الدین مبارک خلجی بدستور فسق و فجور میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے اپنے بھائیوں خضر خاں شادی خاں اور شہاب الدین کو قتل کروا دینے کے بعد ظفر خاں حاکم گجرات اور ملک شاہین جیسے امراء کو بھی قتل کروا دیا۔ اب سلطان کو اپنے کردار کے علاوہ اپنی زبان پر بھی قابو نہ رہا تھا۔ وہ اکثر عالمِ طیش میں ہر ایک کو غلیظ گالیاں دیتا تھا۔ بعض اوقات تو وہ عورتوں کے کپڑے پہن کر اپنے مصاحبوں کے مجمع میں چلا جایا کرتا تھا۔ اور ان کے سامنے رقص و سرود کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس نے صوم و صلوٰۃ کو یکسر ترک کر دیا تھا۔ مبارک

Marfat.com

جلجی کی ان گھٹیا اور مذموم حرکتوں سے شاہی خاندان کا وقار اور دبدبہ خاک میں مل گیا۔ اُس نے اپنے تمام اختیارات کمین زاد خسرو خاں (نام نہاد نو مسلم) کے ہاتھ میں دے دئے۔ اور قلعۂ شاہی کا انتظام بھی اُس کے سپرد کر دیا۔ جو بجائے شکر گذار ہونے کے اپنے محسن کا خاتمہ کر کے تاج و تخت پر قابض ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔ اُس نے اپنے ہم قوم ہندوؤں اور حامیوں کو دہلی میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ ملک ضیاء الدین وکیلِ دَر نے سلطان کو خسرو خاں کے عزائم سے آگاہ کرتے ہوئے محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ اس پر عمل کرنا تو در سلطان نے ان سب باتوں سے خسرو خاں کو مطلع کر دیا اور اُس کے سامنے ملک ضیاء الدین کو ذلیل و خوار کیا۔ آخر اپریل ۱۳۲۰ء میں خسرو نے ایک روز اپنے ہم قوم ساتھیوں کی مدد سے چور دروازے سے محلِ شاہی میں داخل ہو کر مبارک خلجی کو قتل کر دیا اور اُس کا سر کاٹ کر محل کے صحن میں پھینک دیا۔ خسرو نے علاؤالدین کی بیوہ ملکہ جہاں اور دوسرے شہزادوں اور شہزادیوں کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

سُلطان ناصر الدین خسرو خاں

مبارک خلجی کو قتل کرنے کے بعد خسرو خاں نے بلا تاخیر راتوں رات تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور ناصر الدین کا لقب اختیار کیا۔ اُس نے اپنے عزیزوں اور حامیوں کو اعلیٰ عہدے عطا کئے۔ خسرو برائے نام مسلمان تھا یہی وجہ تھی کہ اُس کے ہمنواؤں میں ایک بڑی جماعت ہندوؤں کی تھی جنہیں اُس نے سلطنت کے کلیدی عہدوں پر فائز کیا۔ اِسی لیے مسلمان مؤرخین نے اُس کے مختصر عہدِ حکومت کو رام راجیہ (ہندو راج) سے تعبیر کیا ہے۔ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ اُس کے عہد میں ہندو بہت زور پکڑ گئے تھے۔ قرآنِ حکیم اور مساجد کی کھلم کھلا بے حرمتی کی جاتی تھی۔ اُس نے بڑے بڑے امراء کو قتل کروا دیا۔ ملک فخر الدین جونا خاں ہی ایک امیر ایسا تھا، جو اپنے عہدے پر فائز رہا اور جسے خسرو خاں نے انعام و اکرام سے خوب نوازا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اُس کا باپ غازی ملک تغلق پنجاب اور سندھ کے سرحدی صوبوں کا گورنر اور شمالی سرحد کا محافظ تھا۔ اور ملک کی بہترین فوج اُس کے زیرِ کمان تھی۔ خسرو خاں کو ہر وقت اُس کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔

خسرو خاں کا انجام

۶ ستمبر ۱۳۲۰ء

سطوتِ اسلام کی تباہی، خاندانِ علائی کی بربادی اور ہندوؤں کے تفوق و اقتدار نے مسلمانوں میں جذبۂ قومیت پیدا کر دیا، اور انہوں نے دیپالپور کے گورنر غازی ملک تغلق کی سرکردگی میں خسرو خاں کی غاصبانہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ غازی ملک کا بیٹا فخر الدین جونا خاں دہلی میں مقیم تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح دہلی سے بھاگ کر باپ کے پاس دیپالپور چلا آیا۔ بیٹے کی طرف سے مطمئن ہو کر غازی ملک نے غاصب خسرو خاں کے خلاف انتقامی اقدام کی ٹھان لی۔ اُس نے مُلک کے دیگر گورنروں اور امیروں کو لکھا کہ غاصب خسرو کا تختہ اُلٹنے میں اُس کا ساتھ دیں۔ اکثر اُمراء اُس کے ساتھ ہو گئے البتہ حاکم ملتان انکار کی بنا پر مقامی لوگوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

Marfat.com

غازی ملک نے پنجاب اور سندھ کے تمام ذرائع استعمال کر کے فتحِ دہلی کے لیے ایک بھاری لشکر تیار کیا۔ خسرو خاں نے بھی دہلی میں تیاری شروع کر دی۔ سپاہیوں کو پیشگی تنخواہیں دیں۔ امراء کو انعام و اکرام سے نوازا۔ اسی اثنا میں غازی ملک دہلی کی طرف بڑھا۔ سرسہ کے قریب اُسکی شاہی فوجوں سے ٹکر ہوئی۔ خسرو کا بھائی شاہی افواج کا سپہ سالار تھا۔ غازی ملک نے اُسے شکست فاش دی۔ خسرو خاں تمام مال و اسباب اور سامانِ حرب میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ غازی ملک نے مالِ غنیمت سپاہ میں تقسیم کر دیا۔ ازاں بعد دہلی کی طرف بڑھا۔ دہلی کے باہر لہراوت کے میدان میں دونوں افواج میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ خسرو خاں کو شکست ہوئی۔ اس نے بھیس بدل کر شادی خاں کے مقبرے میں چھپ کر جان بچانے کی کوشش کی، مگر گرفتار ہوا۔ اور غازی ملک کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے ۶ ستمبر ۱۳۲۰ء کو اُسے ٹھیک اسی جگہ پر لے جا کر ہلاک کروایا، جہاں اُس نے سلطان قطب الدین مبارک کو قتل کیا تھا۔

ازاں بعد کوشکِ ہزار ستون میں غازی ملک تغلق نے اُمراء کو جمع کر کے اُن سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ 'غاصب خسرو ہلاک ہو چکا ہے، اب علاؤالدین خلجی کے خاندان کے کسی فرد کو تخت کے لیے منتخب کر لیا جائے۔ لیکن چونکہ ملک کافور، قطب الدین مبارک خلجی اور خسرو خاں نے خاندان علائی کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ اس لیے اُمراء نے متفقہ طور پر غازی ملک کو ہی تاج و تخت کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ اُس نے اُمراء کے اصرارِ بسیار پر اُن کے فیصلہ کو منظور کر لیا۔ اس طرح ۷ ستمبر ۱۳۲۰ء کو غازی ملک تغلق نے سریر آرائے تخت ہو کر غیاث الدین تغلق کا لقب اختیار کیا اور خاندانِ تغلق کے اقتدار کی بنیاد ڈالی۔

اہم تاریخیں

۱۲۹۰ء — جلال الدین فیروز خلجی کا سریر آرائے تخت ہونا۔

۱۲۹۳ء — چنگیز خاں کے پوتے الغو خاں کی سرکردگی میں منگولوں کا برِّ صغیر پر حملہ۔

۱۲۹۴-۹۵ء — علاؤالدین خلجی کی مہم دیوگڑھی۔

۱۲۹۶ء — جلال الدین فیروز خلجی کو قتل کرا کر علاؤالدین خلجی کا تخت نشین ہونا۔

۱۲۹۹ء — عہدِ علائی کے جرنیل الغ خاں اور نصرت خاں کے ہاتھوں تسخیرِ گجرات۔

۱۳۱۶ء — علاؤالدین خلجی کی وفات اور عمر وخاں شہاب الدین کی تخت نشینی۔ شہاب الدین کی معزولی اور قطب الدین مبارک خلجی کا سریر آرائے تخت ہونا۔

Marfat.com

۱۳۲۰ء قطب الدین مبارک خلجی کی وفات اور غاصب خسرو خاں کا تخت نشین ہونا، خسرو خاں کی ہلاکت اور غازی ملک کا غیاث الدین تغلق کے لقب سے تخت نشین ہونا۔

امتحانی سوالات

۱۔ خلجیوں کی ابتدا پر روشنی ڈالتے ہوئے خلجی انقلاب کا جائزہ لیجئے۔

۲۔ سلطان جلال الدین فیروز خلجی کی سیرت و کردار کا جائزہ لیتے ہوئے بتایئے کہ وہ خلجی اُمراء میں کیوں غیر مقبول ہو گیا۔

۳۔ جلال الدین فیروز خلجی کے عہد کی بغاوتوں کا حال بیان کیجئے۔

۴۔ سلطان علاؤ الدین خلجی کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے اُس کے سریر آرائے تخت ہونے کا حال مختصر طور پر بیان کیجئے۔

۵۔ علاؤ الدین خلجی کے عہد میں منگولوں کے حملوں کا ذکر کرتے ہوئے منگولوں کی روک تھام کے لیے سلطان کے اقدامات کا جائزہ لیجئے۔ ان میں وہ کہاں تک کامیاب رہا۔

۶۔ علاؤ الدین کے عہد کی بغاوتوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے اسباب پر روشنی ڈالئے۔ علاؤ الدین نے بغاوتوں کے انسداد کے سلسلے میں کون سے اقدامات اپنائے؟

۷۔ علاؤ الدین کی دکن پالیسی اور فتوحات کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

۸۔ سلطان علاؤ الدین خلجی نے سلطنت کو اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جو انتظامی، فوجی، زرعی اور اقتصادی اصلاحات نافذ کیں، اُن کا مختصر جائزہ لیجئے۔

یا

علاؤ الدین کے نظامِ مالگذاری اور اقتصادی نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے اشیائے ضرورت کی قیمت بندی پر مفصل بحث کیجئے۔

۹۔ علاؤ الدین خلجی کی فتوحات کا جائزہ کیجئے۔

۱۰۔ علاؤ الدین کے عہدِ حکومت میں ملک کافور کی دکنی فتوحات کا حال بیان کیجئے۔

۱۱۔ ملک کافور کے عروج و زوال کا مختصر جائزہ لیجئے۔

۱۲۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ تحریر کیجئے۔

ا۔ ملک چھجو۔ ب۔ سیدی مولیٰ

ج۔ علاؤ الدین کا نظریۂ بادشاہت د۔ خسرو خاں

Marfat.com

آٹھواں باب

خاندانِ تغلق

(۱۳۲۰ء تا ۱۴۱۲ء)

"سلطنتِ دہلی کے پانچ حکمران خاندانوں میں سے تغلق خاندان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مغلوں سے قبل ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت کا یہ بہترین زمانہ تھا۔"[1]

(آغا مہدی حسین)

خاندانِ تغلق کی اصلیّت

خاندانِ تغلق کی اصلیت کے متعلق مؤرخین متضاد آراء رکھتے ہیں۔ مشہور مؤرخ فرشتہ رقمطراز ہے کہ خاندانِ تغلق کے بانی غازی ملک تغلق کا باپ ملک تغلق، سلطان غیاث الدین بلبن کا غلام تھا۔ اس نے پنجاب کی ایک جاٹ عورت سے شادی کر لی تھی۔ غازی ملک اسی عورت کے بطن سے پیدا ہوا۔ لفظِ 'تغلق' کے بارے میں عین الدین بیجاپوری کی مشہور تاریخ "طبقاتِ طبقاتِ ناصری" کے حوالہ سے فرشتہ لکھتا ہے کہ یہ لفظ دراصل 'قتلغ' تھا جو ایک ترکی لفظ ہے اور جس کے معنیٰ بزرگ یا بڑا ہیں، جو برصغیر میں بگڑ کر پہلے 'قتلو' اور پھر 'تغلق' بن گیا۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ کا بیان ہے، کہ غازی ملک تغلق ایک ترک قبیلہ قرونہ سے تعلق رکھتا تھا جو سندھ اور ترکستان کے وسطی پہاڑی علاقہ میں آباد تھا۔ ابتدا میں وہ ایک مفلوک الحال آدمی تھا۔ مشہور مؤرخ ولز لے ہیگ کی رائے میں 'تغلق' ایک قبائلی نام ہے۔ چونکہ غازی ملک شروع ہی سے اپنے نام کے ساتھ تغلق لکھا کرتا تھا۔ اس لیے سریر آرائے سلطنت ہونے پر تغلق کہلایا اور اسی نسبت سے اس کا خاندان "تغلق خاندان" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس خاندان کے بادشاہوں نے اپنے نام کے ساتھ لفظِ "تغلق" بطورِ لقب استعمال کیا[2] لہٰذا یہ ایک لقب ہے۔ جسے تغلق خاندان کے پہلے دو بادشاہوں غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق نے اپنے نام کے ساتھ استعمال کیا، لیکن سلطان محمد تغلق کے کسی جانشین نے اسے اپنے نام میں شامل نہ کیا۔[3]

---

[1] "تغلق ڈائینسٹی"، صفحہ ۱۶۔

[2] "جنرل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۲۲" صفحہ ۲۲ - ۳۱۹۔

[3] آغا مہدی حسین "رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق"، صفحہ ۴۵۔

Marfat.com

غیاث الدین تغلق

(۱۳۲۰ء تا ۱۳۲۵ء)

"غیاث الدین تغلق ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ وہ شعائرِ اسلامی کا پابند تھا۔ اس نے شراب اور دیگر منشیات کی پیداوار اور فروخت کو اسلامی قانون کے مطابق جرم قرار دیا۔ وہ غرورِ شاہی اور کبر و نخوت سے پاک تھا۔ سریر آرائے تخت ہونے کے بعد، اپنے خاندان کے افراد، دیرینہ احباب اور ملازمین سے اس کے تعلقات میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ آیا۔"[1]

(مسٹر ولزلے ہیگ)

ابتدائی زندگی

غیاث الدین تغلق ابتداء میں سندھ کے ایک تاجر کے گھوڑے چرایا کرتا تھا۔ بعد ازاں علاؤالدین خلجی کے بھائی الغ خاں حاکم سندھ کی پیادہ فوج میں ملازم ہوگیا، اور رفتہ رفتہ سواروں میں شامل ہوگیا۔ لیکن جلد ہی جرأت و شجاعت اور مردانگی کی بنا پر الغ خاں کی نظرِ التفات کا مرکز بن گیا۔ جس نے اسے امرائے صغیر میں شامل کرتے ہوئے امیرِ آخور (داروغۂ اصطبل) کے عہدے پر فائز کر دیا۔ ۱۳۰۵ء میں سلطان علاؤالدین نے اسے دیپالپور کے اہم سرحدی صوبے کا حاکم اور محافظِ سرحد متعین کیا۔[2] یہاں اس نے منگولوں کی سرزنش کے لیے بہت سی کامیاب مہمیں سر کیں۔ ابنِ بطوطہ کے بیان کے مطابق "اس نے منگولوں سے انتیس ۲۹ جنگیں لڑیں اور انھیں شکستیں دیں۔ جس کے باعث اسے امرائے کبیر میں شامل کر کے غازی ملک کے خطاب سے نوازا گیا۔" علاؤالدین خلجی کے بعد اودت کے میدان میں اس نے خسرو خاں کو شکست دی اور ۶ ستمبر ۱۳۲۰ء کو سلطان غیاث الدین تغلق شاہ غازی کا لقب اختیار کر کے تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔[3]

عنانِ اقتدار سنبھالتے ہی سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے اعزہ و اقارب اور امراء کو جاگیروں اور انعام و اکرام سے نوازا۔ اپنے بڑے بیٹے فخرالدین محمد جونا خان کو الغ خاں کا خطاب عطا کیا اور اسے اپنا ولیعہد مقرر کیا۔ نیز اپنے داماد شادی خان کو دیوانِ وزارت کے اہم عہدہ پر فائز کیا۔ اس نے مرحوم سلطان علاؤالدین کے حرم سے

---

[1] "دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" (جلد سوم) صفحہ ۱۲۹۔

[2] ایل سری واستوا: "دی سلطنت آف دہلی" صفحہ ۱۸۲۔

[3] تغلق نامہ۔

Marfat.com

نہایت مشفقانہ سلوک کیا۔

انتظامی اصلاحات

تخت نشین ہونے کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کو گوناگوں مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ ملک کا وزیر قطب الدین، مبارک شاہ اور خسرو خاں کی بدعنوانیوں کے باعث سلطنت تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ ملک کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ علائی قوانین منسوخ ہو چکے تھے۔ اور لوگوں کے دلوں پر حکومت کی عظمت و سطوت کا کوئی نقش باقی نہ رہا تھا۔ معاشرہ اخلاقی اعتبار سے بگڑ چکا تھا۔ سلطنت میں سیاسی انتشار اور بدنظمی کی حالت پیدا ہو چکی تھی۔ غرضیکہ غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کے وقت ملک کا انتظامی اور معاشرتی ڈھانچہ درہم برہم ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے بڑی سوجھ بوجھ اور فہم و تدبر سے حالات کی اصلاح کی اور حیرت انگیز حد تک کم مدت میں سلطنت کے استحکام اور حسنِ انتظام کو بحال کر دیا۔ اس نے اعتدال کی حکمتِ عملی اختیار کرتے ہوئے نہ بیجا سختی کی اور نہ بہت زیادہ نرمی کا ہی مظاہرہ کیا۔ اس نے تمام طبقوں کے حقوق کا مناسب لحاظ رکھا اور کسی سے جانبدارانہ اور ناواجب رعایت کا برتاؤ نہ کیا۔ اس کی اس حکمتِ عملی کو ہر حلقہ میں تحسین کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس نے نظم و نسق کی بحالی میں سختی اور شدت گوارا نہ کی۔ حتیٰ کہ پانچ سال کے بعد جب اس نے انتقال کیا تو سلطنت کی کایا پلٹ چکی تھی۔ اس نے سلطنت کی تنظیمِ نو کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کیے :-

مصالحت آمیز اقدامات

۱- وہ اپنے قدیم آقا علاؤ الدین خلجی کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس نے علائی خاندان کے پسماندگان کے لیے وظائف مقرر کیے، اور مرحوم سلطان کی لڑکیوں کی مناسب جگہوں پر شادیاں کر دیں۔

۲- اہم امور میں علائی عہد کے امراء اور مشیروں سے مشورہ لینے کی رسم جاری کی۔ نیز نظامِ حکومت میں علاؤ الدین کی سی سخت گیری اور انتہا پسندی سے گریز کیا۔

۳- جن لوگوں کو ان کی خوشنودی اور حمایت حاصل کرنے کے لیے خسرو نے گرانقدر رقوم دی تھیں۔ ان پر سختی کی گئی تاکہ وہ رقوم بیت المال کو واپس کر دیں۔

زرعی اصلاحات

نظامِ مالیہ کے متعلق سلطان غیاث الدین تغلق کی پالیسی روشن خیالی پر مبنی تھی۔ اس نے کاشت کاروں کی حوصلہ افزائی کی تاکہ زراعت ترقی پذیر ہو۔ اس سے کسانوں، صارفین اور حکومت تینوں کو فائدہ پہنچا۔ سرکاری مطالبہ (پیداوار میں حکومت کا حصہ) کے تعین میں اس نے علاؤ الدین خلجی کے رائج کردہ حکمِ مساعت یعنی پیمائش کا طریقہ ترک کر دیا۔ کیونکہ اس سے کاشتکار پر سختی ہوتی تھی اور فصل خراب ہونے کی صورت میں، سرکاری مطالبہ کو کم کرانے میں کاشت کار کو سخت پریشانی اٹھانی پڑتی تھی۔ اس لیے سلطان نے علاؤ الدین سے قبل کا طریقہ حکمِ حاصل اختیار کیا۔ جس کی رُو سے سرکاری مطالبہ کا تعین کھیت کی حقیقی پیداوار پر ہوتا تھا۔ اس طریقہ میں کاشت کار کو یہ رعایت تھی، اگر پیداوار کسی سبب

Marfat.com

سے خراب یا کم ہوتی تو سرکاری مطالبہ کی شرح بھی کم ہو جاتی تھی۔ سلطان نے حکم جاری کیا کہ سرکاری مطالبہ میں مزید اضافہ ایک دم نہ کیا جائے بلکہ یہ اضافہ بتدریج ہونا چاہیئے، اور اضافوں کے درمیان کافی وقفہ رکھا جائے تاکہ کاشت کاروں پر یک لخت زیادہ بوجھ نہ پڑے۔

۲۔ محکمۂ مال میں ایسے تمام لوگوں کی آمد و رفت پر پابندی عائد کر دی گئی جنھوں نے پیداوار کے اضافہ کی مخبری کرنا اور سرکاری مطالبہ بڑھانا اپنا پیشہ اور ذریعہ آمدن بنا رکھا تھا۔ کیونکہ کمیشن وصول کرنے کی خاطر ان کی فراہم کردہ رپورٹیں اکثر غلط ہوتی تھیں اور کاشت کاروں کے لیے بے جا پریشانی کی موجب بنتی تھیں۔ سلطان نے متعدد غیر شرعی محصولات بھی منسوخ کر دیئے۔

۳۔ سلطان نے دیہات کے نمبرداروں، مقدموں اور چوہدریوں پر اعتماد نہ کرنے کی علائی پالیسی ترک کر دی اور محصولات جمع کرنے میں انھیں باقاعدہ معاون بنایا۔ اس کے عوض اس نے ان پر چرائی ٹیکس معاف کر دیا۔ لیکن انھیں رعایا سے ناجائز طور پر کوئی معاوضہ وصول کرنے کی اجازت نہ دی۔

۴۔ وصولی لگان اور دیگر بدعنوانیوں کے انسداد کے لیے صوبیداروں اور ماتحت حکام کے حساب کتاب کی نگرانی کے لیے ایک نیا محکمہ دیوانِ مستخرج، قائم کر دیا گیا۔ جسے بد دیانتی کرنے والوں کو سخت سزائیں دینے کا پورا اختیار تھا۔

۵۔ گورنروں کا وقار قائم رکھنے کی خاطر سلطان نے ان پر وہ سختی ترک کر دی، جو ان پر حساب گیری کے دوران دیوانِ وزارت میں ہوا کرتی تھی۔ لیکن انھیں صوبائی محصولات میں سے پانچ فیصد اپنے پاس رکھنے کی اجازت دی۔ اس طرح سلطان نے لگان وصول کرنے والے کارکنوں کو بھی محصولات میں ۲½ فیصد رکھنے کی اجازت دی۔ لیکن جن لوگوں نے اس رعایت کے باوجود بڑی بڑی رقمیں ہضم کیں، انھیں سخت سزائیں دیں۔

۶۔ غیاث الدین تغلق نے بنجر زمین کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اسے قابلِ کاشت بنانے کے لیے آب پاشی کا مناسب انتظام کر کے اسے آباد کیا، اور باغات لگوائے۔ اس طرح بہت سا بنجر علاقہ قابلِ کاشت ہو کر شاہی خزانہ کی آمدنی میں اضافہ کا موجب ہوا۔

فوجی اصلاحات

۱۔ سلطان تغلق خود ایک آزمودہ کار جرنیل ہونے کی وجہ سے اپنی فوج کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ اس امر کی بڑی سختی سے احتیاط کرتا تھا کہ جو رقم فوج کے لیے مخصوص ہو، وہ صرف فوجیوں پر ہی صرف ہو۔ اور اس میں امراء اور افسرانِ اعلیٰ کسی قسم کی خیانت نہ کریں۔ اس نے افواج کو تنخواہیں باقاعدگی کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کیا۔

۲۔ سواروں اور ان کے گھوڑوں کا حلیہ محفوظ رکھنے اور ان کے اسلحہ کی جانچ پڑتال کرنے کے قوانین سختی سے نافذ کیے گئے تاکہ فوج مستعد رہے، اور اس میں کسی قسم کی غفلت اور سستی پیدا نہ ہو۔

Marfat.com

رفاہی اقدامات سلطان غیاث الدین نے غربا، مساکین اور مفلوک الحال لوگوں کی امداد کے لیے ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا۔ نیز خشک سالی اور قحط کے زمانے میں رعایا اور کاشت کار طبقہ کی مالی امداد کا انتظام کیا گیا۔

۲۔ شراب نوشی اور گداگری کو سختی سے ممنوع قرار دیا گیا۔

۳۔ تجارت و صنعت کی ترقی کے لیے شاہراہوں کو لٹیروں اور ٹھگوں سے محفوظ کیا گیا۔

۴۔ حکومت کی جملہ خرابیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے عمالِ حکومت کو باقاعدگی سے تنخواہیں دینے کا اہتمام کیا گیا۔

ہندوؤں سے برتاؤ ہندوؤں کی بیشتر آبادی کاشت کاروں پر مشتمل تھی۔ سلطان غیاث الدین نے ان کے ساتھ بڑا مناسب برتاؤ کیا۔ ضیاء الدین برنی ہمیں بتاتا ہے: سلطان کہا کرتا تھا کہ ہندوؤں سے نہ ایسا نرم سلوک کرنا چاہیئے کہ وہ دولت و آسائش کے نشہ میں اندھے ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو جائیں اور نہ ایسا سخت کہ شدتِ افلاس سے تنگ آ کر کاشت کاری ترک کر دیں۔

فوجی مہمّات

سلطنت کے بڑے بڑے داخلی مسائل کو حل کرنے اور انتظامی و مالیاتی امور کو درست کرنے کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق سلطنت کی توسیع اور ان حکمرانوں کی گوشمالی کی طرف متوجّہ ہوا۔ جنھوں نے خسرو خاں کی کمزور حکومت کے دوران سلطنت دہلی کی سیادت سے منہ موڑ کر خود مختاری اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ اس نے یکے بعد دیگرے دو مہمیں اپنے بیٹے جُونا خاں کی سرکردگی میں دکن بھیجیں، جن کا جائزہ حسب ذیل ہے:

تسخیرِ ورنگل ۱۳۲۱ء - ۱۳۲۲ء ۱۳۲۱ء میں سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے ولیعہد فخر الدین محمد جُونا خاں مخاطب بہ الغ خاں کی سرکردگی میں ورنگل کے راجہ پرتاپ رُدرا دیو کاکتیہ کی گوشمالی کے لیے، ایک بھاری فوج روانہ کی۔ راجہ نے سلطنت دہلی کے تغیّرات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خراج دینا بند کر دیا تھا۔

الغ خاں نے قلعہ ورنگل کا محاصرہ کیا۔ راجہ نے تھوڑی سی مدافعت کے بعد صلح کی درخواست کی۔ جُونا خاں تلنگانہ میں کاکتیہ خاندان کا راج ختم کر کے اسے سلطنتِ دہلی میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے صلح کی درخواست کو رد کر دیا۔ اسی دوران راجہ نے دہلی اور ورنگل کے مابین سلسلۂ مواصلات کو منقطع کر دیا جس سے دہلی کی ڈاک کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اسی اثنا میں چند فتنہ پردازوں نے مشہور کر دیا کہ سلطان غیاث الدین تغلق کا انتقال ہو گیا۔ جس سے فوج میں بددلی و بے اطمینانی پھیل گئی۔ اس پر شہزادہ جُونا خاں کو مشہور شاعر عبید

Marfat.com

اور دمشق کے شیخ زادہ جیسے خصوصی احباب کے مشورے پر محاصرہ چھوڑ کر واپس لوٹنا پڑا تاکہ وہ دہلی پہنچ کر تخت و تاج پر قابض ہو سکے۔

اثنائے مراجعت میں تلنگانہ کے عوام اور راجہ نے بہت سی مشکلات پیدا کر کے لشکرِ شاہی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ دیوگری پہنچ کر شہزادہ پر یہ بھید کھلا کہ سلطان کی موت کی خبر غلط ہے۔ تاہم وہ تیزی سے دہلی پہنچا اور سلطان سے مہم کی ناکامی کے لیے معافی کا خواستگار ہوا۔ سلطان نے اس کی معافی کو قبول کرتے ہوئے ان فتنہ پردازوں کو جو اس ہنگامہ و شرارت کے ذمہ دار تھے، ہلاک کروا دیا۔

ورنگل کی دوسری مہم
۱۳۲۳ء - ۱۳۲۴ء

۱۳۲۳ء میں سلطان نے تلنگانہ کی مہم پر شہزادہ جونا خاں کو دوبارہ بھیجا۔ اس مرتبہ شہزادہ نے سلسلۂ مواصلات کا مناسب انتظام کیا۔ تاکہ وہ دہلی کے حالات سے کلی طور پر آگاہ رہے۔ اور قلعہ بیدر کو فتح کرنے کے بعد ورنگل پر حملہ آور ہوا۔ اس دفعہ شہزادے نے اس قدر سخت محاصرہ کیا کہ راجہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ وہ مع اپنے خاندان کے گرفتار ہوا اور دہلی بھیج دیا گیا۔ شہزادہ جونا خاں نے ورنگل کا نام بدل کر سلطان پور رکھا۔ تلنگانہ کو صدر مقام بنایا۔ اس طرح ۱۳۲۳ء میں مہاراشٹر اور دیوگڑھی کی طرح تلنگانہ بھی سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بن گیا۔ شہزادہ مالِ غنیمت سے لدا ہوا اڑلیسہ کی راہ دہلی واپس آ گیا۔

مہم بنگال
۱۳۲۴ء

بلبن کے عہد سے ہی بنگال نیم آزاد چلا آتا تھا۔ اگرچہ بنگال کے گورنر موروثی تھے۔ لیکن رسمی طور پر وہ سلطان دہلی کے باجگذار تھے۔ علاوہ ازیں سکہ اور خطبہ بھی سلطانِ دہلی کا ہی چلتا تھا۔ کچھ عرصہ سے بنگال میں بغرا خاں کے جانشینوں غیاث الدین بہادر، شہاب الدین اور ناصر الدین کے مابین حصول اقتدار کی کش مکش شروع تھی۔ غیاث الدین بہادر گورنر مشرقی بنگال نے شہاب الدین کو شکست دے کر لکھنوتی پر قبضہ کر لیا تھا۔ تیسرے بھائی ناصر الدین نے جو خود بنگال کی حکمرانی کا دعوے دار تھا۔ سلطان غیاث الدین تغلق سے فوجی امداد کی درخواست کی۔ تغلق نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر بنگال پر فوج کشی کر دی۔ سلطان کی آمد پر ناصر الدین نے حضورِ سلطانی میں حاضر ہو کر سلطان کی سیادت قبول کر لی۔ سلطان نے غیاث الدین بہادر کی گوشمالی کے لیے اپنے جرنیل ظفر خاں کو لکھنوتی بھیجا۔ جس نے غیاث الدین بہادر کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ سلطان نے ناصر الدین کو 'چتر شاہی' اور 'دو باش' عنایت کر کے بنگال کا حاکم تسلیم کر لیا۔ مشرقی بنگال کا سلطنت دہلی کے ساتھ الحاق کر لیا گیا۔ ان انتظامات کے بعد سلطان بھاری مالِ غنیمت کے ساتھ دہلی واپس لوٹا۔ واپسی پر اس نے ترہٹ کا مضبوط قلعہ بھی فتح کیا۔

سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات
۱۳۲۵ء

ترہٹ سے سلطان دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ لیکن اسے دہلی پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ اور اثنارِ راہ میں ہی موت نے اسے آگھیرا۔ سلطان کی آمد کی خبر سن کر ولیعہد جونا خاں

Marfat.com

نے دارالسلطنت سے جنوب مشرق میں چھ میل کے فاصلے پر واقع افغان پور میں اپنے بوڑھے باپ کا استقبال کرنے کے لیے لکڑی کا ایک محل (کوشک) تعمیر کرایا جہاں سلطان کا شاہانہ استقبال کیا گیا، اور اسی محل میں تمام عمائدینِ حکومت کے ساتھ سلطان کو ایک پُرتکلف شاہانہ ضیافت دی گئی۔ ضیافت سے فارغ ہوکر سلطان کی سواری دہلی کو روانہ ہونے والی تھی، کہ شہزادہ نے جاج نگر (اڑیسہ) کے ہاتھیوں کی نمائش کی اجازت چاہی۔ چنانچہ ہاتھیوں کی پریڈ (نمائش) سے محل کے چوبی ستون اور چھت لرزنے لگے اور بہت سے لوگ بھاگ کر باہر چلے گئے۔ سلطان غیاث الدین ابھی اندر ہی تھا کہ محل کی چھت گر پڑی۔ سلطان اپنے بیٹے شہزادہ محمود خاں اور چند دیگر امرار کے ساتھ ملبہ میں دب کر مر گیا۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ سلطان کو جب چھت کے ملبے کے نیچے سے نکالا گیا تو وہ ابھی زندہ تھا۔ لیکن بعدازاں اسے مار دیا گیا۔ (جولائی ۱۳۲۵ء)

سلطان غیاث الدین تغلق کی موت کے متعلق مؤرخین متضاد آرار رکھتے ہیں اور اس تضاد و اختلافِ رائے کا باعث یہ امر ہے کہ آیا چھت کا گرنا محض ایک اتفاقی امر تھا یا اس میں کوئی گہری سازش کارفرما تھی۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ شہزادہ جُونا خاں نے دانستہ طور پر یہ چوبی محل اپنے باپ کو مارنے کے لیے بنوایا تھا۔ سر ولزلے ہیگ اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد کا خیال ہے کہ چھت کا گرنا شہزادہ جُونا خاں کی گہری سازش کا نتیجہ تھا۔ اور ضیاء الدین برنی نے دیدہ دانستہ سلطان فیروز شاہ کے ڈر سے اصلیت کو ظاہر نہیں کیا ہے۔ دورِ حاضر کے مؤرخین کی رائے ہے کہ شہزادہ سازش سے بالکل بری الذمہ تھا۔ کیونکہ حقیقت میں باپ کو ہلاک کرنے کے لیے کوئی بھی وجہ موجود نہ تھی۔ دونوں کے مابین تعلقات نہایت خوشگوار اور محبت آمیز تھے۔ جُونا خاں ولیعہد مقرر ہو چکا تھا۔ اور اس کے بھائیوں اور عزیزوں میں کوئی ایسا حریف نہ تھا۔ جس سے اس کو خطرہ لاحق ہوتا۔ خود سلطان غیاث الدین بھی بوڑھا ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس کے بعد جونا خاں کی تخت نشینی یقینی تھی۔ اس لیے تاریخی شواہد اور واقعاتی اصلیت سے جُونا خاں بے گناہ ثابت ہوتا ہے۔ سلطان کی وفات ہر اعتبار سے ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ ڈاکٹر مہدی حسین رقمطراز ہیں کہ محل خود بخود گر پڑا۔ تھا۔ اس معاملہ میں شہزادہ کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ سلطان مرحوم کو نواح دہلی میں آباد کردہ شہر تغلق آباد میں ایک عالیشان مقبرے میں دفن کیا گیا جو تغلق آباد کے قلعہ کے سامنے اب تک موجود ہے۔

تغلق کی سیرت

سریرآرائے تخت ہونے سے قبل سلطان غیاث الدین تغلق ایک آزمودہ کار جرنیل تھا، اور ایک وفادار امیر اور کامیاب محافظِ سرحد کی حیثیت سے مشہور تھا۔ وہ ایک روشن خیال انسان تھا، جسے نمود و نمائش سے سخت نفرت تھی۔ برسر اقتدار آنے کے بعد بھی وہ سادہ زندگی کا خوگر رہا۔ اور دولت و امارت اسے مغرور سرکش نہ بنا سکی۔ اس نے اپنے پانچ سالہ مختصر سے عہد میں سلطنتِ دہلی کا کھویا ہوا وقار بحال کر دیا۔ وہ ایک منصف مزاج حکمران تھا۔ حدِ اعتدال سے کبھی تجاوز نہ کرتا تھا۔ اس ہر وقت یہ امر پیشِ نظر رکھا کہ اس کی بندد اور مسلمان رعایا خوشحال

Marfat.com

اور برسر روزگار ہو۔ ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ :۔

"اس کے عہد میں چوروں اور ڈاکوؤں نے چوری اور نقب زنی کے ہتھیار فروخت کر کے کاشت کاری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ راستے اور شاہراہیں بالکل محفوظ تھیں، تجار سامانِ تجارت لے کر بے خوف و خطر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتے تھے"[1]

اس کی داخلہ پالیسی میں نرمی اور سختی کا امتزاج تھا۔ اسی وجہ سے وہ تخت نشین ہونے کے فوراً بعد رعایا میں مقبول ہو گیا۔ اس نے اپنے عزیز رشتہ داروں اور پرانے خادموں کے حقوق کو پہچانا اور ان کی قدر افزائی کی۔ غیاث الدین تغلق نے اپنی ذہانت و استعداد سے ملک میں مکمل امن و امان بحال کیا اور خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ایسے حالات پیدا کر دیئے جو علاؤ الدین خلجی نے سختی اور تشدد سے پیدا کئے تھے۔ وہ ایک دور اندیش منتظم اور عدل گستر تھا، ہر روز دو دفعہ دربار منعقد کیا کرتا تھا۔ اس نے سلطنتِ دہلی کو ہر اعتبار سے ترقی دینے کی کوشش کی۔ وہ افواج کی بالادستی کا قائل تھا۔ عہدِ حاضر کے مؤرخین اسے فیاض اور مشفق حکمران شمار کرتے ہیں۔

سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنی افواج کی تنظیم پر خاص توجہ مبذول کی اور انھیں مستعد اور چاق و چوبند رکھنے کے لیے خصوصی انتظامات کیے۔ سلطان راسخ العقیدہ سُنّی مسلمان تھا اور اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ اس کا سلوک بڑا روادارانہ تھا۔ وہ اربابِ علم و فن کا مربی بھی تھا۔

غیاث الدین تغلق کو نئی نئی عمارات تعمیر کرانے کا بھی بہت شوق تھا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت کے آغاز میں دہلی کے قریب ایک نیا شہر بسایا اور اس کا نام تغلق آباد رکھا جس میں اس نے اپنے لیے محلات تعمیر کرائے۔ اس کا اپنا محل روغنی اینٹوں کا بنا ہوا تھا، جو سورج کی روشنی میں خوب چمکتی تھیں۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی

Marfat.com

سُلطان محمد تغلُق

(۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء)

"محمد تغلُق خاندانِ تغلق کے عظیم حکمرانوں میں سب سے بلند حیثیت کا مالک ہے۔ کیونکہ اس کے زیرِ اقتدار تغلق ایمپائر بامِ عروج کو پہنچی"۔ [1]

(آغا مہدی حسین)

ابتدائی حالات

برّصغیر کے مسلمان فرمانرواؤں کی تاریخ میں محمد بن تغلق سب سے بڑھ کر مختلف فیہ شخصیت ہے۔ اس کے عہد کا آغاز اختلاف سے ہوا۔ اس کے والد کی وفات کا مسئلہ اور اس کے عہد کا اختتام اختلاف ہوا۔ علم و فضل کے اعتبار سے وہ قابل ترین شخص تھا۔ جو تختِ دہلی کی زینت بنا۔ اسے مختلف علوم میں کمال حاصل تھا۔ وہ ادب، دینیات، طب، ریاضی، ہیئت اور فلسفہ میں مہارتِ تامہ رکھتا تھا۔ اور منطق تک میں اسے عبور حاصل تھا۔

اس کا اصل نام فخرالدین محمد جونا خاں تھا۔ محافظِ سرحدات کے فرزند کی حیثیت سے اس کی ابتدائی تربیت ایک سپاہی کی حیثیت سے ہوئی۔ عسکری تربیت کے علاوہ اسے تمام مروّجہ علوم کی بھی پوری تعلیم دی گئی۔ وہ اپنی زندگی کے آغاز ہی میں، خسرو خاں کے عہد میں امیرِ آخور (داروغۂ اصطبل) کے اہم عہدے پر متعین ہوا۔ اس نے متجسّس طبیعت پائی تھی اور وہ تختِ دہلی پر قابض ہونے کی خواہش رکھتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے خسرو خاں کا تختہ الٹنے میں اپنے باپ کی پرجوش اور بھرپور امداد کی۔ تخت نشینی سے پیشتر وہ فوجی، انتظامی اور سیاسی معاملات میں وسیع تجربہ حاصل کر کے پختہ اور آزمودہ کار ہو چکا تھا۔ ۱۳۲۰ء میں اس کا باپ غازی ملک سریر آرائے سلطنت ہوا۔ تو اس کی منزلِ مقصود قریب تر آگئی۔ اسے ولیعہد مقرر کرتے ہوئے الغ خاں کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۳۲۱ء میں وہ ورنگل کی مہم پر مامور ہوا۔ لیکن ناکام ہوا۔ تاہم دو سال بعد اس نے نہ صرف ورنگل پر قبضہ کر لیا۔ بلکہ راجہ پرتاپ رُدر دیو کو گرفتار کر کے پایۂ تخت دہلی روانہ کر دیا۔ اسے اپنی اہلیت اور فراست پر مکمل اعتماد تھا۔

تخت نشینی ۱۳۲۵ء

جولائی ۱۳۲۵ء [2] میں سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات کے بعد الغ خاں نے محمد تغلق کے لقب سے تاج شاہی سر پر رکھا۔ تخت نشینی کے چالیس روز بعد تک وہ تغلق آباد میں مقیم رہا۔ اس کے بعد ایک جلوس کی شکل میں دہلی میں داخل ہوا۔

---

[1] "رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق"۔ صفحہ ۵۳۔

[2] آغا مہدی حسین "تغلق ڈائنیسٹی"۔

Marfat.com

اور ملبن کے کوشکِ سبز میں تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ عوام نے اس کے خیر مقدم کے لیے شہر کو دلہن کی طرح آراستہ کر رکھا تھا۔ جلوس کی گزرگاہ میں بادشاہ نے عوام پر نقرئی اور طلائی سکوں کی بارش کی۔ عوام نے اس کی تخت نشینی پر خوشی کا اظہار کیا۔ کیونکہ عوام کو اس کے حسنِ تدبر اور علمی استعداد کے پیشِ نظر امید تھی، کہ وہ اپنے پیشروؤں کی بہ نسبت ایک بہتر فرمانروا ثابت ہوگا۔

محمد تغلق کے منصوبے

سلطان کی طبیعت میں نُدرت اور اختراع کا مادہ بہت تھا۔ وہ ہمیشہ انوکھی اور شاندار سکیمیں سوچتا تھا۔ لیکن اس میں ایک بڑی طبعی خامی بھی تھی۔ وہ ان منصوبوں اور سکیموں کی عملی مشکلات کا اندازہ نہ لگاتا اور لوگوں کے احساسات جذبات کو ملحوظ نہ رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے منصوبے ناکام ہو جاتے تھے۔ مشہور مورخ لین پول کی رائے ہے کہ سلطان اعلیٰ تخیل اور انتہائی بلند عزائم کا مالک تھا۔ مگر اس کی سکیمیں اس عہد کے حسبِ حال نہ تھیں۔ ذیل میں اس کے منصوبوں کا مختصر حال درج کیا جاتا ہے:

۱۔ دوآب کے مالیہ میں اضافہ

۱۳۲۶-۲۷ء

دوآب (گنگا جمنا) کا خطہ حد درجہ زرخیز تھا اور وہاں کے باشندے خوشحال اور فارغ البال تھے اور دولت و امارت کے زعم میں آئے دن سلاطین دہلی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیے رکھتے تھے۔ بلبن اور علاؤ الدین خلجی کی مہموں کے باوجود اس علاقہ کے لوگ راہِ راست پر نہ آئے۔ ان لوگوں کی وافر آمدنی کے پیشِ نظر حکومت کا حصہ (لگانِ اراضی) پانچ سے دس فیصد تک بڑھا دیا گیا اور اس کی وصولی کا سختی کے ساتھ اہتمام کیا۔ محاصل میں یہ اضافہ اگرچہ زیادہ نہ تھا مگر حکومت کا یہ اقدام زمینداروں اور کاشت کاروں کو بہت ناگوار گزرا۔ سوئے اتفاق سے اس سال بارش نہ ہونے کے باعث دوآب میں سخت قحط پڑا۔ اس پر زمینداروں اور کاشت کاروں نے احکامِ شاہی سے سرتابی کرتے ہوئے زراعت کو ترک کر دیا اور اپنے اموال اور مویشیوں سمیت گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے۔ اس سے ملکی حالات اور بھی خراب ہو گئے اور ملک میں سخت قحط پڑ گیا۔ آخر سلطان کو اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجنی پڑی۔ فوج نے بغاوت کو کچل کر باغیوں کو عبرتناک سزائیں دیں۔ سلطان نے دوآبہ میں از سرِ نو آبادکاری اور حالات کو سازگار بنانے کی غرض سے مناسب تدابیر اختیار کیں، اور قحط زدگان کی امداد کے لیے تقاوی قرضے کا اجرا کیا۔ زمینوں کی آبیاری کے لیے کنویں کھدوائے۔ سلطان کی تمام کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں۔ اس سے حکومت کا وقار بری طرح متاثر ہوا۔

۲۔ دارالسلطنت کی تبدیلی

۱۳۲۷ء

۱۳۲۷ء میں سلطان محمد تغلق نے دہلی کی بجائے دیوگڑھی کو دارالسلطنت بنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ دیوگڑھی کے متصل دولت آباد

Marfat.com

کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا گیا اور دہلی کے عوام کے علاوہ امراء اور علماء و مشائخ کو وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا گیا۔ سلطنت دہلی کی حدود بہت وسیع ہو چکی تھیں جو دریائے سندھ سے لے کر بنگال تک اور کوہ ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھیں دیو گڑھی کو برِصغیر کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں سے شمالی اور جنوبی صوبے مساوی فاصلے پر واقع تھے۔ علاوہ ازیں دہلی منگولوں کے حملوں کی زد میں تھی۔ لیکن دیو گڑھی مرکز میں واقع ہونے کی بنا پر زیادہ محفوظ تھا۔ دیو گڑھی کو پایۂ تخت بنانے کی سب سے بڑی وجہ سلطان کے پیش نظر یہ تھی کہ دکن میں اسلامی حکومت قائم رکھنے کے لیے وہاں کی بیشتر آبادی کا مسلمان ہونا بہت ضروری ہے۔ ان حالات کے پیش نظر سلطان نے دیو گڑھی کو سلطنت کا پایۂ تخت قرار دیا۔ اور امراء، علماء اور مشائخ کو دیو گڑھی میں آباد ہونے پر مجبور کیا تاکہ وہ دکن میں اسلامی تہذیب و تمدن کو فروغ دے سکیں۔

سلطان نے اس سفر کے لیے دہلی کے لوگوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ دہلی سے دولت آباد تک پختہ سڑک تعمیر کرائی۔ لوگوں کے لیے سامانِ رسد کا تسلی بخش انتظام کیا۔ جن لوگوں میں سامانِ خوراک خریدنے کی سکت نہ تھی۔ انھیں مفت رسد مہیا کی۔ اس کے باوجود لوگ مطمئن نہ ہوئے۔ چونکہ وہ صدیوں سے دہلی میں آباد تھے اس لیے وہ کسی صورت میں بھی اس شہر کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن حکم سلطانی سے مجبور ہو کر انھیں دیو گڑھی کے سات سو میل کے طویل سفر پر روانہ ہونا پڑا۔ راستے کی صعوبتوں کی وجہ سے بہت سے لوگ اثنائے سفر میں مر گئے۔ اور جو زندہ دولت آباد پہنچے۔ وہ بھی بے حد دل شکستہ، اداس اور مایوس تھے۔ انھیں وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ اکثر علماء اور امراء نے یہاں رہنا ہی پسند نہ کیا۔ لوگوں کا مالی اور جانی نقصان بہت زیادہ ہوا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ دولت آباد کے قریب مسلمانوں کے قبرستان ہی قبرستان دکھائی دیتے تھے۔ جب محمد تغلق کو لوگوں کے مصائب اور ان کی پریشانیوں کا علم ہوا تو وہ بہت پشیمان ہوا۔ آخر اس نے انھیں دہلی جانے کی اجازت دے دی۔

اس پر بہت سے لوگ دہلی واپس چلے آئے۔ جن میں بیشتر راستے ہی میں مر کھپ گئے، اور بہت کم لوگوں کو دہلی پہنچنا نصیب ہوا۔ سلطان نے انھیں ہر قسم کی آسائش پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن دکھی دلوں کا مداوا نہ ہو سکا، اور وہ ہمیشہ اسے بد دعائیں دیتے رہے۔ ضیاء الدین برنی نے جو محمد تغلق سے ناراض تھا۔ اس تباہی کے بیان میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے۔ حالانکہ دارالحکومت کی منتقلی کوئی ایسی عجیب بات نہ تھی۔ جدید تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دہلی سے صرف مسلمان آبادی کو ہی دیو گڑھی منتقل کیا گیا تھا اور دہلی بالکل ہی بے چراغ نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اس دوران دہلی کی سرکاری ٹکسال میں سکے برابر ڈھالے جاتے رہے۔ یہ سکے اب بھی لاہور کے عجائب گھر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں سرکاری سطح پر دوسرے اہم کام بھی جاری رہے۔

محمد تغلق کا یہ منصوبہ اگرچہ بری طرح ناکام ہوا مگر اس کے باعث دکن میں اسلامی تہذیب و تمدن

Marfat.com

کی بنیاد پڑی اور وہاں دہلی کی مشہور زبان 'ریختہ' رائج ہوئی۔ نیز دکن میں ایک خود مختار آزاد اسلامی سلطنت یعنی بہمنی سلطنت وجود میں آئی۔ دولت آباد سے مسلمان مبلغین دکن میں ہر طرف پھیل گئے۔ جن کی تبلیغی مساعی سے لوگوں کی ایک بھاری تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی۔

۳۔ علامتی سکّے کا اجراء ۱۳۳۰ء

علامتی سکے کا اجراء سلطان محمد تغلق کا ایک دلیرانہ اقدام اور اُسکی جدّتِ طبع کا مظہر تھا۔ لیکن مورّخین نے سلطان کے اس اقدام کی سب سے زیادہ تضحیک کی ہے۔ علامتی سکّہ یعنی کاغذی نوٹ آج بھی دنیا کے ہر خطّے میں رائج ہے۔ کیونکہ کوئی فرد سونے اور چاندی کے بھاری ٹکڑے جیب میں اٹھائے پھرنے کو پسند نہیں کرتا۔ علامتی سکّہ میں دھات کی قیمت کے مقابلے میں سکے کی قیمت زیادہ مقرر کردی جاتی ہے۔ قبل ازیں بیشتر سکّے قیمتی دھاتوں سے مضروب کئے جاتے، اور ان کی قیمت عموماً سکّہ میں صَرف شدہ دھات کے برابر رکھی جاتی تھی۔ سلطان محمد تغلق سے قبل چین اور ایران میں علامتی سکّے رائج تھے۔

سلطان محمد تغلق نے جو طبعاً جدّت پسند اور نئے نئے منصوبے سوچنے کا عادی تھا، تجربہ کے طور پر ۱۳۳۰ء میں تانبے اور کانسی کے علامتی سکّے جاری کئے۔ جن کی قیمت سکّوں میں صَرف شدہ دھات کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اور حکم دیا کہ لین دین میں اسے چاندی کے تنکہ کے برابر تصوّر کیا جائے۔ چونکہ برّصغیر میں علامتی سکّے کی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ اس وجہ سے لوگ سلطان کے اس نادر منصوبے کی قدر و اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ بلکہ انھوں نے یہ سمجھا کہ قیمتی دھات کے بدلہ میں ارزاں دھات کے سکّے رائج کر کے ان کو دھوکا دیا جا رہا ہے۔ سلطان نے اپنے اس انوکھے تجربہ کو کامیاب بنانے کے لیے عملی تدابیر اختیار نہ کیں اور نہ ہی جعل سازی کی روک تھام کا کوئی مناسب انتظام کیا۔ کیونکہ اس سکّہ کی وضع و ساخت نہایت سادہ تھی۔ اور ویسے سکّے بہ آسانی بنائے جا سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے تانبے کے جعلی سکّے کثیر تعداد میں بنانے شروع کر دیئے۔ بقول ہمعصر مورّخ ضیاء الدین برنی ہر ہندو سنار کا گھر ٹکسال بن گیا۔ جعلی سکّوں کے بننے سے سرکاری سکّے کی ساکھ ختم ہو کر رہ گئی اور اس کے متعلق بے اعتمادی اس حد تک پہنچ گئی کہ تجارت کے پورے نظام کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ علاوہ ازیں حکومت کو بھی شدید نقصان پہنچ رہا تھا۔ کیونکہ مالیہ علامتی سکّوں کی شکل میں ادا ہوتا تھا۔ اور یہ سکّے بیشتر جعلی تھے۔ اس پر سلطان نے علامتی سکّہ منسوخ کر دیا اور حکومت پر عوام کا اعتماد بحال کرنے کی غرض سے حکم دے دیا کہ لوگوں کے پاس جس قدر علامتی سکّہ موجود ہے، وہ لوٹا کر سرکاری خزانے سے اس کے بدلے سونے چاندی کے سکّے وصول کر لیں۔ چنانچہ علامتی سکّہ اتنی تعداد میں واپس کیا گیا، کہ محکمۂ خزانہ کے باہر اس کے بڑے بڑے انبار لگ گئے۔ ان میں بیشتر سکّے جعلی تھے۔ اور یوں حکومت کو شدید مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ مشہور مورّخ فرشتہ کا بیان ہے کہ خاندان سادات کے بادشاہ مبارک شاہ کے عہد میں بھی یہ انبار محکمۂ خزانہ کے باہر دیکھنے میں آتے تھے۔

Marfat.com

علامتی سکوں کا تجربہ سلطان کی محض طبعی اختراع اور جدّت طرازی تھی اور اس کا سبب چاندی کی قلّت نہ تھی جیسا کہ بعض مؤرخین کا خیال ہے۔ کیونکہ معاصر تاریخی کتب سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے سات آٹھ سال میں سلطنت کی مالی حالت اچھی تھی۔ اور محمد بن تغلق کو کسی غیر معمولی دقّت کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ اس سے سلطان کی شخصیّت اور ذہن کے دونوں پہلو ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دماغ کسقدر دُور رس تھا اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے، کہ اس نے اپنی رعایا کی ذہنی حالت کو سمجھنے کی بالکل کوشش نہ کی۔ اور نہ اپنے اس انوکھے تجربے کو کامیاب بنانے اور جعلی سکوں کی روک تھام کے لیے مناسب عملی تدابیر اختیار کیں۔ اگر سلطان کی یہ سکیم کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی، تو سلطنت کی تمام مالی مشکلات ختم ہو جاتیں اور نئی فتوحات کے لیے سلطان کے پاس وافر روپیہ جمع ہو جاتا۔ بہر حال یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ محمد بن تغلق کا عہد برّصغیر کے سکوں کی تاریخ میں ایک مثالی شہرت کا حامل ہے۔ اس نے چاندی اور سونے کے بہت سکّے رائج کئے جو اپنی ساخت، صفائی، خوبصورتی تنوّع اور کھرے پن کے لیے آج تک مشہور ہیں۔

۴۔ خراسان کی فتح

خراسان منگولوں کی طاقت کا سرچشمہ تھا۔ سلطان نے برّصغیر پر منگولوں کے آئے دن کے حملوں کی روک تھام کے لیے خراسان کی فتح کا منصوبہ بنایا۔ ابوسعید حاکمِ خراسان اپنی رعایا میں غیر مقبول تھا۔ اپنے ہمسایہ حکمرانوں سے بھی اس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ سلطان محمد تغلق نے ان حالات سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے منگول سردار ترمہ شیریں والیٔ توران کے ساتھ روابط بڑھائے۔ اس کا داماد دہلی آیا۔ تو اسے بڑے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ علاوہ ازیں امرائے خراسان کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بھی بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ خراسان کی مہم کے لیے تین لاکھ ستر ہزار سواروں پر مشتمل ایک لشکر جرّار تیار کیا گیا۔ جسے سال بھر شاہی خزانہ سے تنخواہ دی گئی۔ مگر توران میں ترمہ شیریں کے قتل اور خراسان میں ابوسعید کی پوزیشن کے مستحکم ہو جانے کے سبب اس مہم کو ترک کر دیا۔ اس سے شاہی خزانہ کو شدید نقصان پہنچا۔

۵۔ قراچل کی مہم

۱۳۳۷-۳۸ء

تسخیر خراسان کے منصوبے کی ناکامی کے بعد سلطان محمد تغلق نے کوہ ہمالیہ کی ریاستوں کو دہلی سلطنت کا باجگذار بنانے کا منصوبہ تیار کیا۔ چنانچہ اس نے دہلی سے دس دن کی مسافت اور کمایوں کی پہاڑیوں میں واقع قراچل کے خلاف اپنے بہنوئی خسرو ملک کی قیادت میں فوج بھیجی۔ ابتداء میں افواج شاہی کو کامیابی ہوئی۔ لیکن بعد میں کثرتِ باراں اور دشوار گزار راستوں کے سبب یہ مہم ناکام رہی۔ فوج کا ایک کثیر حصہ قدرتی مصائب اور دشمن کے بے پناہ حملوں کی وجہ سے تباہ ہو گیا۔ اور صرف دس آدمی جان بچا کر واپس آ سکے۔ دورِ جدید کے بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ قراچل کی مہم چین اور مغربی تبت کو تسخیر کرنے کی ایک ناکام مہم تھی، لیکن ہمعصر تواریخ میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

Marfat.com

۶۔ چین سے سفارتی تعلقات

۱۳۴۱ - ۴۲ء

سلطان محمد تغلق کے بعض ایشیائی ممالک بالخصوص چین سے سفارتی تعلقات قائم تھے۔ ۱۳۴۱ء میں شہنشاہ چین طغان تیمور نے ہمالیہ کی وادی میں بدھ مندروں کی تعمیر کی اجازت حاصل کرنے کے لیے تغلق دربار میں اپنا ایک سفیر بھیجا۔ یہ مندر قراچل کی مہم کے دوران اسلامی فوج کے ہاتھوں مسمار ہو گئے تھے۔ سلطان نے ابن بطوطہ کو اپنا سفیر مقرر کر کے چین کے حکمران کے دربار میں بھیجا۔ ابن بطوطہ ۱۳۴۲ء میں روانہ ہوا، اور ۱۳۴۷ء میں واپس لوٹا۔ مندروں کے متعلق سلطان نے جواب دیا کہ جزیہ ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر اسلام مندروں کی تعمیر کی اجازت نہیں دیتا۔

۷۔ منگولوں کا حملہ

۱۳۲۸ - ۲۹ء

۱۳۲۹ء میں توران کے چغتائی حاکم ترمہ شیریں نے برصغیر پاک و ہند پر یلغار کر دی۔ وہ ملتان، لاہور سے ہوتا ہوا نواحِ دہلی تک آن پہنچا۔ بقول فرشتہ سلطان نے منگولوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے انھیں بیشمار مال و زر بطور تحفہ دے کر واپس جانے پر مجبور کیا۔ یہ پالیسی سخت ناپسندیدہ تھی۔ اس سے سلطان محمد تغلق کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔

تغلق عہد کی بغاوتیں اور ان کے اسباب

محمد بن تغلق کے دورِ حکومت کے ابتدائی چند سال امن و سکون سے گزرے۔ لیکن بعد میں بغاوتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس نے اسے تادمِ حیات چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اس کے ستائیس سالہ عہدِ حکومت میں بائیس بغاوتیں ہوئیں۔ ابتدائی عہد کی بغاوتیں معمولی اور کمتر نوعیت کی تھیں۔ اور آسانی سے فرو ہو گئیں۔ اس کے بعد بڑی منظم اور وسیع پیمانے پر بغاوتیں ہوئیں۔ جن پر قابو پانے میں سلطان کے منصوبوں کی ناکامی نے بھی بغاوتوں کو ہوا دی۔ رعایا میں بے اعتمادی اور بددلی پھیل گئی اور سلطان کی طبیعت میں تلخی پیدا ہو گئی۔ مزید برآں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ باغی عناصر زور پکڑتے گئے۔ بالآخر یہ حالت ہو گئی کہ خود محمد تغلق کے الفاظ میں تمام سلطنت سراپا مرض بن گئی۔ سلطان نے بڑے آہنی عزم سے ان بغاوتوں کو فرو کرنے کی کوشش کی۔ مگر صورتِ حال یہ رہی کہ اگر ایک علاقہ میں فساد کی اصلاح کی جاتی تو وہ کہیں اور پھوٹ پڑتا۔ ان بغاوتوں کے مندرجہ ذیل اسباب تھے :-

بغاوتوں کے اسباب

۱۔ محمد تغلق کے ناکام منصوبوں نے سارے ملک میں بغاوتوں کی آگ کو بھڑکا دیا۔ شاہی وقار بری طرح متاثر ہوا اور رعایا میں بے اعتمادی اور بددلی پھیل گئی۔ نتیجہ کے طور پر سلطنت کی مالی حالت تباہ و برباد ہو گئی، اور تجارت کا نظام

Marfat.com

درہم برہم ہوکر رہ گیا۔ جب عوام سلطان کے منصوبوں کو نہ سمجھ سکے تو اس نے خوفناک سزائیں دینی شروع کر دیں۔

۲۔ امرار نے سلاطینِ دہلی کی گرانقدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ اور وہ سلطنت کے لیے ریڑھ کی ہڈی متصور ہوتے تھے، مگر سلطان کے نت نئے منصوبوں کے باعث امرار کو مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطان نے پایۂ تخت کی منتقلی کا اعلان کر کے امرار کو دولت آباد جانے پر مجبور کیا۔ جس کے باعث وہ اس سے بدظن ہو گئے۔ ذرائع آمد و رفت کی دشواریوں اور کثرتِ باراں سے ملک سیاسی اور مالی طور پر تباہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں سلطان نے پرانے اور تجربہ کار حکام کو معزول کرنا شروع کر دیا، اور ان کی جگہ نئے افسر متعین کیے۔ قتلغ خاں جیسے آزمودہ کار گورنر کو دکن سے بلا لیا گیا۔ سلطان کے ان اقدامات سے پرانے امرار اپنے اقتدار کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔ عین الملک جیسے وفادار کی بغاوت کی وجہ یہی بداعتمادی تھی۔

۳۔ علماء اور مشائخ کو عوام میں بے حد مقبولیت حاصل تھی۔ اگرچہ محمد تغلق سے پہلے کسی بادشاہ نے ان کو سیاسی معاملات میں دخل انداز نہ ہونے دیا تھا۔ لیکن ان کی مخالفت بھی کبھی نہ کی تھی۔ محمد تغلق نے نہ صرف ان کا احترام کرنا چھوڑ دیا، بلکہ انھیں ایسے عہدوں کو قبول کرنے پر مجبور کیا جو ان کے شایانِ شان نہ تھے۔ مثلاً اس نے شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کو جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ اور چشتی سلسلۂ اولیاء کی برگزیدہ شخصیت تھے، کو جامہ بردار بنا دیا۔ یہ شیخ کی صریحاً توہین تھی۔ اس سے ان کے مرید برگشتہ ہو گئے۔ محمد تغلق نے بیشتر مشائخ کو معمولی معمولی وجوہ کی بنا پر قتل کرا دیا۔ علماء اور مشائخ کی مخالفت کی وجہ سے عوام بھی سلطان کے خلاف ہو گئے۔

۴۔ سلطان محمد تغلق نے ابتدا میں غیر ملکی امرار کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر دیا تھا۔ اس امتیازی سلوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر پاک و ہند کے قدیم امرار بدظن و سرکش ہو گئے۔ قیامِ امن کی خاطر سلطان نے امرار کو دبانا ضروری سمجھا، چنانچہ اس نے کئی ایک کو قتل کروا ڈالا۔ اس رویّے کے پیشِ نظر ملکی امرار بغاوت پر آمادہ ہو گئے نیز غیر متوازن حکمتِ عملی سے ملکی و غیر ملکی امرار سلطان سے برگشتہ ہو گئے۔ سلطان محمد تغلق ایک وسیع و عریض سلطنت کا مالک تھا لیکن ذرائع رسل و رسائل کے غیر اطمینان بخش اور محدود ہونے کے باعث اتنی بڑی سلطنت کا نظم و نسق چلانا اور اس میں امن و امان قائم رکھنا بھی کارے دارد تھا۔ چنانچہ دور دراز کے متعدد صوبوں کے گورنروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بغاوتیں برپا کرنی شروع کر دیں۔

۵۔ ہندوؤں نے کبھی بھی برضا و رغبت سلطنتِ دہلی کی سیادت قبول نہ کی تھی۔ وہ مسلمانوں کو اجنبی اور غاصب تصور کرتے اور ہمیشہ خود مختاری حاصل کرنے کے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ شمالی برصغیر میں اگرچہ اسلامی سلطنت کی جڑیں مستحکم ہو چکی تھیں۔ لیکن دکن کے راجگان ہمیشہ آزاد ہونے کی فکر میں رہتے تھے۔ بالآخر ان میں متحدہ محاذ بنانے کے رجحانات پیدا ہو گئے۔ اور دکن بغاوت کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ چنانچہ جلد ہی مدورا، ورنگل، وجے نگر اور گلبرگہ کی آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔

Marfat.com

مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر سلطان محمد تغلق کو اپنے عہد حکومت میں بہت سی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جن میں بہاؤ الدین گرشاسپ کی بغاوت ۱۳۲۷ء بہرام ریبہ کی بغاوت، حاکم معبر کی بغاوت ۱۳۲۵ء امیر حلاجو کی بغاوت، ملک ہوشنگ کی بغاوت ۳۶-۱۳۳۵ء - وجیانگر کی بغاوت ۱۳۳۶ء، بنگال میں فخرالدین کی بغاوت ۱۳۲۷ء، نصرت خاں گورنر بیدر کی بغاوت ۳۹-۱۳۳۸ء عین الملک ملتانی کی بغاوت ۴۱-۱۳۴۰ء مالوہ اور گجرات کی بغاوت ۱۳۴۵ء خاص طور پر مشہور ہیں۔

۱۳۴۵ء میں سلطان محمد تغلق خود ایک بھاری فوج لے کر گجرات پہنچا۔ اس نے حاکم دیوگڑھی کو لکھا کہ تمام امیرانِ صدرہ کو اکٹھا کر کے گجرات بھیج دیا جائے۔ راستے میں ان امیروں نے اپنی زندگیوں کو خطرے میں سمجھتے ہوئے محافظوں کو قتل کر دیا اور خود آزاد ہو کر دیوگڑھی واپس چلے گئے۔ انھوں نے اسماعیل نامی ایک افغان کو اپنا امیر منتخب کر کے خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اور دیوگڑھی کے تمام ہندو مسلمان امرار نے سلطان محمد تغلق کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ سلطان دیوگڑھی کی بغاوت کی خبر پا کر دیوگڑھی کی جانب روانہ ہوا۔ تاکہ بغاوت کو کچل کر حالات پر قابو پا سکے۔ اسی اثنا میں سورت سے تغی خاں کی بغاوت کی اطلاع ملی۔ سلطان دیوگڑھی کی مہم کو ادھورا چھوڑ کر گجرات واپس چلا گیا۔ اور تغی کو فیصلہ کن شکست دی۔ تغی نے راہِ فرار اختیار کی اور ٹھٹھہ (سندھ) کے باغیوں سے مل گیا۔

سلطان کی وفات

۱۳۵۱ء

تغی خاں کے سندھ میں بھاگ جانے کی خبر سن کر سلطان اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ تغی نے سومرا سرداروں کے ہاں پناہ لی۔ سلطان سمندر کے راستے گجرات سے ٹھٹھہ کی جانب روانہ ہوا۔ لیکن ابھی وہ ٹھٹھہ سے چودہ کوس کے فاصلے پر تھا کہ ۲۰ مارچ ۱۳۵۱ء کو بمقام سونڈا اس کا انتقال ہو گیا

محمد تغلق اور علماء و صوفیا

علماء اور صوفیائے کرام کے بارے میں محمد تغلق کی حکمت عملی خصوصی مطالعہ کی مقتضی ہے۔ سلطان شمس الدین التمش کے عہد حکومت سے علماء اور صوفیا کو دہلی میں ایک اہم حیثیت حاصل تھی۔ جہاں تک عوام اور طبقۂ امراء میں ان مشائخ کی مقبولیت کا تعلق ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو بلند ترین مقام حاصل تھا۔ وہ اپنے دینی اور روحانی اثر و رسوخ کے لحاظ سے ایک روحانی حکمران کی حیثیت رکھتے تھے۔ محمد تغلق نے علماء اور صوفیائے کرام کے اس اثر و رسوخ کو شاہی وقار کے لیے ایک خطرہ سمجھا۔ چنانچہ اس نے ملکی اور سیاسی امور میں ان کے نفوذ کو کم کرنے کے لیے اپنے عہد کے ابتدائی ایام میں اس نے چند سرکردہ علماء و صوفیا کو خدمت شاہی پر مامور کرنا چاہا۔ میر خورد "سیر الاولیاء" میں لکھتے ہیں کہ سلطان سادات و مشائخ کو دنیوی کاموں پر مامور کرنا چاہتا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان نے حکم دیا کہ درویش، خدمت گاروں کی طرح اس کی خدمت کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سلطان نے سخت گیری بھی اختیار کی۔ سب سے پہلے جو صوفی سلطان کی سخت گیری کا ہدف بنے۔ وہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی تھے۔ جو حضرت نظام الدین اولیاء

Marfat.com

کے خلفاء کبار میں سے تھے۔ انھیں حکم دیا گیا کہ وہ سلطان کو کپڑے پہنایا کریں۔ اگرچہ شروع میں انھوں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا۔ لیکن انھیں اپنے مرشد کی وہ وصیت وہدایت یاد کرائی گئی۔ جس میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ ہر حالت میں دہلی میں قیام کریں خواہ انھیں کیسے ہی مصائب وشدائد برداشت کرنا پڑیں۔

سلطان نے صوفیاء وعلماء کے خلاف دوسرا اقدام یہ کیا کہ اس نے مولانا شمس الدین یحییٰ جو کہ دہلی کے ایک مقتدر عالم اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مریدوں میں سے تھے، سے یہ کہا کہ آپ جیسے مقتدر علماء کا دہلی میں کام کیا ہے۔ آپ کو کشمیر جانا چاہیئے تاکہ آپ اس وادیٔ کفرستان میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ مولانا نے سفر کی تیاری شروع کی لیکن بیمار پڑ گئے۔ اور چند دن بیمار رہ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

سلطان محمد تغلق کی اس سیاسی حکمت کا ایک اور اہم ہدف حضرت شیخ شہاب الدین المعروف بہ آحق گو تھے۔ بادشاہ نے انھیں شاہی یعنی ذاتی خدمت پر مامور کرنا چاہا، لیکن انھوں نے سلطان کے پیغامبر کو یہ کہہ کر واپس لوٹا دیا کہ وہ ایک ظالم کی خدمت نہیں کر سکتے۔ ان الفاظ سے سلطان مشتعل ہو گیا اور قاضیٔ انصاف سے شکایت کی کہ شیخ ایک انصاف پسند حکمران کو ظالم اور جابر کہتا ہے۔ اس لیے وہ سزا کا مستوجب ہے لیکن شیخ نے قاضی کی عدالت میں بھی اپنے الفاظ کو دہرایا اور بادشاہ کے مظالم کی کئی ایک مثالیں پیش کیں۔ اس بیباکی پر بادشاہ اور بھی مشتعل ہو گیا اور اس نے انھیں قتل کرا دیا۔[1]

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محمد تغلق نے سادات اور مشائخ کو ایک خاص لباس پہننے کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دہلی میں علماء ومشائخ کا اثر ونفوذ کافی حد تک زوال پذیر ہوا۔ کئی ایک مشائخ رضاکارانہ طور پر اور کئی ایک مجبوراً دہلی کو چھوڑ گئے۔ اس کے بعد دارالسلطنت میں علماء ومشائخ کو پہلے جیسا روحانی اور مذہبی نفوذ واقتدار دوبارہ حاصل نہ ہو سکا۔ برنی، ابن بطوطہ، فرشتہ اور میر خورد نے سلطان کی علماء پر سختی اور اس کی خون آشامی کی داستانیں بڑے دردناک انداز میں بیان کی ہے۔ زمانۂ حال کے مورخین نے اسے جابر وظالم قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان نے جس عالم دین کو بھی قتل کرایا۔ اس کی کوئی سیاسی وجہ تھی اور مفتیوں سے اس کا باقاعدہ فتوے لیا گیا۔[2]

جدید تحقیق سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ سلطان محمد تغلق تبلیغ اسلام کا بے حد شیدائی تھا۔ وہ دکن اور دیگر اطراف ہند پر تسلط جمانے کے لیے ضروری سمجھتا تھا کہ وہاں کے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کر کے حکومت کا حامی ومددگار بنائے۔ اس کا نظریہ تھا کہ مسلمان علماء اور مشائخ دارالسلطنت دہلی یا دوسرے شہروں میں مقیم رہنے کی بجائے دور دراز کے علاقوں میں جا کر اسلام کی تبلیغ کریں جب کہ علماء بڑے شہروں میں رہ کر سرکاری وظیفوں پر عیش وآرام کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

---

[1] "دی ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل"۔ صفحہ ۶۵۔

[2] سید عبدالقادر وشجاع الدین "تاریخ انڈو پاکستان" صفحہ ۶۶۶

Marfat.com

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سلطان محمد تغلق اپنے پیشرو علاؤالدین خلجی کی مانند سیاست کو مذہب کے تابع رکھنے کے خلاف تھا اور انتظامی امور میں مذہب کی بالادستی کا قائل نہ تھا۔ مطلق العنان بادشاہ ہونے کے باوجود محمد تغلق شرعِ اسلام کے خلاف نہ تھا۔ وہ عموماً عمائد الرائے علماء اور مشائخ کے مشوروں پر بھی عمل کرتا تھا لیکن اس نے محکمۂ انصاف میں علماء اور مشائخ کی اجارہ داری کو ختم کر دیا اور محکمۂ انصاف میں متعدد غیر علماء کو متعین کیا۔ اسی طرح جب بھی اس نے کسی عالم یا شیخ کو باغیانہ عزائم یا مذہبی عطیات و مراعات میں غلط عنوانیوں کا مرتکب پایا، سزائیں دیں۔ لیکن اس اقدام کے باعث سلطان عوام میں غیر مقبول ہو گیا۔

اصل میں محمد تغلق اپنے پیشرو سلطان غیاث الدین بلبن کی طرح اس نظریہ کا حامی تھا کہ سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہے جیسا کہ اس کے سکوں پر کندہ عبارت سے ظاہر ہے۔ (السلطان ظل اللہ)۔ اس کے بعض سکوں پر ہمیں اس مفہوم کے اشعار بھی ملتے ہیں کہ "جو بادشاہ کی اطاعت کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کی اطاعت کرتا ہے" "بادشاہ خدا کا سایہ ہے"۔ "خدا بادشاہ کا حامی و مددگار ہوتا ہے"۔ اس کا ہر حوالہ خلافت کا آئینہ دار تھا اگرچہ وہ خلیفہ نہ کہلایا۔

بعض مؤرخین کا یہ کہنا کہ سلطان نے مشائخ پر بے جا سختی کی قطعی طور پر حقیقت کے منافی ہے۔ اس نے چند ایک صاحبِ اثر شخصیتوں کو سازش و نافرمانی کی بنا پر ضرور سزائیں دیں۔ لیکن سلطان کے اس اقدام کو ہمعصر مؤرخین نے علماء و مشائخ پر بے جا سختی سے تعبیر کیا۔ اور سلطان کے کردار پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے انتہا پرست اور جنونی قرار دیا۔ لیکن مندرجہ ذیل چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مؤرخین کی رائے حقیقت پر مبنی نہیں۔

سلطان نے شیخ ہود کو محض اس لیے قتل کروایا کہ اس نے اپنی موروثی جاگیر جو ستوا گاؤں پر مشتمل تھی اور ان کے جدِ اعلیٰ شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کو تبلیغی کاموں پر خرچ کرنے کے لیے تفویض ہوئی تھی کی آمدنی کو تبلیغی کاموں پر خرچ کرنے کی بجائے اپنی ذات پر خرچ کرنا شروع کر دیا تھا۔

کوئل (علیگڑھ) کے ایک عالم دین شیخ شمس الدین کو اس لیے قتل کرا دیا کہ اس نے اپنی مجلس میں ایک باغی امیر کی تعریف کی بلکہ اسے حکومت کا اہل قرار دیا تھا۔ اسی طرح شیخ حیدری کو حکومت کے خلاف ایک سازش کرنے کے جرم میں موت کی سزا دی گئی تھی۔

خلیفہ عباسی کا منشور

عدل گستری، فیاضی اور ذاتی ذہانت و استعداد کے باوجود سلطان محمد تغلق نے اپنے آپ کو عوام میں غیر مقبول ہوتے دیکھا تو اس نے یہ خیال کیا کہ اس سے عوام کی بے تعلقی و بیزاری شاید شرع اسلامی سے بے گانگی اور علماء و مشائخ پر تشدد کا نتیجہ ہے۔ اس پر اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ فی الحقیقت از سرِ نو شرع اسلامی دنیا پر حکومت کرنے کا حق خلیفۃ المسلمین کو ہے۔ اور خلیفہ عباسی کی

Marfat.com

اجازت کے بغیر اس کی حکومت کی قانونی اور شرعی حیثیت کمزور اور غیر مسلّمہ ہے چنانچہ اس نے ایک قاصد کے ذریعے خلیفہ عباسی جس کی اب کوئی سیاسی حیثیت باقی نہ تھی اور جو مصر میں مملوک فرمانرواؤں کے زیرِ سایہ زندگی گزار رہا تھا، کو سلطانِ ہند کی سند کے لیے درخواست بھیجی۔ منشورِ خلافت کے آنے تک اس نے جمعہ اور عیدین کی نمازیں معطل کر دیں۔ جب خلیفہ کا نامہ بر منشور اور خلعت لے کر آیا تو سلطان برہنہ پا اس کے استقبال کے لیے گیا۔

ابن بطوطہ
۱۳۰۴ء تا ۱۳۷۸ء

ابن بطوطہ کو قرونِ وسطیٰ کے مؤرخین کی صفِ اوّل میں بلند مقام حاصل ہے۔ وہ بیک وقت ایک سیاح، عوام کا مزاج شناس، کردار نگار، عالم، قاضیٔ انصاف، وقائع نگار، بے لاگ نقاد اور نامور مؤرخ تھا۔

اس کا اصل نام محمد بن عبداللہ تھا۔ وہ مراکو کے شہر طنجہ میں ۲۴ فروری ۱۳۰۴ء کو پیدا ہوا۔ علوم متداولہ کے حصول سے فارغ ہونے کے بعد اکیس سال کی عمر میں اس کے دل میں حجِ بیت اللہ اور حرمین الشریفین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ ۱۴ جون ۱۳۲۵ء سفرِ حج کے لیے روانہ ہوا۔ اور ٹیونس، لیبیا اور شمالی افریقہ کے مختلف ممالک کی سیاحت کرتا ہوا مصر پہنچا۔ سب سے پہلے وہ سکندریہ پہنچا۔ مصر سے وہ حج کی غرض سے عازمِ عرب ہوا۔ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد وہ ایک طویل سیاحتی سفر پر روانہ ہو گیا۔ چنانچہ عرب سے شام، ایشیائے کوچک اور عراق کی سیاحت کرتا ہوا ایران پہنچا۔ ایران سے اس نے برصغیر کا قصد کیا۔ اور ۱۲ ستمبر ۱۳۳۳ء کو سندھ پہنچا۔ سندھ سے ملتان اور دیپالپور ہوتا ہوا ابن بطوطہ ۱۳۳۴ء میں دہلی پہنچا۔ جہاں سلطان محمد تغلق سریر آرائے سلطنت تھا۔ چونکہ اس مقتدر سیاح، عالم اور فقیہہ کی شہرت اس کی آمد سے قبل دہلی پہنچ چکی تھی۔ اس لیے سلطان نے اس کی آمد پر خصوصی مسرت کا اظہار کیا۔ دارالسلطنت میں اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ بادشاہ کی والدہ اور وزیر نے بھی اسے پرتکلف ضیافتیں دیں۔ سلطان نے اسے شرفِ باریابی بخشتے ہوئے خلعتِ فاخرہ سے نوازا اور بعد ازاں اس کی علمی وجاہت اور فقہی علم و استعداد کی قدر افزائی کرتے ہوئے اسے دہلی کا قاضی مقرر کیا اور تین گاؤں بطور جاگیر عطا کیے۔ قاضی کے عہدے پر ابن بطوطہ آٹھ سال تک فائز رہا۔

سفارتِ چین
۱۳۴۲ء

ابن بطوطہ کو اگرچہ سلطان کے دربار میں ہر قسم کی آسائشیں اور شایانِ شان مراعات حاصل تھیں۔ مگر اس کے ذوقِ سیاست اور جہاں نوردی کو کسی پل چین نہ تھا۔ خوش قسمتی سے انہی ایام (۱۳۴۱ء) میں چین سے ایک سفارت دربارِ دہلی میں آئی۔ شاہِ چین نے گرانقدر تحفے تحائف بھیج کر سلطانِ ہند سے اظہارِ دوستی کیا۔ حکومتِ چین سے دوستانہ تعلقات کو مزید مستحکم بنانے کی غرض سے سلطان محمد تغلق نے بھی ایک سفارت چین بھیجنے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے لیے سلطان کی نظروں میں ابن بطوطہ موزوں ترین آدمی تھا۔ چنانچہ ۱۳۴۲ء میں اسے سفیر بنا کر چین روانہ کیا۔ ابن بطوطہ جنوبی ہند اور جزائر شرق الہند وغیرہ کی سیاحت کرتا ہوا چین پہنچا۔ اور اپنے سفارتی فرائض کی بجا آوری کے بعد

Marfat.com

۱۳۴۷ء میں چین سے روانہ ہوکر ۱۳۴۹ء میں واپس اپنے وطن (مراکو) پہنچ گیا۔ جہاں اس نے ۷۸-۱۳۷۷ء میں ۷۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔

سفرنامۂ ابنِ بطوطہ

ابن بطوطہ نے اپنے وطن واپس پہنچ کر اپنا سفرنامہ مرتب کیا۔ جو دنیا کی مشہور ترین اور دلچسپ ترین کتابوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت و مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے، کہ دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ ابنِ بطوطہ کا یہ سفرنامہ اس دور کی اسلامی دنیا بلکہ چین سے مراکو تک کے تمام ممالک کے تاریخی، تمدنی، سیاسی اور معاشرتی حالات پر مشتمل ہے۔ اور اس عہد کے اہم ترین تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے متعلق "سفرنامۂ ابن بطوطہ" مشہور مورخین ضیاء الدین برنی اور عصامی کے بیانات کی وضاحت کرتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس دور کے تمدن کی مکمل تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ابن بطوطہ نے دہلی کے لوگوں کی معاشرت، عادات و اطوار اور مذہبی رسوم پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے سفرنامہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں برصغیر کے عوام خوشحال اور فارغ البال تھے۔ ملک میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ ابن بطوطہ نے سلطان محمد تغلق کے دربار اور اس کی شخصیت۔ کردار اور عادات و خصائل کا ایک جامع نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ سلطان کی داد و دہش، سخاوت و فیاضی اور عدل و انصاف کے حیرت انگیز واقعات بیان کرتا ہے۔

محمد تغلق کا کردار اور شخصیت

سلطان محمد تغلق کی شخصیت کے بارے میں سبھی مورخین کی یہ رائے ہے کہ وہ مزاج و طبع کے اعتبار سے مجموعۂ اضداد تھا۔ وہ ظالم و جابر بھی تھا۔ اور نیک و رحمدل بھی۔ وہ تاریخ برصغیر کی ایک ایسی عجیب و غریب شخصیت ہے۔ جس کی فرمانروایانہ خوبیاں مسلّمہ تھیں۔ ہمعصر مورخ ضیاء الدین برنی نے اسے عجوبۂ روزگار کہا ہے۔ اس میں توازن، دوراندیشی، حسن تدبر اور اعتدال پسندی کا فقدان تھا۔ وہ کسی بھی کام میں مشکلات، مصائب یا مخالفت سے نہ گھبراتا تھا اس کی شخصیت میں لچک بالکل نہ تھی۔ اس کے ذہن و افکار پر منطق کا غلبہ تھا۔ اپنی منطق پسند عقل کی رو سے وہ جس چیز کو صحیح سمجھتا تھا۔ اسے بضد پورا کرتا۔ خواہ وہ رعایا کے ذہنی معیار سے کتنی ہی بالا کیوں نہ ہوتی۔ اکثر معاملاتِ مملکت میں انتہا پسندی اس کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ جو بعض اوقات بہت زیادہ شدت اختیار کر لیتی۔ جب اس کے ذہن نے فلسفہ کا اثر قبول کیا، تو وہ الحاد اور انکارِ دین کی حد تک پہنچ گیا۔ اور جب وہ مذہبی حقائق سے متاثر و مغلوب ہوا تو مذہب پرستی میں اس نے اتنی شدت اختیار کی کہ باجماعت نماز پڑھنے

Marfat.com

والوں کو قتل تک کرا دینے سے دریغ نہ کیا۔ اس کے کردار کے بعض اہم پہلوؤں کا اجمالی جائزہ حسب ذیل ہے:

علمی و ادبی استعداد

علم و فضل اور ذہانت کے اعتبار سے سلطان محمد تغلق منفرد شخصیت کا مالک تھا۔ وہ عربی، فارسی اور ترکی زبان کا ادیب اور شاعر تھا۔ وہ خطیب بھی تھا۔ اور حافظِ قرآن بھی۔ فلسفہ، ریاضی، نجوم اور طبیعیات میں کامل دستگاہ رکھتا تھا۔ اور علم و منطق میں تو وہ بلاشبہ یگانۂ روزگار تھا۔ ان علوم کے علاوہ علمِ طب میں اس کی معلومات کا یہ عالم تھا کہ ملک بھر کے اطبا اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ سلطان محمد تغلق فنونِ لطیفہ کا بھی شائق تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا خوشنویس، خوش گفتار اور حیرت انگیز حد تک ذہین واقع ہوا تھا۔

مذہب

سلطان راسخ العقیدہ سُنّی مسلمان تھا اور نماز پنجگانہ و نوافل باقاعدگی سے ادا کرتا تھا۔ میخواری اور ہر قسم کے فواحشات و منکرات سے اجتناب کرتا تھا۔ اس نے ایک امیر کی ساری جائداد محض اس بنا پر بحقِ سرکار ضبط کر لی کہ وہ شراب نوشی کا عادی تھا۔ مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لیے اس کے احکام اس قدر سخت تھے کہ بقول ابنِ بطوطہ سلطان کے بہنوئی امیر سیف الدین کی شادی کی تقریب میں اذان کی آواز سن کر امرا و خواص تو درکنار، ڈوم اور مغنّی تک رقص و موسیقی چھوڑ کر فریضۂ نماز کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے۔ وہ شرع اسلامی کا اس حد تک پابند تھا کہ کسی کو قتل کرنے یا کڑی سزا دینے سے قبل مفتی سے باقاعدہ شرعی اجازت (فتویٰ) حاصل کرتا تھا۔

عدل و انصاف

عالم، نیک نفس اور پاکیزہ صفت انسان ہونے کی حیثیت سے محمد تغلق کی نجی زندگی بڑی صاف ستھری اور بے داغ تھی۔ عدل و انصاف کا اس کو اس قدر پاس تھا کہ ہفتہ میں دو بار بہ نفسِ نفیس سرِ دربار فریادیوں کی شکایات سنتا۔ اور فیصلے صادر کرتا تھا۔ عدل گستری میں وہ کسی کی حشمت و حیثیت کا حتیٰ کہ خود اپنا بھی لحاظ نہ کرتا تھا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ ایک بار سلطان کے بہنوئی امیر سیف الدین نے ایک دربان کو زخمی کر دیا۔ دربان نے سلطان سے فریاد کی۔ سلطان نے معاملہ قاضی کے سپرد کر دیا۔ فیصلہ امیر کے خلاف ہوا۔ جس پر باقاعدہ عمل کیا گیا۔ ایک مرتبہ ایک تاجر نے سلطان کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ سلطان ایک عام ملزم کی حیثیت سے حاضرِ عدالت ہوا۔ قاضی نے فیصلہ سلطان کے خلاف دیا۔ جس پر سلطان نے کسی قسم کی ناراضگی یا اختلاف کا اظہار نہ کیا بلکہ اس نے اصرار کیا کہ اسے وہیں عدالت میں سزا کے مطابق کوڑے مارے جائیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک نوجوان نے اپیل کی کہ اسے بلا تقصیر کوڑوں کی سزا دی گئی ہے۔ چنانچہ سلطان نے اس کے ہاتھ سے اتنے ہی کوڑے خود کھائے۔ جتنے اس نوجوان کو لگائے گئے تھے۔ حتیٰ کہ دورانِ سزا اس کا عمامۂ شاہی بھی زمین پر گر پڑا۔

سلطان کی رواداری

مذہبی معاملات میں سلطان بڑا روادار تھا۔ اور اپنی ہندو رعایا پر بڑا مہربان تھا۔ ہندو جوگیوں سے بڑے شوق سے ملتا تھا۔ اس نے سیوستان (صوبہ سندھ)

Marfat.com

میں رتن نامی ایک ہندو گورنر مقرر کیا۔ اور دیوگڑھی میں دھارا نامی ایک ہندو کو نائب وزیر مقرر کیا۔

مؤرخین کی متضاد آرا

سلطان محمد تغلق کی شخصیت اور اس کے کردار کے متعلق مؤرخین متضاد آرار رکھتے ہیں۔ وہ اسے مجموعۂ ضدّین شمار کرتے ہوئے ظالم و جابر کے علاوہ نیک اور رحمدل بھی بیان کرتے ہیں۔ ہمعصر مؤرخین میں سے ضیاءالدین برنی اور ابن بطوطہ نے سلطان کی شخصیت کے دونوں پہلوؤں پر بدرجۂ اتم روشنی ڈالی ہے۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ سلطان انعام واکرام دینے اور مجرموں کا خون بہانے کا شائق ہے۔ سلطان حلیم الطبع، منصف مزاج، صوم وصلوٰۃ اور شرعی احکام کا پابند ہے۔

ضیاءالدین برنی لکھتا ہے کہ جو تجویز سلطان کے دل میں آتی تھی۔ بلاکم وکاست اور بغیر کسی مشورے کے وہ اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے نظامِ سلطنت زیر و زبر ہوگیا۔ بے چینی رونما ہوئی۔ شاہی خزانہ خالی ہوگیا۔ باغیوں نے سر اٹھایا۔ اور سلطان کا مزاج برہم ہوتا چلا گیا۔ ہندو مؤرخین نے سلطان کے خلاف بہت زہر اگلا ہے۔ وہ اسے جنونی اور پاگل قرار دیتے ہیں۔ سر ولزلے ہیگ لکھتا ہے کہ سلطان نے اپنے عہد کے ابتدائی ایام میں جس انصاف کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ اس کے بعد مظالم کی تلافی نہیں کر سکتا۔ فرشتہ کی رائے ہے کہ سلطان انصاف اور رعایا پروری سے عاری نہ تھا۔

مندرجہ بالا آرار سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کی شخصیت کا اندازہ لگاتے وقت مورخین نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ محمد تغلق درحقیقت جابر و ظالم نہ تھا۔ کیونکہ اس کے مسلسل ظلم و تشدد کی کہیں تصدیق نہیں ہوتی۔ جہاں کہیں خون ریزی کے واقعات ملتے ہیں۔ وہ سلطان کی طبیعت کے انتہائی غم و غصہ کے آئینہ دار ہیں۔ سزائیں انہی لوگوں کو دی جاتی تھیں۔ جو سزاؤں کے مستحق ہوتے تھے۔ البتہ اس کی طبیعت میں انتہا پسندی تھی۔ خواہ وہ لطف و کرم کی صورت میں ہو یا جبر و سزا کی شکل میں۔ ابن بطوطہ خود لکھتا ہے کہ اس کی بارگاہ سے امیر غریب ہو کر اور غریب امیر ہو کر نکلتے تھے۔ مشہور انگریز مورخ لین پول کی رائے ہے کہ سلطان اعلیٰ تخیل اور ارادے کا مالک تھا۔ مگر اس کے انوکھے اور نت نئے منصوبے اس کے عہد کے حسب حال نہ تھے۔ زمانۂ حال کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر آغا مہدی حسین رقمطراز ہیں کہ:

> "سلطان نہ نظر بازی تھا نہ بے عمل۔ اس کی تجاویز نہ غیر موزوں تھیں اور نہ انسانی طاقت سے ماورا۔ وہ اپنے عہد سے بہت پہلے پیدا ہوگیا تھا ——"[1]

---

[1] "ٹائمز اینڈ فال آف محمد بن تغلق" صفحہ ۲۱۶۔

Marfat.com

سلطان فیروز شاہ تغلق

(۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء)

"وہ اپنے قول و فعل میں راسخ اور دیانت دار تھا۔ اور بلاشبہ عوام کا خیر خواہ تھا۔ اُس سے قبل یا بعد سلطنتِ دہلی کے کسی سلطان نے بھی اپنی رعایا کی مالی خوشحالی کے لیے اس جیسا کام نہیں کیا۔ اس کے نظامِ مالیہ سے نہ صرف زراعت ترقی پذیر ہوئی بلکہ عوام خوشحال اور فارغ البال ہو گئے۔"[1]

(سری واستوا)

ابتدائی حالات

فیروز شاہ تغلق، سلطان غیاث الدین تغلق کے چھوٹے بھائی سپہ سالار رجب کا فرزند تھا۔ اس کی والدہ نائلہ جسے سسرال میں سلطان بی بی کدبانو کا خطاب ملا۔ ابوہر (مشرقی پنجاب) کے بھٹی راجپوت سردار رانا مل کی لڑکی تھی۔ روایت ہے کہ جن دنوں سلطان غیاث الدین تغلق (غازی ملک تغلق) سلطان علاؤالدین خلجی کی طرف سے دیپالپور کا حاکم تھا۔ اس نے اس راجپوت شہزادی کے حسن و جمال کا شہرہ سنا تو اس نے رانا مل کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی اس کے بھائی سپہ سالار رجب سے کر دے۔ لیکن جب یہ درخواست رد کر دی گئی تو غازی ملک تغلق نے تشدد کا مظاہرہ کرتے ہوئے ابوہر کے لوگوں سے لگانِ اراضی کی فوری ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ اس پر لڑکی نے اپنے خاندان کو تباہی و عتاب سے بچانے کے لیے خود اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔[2] چنانچہ اس راجپوت راجکماری کے بطن سے ۱۳۰۹ء[3] میں دیپالپور کے مقام پر فیروز شاہ پیدا ہوا۔ ابھی وہ سات سال کا تھا کہ اس کے باپ نے وفات پائی۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین تغلق اور اس کے بعد محمد تغلق نے اس کی پرورش اور تربیت کی۔ رموزِ جہانبانی کی تربیت بھی فیروز شاہ نے انہی سے پائی۔ محمد تغلق سریر آرائے سلطنت ہوا۔ تو اس نے اسے امیر حاجب مقرر کرتے ہوئے نائب باربک کا خطاب عطا کیا۔ سلطان محمد تغلق کو وہ اس قدر عزیز تھا کہ سلطان اسے ہمیشہ اپنے ہمراہ رکھتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق سلطان اسے اپنا جانشین مقرر کرنا چاہتا تھا۔ ٹھٹھہ کی مہم میں فیروز شاہ سلطان کی معیت میں تھا۔ سلطان محمد تغلق بیمار ہوا، تو فیروز شاہ نے اس کے علاج معالجہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ ۲۰ مارچ ۱۳۵۱ء کو سلطان محمد تغلق نے مرتے وقت وصیت کی کہ "میرے بعد فیروز شاہ بادشاہ ہو۔"

---

[1] "دی سلطنت آف دہلی" صفحہ ۱۹-۲۱۸۔

[2] "ہسٹری آف میڈیول انڈیا" ایشوری پرشاد صفحہ ۲۹۶

[3] عفیف "تاریخ فیروز شاہی" صفحہ ۲۳ لیکن آغا مہدی حسین "عریبک ہسٹری آف گجرات" جلد سوم صفحہ ۸۹۳ کے حوالے سے ۱۳۰۶ء قرار دیتے ہیں۔ "تغلق ڈائنیسٹی" صفحہ ۳۸۶۔

Marfat.com

تخت نشینی

۱۳۵۱ء

سلطان محمد تغلق کی غیر متوقع موت سے سلطانی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ گجرات کے باغی سردار تاتی، اہل ٹھٹھہ اور سلطان مرحوم کے منہ بولے دستے نے باغی ہو کر اپنے سردار فیروز کرگن کی سرکردگی میں شاہی فوج پر حملے شروع کر دیئے اور قریب تھا کہ وہ حرم شاہی اور خزانہ تک پہنچ جاتے، لیکن شاہی کیمپ کے امراء اور علماء و مشائخ نے متفقہ طور پر فیروز کو تخت کے لیے منتخب کیا۔ فیروز شاہ نے امراء کے اصرار پر زمام حکومت سنبھالتے ہی فوج کو از سر نو منظم کیا۔ اور سندھیوں اور مغلوں کے حملوں کا سدباب کرنے کے بعد دہلی کی طرف کوچ کیا۔

دہلی میں وزیر اعظم خواجہ جہان احمد ایاز نے سلطان کی وفات کی اطلاع پا کر ایک خورد سال بچے کو سلطان کا فرزند قرار دے کر تخت نشین کر دیا۔ مگر جوں جوں سلطان فیروز شاہ دہلی کی طرف بڑھا، امرائے سلطنت کے ساتھ چھوڑنے کی وجہ سے خواجہ جہان احمد ایاز کی قوت کمزور ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ جب سلطان فوج دہلی میں پہنچا تو خواجہ جہان احمد ایاز خود سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر سابقہ گناہوں کی معافی کا خواستگار ہوا۔ سلطان نے کمال فیاضی اور دریا دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے معاف کر دیا اور سابقہ میں اسے جاگیر عطا کی۔ لیکن جن امراء بالخصوص ملک مقبول نے فیروز شاہ کی حمایت میں خواجہ جہان کی مخالفت کی تھی۔ وہ سلطان کے اس فیصلے سے بہت ناخوش ہوئے انہیں اندیشہ ہوا کہ اگر خواجہ جہاں دوبارہ مسند وزارت پر متمکن ہو گیا۔ تو وہ انہیں سخت پریشان کرے گا۔ چنانچہ ان سب نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ خواجہ جہاں کے رہنے سے سلطان کے تمام معاملات درست ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ہم سب کو حج کے لیے جانے کی اجازت دی جائے۔ فیروز شاہ نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے خواجہ جہاں احمد ایاز کو سامانہ میں اس کی جاگیر میں بھیج دیا۔ جہاں سامانہ کے گورنر خیر خاں نے اس کے کہنے پر اسے قتل کر دیا۔ اس طرح فیروز شاہ بلا شرکت غیرے سلطنت دہلی کا فرمانروا بن

ابتدائی احکامات

جب فیروز تغلق تخت پر بیٹھا تو تمرد پختگی کے ساتھ سے [illegible] تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ چونکہ امیر حاجب کی حیثیت سے اسے مرحوم سلطان کا بہت قرب حاصل رہا تھا۔ اور وہ قریب سے سلطان کی پالیسی اور ہر قسم کے تباہ کن نتائج کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی حکومت کے لیے ایک مستقل اصول یہ وضع کیا کہ ان تمام طاقت ور عناصر کو جو اس کی مخالفت ان کے پیچھے سے بغاوت کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب بنی تھی۔ یہ پالیسی اس کے مزاج کے عین مناسب تھی۔ کیونکہ وہ صاحب عزم و استقلال نہ تھا۔ اور امراء و علماء سے اختلاف رکھنے کے تصفیہ طلب تھا۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھا اور تصوف سے اسے خاص لگاؤ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تخت نشینی سے قبل ہی وہ عوام میں ایک رحمدل، فیاض، پرہیزگار اور کریم النفس انسان کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے عہد کو کامیاب بنانے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کیے:

۱۔ ملک مقبول کو، جو خواجہ جہان احمد ایاز کی مخالفت اور اس کے برطرف کیے جانے کی کوششوں میں پیش پیش

Marfat.com

تھا۔ خان جہاں کے خطاب سے وزیر مقرر کیا۔

۲۔ خان جہاں احمد ایاز نے اپنی پوزیشن کے استحکام کے لیے امراء میں جو بیشمار روپیہ تقسیم کیا تھا، وہ سب معاف کر دیا گیا۔

۳۔ رعایا کی خوشحالی اور بہبودی کے پیش نظر خراج، زکوٰۃ، جزیہ اور خمس کے سوا سب غیر شرعی ٹیکس منسوخ کر دیئے گئے۔

۴۔ رعایا سے مشفقانہ اور رحمدلانہ سلوک روا رکھتے ہوئے، خوفناک اور وحشیانہ سزائیں مثلاً کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنا۔ دیوار میں زندہ چنوا دینا وغیرہ کلّی طور پر ختم کر دیں۔ اور قید خانوں کی حالت کو سدھارا گیا۔

۵۔ حکومت کے تمام سابقہ واجب الادا قرضے معاف کر دیئے۔ نیز متعدد بدعتوں اور بری رسموں کو بند کرتے ہوئے عورتوں کا مزاروں اور میلوں پر جانا ممنوع قرار دیا۔

۶۔ سونے چاندی کے برتنوں اور ریشمی کپڑوں کا استعمال ممنوع قرار دیا۔ یہ احکام فتوحات فیروز شاہی میں مندرج ہیں اور ان کی تعداد چھبیس ہے۔

فوجی مہمّات

سلطان فیروز شاہ کی خواہش تھی کہ سلطنت کے ان تمام چھنے ہوئے علاقوں کو از سر نو فتح کرے جو سلطان محمد تغلق کے عہد میں بغاوتیں کر کے سلطنتِ دہلی کے حلقۂ اثر سے نکل کر خود مختار ہو گئے تھے۔ اس غرض سے اس نے مختلف مہمات کا اہتمام کیا۔ مگر چھنے ہوئے علاقوں کی بازیافت کے متعلق اس نے جو پالیسی اختیار کی وہ کمزور اور غیر موثر تھی اس لئے ان مہمات میں سلطان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ذیل میں سلطان کی فوجی مہمّات کا مختصر جائزہ دیا جاتا ہے:

بنگال کی مہم

۵۹-۱۳۵۳ء

جب فیروز شاہ تختِ دہلی پر متمکّن ہوا۔ بنگال اس وقت حاجی شمس الدین الیاس کے زیر نگیں تھا۔ جس نے بنگال میں ایک خود مختار اور منظم حکومت قائم کر کے بہار اور اودھ پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ نومبر ۱۳۵۳ء میں سلطان ایک بھاری فوج اور ایک ہزار کشتیوں کی جمعیت لے کر اس کی گوشمالی کے لیے بنگال روانہ ہوا۔ بنگالی فوج کو شکست ہوئی اور حاجی شمس الدین الیاس قلعہ اکدالہ میں پناہ گزین ہوا۔ سلطان نے آگے بڑھ کر قلعہ اکدالہ کا محاصرہ کر لیا۔ مگر قلعہ تسخیر نہ ہو سکا۔ اسی دوران برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ لہٰذا فیروز شاہ نے خود ہی اشارۃً صلح کا خیال ظاہر کیا۔ حاجی شمس الدین الیاس نے بھی اسے مناسب سمجھتے ہوئے سلطنت دہلی کی سادت قبول کر لی۔ صلح کے بعد مئی ۱۳۵۴ء

Marfat.com

میں سلطان واپس دہلی آگیا۔

۱۳۵۹ء میں حاجی شمس الدین الیاس کی وفات کے بعد اس کا فرزند سکندر تخت نشین ہوا تو اس نے بھی حسب سابق اپنی جانب سے تسلیم و اطاعت کا پیغام اور تحائف و نذرانے بھیج کر سلطنتِ دہلی کی سیادت کو قبول کیا۔ لیکن سلطان فیروز شاہ حاجی شمس الدین الیاس کی وفات کی خبر سنتے ہی فوج لے کر برق رفتاری سے بنگال کی جانب روانہ ہوگیا۔ تاکہ سکندر کے قدم جمنے سے قبل ہی بنگال کو فتح کر سکے۔ سکندر قلعہ اکدالہ میں قلعہ بند ہوگیا۔ سلطان اس بار بھی عسکری قوت کے بل بوتے پر قلعہ کو مسخر نہ کر سکا۔ چنانچہ جب سکندر کی طرف سے کنایتہً صلح کی درخواست آئی تو سلطان نے اسے بخوشی قبول کر لیا۔ فیروز شاہ نے سکندر کو تاج بھیج کر بنگال میں اس کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا۔ سکندر نے سلطان کی بالادستی قبول کر لی۔ لیکن بنگال میں حسبِ سابق خطبہ اور سکہ سکندر کا ہی چلتا رہا۔

جاج نگر

۱۳۶۰ء

بنگال سے واپسی پر سلطان نے اپنے آباد کردہ شہر جونپور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد جاج نگر (اڑیسہ) پر فوج کشی کی۔ جاج نگر کا راجہ مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے فرار ہوگیا۔ مگر بعد ازاں ہر سال ہاتھی روانہ کرنے کی شرط پر صلح کر کے اطاعت گزار ہوا۔ اس مہم کے دوران سلطان نے پوری میں واقع جگن ناتھ کے مندر کو تاخت و تاراج کیا۔ اور اس کے بت کو سمندر میں پھینکوا دیا۔

جاج نگر سے سلطان فیروز شاہ تغلق چھوٹا ناگپور کے جنگلوں میں سے ہوتا ہوا دہلی روانہ ہوا۔ لیکن وہ راستہ بھول گیا۔ جس کے باعث کچھ عرصہ کے لیے دارالسلطنت سے اس کا سلسلۂ مراسلت یکسر منقطع رہا۔ اس دوران ملک مقبول خان جہاں نہایت خوش اسلوبی سے امورِ سلطنت انجام دیتا رہا۔ کچھ دنوں کی راہ نوردی کے بعد سلطان کو راستہ مل گیا۔ اور جون ۱۳۶۰ء میں کڑہ ہوتا ہوا دہلی پہنچ گیا۔

نگرکوٹ

۱۳۶۰ء

نگرکوٹ (کانگڑہ) کے راجہ نے اپنی طاقت کے زعم میں نواحی علاقہ کی بستیوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ سلطان نے اس کی گوشمالی کرنے کے لیے نگرکوٹ پر فوج کشی کی۔ راجہ قلعہ نگرکوٹ میں قلعہ بند ہوگیا۔ چھ ماہ کے طویل اور بے سود محاصرہ کے بعد سلطان نے خود ہی اشارۃً صلح کی تجویز پیش کی، جو راجہ نے فی الفور مان لی۔ دونوں طرف سے تحفے تحائف کا تبادلہ ہوا۔ اور فریقین میں دوستانہ مراسم قائم ہوگئے۔ سلطان نے جوالا مکھی کا مندر بھی دیکھا۔ لشکر شاہی کے بعض تخریب پسندوں نے اس مندر کو تباہ کرنا چاہا۔ لیکن بادشاہ نے شریعت اسلام کے حکم پر عمل کرتے ہوئے ہندوؤں کے اس قدیم معبد کی بے حرمتی کرنے کی ممانعت کر دی۔ نگرکوٹ سے بہت سے مالِ غنیمت کے علاوہ سلطان جوالا مکھی مندر کی لائبریری سے سنسکرت زبان کی تیرہ سو قدیم کتب لے کر دہلی پہنچا۔ جن میں سے اس نے چند ایک کتب کا فارسی میں ترجمہ بھی کرایا۔

Marfat.com

ٹھٹھہ
۱۳۶۱-۶۳ء

تغی کی بغاوت کے وقت سندھ سلطنتِ دہلی کے حلقۂ اثر سے آزاد ہوگیا تھا۔ اور سندھ کی حکومت اس وقت سمہ خاندان کے جام علاؤالدین جونا اور صدر الدین بانبینہ (Banhbina) کے ہاتھوں میں تھی۔ انھوں نے تاتاریوں کے ساتھ مل کر ملتان اور گجرات پر حملے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ۱۳۶۱ء میں سلطان فیروز شاہ تغلق ان کی گوشمالی کے لیے لشکرِ جرّار لے کر روانہ ہوا۔ اور ٹھٹھہ پہنچ کر شہر کے باہر خیمہ زن ہوا۔ کچھ عرصہ تک معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ جن میں شاہی فوج کو کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ سلطان عزم و استقلال سے بالکل عاری تھا۔ اور اس کے پاس کوئی اچھا سپہ سالار بھی موجود نہ تھا۔ وہ اس خام خیال میں مبتلا رہا کہ طویل محاصرے ہی سے وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے گا۔ اس دوران لشکر شاہی کی رسد ختم ہو گئی اور سلطان کو مجبوراً یہ مہم ترک کر کے گجرات جانا پڑا۔ راستہ میں سلطان خلیج کچھ کے علاقہ میں راہ سے بھٹک گیا۔ چنانچہ بیشمار سپاہی اور گھوڑے اس سفر کے دوران ضائع ہو گئے۔ جب دہلی میں ایک عرصہ تک سلطان کی سلامتی کی کوئی خبر نہ پہنچی۔ تو عوام اور امراء کو بڑی تشویش ہوئی۔ لیکن خان جہاں نے امن و اماں قائم رکھنے کے لیے سلطان کی سلامتی کا ایک جعلی فرمان نشر کرا کے صورت حال کو قابو میں رکھا۔ بالآخر فیروز شاہ تغلق بڑے سخت مصائب جھیلنے کے بعد گجرات پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

گجرات میں سلطان نے فوج کو از سرِ نو منظم کیا۔ اور ۱۳۶۳ء میں ٹھٹھہ پر دوبارہ حملہ آور ہوا۔ لیکن سلطان نے بارِ دیگر غیر مستقل مزاجی کا ثبوت دیا۔ اور فوج کو میدان جنگ سے واپس بلا لیا۔ اس سے اس کا عسکری وقار سخت متاثر ہوا۔ اس نے سلطنت کے سارے صوبوں سے مزید فوجی کمک بھی منگوائی۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ جنگ سے گریز کرتا رہا۔ اس طویل کشمکش سے سندھ کے عوام سخت پریشان ہو گئے۔ بالآخر جام جونا اور بانبینہ نے اُچ کے مشہور صوفی بزرگ سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں جہان گشت کی وساطت سے سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔ سلطان ان دونوں کو اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ اور سندھ میں جام جونا کے لڑکے اور بانبینہ کے بھائی کو حاکم مقرر کیا۔

تبصرہ

ٹھٹھہ کی مہم سلطان فیروز تغلق کی آخری مہم تھی۔ جس کے بعد اس نے جنگ و جدل کو ترک دیا۔ اور رفاہ عامہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ فیروز شاہ کا دور فتوحات سے خالی ہے۔ فوجی نکتۂ نظر سے اس کی مہمات میں کسی مہم کو بھی کامیاب نہیں سمجھا جا سکتا۔ بنگال اور نگرکوٹ کی مہمیں تو قریب قریب بے سود ہی رہیں۔ ٹھٹھہ میں جو کامیابی ہوئی اس کی بھی اسے بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ ٹھٹھہ سے واپسی کے بعد سلطان تسخیر دکن کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن خان جہان نے جنگ کے نقصانات ظاہر کر کے سلطان کو تسخیرِ دکن کے ارادے سے باز رکھا۔

فیروز شاہ کا نظامِ حکومت

اگرچہ فیروز شاہ تغلق جنگی مہمات میں ناکام رہا۔ مگر امورِ جہانبانی میں اس کی استعداد و قابلیت مسلّم تھی اس

Marfat.com

نے امن وامان قائم کرکے عوام کو اقتصادی طور پر فارغ البال کر دیا۔ اور اپنی تمام تر توجہ اصلاحات کی طرف مبذول کر دی۔ ان اصلاحات میں اس نے رفاہِ عامہ ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ جس کی وجہ سے وہ عوام میں غیر معمولی طور پر مقبول ہوا۔ نظامِ حکومت کی اصلاح کے لیے اس نے مندرجہ ذیل اصلاحات جاری کیں :۔

مالی اصلاحات

فیروز شاہ کی تخت نشینی کے وقت سلطنت کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ محمد تغلق کے منصوبوں کی ناکامی اور اس کی بے جا فیاضی کی وجہ سے سلطنت کا مالی نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ خزانہ بالکل خالی تھا اور نظامِ مالیات کی تنظیم نو کی سخت ضرورت تھی۔ لہٰذا سلطان فیروز شاہ نے سب سے پہلے کسانوں کی گذشتہ تباہ حالی کی تلافی اور حکومت کی اقتصادی حالت کی اصلاح کے لیے خواجہ حسام الدین جنید کو سارے ملک کا مالیاتی جائزہ لینے اور زرعی محصولات کا تخمینہ مرتب کرنے پر مامور کیا۔ خواجہ حسام الدین نے سارے ملک کا دورہ کیا۔ اور چھ سال شب و روز محنت کرکے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ کُل سلطنت کے سالانہ لگان کا جو اندازہ لگایا گیا، وہ پونے سات کروڑ تنکہ تھا۔ شمس سراج عفیف 'تاریخ فیروز شاہی' میں رقمطراز ہے کہ فیروز شاہ کے عہد میں یہی مالیہ وصول کیا جاتا رہا۔ اور رعایا کی خوشحالی کے باوجود سلطان نے اس میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ بلکہ زراعت کی ترقی کے لیے کنوئیں اور نہریں کھدوائیں اور سابقہ شرح لگان گھٹا کر پیداوار کا ۱/۵ حصہ مقرر کی اور افسرانِ مال کو حکم دیا کہ وہ کاشت کاروں سے ہمیشہ نرم سلوک روا رکھیں۔ سلطان نے مکمل تحقیقات کے بعد تمام غیر شرعی ٹیکس معاف کر دیئے۔ اور صرف پانچ قسم کے ٹیکس جن کی شریعت اجازت دیتی تھی، بحال رکھے مثلاً۔ ۱۔ **خراج** :۔ جو زرعی پیداوار پر وصول کیا جاتا تھا۔ اور پیداوار کا پانچواں حصہ ہوتا تھا۔

۲۔ **عشر** :۔ جو بعض کھیتوں کی آمدنی کا دسواں حصہ بطور محصول حکومت وصول کرتی تھی۔ یہ ٹیکس ایسی زمینوں پر لاگو ہوتا تھا۔ جو حکومت کی طرف سے علماء اور صوفیاء کو بطور امداد دی جاتی تھیں۔ بنجر اور غیر آباد زمین کی آبادکاری پر بھی فشر ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔

۳۔ **زکوٰۃ** :۔ جو مسلمان رعایا اپنی آمدنی کا ڈھائی فیصد حکومت کو ادا کرتی تھی۔ زکوٰۃ کی یہ رقم حکومت خیراتی کاموں پر صرف کرتی تھی۔

۴۔ **جزیہ** :۔ جو غیر مسلم اقوام سے ان کی حفاظت کے عوضانہ کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔ بچے، بوڑھے عورتیں، بیمار، غلام، دیوانے اور عسکری خدمت پر مامور ذمی اس ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ سلطان فیروز شاہ نے جزیہ برہمنوں سے بھی وصول کرنا شروع کر دیا۔ برہمنوں کے احتجاج پر سلطان نے نہ صرف برہمنوں بلکہ تمام ہندوؤں پر جزیہ کا بار ہلکا کر دیا۔

سلطان نے کئی ایک ایسے غیر اسلامی ٹیکس بھی منسوخ کر دیئے۔ جن کا اطلاق شہری آبادی پر ہوتا تھا۔ اس سے حکومت کی آمدنی پر خاصا اثر پڑا۔ یہ ٹیکس مختلف صناعوں مثلاً صابن سازوں، تیل نکالنے والوں اور مختلف تاجروں مثلاً گل فروشوں اور ماہی فروشوں پر عائد تھے۔ علاوہ ازیں اس نے ریڑھی والوں پر ٹیکس اور

Marfat.com

چرائی ٹیکس جو عموماً دیہات کے لیے مخصوص تھے، بھی منسوخ کر دیئے۔ ان متعدد محصولات کی کمی سے رعایا کے چھوٹے طبقوں خصوصاً دستکاروں کو بہت فائدہ پہنچا۔ چنانچہ رعایا خوشحال اور مال و دولت کی فراوانی عام ہوگئی۔

جاگیرداری نظام

سلطان علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق نے جاگیرداری نظام کو ختم کر دیا تھا۔ وہ امرار اور دوسرے لوگوں کو جاگیروں کی بجائے نقد تنخواہیں دیتے تھے۔ لیکن فیروز شاہ نے جاگیرداری نظام کو از سر نو جاری کر دیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ محمد تغلق کی اکثر و بیشتر تکالیف کا باعث محض اُمرار کی ناراضگی تھی اس لیے اس نے امرار کو کاروبارِ سلطنت میں بہت اہمیت دی۔ اور انھیں بڑی بڑی جاگیروں سے بھی نوازا۔ اس سے ملک کا بہت سا حصہ جاگیروں میں بٹ گیا اور حکومت کی آمدنی بُری طرح سے متاثر ہوئی۔ سلطان کی یہ پالیسی مفید ثابت نہ ہوئی کیونکہ جاگیردار مزارعین کو ان کی محنت و مشقت کا مناسب معاوضہ نہ دیتے تھے۔ اس کے برعکس خود ان کی فارغ البالی کا یہ عالم تھا کہ ان کے گھروں میں شب و روز ہُن برستا تھا اور معاشرہ میں ان کا اقتدار و نفوذ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

ذرائع آب پاشی

زراعت اور کاشت کی ترقی کے لیے سلطان نے ملک میں پانچ نہریں کھدوائیں جن میں سے دو نہریں بہت مشہور ہیں۔ اوّل نہر جمن عزنی جو دریائے جمنا سے نکالی گئی۔ یہ بانسی، رہتک اور حصار کے علاقوں کو سیراب کرتی تھی۔ یہ ۹۶ میل لمبی تھی۔ علاوہ ازیں ابوہر، دیپالپور اور ملتان کے علاقوں کے لیے بھی نہریں کھودی گئیں جو بعد میں حکومت کی لاپرواہی اور غفلت کی وجہ سے بیکار ہوگئیں ان نہروں کی بدولت صحرائی علاقے سرسبز و شاداب ہوگئے۔ زراعت ترقی پذیر ہوئی اور سال میں دو فصلیں کاشت ہونے لگیں اور اجناس کی قیمتیں بھی گر گئیں۔ سلطان نے آب پاشی کے لیے مختلف علاقوں میں ۱۵۰ کنوئیں اور تین ۳ تالاب بھی تعمیر کرائے۔

عدل و انصاف

معاملاتِ عدل میں سلطان فیروز شاہ تغلق احکامِ شریعت کی پوری پابندی کرتا تھا۔ باقاعدہ طور پر محکمۂ عدل و انصاف قائم تھا۔ دارالسلطنت دہلی میں قاضی القضاۃ (چیف قاضی) اور صوبوں اور شہروں میں مفتی و قاضی مقرر تھے۔ ہر مقدمہ میں اسلامی رواج کے مطابق مفتی شرعی فتویٰ صادر کرتا اور قاضی فیصلہ سناتا تھا۔ سلطان نے متعدد سنگین اور انسانیت سوز سزائیں منسوخ کر دیں تھیں۔ وہ بے حد رحمدل واقع ہوا تھا۔ بعض اوقات مجرموں کو کُلّی طور پر معاف بھی کر دیتا تھا۔

فوج

سلطان فیروز شاہ نے نوّے ہزار سواروں پر مشتمل ایک باقاعدہ اور مستقل فوج منظم کی۔ جسے تنخواہ کے عوض جاگیریں دی جاتی تھیں۔ غیر مستقل فوج کو شاہی خزانے سے نقد تنخواہ ادا کی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں دو لاکھ فوج جاگیرداروں اور ترک سرداروں کے ماتحت بھی تھی۔ فوج کے سواروں کو تندرست و توانا گھوڑے رکھنے کا حکم تھا۔ وزیر دفاع ملک راضی نے کئی ایک عسکری بدعنوانیوں کو دُور کیا۔ سپاہیوں کے ساتھ نہایت نرمی کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اور ان کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور کوتاہیوں کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

Marfat.com

سلطان فیروز شاہ نے فوج سے علیٰحدگی (ریٹائرمنٹ) کے لیے عمر کی پابندی بالکل ختم کر دی تھی۔ سپاہی جب تک چاہتا فوج میں رہ سکتا تھا۔ ریٹائر ہونے والے بوڑھے سپاہیوں کی جگہ ان کے لڑکے۔ داماد اور غلام بھی فوجی خدمت پر متعین ہو سکتے تھے۔ یہ پالیسی اچھے نتائج کی حامل ثابت نہ ہوئی اور فوج میں نااہل افسر جمع ہو گئے۔ جس سے فوج کی کارکردگی بُری طرح سے متاثر ہوئی۔

غلاموں کی پرورش

سلطان فیروز شاہ کے عہد میں غلام رکھنے کا رواج عام تھا۔ سلطان کو غلام جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس نے صوبائی گورنروں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ اچھے غلام خرید کر بارگاہِ سلطانی میں بھیجیں۔ چنانچہ اسی طرح ایک لاکھ اسّی ہزار غلام سلطان کے پاس جمع ہو گئے۔ جن میں سے چالیس ہزار غلام باقاعدہ طور پر قصرِ سلطانی میں شاہی خدمت پر مامور تھے۔ سلطان نے غلاموں کے لیے ایک علیحدہ محکمہ قائم کر رکھا تھا۔ جہاں انھیں مناسب تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا جاتا اور ان کی استعداد کے مطابق کام سکھائے جاتے تھے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ سلطان کمزور طبع انسان تھا اور ایک ایسی جماعت کا سہارا لینا چاہتا تھا۔ جو ہر طرح سے اس کی وفادار اور خیر خواہ ہو۔ مگر افسوس غلاموں کی یہ جماعت سلطان کی وفات کے بعد خاندانِ تغلق کے لیے بجائے مفید ہونے کے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ کیونکہ سلطان کی موت کے بعد ان غلاموں نے حصولِ اقتدار کے لیے تمام ملک میں شورشیں اور بغاوتیں برپا کرنا شروع کر دی تھیں۔

تعمیراتِ عامہ

سلطان فیروز شاہ کو تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ اس نے ملک غازی شحنہ اور عبدالحق کی نگرانی میں دیوانِ وزارت کا محکمہ قائم کیا جو نئی اور پرانی تعمیرات کی دیکھ بھال کا انتظام کرتا تھا۔ سلطان نے فیروزہ آباد، حصارِ فیروزہ، فتح آباد اور جونپور کے نئے شہر آباد کیے۔ دہلی کے گرد و نواح میں تیس پرانے باغات کی مرمت کرائی اور بارہ سو نئے باغات تعمیر کرائے۔ جن کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپیہ تھی۔ مشہور معاصر مؤرخ ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ سلطان نے پچاس ۵۰ مساجد، تیس ۳۰ دارالعلوم جن میں سے ہر ایک کے ساتھ مسجد تھی۔ بیس ۲۰ محل، ایک سو کارواں سرائیں، دو سو ۲۰۰ شہر، تیس ۳۰ حوض۔ ایک سو شفاخانے، پانچ مقبرے، ایک سو حمام، دس مینار، دس کنوئیں اور ایک سو پچاس پل تعمیر کرائے۔

رعایا پروری

سلطان فیروز شاہ ایک متقی و پرہیزگار بادشاہ تھا۔ اسے رعایا کی فلاح و بہبود کا بہت خیال تھا۔ اس نے غریب طبقہ کو گوناگوں مراعات دے کر انھیں خوشحال اور آسودہ زندگی بسر کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ 'دیوانِ خیرات' کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا جو غریب اور یتیم لڑکیوں کی شادی کے لیے مالی امداد مہیا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک اور رفاہی محکمہ 'دیوانِ استحقاق' کے نام سے قائم کیا۔ جو معذور اور نادار لوگوں کو بسر اوقات کے لیے وظائف (گزارہ الاؤنس) دیتا تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد غریب لوگ مع اپنے بال بچوں کے سلطان کو ملنے آتے۔ سلطان ان سے شفقت و ملاطفت سے پیش آتا۔ اور انھیں انعام و اکرام سے خوب نوازتا۔ اس کی جانب سے کوتوالِ شہر کو یہ خاص ہدایت تھی کہ

Marfat.com

وہ بیکار لوگوں کی فہرستیں تیار کرتا رہے۔ اور انھیں حکومت کے کسی نہ کسی شعبہ میں ملازمت دلا کر ان کی بیروزگاری کو ختم کرے۔ سلطان نے متعدد شفاخانے قائم کئے۔ ان میں مریضوں کے علاج کے لیے باقاعدہ قابل حکماء اطباء ملازم رکھے گئے۔ دہلی کا دارالشفا خاص طور پر مشہور تھا۔ جہاں سے غریب مریضوں کو مفت ادویات دی جاتی تھیں۔

علم پروری

علم وادب کی سرپرستی میں بھی سلطان بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اگرچہ خود اعلیٰ پائے کا ادیب نہ تھا۔ مگر علماء وادباء کا قدردان اور ترقی واشاعتِ علوم کے لیے عالموں، ادیبوں اور طالب علموں کو وظائف عطا کرتا تھا۔ اس نے اپنی سرپرستی میں کم وبیش پچاس مدرسے جاری کروائے۔ جن میں فیروزہ آباد کا مدرسہ بہت مشہور تھا۔ اس میں شاہی خاندان کے افراد تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان مدارس پر فراخدلی سے روپیہ صرف کیا جاتا تھا۔ سلطان کو علمِ تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا۔ اس نے اپنی سوانح حیات "فتوحات فیروز شاہی" تحریر کی۔ ضیاء الدین برنی اور شمس سراج عفیف جیسے مشہور مؤرخین نے اس کے سایۂ عاطفت میں علیحدہ علیحدہ "تاریخ فیروز شاہی" مرتب کی۔ علاوہ ازیں دیگر علوم بالخصوص دینیات اور فقہ کی بھی سرپرستی کی گئی اور ان پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔

مذہبی پالیسی

مذہبی امور میں سلطان فیروز شاہ شرعی قوانین کا پابند تھا۔ وہ علماء کا بڑا احترام کرتا تھا اور اہم معاملات میں ان سے باقاعدہ مشورہ لیتا تھا۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور مشائخ سے نہایت عزت واحترام سے پیش آتا تھا۔ ہر مہم پر وہ روانہ ہونے سے قبل وہ بزرگانِ دین کے مزاراتِ مقدسہ پر حاضر ہوتا تھا۔ اپنے عہد کے صوفی بزرگ شیخ مخدوم جہانیاںؒ سے اس کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ شیخ مخدوم کئی بار دہلی تشریف لائے اور شاہی مہمان ہوئے۔ مشائخ سے اس حسنِ سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء اور مشائخ امورِ حکومت میں بے جا طور پر مخل ہونے لگے۔

بعض غیر مسلم مؤرخین نے اسے متعصب اور تنگ نظر فرمانروا قرار دیا ہے۔ جو اس کے کردار پر سراسر بہتان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ شرعی قوانین پر سختی سے کاربند تھا۔ اس نے جزیہ ٹیکس کا نفاذ سختی سے کیا اور برہمنوں سے بھی جزیہ ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس پر برہمنوں نے احتجاج کیا۔ مگر سلطان نے کوئی پروا نہ کی۔ لیکن بسا اوقات اس نے غیر مسلموں کو جزیہ معاف بھی کر دیا۔ غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی تھی۔ لیکن عام گزرگاہوں پر بت پرستی ممنوع تھی۔ اگرچہ اس نے ہندوؤں کے بعض مندروں کو مسمار کرا دیا اور نئی مساجد تعمیر کرائیں مگر ہندوؤں کے لیے تعزیرات میں سنگین سزائیں منسوخ کر دیں۔ قرامطہ پر بہت سختیاں کیں۔ اور انکی کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا۔

آخری ایام اور وفات

سلطان فیروز شاہ تغلق کی زندگی کے آخری ایام حزن ویاس اور پریشانی میں بسر ہوئے۔ جولائی ۱۳۷۴ء میں ولیعہد شہزادہ فتح خاں کی وفات بوڑھے سلطان کے لیے شدید ذہنی وروحانی صدمہ کا باعث ہوئی، کیونکہ سلطان کو شہزادے سے بے پناہ محبت تھی۔

Marfat.com

اس نے اپنے دوسرے فرزند ظفر خاں کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ لیکن وہ بھی اس سے پہلے فانی سے کوچ کر گیا۔ اب سلطان نے اپنے تیسرے بیٹے محمد خاں کو اپنا ولیعہد مقرر کیا۔ لیکن شاہی اقتدار پر وزیر جُونا شاہ خاں جہاں چھایا ہوا تھا جو ۱۳۷۰ء میں اپنے باپ خاں جہاں مقبول کی وفات کے بعد وزارت کے اہم عہدے پر فائز ہوا تھا۔ وزیر نے یہ کہہ کر سلطان کے کان بھرے کہ شہزادہ محمد دوسرے امراء کے ساتھ مل کر سلطان کے خلاف سازش کر رہا ہے اور خود تخت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس پر سلطان نے جس کا دماغی توازن پیرانہ سالی کی وجہ سے بگڑ چکا تھا۔ وزیر کو شہزادہ محمد کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کا پروانہ عطا کر دیا۔ وزیر نے شہزادہ محمد کو گرفتار کر کے اپنے محل میں نظر بند کر دیا۔ لیکن شہزادہ عورتوں کا لباس پہن کر شاہی محل میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ جہاں اس نے سلطان کو وزیر کے غدار ہونے کا یقین دلا کر اسے سزا دینے کا اختیار حاصل کر لیا۔

شہزادے نے وزیر کو گرفتار کرنے کے لیے اس کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن وہ عقبی دروازے سے فرار ہو کر میرات پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ جسے بعد ازاں قتل کر دیا گیا۔ اب امورِ سلطنت شہزادے محمد کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ ۱۳۸۷ء میں سلطان نے اسے اپنا ولیعہد مقرر کیا۔ شہزادہ سیاہ و سپید کا مالک بن کر عیش و نشاط میں کھو گیا۔ جس سے تمام سلطنت کا نظم و نسق درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اس پر چند درباری امراء نے شہزادے کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ قریب تھا کہ شہزادے کے ہاتھوں انھیں شکست ہو جاتی۔ لیکن امراء سلطان کو ایک بھاری فوج کے ساتھ میدانِ جنگ میں لے آئے۔ شہزادہ شکست کھا کر میدان سے بھاگ نکلا اور سرمور کی پہاڑیوں میں جا چھپا۔ اب فیروز شاہ نے اپنے پوتے غیاث الدین تغلق شاہ بن فتح خان کو اپنا جانشین مقرر کر کے اسے شاہی خطاب سے نوازا۔ بوڑھے سلطان نے ۲۰ ستمبر ۱۳۸۸ء کو تقریباً اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

کردار اور شخصیت

سلطان فیروز شاہ تغلق کے کردار اور شخصیت کے بارے میں مورخین متضاد آراء رکھتے ہیں۔ ہمعصر مؤرخ ضیاء الدین برنی اور شمس سراج عفیف اس کی مدح سرائی کرتے ہوئے سلطان ناصر الدین محمود بن ایلتتمش کے بعد اسے ایک انصاف پرور، نیک دل اور مشفق حکمران قرار دیتے ہیں۔ سر ہنری ایلیٹ اور الفنسٹن کی رائے میں "وہ عہدِ سلاطین کا اکبر تھا۔" اسی طرح سر ولزلے ہیگ کی رائے میں "اکبر اعظم کے عہد سے قبل فیروز شاہ کا دورِ حکومت برصغیر میں اسلامی سلطنت کی سطوت و شوکت کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ سری داستوار قمطراز ہے کہ :-

"وہ اپنے قول و فعل میں دیانت دار تھا اور حقیقتاً عوام کی فلاح و بہبود کا خواہاں تھا۔ اس سے قبل سلطنتِ دہلی کے کسی سلطان نے بھی اپنی رعایا کی معاشی خوشحالی کے لیے اس قدر کام نہیں کیا تھا۔ اس کی معاشی حکمتِ عملی زراعت کی ترقی اور عوام کی خوشحالی و فارغ البالی کا باعث بنی۔ اس نے صنعت و حرفت کے فروغ کیلئے ہر وہ اقدام کیا جو اس دور میں ممکن تھا۔ نتیجۃً اشیائے ضرورت ارزاں ہو گئیں"[1]

---

[1] دی سلطنت آف دہلی :

Marfat.com

ڈاکٹر تریپاٹھی کی یہ رائے بجا ہے کہ ایک کامیاب حکمران کو لوگ مالی خوشحالی سے پرکھتے ہیں جس سے وہ ایک حد تک خود متاثر ہوتے ہیں۔ پس یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ فیروز شاہ ایک مثالی فرمانروا تھا۔ جس کے متعلق دورِ جدید اور ہمعصر مؤرخین نے اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔

سلطان فیروز شاہ نہایت نیک دل، نرم مزاج، رعایا پرور، انصاف پسند اور ایک مشفق حکمران تھا۔ اس نے ہر معاملے میں اپنے عوام کے آرام و آسائش اور خوشحالی کا خیال رکھا مگر اس کے کردار اور شخصیت کے چند کمزور پہلو بھی تھے۔ وہ نہایت کمزور طبع اور غیر مستقل مزاج واقع ہوا تھا۔ اس نے اپنی تمام فوجی مہمات میں بڑی کمزوری اور تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ بلبن اور علاؤ الدین خلجی نے بڑی کوششوں اور حکمتِ عملی سے امراء کے اقتدار کو کم کیا تھا مگر فیروز شاہ نے اپنے مشیروں کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بن کر انھیں پھر سر اٹھانے کا موقع دیا۔ بعض اوقات وہ اپنی طبعی کمزوری اور غیر مستقل مزاجی کے باعث عموماً بددیانت ملازموں سے باز پرس تک نہ کرتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں بدنظمی، بے قاعدگی اور رشوت ستانی عام ہو گئی۔

اس کی طبیعت پر مذہبی رنگ غالب تھا۔ اس کی حکومت کی حکمتِ عملی شرعی قوانین کے مطابق تھی۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ وہ اورنگ زیب عالمگیر کی طرح مذہب کو سیاست پر ترجیح دیتا تھا۔ اس نے اشاعتِ اسلام کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے اعلان کرا دیا کہ میری رعایا کا جو شخص بھی مشرف بہ اسلام ہوگا وہ جزیہ ٹیکس اور پول ٹیکس سے مستثنیٰ سمجھا جائے گا۔ نتیجۃً بے شمار ہندو حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ اس نے علماء و مشائخ کے احترام و تقدس کو دوبارہ بحال کیا۔ اور بعض اوقات اہم معاملات کے بارے میں ان سے مشورے بھی لیے۔ اس نے رائج الوقت کئی ایک غیر شرعی باتوں کو ممنوع قرار دیا۔ اس نے مزارات کی زیارت اور میلوں میں خواتین کے جانے پر پابندی عائد کر دی۔ وہ غرباء اور مساکین کی ہر طرح سے مدد کرتا۔ اور نہایت سادہ زندگی کا خوگر تھا۔ ہمیشہ مٹی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا۔

سلطان فیروز شاہ کو عوام کی فلاح و آسودگی کا بہت خیال تھا۔ اس نے تعلیم و تربیت کی ترقی کے لیے درسگاہیں، مساجد، متعدد شفاخانے اور سو سے زائد کارواں سرائیں تعمیر کرائیں۔ نیز زراعت کی ترقی کے لیے تیس تالاب بنوائے۔ وہ موسیقی کا بھی دلدادہ تھا۔ اس کے عہد میں موسیقی پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں غنیۃ امینہ اور فرید الزمان معرفۃ الالحان خاص طور پر مشہور ہیں۔

سلطنت کے نظم و نسق کی اصلاح کے لیے سلطان نے رعایا پروری، عدل و انصاف اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیا۔ اس نے تمام سلطنت میں امن و امان قائم رکھا۔ جس سے رعایا خوشحال ہو گئی۔ چنانچہ بقول ہمعصر مورخ سراج عفیف فیروز شاہ کے عہد میں ضروریاتِ زندگی کی بہت فراوانی تھی۔ مملکت کے ہر حصہ میں ہر چیز بکثرت پائی جاتی تھی۔ اس کے چالیس سالہ عہدِ حکومت میں لوگوں نے کسی چیز کی قلت محسوس نہ کی یہاں تک کہ لوگ علاؤ الدین خلجی کے عہد کو بھی بھول گئے۔

Marfat.com

فیروز شاہ کے جانشین

فیروز شاہ کی وفات کے ساتھ ہی سلطنت کا رعب و داب اور استحکام ختم ہو گیا۔ صوبے خود مختار ہو گئے۔ اور ہندو راجگان نے سلطنتِ دہلی کی سیادت سے منہ موڑتے ہوئے نہ صرف خراج دینا بند کر دیا بلکہ سازشوں اور بغاوتوں پر آمادہ ہو گئے۔ فیروز شاہ کے جانشینوں میں کوئی بھی اس لائق نہ تھا کہ انحطاط و انتشار کے اس ابھرتے ہوئے طوفان کو روک سکتا اور سلطنت کی قوت کو پارہ پارہ ہونے سے بچا سکتا۔ وہ با اثر امرا کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔ اور انتظامِ سلطنت سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کی نااہلی اور کمزوری کے باعث ہندوؤں نے نڈر اور شہ زور ہو کر مسلمان بستیوں کے امن و امان کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔

سلطان تغلق ثانی

۱۳۸۸ء تا ۱۳۸۹ء

سلطان فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد اس کا پوتا تغلق بن فتح خان غیاث الدین تغلق ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ وہ ایک ناتجربہ کار اور جذباتی قسم کا نوجوان تھا۔ اس لیے جلد ہی عیش و نشاط میں کھو گیا۔ اس نے اپنے چچازاد بھائی ابوبکر کو نظر بند کیا۔ تو چند سرکردہ امرا نے اس کے خلاف بغاوت برپا کر کے اسے قتل کروا دیا۔ اور فروری ۱۳۸۹ء میں ابوبکر کو تخت دہلی پر بٹھا دیا۔

ابوبکر شاہ تغلق

۱۳۸۹ء تا ۱۳۹۰ء

ابوبکر شاہ تغلق نے ابھی عنانِ حکومت سنبھالی ہی تھی کہ اس کے چچا محمد بن فیروز شاہ نے سرمور کی پہاڑیوں سے نکل کر حصولِ تخت کے لیے جدوجہد شروع کر دی اور سامانہ آ گیا۔ اس سلسلہ میں درپردہ دہلی کے چند موقع پرست امرا نے بھی اس کی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ وہ دہلی پہنچ گیا۔ شہر کے باہر دونوں کے مابین حصولِ تخت کی جنگ ہوئی۔ محمد بن فیروز شاہ شکست کھا کر دوآب بھاگ گیا۔ اور فوج کو از سرِ نو منظم کر کے دوبارہ حملہ آور ہوا۔ لیکن شکست سے ہمکنار ہوا۔ بعد ازاں ابوبکر شاہ کو اپنی کمزور پوزیشن کے پیشِ نظر اپنے حامی امیر بہادر ناہر کے پاس میوات جانا پڑا۔ اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اور چند امرا کی دعوت پر محمد بن فیروز شاہ پھر ایک بار دہلی پر حملہ آور ہوا۔ اور اگست ۱۳۹۰ء میں دہلی میں داخل ہو کر ناصر الدین محمد شاہ کے لقب سے تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔

ناصر الدین محمد شاہ

۱۳۹۰ء تا ۱۳۹۴ء

ناصر الدین محمد شاہ نے برسرِ اقتدار آتے ہی ابوبکر کے خلاف فوج کشی کی اور اسے شکست دینے کے بعد گرفتار کر کے قید کر دیا۔ لیکن اس کے حامی امیر بہادر ناہر کو معاف کر دیا۔ اس نے دہلی کے متعدد فیروز شاہی ملازموں اور غلاموں کو قتل کرا دیا۔ تاکہ اس کے خلاف فتنہ پردازی کے امکانات ختم ہو جائیں۔ دریں اثنا دوآب کے زمینداروں نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ ناصر الدین محمد شاہ ادھر متوجہ ہوا۔ لیکن ابھی ان کی پورے طور پر گوشمالی نہ کر پایا تھا کہ

Marfat.com

بہادر ناہر نے دہلی پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ اس کی سرکوبی کی گئی۔ سلطان حالات کی درستی میں مصروف تھا کہ ۲۰ جنوری ۱۳۹۴ء کو اسے قضا نے آلیا۔ اس کے بعد اس کا فرزند ہمایوں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ لیکن وہ بھی صرف پینتالیس روز حکومت کرنے کے بعد دنیا سے رحلت کر گیا۔ چنانچہ امرائے دربار نے سلطان محمد شاہ کے لڑکے محمود کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس نے ناصر الدین محمود کا لقب اختیار کیا۔

ناصر الدین محمود شاہ تغلق
۱۳۹۴ء تا ۱۳۹۸ء

دوآب کے مخدوش حالات کے تحت سلطان ناصر الدین محمود شاہ تغلق نے ملک سردار خواجہ جہاں کو ملک المشرق کے خطاب سے نواز کر دوآب اور مشرقی صوبوں میں امن و امان قائم کرنے پر مامور کیا۔ خواجہ جہاں نے جونپور کو اپنا صدر مقام بنایا اور قرب و جوار کے علاقوں کو مسخر کر کے شرقی سلطنت کی بنیاد ڈالی لیکن اسی اثنا میں گجرات اور خاندیش کے صوبے بھی سیادتِ دہلی سے آزاد ہو گئے۔ دریں اثنا دہلی کے چند امرا نے سلطان فیروز شاہ کے پوتے نصرت خان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح دہلی میں بیک وقت دو بادشاہ ہو گئے۔ ایک دہلی کے قدیم شہر میں اور دوسرا پایۂ تخت فیروز آباد میں مقیم تھا۔ دونوں امرا کے ہاتھوں شطرنج کے مُہرے بنے ہوئے تھے۔ اصل اقتدار چند امرا کے ہاتھوں میں تھا۔ جو اپنے ذاتی اقتدار کے لیے گروہ بندی اور سیاسی جوڑ توڑ میں لگے رہتے تھے۔ اسی اثنا میں ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے برصغیر پاک و ہند پر حملہ آور ہو کر اس باہمی کشمکش کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔ محمود تغلق نے ۱۴۲۲ء میں وفات پائی جس کے ساتھ ہی خاندانِ تغلق کا خاتمہ ہو گیا۔

امیر تیمور کا حملہ
۹۹-۱۳۹۸ء

امیر تیمور المعروف بہ تمرلنگ، چغتائی ترک تھا۔ اس کا باپ امیر ترغی برلاس ترکوں کے چغتائی قبیلہ کا سردار تھا۔ امیر تیمور ۱۳۳۶ء میں ماوراء النہر میں سمرقند کے نزدیک کیش کے مقام پر پیدا ہوا۔ ۱۳۶۹ء میں تینتیس ۳۳ سال کی عمر میں اپنے باپ کی وفات کے بعد امیر تیمور سمرقند کے تخت پر متمکن ہوا۔ یہیں سے اس کی فاتحانہ شہرت کا آغاز ہوا۔ وہ خداداد عسکری صلاحیت کا مالک دلیر اور نڈر سالار تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے قبیلے کو منظم کیا اور پھر ترکستان کے تمام قبائل کو اپنے پرچم تلے جمع کیا۔ چنانچہ اس نے جلد ہی ایران اور عراق کو فتح کرنے کے بعد ایشیائے کوچک میں عثمانی ترکوں کو شکستِ فاش دی۔ علاوہ ازیں اس نے افغانستان اور روس کے بعض حصوں کو بھی زیرنگیں کر لیا۔ ان فتوحات سے اس کے حوصلے بلند ہو گئے اور اس نے برصغیر پر بھی حملہ آور ہونے کا ارادہ کر لیا۔

برصغیر پر حملے کے اسباب

برصغیر پر امیر تیمور کے حملہ آور ہونے کے متعدد اسباب تھے۔ وہ مہمات اور فتوحات کا بہت دلدادہ تھا۔ ایران، عراق، ایشیائے کوچک، افغانستان اور روس کے بعض حصوں کی فتح و تسخیر نے اس کے عسکری حوصلوں کو بہت

Marfat.com

زیادہ بڑھادیا۔ علاوہ ازیں سلطنتِ دہلی کے سیاسی انتشار اور برّصغیر کی بے اندازہ دولت کی شہرت نے بھی اسے برّصغیر پاک و ہند کا رخ کرنے پر اکسایا۔ ملک گیری کی فطری خواہش کے ساتھ ساتھ اس کے حملے میں مذہبی جذبہ بھی کارفرما تھا۔ چنانچہ برّصغیر پر یلغار کرنے سے قبل اس نے امراء اور علماء کی ایک مجلسِ مشاورت طلب کی اور اس سے اس طرح خطاب کیا۔" برّصغیر پر فوج کشی کرنے سے میرا اصل مقصد یہ ہے کہ کافروں پر فوج کشی کر کے بُت پرستی کا خاتمہ کردوں۔ ہندوستان کے باشندے شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ آؤ ہم اس ملک کو شرک اور کفر کی آلودگی سے پاک کریں اور وہاں کے لوگوں کو مشرّف بہ اسلام کریں۔ نیز وہاں کے مندروں اور مورتیوں کو مسمار کر کے ہم خدا کی راہ میں غازی اور مجاہد بنیں۔" مجلس نے سلطان کے عزائم کی تائید کی۔

حملہ ۱۳۹۸ء

امیر تیمور نے برّصغیر کا رخ کرنے سے قبل ایک ہراول دستہ اپنے پوتے پیر محمد خاں کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ جس نے دریائے سندھ کو عبور کر کے ۱۳۹۸ء کے آغاز میں اُچ اور ملتان پر قبضہ کرلیا۔ اپریل ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور خود ایک بھاری لشکرِ جرّار کی جمعیت میں سمرقند سے روانہ ہوا۔ اور ستمبر ۱۳۹۸ء میں دریائے سندھ، جہلم، چناب اور راوی کو عبور کر کے لاہور تک آ پہنچا اور لاہور کے حاکم مبارک خاں کو شکست دی۔ جس نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ ازاں بعد امیر تیمور نے اکتوبر ۱۳۹۸ء میں ملتان سے پچھتر میل دور شمال مشرق میں واقع تلمبہ پر حملہ کیا۔ اور جسرت کھوکھر کو گرفتار کرلیا۔ لیکن دو لاکھ روپیہ بطور خراج وصول کر کے اسے رہا کردیا اور دہلی کی طرف روانہ ہوا۔

دیپالپور سے ہوتا ہوا تیمور پاک پتن پہنچا۔ جہاں اس نے حضرت شیخ بابا فریدِ گنج شکرؒ کے مزار مبارک پر فاتحہ خوانی کی۔ وہاں سے آگے بڑھ کر اس نے بھٹنیر کے مضبوط قلعہ پر قبضہ کیا۔ بعدازاں وہاں سے سرسوتی، فتح آباد، کیتھل اور پانی پت سے ہوتا ہوا اور ان علاقوں کو تاراج اور عوام کا قتلِ عام کرتا ہوا دسمبر ۱۳۹۸ء میں دہلی جا خیمہ زن ہوا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کے پاس ایک لاکھ ہندو قیدی جمع ہو گئے تھے۔ امیر تیمور نے دہلی پر دھاوا بولنے سے قبل احتیاط کے طور پر ان سب کو قتل کرا دیا۔ مبادا، دشمن سے جنگ کے دوران یہ لوگ نقصان پہنچائیں۔

امیر تیمور کی آمد پر سلطان ناصر الدین محمود تغلق اپنے وزیر ملّو اقبال کی جمعیت میں چالیس ہزار سپاہ، دس ہزار سوار، اور ایک سو بیس جنگی ہاتھیوں کے ساتھ تیمور سے جنگ کے لیے نکلا۔ مگر لشکرِ شاہی میں کوئی قابل سالار نہ تھا۔ چنانچہ ۱۷ دسمبر ۱۳۹۸ء کو جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو تیمور نے جلد ہی شاہی لشکر کو تتر بتر کر دیا۔ سلطان محمود جان بچا کر گجرات کی طرف بھاگ گیا۔ اور ملّو اقبال بلند شہر میں جا پناہ گزیں ہوا۔

۱۸ دسمبر ۱۳۹۸ء کو امیر تیمور فاتحانہ حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا اور دوسرے دن دربارِ عام منعقد کیا۔ جس میں شہر دہلی کے امراء اور علماء و مشائخ بھی حاضر ہوئے۔ سلطان نے ان کی درخواست پر ایک بھاری رقم بطورِ تاوانِ جنگ وصول کر کے خونریزی بند کردی۔ امیر تیمور کے لشکری شہر سے تاوان کی رقم جمع کرنے

Marfat.com

اور سامانِ رسد حاصل کرنے میں مصروف تھے کہ کسی غلط فہمی کی بنا پر اہل شہر سے ان کا تنازعہ ہو گیا۔ اور چند سپاہی مارے گئے۔ اس پر امیر تیمور نے غضبناک ہو کر قتل عام کا حکم دیدیا۔ چنانچہ دہلی میں پانچ روز تک تاخت و تاراج اور قتلِ عام کا سلسلہ جاری رہا۔ جس سے شہر ویران اور ہزاروں باشندے موت کے گھاٹ اتر گئے۔ لاتعداد عورتیں، مرد اور بچے گرفتار کر کے باندیاں اور غلام بنا لیے گئے۔

تیمور کی واپسی

امیر تیمور پندرہ دن تک دہلی میں قیام پذیر رہا۔ وہ برصغیر میں مستقل قیام اور حکومت کرنے کا خواہشمند نہ تھا۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۳۹۹ء کو وہ دہلی سے سمرقند کی جانب روانہ ہوا۔ ۱۹ جنوری ۱۳۹۹ء کو اس نے میرٹھ پر حملہ کیا۔ یہاں الیاس افغان اور مولانا احمد تھانیسری جیسی غیور شخصیتوں نے اپنی محدود جمعیت کے باوجود ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔ لیکن آخر مغلوب ہوئے۔ تیمور نے شہر کو تاخت و تاراج اور آبادی کو تہہ تیغ کر دیا۔ اس کے بعد وہ ہندوؤں کے مقدس مقام ہردوار پہنچا۔ ہندوؤں کو شکست دی اور ان کے مندروں کو مسمار کرا دیا۔

ہردوار سے امیر تیمور پہاڑی ریاست سرمور پر حملہ آور ہوا۔ اس نے رائے مہروز کو شکستِ فاش دے کر بے اندازہ مالِ غنیمت حاصل کیا۔ یہاں سے وہ شوالک کی پہاڑیوں میں ہندوؤں کی کمین گاہوں تک جا پہنچا ہندو بغیر لڑے فرار ہو گئے۔ تیمور بیشمار مالِ غنیمت جمع کر کے فروری ۱۳۹۹ء میں جموں پر حملہ آور ہوا۔ وہاں کے راجہ نے شکست کھائی۔ اور اطاعت قبول کر کے مشرف بہ اسلام ہوا۔ یہاں سے اس نے آگے بڑھ کر شیخا کھوکھر کے علاقے کو تاراج کیا اور اسے گرفتار کر لیا۔ کیونکہ اس نے تیموری افسروں کی حکم عدولی کی تھی۔ ۱۹ مارچ ۱۳۹۹ء میں امیر تیمور لاہور، ملتان اور دیپالپور کو سید خضر خاں کے سپرد کر کے کابل سے ہوتا ہوا سمرقند واپس چلا گیا۔

حملے کے اثرات

۱۔ تیمور طوفانی آندھی کی طرح برصغیر میں وارد ہوا اور بگولے کی مانند واپس لوٹ گیا۔ لیکن اس کے حملے کے اثرات بڑے دوررس ثابت ہوئے۔ امیر تیمور برصغیر پاک و ہند میں بہت تھوڑی مدت رہا۔ اور ملک کے بہت تھوڑے حصے کو فتح کر سکا۔ لیکن برصغیر کو جس قدر نقصان اس کے حملے سے ہوا۔ آج تک کسی حملے سے نہیں ہوا تھا اس کے حملے نے پنجاب اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ وہ اس علاقے کی تمام دولت سمیٹ کر لے گیا۔ ان علاقوں کے لاکھوں انسان یا تو مارے گئے یا قیدی بنا لیے گئے۔

۲۔ زوال پذیر سلطنتِ دہلی پر ایک کاری ضرب لگی۔ تغلق خاندان کا رہا سہا وقار و دبدبہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ کئی ایک صوبے آزاد و خود مختار ہو گئے۔ اس طرح دہلی کی مرکزی اہمیت و حیثیت ختم ہو گئی۔

۳۔ تیمور کے جانے کے فوراً بعد ملک ایک شدید قحط کی لپیٹ میں آ گیا۔ چنانچہ جو آبادی تیمور کی غارتگری سے بچ گئی تھی وہ قحط کی بھینٹ چڑھ گئی۔

Marfat.com

امتحانی سوالات

۱۔ خاندانِ تغلق کی اصلیت پر ایک مدلل مقالہ تحریر کیجئے۔

۲۔ سلطان غیاث الدین کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے اس کے کردار و سیرت پر روشنی ڈالیئے۔

۳۔ سلطان غیاث الدین تغلق کی فوجی مہمات اور زرعی و ملکی اصلاحات کو مدِ نظر رکھ کر اس کے کارناموں کا جائزہ لیجیے۔

۴۔ "محمد تغلق متضاد صفات کا مالک اور نظریاتی سلطان تھا۔" تبصرہ کیجئے۔ کیا آپ کے خیال میں اس کے خیالی منصوبے عقل و فراست پر مبنی تھے۔

۵۔ "محمد تغلق خاندانِ تغلق کے عظیم حکمرانوں میں سب سے ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ کیونکہ اس کے زیرِ اقتدار تغلق ایمپائر بامِ عروج پر پہنچی۔" (آغا مہدی حسین) پر تبصرہ کیجئے۔

۶۔ سلطان محمد تغلق کے عہد کی بغاوتوں کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے بغاوتوں کا حال بیان کیجئے۔

۷۔ علماء و صوفیاء کے بارے میں محمد تغلق کی حکمت عملی پر ایک مدلل مضمون تحریر کیجئے۔

۸۔ "سلطان محمد تغلق نہ نظریاتی تھا نہ بے عمل۔ اس کی تجاویز نہ غیر موزوں تھیں نہ انسانی طاقت سے ماورا وہ اپنے عہد سے بہت پہلے پیدا ہو گیا تھا۔" (آغا مہدی حسین) اس مقولے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے محمد تغلق کے کردار اور شخصیت کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

۹۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی فوجی مہمات کا جائزہ لیجئے۔

۱۰۔ سلطان فیروز شاہ نے انتظامِ سلطنت کے سلسلے میں جو اصلاحات نافذ کیں۔ ان کا مختصر جائزہ لیجئے۔

۱۱۔ فیروز شاہ کے کردار اور شخصیت کے عام پہلوؤں پر روشنی ڈالیئے۔

۱۲۔ برصغیر پاک و ہند پر امیر تیمور کے حملے کی وجوہات، واقعات اور اثرات واضح کیجئے۔

۱۳۔ فیروز شاہ کے جانشینوں کا مختصر حال بیان کیجئے۔

۱۴۔ خاندانِ تغلق اور سلطنتِ دہلی کے زوال کے اسباب مختصراً بیان کیجئے۔

۱۵۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیں۔

ا۔ ابن بطوطہ۔ ب۔ فیروز شاہ کے ابتدائی احکامات۔ ج۔ فیروز شاہ کی مذہبی پالیسی۔

Marfat.com

نواں باب

خاندانِ سادات

۱۴۱۴ء تا ۱۴۵۱ء

خاندانِ سادات سینتیس ۳۷ برس تک برسرِ اقتدار رہا۔ اس خاندان میں صرف چار بادشاہ ہوئے۔ سید فرمانروا سلطنتِ دہلی کی قدیم عظمت و حشمت کو بحال نہ کر سکے۔ اس خاندان کے مختصر دورِ اقتدار کی تاریخ اس مسلسل کشمکش کی کہانی ہے، جو ان بادشاہوں نے اپنے حریفوں کے خلاف سلطنتِ دہلی کے استحکام کے لئے جاری رکھی۔ دہلی اور مضافاتِ دہلی پر بھی اپنا تسلط قائم رکھنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ ہندوؤں کی بار بار کی بغاوتوں کو فرو کرنے کے علاوہ انہیں سالانہ واجبات وصول کرنے کے لئے بھی ہر سال میوات، دوآب اور کٹیہر کے علاقوں میں فوج کشی کرنی پڑتی تھی۔

سید خضر خاں

۱۴۱۴ء تا ۱۴۲۱ء

خاندان سادات کا بانی سید خضر خاں اس خاندان کا قابل ترین فرمانروا تھا۔ اس کے باپ کا نام ملک سلیمان تھا۔ اوائل عمر میں حاکم ملتان نصیر الملک مودود نے اس کو اپنا بیٹا بنا لیا اور بڑی شفقت و توجہ سے اُسے پالا پوسا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت میں نصیر الملک کی وفات کے بعد وہ ملتان کا گورنر مقرر ہوا۔ ۱۳۹۸ء میں اُس نے طوا قبال کے بھائی سارنگ خاں سے شکست کھا کر امیر تیمور کی معاونت اختیار کر لی۔ امیر تیمور نے دہلی سے واپسی پر پنجاب میں اُسے اپنا نائب مقرر کیا۔ ۱۴۱۴ء میں سلطان محمود شاہ تغلق کی وفات کے بعد اُس نے لاہور سے آگے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کر لیا اور خاندانِ سادات کی بنیاد رکھی۔

سید خضر خاں نہایت پارسا، حلیم اور شریف الطبع انسان تھا۔ دہلی کا سلطان بننے کے بعد بھی اُس نے شاہانہ القاب اختیار نہ کئے۔ بلکہ اپنے آپ کو امیر تیمور کا نائب ہی سمجھتا رہا، اور گاہے بگاہے امیر تیمور کو تحفے تحائف بھیجتا رہا۔ امیر تیمور کی وفات کے بعد بھی وہ خود کو اُس کے جانشین شاہ رخ کا نائب ظاہر کرتا رہا۔ اُس نے خطبہ شاہی اور سکہ کو بھی امیر تیمور اور اُسکی وفات کے بعد اُس کے جانشین شاہ رخ کے نام سے منسوب رکھا۔

خضر خاں کے سریر آرائے تخت ہونے کے وقت تمام ملک میں طوائف الملوکی اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ دور دراز کے صوبجات میں خود مختار اور آزاد ریاستیں قائم ہو رہی تھیں۔ چنانچہ اس کا سارا عہد بدنظمی اور خلفشار کے خلاف مسلسل جدوجہد میں گذرا۔ دہلی کے قرب و جوار اور دوآب کے علاقے میں بحالی امن کے لئے اُسے کئی مرتبہ فوجی کارروائی کرنی پڑی۔ اُس نے اُمراء کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ ملک الشرق ملک تحفہ کو تاج الملک کا خطاب دے کر اُسے اپنا وزیر مقرر کیا اور دوآب و راجپوتانہ کی بغاوتوں کو فرو کرنے پر مامور کیا۔

تاج الملک نے کٹیہر پر فوج کشی کر کے راجہ ہر سنگھ کو اطاعت گذار بنایا۔ نیز کھوڑ، گوالیار اور چندواڑ کے علاقوں کو مطیع و منقاد بنایا۔ مگر ان علاقوں میں بغاوتوں کا سلسلہ یکسر ختم نہ ہو سکا۔ بدامنی کا یہ عالم تھا کہ دہلی کے گرد و نواح میں بھی حکومت کو استحکام نصیب نہ ہو سکا اور اُسے سالانہ محاصل کی وصولی کے لئے بارہا فوج کشی کرنی پڑی۔

Marfat.com

سید خضر خاں بذاتِ خود ایک اچھا حکمران تھا۔ وہ نیک دل، باہمت اور مستعد دافع ہوا تھا۔ اگر وہ بہتر حالات میں برسرِ اقتدار آتا تو یقیناً ایک کامیاب فرمانروا ثابت ہوتا لیکن جب اُس نے عنانِ حکومت سنبھالی تو حالات اس قدر بگڑ چکے تھے اور تخریبی عناصر اس قدر زور پکڑ چکے تھے کہ اُن پر قابو پانا انتہائی مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے میرات اور گوالیار پر چڑھائی کی مگر دورانِ راہ بیمار ہو کر واپس دہلی چلا آیا۔ اُس نے ۲۰ مئی ۱۴۲۱ء کو وفات پائی

مبارک شاہ
۱۴۲۱ء تا ۱۴۳۴ء

سید خضر خاں کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا مبارک شاہ تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔ اپنے باپ کی مانند وہ بھی فہم و فراست کا مالک ایک بہادر سلطان تھا۔ مگر وراثت میں ملا ہوا تختِ شاہی اُس کے لئے پھولوں کی سیج کی بجائے کانٹوں کا بچھونا ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کا عہدِ حکومت بغاوتوں اور شورشوں کے انسداد میں ہی گذرا۔

۱۴۲۱ء میں جسرت کھوکھر نے سلطان خضر خاں کی وفات کے فوراً بعد بغاوت برپا کر دی۔ اُس نے لدھیانہ سے دریائے ستلج تک کا علاقہ تاخت و تاراج کر کے سرہند کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن شاہی افواج سے مقابلہ کی تاب نہ لا کر دریائے چناب کو عبور کر کے پہاڑی علاقہ میں جا پناہ گزین ہوا۔ بعد ازاں اُس نے پھر پہاڑوں سے نکل کر لاہور کا محاصرہ کر لیا لیکن حاکمِ لاہور نے اُسے شکست دے کر بھگا دیا۔

سلطنت کی ناگفتہ بہ حالت کے پیشِ نظر جونپور کے حاکم ابراہیم شرقی نے دہلی فتح کرنے کی ٹھانی، وہ خود فوج لے کر کالپی کی طرف بڑھا اور اپنے بھائی کو اٹاوہ کی جانب بھیجا۔ سلطان مبارک شاہ نے ملک محمود حسن کو ابراہیم شرقی کے مقابلے کے لئے بھیجا اور خود اُس کے عقب میں روانہ ہوا۔ دونوں فوجوں کے مابین کالی ندی اور چندواڑ کے مقامات پر شدید جنگ ہوئی جس میں ابراہیم شرقی کو شکست ہوئی اور وہ ناامید ہو کر واپس چلا گیا۔ اس لڑائی میں میرات کے سردار قدر دمیراتی نے ابراہیم شرقی کا ساتھ دیا۔ مبارک شاہ نے اپنے وزیر ملک سرور کو اُس کی گوشمالی کے لئے بھیجا، مگر وہ اس کے ہاتھ نہ آیا۔

۱۴۲۹ء میں فولاد نامی ایک ترک سردار نے بغاوت برپا کر کے بھٹنڈہ اور رائپری پر قبضہ کر لیا اور اپنی قوت کو بڑھانے کے لئے پنجاب کے کھوکھروں اور کابل کے نومسلم منگول حاکم امیر شیخ زادہ علی کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ شیخ زادہ علی نے لاہور سے ملتان تک کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ سلطان مبارک شاہ نے اس شورش کو کچلنے کے لئے عماد الملک کو بھیجا جس نے امیر شیخ زادہ علی کو شکست دے کر بھگا دیا اور پنجاب کو کابلیوں سے نجات دلائی۔ عماد الملک کی غیر معمولی کامیابی پر خود مبارک شاہ کو حسد پیدا ہوا۔ چنانچہ اُس نے پنجاب میں موجود شاہی افواج کی کمان عماد الملک سے لے کر خیر الدین خاں کے سپرد کر دی جو اس اہم منصب کے لئے بالکل موزوں نہ تھا۔ اس بدلی ہوئی صورتِ حال سے فائدہ اُٹھا کر جسرت کھوکھر نے آگے بڑھ کر لاہور کا محاصرہ کر لیا اور شیخ امیر زادہ علی نے ملتان پر حملہ کر دیا۔ سلطان نے اپنے وزیر سرور الملک کو ان کی گوشمالی پر مامور کیا جس نے دونوں حملہ آوروں کو پسپا ہونے پر

Marfat.com

مجبور کر دیا۔ فولاد ترک جو اس تمام عرصہ میں سرہند میں قلعہ بند تھا۔ وہ بھی نومبر ۱۴۳۲ء میں شکست کھا کر مارا گیا۔

سلطان مبارک شاہ کا دورِ حکومت علمی ترقی کے لئے خاص اہمیت کا حامل ہے "تاریخِ مبارک شاہی" اس دور کا اہم ترین کارنامہ ہے جسے یحییٰ بن احمد سرہندی نے سلطان مُبارک شاہ کے نام پر مرتب کیا۔ اور جس میں سلطان محمد غزنوی سے لے کر سُلطان مبارک شاہ کے دور تک کے تاریخی حالات بکمال احتیاط نہایت تفصیل کے ساتھ دیئے گئے ہیں یہ کتاب خاندانِ سادات کے دور کی تاریخ کا اہم ماخذ شمار ہوتی ہے

سیّد محمد شاہ
۱۴۳۴ء تا ۱۴۴۵ء

مبارک شاہ کے قتل کے بعد سید خضر خاں کا پوتا محمد جسے سلطان مبارک شاہ نے نامزد کیا تھا۔ محمد شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا لیکن اصل اقتدار وزیر سلطنت سرور الملک کے ہاتھوں میں رہا جس نے خان جہان کا لقب اختیار کر کے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو نوازا اور انہیں جاگیریں عطا کیں۔ اُن میں بہت سے افراد سُلطان مرحوم کے قاتلوں میں سے تھے۔ قاتلوں اور سازشیوں کے اس گروہ کے اقتدار سے قدیم اُمراء سخت نالاں تھے۔ چنانچہ کمال الدین نے مرحوم سلطان کا بدلہ لینے کے لئے اس گروہ کے خلاف وفادار اُمراء کی ایک جماعت منظم کی۔ محمد شاہ بھی خُفیہ طور پر اِن اُمراء کا ہمدرد تھا۔ اس کشمکش میں سرور الملک اور اُس کے ساتھی مارے گئے اور مسندِ وزارت پر کمال الدین فائز ہوا۔ جس نے نظامِ حکومت کی اصلاح کرنے کی کوشش کی مگر بیرونی حملوں اور داخلی بغاوتوں نے اُسے چین نہ لینے دیا۔ ابراہیم شرقی نے سلطنت کے مشرقی اضلاع پر قبضہ کر لیا۔

میواتی اُمراء کی دعوت پر مالوہ کا حکمران، محمود خلجی یلغار کرتا ہوا دہلی تک آ گیا مگر اس اثنا میں گ کے فرمانروا احمد شاہ نے مالوہ کے دارالسلطنت مانڈو پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے محمود خلجی کو واپس لوٹنا پڑا۔ علاوہ ازیں لاہور اور سرہند کے حاکم بہلول لودھی نے دہلی پہنچ کر سُلطان کے حکم پر کچھ دور تک محمود خلجی کا تعاقب کیا۔ محمد شاہ نے اُسکی اس بروقت خدمت سے خوش ہو کر اُسے خان خاناں کا خطاب عطا کیا۔ نیز پیار سے اُسے اپنا بیٹا کہا۔ [1]

بعد ازاں بہلول لودھی نے جسرت کھوکھر کے ایما پر تختِ دہلی پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ اُس نے ایک بھاری افغان فوج منظم کر کے دہلی پر چڑھائی کر دی۔ اگرچہ اُسے دارالسلطنت پر قبضہ کرنے میں ناکامی ہوئی لیکن اس اقدام سے خاندانِ سادات کا زوال ناگزیر ہو گیا اور ہر طرف اُس کی تضحیک ہونے لگی دہلی کے گرد و نواح کے جاگیرداروں نے بھی اطاعتِ شاہی ترک کر دی اور خود مختار ہو گئے اُدھر بہلول لودھی حصولِ اقتدار کے لئے کوئی فیصلہ کُن اقدام کرنے کے لئے مناسب موقع کی تاک میں تھا۔ ان حالات میں ۱۴۴۵ء میں سید محمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے پیشروؤں سے بھی زیادہ کمزور حکمران ثابت ہوا۔

علاؤالدین عالم شاہ
۱۴۴۵ء تا ۱۴۵۱ء

سلطان محمد شاہ کی وفات کے بعد اُمرائے دربار نے اُس کے لڑکے کو علاؤالدین عالم شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔ نیا سُلطان اپنے باپ سے

[1] سری واستوا "دی سلطنت آف دہلی" صفحہ ۲۳۱

Marfat.com

بھی زیادہ نااہل پسند اور نااہل ثابت ہوا۔ اُسے امورِ سلطنت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ سیاسی مسائل کو سمجھنے کی بھی فہم و استعداد نہ رکھتا تھا نتیجۃً اُس کے دَور میں سلطنتِ دہلی انتہائی زوال کو پہنچ گئی اور سلطان کی عملداری صرف دارالحکومت دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی جیسا کہ مشہور ہے۔ "بادشاہے شاہ عالم' از دہلی تا پالم"

اس سے بہلول لودھی کے دماغ میں تختِ دہلی حاصل کرنے کا سودا اور قوی ہو گیا۔ ۱۴۴۶ء میں سلطان علاؤالدین عالم شاہ بدایوں گیا اور اس شہر سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اُمرا نے اُس کے اس ارادے کی سخت مخالفت کی مگر اس نے ایک نہ مانی۔ دریں اثنا اُس نے بعض تخریب پسند اُمرا کے کہنے پر اپنے وزیر حمید خاں کے قتل کے احکام جاری کر دیئے۔ مگر وہ کسی طرح بھاگ کر دہلی آ گیا۔ اور بہلول لودھی کو تختِ دہلی پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ بہلول نے دہلی پہنچ کر تخت پر قبضہ کر لیا مگر چند روز کے قیام کے بعد زمامِ اقتدار اپنے چند اُمرا کے سپرد کر کے دیپالپور چلا گیا جہاں سے اُس نے سلطان علاؤالدین عالم شاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میں اب بھی اپنے کو سلطان کا وفادار ملازم سمجھتا ہوں اور تختِ دہلی پر آپ کا حق سمجھتا ہوں۔ علاؤالدین عالم شاہ نے جواب بھیجا کہ میں بدایوں کے پرگنہ پر قانع ہوں۔ سلطنت دہلی تمہارے لئے چھوڑتا ہوں۔ چنانچہ اپریل ۱۴۵۱ء میں بہلول لودھی نے دہلی پہنچ کر اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ علاؤالدین عالم شاہ ایک مدت تک بدایوں میں گمنامی کی زندگی گذار کر ۱۴۷۸ء میں وفات پا گیا۔ اس طرح دہلی میں خاندانِ سادات کا آفتاب اقتدار غروب ہو گیا اور خاندان لودھی منصبِ اقتدار پر متمکن ہوا۔

Marfat.com

اہم تاریخیں

۱۴۱۴ء — خضر خان کا تختِ دہلی پر قابض ہونا۔ خاندانِ سادات کا آغاز

۱۴۲۱ء — خضر خاں کی وفات، سید مبارک شاہ کا سریر آرائے سلطنت ہونا۔

جسرت کھوکھر کی بغاوت۔

۱۴۲۳ء — جسرت کھوکھر کا دوبارہ بغاوت برپا کرنا۔ شیخ امیر زادہ علی والیٔ کابل کا ملتان کو تاخت و تاراج کرنا۔

۱۴۳۴ء — سلطان مبارک شاہ کا قتل اور محمد شاہ کا تختِ دہلی پر متمکن ہونا۔

۱۴۴۵ء — محمد شاہ کی وفات اور علاؤ الدین عالم شاہ کا سریر آرائے تخت ہونا

۱۴۵۱ء — بہلول لودھی کا تختِ دہلی پر متمکن ہونا اور عالم شاہ کا تخت سے دستبردار ہونا۔

امتحانی سوالات

۱۔ خاندانِ سادات کے عروج و زوال کی داستان قلمبند کیجئے۔

۲۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیے

ا:۔ خضر خاں　　ب:۔ مبارک شاہ　　ج:۔ محمد شاہ

د:۔ علاؤ الدین عالم شاہ　　ر:۔ تاریخِ مبارک شاہی

Marfat.com

دسواں باب

خاندانِ لودھی

(۱۴۵۱ء سے ۱۵۲۶ء)

قدیم وقت سے افغان سلسلۂ کوہ سلیمان سے وادیٔ سندھ کے میدانوں میں روزگار اور تجارت کی تلاش میں آتے رہے ہیں۔ بہلول کا جدِ امجد بہرام فیروز شاہ تغلق کے عہد کے آغاز میں ملتان آیا۔ جہاں اُس نے ملک مردان دُرّانی کی ملازمت اختیار کر لی۔ بہرام کے بیٹے اسلام خاں لودھی نے خضر خاں گورنرِ ملتان کی ملازمت کے دوران بہادری کے کارنامے دکھا کر اپنے کو ممتاز حیثیت کا مالک بنایا۔ جس کے بدلے میں اُسے سرہند کا گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ اقدام لودھیوں کے عروج کے لئے سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔"[1]

(ایم کبیر)

بہلول لودھی
۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۹ء

پہلی افغان سلطنتِ دہلی کا بانی بہلول لودھی افغانستان کے مشہور پٹھان قبیلہ لودھی کی ایک شاخ ساہر خیل سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کا دادا ملک بہرام، سلطان فیروز شاہ کے دورِ حکومت میں ملتان آیا اور ملک مردان دُرّانی گورنرِ ملتان کی ملازمت میں داخل ہوا۔ اُس کے پانچ بیٹے تھے۔ ملک سلطان شاہ، ملک کالا، ملک فیروز، ملک محمد اور ملک خواجہ جن میں ملک سلطان شاہ اور ملک کالا نے اپنے بہادرانہ کارناموں کی وجہ سے نمایاں شہرت حاصل کر لی۔ بہلول، ملک کالا کا بیٹا تھا۔ اُس نے جرأت کھوکھر کے زور کو ختم کر کے ایک خود مختار سردار کی حیثیت حاصل کی۔ ۱۴۱۹ء میں بہلول کے چچا سلطان شاہ کو اسلام خان کے لقب سے سرہند کا گورنر مقرر کیا گیا جس نے پنجاب کے تمام افغانوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر کے اُنہیں اہم عہدوں پر فائز کیا۔ مرنے سے قبل اُس نے اپنے بیٹے قطب خاں کی موجودگی میں بہلول کو اپنا جانشین مقرر کیا جو اپنے چچا کی وفات کے بعد سرہند کا گورنر بنا۔ سادات خاندان کی کمزوری کی وجہ سے بہلول تقریباً خود مختار تھا۔ اُس نے گرد و نواح کے علاقوں کو اپنے زیرِ تسلط لا کر اپنی پوزیشن کو کافی مستحکم بنا لیا تھا۔ جب حاکمِ مالوہ محمود خلجی نے دہلی پر حملہ کیا تو بہلول نے بروقت دہلی پہنچ کر حملہ آور فوج کو مار بھگایا۔ بلکہ کچھ دُور تک اُس کا تعاقب بھی کیا۔ اس پر سلطان محمد شاہ نے نہ صرف اُسے خان خاناں کے خطاب سے

---

[1] "شارٹ ہسٹری آف پاکستان" جلد دوم (مسلم رول انڈر دی سلاطین) صفحہ ۹۸۔

Marfat.com

نوازا بلکہ لاہور سے لے کر دیپالپور تک کا علاقہ بھی عطا کیا۔ اس سے تمام پنجاب میں اُس کا طوطی بولنے لگا۔ ازاں بعد اُس نے سلطان کا لقب اختیار کر کے دہلی پر یلغار کر دی مگر کامیابی سے ہمکنار نہ ہوا۔ تاہم جب خاندانِ سادات کے آخری تاجدار علاؤالدین عالم شاہ کے وزیر حمید خاں نے اُسے دہلی آنے کی دعوت دی تو اُس نے موقعہ کو غنیمت جان کر ۱۴۵۱ء میں دہلی پہنچ کر دارالسلطنت پر قبضہ کر لیا۔

تخت نشینی
۱۹ اپریل ۱۴۵۱ء

دہلی میں ابھی تک اصل اقتدار وزیر حمید خاں کے قبضہ اختیار میں تھا۔ بہلول نے محسوس کیا کہ وزیر کی موجودگی میں اُس کا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا چنانچہ اُس نے ہر روز وزیر حمید خاں کو ملنے اُس کے مکان پر جانا شروع کر دیا جہاں ایک روز اُس کے چچازاد بھائی قطب خاں نے نہایت چالاکی سے وزیر حمید خاں کو گرفتار کر لیا۔ جب وزیر حمید خاں نے اس کی وجہ دریافت کی، تو قطب خاں نے جواب دیا کہ افغانوں کو تم پر کوئی اعتماد نہیں ہے۔ کیونکہ تم اپنے پہلے آقا علاؤالدین عالم شاہ سے غداری کر چکے ہو۔ حمید خاں کو مقید کرنے کے بعد بہلول نے سلطان علاؤالدین عالم شاہ کو بدایوں سے واپس دہلی آنے کی دعوت دی۔ لیکن سلطان نے جواب میں لکھ بھیجا "اُسے بادشاہت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نیز اُس کے باپ نے بہلول کو اپنا بیٹا کہا تھا۔ اس لئے وہ بھی بہلول کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہے اور بخوشی اُسکے حق میں تخت سے دست بردار ہوتا ہے۔"[1] اس پر ۱۹ اپریل ۱۴۵۱ء کو بہلول نے اپنی تاجپوشی کی رسم ادا کی اور اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کیا۔

داخلہ پالیسی

بہلول لودھی صاحبِ فہم و فراست اور مدبر سلطان تھا اُسے اپنی اس پوزیشن کا پورا احساس تھا کہ اُس کی تمام تر قوت کا دارومدار افغانوں پر ہے۔ بدیں وجہ اُس نے انہیں ہر طرح سے مطمئن رکھنے کی پالیسی اختیار کی۔ وہ خود کو صرف اُمرا کا سردار تصور کرتا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے اُمرا سے ہمیشہ اخلاق اور مروّت سے پیش آتا تھا اور ان سے برابری کا سلوک کرتا تھا۔ چنانچہ سرکاری اور نجی تقریبات کے موقعہ پر وہ کبھی تخت پر نہ بیٹھتا، بلکہ عام لوگوں کے ساتھ ایک ہی قالین پر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ اُمرا اور عام سپاہیوں سے آزادانہ طور پر ملتا تھا اور اُن میں گھل مل جاتا تھا۔ اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم کرنے کے لئے نہ صرف اُس نے فیاضانہ انعام و اکرام سے نواز کر اپنی افواج کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کی بلکہ اپنے وطنِ مالوف کوہِ سلیمان کے لودھی پٹھانوں کو برِصغیر میں بُلا کر اُنہیں جاگیریں اور زمینیں عطا کیں، نیز اُنہیں ممتاز فوجی عہدوں پر فائز کیا۔

سلطنت میں داخلی امن و امان کی بحالی کے لئے بہلول سرکش اور باغی اُمرا اور گورنروں کی گوشمالی ضروری سمجھتا تھا اس لئے اُس نے اس سلسلے میں سخت اور جارحانہ پالیسی اختیار کی اور سرکش اور باغی حاکموں کو سیادت قبول کرنے کی ترغیب دلانے کی غرض سے نواحی اضلاع کے خلاف مسلسل فوجی کارروائیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ جلد ہی اُس نے حاکم

---

[1] سر ولزلے ہیگ "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" جلد سوم صفحہ ۲۲۸-۲۲۷

Marfat.com

میرات احمد خاں میراتی، دریا خاں بودھی حاکم سنبھل، کوئل (موجودہ علی گڑھ) کے حاکم عیسیٰ خان، گورنر سیکت مبارک خاں مین پوری کے راجہ پرتاپ سنگھ اور حسین خاں افغان کے بیٹے قطب خاں حاکم ریواڑی کے خلاف فوج کشی کی۔ اور انہیں حکومت دہلی کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کردیا۔ ملتان و سرہند میں بغاوت و سرکشی کے آثار پیدا ہوئے لیکن بہلول نے جلد ہی اُن پر قابو پالیا۔ اس طرح وہ اپنی سخت پالیسی کے ذریعے حکومتِ دہلی کے وقار کو بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

خارجہ پالیسی

بہلول بودھی کی خارجہ پالیسی کا سب سے بڑا نصب العین یہ تھا کہ ایسے علاقوں کو تسخیر کرکے سلطنت دہلی میں شامل کیا جائے جو کسی وقت بھی سلطنتِ دہلی کا ایک حصّہ متصوّر ہوتے تھے۔ چنانچہ بہلول نے چیتوڑ کے رانا کو بزورِ شمشیر اطاعت گذار بنانے اور دوآب کے علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد جونپور کی شرقی سلطنت کو زیرِ نگین کرنے کی ٹھانی۔ کیونکہ شرقی حکمران خاندانِ سادات کے زمانے سے ہی سلطنتِ دہلی پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

شرقی سلطنت (جونپور) سے جنگ

سید علاؤالدین شاہ عالم کے متعدد اُمرا بودھی حکومت کے قیام کے خلاف تھے اُنہوں نے سلطان محمود شرقی والیِ جونپور کو دہلی پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ شرقی سلطان کی ملکہ سید علاؤالدین کی لڑکی تھی اُس نے بھی اُسے انتقاماً دہلی پر حملہ کرنے کے لئے اُکسایا۔ چنانچہ ۱۴۵۲ء میں سلطان محمود شرقی نے دہلی کا محاصرہ کرلیا۔ دریا خاں بودھی حاکم سنبھل شرقی افواج کی کمان کر رہا تھا۔ بہلول کے چچازاد بھائی قطب خاں بودھی نے اُسے غیرت دلائی کہ افغان ہرگز افغانوں کے خلاف اُن کے دشمنوں کی مدد کرتے ہوا اس پر وہ میدانِ جنگ سے واپس چلا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شرقی سلطان محمود کے حوصلے پست ہوگئے اور وہ پسپائی پر مجبور ہو گیا۔ تاہم تھوڑے عرصے کے بعد شرقی سلطان محمود شاہ نے دوبارہ حملہ کردیا۔ لیکن قطب خاں نے مصالحت کرادی اور لڑائی ایک بار پھر ٹل گئی۔ دریں اثنا محمود شاہ کا انتقال ہو گیا اور اُمرا نے اُسکی جگہ شہزادہ بھیکھن خاں کو محمد شاہ کے لقب سے تخت پہ بٹھادیا لیکن وہ جلد ہی اپنی بربریت اور خونریزی کے باعث اُمرا میں غیر مقبول ہو گیا، اور اُنہوں نے اُسے معزول کرکے حسین کو سلطان حسین شاہ کے لقب سے تخت نشین کردیا۔ سلطان حسین شاہ نے بہلول سے چارناچار کے لئے صلح کرلی لیکن بہلول مغربی صوبوں کی طرف روانہ ہوا تو سلطان حسین نے حملہ کردیا۔ بہلول نے واپس پلٹ کر اُس کا تعاقب کیا۔ سات روز تک لڑائی جاری رہی آخر اُمرا کی کوشش سے دونوں کے مابین تین سال کے لئے صلح ہو گئی۔ ۱۴۷۸ء میں جب بدایوں میں سلطنت دہلی کے سابق سلطان علاؤالدین عالم شاہ نے وفات پائی تو سلطان حسین نے تعزیت کے بہانے پہنچ کر بدایوں پر قبضہ کرلیا لیکن معمولی جنگ کے بعد قطب خاں کی وساطت سے فریقین میں دوبارہ صلح ہو گئی۔ سلطان حسین شاہ نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے پھر حملہ کردیا۔ لیکن بُری طرح شکست کھاکر واپس لوٹ گیا۔ اب بہلول نے ایک بھاری فوج کے ساتھ حملہ آور ہو کر جونپور پر قبضہ کرلیا۔ سلطان حسین شاہ نے جونپور واپس لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ بہلول نے اپنے لڑکے بایزید کو جونپور کا حاکم مقرر کیا۔ جونپور کی فتح سے بہلول کے

Marfat.com

وقار میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ چنانچہ کالپی، دھولپور اور ریواڑی کے حاکموں نے خود ہی سلطنتِ دہلی کی سیادت قبول کرلی جولائی ۱۴۸۸ء میں جلالی کے نزدیک سلطان بہلول کا انتقال ہوگیا۔

تبصرہ بہلول لودھی بہادر سپاہی اور ایک کامیاب جرنیل تھا۔ اگرچہ وہ سلطنتِ دہلی کے دورِ انحطاط میں برسرِ اقتدار آیا مگر اُسے اپنی ذمہ داریوں اور حالاتِ وقت کے تقاضوں کا خوب علم تھا۔ چنانچہ وہ سلطنت کے حالات اور وقار کی بحالی کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بطریقِ احسن بروئے کار لایا۔ اُس نے ۲۸ سال تک حکومت کی اور زوال پذیر سلطنت میں نئے سرے سے جان ڈالی، اور شمالی برِصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو دوبارہ قائم کیا اُس کی تمام عمر جنگوں میں گذری۔ اگرچہ وہ انتظامی اصلاحات نافذ کرکے مضبوط حکومت قائم نہ کرسکا لیکن اس کے باوجود بحیثیت سپہ سالار اور منتظم وہ اپنے پیشرو سلاطین (فیروز تغلق کے عہد سے عالم شاہ تک کے سلاطین) سے اور اپنے جانشین بلند تر مقام کا حامل تھا۔

وہ معمارِ ملت تھا۔ اُس نے برِصغیر میں پہلی افغان حکومت قائم کرکے افغان اقتدار کو مستحکم کرنے کی پوری کوشش کی۔ افغان اُسے اپنا قائد سمجھتے تھے ذاتی طور پر وہ بہت سی خوبیوں کا مالک اور غرور و تکبر سے مبرا، فراخدل، نیک طبع اور نہایت سادہ دل واقع ہوا تھا۔ ایک بار جونپور کے خلاف جنگ کے دوران شرقی سلطان کی ملکہ اُس کے ہاتھوں گرفتار ہوگئی مگر اُس نے نہایت عزت و احترام اور حفاظت کے ساتھ اُسے جونپور بھجوادیا۔

اگرچہ خود زیادہ تعلیم سے بہرہ ور نہ تھا، مگر علماء کا بہت قدردان تھا۔ اور عدل و انصاف کا دلدادہ تھا۔ رعایا کی عرضداشتیں خود سنتا اور اُن کی دادرسی کرتا تھا۔ اگر کوئی امیر بیمار ہوجاتا تو اُسکی عیادت کے لئے خود اُس کے گھر چلا جاتا تھا۔ اسی طرح اگر کوئی امیر کسی وجہ سے اُس سے ناراض ہوجاتا تو وہ خود اُس کے گھر جاکر راضی کرلیتا تھا۔ لیکن اگر اس کے باوجود وہ امیر راضی نہ ہوتا تو بہلول اپنی تلوار کمر سے کھول کر اُس کے آگے رکھ دیتا اور معافی کا خواستگار ہوتا تھا۔ بعض اوقات وہ پگڑی اُتار کر اُس کے پاؤں پر رکھنے سے بھی دریغ نہ کرتا تھا۔

پٹھانوں میں بہت سی قبیح رسمیں رائج تھیں۔ بہلول نے انہیں یکسر ختم کردیا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر پٹھان اس قسم کی مضرانہ رسوم کے پابند رہے تو وہ افلاس و احتیاج کے شکار ہوجائیں گے۔ اُس نے پاک و ہند میں بالخصوص پنجاب اور بہار میں پٹھانوں کی بے شمار بستیاں اور شہر آباد کئے جس میں سلطان پور لودھیاں خاص طور پر مشہور ہے۔ اسی طرح بستی پٹھاناں بھی قابلِ ذکر ہے۔

سکندر لودھی
۱۴۸۸ء تا ۱۵۱۷ء

سلطان بہلول لودھی کی وفات کے بعد اُمرا نے اُس کے تیسرے لڑکے نظام خاں کو تخت نشین کیا۔ بعض اُمرا نے اس بنا پر اُس کے انتخاب کی پُرزور مخالفت کی کہ وہ شہزادی کے بطن سے ہے اور سلہنوں نے اُن کے بڑے بھائی بارمک حاکم جونپور کا نام تجویز کیا۔ لیکن خانخاناں اور دیگر اُمرا کی حمایت پر نظام خاں کو بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔ اُس نے ۱۷ جولائی ۱۴۸۸ء کو بڑی شان و شوکت سے اپنی تاجپوشی کی رسم ادا کی اور اُمرا کو انعام و اکرام اور خلعت فاخرہ سے نوازا۔

سکندر لودھی کے کارنامے

بغاوتوں کا انسداد

سکندر لودھی کو تخت نشین ہونے کے فوراً بعد کئی ایک بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اُس

Marfat.com

باغیوں کی سختی سے گوشمالی کی اُس نے سب سے پہلے اپنے بھائی عالم خاں عالم رایہ ے خلاف فوج کشی کی جس نے کنت کا دعویٰ کر کے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ عالم خاں نے بھاگ کر علیسی خاں لودھی حاکم ٹیلیالی کے پاس پناہ لی۔ لیکن سکندر نے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مصالحت کر کے اُسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ بعد ازاں اُس نے علیسی خاں کے خلاف تادیبی کارروائی کی اور اُسے ایسا زچ کیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

جونپور میں باربک شاہ نے خود مختاری اختیار کر رکھی تھی۔ سلطان سکندر لودھی نے اسماعیل خاں لوہانی کی مساعلت سے باربک شاہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ اس پر سکندر نے جونپور حملہ کر دیا باربک کا سپہ سالار کالا پہاڑ شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ لیکن سلطان کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر باربک کے خلاف لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ باربک کو شکست ہوئی۔ اور وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا۔ سکندر نے فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے جونپور کی حاکمیت پر اُسے بحال رکھا، اور اُس کی راہنمائی کے لئے چند افغان اُمرا کو اُس کا مشیر مقرر کیا۔ لیکن باربک بالکل نااہل ثابت ہوا۔ سلطان کے جانے کے بعد جونپور کے نواحی علاقوں کے زمینداروں نے سرکش ہو کر اس زور سے شورش برپا کی کہ باربک حالات پر قابو نہ پا سکا اور جونپور کو چھوڑ کر دریا آباد میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ اس پر سلطان سکندر لودھی نے خود فوج کشی کر کے باغی زمینداروں کی گوشمالی کرنی پڑی۔ سلطان نے باربک کو دوبارہ جونپور کی حاکمیت پر بحال کر دیا لیکن وہ ایک اچھا منتظم ثابت نہ ہوا۔ اسلئے سلطان نے اُسے معزول کر کے قید میں ڈال دیا اور جونپور پر اپنا گورنر مقرر کیا۔

سلطان حسین شاہ شرقی والیِ بہار نے باغی زمینداروں کی پشت پناہی کر کے جونپور کی بدنظمی سے فائدہ اُٹھانا چاہا؛ اس پر سلطان نے اُسے بنارس کے نزدیک فیصلہ کن شکست دی اور وہ بنگال بھاگ گیا۔ شاہی افواج نے آگے بڑھ کر بہار پر قبضہ کر لیا۔ سلطان سکندر نے بہار کی حکومت پر دریا خاں لوہانی اور ترہٹ پر اپنے بیٹے اعظم ہمایوں کو حاکم مقرر کیا۔ اب سلطان بنگال کی طرف بڑھا۔ لیکن والیِ بنگال سلطان علاؤالدین نے اُس سے صلح کر لی اور طے یہ پایا کہ سلطان علاؤالدین سلطنتِ دہلی کے باغیوں کو اپنے ہاں پناہ نہ دیگا اور دونوں فریق ایک دوسرے کی سرحدوں کا احترام کریں گے۔

فتوحات

سلطان سکندر لودھی گوالیار اور دھولپور کی تسخیر کا متمنی تھا۔ ۱۵۰۲ء میں اُس نے دھولپور کے راجہ ونائک دیو کے خلاف فوج کشی کی۔ راجہ نے بھاگ کر گوالیار میں پناہ لی۔ سلطان نے دھولپور پر قبضہ کر لیا۔ اور بعد میں گوالیار پر دھاوا بول دیا۔ راجہ مان سنگھ والیِ گوالیار شکست سے دوچار ہو کر اطاعت گذار ہوا۔ علاوہ ازیں سلطان نے کالپی، بیانہ کے علاقوں کو بھی فتح کیا اور وہاں کے زمینداروں کو اطاعت گذار بنایا۔ مالوہ کے بعض علاقوں کو فتح کر کے سلطنتِ دہلی میں شامل کر لیا۔ سلطان نے چندیری کو بھی زیرنگیں کیا۔

اصلاحات

اگرچہ سکندر لودھی بھی بہلول لودھی کی طرح فوجی مہمات میں ہی مصروف رہا لیکن اُس نے اپنے اس نے انتظامِ سلطنت کی اصلاح کی طرف خاص توجہ مبذول کی اور تمام اطراف سلطنت میں نظم و نسق قائم کر کے امن و امان بحال کیا۔ سوبائی گورنروں پر براہ راست اپنا تسلط قائم کیا۔ باغیوں اور راہزنوں کا سختی سے محاسبہ کیا، ذرائع آمد و رفت درست اور محفوظ کیا، محکمہ پولیس کو از سرِ نو منظم کیا اور شاہراہوں پر

Marfat.com

جا بجا ڈاک چوکیاں قائم کیں۔ تجارت اور زراعت کی ترقی کے لئے غلّہ کی نقل و حمل پر محصول چونگی معاف کر دیا۔ باغی اُمرا کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے باقاعدہ جاسوسی نظام کو منظم کیا اور قابلِ اعتماد جاسوسوں اور وقائع نویسوں کو اُمرا کے گھروں کے علاوہ چیدہ چیدہ جگہوں پر متعیّن کیا۔ وہ جاسوس سُلطان کو ہر وقت حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ خبر پہنچانے میں سُلطان کے جاسوس اسقدر مستعد تھے کہ یہ عام روایت تھی کہ سُلطان نے جنّات رکھے ہُوئے ہیں جو اُسے تمام حالات سے آگاہ رکھتے ہیں۔

اُمرا پر سختی

جونپور کو زیر نگیں کرنے اور اپنی قوّت کو مستحکم بنانے کے بعد سُلطان سکندر لودھی نے اپنے لودھی اُمرا کو اطاعت گذار اور شاہی نظم و ضبط کا تابع فرمان بنانے کی طرف توجہ مبذول کی۔ اُس نے اپنے گورنروں اور افسروں کے حسابات کی سختی سے جانچ پڑتال کرنے کا حکم دیا۔ سُلطان نے مبارک لودھی کو جونپور کا مالیہ وصول کرنے پر مامور کیا تھا۔ لیکن اُس نے بہت سا زرِ مالیہ خورد بُرد کر لیا تھا۔ حسابات کی جانچ پڑتال سے پتہ چلا کہ بہت روپیہ اُس کے ذمّے واجب الادا ہے۔ اس پر سُلطان نے حُکم دیا کہ اُس سے یہ روپیہ جبراً وصول کیا جائے۔ دُوسرے اُمرا کے حسابات کی بھی اسی طرح جانچ پڑتال کی گئی۔

جون پور میں چوگان بازی کے سلسلے میں بعض امرا میں جھگڑا ہو گیا، اور دھینگا مُشتی تک نوبت آئی، سُلطان کو یہ حرکت ناگوار گذری۔ چنانچہ اُس نے ایک افغان امیر کو جو اس جھگڑے کا ذمّہ دار تھا اپنے سامنے بڑے ذلت آمیز طریقے سے پٹوایا اور اس سخت حکمتِ عملی اختیار کرتے ہُوئے اپنے امرا کو مجبور کیا کہ وہ دربار میں بادشاہت کے وقار و احترام کا خیال رکھیں۔ افغان اُمرا کو جو بہلول لودھی کے برادرانہ اور مشفقانہ سلوک کے عادی تھے یہ سختی گراں گذری چنانچہ بائیس اُمرا نے سازش کر کے سکندر کو تخت سے معزول کر کے اُس کے بھائی فتح خاں کو تخت پر بٹھانا چاہا لیکن خود فتح خاں نے ہی سُلطان کو بروقت اس سازش سے مطلع کر دیا سُلطان نے اُن اُمرا کو دہلی سے باہر بھجوا دیا۔

سُلطان کی اس سخت گیر پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام افغان اُمرا شاہی نظم و ضبط اور تنظیم کے دائرے میں آ گئے۔ اس سے نہ صرف بادشاہ کی عزّت و توقیر ملحوظ رہی، بلکہ شاہی دبدبہ اور وقار اسقدر بلند ہُوا کہ جب بھی کوئی شاہی فرمان جاری ہوتا تو متعلقہ حکام اس سے مطلع اور آگاہ ہونے کیلئے فوراً ساٹھ ساٹھ میل آگے آ کر تقریبِ اعلان میں مؤدبانہ کھڑے ہو جاتے۔ جہاں وہ فرمان اُونچی آواز سے پڑھا جاتا اور وہ بڑے غور سے سُنتے۔

آگرہ کی تعمیر

۱۵۰۴ء میں سُلطان سکندر لودھی نے شہر آگرہ کی تعمیر شروع کی اور اسے اپنا دارالسلطنت بنایا یہاں آگرہ میں شاہی عمارات اور فوجی چھاؤنی تعمیر کی گئی تاکہ مشرقی و مغربی راجپوتانہ کے علاقوں پر بہتر طور پر نگرانی ہو سکے۔ لیکن اگلے ہی سال ۶ جولائی ۱۵۰۵ء کو ایک زبردست زلزلہ آیا جس نے آگرہ کے نو آباد شہر اور محلّات تباہ و برباد کر دیا۔ تاہم سُلطان نے اُس کی از سرِ نو تعمیر کی اور وہیں سکونت اختیار کی۔

مذہبی پالیسی

سُلطان سکندر شاہ لودھی راسخ العقیدہ سُنّی مُسلمان تھا۔ وہ عہد شباب [illegible] سادہ و پاکیزہ زندگی کا خوگر اور شعائرِ اسلامی کا پابند تھا۔ اور علماء و مشائخ کا بڑا قدردان تھا [illegible] صرف خود

Marfat.com

شریعت کے اصولوں کا پابند تھا بلکہ اُس نے معاشرہ کو ہر قسم کی بدعتوں اور غیر شرعی رسوم و روایات سے پاک کرنے کی بھی کوشش کی۔ اُس نے مزاروں پر عورتوں کا جانا یکسر ممنوع قرار دے دیا سکندر لودھی کے ان مذہبی اوصاف کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ اُس پر دوسرے مذاہب کے بارے میں متعصب اور تنگ دل ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں سے اُس کا سلوک غیر روادارانہ تھا اور انہیں مکمل مذہبی آزادی حاصل نہ تھی۔

ہندو مورخین پروفیسر الیشوری پرشاد اور اے ایل سری واستوا "تاریخِ داؤدی" کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ کہ تھانیسر کے متبرک تالاب اور دریائے جمنا کے گھاٹ پر ہندوؤں کو اشنان کرنے کی اجازت نہ تھی اُس نے بادشاہ بننے کے بعد مندروں کو منہدم کرانے اور اُن کی جگہ مساجد تعمیر کرنے کی پالیسی اپنائی۔ اُس نے نگرکوٹ (کانگڑہ) کے جوالا مکھی مندر کے بت کو پاش پاش کر کے قصابوں میں تقسیم کر دیا تاکہ وہ اُس کے ٹکڑوں کو گوشت وزن کرنے کے لئے بطور اوزان استعمال کریں اُس نے متھرا، منڈریل، اُجاگیر، نارواڑ، چندیری کے علاوہ کئی دیگر شہروں کے مندروں کو مسمار کروا دیا۔ اور بڈھن[1] نامی ایک ہندو کو اُس نے محض اس لئے ہلاک کروا دیا کہ اُس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اسلام کی مانند ہندو مت بھی ایک سچا مذہب ہے اُس نے حجاموں کو ہندوؤں کی حجامت بنانے سے منع کر دیا تھا۔ سلطان فیروز شاہ کی طرح اُس نے ہندوؤں کو حلقہ بگوشِ اسلام ہونے پر مجبور کیا چنانچہ اُس کی اس پالیسی کی وجہ سے رعایا کا ایک بڑا طبقہ اُس سے متنفر ہو گیا[2]

وفات سلطان سکندر شاہ کے دورِ حکومت کے آخری چند سال گوالیار، دھولپور، نارواڑ اور راجستھان کی سرحد کے دوسرے سرداروں کی گوشمالی میں گذرے ان مہمات میں سلطان کی صحت خراب ہو گئی اور وہ بیانہ سے واپسی پر بیمار پڑ گیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد وہ ۳۱ نومبر ۱۵۱۷ء کو وفات پا گیا۔

تبصرہ سکندر شاہ خاندانِ لودھی کا ایک عظیم المرتبت بادشاہ تھا۔ مورخین اسکی تعریف کرتے ہوئے اسکو فہم و استعداد کا حامل، عدل گستر، مشفق اور خدا ترس حکمران قرار دیتے ہیں۔ وہ ایک بہادر اور دلیر سپاہی تھا۔ جس نے تقریباً ایک صدی کے انتشار و خلفشار کے بعد پنجاب سے لے کر بہار اور کوہ ہمالیہ سے مالوہ تک کے علاقوں کو سلطنتِ دہلی کے زیرِ نگیں کیا فیروز خلجی کے بعد وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے شمالی برِصغیر پاک و ہند کے بیشتر حصّے کو سلطنتِ دہلی کے زیرِ عنان کر کے سلطنت کے وقار کو بحال کیا۔ امورِ مملکت کی اصلاح کر کے سارے ملک میں نظم و نسق اور امن و امان بحال کیا اور سرکش افغان اُمراء کو حکومت کے احتساب کا پابند بنایا۔ اور اُنہیں حکم دیا کہ شاہی فرامین کا استقبال کریں اور انہیں پڑھ کر سنانے کے لئے باقاعدہ ایک دربار منعقد کیا کریں اُس نے تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد حکام کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل کرنے کا طریقہ بھی نافذ کیا۔ تاکہ وہ صوبوں اور پرگنوں کو ذاتی ملکیت نہ سمجھنے لگیں۔ اُس نے خفیہ اطلاعات کا محکمہ ایسے اہتمام سے قائم کیا کہ اُسے رعایا اور فوج کے تمام حالات فوراً معلوم ہو جاتے۔ لوگوں کو اس کی باخبری پر حیرت ہوتی

---

[1] ایلیٹ اور ڈاؤسن نے اس کا نام بودھن لکھا ہے۔ (جلد چہارم۔ صفحہ ۴۶۴)

[2] "میڈیول ہسٹری آف انڈیا" صفحہ ۱۵۰ اور "دی سلطنت آف دہلی" صفحہ ۲۴۲-۲۴۱

Marfat.com

تھی اور اس کے متعلق یہ بات عام مشہور تھی کہ جنات اُس کے تابع ہیں اور وہی اُس کو سارے ملک کے حالات سے بروقت آگاہ کر دیتے ہیں۔

اُسے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ہر روز غرباء میں کھانا تقسیم کرواتا۔ جاڑے کے موسم میں کمبل تقسیم کئے جاتے۔ نیز بہت سے مستحق زمیندار لوگوں کے وظائف مقرر تھے۔ وہ خدا ترس اور انصاف پسند تھا۔ دولتمند کو غریب پر اور طاقتور کو کمزور پر ظلم و استبداد کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا اور نہ کسی کو عدل و انصاف کے تقاضوں سے انحراف کی اجازت دیتا تھا۔ اُس کے زمانے میں اشیائے ضرورت بہت ارزاں تھیں رعایا بہت آسودہ حال تھی اُس نے غلّہ کی نقل و حمل پر محصول چونگی منسوخ کر دیا۔ تاکہ غلّہ مزید ارزاں ہو جائے۔

سکندر لودھی پاکیزہ سیرت اور خدا ترس سُلطان تھا اُس کے دربار میں نازیبا، نامشروع باتوں اور رسموں کی قطعی اجازت نہ تھی۔ وہ اسقدر مستعد اور فرض شناس واقع ہوا تھا کہ اکثر رات گئے تک امورِ سلطنت کی انجام دہی میں مصروف رہتا تھا۔ اکثر نیم شب کو کھانا کھاتا اور بعد ازاں علماء اور مشائخ سے مذہبی معاملات پر تبادلۂ افکار کرتا۔ وہ سیر و شکار اور سفر و حضر میں بھی علماء و مشائخ کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اُس کی گفتگو میں ہمیشہ سلیقہ اور توازن ہوتا تھا۔ اُس کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ جس چیز کو ایک بار دیکھ لیتا اُسے کبھی نہ بھولتا تھا۔ تواریخ اُس کی ذہانت اور شخصیت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ بلا شُبہ وہ فیروز تغلق کے بعد سلطنتِ دہلی کا ایک عظیم فرمانروا تھا۔ سکندر لودھی موسیقی کا بھی دلدادہ تھا۔ اس کے عہد میں اس فن پر کتابیں لکھی گئیں لہجاتِ سکندر شاہی خاص طور پر مشہور ہے، وہ شاعر بھی تھا، جمالی کا شاگرد تھا اور گلرخی تخلص کرتا تھا۔

سُلطان ابراہیم لودھی
۱۵۱۷ء تا ۱۵۲۶ء

ابراہیم لودھی سلطان سکندر لودھی کا بڑا لڑکا تھا جو اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا خاندان لودھی کا یہ آخری تابدار تھا بعض اُمرائے دربار نے اپنی ذاتی اغراض کی بنا پر یہ چاہا کہ سلطنت کو دونوں بھائیوں میں بانٹ دیا جائے دہلی میں ابراہیم بادشاہ ہو اور جونپور میں شہزادہ جلال خاں برسرِ اقتدار رہے لیکن خان جہان لودھی جو مرحوم سلطان کے مقتدر اُمرا میں سے تھا، جب اپنی جاگیر سے نئے بادشاہ کی بیعت کے لئے دارالسلطنت آیا تو اُس نے اس تجویز پر سخت اعتراض کیا۔ اُس نے افغان سلطنت کی وحدت کو برقرار رکھنے پر زور دیتے ہوئے اُمرا کو بہت لعن طعن کی۔ چنانچہ شہزادہ جلال کو دہلی آنے کو کہا گیا۔ بلکہ چند مقتدر اُمرا کو بھی اُس کے پاس بھیجا گیا لیکن اُسے اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ اب سُلطان ابراہیم نے مشرقی صوبوں کے تمام اُمرا اور زمینداروں کو احکام بھیجے کہ وہ شہزادہ کی حمایت نہ کریں اور نہ اُسکی اطاعت کریں۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا جونپور کے سارے اُمرا جلال خاں کے مخالف ہو گئے اس پر وہ مجبوراً جونپور چھوڑ کر اپنی جاگیر کالپی میں چلا گیا۔

کالپی پہنچ کر شہزادہ نے سلطان جلال الدین کا لقب اختیار کر کے اپنے نام کا خطبہ اور سکّہ جاری کر دیا نیز اپنی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا اور قرب و جوار کے راجاؤں اور زمینداروں کو اپنا اطاعت گذار بنا لیا۔ شہزادہ جلال نے اعظم ہمایوں سرانی کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی طاقت کو مزید مستحکم بنایا اور جونپور کی تسخیر کی ٹھانی۔ ان حالات کے تحت

Marfat.com

سلطان ابراہیم نے اپنے سب بھائیوں کو قلعہ ہانسی میں مقید کیا اور ایک بھاری فوج لے کر قنوج پہنچا۔ اس پر اعظم ہمایوں نے شہزادہ جلال کا ساتھ چھوڑ کر ابراہیم سے مفاہمت کر لی۔ سلطان نے فوج بھیج کر کالپی پر قبضہ کر لیا۔ دریں اثنا جلال خاں نے آگرہ فتح کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا اور گوالیار کے راجہ کے ہاں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ جب شاہی افواج اُس کے تعاقب میں گوالیار پہنچیں تو وہ بھاگ کر مالوہ چلا گیا اور وہاں سے کٹڑہ کے علاقے میں آیا مگر گونڈ کے زمینداروں نے اُسے پکڑ کر سلطان ابراہیم کے حضور پیش کر دیا۔ جس نے اُسے قتل کرا دیا۔

اُمرا سے کشمکش

سلطان ابراہیم اُمرا کو پوری طرح مطیع و منقاد بنانے کا متمنی تھا۔ مگر وہ اپنے باپ کی سی ہوشیاری اور موقع شناسی سے بالکل عاری تھا۔ وہ فطرتاً شکی مزاج، ضدی اور تُند خُو واقع ہوا تھا۔ وہ اُمرا سے بڑی سخت گیری اور درشت روی سے پیش آتا تھا۔ اس سے اُمرا میں بددلی اور بغاوت پھیل گئی۔ سلطان نے اعظم ہمایوں سروانی اور اُس کے لڑکے فتح خاں جیسے با اثر اُمرا کو گوالیار کی مہم سے واپس بلا کر محض غلط فہمی کی بنا پر قید میں ڈال دیا اس کارروائی سے دُوسرے اُمرا بددل اور ہراساں ہو گئے۔ اعظم ہمایوں کے دُوسرے لڑکے اسلام خاں نے کٹڑہ میں علمِ بغاوت بلند کر دیا اور اپنے باپ کی فوج کی معیت میں کٹڑہ کے نئے گورنر احمد خاں کو شکست دی۔ اسی اثنا میں اعظم ہمایوں اور سعید خاں لودھی آگرہ سے فرار ہو کر لکھنؤ پہنچ گئے اور سلطان کے خلاف شورش اور فساد برپا کرنے میں مصروف ہو گئے اس سے قنوج اور جونپور وغیرہ کے علاقوں میں عام بغاوت پھیل گئی۔ سلطان نے کئی اُمرا کی زیرِ قیادت ایک زبردست فوج اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے بھیجی۔ لیکن قنوج کے نواح میں باغی اُمرا کی ایک چھوٹی سی فوج نے شاہی فوج کو شکست دیکر منتشر کر دیا۔ سلطان کے کمک بھیجنے کے باوجود شاہی فوج کو کئی بار ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ اگرچہ باغی مغلوب ہو گئے مگر بغاوت کُلّی طور پر ختم نہ ہوئی بلکہ کئی وفادار اُمرا بھی باغیوں سے مل گئے۔ دریا خاں لوہانی کے بیٹے بہادر خاں لوہانی نے بہار میں خود مختاری اختیار کر لی۔ اُس نے سلطان محمد لوہانی کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا۔ تمام باغی اُمرا جن میں نصیر خاں لوہانی جیسے مقتدر اُمرا بھی شامل تھے، سلطان ابراہیم سے دل برداشتہ ہو کر سلطان محمد لوہانی سے مل گئے۔ شاہی فوج اُس کا مقابلہ نہ کر سکی۔ چنانچہ سنبھل تک کا علاقہ سلطنتِ دہلی سے منقطع ہو گیا۔

مشرقی صوبوں کی بغاوت اور اُمرا کے ساتھ چھوڑ دینے کے باوجود ابراہیم کی تُند مزاجی میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ اُس نے پنجاب کے حاکم دولت خاں لودھی کو لاہور سے دہلی طلب کیا۔ چونکہ وہ سلطان سے خوفزدہ تھا اس لئے اُس نے اپنے لڑکے دلاور خاں کو دربارِ دہلی میں بھیجا۔ سلطان اُس سے نہایت درشتی سے پیش آیا چنانچہ وہ بھاگ کر پنجاب میں اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا اور اُسے بتایا کہ اگر سلطان بہار میں بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ لاہور ہم سے چھین لے گا۔ اسی طرح دولت خان سے بھی ابراہیم کے تعلقات بگڑ گئے اور دولت خاں لودھی نے ہراساں ہو کر کابل کے بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر کو برِ صغیر پاک و ہند پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔

سلطنتِ دہلی کا خاتمہ
۱۵۲۶ء

ظہیر الدین بابر نے جو پہلے ہی برِ صغیر پاک و ہند کو تسخیر کرنے کا مصمم ارادہ کئے ہوئے تھا، دولت خاں لودھی حاکم لاہور کی دعوت کو غنیمت سمجھا اور دولت خاں کا

Marfat.com

خیال تھا کہ بابر ایک طوفان کی طرح دہلی کی سلطنت پر حملہ آور ہوگا اور ابراہیم کو شکست دیکر لوٹ مار کرنے کے بعد بگولے کی طرح واپس چلا جائے گا اور بعد میں وہ بڑی آسانی سے تمام پنجاب پر قابض ہو جائے گا۔ لیکن نتیجہ بالکل اس کے برعکس نکلا۔ اسی دوران تختِ دہلی کے ایک دوسرے دعویدار عالم خاں لودھی حاکم دیپالپور نے بھی بابر سے مل کر فوجی امداد کی درخواست کی۔ جس کے نتیجہ میں اکیس اپریل ۱۵۲۶ء کو مشہور تاریخی جنگ پانی پت کی پہلی لڑائی معرضِ وجود میں آئی جس میں سلطان ابراہیم شکست کھا کر مارا گیا اور جس کے ساتھ ہی خاندانِ لودھی کے اقتدار کا آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ بابر نے آگے بڑھ کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہوئے مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

اہم تاریخیں

۱۴۵۹ء	شہر جودھپور کی تعمیر۔
۱۴۶۹ء	بابا گورو نانک کی پیدائش۔
۱۴۸۸ء	سلطان بہلول لودھی کی وفات اور سکندر لودھی کی تخت نشینی۔
۱۴۹۷-۹۸ء	مشہور جہازران واسکوڈے گاما کا پہلا سفرِ ہند۔
۱۵۰۹ء	البوقرق کا ہندوستان میں پرتگیزی مقبوضات کا گورنر مقرر ہو کر آنا۔
۱۵۱۷ء	سکندر لودھی کی وفات اور ابراہیم لودھی کا تختِ دہلی پر متمکن ہونا۔
۱۵۲۶ء	پانی پت کی پہلی لڑائی۔

امتحانی سوالات

۱۔ لودھی خاندان کے عروج و زوال کا حال بیان کیجئے۔

۲۔ بہلول لودھی کی داخلہ و خارجہ پالیسی بیان کرتے ہوئے اُس کے کردار پر روشنی ڈالیئے۔

۳۔ سلطان سکندر لودھی کے کارنامے مختصر طور پر بیان کیجئے اور بتایئے کہ سلطنتِ دہلی کو مستحکم بنانے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا۔

۴۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیئے:

ا:۔ سکندر لودھی کی مذہبی پالیسی۔ ب:۔ ابراہیم لودھی ج:۔ دولت خاں لودھی

Marfat.com

گیارہواں باب

سلطنتِ دہلی کا نظامِ حکومت

طلوعِ اسلام سے قبل شاہانِ عالم کا نظامِ حکومت سیاستِ عقلیہ پر چلتا تھا جس میں عقلی طور پر عام انسانوں کی مصلحتوں کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ مگر اسلام کی بدولت معاشرتیات میں جمہوری نظام کی بنیاد پڑی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے جمہوری نظامِ حکومت کی بنا ڈالی جو شریعتِ اسلامیہ کے زرّیں اصولوں پر مبنی تھا اور جس میں مسلمانوں کو مجلسِ شوریٰ کی مدد سے اپنے مسائل حل کرنے اور اختلافات رفع کرنے کی تاکید فرمائی گئی تھی۔ اس نظام کی رُو سے عالمِ اسلام میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے نائب تھے۔

خلیفہ رسولؐ کا نائب یعنی ملّتِ اسلامیہ اور دولتِ اسلامیہ کا رئیس و امیر تھا۔ اور سلطان خلیفہ کا نائب متصور ہوتا تھا۔ نویں صدی عیسوی کے وسط تک اسلامی نظامِ حکومت کی قانونی اور حقیقی صورتِ حال یہی رہی لیکن اس کے بعد یہ صورتِ حال تغیّر پذیر ہونے لگی۔ خلافت کے مرکزِ اقتدار میں ضعف واقع ہونے کے سبب بلادِ اسلامیہ کے متعدد صوبجات میں جو مرکزِ خلافت سے دُور تھے، مختلف خاندانوں کے زیرِ سرکردگی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ خلیفہ کی سیاسی اور فوجی حکومت بالکل ختم ہو گئی لیکن اس کے باوجود خلافت کی شرعی حیثیت اور نظریاتی تقدس بحال رہا۔ اور مسلمان اُسے اپنا حقیقی حکمران تسلیم کرتے رہے۔ دُور دراز کے ممالک کے حکمران اور سلاطین، خلیفۃ المسلمین سے اپنی سلطانی کی تسلیم و قبولیت کا پروانہ حاصل کرتے رہے کیونکہ منشورِ خلافت کے بغیر اُن کی بادشاہت غیر آئینی سمجھی جاتی تھی۔ اس طرح تمام اسلامی ممالک گویا خلیفۃ المسلمین کی رُحانی و آئینی سیادت کے مؤید اور نمائندہ تھے۔

جب سلطنتِ دہلی معرضِ وجود میں آئی تو سب سے پہلے سلطان شمس الدین ایلتتمش نے باقاعدہ عباسی خلیفہ المستنصر باللہ سے منشورِ حکمرانی حاصل کیا۔ برِّ صغیر پاک و ہند میں اسلامی حکومت کی تاریخ کا یہ ایک اہم واقعہ ہے۔ اس منشور کی بنا پر سلطنت نے آئینی و جمہوری حیثیت حاصل کر لی، اور اسے غور اور غزنہ کی آئینی بیعت (سیادت) سے آزادی مل گئی۔ ایلتتمش کے جانشین بھی خلیفہ کی آئینی برتری تسلیم کرتے رہے جس کا اظہار اُن کے سکوں میں ہوتا رہا۔

۱۲۵۸ء میں ہلاکو خاں نے عباسی خلافتِ بغداد کا تختہ اُلٹ دیا، اور خلیفہ معتصم باللہ کو بڑی بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ اس سے سلاطینِ دہلی کے لئے ایک آئینی مشکل پیدا ہوئی تاہم وہ اپنے سکوں پر معتصم باللہ کا نام بدستور کندہ کرتے رہے حتیٰ کہ فیروز شاہ خلجی کے عہد تک سلطنتِ دہلی کے سکوں پر معتصم باللہ کا نام کندہ ہوتا رہا۔ حالانکہ خلیفہ کی وفات کو ایک عرصہ گذر چکا تھا لیکن علاؤ الدین خلجی نے خطبہ اور سکوں سے خلیفہ معتصم کا نام ہٹا دیا۔ اور اُسکی جگہ اپنا اختیار کردہ لقب 'ناصر امیر المومنین' اور 'یمین الخلافت' کندہ کروایا۔ مبارک خلجی سلطنتِ دہلی کا پہلا سلطان تھا جس نے خود خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ مگر اُس کے جانشینوں نے اُس کی تقلید نہ کی۔

جب محمد تغلق سلطنتِ دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اُسے یہ بتایا گیا کہ منشورِ خلافت حاصل کئے بغیر اُس کی حکومت

Marfat.com

غیر شرعی ہے چنانچہ اس نے مصر میں خلیفہ وقت المستکفی باللہ کے پاس اپنا سفیر بھیجا۔ اور پروانۂ حکمرانی منگوایا۔ نیز شاہ تغلق نے بھی خلیفہ سے باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کیا۔ خاندانِ سادات کے سلاطین اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ نائب امیر المومنین کے الفاظ استعمال کرتے رہے۔ یہی طریقہ لودھی سلاطین نے بھی اپنایا۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ عباسی خلیفہ سے سلاطینِ دہلی کی وابستگی مذہبی ارادت و روایت کی بنا پر تھی۔

سُلطان

سلطنت دہلی کا سربراہ سلطان کہلاتا تھا جسے سب سے اعلیٰ اور ارفع حیثیت حاصل تھی۔ اگرچہ اصولی اور نظریاتی اعتبار سے سُلطان، خلیفہ کا نائب تھا، اور شریعت کے قوانین کا پابند، جن میں وہ ردّ و بدل کرنے کا قطعی مجاز نہ تھا، لیکن عملی طور پر خود مختار اور وسیع اختیارات کا حامل تھا۔ وہ انتظامیہ اور عدلیہ کا مختارِ مطلق تھا اور افواج کا افسرِ اعلیٰ (سپہ سالار) بھی ہوتا تھا۔ سلطنت کے تمام اعلیٰ عہدیداروں کا تعین وہ خود کرتا تھا جو نہ صرف اُس کے سامنے جوابدہ تھے بلکہ اُس کے اشارۂ ابرو کے پابند بھی تھے۔ وہ وزیروں اور مشیروں کے مشوروں کا پابند نہ تھا۔ عملاً وہ شاہی خزانے کا مالک تھا اور اُسے اپنی مرضی کے مطابق اپنی ذاتی ضروریات اور آسائشوں پر اور مُلکی ضروریات پر خرچ کر سکتا تھا۔ وہ سلطنت کے جملہ اختیارات کا سرچشمہ تھا۔ لیکن ان وسیع اختیارات کا مؤثر استعمال بہت کچھ سلطان کی مرضی اور قوتِ ارادی پر منحصر تھا۔ بلبن یا علاؤالدین خلجی جیسا قوی الارادہ سلطان ساری سلطنت کو اپنی مُٹھی میں لے سکتا تھا۔ اس کے برعکس معزالدین بہرام اور ناصرالدین محمود کو ہر معاملہ میں اپنے اُمرا اور رؤسا کی رائے کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ علاؤالدین خلجی جیسے طاقتور سُلطان نے بھی علما اور صُوفیا کو مخالفت کا موقع نہ دیا۔ سلطنتِ دہلی اُمرا کے تعاون سے معرضِ وجود میں آتی تھی اسلئے شریعت کے علاوہ سُلطان کو اُن کی خوشنودی کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ کیونکہ اُن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو سُلطان بننے کا اہل سمجھتا تھا۔ عدل و انصاف کے معاملات میں سُلطان کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا تھا تاہم آئینی اور انتظامی اقدامات کرتے وقت سُلطان کو شرعی قوانین کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔

بدقسمتی سے سلطنتِ دہلی میں تاج و تخت کے لئے کوئی قانونِ وراثت نہ تھا۔ منصبِ سُلطانی کے لئے عام طور پر انتخاب کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ ہر سُلطان کے انتقال کے بعد حصولِ تخت کیلئے کشت و خون ہوتا تھا اور طاقت کی توازن ہی وارثِ تخت و تاج کا تعین کرتی تھی۔ چنانچہ "جو سلاطین تختِ سلطنت پر متمکن ہوتے وہ محض وراثت کی وجہ سے حکمرانی کے حقدار نہ سمجھے جاتے تھے۔ بلاشبہ حکمرانی بعض خاندانوں میں محدود ہوتی تھی لیکن اوّل یہ ضروری نہ تھا کہ باپ کی جگہ ضرور ہی بیٹا بیٹھے۔ دوم، ہر سُلطان کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ علما، اُمرا اور دوسرے وجوہ الناس اُس کی ذات پر متفق ہو جائیں۔ سب سے پہلے اُن کی بیعت و اطاعت لازمی تھی۔ جب وہ کسی پر اتفاق کر لیتے تو اُس کی سُلطانی کا اعلان کر دیا جاتا۔ گویا انتخاب کا طریقہ کسی نہ کسی رنگ میں محفوظ تھا۔"[1] اس طرح گویا اصولی طور پر سلطنتِ دہلی موروثی نہ تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مستحق افراد سُلطان بنتے رہے اور نااہل سلاطین اُمرا کے ہاتھوں سے معزول ہوتے رہے یا کٹ پتلی بنے رہے۔

---

[1] مولانا عبدالمجید سالک۔ "مسلم ثقافت ہندوستان میں" صفحہ ۱۴۲-۱۴۱

Marfat.com

مرکزی وزراء اور انتظامی شعبے

مرکزی حکومت کے انتظامی فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں سلطان کی مدد کے لئے متعدد وزیر ہوتے تھے جن کی تعداد اکثر بڑھتی اور گھٹتی رہتی تھی۔ سلطنتِ دہلی کے ابتدائی دور میں یعنی خاندانِ غلاماں کے دورِ اقتدار میں چار وزیر (دیوانِ وزارت، دیوانِ عرض، دیوانِ انشا اور دیوانِ رسالت) تھے۔ بعض سلاطین نے نائب یا نائب الممالک بھی مقرر کئے۔ بعد میں دیوانِ برید، صدر الصدور اور دیوانِ قضا کے وزیر بڑھائے گئے۔ اس طرح سلطنتِ دہلی کے وزراء کی تعداد سات ہو گئی۔ بادشاہ کا ذاتی عملہ اس کے علاوہ تھا جو قربِ شاہی کی وجہ سے تمام وزراء کی بہ نسبت اعلیٰ حیثیت کا حامل ہوتا تھا۔

نائب الممالکت

نائب الممالکت کو "نائب الممالک یا نائب غیبت" بھی کہا جاتا تھا۔ جو عہدے کے لحاظ سے سلطان کا نائب اور وزیر سے اعلیٰ حیثیت کا مالک ہوتا تھا۔ یہ عہدہ مستقل نہ تھا۔ صرف بعض سلاطین نے نائب الممالک مقرر کئے۔ اگرچہ نائب الممالک، سلطان کا نائب وزیر سے کم منصب کا مالک ہوتا تھا لیکن کمزور سلاطین کے زمانہ میں وہ اعلیٰ وارفع حیثیت و اقتدار کا مالک شمار ہوتا تھا۔ دارالسلطنت سے سلطان کی مدم موجودگی کی صورت میں وہ "نائب غیبت" کہلاتا تھا۔ سلطان فیروز شاہ جب بھی کسی طویل سفر پر جاتا تو وزیر خان جہان کو اپنا نائب اور قائم مقام مقرر کر جاتا تھا۔

وزیر

وزیرِ اعظم "وزیر" کہلاتا تھا۔ وہ سلطان کے بعد سارے ملک میں اہم حیثیت کا حامل ہوتا تھا۔ حکومت کے جملہ شعبہ جات اس کی زیرِ نگرانی ہوتے تھے اہم معاملات میں سلطان کو مشورہ دینا، حکام کا تقرر کرنا، محکمہ مال کی نگرانی، خراج اور لگانِ مالیہ کی وصولی، سلطنت کے جملہ آمدن و اخراجات کا حساب کتاب رکھنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ اس کے ماتحت ایک بہت بڑا دفتر ہوتا تھا جسے دیوانِ وزارت کہتے تھے۔ دیوانِ وزارت میں ایک نائب وزیر بھی ہوتا تھا جس کے ماتحت دو افسر ہوتے تھے جو آمدن اور اخراجات کا حساب رکھتے تھے اُن میں سے ہر افسر کے ماتحت تین سو کے قریب محرر (کلرک) مقرر تھے۔ محکمہ مال کی جانچ پڑتال کے لئے دو الگ افسر مقرر تھے جو حسابات میں کی گئی ہر قسم کی بدعنوانی سے وزیر کو بروقت مطلع کرتے تھے۔

چونکہ وصولات کی وصولی میں دیوانِ وزارت کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بدیں وجہ دیوانِ وزارت کی اپنی ایک الگ پولیس ہوتی تھی جو مجرموں کو گرفتار کر کے لاتی۔ پولیس کے افسر کو "شحنۂ دیوانِ وزارت" کہتے تھے۔ دیوانِ وزارت میں آمدنی اور اخراجات کی تمام مدوں کے الگ الگ رجسٹر تھے، لیکن ایک عام رجسٹر بھی ہوتا تھا جس میں ہر چیز کا اندراج ہوتا تھا۔

وزیر کا عہدہ بے حد اہم اور ذمہ دارانہ تھا۔ اس لئے وہ بہت صاحبِ اختیار ہوتا تھا۔ اس کا شمار بھی سب سے زیادہ ہوتا تھا۔ اس لئے اکثر و بیشتر اُمراء اس کے خلاف سازشیں کرتے اور سلطان کے کان بھرتے رہتے تھے۔ چونکہ صوبائی حکام کے حسابات کی جانچ پڑتال کرنا بھی وزیر کے فرائض میں شامل تھا، اسلئے وہ بھی اکثر اُن کے خلاف ہو جاتے تھے۔ ان فرائض کی بنا پر وزیر کا عہدہ اہم ترین ہوتا تھا۔ اور وہ منصبی کوتاہی یا بدعنوانی کی بنا پر کسی وقت بھی سلطان کے زیرِ عتاب آ سکتا ہے۔

وزیر ہمیشہ اعلیٰ استعداد و فراست رکھنے والے اُمراء میں سے منتخب کیا جاتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ حکومت کے جملہ شعبہ جات کے متعلق مکمل معلومات رکھتا ہو اور ماہرِ شماریات ہو۔ اس کے لئے فنونِ حرب میں ماہر ہونا ضروری نہ تھا۔ لیکن اہلِ قلم ہونا لازمی تھا۔

Marfat.com

دیوانِ عرض

دیوان عرض محکمۂ دفاع تھا۔ اس محکمہ کے افسرِ اعلیٰ کو 'عارضِ ممالک' کہتے تھے۔ اُس کے فرائض میں فوج کی بھرتی، سپاہیوں کی تنخواہ کا تعین کرنا، افواج کے لئے اسلحہ و رسد کا انتظام، فوجی گھوڑوں کی جانچ پڑتال فوج کو لڑائی کے لئے مستعد رکھنا اور اس میں تنخواہ تقسیم کرنا شامل تھا۔ عارضِ ممالک کا ایک نائب بھی ہوتا تھا۔ جسے نائب عارضِ ممالک کہتے تھے۔ عارضِ ممالک سال میں ایک بار پوری فوج کا عرض یعنی معائنہ کرتا تھا۔ وہ سپاہیوں اور فوجی گھوڑوں کے حلیے اور پتے رکھنے کا بھی ذمہ دار تھا۔ جنگ کے دوران سامانِ حرب اور سامانِ رسد کی فراہمی بھی اُس کے فرائض میں شامل تھی۔ عارضِ ممالک کو متعلقہ دیوان عرض سے متعلقہ تمام حسابات دیوانِ وزارت میں پیش کرنے پڑتے تھے۔

دیوانِ رسالت

دیوان رسالت کے فرائض کے متعلق مؤرخین کی آرا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر آئی۔ ایچ قریشی کی رائے میں وہ مذہبی امور کا نگران وزیر تھا۔ تمام مذہبی امور، اوقاف کی نگرانی، علما و فقرا، طلبا اور غربا و مساکین کی مالی امداد، نیز مساجد اور خانقاہوں کے لئے امدادی رقوم کی فراہمی اُس کے ذمہ تھی۔ مسجدوں کی سفارش پر بادشاہ اہلِ علم لوگوں کے وظائف مقرر کرتا تھا۔

ڈاکٹر اے بی۔ ایم حبیب اللہ کا موقف ہے کہ دیوانِ رسالت امورِ خارجہ کا وزیر تھا اور اُس کے فرائض میں بیرونی ممالک سے خط و کتابت، دوسرے ممالک میں سفرا کا تقرر اور بیرونی ملکوں کے سفیروں کا خیر مقدم کرنا شامل تھا۔ ڈاکٹر حبیب اللہ کی رائے اس بنا پر خطرناک دکھائی دیتی ہے کہ سلطنتِ دہلی کے آغاز سے ہی مذہبی امور کی نگرانی اور وظائف و عطیاتِ شاہی دیوان پر باقاعدہ ایک علیحدہ افسر تھا جسے صدر الصدور کہا جاتا تھا۔ دیوانِ رسالت درحقیقت وزیرِ امورِ خارجہ تھا۔ کیونکہ سلطنت دہلی کے سلاطین بیرونی ممالک بالخصوص وسط ایشیا کے حکمرانوں کے ساتھ دوستانہ اور سفارتی تعلقات رکھنے کے خواہشمند تھے۔

صدر الصدور

یہ وزیر مذہبی امور اور فقرا، اوقاف کا نگران تھا۔ اس کے فرائض میں، علما، سادات، طلبا، غربا، اور محتاجوں کو مالی امداد مہیا کرنا، مساجد میں مؤذن مقرر کرنا، مدارس، مساجد اور خانقاہوں کو مالی امداد دینا شامل تھا اسے 'صدرِ جہاں' بھی کہا جاتا تھا۔ یہ اپنے معاملات میں دیوانِ وزارت کے تابع نہیں تھا، بلکہ براہِ راست بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھا، چونکہ یہ عہدہ بے حد اہمیت اور تقدس کا حامل تھا، اس لئے اس پر عموماً ایسے شخص کو متعین کیا جاتا تھا جو علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے یگانۂ روزگار اور عوام کی نظروں میں محترم ہوتا۔ سلطان علاؤالدین خلجی پہلا حکمران تھا جس نے صدرِ جہاں کے انتخاب میں تقویٰ کی بجائے ملکی خدمات کا زیادہ خیال رکھا۔

دیوانِ قضا

عدل و انصاف کا محکمہ دیوانِ قضا کہلاتا تھا۔ جہاں مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہوتے تھے۔ اسے 'دیوانِ شرع' بھی کہا جاتا تھا۔ دیوانِ قضا کے سربراہ کو قاضی القضاۃ یا قاضیٔ ممالک کہتے تھے اس کے فرائض میں فریادیوں کی دادرسی کرنا، افسروں کے خلاف شکایات سننا اور اُن پر فیصلے صادر کرنا ہوتا تھا۔ سارے ملک کے مفتی اور قاضی دیوانِ قضا کے ماتحت تھے۔ دیوانِ قضا کے معاملات میں بادشاہ خود بھی گہری دلچسپی لیا کرتا تھا اور ہفتہ یا مہینہ کے مقررہ دنوں میں دیوانِ عام منعقد کیا کرتا تھا جس میں افسروں کی

Marfat.com

کئے جاتے تھے۔ جاگیرداریوں کی شکایات پر فیصلے صادر کئے جاتے تھے :

دیوانِ انشا

دیوانِ انشا شاہی خط و کتابت کا محکمہ تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں سیکرٹریٹ تھا۔ اس کے افسر کو دبیرِ خاص کہتے تھے۔ جس کی زیرِ نگرانی کئی دبیر تھے۔ تمام شاہی خط و کتابت اور مراسلت کی ترسیل اس محکمہ کے ذمہ ہوتی تھی۔ اسکے فرائض میں غیر ممالک کے سلاطین سے نامہ و پیام کے مکتوبات تیار کرنا، وزرا، امرا اور گورنروں کے نام فرامین اور قرمان لکھنا، ان کا ریکارڈ رکھنا اور ان کی ترسیل تھی۔ سلطان معمولہ دبیرِ خاص کو بلا کر مضمون کے اصل متن سے آگاہ کر دیتا، ازاں بعد دبیرِ خاص اور اس کا عملہ اس مضمون کو فصیح و بلیغ اور پر شکوہ عبارت کے قالب میں ڈھالتا تھا۔ مہمات کے دوران بھی دیوانِ انشا کے کچھ دبیر سلطان کے ہمراہ رہتے اور حسبِ ہدایت اعلانات، فرامین اور فتح نامے تحریر کرتے جنہیں بڑے بڑے شہروں میں پڑھ کر سنایا جاتا۔ دبیر کے لئے لازم تھا کہ وہ فنِ خطابت کے ماہر اور انشا پایہ کے ادیب ہوں اور سجع عبارت تحریر کر سکیں۔ چونکہ تمام شاہی خط و کتابت دیوانِ انشا کے ذریعہ ہوتی تھی اسلئے دبیرِ خاص کا عہدہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

دیوانِ برید

دیوانِ برید محکمہ خبر رسانی و جاسوسی تھا۔ اس کا افسرِ اعلیٰ "برید ممالک" کہلاتا تھا۔ اس کے ماتحت ایک بہت بڑا عملہ ہوتا تھا جو سلطنت کے ہر گوشے میں پھیلا ہوا تھا اور اپنے اپنے علاقے کے حالات سے سلطان کو باخبر رکھتا تھا۔ امرا کے معمولات کی ملازمائیں اور ملازم خفیہ طور پر اس محکمہ سے متعلق ہوتے تھے۔ اور ان کی سرگرمیوں سے محکمہ کو باخبر رکھتے تھے۔ وہ ان خدمات کے عوض معقول تنخواہیں پاتے تھے۔ ہر صوبے کا دیوانِ برید اور اس کا عملہ براہِ راست مرکزی محکمہ برید کے ماتحت تھا۔ صوبائی گورنروں کو ان پر کوئی اختیار نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی برید یعنی مخبر ادائیگی فرائض میں کوتاہی کرتا اور حالات کی بروقت اطلاع نہ دیتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی، سلطان غیاث الدین بلبن نے بدایوں کے برید کو اسی پاداش میں قتل کروا دیا تھا کہ اس نے گورنر کے مظالم کی اطلاع سلطان کو نہ بھیجی تھی۔ عہدِ علائی کی قیمت بندی اور اشیا کے کنٹرول سسٹم کی کامیابی محکمہ خبر رسانی کی مستعدی اور کارکردگی کی ہی مرہونِ منت تھی فوجی مہمات کے دوران یہ محکمہ سلطان کو جنگ کے حالات سے پوری طرح باخبر رکھتا تھا جس کے لئے دہلی سے مقامِ جنگ تک ہر کوس یا نصف کوس پر ڈاک چوکیوں کا ایک سلسلہ قائم ہوتا جہاں خبر رساں سوار ہر وقت مستعد اور تیار رہتے تھے۔

محتسب

یہ محکمہ احتساب (استفامیہ) تھا جو عوام کی دینی اور اخلاقی زندگی پر نگاہ رکھتا تھا۔ اور مسلمانوں میں شعائر اسلامی کے احترام، مذہبی فرائض کی پابندی اور غیر شرعی رسوم و روایات کے سدِ باب کا اہتمام کرتا تھا۔ محتسب اس محکمہ کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ محتسب کے فرائض کا دائرہ نہایت وسیع تھا اس کے فرائض میں رعایا کو اخلاقی حدود، نظم و ضبط کا پابند بنانا، ملک میں شراب خانوں اور قمار خانوں کا استیصال، فحاشی اور سماجی جرائم کی روک تھام کرنا شامل تھا۔ غلاموں، لاوارثوں اور جانوروں پر بیجا مظالم کو روکنا۔ طلبا پر سختی روا رکھنے والے مدرسین سے باز پرس اور رفاہِ عام کے کاموں اور ان سے متعلق عمارات کی نگرانی وغیرہ بھی اس کے ذمہ تھی۔ محتسب کے فرائض کی وسعت حکمران کے مزاج کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ سلطان غیاث الدین بلبن اور علاؤ الدین خلجی سخت نظم و ضبط کے حامی تھے اور امن و امان کی بحالی کے لئے عوام کی اخلاقی زندگی کو ہر قسم کی فحاشی سے پاک رکھنا چاہتے تھے۔ اسلئے ان کے دورِ حکومت میں محکمہ حسبہ بڑا مستعد اور محتسب کے فرائض اور اختیارات بڑے وسیع تھے۔

کوتوال

شہر کا پولیس افسر کوتوال کہلاتا تھا۔ اسے بعض عدالتی اختیارات بھی حاصل تھے۔ کوتوال سے امید کی جاتی تھی کہ وہ شہر میں

Marfat.com

امن وامان قائم رکھے۔ شہر کے ہر شخص اور ہر مسئلہ کے متعلق معلومات رکھے، رات کو گشت لگائے، بازار کے پیمانوں اور زان کی پڑتال اور چوری ڈکیتی کے انسداد کا اہتمام کرے۔ وہ قاضی کے ماتحت ہوتا تھا اور اُس کے احکام اور دیوانِ قضا کے فیصلوں کو نافذ کرتا تھا۔ رات کو مقررہ اوقات کے بعد شہر کے دروازے بند کر دیتا تھا۔

ہر شہر میں کوتوال کی حیثیت اہم سمجھی جاتی تھی لیکن دارالحکومت میں چونکہ بعض معاملات میں وہ براہِ راست سلطان سے رابطہ رکھتا تھا اس لئے دہلی کا کوتوال بہت بااثر اور اہم شخص متصور ہوتا تھا۔ اُس کی اہمیت کا اندازہ کوتوالِ دہلی علاؤالملک کی شخصیت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب علاؤالدین کے دماغ میں یہ خیالِ خام پیدا ہوا کہ وہ ایک نئے دین کی بنیاد ڈالے تو اُس نے ہی اُس کو سمجھا کر اس منصوبہ سے باز رکھا۔

مجلسِ خلوت

وزراء کے علاوہ سلطان کو اہم امور میں مشورے دینے کے لئے ایک مجلسِ خلوت بھی تھی۔ جو چیدہ چیدہ اُمراء، سرکاری افسروں، علماء و مشائخ، سلطان کے خصوصی احباب اور مقتدر ترین شہریوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ تاہم سلطان مجلسِ خلوت کے مشوروں پر عمل پیرا ہونے کا پابند نہ تھا اور نہ ہی اُس کے ارکان نظم و نسق میں مداخلت کے مجاز تھے۔

سلطان کا ذاتی عملہ

وکیلِ دار:۔ قصرِ سلطانی اور دولتکدۂ شاہی کے انتظام کے لئے امیروں، افسروں اہلکاروں، نقیبوں، چوبداروں اور غلاموں کی ایک خاصی تعداد متعین تھی اُن سب کا اعلیٰ ترین افسر وکیلِ دار کہلاتا تھا۔ جو محل کا مقتدر نگرانِ کار ہوتا تھا۔ پورے عملے کی تنخواہیں دینا اُس کے فرائض میں شامل تھا۔ محل کا باورچی خانہ، آبدار خانہ، اصطبل بلکہ بادشاہ کے اہل و عیال کی دیکھ بھال بھی اُسکے ذمے ہوتی تھی۔ وکیلدار کا عملہ اور دفتر بہت وسیع تھا۔ بادشاہ سے قُرب کی وجہ سے وکیل دار کا مرتبہ بہت اُونچا مقرر ہوتا تھا۔ غزنوی دور میں اس کو صاحبِ دیوان وکالت کہتے تھے۔ سلاطین کے عہد میں وکیل دار اور مغلوں کے عہد میں میرِ سامان یعنی چیف سٹور کیپر کہتے تھے۔

امیرِ حاجب:۔ وکیل دار کے بعد 'امیرِ حاجب' کا رُتبہ تھا۔ جس کو 'باربک' بھی کہتے تھے۔ اُس کے ماتحت کئی حاجب ہوتے تھے۔ یہ لوگ سلطان کے حضور میں عام لوگوں اور امیروں اور وزیروں کی عرضیاں پیش کرتے تھے۔ جب تک یہ تعارف نہ کراتے، کوئی شخص سلطان کے حضور باریاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہ عہدہ بھی خاصی اہمیت کا حامل تھا اس عہدہ پر ایسے افراد کو مامور کیا جاتا تھا جو سلطان کے مخلص دوست یا رشتہ دار ہوتے تھے اگر سلطان کبھی بنفسِ نفیس میدانِ جنگ میں جاتا تو حاجب اُس کے مشیرِ خصوصی (ایڈی کانگ) کا فریضہ انجام دیتا۔

نقیب:۔ محلسرائے سے سلطان کی آمد کا اعلان کرنے پر مامور شخص 'نقیب' کہلاتا تھا۔ گو دوسرے عہدوں کے مقابلہ میں یہ عہدہ بہت کمتر تھا، لیکن حکمران کے قُرب کی وجہ سے نہایت معزز سمجھا جاتا تھا۔ نقیبوں کا افسر نقیب النقباء کہلاتا تھا۔ جو ہاتھ میں سونے کا گُرز لئے رہتا اور ایک طلائی ٹوپی پہنتا جس پر مور کے پروں کی کلغی لگی ہوتی تھی۔ نقیب عوام کو احکامِ شاہی پڑھ کر سُناتے اور شاہی جلوس (سواری) کے آگے آوازِ بلند سلطان کی آمد کا اعلان کرتے تھے۔

جاندار:۔ شاہی محافظ دستہ (باڈی گارڈ) کے سپاہی جاندار کہلاتے تھے اور اُن کا افسر سرجاندار کہلاتا تھا۔ شاہی محافظ دستے کے لئے جو سپاہی منتخب ہوتے، وہ سب کے سب بلند قامت، وجیہہ اور بہادر نوجوان ہوتے تھے۔

Marfat.com

حرم سرائے شاہی کا پہرہ خواجہ سراؤں کے سپرد تھا جو کہ محل کے اندر باہر آمد و رفت اور پیغام رسانی کا کام بھی انجام دیتے تھے اور حرم کی نگران اور بیگمات شاہی کی خدمت کے لئے حاضر رہتے تھے۔

دیگر عہدیدار:۔ ان عہدوں کے علاوہ بعض چھوٹے ملازمین بھی تھے۔ شاہی لائبریری کا مہتمم کتابدار، باورچیخانے کا مہتمم خانسہ دار، پانی کا انتظام کرنے والا سرآبدار، فرنیچر اور خیموں و خرگاہ کا نگران فراشی، سلطان کا وضو کرانے والا تشت دار، لکھنے کا سامان مہیا کرنے والا دوات دار، قریب ترین شاہی خدمتگار آنماچی، سلطان کی جیب خاص کا امین ہاملہ دار یا خزینہ دار، سلطان کے چتر برداروں کا افسر سرچتر دار، محل کا طبیب خاص، ملک الحکماء، سلطان کے جھنڈوں کا مہتمم و نگران کورنیگ اور شاہی رسوم کا منتظم امیر توزک اور محلات شاہی میں مشعل جلانے کا نگران، مشعل دار تھے۔

صوبائی نظام

سلطنت دہلی کی صوبائی حکومتیں قریب قریب مرکزی حکومت سے ملتی جلتی تھیں۔ صوبے کا حاکم گورنر، سلطان کا نائب اور نظم و نسق کا نگران اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ بہت سے صوبائی شعبے بالکل مرکزی شعبوں کے انداز پر قائم تھے عام طور پر ان شعبوں میں مرکزی حکومت کی نگرانی اور مرکزی وزراء و حکام کا اقتدار تھا۔ دور دراز کے صوبجات عام طور پر خود مختار سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں رسل و رسائل کے ذرائع بہت محدود اور دیر طلب تھے، بدیں وجہ صوبجات کے حکام کو آج کل کے گورنروں سے زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ لیکن اس کے باوجود قاضیوں اور مالگذاری کے اعلیٰ افسروں کے تقرر کا اختیار بادشاہ ہی کو حاصل تھا۔ ضیاء الدین برنی ان گورنروں کے لئے لفظ 'والی' استعمال کرتا ہے۔ اُن کو مقطع بھی کہتے تھے۔ محمد تغلق کے عہد میں مقطع کی جگہ امیر نے لے لی۔ سلاطین لودھی صوبائی حاکم کو شقدار شقداران کہا کرتے تھے۔

سلطنت دہلی کی تاریخ میں صوبوں کی اصطلاح کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تاہم دہلی کی وسیع سلطنت انتظامی سہولتوں کے تحت متعدد اقطاع میں تقسیم کی گئی تھی۔ جن پر فوجی حکام مقرر تھے۔ جنہیں والی یا مقطع کہا جاتا تھا۔ خاندان غلاماں کے سلاطین کے تحت تمام سلطنت بارہ اقطاع میں منقسم تھی۔ علاؤالدین خلجی جس نے دکن سمیت تقریباً تمام ملک کو فتح کیا، نے ابتدا میں مفتوحہ علاقوں پر سابقہ حکمرانوں کو اپنی طرف سے گورنر مقرر کیا۔ اس نے اقطاع کو بھی بدستور قائم رکھا۔

گورنر کے عہدے پر سلاطین ہمیشہ نہایت معتبر اور کارآزمودہ امیر کو مقرر کرتے اور ان سے توقع رکھتے کہ لشکریوں، ملازموں اور اہلکاروں کی حفاظت و سرپرستی، بغاوتوں کا انسداد، عوام کی فلاح و بہبود کا اہتمام اور عدل گستری کا انتظام ہمیشہ مرکز کے نمونے پر کریں گے۔ ہر صوبے میں ایک صاحب دیوان ہوتا جسے عموماً خواجہ کہتے تھے۔ اس افسر کو وزیر کی سفارش پر خود سلطان مقرر کرتا تھا اس کے فرائض میں صوبائی آمدن و خرچ کے مفصل اور باقاعدہ حساب کا صدر دفتر کو بھیجنا تھا۔ گورنر اس کے کام میں مداخلت کا مجاز نہ تھا۔

شق صوبوں کو شقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا اور ہر شق کا حاکم شقدار کہلاتا تھا لیکن یہ تقسیم ان صوبوں میں ہوتی تھی جو زیادہ وسیع تھے۔ مثلاً محمد تغلق نے دکن کو چار شقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ شقدار ایک فوجی افسر ہوا کرتا تھا جس کا فرض اپنے حلقۂ اختیار میں امن و امان قائم کرنا تھا۔

Marfat.com

پرگنہ شِق کے بعد چھوٹی انتظامی وحدت کو پرگنہ کہا جاتا تھا۔ جو کم و بیش ایک سو دیہات پر مشتمل ہوتا تھا۔ پرگنوں کا انتظام اور دیہات سے مالیہ وصول کرنے کا کام تمام تر ہندو مقدموں اور چوہدریوں کے سپرد تھا۔ ہر پرگنہ میں ایک چوہدری اور ایک متصرف دونوں مالیہ وصول کرنے پر مامور تھے۔ متصرف یا عامل سرکاری ملازم ہوتا تھا۔ لیکن چوہدری (نمبردار) مقامی لوگوں کا نمائندہ ہوتا تھا۔

دیہات سلطنت میں سب سے چھوٹا انتظامی حلقہ دیہات کہلاتا تھا، جہاں پنچائت سسٹم کے ذریعے متنازعہ فیہ معاملات کا تصفیہ ہوتا تھا۔ دیہات کے انتظام کے لئے مقدم، چوکیدار اور پٹواری مقرر تھے۔

ذرائع آمدن سلطنتِ دہلی کا نظامِ مالیات شریعتِ اسلامی، خلافتِ عباسیہ کی روایات اور برِصغیر کے مقامی احوال و عوائد پر مبنی تھا۔ اس کے بڑے بڑے ذرائع آمدن میں لگانِ اراضی، زکوٰۃ، جزیہ، عشور، مالِ غنیمت، کانیں، مدفون خزانے، لاوارث جائدادیں، تحائف اور کئی دیگر مختلف النوع محاصل شامل تھے۔

ا۔ لگانِ اراضی:- عہدِ وسطیٰ میں حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ زمین کا مالیہ تھا جس کی دو قسمیں تھیں عشر اور خراج جو شریعتِ اسلامی کے احکام کے مطابق وصول کئے جاتے تھے۔

ا۔ عشر:- اُس زمین سے وصول کیا جاتا تھا جس کو مسلمان کاشت کرتے تھے اِسکی شرح کُل پیداوار کا دس فیصد تھی۔

ب۔ خراج:- اُس زمین پر وصول کیا جاتا تھا جس کو غیر مسلم کاشت کرتے تھے۔ اس کی شرح ۲۰ فیصد سے لے کر ۵۰ فیصد تک تھی اس کی وصولی کے دو طریقے تھے **حکمِ مساحت** یعنی زمین کی پیمائش کر کے گذشتہ سالوں کی پیداوار کی بنیاد پر قیمت کا اندازہ لگا لیا جاتا اور حکومت کا حصّہ متعیّن کر لیا جاتا، اور **حکمِ حاصل** یعنی تجربہ کار لوگ کھڑی فصل کی قیمت کا اندازہ لگا کر حکومت کا حصّہ مقرر کر لیتے تھے۔ سلطان فیروز شاہ کے عہد میں یہی طریقہ رائج رہا۔ خراج کی شرح مختلف سلاطین کے عہد میں بدلتی رہی۔

قحط یا خشک سالی کی صورت میں سارا مالیہ یا مالیہ کا کچھ حصّہ معاف کر دیا جاتا تھا۔ مالیہ جنس یا نقدی دونوں صورتوں میں وصول کیا جاتا تھا۔ علاؤالدین اور لودھی سلاطین نے جنس کی صورت میں مالیہ کی وصولی پر زور دیا خراج کی وصولی پر مقامی ہندو زمیندار مقرر تھے جو مقدم یا چوہدری کہلاتے تھے۔ حکومت انہیں اس خدمت کا عوضانہ دیتی تھی۔ اُن سے بعض ٹیکس بھی وصول نہیں کئے جاتے تھے۔

۲۔ زکوٰۃ:- یہ مذہبی ٹیکس تھا، جو صرف مسلمانوں سے وصول کیا جاتا تھا جس کی شرح ڈھائی فیصد تھی۔ اسلام کے مقرر کردہ ضابطہ کی وجہ سے اس میں کمی بیشی ناممکن تھی۔ زکوٰۃ کی آمدنی کو عامۃ المسلمین کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں نہ صرف اس کے مصرف متعین تھے بلکہ اس کی وصولی خود حکومت کرتی تھی اور اس کے لئے ایک علیحدہ خزانہ تھا۔

۳۔ جزیہ:- یہ ایک اسلامی ٹیکس تھا، جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اِسے تمام سلاطینِ دہلی کے عہد میں وصول کیا جاتا رہا، اس سے مراد یہ تھی کہ حکومت یہ محصول لے کر غیر مسلموں کے مال و جان، عزت اور مذہبی آزادی کی

Marfat.com

ذمہ دار ہو جاتی تھی، اسکی تین شرحیں تھیں دولتمند طبقہ سے اڑتالیس تنکہ سالانہ، متوسط طبقہ سے چوبیس تنکہ اور ادنیٰ طبقہ سے بارہ تنکہ۔ عورتیں، بچے، محتاج، اپاہج، بوڑھے، مذہبی پیشوا اور فوجی خدمت انجام دینے والے ذمی (غیر مسلم) جزیہ ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ اس ٹیکس کی افادیت کے پیشِ نظر فیروز شاہ تغلق نے اسے برہمنوں پر بھی عائد کیا۔ لیکن برہمنوں کے انکار پر دہلی کے ہندوؤں نے اُن کی طرف سے یہ رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

۴۔ عشور:۔ یہ وہ ٹیکس تھا جو درآمدی مالِ تجارت پر ملک کی سرحد پر وصول کیا جاتا۔ ابنِ بطوطہ کا بیان ہے کہ جب وہ وارد ہند ہوا تو اسکی شرح ۲½ فیصد تھی سلطان محمد تغلق نے اسے گھٹا کر بیس فیصد کر دیا۔ جبکہ سکندر لودھی نے گندم پر اسکی وصولی یکسر ختم کر دی۔

۵۔ مالِ غنیمت: میدانِ جنگ میں چھوڑا ہوا غنیم کا مال جو فاتح فوج کے ہاتھ آتا ہے، مالِ غنیمت کہلاتا ہے عہدِ سلاطین میں شرعی لحاظ سے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (خمس) شاہی خزانہ میں چلا جاتا اور باقی چار حصے فوج میں تقسیم کر دیئے جاتے۔ علاؤالدین خلجی نے اس شرح کو یکسر بدل دیا، یعنی چار حصے حکومت لے لیتی اور پانچواں حصہ لشکریوں میں تقسیم کر دیا جاتا، لیکن فیروز شاہ نے علماء کے اعتراض پر پھر وہی پرانی شرح قائم کر دی۔

۶۔ کانیں، مدفون خزائن اور لاوارث جائدادیں:۔ کانوں کی آمدنی کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کیا جاتا۔ اسی طرح مدفون خزائن کا پانچواں حصہ حکومت کی ملکیت تصور ہوتا اور لاوارث جائداد تمام کی تمام شاہی خزانے میں چلی جاتی تھی۔

۷۔ تحائف:۔ سلطان کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تحائف بھی تھے جو اُمرا یا غیر ملکی سفرا کی طرف سے وقتاً فوقتاً سلطان کے حضور پیش ہوتے تھے۔

۸۔ دیگر محاصل:۔ مندرجہ بالا ذرائع آمدنی کے علاوہ بعض ایسے ٹیکس بھی وصول کئے جاتے تھے، جو برِصغیر میں ازمنۂ قدیم سے رائج تھے سلاطینِ دہلی نے بھی انہیں جاری رکھا اُن میں ہاؤس ٹیکس، چراتی اور وائر ٹیکس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فوجی نظام

سلطنتِ دہلی کے استحکام کا انحصار زیادہ تر فوج کا مرہونِ منت تھا۔ کیونکہ برِصغیر پر بیرونی حملوں کا اندیشہ ہر وقت رہتا تھا اور اندرونِ ملک بھی کئی عناصر حکومت کی مخالفت میں مصروفِ کار رہتے تھے۔ برِصغیر کی آبادی کا بیشتر حصہ ہندوؤں پر مشتمل تھا جنہوں نے مسلم سلطنت کو دل سے تسلیم نہ کیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو غاصب سمجھتے تھے اور صرف قوت کے ڈر سے مرعوب ہو کر اطاعت گذار بنے ہوئے تھے۔ اکثر و بیشتر جب بھی موقع پاتے علمِ بغاوت بلند کر دیتے تھے علاوہ ازیں اُنہیں جائز مالگزاری کی وصولی کے لئے بھی طاقت کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ سلاطینِ دہلی مہمات اور توسیع پذیری کے بھی دلدادہ تھے۔ اس لئے سلاطینِ دہلی اپنی فوجی تنظیم پر خاص توجہ دیتے تھے۔

آئینی اعتبار سے سلطان ہی افواج کا سپہ سالار ہوتا تھا جو عسکری مہارت سے آراستہ ایک تجربہ کار جرنیل ہوتا تھا۔ فوجی امور میں سلطان کا معاون و مشیر نائب الملک ہوتا تھا۔ محکمۂ دفاع کا افسرِ اعلیٰ دیوانِ عرض یا عارضِ ممالک ہوتا جس کے فرائض میں محکمۂ دفاع کی تنظیم فوج کی بھرتی اور اس کی عسکری تربیت نیز وقتاً فوقتاً فوج کا معائنہ کرنا شامل تھا۔ دیوانِ عرض میں ہر سپاہی کا حلیہ اور اُس کا پتہ درج ہوتا تھا سلطان علاؤالدین خلجی نے فوجی گھوڑوں کو داغ دینے کا طریقہ رائج کیا تاکہ بوقتِ معائنہ اصل گھوڑا بدلا نہ جا سکے۔ سلطان فیروز شاہ نے اسے بالکل ترک کر دیا مگر سکندر لودھی نے اسے دوبارہ جاری کر دیا۔

سلاطینِ دہلی داخلی امن و امان اور بغاوتوں کے انسداد کے لئے افواج کو اہم مقامات پر متعین رکھتے تھے۔ منگولوں کے حملوں کو روکنے کے لئے مختلف سرحدی چوکیوں اور قلعوں میں خصوصی تربیت یافتہ فوج متعین کی جاتی تھی جہاں سامانِ حرب اور رسد کا معقول

Marfat.com

انتظام ہوتا تھا۔ افواج چار قسم کی ہوتی تھی مستقل مرکزی فوج جو دارالسلطنت میں بادشاہ کی زیر نگرانی ہوتی تھی مستقل صوبائی فوج جو صوبائی گورنروں اور امرا کے ماتحت تھی، رنگروٹ جو وقتی طور پر بھرتی کئے جاتے تھے۔ اور مجاہدین جو جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر فوج میں شامل ہو جاتے تھے فوج کا وہ حصہ جو دارالسلطنت میں موجود رہتا چشم قلب کہلاتا تھا۔ اس میں سوار، پیادہ دستے، شاہی محافظ دستے (خاصہ خیلی) اور امرا کے دستے بھی شامل ہوتے تھے دارالسلطنت کے علاوہ مختلف مقامات یا صوبجات میں متعینہ افواج کو چشم اطراف کہا جاتا تھا۔

سلاطین دہلی کا یہ دستور تھا کہ وہ ملک میں اہم مقامات پر جنگی قلعے اور فوجی چھاؤنیاں تعمیر کراتے تھے جن میں ہمیشہ کافی رسد کے ساتھ اعلیٰ تربیت یافتہ فوج متعین رہتی تھی۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے منگولوں کے حملوں کا انسداد کرنے کے لئے شمال مغربی سرحد سے لے کر دارالسلطنت دہلی تک جابجا مضبوط قلعے اور فوجی ناکے تعمیر کرائے جنہیں بعد میں سلطان علاؤ الدین خلجی نے دوبارہ مرمت کرا کے مزید مستحکم کیا۔ فوج مختلف شعبوں میں منقسم تھی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

سوار فوج :- سلطنتِ دہلی کی فوج کا اہم ترین اور مؤثر حصہ سوار فوج تھی جسے آج کل کی اصطلاح میں رسالہ کہا جاتا ہے اُس زمانے میں کسی بادشاہ کی جنگی قوت کا اندازہ اُس کے سوار دستوں ہی سے کیا جاتا تھا۔ بعض سوار اور اُن کے گھوڑے زرہ بکتر سے آراستہ ہوتے تھے۔ ہر سوار کے پاس دو تلواریں، ایک خنجر، ایک ترکی کمان اور ترکش ہوتا تھا، رسالہ یک اسپہ، دو اسپہ اور سہ اسپہ سپاہیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ افواج کو اعلیٰ النسل کے گھوڑے فراہم کرنے کا معقول انتظام تھا۔ حکومت کی طرف سے کئی شاہی پائیگاہ (اصطبل) قائم تھے جہاں بے شمار اعلیٰ نسل کے گھوڑے پالے جاتے تھے۔ اور عرب، ترکستان اور روس سے اعلیٰ نسب کے بے شمار گھوڑے درآمد ہوتے تھے۔

پیادہ فوج | سوار فوج کے بعد پیادہ فوج تھی جس کے سپاہیوں کو **پائک** کہا جاتا تھا۔ ان میں تیر انداز بھی ہوتے تھے جن کو **دھانک** کہا جاتا تھا پیادہ فوج میں زیادہ تر ہندو، غلام اور ایسے ادنیٰ طبقوں کے لوگ ہوتے تھے جنہیں گھوڑا رکھنے کی استطاعت نہ تھی، شاہی محافظ دستے، شاہی محلات کے پہرہ دار اور چوکیدار عموماً پائک فوج سے ہی ہوتے تھے۔ یہ فوج داخلی سازشوں اور سرکش عناصر کو کچلنے کے لئے بڑی کامیاب ثابت ہوتی تھی۔

جنگی ہاتھی | ازمنۂ قدیم اور قرونِ وسطیٰ میں جنگی ہاتھی بھی لشکرِ شاہی کا ایک اہم حصہ ہوتے تھے اُن کو وہی اہمیت حاصل تھی جو آج ٹینکوں کو حاصل ہے اس لئے ہاتھیوں کی خورد پرداخت پر خاص توجہ دی جاتی اور انہیں باقاعدہ جنگ کی تربیت دی جاتی تھی۔ ہاتھیوں پر متعدد سپاہی تیر و کمان اور دوسرے اسلحہ سے لیس ہو کر بیٹھ جاتے اور پیادہ و رسالہ دونوں پر موت کا مینہ برسا دیتے تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے نزدیک ہاتھی کی بہت اہمیت تھی وہ اسے پانچ سو سپاہیوں کے برابر مؤثر سمجھتا تھا۔ اُن کی سونڈوں اور بڑے دانتوں کے ساتھ درانتیاں باندھ دی جاتیں جن کی وجہ سے وہ دشمن فوج میں تباہی کا موجب بنتے تھے۔ اُن کی جنگی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ محمد تغلق کی فوج میں تین ہزار ہاتھی تھے۔ فیروز شاہ نے بنگال پر حملہ کیا تو چار سو ستر ہاتھی اُس کے ساتھ تھے۔ سلطان محمود شرقی والیٔ جونپور نے ایک ہزار چار سو ہاتھیوں کے ساتھ دہلی پر حملہ کیا تھا۔ شاہی ہاتھیوں کا نگران افسر شحنۂ فیل کہلاتا تھا[1] ہاتھیوں پر سلطان کا اجارہ ہوتا تھا کوئی شخص سلطان کی اجازت کے بغیر ہاتھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اوسط قیمت فی ہاتھی سات آٹھ ہزار روپے تھی۔

---

[1] مولانا عبدالمجید سالک "مسلم ثقافت ہندوستان میں" صفحہ ۱۶۵

Marfat.com

فوج میں آتشیں اسلحہ (نفت) بھی تھا۔ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں نہایت ابتدائی قسم کی توپیں بھی ایجاد ہو گئی تھیں۔ لیکن سلاطین نے آتشیں اسلحہ کی طرف زیادہ توجہ صرف نہ کی جس کی نتیجہ یہ ہوا کہ پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی، بابر کے توپخانہ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ دشمنوں کے قلعوں کی فصیلوں کو توڑنے کے لئے منجنیقیں اور عرادے بھی موجود رہتے تھے۔ دریاؤں کو عبور کرنے کے لئے کشتیوں کے پُل بنائے جاتے تھے۔ فوج کے ساتھ ایسے خبر رساں بھی ہوتے تھے جو دشمن کی جنگی سرگرمیوں کی خبریں لاتے تھے۔ انہیں برزکی کہا جاتا تھا۔ ہر فوج میں طبی امداد اور بینڈ باجے کا بھی باقاعدہ انتظام ہوتا تھا۔ فوج کے ہمراہ بڑے بڑے عسکری نشان (پرچم) بھی ہوتے تھے جنہیں ہاتھیوں پر رکھ کر بلند کیا جاتا تھا۔ فوج کا جلوس نکلتا تو دائیں حصے پر عباسی خلیفہ کا سیاہ جھنڈا اور بائیں جانب سلاطینِ دہلی کا سُرخ جھنڈا لہراتا تھا۔ قطب الدین ایبک کے جھنڈوں پر ہلال، شیر اور اژدھا کی تصاویر ہوتی تھیں۔ فوج کی باقاعدہ وردی مخصوص ہوتی تھی۔ فوج میں عشاری نظام قائم تھا دس سواروں پر ایک سرخیل، دس سرخیلوں پر ایک سپہ سالار، دس سپہ سالاروں پر ایک امیر اور دس امیروں پر ایک خان ہوتا تھا۔ بعد میں سپہ سالار تمام فوج کا افسر اعلیٰ متصور ہونے لگا۔ سلاطین دہلی میں قطب الدین ایبک پہلا سلطان تھا جس نے اپنے نام کے ساتھ سپہ سالار کا لقب اختیار کیا۔

افواج کو تنخواہ دینے کے طریقے میں کئی بار تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔ التمش کے عہد میں فوجیوں کو نقد تنخواہ کی بجائے اقطاع یعنی چھوٹی چھوٹی جاگیریں دی جاتی تھیں جن کی آمدنیوں سے وہ اپنے ذاتی، گھوڑوں اور ساز و سامان کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے ساری فوج کو مرکزی خزانہ کا تنخواہ دار بنایا۔ وہ فوجیوں کو اقطاع دینے کے سخت خلاف تھا۔ اُسی کے دور میں ایک سوار کو دو سو چونتیس تنکہ سالانہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ محمد تغلق ہر سپاہی کو پانچ سو تنکہ تنخواہ کے علاوہ وردی اور گھوڑے کا چارہ بھی دیتا تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے سپاہیوں اور فوجی افسروں کو انتہائی فراخدلی سے جاگیریں عطا کیں جو بعد میں موروثی بن گئیں۔ مستقل مرکزی فوج کو "وجی" اور ہنگامی حالات کے تحت بھرتی کی ہوئی فوج کو غیر وجی کہا جاتا تھا۔

امتحانی سوالات

۱۔ سلطنتِ دہلی کے نظامِ حکومت کے اہم خدوخال بیان کیجئے۔

۲۔ سلطنتِ دہلی کے صوبائی انتظامی ڈھانچہ پر روشنی ڈالئے۔

۳۔ سلطنتِ دہلی کے ذرائع آمدن کا تفصیلی جائزہ لیجئے۔

۴۔ سلاطینِ دہلی کے فوجی نظام پر سیر حاصل تبصرہ کیجئے۔

۵۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیں:۔

(ا) سلطان (ب) دیوانِ وزارت (ج) حسبہ

Marfat.com

بارہواں باب — علوم و فنون

سلاطین دہلی کو سیاست، معاشرت، جنگ، دفاع اور دوسری ملکی سرگرمیوں کے لحاظ سے محور کی حیثیت حاصل تھی اور ملک کی خوشحالی اور بدحالی کا تمام تر انحصار سلاطین ہی کی ذات و صفات پر تھا۔ علوم و فنون کی ترویج و ترقی کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اگرچہ ابتدائی دور میں سلاطین دہلی کی زیادہ تر توجہ فتوحات اور استحکامِ ملک پر مرکوز رہی، لیکن اس کے باوجود اکثر و بیشتر سلاطین علوم و فنون کے مربی اور علماء کے قدر دان و سرپرست تھے۔ انہیں اپنے ثقافتی فرائض کا پورا احساس تھا۔ اُن کے عہد میں علوم و فنون اور تعلیم و تدریس کو حیرت انگیز حد تک فروغ حاصل ہوا، کیونکہ سلاطین علوم و فنون کی حوصلہ افزائی کے لئے نہ صرف اپنا قیمتی وقت وقف کرتے اور ذاتی طور پر اس میں دلچسپی لیتے تھے بلکہ روپیہ پانی کی طرح بہاتے تھے۔ اُن کے درباروں میں اہلِ علم کا ہجوم رہتا تھا۔ بعض سلاطین کی تشنگی علم غیر معمولی تھی اور انہوں نے علماء و فضلاء کی فیاضانہ قدر دانی کی۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ و جدال کے دور میں بھی دارالسلطنت دہلی بلند پایہ علماء، ادباء اور شعراء کا ایک مثالی مرکز اور علوم و فنون کا گہوارہ بنا رہا۔ ذیل میں سلاطینِ دہلی کی علم پروری اور ثقافت نوازی کی تفصیل دی جاتی ہے۔

علم و ادب

محمود غزنوی | یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ محمود غزنوی علوم و فنون کی قدر افزائی کے باب میں اپنے تمام ہم عصر حکمرانوں سے افضل مقام رکھتا تھا۔ وہ ہر سال علماء و شعراء کی امداد میں جو روپیہ صرف کرتا تھا، اُس کی مقدار چار لاکھ دینار تھی۔ اُس نے غزنی میں سنگِ مرمر اور سنگِ خارا کی ایک رفیع الشان اور خوبصورت مسجد تعمیر کروائی، پُر شکوہ فانوسوں، بیش بہا قالینوں اور تزئین و آرائش کے دیگر سامان سے اُسے مزین کیا۔ اُس نے غزنی میں ایک اعلیٰ درجہ کا دارالعلوم بھی قائم کیا جس میں مختلف زبانوں کی بے شمار کتب جمع تھیں اُس کے ساتھ ایک عجائب گھر بھی تھا۔ اس وسیع ادارے کے انتظام و انصرام، طلباء کی گذر بسر اور یکتائے زمانہ اساتذہ کی شایانِ شان کفالت کے لئے بیش قرار رقم وقف کی۔ مشہور مؤرخ فرشتہ کا بیان ہے کہ کسی دوسرے بادشاہ کے دربار میں علماء و فضلاء کا اتنا مجمع نہ تھا جتنا سلطان محمود غزنوی نے اپنے گرد جمع کر رکھا تھا۔

محمود کے جانشین | محمود کا جانشین مسعود علماء و فضلا اور علم و ادب کا اسقدر شیدائی تھا کہ دور دراز سے اہلِ علم و دانش اُس کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے مشہور فلسفی اور ہیئت دان ابوریحان البیرونی اس عہد کے یگانۂ روزگار دانشوروں میں سے تھا۔ جس نے علمِ ہیئت پر ایک کتاب "قانونِ مسعودی" کے نام سے لکھی۔ جس پر خوش ہو کر سلطان مسعود نے اس کو ایک ہاتھی کے بار کے برابر چاندی کے سکے عطا کئے۔ سلطان مسعود نے اپنے دورِ حکومت میں متعدد مساجد اور سلطنت غزنہ کے مختلف شہروں میں مکاتب و مدارس قائم کر کے، علم و ثقافت کی بے حد حوصلہ افزائی کی۔ سلطان محمود کا عہد علوم و فنون کی ترویج و ترقی کے لئے بہت مشہور ہے۔ ابوریحان البیرونی نے اُسی کی سرپرستی میں ہندی علوم و فنون کو سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا اور ریاضیات فلکیات، نجوم، فلسفہ، طب، دواسازی کے علوم کی طرف مسلمان علماء و مترجمین کی توجہ مبذول کرائی۔ سلطان محمود غزنوی کے دوسرے جانشین سلطان ابراہیم اور سلطان بہرام بن مسعود بھی علم و ثقافت کے سرپرست اور علماء و فضلاء کے

Marfat.com

قدردان تھے۔ شیخ نظامی گنجوی صاحبِ 'مخزنِ اسرار' اور سید حسن غزنوی جیسے مشہورِ زمانہ اربابِ علم و فضل اُن کے دربار کی زینت تھے۔ سلطان بہرام بن مسعود نے متعدد غیر ملکی کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کروایا۔ جن میں سنسکرت کی مشہور کتاب 'کلیلہ دمنہ' بھی شامل ہے۔

محمد غوری سلطان محمد غوری کو جنگ و جدال میں مصروف رہنے کی وجہ سے علم و ادب کی خدمت کا موقع نہیں ملا لیکن اجمیر پہنچ کر اُس نے مسجدیں تعمیر کروائیں اور مدرسے قائم کئے[1]۔ سلطان محمد غوری کے اولاد نرینہ نہ تھا جس کی وجہ سے اُس کی تمام تر شفقتِ پدرانہ اپنے ترک غلاموں کے لئے وقف رہی۔ جن میں قطب الدین ایبک سلطانِ ہند، تاج الدین یلدوز حاکم غزنی اور ناصر الدین قباچہ حاکم ملتان و سندھ شامل تھے۔ جنہیں محمد غوری نے نہ صرف علومِ مروجہ کی تعلیم دلوائی بلکہ فنونِ جہانبانی سے بھی آراستہ کیا۔

خاندانِ غلاماں سلطان قطب الدین ایبک خاندانِ غلاماں کا بانی عربی اور فارسی زبانوں کے علوم و فنون پر عبور رکھتا تھا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور مذہبی جذبہ سے سرشار تھا۔ اُس نے دہلی میں مشہورِ زمانہ مسجد "قبتہ الاسلام" تعمیر کرا کے برِصغیر میں اسلامی فنِ تعمیر کی بنیاد رکھی۔ قطب مینار جس کا شمار عجائباتِ عالم میں ہوتا ہے، اُسی نے تعمیر کروایا۔ اُس کا جانشین شمس الدین التمش اگرچہ اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے علوم و فنون کی ترویج و ترقی کی طرف توجہ نہ دے سکا، تاہم وہ اربابِ علم و دانش کا بے حد قدردان تھا۔ اُس کے زمانے میں دہلی اہلِ کمال کا مرکز بن چکی تھی۔ تعلیم و تدریس کے کئی ایک مراکز حکومت کی نگرانی میں قائم ہو چکے تھے۔ نورالدین محمد عوفی جس نے فارسی میں تاریخی حکایات کا ایک پسندیدہ مجموعہ مرتب کیا، سلطان کے دربار سے وابستہ اور اُس کی فیاضی سے بہرہ اندوز تھا۔ سلطان شمس الدین التمش بے حد علم دوست اور جوہر شناس تھا۔ اُس نے فخر الملک کو جو تیس سال تک خلیفہ بغداد کا وزیر رہا تھا اور علم و دانش کے لئے مشہور تھا، اپنا وزیر مقرر کیا۔ اُس نے اپنے بیٹے محمود اور بیٹی رضیہ کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ مشہور مؤرخ فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان رضیہ نہ صرف قاریۂ قرآن تھی بلکہ علماء نواز بھی تھی۔ اُس نے دہلی میں ایک عالیشان مدرسہ قائم کیا جس کو 'مدرسۂ معزیہ' کہتے تھے۔

ناصر الدین محمود ناصر الدین محمود خاندانِ غلاماں کا ایک دانش مند حکمران تھا۔ وہ نہ صرف خود عالم تھا بلکہ اربابِ علم و فضل کا قدردان بھی تھا۔ وہ اپنی معاش قرآنِ کریم کی کتابت کر کے پیدا کرتا تھا۔ وہ علومِ فارسی کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ [illegible] نے مشہورِ زمانہ تاریخ

---

[1] حسن نظامی 'تاج المآثر'، ایلیٹ، جلد دوم صفحہ ۱۵۔

Marfat.com

"طبقاتِ ناصری" اسی سلطان کے عہد میں مرتب کی۔

بلبن

ناصرالدین محمود کے بعد غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا۔ وہ علم و ثقافت کا دلدادہ اور اہلِ علم و دانش کا سرپرست تھا۔ متعدد نامور علما اُس کے دربار کی زینت تھے۔ جب چنگیز خاں نے خراسان وغیرہ کو تاخت و تاراج کیا تو وسطِ ایشیا کے پندرہ شہزادے بے خانماں ہو کر دہلی آ گئے جن کی پذیرائی اور خاطر و مدارات نہایت شاہانہ پیمانہ پر کی گئی۔ ان شہزادوں کے ساتھ اُس زمانے کے بہت سے علما و اہلِ فن بھی برِ صغیر میں آئے۔ اس سے بلبن کا دربار علم اور دولت کا مرکز بن گیا۔

بلبن کا بڑا بیٹا شہزادہ محمد بہت خوش ذوق اور علم دوست نوجوان تھا اُس کی سرپرستی میں دہلی میں بہت سی ادبی مجالس قائم ہو گئی تھیں۔ شہزادے کی مجلس اُس کے محل میں منعقد ہوتی تھی جس کی صدارت اُس کا اتالیق امیر خسرو کرتا تھا۔ دہلی کی ان مجالس میں شعرا اپنا کلام پڑھتے۔ قصہ گو داستانیں سناتے اور اہلِ فن رقص و موسیقی کے مظاہرے کرتے۔ اس طرح دہلی علم و ادب کا گہوارہ بن گیا۔ شہزادہ محمد کی تشنگیٔ علم کا یہ عالم تھا کہ اُس نے بعض باکمال اربابِ علم و فن کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ اُس نے شیخ سعدی شیرازی سے بھی برِ صغیر میں آنے کی استدعا کی۔ شیخ کی خدمت میں تحائف کے علاوہ روپیہ بھی ارسال کیا اور یہ بھی ارادہ ظاہر کیا کہ شیخ کے لئے ملتان میں ایک خانقاہ بنا دی جائے گی اور چند گاؤں اُن کے مصارف کے لئے وقف کر دیئے جائیں گے۔ شیخ نے دونوں مرتبہ اپنی پیرانہ سالی کے باعث انکار کر دیا اور کچھ اشعار بطورِ معذرت لکھ بھیجے اور لکھا کہ آپ کی مجلس کے صدر امیر خسرو بہت قابل اور باکمال ہیں، اُنہی پر اکتفا کیجئے۔[1]

بلبن کے ذوقِ علم و ادب کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات وہ خود بہ نفسِ نفیس علما و فضلا کے مکانوں پر چلا جاتا اور بیش قیمت تحائف اُن کی خدمت میں پیش کرتا۔ بلبن ہی کے عہد میں مشہور صوفی اور عالمِ دین شیخ نجم الدینؒ۔ قطب عالم شیخ صدرالدین شیخ بدرالدین عارف غزنویؒ۔ خلیفہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ سیدی مولاؒ اور کئی دوسرے اربابِ بصیرت اور ماہرینِ علوم موجود تھے۔ سلطان ان سب سے احترام و ملاطفت سے پیش آتا تھا۔ سیدی مولا علم و تقویٰ میں بڑے مشہور تھے۔

خلجی خاندان

سلطان جلال الدین خلجی بھی اپنے پیشرو سلاطین کی مانند علم و ادب کا شیدائی اور سرپرست تھا اُس کی مجالس میں امیر خسروؒ، تاج الدین عراقی، خواجہ حسن سجزی، مؤید دیوانہ، امیر ارسلان قلی اختیار الدین یاغی اور باقی خطیب جیسے شعرا، محدثین اور علما شامل تھے۔ تخت نشین ہونے کے بعد سلطان نے امیر خسرو کو اپنا مصحف بردار مقرر کیا اور امرائے خصوصی میں شامل کر کے اُسے اجازت دی کہ وہ سفید کپڑوں میں حاضرِ دربار ہوا کرے یہ وہ امتیاز تھا جو صرف خاندانِ شاہی کے اعیان اور بڑے اُمرا ہی کو دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ امیر خسرو کو **شاہی کتبخانہ** کا مہتمم بھی مقرر کیا۔

علاؤالدین خلجی

علاؤالدین خلجی پہلے پہل تو علم و ادب سے بیگانہ تھا۔ نہ خود پڑھا لکھا تھا نہ اپنے شہزادوں کی تعلیم پر متوجہ تھا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد اُسے ناخواندگی کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے

---

[1] ضیاالدین برنی۔ "تاریخ فیروز شاہی" ایلیٹ (جلد سوم) صفحہ ۱۱۰

Marfat.com

پڑھنا شروع کیا۔ اور علما کی صحبت سے بھی مستفیض ہونے لگا۔ وہ مولانا کہرامی اور قاضی مغیث الدین کا بے حد احترام کرتا تھا۔ چونکہ اُس زمانے میں علم کا چرچا عام ہو چکا تھا اور اہلِ دہلی علم دوستی کی رُوح سے سرشار تھے اس لئے دہلی بڑے بڑے اہلِ کمال کا مرکز بن رہا تھا۔ علوم و فنون کے بڑے بڑے ماہرین میں پنیا لیس رہتے تھے جو دہلی کے مختلف دارالعلوم میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے" سلطان علاؤالدین خلجی کا وزیر شمس الملک بہت فاضل آدمی تھا اور زمانے کے بڑے بڑے نامور علما اُس کے شاگرد تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور شیخ عثمان بھی اُسی زمانے میں ہوتے۔ ضیاءالدین برنی کا بیان ہے کہ علم بدیع و بیان، فقہ، اصولِ فقہ، اصولِ دین، نحو، تفسیر وغیرہ کے بعض اتنے جید علما دہلی میں موجود تھے جو بخارا، سمرقند، بغداد، قاہرہ، دمشق، اصفہان اور تبریز کے عالی مرتبت علما سے بھی زیادہ فاضل تھے۔ ان کے علاوہ چند منجم اور موسیقار بھی موجود تھے۔

تعلق خاندان

خاندان تغلق کا بانی سلطان غیاث الدین تغلق علما و فضلا کا بڑا قدردان تھا اور سرپرست تھا۔ اُس نے کئی ایک مدرسے قائم کئے اور علماء، شیوخ اور سادات کو وظائف عطا کئے۔ اُس کا جانشین محمد تغلق خود نہایت فاضل آدمی تھا اور اہلِ علم و دانش کا بڑا قدردان تھا۔ وہ علمِ ادبیات، منطق، فلکیات اور ریاضیات کے علوم پر عبور رکھتا تھا۔ فلسفہ یونان کا بڑا ماہر تھا۔ قرآن اور فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ کا حافظ تھا۔ یہ سلطان خود رائے تھا۔ اس لئے اس نے امرا کے مشورہ کے خلاف دیوگڑھی (دولت آباد) کو دہلی کی بجائے دارالحکومت بنایا اور دہلی کی آبادی کو وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علوم و فنون کا مرکز دہلی تباہ و برباد اور علما کا جمگھٹا بکھر کر رہ گیا۔

اس کے دربار میں ہزار شعرا اور ایک ہزار دو سو طبیب تھے۔ جب کھانے پر بیٹھتا تھا تو دو سو فقیہہ اُس کے دسترخوان پر ہوتے تھے جن سے وہ عالمانہ مذاکرات کیا کرتا تھا۔ تمام ملکی و غیر ملکی اہلِ کمال کی خبر گیری اور مدارت صدرِ جہاں اور کے سیکریٹریوں کے سپرد تھی۔ [1]

فیروز شاہ تغلق

محمد تغلق کا جانشین فیروز شاہ تغلق اپنی قدردانی، علم و فضل، فیاضی اور علم دوستی کے اعتبار سے سلاطین دہلی میں مثال نہیں رکھتا تھا۔ وہ خود صاحبِ علم و فضل تھا۔ اُس نے اپنی خودنوشت سوانح عمری "فتوحاتِ فیروز شاہی" کے نام سے مرتب کی۔ سلطان فیروز شاہ عطیات اور وظائف پر ایک کروڑ چھتیس لاکھ تنکہ صرف کرتا تھا۔

---

[1] مسلم ثقافت ہندوستان میں ... صفحہ ۹۴-۱۹۳

Marfat.com

جس میں سے چھتیس لاکھ تنکہ کی رقم علمائے دین کو عطا کی جاتی تھی۔ سلطان کو غلاموں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بہت شوق تھا۔ اس کے پاس اٹھارہ ہزار ایسے غلام تھے جن کی تعلیم و تربیت اور آرام و آسائش پر کافی روپیہ خرچ کیا جاتا تھا۔ سلطان فیروز شاہ خود "فتوحاتِ فیروز شاہی" میں رقمطراز ہے کہ اس نے بے شمار مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کیں اور مسجد معزالدین بدر سہ ایلتتمش، مقبرہ سلطان جلال الدین خلجی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کی مرمت کرائی اور ان کے مصارف اوقاف سے ادا کئے گئے۔ سلطان نے دہلی کے نزدیک کوٹلہ فیروز آباد کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا۔ جہاں ایک مدرسہ فیروز شاہی کے نام کا بھی قائم کیا۔ جو کہ حوضِ علائی کے نزدیک واقع تھا۔ جس میں یگانۂ روزگار اساتذہ اور فضلاء ادب اعلیٰ تعلیم دیتے تھے۔ طلباء کی رہائش کا باقاعدہ انتظام تھا۔ مدرسے کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔

فیروز شاہ نے ہندوؤں کی تعلیم و تربیت کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا اور انہیں عربی و فارسی سیکھنے پر راغب کیا۔ اس نے ہندوؤں کی کئی ایک کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ وہ کسی عالم و فاضل اور باکمال شخص کو قلاش و محتاج نہ دیکھ سکتا تھا۔ جو اہلِ کمال، علماء شرم اور نارسائی کی وجہ سے اپنی مفلسی اور احتیاج ظاہر نہ کر سکتے تھے۔ ان کے لئے کوتوال اور دوسرے حکامِ اضلاع کو حکم تھا کہ وہ ایسے مجبور و مستحق اشخاص کی فہرستیں مرتب کریں اور انہیں ملازمت دلانے کا مناسب بندوبست کریں۔

خاندانِ سادات

خاندانِ سادات کے پہلے بادشاہ تو بعض وجوہات کی بنا پر ترویج علوم کی طرف متوجہ نہ ہو سکے لیکن مبارک شاہی عہد میں علوم و فنون کی سرپرستی کی گئی۔ عہد سادات کے واقعات پر مشتمل کتاب "تاریخ مبارک شاہی" اسی عہد میں مرتب ہوئی۔ بعد ازاں بہلول لودھی نے آخری بادشاہ علاؤالدین شاہ سے دہلی چھین لی تو اس نے بدایوں جا کر کچھ مساجد، مقبرے اور مدرسے قائم کئے۔ اس طرح بدایوں علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔

خاندانِ لودھی

خاندانِ لودھی کا بانی بہلول لودھی گو خود تو چنداں تعلیم یافتہ نہ تھا، لیکن علماء کی صحبت کا بے حد مشتاق تھا اور انہیں عطیات و انعامات سے نوازتا رہتا تھا، "مآثرِ رحیمی" میں لکھا ہے کہ اس نے کئی ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کئے۔ اس کے جانشین سکندر لودھی نے آگرہ شہر کی بنیاد رکھی اور دارالحکومت کو دہلی سے آگرہ میں منتقل کیا تو آگرہ اربابِ کمال اور علماء کا مرکز بن گیا۔ اس نے نرواراور متھرا میں مدرسے قائم کر کے اور فوجی افسروں کو تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا حکم دے کر علم و ثقافت کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ سکندر لودھی مذہبی مباحث سننے کا بہت دلدادہ تھا۔ اس دور کا نمایاں ترین علمی و ثقافتی پہلو یہ ہے کہ ہندوؤں نے فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم کی تحصیل بھی شروع کر دی۔ سلطان کے حکم سے سنسکرت زبان کی بعض کتابوں کو فارسی زبان میں منتقل کیا گیا۔ اس کی علم دوستی اور فیاضی کی وجہ سے عرب، ایران، بخارا اور ہندوستان کے بہت سے علماء اس کے دربار کی زینت بن گئے ان میں سلطان کے وزیر میاں بھوہ کا نام قابلِ ذکر ہے جس نے مشہور طبی کتاب "طبِ سکندری" مرتب کی۔

سکندر لودھی کا جانشین ابراہیم لودھی اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا چونکہ امراء دربار اس کے خلاف تھے اس لئے وہ سیاسی بدامنی کی وجہ سے علوم و فنون کی سرپرستی نہ کر سکا۔ علوم و فنون کی ترویج و ترقی صرف دہلی

Marfat.com

تک ہی محدود نہ تھی بلکہ برصغیر میں جہاں کہیں بھی مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں، انہوں نے علم دوستی کی اسلامی روایات کو برقرار رکھا۔

فارسی یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں کوئی ایک ہزار سال تک فارسی کو برصغیر کی سرکاری اور درباری زبان ہونے کا شرف حاصل رہا اور تصنیف و تالیف اور تخلیقی ادب پر بھی اسی زبان کا قبضہ رہا۔ اسلامی آبادی کے بیشتر حصوں میں عام بول چال اسی زبان میں ہوتی تھی۔ اس طرح برصغیر میں فارسی کا علمی و ادبی درجہ بہت بلند ہو گیا۔ رفتہ رفتہ برصغیر کی صوبائی اور علاقائی زبانوں میں بھی اس زبان کے اثرات نفوذ کر گئے۔ کشمیری، پشتو اور بلوچی زبانیں تو اس ملک میں مسلمانوں کے ورود سے پیشتر بھی فارسی سے رابطہ رکھتی تھیں۔ حکمران طبقہ کی زبان ہونے کے باعث صوبائی زبانوں نے اس کے الفاظ کو اخذ کرنا موجبِ فخر خیال کیا۔ سلاطینِ دہلی نے سنسکرت زبان کی متعدد کتب کو فارسی میں اور مستند فارسی کتابوں کو سنسکرت میں منتقل کرایا۔ عہدِ سلاطین کی اکثر کتب فارسی زبان میں ملتی ہیں۔ مشہور صوفی شاعر امیر خسرو نے فارسی ادب کی ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

اردو اردو نے مستقل زبان کی حیثیت تو مغلوں کے عہد میں اختیار کی۔ لیکن اس کے نشوونما کا سنگِ بنیاد سلطنتِ دہلی کے زمانے ہی میں رکھا گیا تھا۔

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "لشکر" کے ہیں۔ سرحد، پنجاب، سندھ اور دکن کے باشندے اس امر کے مدعی ہیں کہ اردو زبان کا آغاز ان کے علاقوں سے ہوا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ برِّصغیر کے ہندوؤں سے نووارد مسلمانوں کے اختلاط اور ان کی زبانوں کے امتزاج سے جو ایک مشترک اور نئی زبان پیدا ہوئی، وہ اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ "اردو اپنے قواعد، نحوی تراکیب اور صوتیات کے اعتبار سے پنجابی اور ملتانی زبان سے بہت کچھ مشابہ ہے اور ہونی چاہیئے تھی۔ کیونکہ یہی وہ زبانیں ہیں جن کی بنیاد پر اردو کا قصر تعمیر ہوا۔ ملتانی بولی کو پنجابی اور سندھی کے درمیان ایک کڑی سمجھئے اور سرحد کے شہروں میں جو بولی "ہندکو" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے، وہ اصلاً پنجابی ہی ہے اور پشاور و لاہور کے لوگ ایک دوسرے کی بولی کو نہایت آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اردو ہندوستان کی انہی شمال مغربی زبانوں پر مبنی ہے۔ باقی رہا دکن کا دعویٰ تو اس میں شک نہیں کہ دکن میں سب سے پہلے اردو نظم و نثر کا آغاز ہوا۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہوئی کہ علاؤالدین خلجی کے فوجیوں نے فارسی آمیز ہندوستانی کو تیرھویں صدی کے اواخر میں وہاں رائج کیا اور پھر ۱۳۲۶ء میں محمد تغلق نے پایۂ تخت کو دہلی سے دولت آباد میں منتقل کیا تو یہ زبان دکن میں عام ہو گئی"[1]

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ فارسی و عربی الفاظ نے اس میں شان و شوکت پیدا کی اور سندھی الفاظ نے اس کی شیرینی اور جاذبیت میں اضافہ کیا۔ اردو کی پیدائش اور نشوونما کے حالات نے اس میں ایک انجذابی صلاحیت پیدا کر دی۔ جو زمانۂ مابعد میں اس کی ترقی کے لئے بہت معاون ثابت ہوئی اور مغلوں کے عہد میں وہ اپنی پختگی کو پہنچی۔ مغلیہ

---

[1] مولانا عبدالمجید سالک "مسلم ثقافت ہندوستان میں" صفحہ ۲۷-۵۲۶

Marfat.com

سلطنت کے بانی بابر نے اپنی توزک میں سب سے پہلے اس زبان کو اردو کے نام سے یاد کیا ہے۔ [1]

موسیقی عباسیوں کے دورِ عروج میں مسلمانوں نے موسیقی میں ایک شاندار روایت قائم کر لی تھی اور مسلم سلاطین بالخصوص اندلسی فرمانرواؤں نے اس فن کی حوصلہ افزائی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ اس طرح فنِ موسیقی بھی مسلم معاشرے کا ایک حصہ بن گئی۔ فارابی اور ابنِ سینا جیسے مفکرین اور حکماء نے فنِ موسیقی پر کتابیں تصنیف کیں، مسلمان برِصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے تو وہ یہ روایات اپنے ہمراہ لائے۔ دوسری طرف ہندوؤں کے ہاں بھی موسیقی کے ارتقاء اور اس کی اصلاح کی ایک طویل تاریخ موجود تھی۔ ان کا فن مقابلتاً زیادہ پُرپیچ تھا اور اس میں کافی محنت کی گئی تھی۔ چنانچہ برِصغیر میں ہندو مسلم موسیقی کا باہمی امتزاج ہوا۔ نتیجتہً بہت سے نئے سازوں کا اضافہ ہوا۔ اور مسلم موسیقاروں کی تخلیقی سرگرمیوں سے کئی ایک نئے راگ راگنیاں وجود میں آئیں۔ اس طرح فنِ موسیقی ایک نئے باب میں داخل ہوا۔ برِصغیر کی موسیقی کی متعدد دھنیں، ساز اور راگ آج بھی عربی اور ایرانی مطابقت کے غماز ہیں۔ مثلاً ایمن حجک، کافی، حسینی کانہڑا، وجے سلطان حسین شرقی والئے جونپور نے ایجاد کیا تھا) خیال، قول، ترانہ، چرخی، عشق پیچاں، ستار، دلربا، شہنائی، نائی، سرود اور رباب وغیرہ۔

سلاطینِ دہلی موسیقی کے بڑے رسیا تھے۔ سلطان بلبن کے عہد میں جب امیر خسرو کے زیرِ صدارت فنون ادب کی ترقی کے لئے مجالس قائم ہوئیں اور شہزادہ محمد نے ان کی سرپرستی اختیار کی تو ان مجالس میں علوم و ادب کے علاوہ موسیقی نے بھی فروغ پایا۔ جلال الدین خلجی کے زمانے میں بھی شعر و نغمہ میں نئی نئی ایجاد و اختراع اور اجتہاد کے سرآمدہ عصر امیر خسرو ہی تھے اور سلطان کی مجلس میں علم و فضل کے ساتھ موسیقی کا بھی چرچا رہتا تھا۔ اس زمانے کے بہترین گانے والے امیر خاصا اور حامد راجہ تھے اور سازندوں میں محمد چنگی اور فتو حاناصر خاں اور بیرو زنہایت باکمال اور نامور استاد مانے جاتے تھے۔ امیر خسرو بھی اکثر ان مجالس میں اپنے کلام یا موسیقی کا مظاہرہ کرتے اور ہر دفعہ انعام پاتے۔ [2] یہ زمانہ موسیقی میں تجدید و اجتہاد کا زمانہ تھا۔ اور اس کے مجتہد امیر خسرو تھے۔ جنہوں نے ہندوستانی موسیقی میں ایرانی موسیقی کا رنگ شامل کر کے اسے انتہائی کیف انگیز اور سحر طراز بنا یا۔ اکثر بڑے صوفیوں کے ہاں بھی موسیقی کا اہتمام کیا جاتا اور اسے متصوفانہ معرفت میں معاون سمجھا جاتا۔ قوالی، جس سے آج تک ہمارے فقراء صوفیاء کی محفلیں آباد ہیں، امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ جس کے متعلق علامہ اقبالؒ کا قول ہے کہ ہندی موسیقی نے مشرف بہ اسلام ہو کر قوالی کی صورت اختیار کی ہے۔ جون پور کے شرقی حکمران سلطان حسین شاہ نے موسیقی کی سرپرستی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ خود کئی ایک عمدہ دھنوں کا موجد اور اسرارِ موسیقی کا یکتائے روزگار استاد تھا۔

ہندوستانی موسیقی میں علم و فن کے استاد کو پنڈت کہتے تھے اس کے بعد گئی کا درجہ تھا جو اس سے بڑھے

---

[1] "پنجاب میں اردو" محمود شیرانی

[2] "تاریخ فرشتہ" صفحہ ۹۲-۲۹۲

Marfat.com

اس کو گندوب یا گندھرب کہا جاتا۔ پھر گائن اور پھر نائک کا مرتبہ تھا۔ جو کمالاتِ موسیقی کا بلند ترین رتبہ ہے[1]
اب تک ہندوستان کی موسیقی میں سات نائک گزرے ہیں۔ امیر خسرو، سلطان حسین شاہ شرقی، چنچل سین، باز بہادر فرمانروائے مالوہ، سورج خاں قوال، چاند خاں کبیر اور غلام رسول لکھنوی یعنی سات باکمال نائکوں میں صرف ایک ہندو اور باقی سب کے سب مسلمان ہیں[2]۔

مصوّری

برِصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے عروج سے قبل فنِ مصوری نے خاصا عروج حاصل کر لیا تھا جس کی ابتدا بھوج پتر اور کھالوں پر تصویر کشی سے ہوئی۔ قدیم تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بڑے بڑے باکمال مصوّر مندروں اور راج محلوں کی دیواروں پہ تصویریں کھینچتے تھے اور یہ فن چتر وِدّیا کہلاتا تھا۔
مسلمانوں نے برِصغیر میں داخل ہونے کے بعد دیگر فنون کی طرح فنِ مصوّری میں بھی دلچسپی لی اور مصوروں کی حوصلہ افزائی کے لئے کافی روپیہ خرچ کیا۔ لیکن انہوں نے محلات اور دیگر عمارات کی دیواروں اور چھتوں پر آرائشی تصاویر پر ہی اکتفا کیا۔ ایلتتمش کے زمانے کا ایک مؤرخ تاج رضا لکھتا ہے کہ جب دہلی میں خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کا سفیر سلطان کے لئے خلعت لے کر آیا تو اس کی پذیرائی کے لئے شہر کو خوب سجایا گیا اور اس سلسلے میں بہت سی دیواری تصاویر کھچوائی گئیں۔ فیروز شاہ تغلق نے بھی فنِ مصوّری کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن اس نے محلات کی دیواروں پر جانداروں کی تصاویر بنانے کی ممانعت کر دی اور صرف باغات اور دیگر قدرتی مناظر وغیرہ کی تصویریں بنانے کا حکم دیا۔ مشہور مورخ عفیف کی مشہورِ زمانہ تصنیف "تاریخِ فیروز شاہی" میں اس زمانے کی دیواری تصویروں اور پیتل، تانبے، چاندی اور سونے کی چیزوں کی منقوشات کا ذکر ملتا ہے۔ شاہی جھنڈوں پر چم بھی گوناگوں تصاویر سے مزین کئے جاتے تھے۔
بعض سلاطینِ دہلی نے احکامِ شریعت کی بناء پر جانداروں کی تصاویر کو ممنوع قرار دیا۔ برصغیر کی مصوری میں کتابی تصویر کا اضافہ جسے انگریزی میں (MINIATURE) کہتے ہیں، مسلمانوں ہی کے فنی اور جمالیاتی ذوق کا کارنامہ ہے۔ مسلمان یہ فن ایران سے لائے تھے۔ مسلمانوں نے اس فن میں بدرجۂ غایت کمال پیدا کیا اور بے شمار ایسی کتابیں لکھیں، جن کے ایک ایک صفحہ پر خطاطی کے ساتھ ساتھ نقاشی اور مصوّری کے کمالات کا اظہار کیا گیا۔

فنِ تعمیر

ایک ترقی یافتہ اور متمدّن و مہذّب قوم کی حیثیت سے مسلمان برِصغیر میں اپنی مخصوص تعمیری روایات بھی لائے۔ انہیں فنونِ لطیفہ سے فطری طور پر گہرا لگاؤ تھا۔ برِصغیر میں جب انہیں عمارات تعمیر کرنے کی ضرورت پڑی تو ان کا تربیت یافتہ ذوقِ سلیم رہبر بنا۔ اور انہوں نے محلات، ایوانات اور مساجد تعمیر کروانی شروع کیں۔ اس سے برصغیر میں اسلامی فنِ تعمیر کی بنیاد پڑی۔ ابتدائی دور کے مسلم فاتحین جو برصغیر میں وارد ہوئے، سپاہیوں کا ایک گروہ تھے۔ وہ قلیل تعداد میں یہاں آئے تھے اور بہت کم فنکار اپنے ساتھ

---

[1] "غنچۂ راگ" نواب مراد علی خاں مراد آبادی
[2] " راگ درپن" فقیر اللہ

Marfat.com

لائے تھے، لہٰذا ابتدا میں انہیں مقامی ہندو فنکاروں سے کام لینا پڑا۔ یہ فنکار ہندو دوانہ تعمیراتی روایات کے عادی تھے۔ اسی لئے سلاطینِ دہلی کی ابتدائی عمارات میں ہمیں جابجا ہندو تمدن اور ہندو فنِ تعمیر کے اثرات نظر آتے ہیں۔ لیکن جلد ہی ہندو مسلم تمدن اور طرزِ تعمیر کے امتزاج سے ایک نیا تمدن اور ایک جدید طرزِ تعمیر عالمِ وجود میں آیا جس کو بعض مؤرخین نے انڈو مسلم فنِ تعمیر کے نام سے یاد کیا ہے۔ لیکن اس استدلال میں زیادہ جان نہیں۔ کیونکہ برِصغیر کی اسلامی عمارات دراصل اسلامی فنِ تعمیر کی ہی مظہر ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برِصغیر میں مسلم اقتدار کے زمانۂ آغاز میں مقامی ہندو فنکاروں کی وجہ سے کچھ عرصہ تک ان میں ہندو دوانہ طرزِ تعمیر کی آمیزش رہی لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ اثر کم ہوتا چلا گیا۔ برِصغیر میں مسلمانوں کے ابتدائی طرزِ تعمیر کی حیثیت ہر لحاظ سے منفرد تھی اسے اسلامی فنِ تعمیر کہنا ہی زیادہ صحیح ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے طرزِ تعمیر میں بنیادی طور پر بڑا فرق ہے۔

فنِ تعمیر کسی قوم کی نفسیاتی، معاشرتی اور مذہبی خصوصیات کا مظہر ہوتا ہے۔ برِصغیر پاک و ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعمیرات کے درمیان جو تفاوت نمایاں ہے وہ ان دونوں قوموں کی طبعی خصوصیات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ اسلامی فنِ تعمیر کے مختلف خدوخال کا جائزہ لیا جائے۔

۱۔ اسلامی عمارات نہ صرف کشادہ اور خوش منظر ہوتی ہیں بلکہ روشنی، وسعت، عظمت، بلندی اور ہواداری کے محاسن بھی لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ جن سے مسلمان قوم کے خصائصِ طبعی واضح ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندو دوانہ عمارات پیچیدہ و پُراسرار اور تنگ و تاریک ہوتی ہیں۔ جن میں روشنی اور ہوا کا انتظام مفقود ہوتا ہے۔

۲۔ سلاطینِ دہلی نے اپنی عمارات میں سادگی اور باہمی تناسب کا خاص خیال رکھا۔ اور ہندو دوانہ طرزِ آرائش و تزئین یعنی عمارتوں میں اندر اور باہر دیوی اور دیوتاؤں کی مورتیاں بنانے کو ترک کر دیا۔ انہوں نے آرائش و زیبائش کے سلسلے میں خوشنویسی اور کتبوں سے عمارات کو سجایا۔ علاوہ ازیں مساجد کی محرابوں پر آیاتِ قرآنی کندہ کروائیں اور رنگدار بوٹوں اور خطوط سے تزئین کا کام لیا۔

۳۔ ستون اور کڑیوں کی چھت ہندو عمارات کا ایک جزو تھا۔ ان کے دروازے بغیر محراب کے بالکل سیدھے سادھے تھے۔ اور ان کی عمارتوں میں گنبد کا نام و نشان تک نہ ہوتا تھا۔ لیکن اسلامی عمارات کی خصوصیات میں گنبد، محراب، چھت دار محراب اور مینار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عہدِ سلاطین کے آخری حصے میں دوہرے گنبد کی تعمیر کا بھی آغاز ہوا۔ پہلے ایک پست گنبد بنایا جاتا جس کے نیچے کی زیبائش و آرائش اندر سے نظر آتی۔ اس پر ایک اونچا گنبد بنا دیا جاتا۔ جو باہر سے نہایت جاذبِ نظر ہوتا۔ دونوں گنبدوں کے درمیان خلا ہوتا تھا۔

۴۔ مسلمان عمارات کی عام حیثیت میں حسن پیدا کرنے کا زیادہ اہتمام کرتے اور آرائشوں سے صرف اس وقت کام لیتے تھے جب عمارات کے عام حسن میں اضافہ مقصود ہوتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس ہندو اپنی ہنرمندی اور جدت کا پورا زور آرائش پر صرف کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عمارتوں

Marfat.com

میں سجاوٹ کے لئے شوخ رنگوں کی بھرمار ہوتی ہے اور دیواریں سر سے پاؤں تک آرائشوں سے اٹی ہوتی ہیں۔

۵۔ اسلامی عمارات میں خطا بالعموم عمودی ہوتے ہیں۔ جو کہ عمارات کی رفعت کو نمایاں کرتے تھے۔ اس کے برعکس ہندو عمارات کے خطوط عموماً افقی ہوتے تھے۔

۶۔ برِصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے فن تعمیر نے جو نئی چیز پیدا کی اور جس سے ہندو بالکل بے بہرہ تھے، وہ عمارات میں چونے کا استعمال تھا۔ مسلمانوں نے انہیں عمارات کو جوڑنے والے مسالے سے شناسا کیا۔ کو مسلمانوں نے ہندو طرزِ تعمیر کی بعض خوبیاں بھی اختیار کیں۔ لیکن ان کو اپنے فنِ تعمیر میں ایسا سمویا کہ وہ اس فن کا جزوِ لاینفک ہو کر رہ گئیں اور ہند و مسلم فنِ تعمیر کا امتزاج مسلم فن تعمیر ہی قرار پایا۔

خاندانِ غلاماں کے عہد کی عمارات

سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی میں سلطان معزّالدین محمد غوری بن سام کے نائب کی حیثیت سے عنانِ اقتدار سنبھالی تو دہلی میں نئی عمارات کی ضرورت پڑی اگرچہ ابتداء میں ہندوؤں کی عمارتوں میں کچھ تبدیلی کر کے کام چلایا گیا تاہم نئی عمارتیں بھی تعمیر کی گئیں۔ اس دور کی تمام عمارتوں میں اینٹ، پتھر اور چونا سب کا سب ہندوؤں کی عمارتوں کا ہے۔ بتوں کی تصاویر والے پتھروں کو الٹا کر کے لگایا گیا۔ کیونکہ مقامی معمار سمجھانے کے باوجود صحیح طرز کا گنبد تعمیر کرنے سے قاصر رہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کے گنبد بغیر گردن کے ہیں۔ چھت اور ستونوں پر ہندوؤں کی آرائش اور نشانات بدستور موجود رہے۔ اس دور کی مشہور عمارات مندرجہ ذیل ہیں:۔

مسجد قوۃ الاسلام: سلطان قطب الدین ایبک نے فتح دہلی کے بعد جو سب سے پہلی عمارت بنوائی، وہ مسجد قبۃ الاسلام[1] تھی، جو مہرولی میں قطب مینار کے پاس واقع ہے۔ اس میں زیادہ تر گرد و نواح کی ہندو عمارات کا ملبہ صرف ہوا۔ اس کے ستونوں پر اب بھی ہندو مورتیوں کے نیم شکستہ آثار دکھائی دیتے ہیں۔ یہ عمارت مقامی معماروں اور کاریگروں کی مدد سے وجود میں آئی۔ اس مسجد کے ستون قدیم مندروں کے ستونوں کی طرز پر ہیں۔ قطب الدین ایبک کی خواہش تھی کہ اسلامی فن کی خصوصیات اس مسجد میں موجود ہوں۔ یعنی گنبد اور محرابوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہو۔ مگر ہندوستانی معمار صحیح گنبد اور صحیح محراب سے واقف نہ تھے۔ جب مسجد پایۂ تکمیل کو پہنچی تو سلطان کو اس کی ہیئت بہت اجنبی معلوم ہوئی۔ چنانچہ اسے اسلامی رنگ دینے کے لئے وسطی دالان کے آگے ایک نہایت خوبصورت اور منقش جالی لگائی گئی اور بخطِ طغرا آیاتِ قرآنی بھی ثبت کر دی گئیں۔

قطب الدین ایبک کے بعد سلطان ایلتتمش نے اس مسجد کی توسیع و آرائش کی اور اس نے دالان کے آگے

---

[1] یہ عام طور پر مسجد قوۃ الاسلام کے نام سے مشہور ہے۔ گو یہ نام بھلا لگتا ہے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ دہلی کو سلطنت کے پایۂ تخت ہونے کی بناء پر قبۃ الاسلام کہتے تھے اور اسی مناسبت سے اس مسجد کا نام قبۃ الاسلام ہے۔

Marfat.com

ایک محراب دار مقصورہ تعمیر کرایا۔ یہ مقصورہ برِصغیر میں صحیح معنوں میں اسلامی فنِ تعمیر کا اوّلین مظہر ہے۔ علاؤالدین خلجی نے بھی اس مسجد میں مزید توسیع کی اور اسے مزید جاذبِ نظر بنایا۔

قطب مینار:۔ یہ مینار مسجد قبۃ الاسلام کے متصل واقع ہے اسے سلطان قطب الدین ایبک نے شروع کیا اور ایلتتمش نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس مینار کا اسلوبِ تعمیر، اس کی نقاشی و خطاطی اور اس کی عمودی رفعت اس کے خالص اسلامی تعمیر ہونے کی مظہر ہے۔ مشہور ماہرِ آثارِ قدیمہ سر جان مارشل نے ہندو مؤرخین کے اس موقف کی تردید کی ہے کہ قطب مینار اصلاً ہندوانی تعمیر کا شاہکار ہے۔ سر جان مارشل نے لکھا ہے کہ اس مینار کی تعمیر کا پورا منصوبہ اور ساخت و آرائش ہر پہلو سے قطعاً اسلامی ہے اور یہ عظیم عمارت مسلمانوں کی قوت و شوکت کے اظہار کا نہایت موزوں اور مرعوب کن شاہکار ہے۔ اس کے کتبوں کا نظم و ضبط اور حسن و جمال بے مثال ہے۔

یہ مینار مخروطی شکل کا ہے۔ اس کی اونچائی ۲۴۲ فٹ ہے۔ اس وقت اس کی پانچ منزلیں موجود ہیں۔ آخری منزل جو چھتری نما تھی، بجلی کے گرنے سے تباہ ہو گئی۔ فرش پر اس کا قطر ۴۸ فٹ ۴ انچ ہے۔ لیکن آخری منزل کا قطر صرف ۹ فٹ ہے۔ سیڑھیاں خوب کشادہ ہیں اور دیواروں میں روشنی کے لئے جھروکے ہیں۔ اوپر تلے چار بڑے چھجے بادشاہ نشین ہیں۔ پہلا ۹۷ فٹ پر، دوسرا ۱۴۸ فٹ پر، تیسرا ۱۸۸ فٹ پر اور چوتھا ۲۱۴ فٹ کے فاصلے پر ہے۔ یہ مینار برِصغیر کی اسلامی یادگاروں میں منفرد و ممتاز حیثیت رکھتا ہے بعض مؤرخین اس مینار کو فتحِ دہلی کی یادگار کہتے ہیں۔ عوام اسے سلطان قطب الدین ایبک کے نام کی نسبت سے قطب مینار یا قطب شاہ کی لاٹھ کہتے ہیں۔ بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ اس مینار کا نام اس دور کے مشہور ولی اللہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نام سے مشہور ہوا۔

اڑھائی دن کا جھونپڑا:۔ قطب الدین ایبک کی تعمیر کردہ عمارات میں ایک اور مشہور عمارت اجمیر کی مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ مثلاً یہ مسجد محض اڑھائی دن میں تعمیر ہوئی۔ یا یہ کہ مرہٹوں کے زمانے میں یہاں اڑھائی دن کا ایک میلہ لگتا تھا۔ یہ مسجد طرزِ تعمیر میں بالکل دہلی کی مسجد قبۃ الاسلام کی طرح ہے۔ آرائش اور طرزِ تعمیر کے اعتبار سے یہ کوہ آبو کے جین مندر سے بھی کچھ مشابہ ہے۔ اس کے گنبد اور ستون نہایت متناسب اور خوبصورت ہیں۔ چھت کی نقاشی بھی بڑی دیدہ زیب ہے۔ صحن کے آگے سات محرابیں ہیں۔ مرکزی محراب ۲۲ فٹ ۲ انچ چوڑی ہے۔ ان محرابوں پر کوفی اور طغرا طرز کی آرائش بے مثل ہے۔

مقبرۂ ایلتتمش:۔ سلطان ایلتتمش کا مقبرہ مسجد قبۃ الاسلام کے شمال مغربی گوشے کے پیچھے واقع ہے۔ یہ سنگِ سرخ کا بنا ہوا ہے۔ اگرچہ اب اس کی چھت باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن اس کے حسنِ تعمیر میں کوئی کلام نہیں۔ اس کی دیواروں اور قبر کے بلند تعویز پر باریک نقاشی کے علاوہ آیاتِ

Marfat.com

قرآنی بھی کندہ ہیں۔ یہ برصغیر پاک و ہند میں سب سے پرانا مقبرہ ہے۔

مقبرۂ بلبن :- دہلی میں سلطان غیاث الدین بلبن کا مقبرہ اسلامی طرزِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ مقبرہ کے داخلی دروازہ کی محراب اپنی نوعیت کی منفرد محراب ہے اور برصغیر میں ترکوں کی تعمیر کردہ سب محرابوں سے بہتر۔ دیدہ زیب اور بے مثل حیثیت کی حامل ہے۔

خلجی دور کی عمارات

سلطان علاؤالدین خلجی ایک عظیم فاتح اور بلند پایہ حکمران ہونے کے علاوہ فنِ تعمیر کا بھی دلدادہ تھا۔ اس کا دور تہذیب و تمدن کی ترقی کے لحاظ سے تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اس کے دور میں فنِ تعمیر نے بہت ترقی کی۔ اسی بنا پر خلجی دور کی عمارات طرزِ تعمیر کے اعتبار سے خاص نوعیت کی ہیں۔ ان کے گنبد نہایت گول اور خوبصورت ہیں۔ محرابیں متناسب اور زیبائش عمدہ ہے خلجی عہد کی عمارات کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

علائی دروازہ :- سلطان علاؤالدین خلجی مسجد قبۃ الاسلام کو ایک وسیع اور عظیم الشان مسجد میں تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے لئے اس نے سنگ سرخ سے ایک رفیع الشان دروازہ تعمیر کروایا۔ جو علائی دروازہ کے نام سے مشہور ہے گو یہ ایک چھوٹی سی عمارت ہے۔ لیکن بلاشبہ پاک و ہند میں حسنِ تعمیر کا ایک بے مثل شاہکار ہے۔ اس میں اسلامی فنِ تعمیر کی نفاست اور تعمیر کی پختگی دونوں بدرجۂ کمال موجود ہیں۔ اس کی ڈیوڑھی کی چھت، داخلہ کی محراب اور دیواروں کی بیرونی سطح کی آرائش نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ اس میں سنگ سرخ اور مرمر کی آمیزش بہت بھلی لگتی ہے۔ داخلی محراب خوشنما کنگورہ کی ایک جالی سے مزین ہے۔ گنبد سڈول اور خاصا بڑا ہے۔ مجموعی لحاظ سے یہ عمارت تناسب، تعمیری حسن اور عثمانی دلکش تصویر ہے۔

مسجد جماعت خانہ :- سلطان علاؤالدین کے لڑکے خضر خاں نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء سلطان المشائخ کے مدفن کے لئے ایک رفیع الشان گنبد تعمیر کروایا۔ لیکن حضرت سلطان المشائخ کے ناپسند کرنے پر شہزادے نے اس کے دائیں بائیں دو کمروں کا مزید اضافہ کر کے اسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ جو مسجد جماعت خانہ کے نام سے مشہور ہے اور یہ دورِ سلاطین کے اسلامی فنِ تعمیر کا ایک نادر شاہکار ہے۔ مسجد کا درمیانی کمرہ بہت بلند اور وسیع ہے اور اس کے اوپر ایک خاصہ بڑا گنبد ہے۔ داخلہ کی محراب تعمیری حسن کی ایک مرصع تصویر ہے۔ پوری عمارت سنگِ سرخ کی ہے۔

تغلق دور کی عمارات

تغلق عمارات میں خلجی عمارات کی شان و شوکت اور سطوت و آرائش مفقود ہے۔ تاہم ان کی مضبوطی اسلامی فنِ تعمیر کا ایک نمایاں پہلو ہے اس دور میں اسلامی فنِ تعمیر اپنی پختگی کو پہنچا۔ چونہ کا مسالہ اور کنکریٹ کا استعمال اب عام ہو گیا تھا۔ گنبدوں، محرابوں اور ڈاٹ کی چھتوں کا رواج بھی عام ہو گیا۔ ملتانی طرز کے مطابق دیواروں اور ستونوں میں ڈھلان کا رکھنا

Marfat.com

تاکہ عمارت کے رعب میں اضافہ ہو تغلق دور کے فن تعمیر کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

غیاث الدین تغلق کا مقبرہ:- محمد تغلق کے قلعہ عادل آباد کے کھنڈرات میں سلطان غیاث الدین تغلق مہرولی سے چند میل کی مسافت پر غیاث الدین تغلق کے قلعہ تغلق آباد اور کا مقبرہ واقع ہے۔ جس کے گرداگرد فصیل نما دیوار ہے۔ دروازہ پُرشکوہ اور عالیشان ہے۔ مقبرہ کے چاروں طرف ایک مصنوعی جھیل تھی جو اب خشک پڑی ہے۔ یہ ایک پہاڑی ٹیلہ پر واقع ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ محمد تغلق کے زمانے میں اسے بطور خزانہ استعمال کیا جاتا تھا۔ عمارت سنگِ سرخ سے تعمیر کی گئی ہے۔ لیکن کہیں کہیں سنگ مرمر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ گنبد سنگِ مرمر کا ہے۔ خاصا بلند ہے۔

جہاں پناہ:- سلطان محمد تغلق نے دہلی اور اس کی نواحی بستیوں کے دفاع کے لئے ایک مضبوط فصیل تعمیر کروائی جسے جہاں پناہ کہتے ہیں۔ جس کے آثار اب بھی دہلی کے باہر پائے جاتے ہیں۔ جہاں پناہ کے اندر سلطان نے ہزار ستونوں والا ایک عالیشان ہال تعمیر کروایا۔ جہاں شاہی دربار منعقد ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں محمد تغلق نے شہر کے اندر ایک ٹیلے پر اپنے لئے ایک محل بھی تعمیر کروایا۔ جس کا نام بدیع منزل تھا اور جو اب بجے منڈل کے نام سے مشہور ہے۔

بیگم پوری مسجد:- سلطان محمد تغلق نے بدیع منزل کے قریب بیگم پوری نامی ایک وسیع مسجد تعمیر کروائی۔ اس مسجد میں سلطان کے نماز پڑھنے کے لئے ایک علیحدہ گیلری کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں جانے کے لئے شمال مشرق کی جانب ایک الگ راستہ ہے۔ مسجد کے درمیان صحن ہے اور چاروں طرف مسقف دالان ہے۔ ہر دالان پر علیحدہ چھوٹا سا گنبد ہے۔ چھت پر چھوٹے چھوٹے پست حجم کے گنبد ہیں جو تغلق دور کے فنِ تعمیر کے ایک اہم پہلو کی غمازی کرتے ہیں۔

فیروز تغلق کی عمارات:- سلطان فیروز شاہ تغلق کو عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا دہلی میں جا بجا اس کی عمارتوں کے آثار ملتے ہیں۔ اس نے متعدد شہر آباد کئے۔ جن میں فیروز آباد (دہلی)، جونپور، حصار فیروزہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کی سب سے اہم یادگار کوٹلہ فیروز آباد ہے جو فیروز شاہ کا قلعہ تھا۔ یہیں پر مسجد فیروز آباد ہے جو اپنے زمانے کی ایک عالیشان عمارت تھی۔ امیر تیمور نے اس مسجد کو اس قدر پسند کیا کہ اس جیسی مسجد سمرقند میں بنانے کا تہیہ کیا۔ سلطان فیروز شاہ نے عمارات کے علاوہ بے شمار نہریں باغات، مقبرے، حوض، مسجدیں اور مدرسے تعمیر کرائے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے فیروز شاہ کی عمارتیں کم درجہ کی ہیں۔ ان میں چھوٹی اینٹ استعمال کی گئی ہے۔ جس کے سبب عمارتوں میں حسن و رعنائی اور تناسب کا معیار قائم نہیں رہ سکا۔ سلطان نے حوض علائی کے قریب مدرسہ فیروز شاہی تعمیر کیا جو آج کل کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے۔ دہلی میں سلطان کے وزیر خاں جہاں مقبول نے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے متصل ایک مسجد تعمیر کروائی۔ جو کالی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اور جو اب شکستہ حالت میں ہے۔ اس مسجد کا طرز تعمیر عام مساجد سے

Marfat.com

مختلف ہے۔ موضع کھڑکی (دہلی) میں واقع کھڑکی مسجد کا طرز تعمیر بھی البساہی ہے۔ ان مساجد کے صحن کو محرابوں کے ذریعے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

قطب مینار کے نواح میں حوض علائی کے کنارے سلطان فیروز شاہ کا مقبرہ واقع ہے جو نہایت سادہ اور مربع شکل کا ہے۔ اس کا گنبد چھوٹا مگر نہایت دیدہ زیب ہے۔ مقبرہ خاں جہاں تلنگانی فیروز شاہ کے دور کا ایک دوسرا نہایت خوبصورت مقبرہ ہے۔ یہ بستی نظام الدین اولیاء میں واقع ہے اور فن تعمیر اور آرائش کے لحاظ سے مقبروں کے طرز تعمیر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہشت پہلو ہے اور اس کے اردگرد ہشت پہلو برآمدہ ہے۔ اس کے ہر پہلو کے اوپر چھتری بنی ہوئی ہے۔ اور برآمدہ کی چھت کے ساتھ چھجہ ہے۔ یہ دہلی میں اپنی طرز کا پہلا مقبرہ ہے۔

سید اور لودھی دور کی عمارات

سادات اور لودھی سلاطین کا عہد سلطنت دہلی کا دور انحطاط تھا۔ ان کا بیشتر وقت لڑائیاں اور بغاوتیں فرو کرنے میں گزرا۔ ان کے ذرائع آمدنی بھی محدود تھے۔ اس لئے وہ فن تعمیر کے لحاظ سے منفرد حیثیت کی عمارات تعمیر نہ کروا سکے تاہم اس دور میں مقبروں کے طرز تعمیر میں ایک نئی جدت پیدا ہوئی۔ اور ہشت پہلو مقبروں کی تعمیر کا رواج عام ہو گیا۔ سادات خاندان کی عمارتوں میں مبارک شاہ سید اور محمد شاہ سید کے مقبرے قابل ذکر ہیں۔ یہ سب ہشت پہلو ہیں۔ اس کے اردگرد برآمدے ہیں۔ برآمدہ کے ہر پہلو پر ایک چھتری (برجی) ہے۔ درمیانی گنبد اگرچہ پست اور گولائی میں کم ہے لیکن اس کے کندھے کافی بلند رکھے گئے ہیں تاکہ نمایاں نظر آسکے۔ اس میں آرائش اور سجاوٹ کا خاص اہتمام ہے۔

لودھی عمارات میں تغلق عہد کی عمارات کی بہ نسبت آرائش زیادہ ہے۔ لیکن آرائش میں نفاست کی کمی ہے ان عمارات میں آرائش کے لئے رنگین ٹائلوں کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔

مقبرہ سکندر لودھی:۔ لودھی سلاطین کی عمارات میں سکندر لودھی کا مقبرہ اس دور کے فن تعمیر کا ایک نادر شاہکار ہے۔ گو یہ مبارک شاہ سید اور محمد شاہ سید کے مقبروں کی طرز پر بنایا گیا ہے لیکن اس میں چند ایک جدتیں بھی پیدا کی گئی ہیں۔ جن کے باعث صغیر میں اسلامی فن تعمیر ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ اس میں پہلی بار اکہرے گنبد کی جگہ دوہرا گنبد بنایا گیا۔ اس سے مقبرہ پُرشکوہ اور عالیشان ہو گیا۔ علاوہ ازیں مقبرہ کے چاروں طرف ایک وسیع احاطہ ہے۔ جس کے چاروں کونوں پر ہشت پہلو چھتریاں (برجیاں) ہیں۔ اس کا داخلی دروازہ بہت بلند اور پُرشکوہ ہے۔ سکندر لودھی کا مقبرہ ملاشہ مغل بادشاہوں کے رفیع الشان مقبروں کے لئے نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

Marfat.com

امتحانی سوالات

۱۔ عہدِ سلاطین میں علم و ادب کی ترقی و ترویج کا عہد بہ عہد حال بیان کیجئے۔

۲۔ عہدِ سلاطین میں فارسی اور اردو کے ارتقاء و عروج کا تذکرہ کیجئے۔

۳۔ فنِ مصوری اور موسیقی کی ترقی و ترویج میں سلاطینِ دہلی کی دلچسپی کا ذکر کیجئے۔

۴۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلامی فنِ تعمیر کے ارتقاء کا حال بیان کرتے ہوئے عہدِ سلاطین کی عمارات کا ذکر کیجئے۔

۵۔ اسلامی فنِ تعمیر کی نمایاں خصوصیات قلمبند کیجئے۔ نیز ہندو فنِ تعمیر سے ان کا موازنہ کیجئے۔

۶۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھئے۔

امیر خسرو۔

مسجد قبۃ الاسلام۔

قطب مینار۔

مسجد جماعت خانہ۔

علائی دروازہ۔

مقبرۂ غیاث الدین تغلق۔

مقبرۂ خان جہاں تلنگانی۔

مقبرۂ سکندر لودھی۔

Marfat.com

تیرھواں باب

معاشرتی و اقتصادی حالات

ا۔ معاشرتی حالات

برّصغیر پاک و ہند میں اسلامی معاشرے کی بنیاد سلاطینِ دہلی کے دور میں پڑی۔ اس سے پیشتر جتنے حملہ آور برّصغیر میں داخل ہوئے، خواہ وہ یونانی تھے یا ایرانی، کوشان تھے یا ہُن، سب کے سب بالآخر ہندی معاشرے میں مدغم ہو گئے لیکن مسلمان حملہ آور اپنی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ چونکہ اسلامی عقائد و فلسفہ کی ہندی عقائد و فلسفہ سے کوئی مشابہت و مطابقت نہ تھی۔ اس لئے اسلامی تہذیب و تمدّن کی جداگانہ حیثیت ہر لحاظ سے برقرار رہی۔ شمال مغربی راستے سے برّصغیر میں آنے والے بیشتر مسلمان حملہ آور ترک نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ عہدِ سلاطین میں اعلیٰ مسلم طبقہ پانچ حصّوں میں منقسم تھا۔ اوّل ترک امراء، جو حکومت میں عمل دخل رکھتے تھے۔ دوم علماء، جو اپنی علمی فضیلت کی وجہ سے معاشرہ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ سوم مشائخ و صوفیہ کرام، جن کے پیشِ نظر صرف تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا کام تھا۔ چہارم سلوات، جو آلِ رسولؐ ہونے کی وجہ سے باعثِ احترام تھے۔ پنجم خان، ملک و امیر — جو ملکی سیاسیات میں حصّہ لیتے تھے۔ مسلم معاشرے میں ہر شخص کے لئے ترقی کے یکساں مواقع موجود تھے۔ عہدوں کی تقسیم میں استحقاق کے اصول کو مدِّ نظر رکھا جاتا تھا۔ ایک غلام بھی اپنی صلاحیتوں کی بنا پر تختِ شاہی پر متمکّن ہو سکتا تھا۔

مسلم اُمراء معاشرہ میں سلطان کے بعد اہم ترین طبقہ مسلم امراء پر مشتمل تھا۔ جس میں صوبائی گورنر، مختلف شعبہ جات کے سربراہ اور مرکزی و صوبائی حکام شامل تھے۔ ممتاز ترین امراء خان کہلاتے تھے۔ ذی اثر امراء میں سے بالعموم صرف ایک کو الغ خاں یا خانِ اعظم کا امتیازی خطاب سے نوازا جاتا تھا۔ جیسا کہ بلبن کو الغ خاں کا خطاب ملا تھا۔ ان کے بعد دوسرے اور تیسرے درجہ میں علی الترتیب ملک اور امیر تھے۔ سلاطینِ دہلی کے دربار میں اس سے نیچے امراء کا اور کوئی درجہ نہ تھا۔ ان کے بعد فوجی عہدیدار، سپہ سالار اور سرخیل تھے۔

حکومت مسلم امراء کو ان کی خدمات کے صلے میں اقطاع (جاگیریں) عطا کرتی تھی۔ بعض مؤرخین نے ان مسلم امراء کو فرونِ وسطیٰ کے یورپی فیوڈل لارڈز سے مشابہت دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ نظریہ غلط ہے۔ کیونکہ ان کی وہ حیثیت نہ تھی جو یورپ میں لارڈز کی تھی۔ نہ ان کی جاگیریں (اقطاع) موروثی نوعیت کی تھیں اور نہ ہی ان کی اپنی حیثیت موروثی تھی۔ وہ صرف اس وقت تک زمین سے استفادہ کرنے کے مستحق تھے۔ جب تک وہ حکومت کی خدمات انجام دیتے رہتے۔ سلاطینِ دہلی کا ہے بگا ہے امراء (اقطاع داروں) کے تبادلے بھی کرتے رہتے

Marfat.com

تھے اور اس طرح ان کے اقطاع بھی بدلتے رہتے تھے۔ امرا دِ حکومت کے ملازم ہوتے تھے۔ وہ جاگیروں کی آمدنی سے اپنے سپاہیوں کو تنخواہیں ادا کرتے اور اپنے اخراجات پورے کرتے تھے۔

مسلم امراء کے علاوہ لوگوں کا ایک اور طبقہ بھی تھا جو خوشحالی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ طبقہ حکام، تجار، اساتذہ، اطبّاء، شعرا اور فنکاروں پر مشتمل تھا۔ پیشہ ور لوگ اپنے مخصوص محلّوں میں رہتے تھے جو ان کے پیشہ کے نام سے منسوب تھے۔ مثلاً جولاہوں کا محلہ، کمہاروں کا محلّہ، زرگروں کا محلہ، بہرحال مسلم عوام زیادہ تر شہروں میں سکونت پذیر تھے اور ان کی اکثریت فوج میں ملازم تھی۔

مسلمانوں کی مجلسی زندگی

مسلمان اپنی روایات اور رسوم اپنے ساتھ لائے۔ ٹوپی یا پگڑی، کرتا، شرعی پائجامہ (شلوار) مسلمانوں کا عام لباس تھا۔ سردیوں میں حسبِ استطاعت گرم کپڑے پہنتے یا کمبل اور شالیں اوڑھتے۔ سلاطینِ دہلی سر پر کلاہ تاتاری پہنتے تھے۔ جلال الدین خلجی دستار پہنتا تھا۔ امرا علی العموم سلاطین ہی کا لباس پہنتے تھے۔ لیکن درباروں کے مواقع پر کلاہ تاتاری اور مخمل کی زردوزی قبا پہنتے اور سفید پیٹی باندھتے تھے۔ زیر جامہ اور شب خوابی کا لباس پہننے کا رواج عام تھا۔ علماء قبا و عمامہ اور درویش قلنسوہ (فقیروں کی مخصوص ٹوپیاں) پہنتے۔

تمام مسلمان گوشت خور تھے۔ خمیری روٹی (خصوصاً تنوری) کباب اور پلاؤ ان کی عام خوراک تھی۔ جب انہوں نے ہندوؤں کو روغنی پوری تلتے دیکھا تو پراٹھا ایجاد کر لیا۔ اس کے علاوہ قورمہ، متنجن، پلاؤ وغیرہ متمول مسلم گھرانوں کے مشہور پکوان تھے۔ لیکن ان کی تیاری میں بھی مقامی تہذیب اثر انداز ہو چکی تھی۔ مثلاً ان کھانوں میں مرچ مصالحے کا استعمال زیادہ ہو گیا تھا۔ مسلمان بالعموم فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ لیکن دسترخوان ضرور بچھایا جاتا ایک آدمی (بالعموم خادم) آفتابہ ہاتھ میں لے کر ہاتھ دھلواتا۔ اس کے بعد دسترخوان بچھایا جاتا۔

پان کھانے کا رواج مسلمانوں کی آمد سے قبل برِصغیر میں رائج تھا۔ لیکن اس میں کوئی نفاست نہ تھی۔ مسلمانوں نے پان کے طریقے اور اس کے کھانے میں نفاستیں پیدا کیں اور اسے مخصوص آداب کے ساتھ مہمانوں کے سامنے پیش کرنے کے انداز رائج کئے۔ مسلم عوام کی اہم ترین تقریبات عقیقہ، بسم اللہ، ختنہ، شادی اور تجہیز و تکفین تھیں۔ شروع شروع میں ان تقریبات کا انداز خالصتاً اسلامی یا وسط ایشیائی تھا۔ مگر بعد میں ان میں بعض ہندو رسومات کو داخل کر لیا گیا۔ جن میں جہیز اور دلہن کا بناؤ سنگھار (سولہ سنگھار) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

تفنگ بازی، چوگان، تیر اندازی، نیزہ بازی، شمشیر زنی، گھوڑ دوڑ اور شکار طبقہ اعلیٰ اور امراء کے کھیل تھے جو عام طور پر دہلی اور صوبائی مرکزوں میں کھیلے جاتے تھے۔ عوام کے کھیل لکڑی، گتکہ، پٹہ بلانا، کشتی، برچھا بانا اور کٹار تھے۔ گھروں میں بالعموم شطرنج کے کھیل سے دل بہلایا جاتا تھا۔ شراب نوشی کی قبیح عادت بھی معاشرے میں راہ پا گئی تھی اور رقص و سرود کا شوق بھی روز بروز ترقی پر تھا۔

شاہی تقریبات (جشنِ نوروز وغیرہ) بڑے تزک و احتشام سے منائی جاتی تھیں۔ جن میں رقص و موسیقی کا

Marfat.com

باقاعدہ اہتمام ہوتا تھا۔ رقاصائیں اپنے فن کا مظاہرہ کرتیں اور مغنّی عورتیں اپنے سحر انگیز نغموں سے عوام کو محظوظ کرتی تھیں۔ حاضرین کی شربت وغیرہ سے تواضع کی جاتی۔ غلام رکھنے کا عام رواج تھا کیونکہ سلاطینِ دہلی خود بھی غلام رکھنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے پاس کم و بیش ایک لاکھ اسّی ہزار غلام تھے۔ مسلم امراء کے علاوہ متوسط طبقہ میں بھی غلام رکھنے کا رواج تھا مگر مسلم معاشرہ میں غلام کو معاشرتی انصاف اور عام انسانی استحقاق حاصل تھا ان کی تربیت باقاعدہ باقاعدہ اولاد کی مانند کی جاتی تھی۔ اور وہ اپنی ذہنی استعداد و صلاحیت کے مطابق ترقی کر سکتے تھے۔ سلطنتِ دہلی کے قیام اور استحکام میں ان غلاموں نے نمایاں کردار ادا کیا۔

ہندوؤں کی مجلسی زندگی

برصغیر میں مسلم فتوحات کے وقت ہندو معاشرہ روائتی اعتبار سے چار طبقوں میں منقسم تھا۔ یعنی برہمن، کھتری، ویش اور شودر۔ ذات پات کی یہ تقسیم ہندو سماج کی بدترین لعنت تھی۔ اس کی وجہ سے ہندو معاشرہ میں عدم مساوات اور ناانصافی کی حد تھی۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ کیونکہ ہندو مسلمانوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے آپ کو اسلامی اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب برصغیر میں اسلامی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں تو اسلام مساوات کے اصول نے طبقاتی نظام کو متاثر کیا اور ہندو سماج میں مختلف اصلاحی تحریکیں رونما ہونے لگیں جن میں سماجی مساوات کی تبلیغ اور شودروں کی حالت کو بہتر بنانے پر زور دیا گیا۔ اس سے ذات پات کا نظام بالکل لایعنی ہو کر رہ گیا۔

اپنی مجلسی زندگی میں ہندو خود مختار تھے۔ کیونکہ سلاطین دہلی نے انہیں پوری مذہبی آزادی عطا کی تھی۔ انہیں اجازت تھی کہ اپنے باہمی تنازعات اپنے قانون اور رواج کے مطابق طے کریں۔ حکومت ان کی مجلسی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرتی تھی۔ ہندو معاشرہ میں ممتاز طبقہ ہندو رؤسا، حکام، ملک اور سوداگروں پر مشتمل تھا۔ اور وہ نہایت خوشحالی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ہندو رؤسا میں چند بیویاں رکھنے کی عادت تھی۔ بچپن کی شادی کا عام رواج تھا۔ ستی بھی عام تھی۔ سلاطینِ دہلی نے ہر ممکن طریقے سے ان قبیح رسموں کو روکنے کی کوشش کی۔ ہندو اسلامی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے فارسی زبان سیکھنی شروع کر دی اور جلد ہی سلطنت کے کلیدی عہدوں پر فائز ہونے لگے انہوں نے کئی ایک مسلم روایات اور رسوم کو اپنایا اور لباس وغیرہ میں بھی نمایاں تبدیلیاں کیں۔

ب۔ اقتصادی حالات

ترکوں اور افغانوں کے تین سو سالہ دورِ حکومت میں برصغیر کے عوام کی اقتصادی حالت کی تفصیلی اور جامع تصویر پیش کرنا نہایت مشکل ہے۔ کیونکہ عہد بہ عہد تاریخوں میں اس عہد کی اقتصادی حالت پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاہم جہاں گرد مارکو پولو، مشہور سیاح ابن بطوطہ کے سفرنامے اور امیر خسرو کی مثنویاں نیز مشائخ

Marfat.com

کے تذکرے ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ جن کی مدد سے ہم مختصر سا اقتصادی خاکہ مرتب کر سکتے ہیں۔

زراعت

زراعتی اعتبار سے سلطنتِ دہلی کا پورا دور انتہائی خوشحالی کا دور تھا۔ اس دور کے تمام غیر ملکی سیاحوں نے خصوصی طور پر برِصغیر کی زرخیزی کا ذکر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے کسان سال میں دو فصلیں اٹھاتے تھے۔ آبادی کی اکثریت زراعت پیشہ تھی۔ کسان خوش حال اور فارغ البال تھے۔ سلطنت کے مطالبے (محاصل) بہت کم تھے۔ محاصل ادا کر چکنے کے بعد کسان کے پاس اتنی پیداوار بچ رہتی تھی کہ وہ اطمینان و خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے۔ کسانوں کو معاشرے میں نہایت اہم حیثیت حاصل تھی۔ حکومت کو بھی ان کی فلاح و بہبود کا خیال رہتا تھا۔ زراعت کی ترقی کے لئے موثر اقدامات کئے جاتے۔ ذرائع آب پاشی کی ترقی کے لئے ملک میں جا بجا کنوؤں اور نہروں کا اہتمام کیا گیا۔ قحط سالی کے ایام میں حکومت نہ صرف مالیہ معاف کر دیتی، بلکہ کسانوں کی امداد کے لئے تقاوی قرضے جاری کرتی جو بعد میں آسان قسطوں میں واپس لئے جاتے تھے۔ کسان سادہ مگر سکون و آرام کی زندگی گزارتے تھے۔ اشیائے ضرورت اس قدر ارزاں اور بافراط تھیں کہ معمولی آمدن رکھنے والا شخص بھی بخوبی گزارہ کر سکتا تھا۔

صنعت و حرفت

عہدِ سلاطین میں صنعت و حرفت اور دستکاری فروغ پر تھی۔ دارالحکومت دہلی میں شاہی کارخانے خاصی بڑی تعداد میں تھے۔ مسلمانوں نے برصغیر میں کپڑے کی صنعت کو بہت ترقی دی اور کپڑے کی کئی نئی اقسام بھی ایجاد کیں۔ بنگال ریشمی اور سوتی کپڑے کی صنعت کے لئے خاص طور پر مشہور تھا۔ حکومت صنعتی ترقی میں نمایاں دلچسپی لیتی تھی۔ برصغیر کی مصنوعات میں کاغذ سازی، چمڑہ، دھات کا سامان، ہر قسم کا کپڑا، کھانڈ، نیل، اسلحہ، عطریات، گھریلو ساز و سامان، خیمے، زین، گھوڑوں کے ساز، زرہ بکتر وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر تھیں۔ گجرات کا ٹھیا واڑ بھی ایک مشہور صنعتی مرکز تھا جہاں مختلف دھاتوں کے خوبصورت ظروف اور چاقو چھریاں وغیرہ تیار ہوتے تھے۔ کھانڈ اور شکر کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز بنگال تھا۔

تجارت

برِصغیر پاک و ہند اور وسط ایشیائی و مغربی ممالک کے درمیان زمانۂ قدیم سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ ایران، افغانستان، وسط ایشیا، تبت اور چین سے خشکی کے راستے تجارتی مال بڑی مقدار میں آتا تھا۔ بحری راستے سے تجارت چین، جنوبی و مشرقی ایشیا کے ممالک اور یورپ کے ساتھ خاصی تھی۔ برِصغیر کا مال ساحلِ عرب سے ہو کر دمشق اور سکندریہ پہنچتا اور وہاں یورپ کی مختلف منڈیوں میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ تجارت کا توازن برِصغیر کے حق میں تھا یعنی درآمد کے مقابلے میں برآمد کی مقدار زیادہ تھی۔ اسی لئے برِصغیر میں سونے اور چاندی کی عام بہتات تھی۔ باہر سے زیادہ گھوڑے یہاں آتے اور یہاں سے عام طور پر اجناس، تیل نکالنے کے بیج اور پارچات برآمد کئے جاتے۔ بیرونی ممالک میں بنگال اور گجرات کے پارچات کی بہت زیادہ کھپت تھی۔ ملکی تاجروں میں ملتانی تاجر اور گجرات کے بنئے بہت مشہور تھے۔ تجارت پر زیادہ تر بڑے بڑے ہندو ساہوکاروں کا قبضہ تھا۔ تاجروں کو معاشرے میں بے حد عزت و توقیر حاصل تھی۔

Marfat.com

قیمتیں ناقص اور محدود ذرائع آمدورفت کی وجہ سے سارے برصغیر میں اشیاء کی قیمتیں یکساں نہ تھیں۔ بہرحال اشیائے ضرورت کی ارزانی اور فراوانی تھی۔ قحط اور خشک سالی کے ایام میں قیمتیں عموماً بڑھ جاتی تھیں۔ محمد تغلق کے عہد میں قحط رونما ہوا تو گندم کی قیمت بڑھ کر سولہ یا سترہ تنکہ فی سیر ہو گئی۔ جنگ کے ایام میں بھی قیمتیں معمول سے بڑھ جایا کرتی تھیں۔ فیروز تغلق کے عہد میں اجناس تقریباً اتنی ہی ارزاں تھیں، جتنی علاؤالدین خلجی کے زمانے میں تھیں۔ سلاطین لودھی کے عہد میں بھی اشیائے ضرورت ارزاں تھیں خصوصاً سکندر لودھی اور سلطان ابراہیم لودھی کے زمانے میں اجناس بہت ہی ارزاں تھیں۔ ابراہیم کے عہد میں ایک بہلولی سکہ (جو تنکہ سے کسی قدر زیادہ تھا) میں دس من غلہ یا پانچ سیر تیل یا دس گز معمولی کپڑا خریدا جا سکتا تھا۔ ہمعصر تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ عہدِ سلاطین میں معمولی سی آمدنی بھی خاصے بڑے گھرانے کے مصارف پورے کرنے کے لئے کافی ہوتی تھی۔ علائی دور میں ایک تنکہ سے بخوبی ایک معقول دعوت کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اس نے کسی بھی ملک میں اجناس اس قدر ارزاں نہیں دیکھیں جس قدر بنگال میں تھیں۔ اسی طرح مارکو پولو اور چینی سیاح مہوآن جو بنگال میں ۱۴۰۶ء میں وارد ہوا۔ کے سفرناموں سے پتہ چلتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند اقتصادی اور صنعتی لحاظ سے بڑا خوشحال تھا اور اشیائے ضرورت کی فراوانی تھی۔

امتحانی سوالات

۱۔ عہدِ سلاطین میں برصغیر پاک و ہند کی معاشرتی حالت سے خط و خال بیان کرتے ہوئے مختصراً مسلمانوں اور ہندوؤں کی مجلسی زندگی کا حال قلمبند کیجئے۔

۲۔ سلاطینِ دہلی کے عہد میں برصغیر کی اقتصادی حالت کا مختصر خاکہ پیش کیجئے۔

Marfat.com

چودھواں باب

عہدِ سلاطین کے صوفیائے کرام اور مبلّغین

جب سلاطین دہلی کی سرپرستی میں امراء، رؤسا، اولوالعزم فوجی جرنیل اور عظیم فنکار ملک گیری، کشور کشائی اور ثقافت کی گرانقدر خدمات انجام دے رہے تھے تو مسلمان بزرگانِ دین کا ایک گروہ خاموشی سے مگر بڑی مستعدی کے ساتھ اشاعتِ اسلام میں مصروف تھا۔ ان کی زندگیاں نہایت سادہ و پاکیزہ تھیں۔ ان کے کردار اعلیٰ درجہ محاسن اخلاق کے مظہر اور ان کے دربار امن و آشتی اور مساواتِ انسانی کی تعلیمات کے گہوارے تھے جو بلا تمیز مذہب و ملت ہر کس و ناکس پر کھلے رہتے تھے۔ کسی کی تکفیر و تکبیر سے انہیں کوئی علاقہ نہ تھا اور ان کی تعلیمات سب کے لئے یکساں تھیں۔ ان کے درباروں میں برہمن اور اچھوت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ ان کی مقدس زندگیوں کے اتقا اور حسنِ اخلاق سے عوام کو اسلام کی کشش و رغبت پیدا ہوئی۔ چنانچہ ان کی ذاتِ بابرکات اور مساعی سے ہزارہا لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔

چونکہ ان بزرگانِ دین کے مقاصد جلیل، بے لوث اور انسانیت پرور تھے، اس لئے شاہانِ دہلی اور ارباب امارت و اقتدار کی نگاہوں میں ان کی بہت زیادہ قدر و منزلت تھی۔ اور وہ ان کے لنگروں کے مصارف کے لئے بہت سی جاگیریں بطور نذرانہ روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ یہ بزرگانِ دین بسا اوقات اپنے اثر و رسوخ سے عوام کی بعض شکایات کا تدارک بھی کرا دیتے۔ جس کے باعث عوام ان کے ممنون ہوتے۔ اور ان کی یہ ممنونیت تبلیغ کے کام میں مفید و معاون ثابت ہوتی۔

"برصغیر کے مختلف گوشوں میں دس گیارہ صدیوں تک ہزارہا صوفیہ اور مبلّغین نے اشاعتِ اسلام کے لئے کام کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کا فکری جمود ٹوٹ گیا۔ جاہلانہ ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی اور ذات پات کے امتیاز، چھوت چھات اور شرک و انکار کی گھٹائیں جو صدیوں سے اس بدنصیب ملک پر چھائی ہوئی تھیں، چھٹ گئیں اور شرفِ انسانیت کا آفتاب طلوع ہوا۔ عقیدۂ توحید اور مساواتِ انسانی کی مقبولیت عامہ کے باعث ہندوؤں کے مذاہب کی بنیادیں ہل گئیں اور ان میں نئے نئے روشن خیال مذہبی مفکرین پیدا ہوئے جن کی مساعی سے پرانے ہندو دھرم کا قلع قمع ہو گیا۔"

حضرت شیخ اسماعیل بخاریؒ لاہوری پہلے مبلغِ اسلام ہیں جو ۱۰۰۵ء میں وارد ہندوستان ہوئے۔ علم و تصوف میں آپ کا منصبِ ارشاد بہت بلند تھا۔ علاوہ ازیں حضرت فخر الدین حسین زنجانیؒ اور حضرت مخدوم علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ جو سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے دور میں وارد لاہور ہوئے، کے وعظ و ارشاد کی بدولت

Marfat.com

بھی ہزارہا ہندو حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ ان بزرگانِ دین کا مفصل تذکرہ باب چہارم میں ہو چکا ہے۔ سرِدست ذیل میں ان چند نامور صوفیہ و مبلغین کا مختصر سا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اپنے زہد و اتقا، اپنے منصب رشد و ہدایت اور اپنے تبلیغی کارناموں کے اعتبار سے افضل و ممتاز تھے اور جن کی درگاہیں بلا تخصیص مذہب و ملت مرجع عوام و خواص ہیں۔

سلسلۂ چشتیہ

تصوف کے سلسلۂ چشتیہ کے اصل بانی خواجہ ابو اسحاق شامی (المتوفی ۹۴۰ء) تھے[1] برصغیر میں اس سلسلے کی بنیاد رکھنے والے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ تھے۔ سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں کی رشد و ہدایت اور تلقینِ اخلاق و تصوف کے طفیل برصغیر میں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔ یہ بزرگ جاہ و حشمت اور ارباب اقتدار سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ بلکہ سلاطین سے ملاقات کرنے اور ممتاز حیثیت کے عہدے قبول کرنے سے بھی ہمیشہ اعراض کرتے رہے۔ درویشانہ شان استغنا و بے نیازی پر اس طریق سے تبلیغ اسلام میں مصروف رہے۔

خواجہ معین الدین اجمیریؒ:

دین اسلام کی تبلیغ اور تصوف و اخلاق کی تلقین و تعلیم میں خواجہ معین الدین اجمیری برصغیر پاک و ہند کے اولیاء کرام میں افضل و ارفع حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ ۱۱۴۲ء میں سیستان کے ایک قصبہ سنجر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر سے آپ میں عشقِ حقیقی کا جذبہ تھا۔ آپ نے ہوش سنبھالتے ہی دینی اور [illegible] علوم کی تحصیل کی۔ [illegible] قصبہ ہرون میں حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے مرید ہوئے اور [illegible] کی ریاضت کے بعد خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آپ نے بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے دوران حضرت غوث الاعظم شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، خواجہ اوحدالدین کرمانی شیخ نجم الدین کبریٰ اور دوسرے بے شمار مشائخ اور صوفیہ سے ملاقات کی۔ جب آپ رشد و ہدایت کے لئے عازم ہندوستان ہوئے تو بلخ اور غزنی ہوتے ہوئے سب سے پہلے لاہور گئے۔ جہاں دو ماہ تک آپ نے داتا گنج بخشؒ کے مزار پر چلہ کی۔ لاہور سے آپ ملتان تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے پانچ سال کی محنت کے بعد ہندوستانی زبان میں مہارت تامہ حاصل کی۔ ازاں بعد ۱۱۹۲ء میں دہلی سے ہوتے ہوئے اجمیر پہنچے جو راجپوتانہ میں اس زمانے کے ہندوؤں کی قومی طاقت کا مرکز تھا۔ اس وقت یہاں پرتھوی راج کی حکومت تھی۔ یہاں آپ نے تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ جو رفتہ رفتہ سارے برصغیر میں پھیل گیا۔ اہل ہند ہزاروں کی تعداد میں آپ کے فیضانِ رشد و ہدایت سے مسلمان ہوئے۔ اجمیر کے راجہ گورو جے پال جوگی بھی آپ کے دستِ حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ ۱۲۳۶ء میں ۹۷ سال کی عمر میں سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ کا مزار شریف اجمیر میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

خواجہ اجمیری برصغیر میں سلسلۂ چشتیہ کے بانی اور بہت بڑے ولی تھے۔ تصوف کی کتابوں میں آپ کو

---

[1] ایم کبیر "اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان" جلد دوم۔ صفحہ ۱۱۵

Marfat.com

خواجہ بزرگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عوام آپ کو احترام اور محبت سے خواجہ غریب نوازؒ کہتے ہیں۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ:-

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ فرغانہ کے قصبہ اوش میں پیدا ہوئے۔ بغداد میں علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ یہیں آپ کی ملاقات خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ہوئی۔ ان کی بیعت کر کے خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے جب خواجہ اجمیری ہندوستان چلے تو آپ نے بھی ہندوستان کا رخ کیا۔ چنانچہ آپ پہلے ملتان پہنچے۔ اور شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے مہمان رہے۔ ازاں بعد دہلی پہنچے اور اپنے مرشد خواجہ معین الدین چشتیؒ سے حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہی۔ مگر حکم ہوا کہ جب قرب روحانی میسر ہے تو قرب جسمانی کی کیا ضرورت ہے۔ دہلی میں قیام کرو اور اشاعت حق میں مصروف رہو۔ چنانچہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ مدت العمر دہلی ہی میں رہے۔ اس طرح اجمیر و دہلی بیک وقت ایک ہی چشمۂ رشد و ہدایت سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ آپ نے ۱۲۳۶ء میں دہلی میں وفات پائی۔ دہلی میں آپ کا مزار زیارت گاہِ عام و خاص ہے۔

سلطان شمس الدین ایلتتمش نے آپ کو شیخ الاسلام کا عہدہ پیش کیا، لیکن آپ نے چشتی روایات کے موجب اس بلند منصب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ سلسلۂ چشتیہ کے پہلے بزرگ تھے جو سماع سے رغبت و شوق رکھتے تھے۔ آپ اپنے رفیقِ خاص قاضی حمید الدین سے مل کر اکثر مجالسِ سماع کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ سلسلۂ چشتیہ میں سماع داخل ہو گیا۔ حالانکہ خواجہ عثمان ہرونی اور حضرت خواجہ اجمیریؒ بھی اس کے قائل نہ تھے۔

بابا فرید گنج شکرؒ:-

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے بعد خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ ان کے جانشین ہوئے۔ آپ عوام میں بابا فرید کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا اصل نام مسعود تھا۔ آپ کھوتوال (ضلع ملتان) میں پیدا ہوئے۔ حصولِ تعلیم کے زمانہ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملتان ہی میں ملاقات ہوئی۔ جوشِ عقیدت میں ان کے ساتھ دہلی چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر یہ کہہ کر روک دیئے گئے کہ پہلے تحصیلِ علم مکمل کرو۔ تحصیلِ علم کے بعد آپ نے ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت کی۔ جس کے دوران شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ فرید الدین عطارؒ اور بعض دیگر صوفیہ کرام سے ملاقات کی۔ واپس آ کر خواجہ بختیار کاکیؒ کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے اور ان کی زندگی میں آپ ہانسی (ضلع حصار) میں ہی مقیم رہے۔ مرشد کے وصال کے بعد خرقۂ خلافت ملا تو آپ اجودھن (موجودہ پاکپتن ضلع ساہیوال پنجاب) میں مقیم ہو گئے، اور تادمِ آخر یہیں ہدایت و ارشاد اور ذکرِ الٰہی میں مصروف رہے۔ آپ نے ۱۲۶۵ء میں انتقال فرمایا۔ پاکپتن میں آپ کا مزارِ مبارک زیارت گاہِ عام ہے۔ ہر سال ماہِ محرم کے ابتدائی ایام میں بڑی دھوم دھام سے آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔

آپ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ معمولی پھٹے پرانے کپڑے پہنتے تھے اور جنگلی پھلوں پر گذارہ کرتے تھے۔ زیادہ تر وقت یادِ خدا میں گذارتے تھے۔ آپ ایک صاحبِ فضیلت اور باکرامت بزرگ تھے۔ آپ کی سب سے بڑی کرامت قناعت اور پاک زاہدانہ زندگی تھی۔ آپ کے سب سے بڑے خلیفہ حضرت مولانا جمال الدین ہانسویؒ تھے، جن پر آپ کو بے حد اعتماد تھا۔ آپ نے جب اپنے بھانجے مخدوم علاؤ الدین صابرؒ کو ولایتِ دہلی کی سند عطا کی تو حضرت

Marfat.com

ہانسوی نے وہ سند پھاڑ ڈالی۔ حضرت مخدوم صابرؒ نے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ سے شکایت کی تو ارشاد ہوا کہ جمال کا پھاڑا ہوا فرید نہیں سی سکتا۔ تم اب دہلی نہیں جا سکتے۔ کلیر کا علاقہ تمہیں دیا جاتا ہے۔ [1]

مخدوم علاؤالدین صابرؒ :- حضرت مخدوم علاؤالدین صابرؒ، بابا فرید گنج شکرؒ کے خلیفہ ہونے کے علاوہ رشتہ میں بھانجے اور داماد بھی تھے۔ آپ ۱۱۹۵ء میں موضع کھوٹوال (ملتان) میں پیدا ہوئے۔ بابا فرید گنج شکرؒ نے آپ کو علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ کیا۔ زیادہ تر عالم استغراق میں رہتے تھے۔ آپ نے ۱۲۹۱ء میں وفات پائی۔ اودھ کی ضلع سہارنپور کے پاس کلیر میں مدفون ہوئے۔ آپ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے بانی ہیں۔ آپ کے مزار پر ہر سال بڑی دھوم دھام سے عرس ہوتا ہے۔

شیخ نظام الدین اولیاءؒ :- آپ بابا فرید گنج شکرؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ سلطان المشائخ اور محبوب الٰہی کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ آپ کا اصل اسم گرامی سید محمد ہے۔

۱۹ اکتوبر ۱۲۳۸ء کو بمقام بدایوں پیدا ہوئے۔ بدایوں اور دہلی میں علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کے بعد پاکپتن میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی عبادت و ریاضت اور روشن ضمیری کے باعث ۱۲۶۱ء میں صرف ۲۲ سال کی عمر میں خرقۂ خلافت کے علاوہ نیابتِ دہلی سے سرفراز ہوئے۔ جب آپ حضرت بابا فریدؒ کے منظورِ نظر شیخ جمال ہانسویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ سندِ نیابت پر ان کی تصدیق حاصل کریں تو آنحضرت نے سند پر یہ شعر لکھ دیا ؎

ہزاراں درود و ہزاراں سپاس کہ گوہر سپردم بہ گوہر شناس

دہلی پہنچ کر آپ نے قصبہ غیاث پور میں سکونت اختیار کی۔ جو اب بستی نظام الدین اولیاء کے نام سے مشہور ہے۔ سلطان المشائخ کا لنگر وسیع تھا۔ اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ نذر و نیاز کا جو روپیہ آتا اسی وقت خیرات کر دیتے تھے۔ آپ کی مقبولیت اور جاذبیت کی وجہ سے جلد ہی آپ کی قیام گاہ مرجعِ خلائق بن گئی۔ عوام اور عمائدینِ شہر کے علاوہ امرائے سلطنت اور شہزادے و عوام آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ بادشاہ بھی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔

حضرت سلطان المشائخ نے تین شاہی خانوادوں کا زمانہ دیکھا۔ یعنی خاندانِ غلاماں، خاندانِ خلجی اور خاندان تغلق آپ کی ذات میں کچھ ایسی کشش و جاذبیت تھی کہ صوفیاء، علماء، مورخین اور شعراء سب ہی آپ کے گرویدہ تھے جن میں امیر خسرو، امیر حسن سجزی اور ضیاء الدین برنی کے نام خاص طور پر مشہور ہیں۔ چشتی روایات کے مطابق آپ شاہی دربار اور سیاسی معاملات سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے ایک بار آپ سے ملنے کی خواہش کی تو آپ نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ "میرے گھر کے دو دروازے ہیں۔ اگر سلطان ایک دروازے سے داخل ہوگا تو میں

---

[1] مولانا عبدالمجید سالک۔ "مسلم ثقافت ہندوستان میں"، صفحہ ۲۴۲

Marfat.com

دوسری طرف سے باہر نکل جاؤں گا"۔ تاہم بقول ضیاء الدین برنی سلطان علاؤالدین خلجی نے سلطان المشائخ سے دربار دعا کرائی۔ اوّلاً جب منگول فوج نے ترغی کی زیر کمان دہلی کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ثانیاً جب ملک کافور تلنگانہ کی مہم پر روانہ ہوا۔ اور ڈاک کے غیر تسلی بخش نظام کے باعث لشکرِ اسلام کی خیریت کے بارے میں تشویش تھی۔ ترغی کے بلا سبب محاصرہ اٹھا کر واپس چلے جانے اور علائی عہد کی ارزانی اور خوشحالی کو لوگ آپ ہی کی روحانی کرامات و برکات پر محمول کرتے تھے۔ علاؤالدین کا بڑا لڑکا خضر خاں آپ کا بے حد معتقد تھا۔

سلطان قطب الدین خلجی آپ سے ناراض تھا۔ وجہ یہ تھی کہ دیگر علماء و مشائخ کی طرح آپ حاضرِ دربار نہ ہوتے تھے۔ بلکہ اپنے غلام کو بھیج دیا کرتے تھے۔ سلطان غیاث الدین تغلق بھی آپ سے ناخوش تھا۔ کیونکہ آپ کو سماع کا بڑا شوق تھا، جبکہ سلطان کے نزدیک سماع خلافِ شرع تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب سلطان غیاث الدین تغلق بنگال کی مہم پر گیا تو اس کے بڑے لڑکے الغ خاں نے حضرت سلطان المشائخ کی مریدی اختیار کر لی اور فوج فراہم کر کے حصولِ تخت کے لئے زور شور سے تیاری کرنے لگا۔ سلطان کو شبہ گزرا کہ سلطان المشائخ اس بغاوت کی پشت پر ہیں چنانچہ دورانِ مراجعت سلطان نے حضرت کو لکھ بھیجا کہ میرے دہلی واپس پہنچنے سے قبل آپ دہلی چھوڑ دیں۔ حضرتؒ نے اس پر کہا کہ "ہنوز دہلی دور است"۔ سلطان کی مراجعت پر شہزادہ الغ خاں نے افغانپور میں ایک نیا محل بنوا کر باپ کا استقبال کیا۔ یہ محل لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ابھی بادشاہ کھانے سے فارغ ہوا تھا کہ یہ محل زمین پر آ رہا اور سلطان غیاث الدین تغلق اس کے نیچے دب کر مر گیا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد ۳ر اپریل ۱۳۲۵ء کو سلطان المشائخؒ کا بھی وصال ہو گیا۔ شیخ رکن الدین ملتانیؒ المعروف بہ رکنِ عالم نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ بستی نظام الدین اولیاء (دہلی) میں دفن ہوئے۔ آپ کا مزار زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

آپ کی تبلیغی سرگرمیاں صرف برِ صغیر تک ہی محدود نہ تھیں۔ بلکہ عرب اور چین تک پھیلی ہوئی تھیں۔ آپ نے اپنے بیشمار خلفاء و مبلغین کو گجرات، دکن، پنجاب، چین اور افغانستان بھیجا۔ آپ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے بانی قرار پائے جو صابریہ کی طرح سلسلہ چشتیہ کی ایک شاخ ہے اور جس کے وابستگان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے امیر خسرو اپنے مرشد کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

در حجرۂ فقر بادشاہے — در عالمِ دل جہاں پناہے
شہنشہِ بے سریر و بے تاج — شاہانش بخاکپائے محتاج

نصیر الدین محمودؒ چراغِ دہلی:-

آپ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ اور جانشین مقرر ہوئے۔ آپ اپنے زہد و ریاضت اور صفائے باطن کے باعث چراغِ دہلی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ بہت بڑے عالم، متقی اور صاحبِ دل بزرگ تھے۔ ہر بات میں قرآن و سنت کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ سماع کو ناجائز اور خلافِ سنت سمجھتے تھے۔ اپنے خلفاء کو ہمیشہ علومِ دین کی اشاعت اور شریعت اسلامی کی ترویج کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ آپ نے اپنے خلیفہ اعظم حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کو دکن اور

Marfat.com

اپنے بھانجے شیخ کمال الدین کو احمد آباد (گجرات) بھیجا۔ جہاں ان بزرگوں کا سلسلۂ فیض مدت دراز تک جاری رہا۔ حضرت چراغِ دہلی نے مسائلِ تصوف پر ایک سو سے زائد کتابیں لکھیں۔ آپ شاعر بھی تھے آپ کا کلام عارفانہ و صوفیانہ رموز کا آئینہ دار تھا۔ ۱۲۵۶ء میں ایک قلندر نے آپ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ خدام نے اسے گرفتار کرنا چاہا۔ لیکن آپ نے انہیں منع کر دیا اور حملہ آور کو گھوڑا اور پچاس اشرفیاں دے کر رخصت کر دیا۔ آپ اس حملہ سے جانبر نہ ہو سکے۔ مزارِ مبارک دہلی سے باہر روشن چراغ کے نام سے مشہور ہے۔ خیر المجالس آپ کے ملفوظات کا مجموعہ ادبیاتِ فائقہ میں شمار ہوتا ہے۔

سید محمد گیسو دراز رح: آپ حضرت چراغِ دہلی کے خلیفۂ اعظم تھے ۱۳۲۰ء میں آپ بمقام دہلی پیدا ہوئے مرشد کے حکم سے بسلسلۂ تبلیغ دکن چلے گئے۔ جہاں وہ سب سے زیادہ نامور اور کامیاب مبلغ ثابت ہوئے۔ آپ صاحبِ قلم بھی تھے۔ دینی موضوعات پر متعدد کتب آپ نے لکھیں۔ آپ کا مزار گلبرگہ میں مرجع خاص و عام ہے۔

سلسلۂ سہروردیہ برصغیر پاک و ہند میں سلسلۂ سہروردیہ کے بانی شیخ بہاؤ الدین زکریا تھے ان کی اور ان کے خلفاء کی کوششوں سے یہ سلسلہ سندھ، بلوچستان اور پنجاب میں بہت مقبول ہوا۔ سہروردی سلسلہ میں، سلسلۂ چشتیہ کے مقابلہ میں شریعت کی پابندی پر زور دیا جاتا ہے اور سماع اور رقص و حال کا رواج کم ہے۔ سہروردیہ تصوف میں مذہبی رنگ نہایت گہرا ہے۔ اس سلسلہ کے بزرگوں کو تبلیغ کا بہت زیادہ شوق تھا۔ وہ سلسلۂ چشتیہ کے برعکس ترکِ جاہ اور عزلت نشینی کے قائل نہ تھے بلکہ دنیا داری اور امارت کی زندگی بسر کرنے کے حامی تھے۔ انہوں نے حکومت سے تعاون کرنے کے سبب مراتب بھی حاصل کیے۔ سلسلۂ سہروردیہ میں روحانی وراثت عموماً والد سے فرزند کو ملتی رہی۔

شیخ بہاؤ الدین زکریا: آپ ۱۱۸۲ء میں بمقام ملتان پیدا ہوئے حصولِ تعلیم کے لئے بخارا اور بغداد گئے۔ بغداد میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ چونکہ تقویٰ اور صلاحیتِ باطنی کے اعتبار سے پہلے ہی ممتاز تھے۔ اس لئے بیعت کے چند ہی روز بعد خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے اور ہدایت و ارشاد کے لئے ملتان جانے کا حکم ملا۔ چنانچہ آپ ملتان پہنچے آپ ناصر الدین قباچہ حاکم ملتان و سندھ اور سلطان شمس الدین التمش دونوں آپ کے معتقد تھے۔ آپ برصغیر پاک و ہند میں سلسلۂ سہروردیہ کے بانی ہیں۔ آپ کی زندگی امیرانہ تھی۔ اس سلسلہ میں آپ کا استدلال تھا کہ امارت بنفسہٖ کوئی بُری چیز نہیں بلکہ اس کا غلط استعمال اسے بُرا بنا دیتا ہے۔ آپ اتباعِ سنت کا بڑا خیال رکھتے تھے مگر سماع و سرود میں بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ فارسی کے نامور صوفی شاعر عراقی کے کلام سے آپ کو بہت رغبت تھی۔ عراقی شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے اور شیخ زکریا کے داماد تھے۔ شیخ نے ۱۲۶۶ء میں انتقال فرمایا آپ کا مزارِ مبارک ملتان میں ہے۔

Marfat.com

شیخ صدرالدین عارفؒ: آپ شیخ بہاؤالدین زکریا کے فرزند اور جانشین تھے۔ خانوادۂ سہروردیہ کے سجادہ نشین ہو کر آپ نے موروثی سجادہ نشینی کی پہلی مثال قائم کی۔ آپ نے شہزادہ محمد شہید حاکمِ ملتان و دیپالپور کی مطلقہ بیوی سے شادی کی اور بعد ازاں شہزادے کی درخواست نے باوجود اسے طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے ۱۲۸۵ میں انتقال فرمایا۔

شیخ رکن الدینؒ ابوالفتح ملتانی: شیخ رکن الدین، شیخ صدرالدین عارف کے فرزند تھے اور شیخ رکن العالم کے نام سے معروف ہوئے۔ باپ کی وفات کے بعد سلسلۂ سہروردیہ کی سجادہ نشینی آپ کے حصہ میں آئی۔ آپ نہایت ہی متقی اور زاہدِ شب زندہ دار بزرگ تھے۔ آپ نے علاؤالدین خلجی سے لے کر محمد تغلق تک کا زمانہ دیکھا۔ سلطان علاؤالدین خلجی آپ کا بے حد مداح تھا۔ اس کے عہد میں دہلی گئے اور شاہی مہمان بنے۔ رخصت کے وقت سلطان نے لاکھوں تنکے (رائج الوقت سکہ) آپ کی نظر کئے۔ جو آپ نے مستحقین اور فقراء میں تقسیم کر دیئے۔

قطب الدین مبارک خلجی سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مخالف تھا۔ اس نے ملتان سے حضرت رکن الدین عالم کو دہلی بلایا تاکہ سلطان المشائخ کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لئے مخانقاہ چشتیہ نظامیہ کے بالمقابل ان کی خانقاہ قائم کر سکے۔ مگر وہ اپنے اس منصوبہ میں ناکام رہا۔ کیونکہ حضرت سلطان المشائخ نے بکمال محبت خود اپنی خانقاہ سے حوضِ علائی تک جا کر حضرت رکن العالم کا استقبال کیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی رحلت کے وقت بھی آپ دہلی میں موجود تھے۔ اس لئے ان کی نماز جنازہ بھی آپ نے ہی پڑھائی۔ آپ نے ۱۳۲۵ء میں وفات پائی اور قلعہ ملتان میں مدفون ہوئے۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ: آپ شیخ رکن العالمؒ کے خلیفہ تھے اور سید جلال الدین شاہ میر سرخ بخاریؒ (المتوفی ۱۲۹۱ء) بانیٔ اُچ بخاریاں کے پوتے تھے۔ آپ کا اصلی نام سید جلال الدین بخاری تھا۔ آپ نے بلادِ اسلامیہ کی بہت سیاحت کی۔ اور چھتیس مرتبہ حج کیا۔ اس لئے "جہاں گشت" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ حضرت نصیرالدین چراغِ دہلی سے بھی فیض یاب ہوئے۔ مشہور ہے کہ آپ چودہ خانوادوں سے فیض یافتہ تھے۔ آپ دیگر سہروردی بزرگوں کی طرح بلند مرتبہ عالمِ دین اور پابندِ شریعت تھے۔ علمی اعتبار سے آپ کو جامع العلوم کا درجہ حاصل تھا۔ جو لوگ درویشی کا دعویٰ کرتے لیکن شریعت کے احکام پر عمل نہ کرتے آپ انہیں سختی سے ڈانٹتے تھے۔ آپ سندھ بلوچستان اور گجرات کاٹھیاواڑ میں دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرتے رہے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے ساتھ بڑے گہرے مراسم تھے اور وہ آپ کا بڑا عقیدتمند تھا۔ جب بھی آپ دہلی تشریف لے جاتے، سلطان آپ کا شاہانہ استقبال کرتا۔ آپ نے ۱۳۸۶ میں وفات پائی۔ مزارِ مبارک اُچ شریف میں ہے۔

شیخ جلال الدینؒ تبریزی: آپ ایرانی النسل تھے اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے

Marfat.com

فیض یافتہ تھے۔ آپ پہلے بزرگ تھے جو دینِ اسلام کی تبلیغ کی غرض سے بنگال تشریف لے گئے۔ جہاں آپ کو خاصی کامیابی ہوئی۔ آپ سماع کے حامی تھے۔ آپ نے ۱۳۲۵ء میں وفات پائی۔ کوہاٹی (آسام) میں آپ کا مزار مرجعِ عوام ہے۔ لیکن "تذکرۂ صوفیائے بنگال" اور "آبِ کوثر" میں آپ کا مدفن بندر دیوا محل (بنگلہ) بتایا گیا ہے۔

سیّد محمد غوث گیلانی قادریؒ:- آپ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ مقتدر بزرگ اور جیّد عالم تھے۔ آپ اتباعِ سنت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ آپ نے متعدد اسلامی ممالک کی سیاحت کی اور بعد ازاں اُچ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ جہاں آپ نے قادری سلسلہ کی خانقاہ قائم کی، جو صدیوں تک اسلامی علوم کا مرکز رہی اور وہاں سے ہزارہا افراد نے کسبِ فیض کیا۔ سیّد محمد غوث کی اولاد اور ان کے مریدین نے اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آپ نے ۱۵۱۷ء میں فات پائی اور اُچ میں مدفون ہوئے۔

حضرت بوعلی قلندرؒ:- آپ بوعلی قلندر پانی پتی کے نام سے مشہور رہیں۔ اسم گرامی شیخ شرف الدین تھا۔ آپ حضرت قطب جمال ہانسویؒ کے خالہ زاد تھے۔ علوم دین کی تحصیل کے بعد آپ نے رُشد و ہدایت اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مسجد قبتہ الاسلام میں وعظ بھی فرماتے رہے۔ کسی فقیر کے جذب و اثر سے درس و تدریس کو ترک کر کے قلندری اختیار کر لی اور سب کتابیں دریا برد کر دیں۔ آپ کا شمار مشہور مجذوب اولیاء میں ہوتا ہے۔ آپ نے ۷۲۴ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزارِ مبارک پانی پت میں زیارت گاہِ عوام و خواص ہے۔ آپ کی ارادت مشائخِ مشہور میں سے کسی کے ساتھ منسوب نہیں ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ارادت رکھتے تھے اور بعض کا خیال ہے کہ آپ کا روحانی تعلق حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے تھا۔ ان میں سے کسی روایت کی تصدیق نہیں ہو سکی [1]

لال شہباز قلندرؒ:- آپ کا اصل نام شیخ عثمان ہے۔ آپ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور شیخ بہاؤالدین زکریاؒ جیسے بزرگانِ طریقت سے فیضیاب ہوئے۔ لیکن بعد میں جب روحانی استغراق کی کیفیت طاری ہوئی تو آپ نے اتباعِ سُنّت کا خیال چھوڑ دیا۔ سماع اور رقص و سرود کے بڑے رسیا تھے۔ آپ کا مزار سہون میں ہے۔

پیر منگھوؒ:- پیر منگھو المعروف بہ مگر پیر، حضرت لال شہباز قلندر کے ہمعصر اور ایک بلند پایہ بزرگ تھے۔ ہندو لوگ آپ کو لالہ جیراج کے نام سے ملتے ہیں۔ آپ کا مزار کراچی میں ہے۔ آپ کے مزار کے متصل ایک چھوٹا سا تالاب بھی ہے۔ جس میں کئی ایک مگرمچھ ہیں۔ آپ کے مزار پر ہمیشہ عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔

---

[1] شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ "اخبار الاخیار"

Marfat.com

بھگتی تحریک

برِّصغیر میں ہندو دھرم کی اصلاح اور تعمیرِ نو کے لئے جو تحریکیں جاری ہوئیں۔ ان کا آغاز سب سے پہلے جنوبی ہند میں ہوا اور ابتدائی دور کے اکثر مصلحین بھی جنوبی ہند سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہندو ثقافت مذہب کا قدیم ترین مرکز شمالی ہند تھا تو یہ تحریکیں شمالی ہند کی بجائے جنوبی ہند میں ہی کیوں اٹھیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام، مذہب کی حیثیت میں سب سے پہلے جنوبی ہند میں پہنچا۔ مسلمان تاجر اور مبلّغین ساتویں صدی عیسوی میں مالیبار اور جنوبی سواحل کے دیگر علاقوں میں آنے جانے لگے چونکہ مسلمان بہترین اخلاق و کردار کے مالک اور کاروباری لین دین میں دیانتدار واقع ہوئی تھے، اس لئے مالیبار کے راجاؤں، تاجروں اور عام لوگوں نے ان کے ساتھ رواداری کا سلوک روا رکھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے برِّصغیر پاک و ہند کے مغربی ساحلوں پر قطعاتِ اراضی حاصل کر کے مسجدیں تعمیر کیں اور اپنے دین کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ ہر مسلمان اپنے اخلاق اور عمل کے اعتبار سے دینِ اسلام کا مبلغ تھا اور نہایت سادگی و شائستگی سے اسلام کے سیدھے سادے عقائد کی تبلیغ و اشاعت کرتا تھا۔ نتیجتہً عوام ان کے اعمال و اخلاق سے متاثر ہوتے چلے گئے تجارت اور تبلیغ کا یہ سلسلہ تقریباً ایک صدی تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ مالیبار میں اسلام کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا اور وہاں کا راجہ بھی مسلمان ہو گیا۔

جنوبی ہند میں فروغِ اسلام کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں جنوبی ہند مذہبی کشمکش کا شکار تھا۔ ہندو دھرم کے پیروکار بدھ مت اور جین مت کے شدید مخالف اور ان کی بیخ کنی میں مصروف تھے۔ اس عالم میں جب ان کے سامنے اسلام کی روشنی نمودار ہوئی اور مبلّغینِ اسلام نے توحیدِ الٰہی کا عقیدہ پیش کیا اور ذات پات اور چھوت چھات کو لایعنی اور خلافِ انسانیت قرار دیا تو عوام جو ہزارہا سال سے تفرقات و امتیازات کے شکار ہو رہے تھے بے اختیار اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ چونکہ حکومت اور معاشرہ کی طرف سے تبدیلیٔ مذہب پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس لئے ہزاروں غیر مسلم، مسلمان ہو گئے۔

اسلام نے توحید کے عقیدے کو اس قدر وضاحت اور قوّت کے ساتھ پیش کیا کہ ہندو ریشیوں اور فلسفیوں کے لئے اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ انہوں نے کروڑوں دیوتاؤں کے مذہب میں ترمیم ضروری سمجھی اور پھر ہندوؤں سے کہا کہ توحید کوئی مسلمانوں ہی کا اجارہ نہیں ہے، ہندوؤں کے قدیم دھرم میں بھی یہ عقیدہ موجود ہے۔ اور ہندوؤں نے ہی اس کو بھلا رکھا ہے[1]۔ چنانچہ ردِّ عمل کے طور پر بہت سی

---

[1] مولانا عبدالمجید سالک "مسلم ثقافت ہندوستان میں"

Marfat.com

تحریکوں نے جنم لیا جو شنکراچاریہ، رامانُج کے ناموں سے منسوب ہیں۔ چنانچہ اسلام کے اثر سے ہندومت کا روحانی ارتقا، جو برہمنوں کے رجعت پسندانہ اقتدار سے رُک گیا تھا، پھر سے شروع ہو گیا اور اس میں از سرِ نو حرکت پیدا ہو گئی۔ اسلام کے مسئلۂ توحید کے اثر سے ہندومت میں ایک نئے مکتبِ خیال کی بنیاد پڑی جو بھگتی تحریک کے نام سے معرضِ وجود میں آئی

بھگتی کا پرچار کرنے والوں نے بتایا کہ برہمنوں کی بتلائی ہوئی قربانیاں اور ریاضت بے سود ہیں۔ اصل چیز خدا کی محبت ہے۔ اسی لئے بھگتی میں بھجنوں پر، رام اور کرشن، کا نام جپنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ دل میں ذوقِ عبودیت اور عشقِ الٰہی پیدا ہوتا ہے۔ بھگتی تحریک کی پرجوشی اور سرگرمی بڑی حد تک مسلم تصوف کی مرہونِ منت تھی۔ مبلغین اور صوفیائے کرام کی زندگیاں نہایت پاکیزہ تھیں وہ اسقدر وسعتِ خیال واقع ہوئے تھے کہ ذات پات اور چھوت چھات کی تمیز سے بالاتر ہو کر نیچی ذات کے لوگوں، اُمرا، غربا اور غیر مسلموں کے ساتھ محبت آشتی سے ملتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ اور ملک کے مذہبی حلقوں میں توحید پرستی اور رواداری کے جذبات فروغ پانے لگے۔ بھگتی تحریک کے مبلغین نے بھی یہی رنگ اختیار کیا۔ انہوں نے اپنا حلقۂ اوادت میں نہ صرف ذات پات بلکہ ہندو اور غیر ہندو کی تمیز کو بھی اُڑا دیا، اور محبت، رواداری اور صلح کا پرچار کرنے لگے۔

بھگتی تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ اُن کے روحانی خیالات و جذبات میں یکجہتی پیدا ہونے لگی اور برِ صغیر کی غیر مسلم اقوام میں بھی توحید کی ترویج ہوئی۔ مگر اس تحریک کا ایک نقصان اسلام کو یہ پہنچا کہ تبلیغ رُک گئی۔ اُس کا سبب یہ تھا کہ ہندو جن عقائد و خیالات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے تھے، وہ اُنہیں مذہب تبدیل کئے بغیر بھگتی تحریک کے ذریعے میسّر ہونے لگے۔

"بت پرستی، ذات پات کی تقسیم اور دوسری خرابیاں جو انہیں ہندو مذہب سے متنفر کر سکتی تھیں وہ بھگتی تحریک کے بعد عالمِ وجود میں آنے والے ہندو ذہنوں میں مفقود تھیں۔ علاوہ ازیں ایک شخص کا پرانا عقیدہ ترک کر کے بھگتی تحریک میں شامل ہو جانا قبولِ اسلام سے زیادہ آسان تھا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے اعزہ و اقربا سے تعلق قائم رکھ سکتا تھا۔ اور اس کی برادری والے اُس کے موافق ہی رہتے تھے۔ بصورتِ دیگر اُسے اپنے ماحول کی دشمنی مول لینی پڑتی تھی۔ بھگتی تحریک کا ایک اچھا نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ برِ صغیر پاک و ہند میں بسنے والی اقوام میں روحانی یکجہتی پیدا ہوئی، رواداری اور خدمتِ خلق کے جذبات نے فروغ پایا اور لوگوں کو اختلافِ مذہب کے باوجود باہم پیار سے رہنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس سے ایک مشترکہ تمدن نے فروغ پایا اور اُردو زبان نے ترقی کی۔" [1]

ذیل میں بھگتی تحریک کے چند مقتدر رہنماؤں کا حال اختصار سے پیش کیا جاتا ہے:-

---

[1] پروفیسر عبد القادر و شجاع الدین

Marfat.com

رامانُج: بھگتی تحریک کے بانی رامانُج ۱۰۱۶ء میں مدراس کے ایک نواحی گاؤں میں ایک برہمن کے گھر پیدا ہُوئے۔ وہ وحدانیت کے حامی تھے۔ آپ کے نزدیک برہما اور ایشور ایک ہی ہیں۔ وہی رُوحِ اعظم ہے اُسکی ذات و صفات میں اُس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ ہر فعل سے مبرا ہے اُسی میں سے رُوح اور مادّہ نکلتے ہیں۔ رُوح خدا کو صرف بھگتی سے حاصل کر سکتی ہے۔ پہلی منزل ادائے فرض ہے، دُوسری منزل ریاضت ہے اور تیسری بھگتی۔ یعنی آپ نے شریعت و طریقت دونوں کی پابندی کو اصل عبادت اور باعثِ نجات قرار دیا۔ اگرچہ آپ ذاتوں کی قدیم تقسیم کے قائل تھے۔ لیکن آپ نے شُودروں اور چنڈالوں کے حقِ عبادت کو تسلیم کیا اور بعض مندر اُن کے لئے کھول دیئے[1]

چونکہ وہ وشنو کے پجاری تھے۔ اسلئے شِوَمت کے پیرو کار اُن کے خلاف ہو گئے۔ آپ نے اُن کی مخالفت کا صبر و تحمل سے مقابلہ کیا۔ شِوَمت کے پیرو جنوبی ہند کی چولا حکومت کے راجہ نے آپ کو مُلک بدر کر دیا جس پر آپ میسور آ گئے اور وہیں سُورگ باش ہُوئے۔

سوامی رامانند: سوامی رامانند ۱۲۹۹ء میں پریاگ (الہ آباد) کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے انہوں نے پریاگ و بنارس میں تحصیلِ علم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ وہ رامانج کے پانچویں جانشین تھے اُنہوں نے اپنے رُوحانی پیشوا کے عقائد کے برعکس ذات پات کی تفریق کی سخت مخالفت کی اور سنسکرت کو ترک کر کے عام زبان میں اپنے خیالات کا پرچار کیا، تاکہ عوام اور نیچ اقوام کے لوگ بھی اُن کی تعلیمات سے فیضیاب ہو سکیں یہی وجہ تھی کہ ہر ذات کے لوگ اُن کے حلقۂ ارادت میں شریک ہُوئے اُنہوں نے تمام تیرتھوں کا سفر کیا اور سری رامچندر جی اور سیتا جی کو وشنو کا مظہر قرار دیکر اُن کی پُوجا کو رواج دیا۔ اُنہوں نے ساری زندگی شمالی ہند کے مختلف علاقوں میں دھرم کی تبلیغ میں گذار دی اُن کے بارہ (۱۲) چیلے بڑے مشہور ہیں۔ جن میں ایک برہمن، ایک راجپوت، ایک حجام اور کبیر نامی ایک جولاہا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سوامی ولبھ اچاریہ: ولبھ اچاریہ تلنگانہ (دکن) کے باشندے تھے۔ ۱۴۷۹ء میں ایک برہمن کے ہاں پیدا ہُوئے کم عُمری میں ہی علم و فضل میں کمال حاصل کیا۔ اُنہوں نے برِّ صغیر کے مُختلف حصّوں کے مذہبی مراکز کی یاترا کی، اور آخر میں بنارس میں مستقل سکونت اختیار کی۔ وہ وشنو کے پیرو تھے اور کرشن جی کو وشنو کا مظہر قرار دیتے تھے۔ اُنہوں نے کرشن اور رادھا کی محبت اور گوپیوں کی چھیڑ چھاڑ کو اپنی بھگتی اور عبادت کی رسوم میں خاص جگہ دی۔ اُن کے نزدیک رادھا کرشن کی محبت میں شریک ہونا دائمی مسرت اور بھگتی کا آخری مقصد تھا۔ وہ بھگتی کو مایا (دولت) کے جال سے نکلنے کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ رادھا کرشن کی یہ طرب انگیز لیلا لوگوں میں اسقدر مقبول

---

[1] "ہندو ثقافت پر اسلام کا اثر" ڈاکٹر تارا چند۔

Marfat.com

ہو گئی کہ ولبھ کی وفات کے بعد اُن کے پیروؤں نے بدعنوانیاں شروع کر دیں۔ جس کے باعث اُن کا مت بہت بدنام ہو گیا۔ ولبھ اچاریہ نے ریاضت، نفس کُشی اور ترکِ دُنیا کی بھی تعلیم دی۔

سوامی چے تنّیہ: بھگتی کے مشہور پرچارک سوامی چے تنّیہ ۱۴۸۵ء میں نادیہ (بنگال) کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پچیس برس کی عمر میں تارک الدُنیا ہو کر سنیاسی بن گئے۔ اور مُلک بھر میں دَورہ کر کے پریم اور شانتی کا پرچار کرنے لگے۔ اُن کی شخصیت میں بلا کی کشش و جاذبیت تھی۔ جب بھگتی کے نشے میں سرشار ہو کر محبت (پریم) اور صلح (آشتی) کا پرچار کرتے تو ہزاروں ہندو فرطِ عقیدت سے تعظیماً اُن کے آگے جُھک جاتے۔ اُن کی تعلیم تھی کہ کرشن، ہر آتما (روح) میں موجود ہے۔ اس لئے ہر ذی رُوح سے محبت کرو اور عجز و انکسار کو اپنا شعار بناؤ۔ سوامی چے تنّیہ اُونچ نیچ اور ذات پات کی تمیز کے قائل نہ تھے۔ بلکہ غریبوں اور مصیبت زدوں سے پریم و محبت سے پیش آتے۔ حتیٰ کہ اچھوتوں اور چنڈالوں کو گلے لگا لیا کرتے تھے۔ اُن کی تبلیغ کا لبِّ لباب یہ تھا کہ بھگوان کے نزدیک برہمن اور شودر میں کوئی امتیاز نہیں تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور تسکینِ قلب اور دائمی مسرت صرف خدا کی عبادت اور محبت و شانتی سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے بنگال و اڑیسہ میں اب تک لاکھوں ہندو سوامی چے تنّیہ کو سری کرشن کا مظہر (اوتار) مانتے ہیں اور اُن کا بے حد احترام کرتے ہیں۔

بھگت کبیر: بھگت کبیر رامانند کے چیلوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق اُن کی پیدائش ایک برہمن بیوہ کے بطن سے ہوئی جو اُنہیں بنارس کے ایک تالاب کے کنارے چھوڑ گئی تھی۔ جہاں سے نیرو نامی ایک جولاہا اُنہیں اُٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ اور نیرو اور اُس کی بیوی نیما نے اُنہیں متبنّیٰ بنا لیا۔ اس طرح کبیر نے ایک مُسلم گھرانے میں پرورش پائی۔ تذکرۂ اولیائے ہند میں اُن کا نام شیخ کبیر مرقوم ہے۔ اُنہوں نے اسلامی تصوّف کے خیالات شیخ بھیکا چشتی اور شیخ تقی سہروردی، اور ہندو ویدانت کے تخیلات رامانند سے سیکھے۔ اُنہوں نے دونوں قوموں کو متحد کرنے کی تحریک شروع کی وہ ایک خاص طرز و اسلوب کے شاعر تھے اور اُن کی ہندی شاعری معرفتِ ربّانی اور بھگتی کے خیالات سے معمور ہے۔ وہ وحدانیت کے علمبردار اور بُت پرستی کے سخت مخالف تھے۔

بھگت کبیر کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا ایک ہے اُس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں اُنہوں نے ذات پات کی تفریق اور چھوت چھات کو گمراہ کُن اور خرافات قرار دیا۔ ہر انسان کو عرفانِ الٰہی کے حصول میں مصروف رہنا چاہیئے۔ جب تک دِل ریا، فریب اور بُنیادی اغراض سے پاک نہ ہو، عبادت اور تپسیا بے سُود ہے دل میں ہمیشہ خدا کی محبت ہونی چاہیئے۔ اور ہر انسان کو خلوص، رواداری، بے غرضی، اور انسانی مساوات کا پیکر ہونا چاہیئے۔ اُن کی پاکیزہ تعلیمات کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لوگ اُن کے مُرید تھے۔ ہندو معتقدین انہیں کبیر پنتھی اور مسلمان مرید اُنہیں شیخ کبیر کہتے تھے۔ انہیں ہر مکتبِ خیال کے لوگوں میں عزت و مقبولیت حاصل تھی۔ اُن کی ہر دلعزیزی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وعظ و نصیحت میں نہایت شیریں اور سادہ زبان استعمال

Marfat.com

کرتے تھے۔ اسرارِ معرفت اور حقائقِ زندگی سے معمور اُن کے سادہ اور دلآویز دوہے آج بھی برِّ صغیر کی ادبی میراث کا ایک انمول حصّہ ہیں۔

بابا گورو نانک : بابا گورو نانک ۱۴۶۹ء میں ضلع شیخوپورہ کے ایک قصبہ تلونڈی (ننکانہ صاحب) میں پیدا ہوئے۔ تیس سال کی عمر میں تارک الدنیا ہو کر دُور دُور کے ممالک کی سیاحت کی۔ اور وہاں کے تیرتھوں اور خانقاہوں اور دوسرے مقدّس مقامات پر جا کر سادھوؤں سنتوں اور صُوفیوں کی صحبت سے استفادہ کیا اور پھر اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی۔ بابا گورو نانک نے بھگت کبیر کے انداز پر توحیدِ الٰہی کی تلقین کی اور مذہبی رذالت پات کے اختلاف کی مذمّت کی۔ اُن کے خیالات پر اسلام کا گہرا اثر تھا۔ "آپ کے نزدیک خلوص، دل کی پاکیزگی، لطف و مہربانی اور حلم و انکسار کو دُنیا بھر کی عبادتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ گورو نانک نے اپنی تصانیف میں مُسلمانوں کی مذہبی کُتب اور متصوّفانہ خیالات سے بہت استفادہ کیا"۔ چنانچہ آپ کے کلام میں اسلامی تصوّف کا رنگ نمایاں ہے۔ گورو نانک کی وسیع المشرب تعلیمات نے آگے چل کر سکھ مذہب کی شکل اختیار کی۔ اُن کے پیروکار سِکھ کہلاتے ہیں۔ اگرچہ مسلم حکومت سے سکھوں کا تصادم بھی ہوا۔ لیکن سکھ آج تک توحید کے قائل ہیں اور بُت پرستی کے دُشمن ہیں"۔ "اُن کی عبادت و ریاضت اور وظائف کے طریقے بڑی حد تک مُسلمانوں سے ملتے جُلتے ہیں"۔ آپ نے ۱۵۳۸ء میں کرتارپور کے مقام پر وفات پائی۔

دادو : ۱۵۴۴ء میں احمد آباد (گجرات) میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک روشن خیال بُزرگ تھے اُن کی عمر جونا بی بعد میں بسر ہوئی۔ انہوں نے ہندوؤں کو تعصّب سے بالاتر رہ کر باہمی محبت و صلح کی تلقین کی۔ مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک حقیقت پسند شاعر بھی تھے اور بُت پرستی اور ذات پات کی تمیز کے خلاف تھے۔ غریب داس اور سادھو داس اُن کے دو مشہور چیلے تھے۔ جنہوں نے اُن کی تعلیمات کو راجپوتانے میں پھیلایا اور لاہور میں چھجّو بھگت نے۔

امتحانی سوالات

۱۔ سلطنتِ دہلی میں تصوّف کے کون سے سلسلے مقبول ہوئے۔ حکومت کے بارے میں اُنکا مسلک بیان کیجئے۔

۲۔ برِّ صغیر پاک و ہند میں مُسلم مشائخ نے اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں کیا کارنامے سرانجام دیئے۔ نامور اور مقتدر مشائخ کے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کیجئے۔

۳۔ بھگتی تحریک سے کیا مُراد ہے اُس کی ابتدا کہاں اور کیسے ہوئی اُسکے اہم پرچارکوں کا تذکرہ کیجئے۔

۴۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھئے۔

خواجہ معین الدین اجمیریؒ	بابا فرید گنج شکرؒ	شیخ نظام الدین اولیاءؒ
شیخ بہاء الدین زکریاؒ	مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ	سیّد محمد غوث گیلانی قادریؒ
رامانج	بھگت کبیر	بابا گورو نانک

Marfat.com

اسی مصنّف کے قلم سے

تاریخِ اِسلام

(عہدِ رسالت تا بنو اُمیّہ)

Marfat.com

اسی مصنّف کے قلم سے

تاریخِ پاکستان

۱۷۰۷ء تا ۱۹۷۳ء

Marfat.com

عہدِ مُغلیہ

Marfat.com

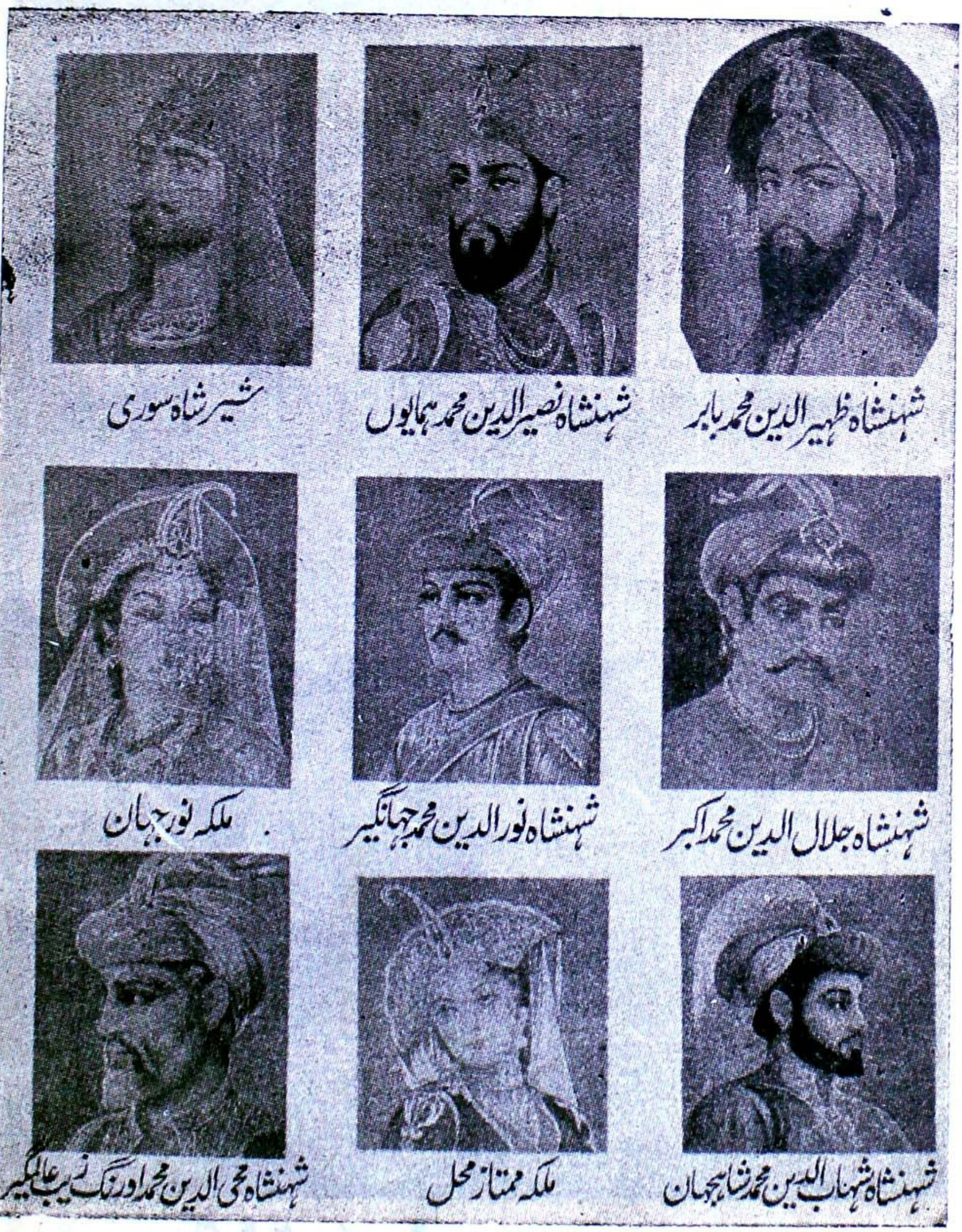
Marfat.com

سکّہ جاتِ سلطنتِ مُغلیہ



پیشکار: قریشی برادرز پبلشرز چوک اردو بازار ۲۰۷۔ سرکلر روڈ لاہور

Marfat.com


شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر
شہنشاہ نصیر الدین محمد ہمایوں
شیر شاہ سوری
شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر
شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر
ملکہ نور جہان
شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہجہان
ملکہ ممتاز محل
شہنشاہ محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر

Marfat.com

پہلا باب

بابر کی آمد پر برِصغیر پاکستان و ہند کی حالت

"سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں برِصغیر پاکستان و ہند ریاستوں کا ایک جمگھٹا تھا اور اس حملہ آور کے لئے آسان شکار ثابت ہو سکتا تھا جس میں اس کو فتح کرنے کی طاقت اور استعداد موجود ہو۔" [1]

—— ایشوری پرشاد ——

سیاسی حالت

سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں بابر کے حملے کے وقت برصغیر پاکستان و ہند سیاسی انتشار کا شکار تھا۔ مرکزیت اور استحکام کا نام و نشان تک نہ تھا۔ انتشار و بدنظمی، لامرکزیت اور عدم استحکام کی وجہ سے برصغیر کی سیاسی حالت ابتر تھی بابر کے حملے کے وقت برصغیر پاک و ہند سیاسی لحاظ سے لاتعداد خود مختار ریاستوں میں منقسم تھا۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

سلطنتِ دہلی سلطنت دہلی پر لودھی سلاطین قابض تھے اور برصغیر پاک و ہند کے شہنشاہ کہلاتے تھے۔ لیکن لودھی سلطنت بے حد کمزور تھی۔ اس لئے تمام ملک پر اس کا کنٹرول نہ تھا۔ سیاسی خلفشار اور عدم استحکام کے باعث سلطنتِ دہلی صرف دہلی، آگرہ، دوآبہ، جونپور، بہار کے کچھ حصہ، بیانہ اور چندیری کے علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ بابر کی آمد کے وقت سلطنت دہلی کا بادشاہ سلطان ابراہیم لودھی تھا جو ۱۵۱۷ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ بہت ہی غیر مدبر اور ظالم بادشاہ تھا اس کی برہم مزاجی اور شکی طبیعت کی وجہ سے امراء، وزراء اس کے خلاف سازشوں میں مشغول رہتے اور آئے دن

---

[1] "اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا" صفحہ ۲۹۲

Marfat.com

بغاوتیں برپا کیے رکھتے تھے۔ ۱۵۲۱ء میں مشرقی صوبوں (بہار اور جونپور) کا حاکم بہار خاں یا بہادر خاں خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ دیپالپور کے حاکم عالم خاں لودھی اور لاہور کے گورنر دولت خاں لودھی نے بھی بغاوت کر دی بلکہ دونوں نے راجہ سنگرام سنگھ عرف رانا سانگا والئے میواڑ سے ساز باز کر کے کابل کے بادشاہ بابر کو برصغیر پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ ابراہیم لودھی اپنے متشددانہ رویہ کی وجہ سے حالات سدھارنے سے قاصر تھا۔ اگرچہ ابراہیم لودھی نے سلطنت کے وقار کو بحال رکھنے اور امراء کو تابع فرمان بنانے کی کوشش کی مگر چونکہ وہ سیاسی بصیرت، تدبر اور موقع شناسی سے یکسر عاری تھا اس لئے وہ ناکام رہا اور امراء نے بغاوتوں اور سازشوں سے سلطنت دہلی کے رہے سہے وقار اور دبدبہ کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔

پنجاب

پنجاب کا صوبہ برائے نام سلطنت دہلی کے زیر نگین تھا۔ ابراہیم لودھی کا رشتہ دار دولت خاں لودھی یہاں کا حاکم تھا اس نے اپنے بیٹے دلاور خاں کے ساتھ کی گئی بدسلوکی کے باعث ابراہیم لودھی کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی علاوہ ازیں اقتدار دہلی پر کاری ضرب لگانے کی غرض سے اپنے بیٹے دلاور خاں کو کابل بھیج کر بابر کو نہ صرف برصغیر پاک و ہند پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی بلکہ تیمور کے وارث کی حیثیت سے پنجاب پر اس کا قبضہ بھی تسلیم کر لیا۔

ملتان و سندھ

صوبہ سندھ جو محمد تغلق کے عہد کے اختتام پر سلطنت دہلی کی سیادت سے آزاد ہو کر خود مختار ہو گیا تھا اور جہاں سمرا خاندان کے جام خیر الدین نے اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا سولھویں صدی عیسوی کے ربع اول میں سیاسی انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار تھا۔ بابر کی آمد سے قبل ۱۵۲۰ء میں سمرا خاندان کے دور انحطاط سے فائدہ اٹھا کر شاہ بیگ ارغون نے سندھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ شاہ بیگ ارغون پہلے قندھار کا حاکم تھا لیکن بابر نے اسے شکست دے کر قندھار پر قبضہ کر لیا اور اسے سندھ کی جانب دھکیل دیا۔ شاہ بیگ ارغون کے بیٹے حسین شاہ نے ملتان کو فتح کر کے سندھ میں شامل کر لیا تھا۔ بابر کے حملے کے وقت سندھ و ملتان میں ارغون خاندان کا اقتدار اپنے انتہائی عروج کو پہنچا ہوا تھا۔

کشمیر

کشمیر کو ۱۳۲۹ء میں شاہ مرزا نے آزاد کرایا تھا لیکن یہاں اسلام کی شمع روشن کرنے والے بزرگانِ دین بلبل شاہ اور میر سید علی ہمدانی تھے جن کے روحانی فیوض و برکات سے اس خطے میں مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوا۔ کشمیر کا مشہور ترین حکمران زین العابدین (۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء) تھا جس نے اپنی خداداد لیاقت و

Marfat.com

فراست سے نہ صرف مذہبی رواداری کی پالیسی اپنائی بلکہ گوناگوں انتظامی اور سماجی اصلاحات نافذ کرکے اپنی رعایا کو اقتصادی خوشحالی بخشی۔ نیز اس کے دور حکومت میں کشمیر نے علمی اور ادبی لحاظ سے بھی خوب ترقی کی۔ مورخین زین العابدین کو کشمیر کا اکبر تصور کرتے ہیں۔ ۱۴۷۰ء میں اس کی وفات کے بعد یہاں بدامنی اور انتشار کا دور دورہ ہوا۔ ۱۵۴۰ء میں تاریخ رشیدی کے مصنف مرزا حیدر نے صرف چار ہزار سپاہ کی جمعیت سے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ مرزا حیدر کے عہد میں کشمیر نے علوم و فنون کے علاوہ اقتصادی طور پر بھی خوب ترقی کی۔ ۱۵۵۱ء میں مرزا حیدر اپنے امراء کی سازشوں کا شکار ہوا اور اس سرزمین فانی سے کوچ کر گیا۔

بہار اور جونپور پندرھویں صدی میں بہار اور جونپور کا علاقہ سلطنت دہلی میں شامل تھا۔ کیونکہ بہلول لودھی نے ۱۴۷۸ء میں سلطان حسین شاہ شرقی کو شکست دے کر باقاعدہ طور پر سلطنت دہلی سے اس کا الحاق کر لیا تھا لیکن ابراہیم کی آمرانہ پالیسی کی وجہ سے یہاں کے افغان امراء نے دریا خاں لوہانی اور ناصر خاں لوہانی کی زیر قیادت اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بابر کے حملے کے وقت یہاں دریا خاں لوہانی کے بیٹے بہار خاں یا بہادر خاں کی حکومت قائم تھی۔

بنگال بنگال حسینی خاندان کے حکمرانوں کے زیر نگیں تغلق سلاطین کے عہد سے ہی آزاد اور خود مختار صوبہ تھا۔ اس خاندان کا بانی سید علاؤ الدین حسین شاہ (۱۴۹۳ء تا ۱۵۱۹ء) تھا جو ایک نہایت لائق اور رعایا پرور حکمران تھا۔ اس کا عہد امن و امان کا عہد تھا اس نے آسام، اڑیسہ اور کوچ بہار تک اپنی سلطنت کی حدود میں توسیع کی۔ علاؤالدین حسین شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نصرت شاہ تخت نشین ہوا۔ بابر کے حملے کے وقت بنگال پر نصرت شاہ حکمران تھا اس نے بابر سے دوستانہ تعلقات استوار کر لئے تھے نصرت شاہ نے اپنے عہد حکومت میں نہ صرف بنگالی ادب کی سرپرستی کرتے ہوئے ہندوؤں کی متبرک کتاب مہا بھارت کا بنگالی زبان میں ترجمہ کرایا بلکہ فن تعمیر اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کے سلسلے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔

مالوہ سلاطین دہلی کے دور میں مالوہ کے صوبیدار دلاور خاں غوری نے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ لیکن ۱۴۳۵ء میں غوری سلطان کے وزیر محمود خاں نے مالوہ کے تخت پر قبضہ کر کے خلجی خاندان کے اقتدار کی بنیاد ڈالی۔ محمود خلجی ایک قابل اور اولوالعزم حکمران تھا تاریخ فرشتہ کا مصنف محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ اسکی بہادری، قابلیت اور علم

Marfat.com

گستری کی بہت تعریف کرتا ہے۔

بابر کے حملے کے وقت محمود شاہ ثانی مالوہ کا حکمران تھا جس نے سلطنت کے جملہ اختیارات راجپوت وزیر مدنی راؤ کو تفویض کر رکھے تھے۔ مدنی راؤ نے سلطنت کے اہم عہدوں پر ہندوؤں کو تعینات کر رکھا تھا اور مسلمان امراء سے اس کا سلوک قابلِ تحسین نہ تھا۔ مسلمان امراء نے والئے گجرات کی مدد سے اس کا اقتدار ختم کرنا چاہا لیکن مدنی راؤ بہت ہوشیار واقع ہوا تھا اس نے سنگرام سنگھ عرف رانا سانگا والئے میواڑ کی مدد سے باغی امراء کو شکست دے کر سلطان محمود شاہ ثانی کو بھی قید کر لیا۔ بعد ازاں والئے گجرات کے ڈر سے اسے آزاد کر دیا۔ بالآخر ۱۵۳۱ء میں گجرات کے سلطان بہادر شاہ نے مالوہ پر قبضہ کر کے اس کی خود مختار حیثیت کو ختم کر کے رکھ دیا۔

گجرات کاٹھیاوار

گجرات کا صوبہ ۱۴۰۱ء میں نومسلم راجپوت کے بیٹے ظفر خاں کی سرکردگی میں خود مختار ہوا۔ جس نے ظفر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ ۱۵۱۱ء میں یہاں مظفر شاہ ثانی کی حکومت تھی جو مالوہ پر قبضہ کرنے کا خواہاں تھا۔ جب رانا سانگا نے مدنی راؤ کے ایما پر مالوہ پر فوج کشی کی اور مالوہ کے سلطان محمود ثانی کو گرفتار کر لیا تو اسے والئے گجرات مظفر شاہ ثانی ہی کی مداخلت کے پیش نظر محمود ثانی کو چھوڑنا پڑا تھا۔ بابر کے حملے کے وقت سلطنت دہلی کے بعد گجرات، برصغیر کی دوسری اہم اور عظیم مسلم سلطنت تھی ۱۵۲۶ء میں مظفر شاہ ثانی کی وفات پر اس کا بیٹا بہادر شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ فتوحات کا شوقین اور بلند عزائم کا مالک تھا وہ سارے برصغیر کا بادشاہ بننے کا خواہشمند تھا۔ اس نے ۱۵۳۱ء میں مالوہ پر قبضہ کر لیا۔

خاندیش

دریائے تاپتی کی وادی میں واقع ریاست خاندیش پر فاروقی خاندان کی حکومت تھی۔ یہ ریاست فیروز شاہ تغلق کے وقت سے ہی آزاد و خود مختار چلی آ رہی تھی۔ اس کا پہلا مسلمان حکمران راجہ فاروقی تھا اس کا پایہ تخت برہان پور تھا۔ بابر کے حملے کے وقت یہاں میراں محمد حکمران تھا اگرچہ دہلی سے دور واقع ہونے کی وجہ سے سیاسی اور فوجی نقطۂ نگاہ سے ریاست خاندیش زیادہ اہم حیثیت کی حامل نہ تھی مگر خوشحالی اور تجارت کے لحاظ سے بڑی شہرت کی مالک تھی۔

بہمنی سلطنت

۱۳۴۷ء میں حسن بہمنی نے محمد تغلق کے خلاف علم بغاوت بلند کر بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یہ سلطنت اپنے عروج پر تھی لیکن ۱۴۸۱ء میں محمود گاوان کی موت کے بعد بہمنی سلطنت زوال پ

Marfat.com

ہوئی۔ چنانچہ برصغیر پاک و ہند پر بابر کے حملے سے پیشتر بہمنی حکومت ایک عظیم الشان سلطنت کی بجائے پانچ چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستوں میں بٹ چکی تھی جن کا بعد ازاں مغلوں نے یکے بعد دیگرے الحاق کر لیا ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

۱۔ **ریاست برار** : ۱۴۸۴ء میں عماد شاہی حکومت کے تحت آزاد ہوئی بابر نے ۱۵۲۷ء میں اس پر قبضہ کر کے اسے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔

۲۔ **ریاست احمد نگر** : احمد نگر نے ۱۴۸۶ء میں نظام شاہی حکومت کے تحت خود مختاری اختیار کی اس کا بعہد شاہجہانی ۱۶۳۳ء میں مغلیہ سلطنت سے الحاق ہوا۔

۳۔ **ریاست بیجاپور** : ۱۴۸۹ء میں یہاں عادل شاہی حکومت قائم ہوئی جس کو ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔

۴۔ **ریاست گولکنڈہ** : ۱۵۱۲ء میں گولکنڈہ میں قطب شاہی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۶۸۷ء میں عالمگیر نے اس پر قبضہ کر کے باقاعدہ طور پر مغلیہ سلطنت کے ساتھ اس کا الحاق کر لیا۔

۵۔ **ریاست بیدر** : بیدر پر ۱۵۲۶ء میں امیر بریدنے بریدشاہی حکومت قائم کر لی ۱۶۶۰ء میں بعہد اکبری مغلیہ سلطنت سے الحاق ہوا۔

بابر کے حملے کے وقت یہ ریاستیں وجے نگر کے خلاف نبرد آزمائی اور باہمی آویزشوں میں مصروف تھیں۔

وجے نگر | یہ برصغیر پاک و ہند کی ہندو ریاستوں میں ایک اہم ترین ریاست تھی۔ بابر کے حملے کے وقت یہاں کرشنا دیو (۱۵۰۹ء تا ۱۵۳۰ء) حکمران تھا جسے ریاست وجے نگر کا عظیم ترین راجہ سمجھا جاتا ہے وجے نگر کا شہر اسی نے آباد کیا تھا۔

وجے نگر کی حکومت محمد تغلق کے عہد کے دوران (۱۳۲۶ء) دو بھائیوں ہری ہر اور بکا نے قائم کی تھی۔ کرشنا دیو نے بہمنی سلطنت کے زوال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے کئی علاقے زیر نگیں کر لئے۔ وہ فن تعمیر اور علم و ادب میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں وجے نگر کی ریاست اپنے عروج پر تھی۔

اڑیسہ | یہ ہندو ریاست بھی خاصی بڑی تھی اور شمالی ہند کی سیاست سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ اس ریاست کو کئی بار شمال سے بنگال کے مسلم فرمانرواؤں اور جنوب سے وجے نگر کے ہندو راجاؤں کے جارحانہ حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا تاہم اس نے اپنے وجود کو برقرار رکھا۔

Marfat.com

راجپوتانہ راجپوتانہ میں امبر، گوالیار، اجمیر، بیکری، کالپی، بوندی اور میواڑ کی ہندو ریاستیں شامل تھیں۔ جن میں ریاست میواڑ سب سے اہم تھی۔ اور وہ ہندوؤں کے قومی جذبات کی صحیح آئینہ دار تھی۔ چتوڑ کا شہر اس کی راجدھانی تھا۔ اس ریاست کا کامیاب اور قابل ترین حکمران رانا کمبھار (۱۴۳۳ء تا ۱۴۶۸ء) تھا جس نے اپنی سلطنت کے دفاع اور استحکام کے لئے نہ صرف جا بجا مضبوط قلعے تعمیر کرائے بلکہ اپنے دارالخلافہ کو عروس البلاد بنانے کی غرض سے وہاں بہت سی خوبصورت اور عالیشان عمارات تعمیر کرائیں۔ اس نے مالوہ کے سلطان کو شکست دے کر وسطِ ہند میں میواڑ کی برتری بھی قائم کی۔

برصغیر پہ بابر کے حملے کے وقت راجہ سنگرام سنگھ عرف رانا سانگا (۱۵۰۹ء تا ۱۵۲۹ء) میواڑ کا حکمران تھا۔ یہ راجہ نہایت ہی جنگجو اور نڈر سپاہی تھا اس نے شاہانِ دہلی اور مالوہ کے خلاف ۱۸ جنگوں میں فتوحات حاصل کی تھیں۔ رانا سانگا کو ایک بہادر جنگجو اور ایک سو جنگوں کا ہیرو لکھتے ہوئے ایک مورخ ٹوڈ (TOD) رقمطراز ہے کہ "رانا سانگا کے جسم پہ زخموں کے ۸۰ نشانات تھے وہ ان جنگوں میں ایک ٹانگ ایک ہاتھ اور ایک آنکھ سے محروم ہو چکا تھا۔" رانا سانگا دہلی میں ہندو راج کا خواہاں تھا۔ ۱۵۲۷ء میں بابر نے اسے کنواہہ کے مقام پہ عبرتناک شکست دی۔ پروفیسر رش بروک ولیمز کے قول کے مطابق "صرف رانا سانگا ہی ایک مضبوط ترین اور طاقتور ہندو حکمران تھا جس نے ہندوستان کی تسخیر کے دوران بابر سے سنجیدگی کے ساتھ جنگ آزمائی کی۔"

پرتگیز مشہور پرتگیز جہازران واسکوڈے گاما ۱۴۹۸ء میں راس امید کا چکر کاٹ کر جنوبی ہند کی بندرگاہ کالی کٹ میں لنگرانداز ہوا۔ اس نے مغربی اقوام کے لئے برصغیر پاک و ہند کا نیا بحری راستہ دریافت کیا جس سے برصغیر اور یورپ کی تجارت ترقی پذیر ہوئی۔ پرتگیز عیسائیت کے حامی تھے اور انہوں نے یہاں عیسائیت کی خوب تبلیغ کی۔ برصغیر پہ بابر کے حملے کے وقت (۱۵۲۶ء) پرتگیزوں نے برصغیر کے ساحلی علاقوں میں متعدد تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی تھیں۔ گوا ان کے مقبوضات کا صدر مقام تھا۔

تبصرہ بابر کے حملے کے وقت برصغیر پاک و ہند بے شمار چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن میں باہمی اتحاد و یگانگت یکسر مفقود تھی۔ یہ ریاستیں ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ مرکزی طاقت کا فقدان تھا اور عزم و استقلال رکھنے والا کوئی بھی غیر ملکی حملہ آور اس ملک پر قابض ہو سکتا تھا۔ بابر میں یہ تمام اوصاف موجود

Marfat.com

تھے وہ عزم و استقلال کا پتلا اور جرأت و شجاعت کا پیکر تھا۔ بدیں وجہ اس نے پانی پت کے تاریخی میدان میں سلطنتِ دہلی کے سلطان ابراہیم لودھی کو شکست فاش دے کر اس پر فتح پائی اور مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے کہ "سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں برصغیر پاک و ہند ریاستوں کا ایک جمگھٹا تھا اور اس حملہ آور کے لئے آسان شکار ثابت ہو سکتا تھا جس میں اس کو فتح کرنے کی طاقت اور استعداد موجود ہو"

"India was a congeries of states at the opening of the 16th century and likely to be the easy prey of an ivader who had the strength and will to attempt her conquest."

(Ishwari Prashad)

بابر کے حملے کے وقت برصغیر بدامنی اور سیاسی انتشار کا شکار تھا جیسا کہ بابر خود "تزکِ بابری" میں اس کی تصدیق کرتا ہے کہ "جب میں نے اس خطۂ سرزمین کو فتح کیا تو یہاں پانچ مسلمان اور دو ہندو حکمرانوں کے علاوہ متعدد روسا حکمران تھے۔" چنانچہ منتشر، غیر متحد اور مرکزیت و استحکام سے محروم ہونے کے باعث برِصغیر پر بابر کا حملہ بروقت اور حالات کے عین مطابق تھا۔

قُدرتی حالت

سولھویں صدی عیسوی کے برصغیر پاک و ہند کی قدرتی حالت کے متعلق بابر اپنی شہرۂ آفاق خودنوشت 'تزک بابری' میں کافی روشنی ڈالتا ہے وہ لکھتا ہے کہ برِصغیر پاک و ہند ایک وسیع خطۂ ارضی ہے جو دنیا کے دوسرے ملکوں سے بالکل مختلف ہے یہ آبادی سے بھرپور اور زر و جواہر سے معمور ہے اور دولت کی فراوانی کے باعث عموماً سونے کی چڑیا کے نام سے مشہور ہے اس کے تمام قدرتی مناظر، پہاڑ، دریا، جنگلات، میدان جداگانہ کیفیات کے حامل ہیں۔ اس کے نباتات، کھیت، جانور، باشندے اور ان کی زبانیں حتیٰ کہ اس کی آب و ہوا اور موسم سبھی کچھ دیگر ممالک سے مختلف نوعیت کے ہیں۔ دریائے سندھ کو عبور کرتے ہی سب چیزیں بدلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ درخت، پتھر، خانہ بدوش قبائل عوام کے رسم و رواج اور عادات سب کچھ قطعی طور پر ہندوستانی طرز کے آئینہ دار دکھائی دیتے ہیں۔

Marfat.com

یہاں کی آب وہوا موسم برسات میں نہایت خوشگوار ہوتی ہے بعض اوقات دن میں دس پندرہ بلکہ بیس مرتبہ بھی بارش ہوتی ہے۔ بارش کے فوراً بعد ہر سُو جل تھل ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ خشک علاقوں میں بھی پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ بعض اوقات بارش کا پانی دریاؤں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بارش کے دوران آب وہوا نہایت لطیف وخوشگوار ہو جاتی ہے۔ موسم برسات کی یہ بڑی خرابی ہے کہ نمی بہت ہو جاتی ہے بارش کے دنوں میں کتابیں، زرہ بکتر، کپڑے، فرنیچر سبھی کچھ حتیٰ کہ تیر کمان بھی نم آلود ہو جاتی ہے۔

گرمی، سردی اور برسات کے دنوں میں موسم بڑا خوشگوار ہوتا ہے لیکن تالی ہوائیں ہمیشہ چلتی رہتی ہیں جن کے باعث بڑی کثرت سے گرد وغبار اڑتا رہتا ہے۔ بارش آنے سے قبل گرد وغبار سے اٹی ہوئی تند ہوائیں دن میں پانچ چھ بار اس تیزی سے چلتی ہیں کہ مطلع بہت زیادہ گرد آلود ہو جاتا ہے۔ برصغیر کے لوگ اسے آندھی کہتے ہیں۔

معاشرتی حالت

برصغیر پاک وہند کی معاشرتی حالت کے بارے میں بابر اپنے تجربات اور مشاہدات کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ "برصغیر کے باشندے خوبصورت نہیں ہیں اور ان میں باہمی میل ملاپ، دوستانہ تعلقات اور خاندانی رکھ رکھاؤ کا ذوق نہ ہونے کے باعث باہمی انس اور معاشرتی میل ملاپ کا فقدان ہے۔ لوگ ذہین بھی نہیں ہیں ان میں فہم وفراست، مہذبانہ آداب ہمدردی اور ملاطفت بھی مفقود ہے۔ صنّاعی اور نئی نئی سکیموں کے لئے تخلیقی ذہن کا بھی فقدان ہے۔ نہ ہی وہ صنعت گری اور فن تعمیر میں نئی اختراعات کا شعور رکھتے ہیں۔ ان کے مکانات اچھے نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے ہاں اچھا گوشت، پھل، برف یا ٹھنڈا پانی میسر ہے۔ نہ بازار خوبصورت ہیں نہ اچھا کھانا دستیاب ہے اور نہ ہی وہاں حمام، اعلیٰ درسگاہیں اور مشعلیں میسّر ہیں۔"

سولھویں صدی عیسوی میں معاشرتی لحاظ سے برصغیر انقلابی دور سے گذر رہا تھا کیونکہ معاشرتی زندگی کے اہم شعبوں میں خاصی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ معاشرہ میں حاکم اور محکوم کے معیارِ زندگی میں بہت زیادہ تفاوت سولھویں صدی کے ہندوستانی معاشرے کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ ترکوں اور ہندوستانیوں کی باہمی رفاقت ومحبت میں کئی دشواریاں اور رکاوٹیں تھیں۔ ترک اپنے آپ کو ایک فاتح قوم تصور کرتے تھے اور اس گمان میں مبتلا تھے کہ

Marfat.com

وہ ملک کے سربراہ طبقہ کے افراد ہیں۔ اس طرح یہاں کے باشندوں اور ترکوں کے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔

دوسری طرف "ہندو جو کہ رسم و رواج، توہم پرستی اور ذات پات کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے وہ مسلمان فاتحین کو اجنبی، غاصب، غیر مہذب اور حقیر تصور کرتے تھے۔ دونوں قوموں کے مذہبی شعائر، رسم و رواج حتیٰ کہ زبان تک ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھی۔ ہندو ذات پات کی بنا پر مسلمانوں کو اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھتے تھے اس لئے ان سے علیحدہ رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے ہر دو اقوام کا باہمی میل جول، آپس میں لین دین اور دیگر سماجی تعلقات کا استوار ہونا ایک ناممکن سی چیز بن گیا تھا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد پر اگرچہ شروع میں ہندوؤں نے اس خوش فہمی کے تحت مسلمانوں کو قبول کر لیا تھا کہ یہ بھی بالآخر دیگر اقوام کی طرح ہندو سوسائٹی میں مدغم ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس خوش فہمی کی بنا پر بعض اوقات ہندو اپنی لڑکیاں ترک حاکموں کے نکاح میں دینے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ لیکن جب ترک حاکموں کی جانب سے شادی سے قبل ان ہندو لڑکیوں کو قبولِ اسلام کی ترغیب دی گئی تو یہی رشتے باہمی اختلافات اور ازدواجی جھگڑوں کا باعث بن گئے۔ "نتیجتہً" دونوں اقوام میں مذہبی و معاشرتی بیگانگی بدستور رہی لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی جانب سے کبھی تعصب کا اظہار نہیں ہوا۔

مسلم فاتحین اپنے ساتھ اسلامی تہذیب و تمدن لائے تھے جو مساوات، رواداری اور عدل گستری کے اصولوں پر مبنی تھی۔ چونکہ یہ سب کچھ ہندو سوسائٹی کے معاشرتی اصولوں اور مذہبی روایات سے یکسر مختلف تھا اس لئے مسلمان نہ تو ان کی سماجی قدروں کو اپنا سکے اور نہ ہی دیگر اقوام کی طرح ہندو معاشرہ میں ڈھل سکے۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ تاہم ہر دو اقوام کے احساسات اور رجحانات وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے چلے گئے۔ "نتیجتہً" آہستہ آہستہ دونوں اقوام میں یگانگت کا ماحول پیدا ہوتا چلا گیا۔ جب برصغیر میں اسلام کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا اور نو مسلموں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھنے لگی تو ہندو تہذیب پر اسلامی تہذیب و معاشرت کے اثر سے برصغیر میں ایک نیا تمدن معرض وجود میں آیا یعنی ہندوؤں میں بھگتی تحریک نے جنم لیا۔ جس پر اسلامی تہذیب کے گہرے اثرات غالب تھے۔ بھگتی تحریک کے علمبردار ملک میں ہندو مت کی اصلاح کے لئے خدا کی وحدانیت اور انسانی مساوات کا پرچار کرنے لگے۔ اور ساتھ ہی ذات پات کی طبقاتی تمیز کے خلاف وعظ کرنے لگے۔ جس سے اگرچہ اسلام کی اشاعت قدرے رک گئی مگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی

Marfat.com

یگانگت اور میل جول کے لئے فضا ہموار ہوگئی۔

اگرچہ سولھویں صدی میں بابر کے حملے کے وقت بھگتی تحریک کی بدولت ہندو معاشرہ کافی حد تک اصلاح پذیر ہو چکا تھا لیکن ہندوؤں میں ذات پات کی تمیز بدستور قائم تھی۔ برصغیر کے مسلمان بھی عقائد کے لحاظ سے اخوت و مساوات کے قائل ہونے کے باوجود طبقاتی تقسیم کے شکار تھے۔ اسلامی معاشرہ امراء غلام اور عوام کے طبقوں میں منقسم تھا۔ امراء کا گروہ برسر اقتدار اور حکمران طبقہ کہلاتا تھا۔ جاگیردار اور فوجی جرنیل منصب و حیثیت کے اعتبار سے امراء کی صف میں شامل تھے۔ یہ طبقہ عیش و آسودگی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن غلام کو بھی سوسائٹی میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ وہ لیاقت و محنت سے ترقی کر کے اعلیٰ مرتبہ کو پہنچ سکتا تھا بلکہ بادشاہ کا داماد اور وزیر و مشیر بھی بن سکتا تھا۔ سوسائٹی میں امراء کے بعد سرکاری افسران اور تجارت پیشہ افراد کا مرتبہ تھا البتہ عوام اور کاشت کار کمتر اور معمولی حیثیت کے لوگ متصور ہوتے تھے۔ لیکن مسلمانوں میں یہ طبقاتی تقسیم ہندو سوسائٹی کی مانند مستقل اور شدید قسم کی نہ تھی۔ کیونکہ ہر فرد اپنی ذہانت، قابلیت اور محنت اور استعداد کی بدولت معاشرہ میں نہ صرف نمایاں مقام بلکہ اعلیٰ منصب و اعزاز بھی حاصل کر سکتا تھا۔

سولھویں صدی عیسوی کے معاشرہ میں مستورات کو اعلیٰ مقام حاصل تھا اعلیٰ طبقے کی مستورات پردے کی سخت پابند تھیں۔ مسلم مستورات کو اسلامی معاشرہ کے تمام حقوق حاصل تھے وہ ملکی سیاست میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ البتہ ہندو معاشرہ میں عورت اپنے حقوق سے محروم تھی۔ بچپن کی شادی کا عام رواج تھا۔ ہندو بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت نہ تھی بلکہ اسے رسم ستی کے تحت اپنے خاوند کی نعش کے ساتھ جل مرنا ہوتا تھا۔

برصغیر پر بابر کے حملے کا زمانہ برصغیر میں علوم و فنون کی ترقی کا دور تھا۔ اشاعت تعلیم کے لئے حکومت کی زیر نگرانی ملک میں لاتعداد درسگاہیں موجود تھیں۔ نجی تعلیمی اداروں کو بھی شاہی سرپرستی حاصل ہوتی تھی اور انہیں حکومت کی طرف سے باقاعدہ مالی امداد ملتی تھی علماء اور طلباء کو سرکاری وظائف ملتے تھے۔ علمی مراکز کو حکومت کی طرف سے زمین بھی عطا کی جاتی تھی جس کا لگان معاف ہوتا تھا۔ شاہی تعلیمی درسگاہوں میں گرانقدر مشاہروں پر جید علماء اور اساتذہ متعین تھے جن کو گرانقدر مشاہرے ملتے تھے۔ سلاطین دہلی علوم و فنون کی خوب سرپرستی کرتے تھے۔

دہلی کی لودھی سلطنت اگرچہ زوال پذیر ہو رہی تھی لیکن لودھی سلاطین نے علوم و فنون کی پوری پوری سرپرستی کی۔ اس دور میں علم حدیث۔ فقہ اور فلسفے کو خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ لیکن

Marfat.com

علمِ تاریخ، ریاضت، ہیئت اور علم طب کو بھی عروج تھا۔ جونپور اس دور کا ایک عظیم تعلیمی مرکز تھا اور برصغیر کا شیراز کہلاتا تھا۔ اس دور میں فن کتابت، جلد سازی اور کتابوں کی تزئین و آرائش کے فن کو بھی بہت عروج حاصل ہوا۔

اگرچہ سرکاری زبان فارسی تھی لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل ملاپ اور اختلاط کی بدولت ایک نئی زبان نے جنم لیا جو اردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ چونکہ اس زبان میں فارسی کے علاوہ عربی، ہندی اور دیگر زبانوں کے الفاظ بکثرت شامل ہو گئے تھے اس لئے اس نے بہت جلد برصغیر کی عام فہم اور مقبول زبان کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس دور میں فنِ موسیقی نے بھی خوب ترقی کی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی موسیقی سیکھ کر نہ صرف نئے ساز بنائے بلکہ نئے راگ راگنیاں ایجاد کیں۔ جونپور اور کانہڑا راگ اسی دور کا نتیجہ ہیں علاوہ ازیں اسلامی تصوف کے عروج نے سماع اور قوالی کو بھی خوب فروغ دیا۔

معاشی حالت

بابر کے حملے کے وقت معاشی لحاظ سے برصغیر کی حالت بہت اچھی تھی۔ حکمران طبقہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ جنگ و جدل پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا تھا۔ برصغیر کی دولت و ثروت کی داستانیں دور دراز کے ملکوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ملک کی معاشی حالت کے استحکام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف بیرہ سے بہار تک کے مفتوحہ علاقے سے بابر کو پندرہ لاکھ پونڈ سالانہ مالیہ وصول ہوتا تھا۔ اس وقت زراعت، تجارت، اور صنعت ترقی پذیر تھی اور کسبِ زر اور معاش کے ذرائع بہت وسیع تھے۔ ملک معدنیات جیسے لاتعداد قدرتی وسائل سے مالا مال تھا اور ہر طرف دولت کی فراوانی کے باعث عوام مطمئن اور آسودہ حال تھے۔

درآمدی و برآمدی تجارت بھی اپنے عروج پر تھی۔ بیرونی ممالک میں برصغیر کی اشیاء کی بڑی مانگ تھی۔ اشیائے ضرورت بکثرت و سستیاب اور ارزاں تھیں۔ تاریخِ داؤدی کے مصنف کے قول کے مطابق ابراہیم لودھی کے زمانے کی اشیا کی قیمتیں اس قدر کم تھیں کہ سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانے سے ان کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ ملک میں جا بجا کارخانے اور فیکٹریاں قائم تھیں۔ کپڑا بننے کی صنعت، اسلحہ سازی اور چمڑے کی صنعت انتہائی عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ الغرض بابر کے حملے کے وقت برصغیر کی معاشی حالت ہر پہلو سے

Marfat.com

مضبوط تھی۔

دفاعی حالت

دفاعی لحاظ سے برصغیر کی حالت خاصی دگرگوں تھی۔ اگرچہ برصغیر میں اعلیٰ عسکری ذہن رکھنے والوں کا قحط نہ تھا اور اعلےٰ فوجی صلاحیتیں رکھنے والے جرنیل بھی موجود تھے مگر بدنظمی اور سیاسی انتشار کی وجہ سے ملک کی دفاعی حالت بالکل کمزور تھی۔ سلاطینِ دہلی کے علاوہ دیگر راجے اور سلطان بھی فوج کو جدید فنونِ حرب اور جدید اسلحہ سے لیس کر کے منظم کرنے سے قاصر رہے تھے انہوں نے نہ تو شمال مغربی سرحد کی حفاظت کے لئے چھاؤنیاں اور قلعے تعمیر کئے تھے اور نہ ہی وہ توپ خانہ کی اہمیت سے واقف تھے۔ برصغیر کے باشندے محض قدیم طریق جنگ کے ماہر تھے۔ وہ صرف تیر کمان اور تلوار سے ہی لڑنا جانتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ بابر جیسے تجربہ کار جرنیل اور اس کی جدید فنونِ حرب سے واقف اور جدید اسلحہ سے لیس منظم فوج کا مقابلہ نہ کر سکے۔

امتحانی سوالات

۱۔ بابر کے حملے کے وقت برصغیر پاکستان و ہند کی سیاسی، قدرتی، معاشرتی، معاشی اور دفاعی حالت مختصر طور پر قلمبند کیجئے۔

۲۔ "سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں برصغیر پاکستان و ہند ریاستوں کا ایک جمگھٹا تھا اور ہر اُس حملہ آور کے لئے آسان شکار ثابت ہو سکتا تھا جس میں اس کو فتح کرنے کی طاقت اور استعداد موجود ہو۔" (ایتوری پرشاد)
تبصرہ کیجئے۔

Marfat.com

دوسرا باب

ظہیر الدین محمد بابر

(۶۱۵۲۶ ـــ ۶۱۵۳۰ مطابق ۹۳۳ھ ـــ ۹۳۷ھ)

"بابر اپنے زمانے کا زیرک ترین ایشیائی فرمانروا تھا وہ کسی بھی دور اور کسی بھی ملک کے حکمرانوں کے مقابلے میں بلند مقام کا مستحق ہے۔" [1]

وی۔ اے۔ سمتھ

خاندانِ مغلیہ

برصغیر پاکستان و ہند میں خاندان مغلیہ کے جدِ امجد اور مغلیہ حکومت کے بانی بابر کا اصل نام ظہیر الدین محمد تھا۔ بابر محض اس کا لقب تھا جو اسے اس کے ترک دوستوں کی طرف سے ملا تھا۔ ترکی زبان میں بابر کے معنی شیر کے ہیں۔ چونکہ وہ شجاعت اور دلیری میں ممتاز تھا اس لئے بابر کہلایا۔

اپنے شجرۂ نسب کے لحاظ سے بابر پدری نسبت سے ایشیا کے نامور فاتح امیر تیمور کی پانچویں پشت اور مادری نسبت سے چنگیز خاں کی چودھویں پشت سے تھا جو تاریخ عالم میں 'قہرِ الٰہی' کے نام سے مشہور ہے اس طرح "اس کی رگوں میں ایشیا کے دو عظیم المرتبت فاتحین کا خون دوڑ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس میں بیک وقت منگولوں کی شگدلی اور ترکوں کی جرأت و استقامت موجود تھی لیکن ان موروثی صفات کے علاوہ وہ فارس کی شائستگی اور ثقافت سے بھی مزین تھا۔" [2]

بابر ہمیشہ اپنے کو چغتائی ترک کہا کرتا تھا۔ اسے منگول یا مغل کے لفظ سے سخت نفرت تھی۔ لیکن یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ وہ برصغیر میں مغل اور اس کا خاندان مغلیہ خاندان کہلایا۔ بابر کے مغل مشہور ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سے پیشتر برصغیر پاک و ہند پر حملہ آور ہونے والوں کی اکثریت نسلی اعتبار سے منگول یعنی مغل تھی اور اس طرح یہاں کے

---

[1] "دی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا" ایڈیشن سوم صفحہ ۳۲۰

[2] لین پول۔ "رولرز آف انڈیا" (بابر) صفحہ ۹

Marfat.com

باشندوں کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہوگیا تھا کہ شمال مغرب کی جانب سے فتح و تسخیر کے ارادے سے آنے والے تمام افراد مغل ہی ہیں۔

ابتدائی زندگی بابر کے باپ کا نام عمر شیخ مرزا تھا جو وسط ایشیا اور خراسان کے بادشاہ ابو سعید صاحبقران کا چوتھا بیٹا تھا۔ بابر کی والدہ کا نام قتلق نگار خانم تھا جو چنگیز خاں کے بارھویں وارث یونس خاں کی بیٹی تھی۔ وہ ۱۴ فروری ۱۴۸۳ء کو بروز جمعہ فرغانہ کے دارالسلطنت اندیجان میں پیدا ہوا۔ بابر ۱۴۹۴ء میں اپنے باپ عمر شیخ مرزا کی وفات (۸ رجون ۱۴۹۴ء) کے بعد گیارہ سال اور چار ماہ کی عمر میں ریاست فرغانہ کے تخت پہ متمکن ہوا۔

یہ نوعمر بادشاہ ابھی مسند حکومت پر بیٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے دشمنوں کی حریصانہ نگاہیں ریاست فرغانہ کی طرف اٹھنے لگیں اور وہ اسے ہڑپ کرنے کے درپے ہو گئے۔ اس سلسلے میں اس کے چچا احمد مرزا اور ماموں محمود خاں نے بھی اسے زک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ بابر نے ان تشویشناک حالات کے پیش نظر اپنے چچا احمد مرزا کو جو کہ فرغانہ کی تسخیر کے درپے تھا لکھا کہ "جب وہ فرغانہ کو فتح کرنے کے بعد بھی بہرصورت اس کا انتظام کسی اور کے سپرد کرے گا تو کیا یہ بہتر نہیں کہ ریاست فرغانہ میری ہی سپرداری میں دے دی جائے جبکہ میں آپ کا رشتہ دار بھی ہوں اور بخوشی آپ کی طرف سے گورنر بن کر یہ کام سرانجام دینے کو تیار بھی ہوں"۔ [1]

احمد مرزا پہ بابر کی اس درخواست کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے فرغانہ پر حملہ کر دیا مگر ناکام لوٹا۔ بعدازاں فرغانہ پہ حملہ آور ہونے کی حیثیت سے بابر کے ماموں محمود خاں کا بھی یہی حشر ہوا۔

سمرقند پر قبضہ اور اخراج بابر اپنے جد امجد امیر تیمور کے پایۂ تخت سمرقند پر قابض ہو کر وسط ایشیا پہ حکومت کرنے کا خواہشمند تھا۔ کیونکہ تیموری خاندان کی روایت کے مطابق سمرقند پہ قابض تیموری شہزادے کو دیگر شہزادوں پر فوقیت حاصل ہوتی تھی۔

جولائی ۱۴۹۴ء میں والئے سمرقند احمد مرزا نے وفات پائی تو بابر نے سمرقند کو فتح کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تاہم ۱۴۹۷ء میں بابر نے سمرقند پہ قبضہ کر لیا اس وقت

---

[1] ڈاکٹر اے۔ ایل۔ سری واستوا۔ دی مغل ایمپائر۔ صفحہ ۱۱

Marfat.com

بابر کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ تزکِ بابری کی رو سے بابر اپنی اس عظیم فتح کے واقعہ کو تمام عمر دل سے نہ بھلا سکا۔ مگر یہ فتح عارضی ثابت ہوئی اور صرف ننو دن کی حکمرانی کے بعد اسے سمرقند چھوڑنا پڑا۔ سمرقند میں قیام کے دوران بابر سخت بیمار پڑ گیا۔ تندرست ہوا تو اسے خبر ملی کہ فرغانہ میں اس کے چھوٹے بھائی جہانگیر مرزا کے حق میں بغاوت ہو گئی ہے۔ اس پر وہ سمرقند سے فرغانہ کے لئے روانہ ہوا۔ لیکن جونہی اس نے سمرقند سے قدم باہر رکھا اس کے چچیرے بھائی سلطان علی نے سمرقند پر قبضہ کر لیا۔ اب وہ ایک بے تخت و تاج بادشاہ تھا اور ایک برگِ آوارہ کی طرح تقریباً ایک سال تک موجِ حوادث کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتا رہا۔ مگر ۱۴۸۴ء کے موسم گرما میں اس نے اپنے جان نثار ساتھیوں کی مدد سے فرغانہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

۱۵۰۰ء میں بابر نے سمرقند کے حصول کے لئے دوبارہ کوشش کی مگر ناکام رہا۔ کیونکہ ازبک اور سردار شیبانی خاں عرف شاہ بیگ نے اس سے پہلے شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ بابر نے حصولِ سمرقند کے لئے اپنے ۲۴۰ ساتھیوں کے ساتھ رات کے وقت کوشش کی اور اس نے سمرقند کو فتح کر لیا۔ اس فقید المثال جرأت اور دلیری کے واقعہ سے بابر کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ مگر آٹھ ماہ بعد شیبانی خاں ازبک نے سرائے پل کے مقام پر بابر کو شکست دیکر دوبارہ سمرقند پر قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں فرغانہ پر جہانگیر مرزا دوبارہ قابض ہو چکا تھا اس طرح وہ تیسری بار بے خانماں ہو کر مسلسل تین سال تک وسطِ ایشیا میں مارا مارا پھرتا رہا۔

کابل کی تسخیر

کابل پر بابر کے چچا الغ بیگ کی حکومت تھی ۱۵۰۱ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا عبدالرزاق تخت نشین ہوا تو وزیر اعظم مقیم بیگ ارغون نے اسے تخت سے اتار کر خود قبضہ کر لیا۔ اس سے ملک میں بدنظمی اور ابتری پھیل گئی۔ بابر نے وسطِ ایشیا میں اپنے دشمن شیبانی خاں ازبک کے بڑھتے ہوئے غلبہ و اقتدار کے پیشِ نظر وہاں سے ناامید ہو کر کابل میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۵۰۴ء میں اس نے مقیم بیگ کو شکست دے کر آسانی سے کابل پر قبضہ کر لیا۔

اگرچہ کابل کی حکومت ہر پہلو سے محدود اور چھوٹی تھی لیکن بابر ایک ایسے علاقے کا بادشاہ تھا جہاں سے مشرق میں برصغیر پاک و ہند اور مغرب میں وسط ایشیا پر بآسانی فوج کشی کی جا سکتی تھی۔ ۱۵۰۰ء میں اس نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا اس طرح وہ امیر تیمور کا جانشین اور تیموریہ خاندان کا افضل ترین فرد بن گیا۔ اسی سال اس نے قندھار کو بھی فتح کر لیا۔ لیکن چند ہی ہفتوں کے بعد قندھار اس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔

Marfat.com

سمرقند کی آخری مہم

اگرچہ بابر کابل کی سلطنت پاکر بہت خوش و خرّم تھا مگر سمرقند کی دیرینہ خواہش کو ابھی تک دل سے نہ نکال سکا تھا وہ ہر حالت میں شیبانی خاں ازبک کو شکست دینا چاہتا تھا جس نے وسط ایشیا سے تیموریوں کو نکال باہر کیا تھا۔ اور اسی مقصد کے تحت ۱۵۰۷ء میں بابر اپنے چچازاد بھائی کے پاس ہرات پہنچا تاکہ اس سے فوجی امداد لے کر شیبانی خاں ازبک کو ناقابل فراموش اور عبرتناک سزا دے سکے۔ لیکن اسے مایوس و ناکام لوٹنا پڑا۔

۱۵۱۰ء میں جب شیبانی خاں ازبک 'مرو' کی جنگ میں فرمانروائے ایران شاہ اسمٰعیل صفوی کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا گیا تو بابر کے دل میں اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا جذبہ پھر ایک بار پوری شدت سے ابھر آیا۔ چنانچہ ۱۵۱۱ء میں خراج ادا کرنے اور شیعہ مذہب کے چند عقائد اپنانے کی شرط پر بابر نے شاہ اسماعیل صفوی سے فوجی امداد لے کر ازبکوں کو شکست دی۔ اور فاتح کی حیثیت سے سمرقند میں داخل ہوا۔ اب بابر کی سلطنت تاشقند، سمرقند، بخارا، فرغانہ، کابل اور غزنی کے علاقوں پر مشتمل تھی۔ مگر یہ عروج جلد ہی زوال پذیر ہو گیا۔ کیونکہ ۱۵۱۲ء میں اپنے ہی خاندان کے لوگوں کی مخالفت اور کولابِ ملک کے مقام پر ازبک سردار عبیداللہ خاں کے ہاتھوں شکست کھا کر بابر کو سمرقند ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑا۔ البتہ بدخشاں اس کے قبضے ہی میں رہا۔ آبائی سلطنت کی بازیابی سے مایوس ہو کر بابر ۱۵۱۳ء میں واپس کابل لوٹ آیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی آبائی میراث وسط ایشیا (ماوراء النہر) کا نام تک نہ لیا۔ لیکن بعد ازاں اس نے برصغیر کی تسخیر پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی۔

برصغیر پر بابر کے ابتدائی حملے

پہلا حملہ ۱۵۰۵ء

برصغیر پاک و ہند پر بابر نے پہلا حملہ کابل کی فتح کے فوراً بعد ۱۵۰۵ء میں کیا۔ وہ درۂ خیبر سے آگے بڑھ کر کوہاٹ کے راستے دریائے سندھ کے کنارے ڈیرہ غازی خاں تک آ پہنچا لیکن ان علاقوں کا الحاق کئے بغیر کابل واپس لوٹ گیا۔ اس کے اس حملے کا مقصد برصغیر پاک و ہند کے جغرافیائی حالات کا جائزہ لینا تھا۔

دوسرا حملہ ۱۵۱۹ء

۱۵۱۹ء میں بابر یوسف زئی قبائل کی گوشمالی اور ان سے خراج وصول کرنے کی غرض سے روانہ ہوا۔ بعد ازاں اس نے باجوڑ کا قلعہ فتح کرنے کے بعد وہاں کے باغی اور بدامنی پیدا کرنے والے عناصر کی سرکوبی

Marfat.com

کے لئے کسی قدر متشددانہ رویہ بھی اختیار کیا۔ ازاں بعد اس نے دریائے سندھ کو عبور کر کے دریائے جہلم کے کنارے پر واقع بھیرہ (باب ہندوستان) پر حملہ کیا جہاں کے لوگوں نے بغیر جنگ کئے اس کی سیادت کو قبول کر لیا۔ بعد میں اس نے خوشاب کو بھی فتح کیا۔ امیر تیمور کے وارث کی حیثیت سے بابر پنجاب کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ کیونکہ اس علاقے کو امیر تیمور نے ۹۶-۱۳۹۸ء میں فتح کیا تھا۔ چنانچہ بابر نے ملا مرشد کو سفیر بنا کر ابراہیم لودھی کے دربار میں دہلی روانہ کیا اور مطالبہ کیا کہ پنجاب کا تمام علاقہ جو ترکوں کی ملکیت رہا ہے اس کے حوالے کیا جائے۔ لیکن لاہور کے حاکم دولت خاں لودھی نے بابر کے سفیر کو لاہور ہی میں روک لیا۔ اس طرح سے بابر کو اپنے پیغام کا کوئی جواب نہ ملا۔ بابر مفتوحہ علاقوں کی گورنری اپنے ایک امیر ہندو بیگ کے سپرد کر کے پنجاب کو فتح کئے بغیر واپس لوٹ گیا۔ لیکن بھیرہ اور باجوڑ کے لوگوں نے بابر کی واپسی کے فوراً بعد ہندو بیگ کو وہاں سے مار بھگایا اس طرح کی یہ مہم ناکام اور بے نتیجہ ثابت ہوئی۔

تیسرا حملہ ۱۵۱۹ء

ستمبر ۱۵۱۹ء میں یوسف زئی قبیلہ کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے بابر پھر ایک بار درۂ خیبر کو پار کر کے برصغیر پر حملہ آور ہوا اس بار اس نے پشاور کو اپنا فوجی مستقر بنانے کی کوشش کی۔ لیکن بدخشاں میں بغاوت کی خبر پا کر فوراً واپس لوٹ گیا۔

چوتھا حملہ ۱۵۲۰ء

۱۵۲۰ء میں بابر نے ایک بار پھر ہندوستان کا رخ کیا۔ بھیرہ اور باجوڑ کو دوبارہ فتح کیا۔ بعد ازاں فتوحات حاصل کرتا ہوا سیالکوٹ تک جا پہنچا۔ جہاں کے لوگوں نے کسی مدافعت کے بغیر اس کی اطاعت قبول کر لی۔ البتہ سید پور کے لوگوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن شکست سے دوچار ہوئے۔ اسی دوران قندھار میں شاہ بیگ ارغون کی شورش کے پیش نظر بابر فوراً واپس لوٹ گیا جہاں اس نے ۱۵۲۲ء میں قندھار پر قبضہ کر کے شاہ بیگ ارغون کو سندھ کی جانب بھگا دیا۔

پانچواں حملہ ۱۵۲۴ء

۱۵۲۳ء میں پنجاب کے لودھی حاکم دولت خاں نے بابر کو برصغیر پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ دولت خاں لودھی اپنے آقا ابراہیم لودھی سے سخت نالاں تھا اس لئے اس نے بابر کو فوجی امداد مہیا کرنے کے علاوہ پنجاب پر اس کی ملکیت کے دعوے کو بھی قبول کرنے کا وعدہ کیا۔

لہٰذا ۱۵۲۴ء میں بابر ایک بھاری فوج کے ساتھ لاہور کی طرف بڑھا۔ اس اثنا میں ابراہیم لودھی کی فوج نے دولت خاں لودھی کو مار بھگایا۔ ابھی بابر کی افواج لاہور سے چند میل کی مسافت پر ہی تھیں کہ ابراہیم لودھی کی فتح مند فوج نے بابر کی پیش قدمی کو روکنے کی کوشش

Marfat.com

کی لیکن شکست کھائی۔ لاہور پر قبضہ کر کے بابر نے شہر کو تاخت و تاراج کیا۔ بعد ازاں اس نے (موجودہ ضلع ساہیوال میں واقع) دیپال پور کی مشہور فوجی چھاؤنی کو بہ نوکِ شمشیر فتح کیا۔ اس طرح پنجاب کا بیشتر علاقہ اس کے قبضے میں آگیا۔ دیپالپور میں دولت خاں لودھی بھی اس سے آملا۔ اور پنجاب کا گورنر بننے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن بابر پنجاب جیسے اہم علاقے کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے جالندھر کا علاقہ دولت خاں کو اور سلطانپور کا علاقہ اس کے لڑکے دلاور خاں کو دیا اور دیپالپور کی گورنری ابراہیم لودھی کے چچا عالم خاں لودھی کے حوالے کی۔ بعد ازاں مناسب انتظامات کرنے اور دیپالپور، لاہور اور سیالکوٹ میں مغل فوج کے دستے تعینات کرنے کے بعد کابل واپس چلا گیا۔ تاکہ ایک مضبوط فوج کا انتظام کر سکے۔ کیونکہ اس کے دل میں پورے ملک کی تسخیر کی شدید خواہش پیدا ہو چکی تھی اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے ایک بہت ہی بڑی اور مضبوط فوج کی ضرورت ناگزیر تھی۔ جونہی بابر کابل کی طرف لوٹا دولت خاں لودھی نے دلاور خاں اور عالم خاں لودھی کو شکست دے کر سلطانپور اور دیپالپور کے علاقے چھین لئے اور دوبارہ سارے پنجاب پر قبضہ کرنے کی غرض سے سیالکوٹ کی مغل چھاؤنی پر بھی حملہ کیا لیکن ہزیمت اٹھائی۔ ابراہیم لودھی پنجاب کے حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے ایک فوج باغی سردار دولت خاں لودھی کی سرکوبی کے لئے روانہ کی لیکن دولت خاں نے اس فوج کو مار بھگایا۔

اسی دوران عالم خاں لودھی حاکمِ دیپالپور دولت خاں سے شکست کھا کر بابر کے پاس کابل پہنچا۔ اور فوجی امداد کا طالب ہوا۔ آخر ایک معاہدہ کے تحت بابر نے عالم خاں لودھی کو فوج دے کر دولت خاں لودھی سے نبرد آزما ہونے کے لئے بھیجا مگر وہ دولت خاں لودھی سے مل گیا اور دونوں سلطنتِ دہلی کی تسخیر کے منصوبہ کے تحت دارالخلافہ کی جانب روانہ ہوئے لیکن ابراہیم لودھی نے دونوں کو شکست فاش دی۔ جب پنجاب میں رونما ہونے والے ان حالات کی اطلاع بابر کو پہنچی تو اس نے سارے برِصغیر پاک و ہند کو زیرنگیں کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

Marfat.com

پانی پت کی پہلی لڑائی

۲۱-اپریل ۱۵۲۶ء

وجوہات

۱- فرغانہ اور سمرقند سے مایوسی: بابر کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ اپنے جدامجد امیر تیمور کے پایۂ تخت سمرقند میں بیٹھ کر وسط ایشیا پر حکومت کرے لیکن اسے اپنی موروثی ریاست فرغانہ سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ جب تین بار کوششِ بسیار کے باوجود وہ فرغانہ اور سمرقند پر قبضہ کر کے امیر تیمور کا جانشین کہلانے میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے کابل میں اپنی پوزیشن کو مستحکم بنا کر سرسبز و شاداب برصغیر پاک و ہند کی تسخیر پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دی۔

۲- پنجاب کی ملکیت کا دعویٰ: چونکہ بابر امیر تیمور کا جانشین ہونے کا دعویدار تھا اس لئے وہ پنجاب کو اپنی میراث سمجھتا تھا کیونکہ امیر تیمور نے ۱۳۹۸-۹۹ء کے دوران اس علاقے کو فتح کیا تھا پنجاب کی ملکیت کا دعویٰ اس نے ۱۵۱۹ء کے حملے کے دوران کیا۔ دولت خاں لودھی حاکم لاہور نے ابراہیم لودھی سے مخالفت کی بنا پر بابر کے اس حق کو تسلیم کر لیا۔

۳- لودھی امراء اور رانا سانگا کی دعوت: سلطنت دہلی کے سربراہ ابراہیم لودھی کے مظالم سے تنگ آ کر ہندو اور مسلمان امراء بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ دولت خاں لودھی حاکم لاہور، عالم خاں لودھی حاکم دیپالپور اور رانا سانگا والئے میواڑ نے بابر کو ابراہیم لودھی کے خلاف برصغیر پاک و ہند پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور ساتھ ہی فوجی امداد کا وعدہ بھی کیا اس وجہ سے بھی بابر نے سلطان ابراہیم لودھی سے فیصلہ کن ٹکر لینے کا عزم کر لیا۔

۴- سیاسی انتشار: سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں برصغیر پاک و ہند میں سیاسی استحکام کا فقدان تھا۔ ملک کے طول و عرض میں لاقانونیت اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ سارا ملک چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ بابر نے ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنتِ دہلی پر حملہ کر دیا۔

Marfat.com

۵۔ ابتدائی حملوں میں کامیابی:

بابر نے پانی پت کی پہلی لڑائی سے قبل برصغیر پر پانچ حملے کئے۔ ان ابتدائی حملوں نے بابر پر واضح کر دیا برصغیر پاک و ہند میں نظم و نسق اور سیاسی استحکام ناپید ہے۔ نہ یہاں اس کے پایہ کا کوئی جرنیل ہے اور نہ ہی برصغیر کی فوج اس کی تربیت یافتہ فوج کی مدمقابل ہو سکتی ہے۔ ان وجوہات کے علاوہ ابتدائی حملوں میں کامیابی نے بھی بابر کی حوصلہ افزائی کی اور وہ دہلی کی مرکزی قوت سے ٹکر لینے کو تیار ہو گیا۔

واقعات

بابر نومبر ۱۵۲۵ء میں پنجاب پر حملہ آور ہوا وہ کابل سے سیدھا سیالکوٹ پہنچا جہاں مغلیہ افواج کی چھاؤنی تھی۔ یہاں سیالکوٹ میں اسے معلوم ہوا کہ دولت خاں لودھی ملوٹ MILWAT کے قلعہ میں محصور ہے اور مغلیہ فوج سے ٹکر لینے کا ارادہ رکھتا ہے بابر نے سب سے پہلے دولت خاں لودھی کی گوشمالی کی اور اسے گرفتار کر کے قید کرنے کے لئے بھیرہ بھیج دیا لیکن وہ راستے ہی میں فوت ہو گیا۔ بعد ازاں بابر نے تمام پنجاب کو زیر نگیں کر کے دہلی کا رخ کیا اور پانی پت کے تاریخی میدان میں خیمہ زن ہوا جہاں پہلے ہی سلطان ابراہیم لودھی اپنے ایک لاکھ لشکر جرار اور ایک ہزار جنگی ہاتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ تزک بابری میں بابر فخریہ بیان کرتا ہے کہ "اس نے صرف بارہ ہزار فوج کے ساتھ ابراہیم لودھی کو شکست دی"۔

ابراہیم کی کثیر التعداد فوج کے پیش نظر بابر نے محسوس کیا کہ دشمن کی فوج کے مقابلے میں اس کی فوج کی تعداد اس قدر کم ہے کہ دفاعی مورچہ بندی کے بغیر مقابلہ ناممکن ہے۔ لہذا بابر نے اپنی عسکری ذہانت اور گذشتہ جنگی تجربات سے کام لیتے ہوئے اپنی فوج کو دفاعی لحاظ سے پانی پت کے شہر کے مشرق میں اس طرح ترتیب دیا کہ اس کی فوج کا منہ جنوب کی طرف تھا۔ دائیں بازو (میمنہ) جس طرف پانی پت کا قصبہ تھا درخت کاٹ کر ڈال دیئے اور بائیں بازو (میسرہ) کو جو دریائے جمنا کی قدیم گذرگاہ کی طرف تھا کو ایک خندق کے ذریعے محفوظ کر لیا۔ قلب کے سامنے سات سو گاڑیاں قطار میں اس طرح کھڑی کر دیں کہ ہر دو گاڑیوں کے درمیان ۷۰۔۶۰ گز کا فاصلہ رکھا تاکہ سو ڈیڑھ سو برق دم شہسوار وہاں سے گذر کر آسانی سے دشمن پر یلغار کر سکیں گاڑیوں کو چمڑے کے رسوں سے مضبوطی سے باندھ دیا گیا۔ ان گاڑیوں کے درمیان بندوقچیوں اور توپوں کے لئے کچھ فاصلے پر مورچے بنا دیئے گئے دائیں اور بائیں اس نے تیزی سے حرکت کرنیوالے تلغمہ[1]

---

[1] ایک طریق جنگ جس کی رو سے میمنہ اور میسرہ دونوں بازوؤں پر چابک دست سوار متعین کر دیئے جاتے تھے جو مناسب وقت پر دشمن کے دائیں اور بائیں بازو پر حملہ آور ہو کر دشمن کو قلب کی طرف دھکیلتے تھے تاکہ اسے توپخانہ کی زد میں لایا جا سکے۔

Marfat.com

شہزادوں نے متعین کر دیئے جو یکایک حملہ کر کے دشمن کو نرغہ میں لے سکیں۔ توپ خانہ اور بندوقچیوں کی کمان دو تجربہ کار رومی افسران استاد علی رومی اور استاد مصطفےٰ رومی کے سپرد تھی اس طرح مورچہ بندی کرنے کے بعد بابر نے ۲۰-۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کی درمیانی رات کو ابراہیم کے کیمپ پر ناکام شبخون مارا۔ اس طرح سلطان ابراہیم لودھی نے مشتعل ہو کر اپنی فوج کو ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کو علی الصبح حملے کا حکم دے دیا۔ افغان فوج بابر کی تربیت یافتہ اور نظم و ضبط سے آراستہ فوج کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ابراہیم لودھی کے جنگی ہاتھی بابر کے توپ خانہ کی آتشیں گولہ باری سے دہشت زدہ ہو کر راجہ پورس کے ہاتھی ثابت ہوئے اور اپنی ہی فوج کو روندتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے سلطان ابراہیم لودھی اپنے پندرہ ہزار سپاہیوں سمیت میدان جنگ میں کام آیا۔ سلطان ابراہیم لودھی کا جنگی حلیف راجہ بکرماجیت والئے گوالیار بھی مارا گیا۔ یہ جنگ نصف روز میں ختم ہو گئی۔ بابر تزکِ بابری میں لکھتا ہے:

"ابھی سورج ایک نیزہ اونچا ہوا تھا کہ لڑائی شروع ہوئی اور دوپہر تک دشمن کی فوجی طاقت بالکل تباہ ہو چکی تھی اور اس کا لشکرِ عظیم شکست فاش کھا چکا تھا اور میرے آدمی فتحیاب ہو چکے تھے۔ اللہ کی مہربانی سے مشکل کام آسان ہو گیا تھا اور اس کے فضل و کرم سے ابراہیم کا ٹڈی دل لشکر نصف روز میں ہی خاک میں مل گیا تھا۔"

پانی پت کی فتح کے فوراً بعد بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں اور خواجہ کلان کی سرکردگی میں ایک فوج آگرہ پر قبضہ کرنے کی غرض سے روانہ کی اور ایک دوسری مہم دہلی پر قبضہ کے لئے بھیجی بعد ازاں بابر خود دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ بابر ۱۰ مئی ۱۵۲۶ء کو آگرہ پہنچا جہاں ہمایوں نے اس کا شایانِ شان استقبال کیا اور بے انتہا دولت کے علاوہ دنیا کا مشہور ہیرا کوہ نور اس کے حضور پیش کیا۔ جس کی قیمت پوری دنیا کے نصف روز کے خرچ کے برابر تھی۔ یہ ہیرا ہمایوں کو گوالیار کے مرحوم راجہ بکرماجیت کے کنبہ کے افراد سے ملا تھا جن کے ساتھ اس نے نہایت شریفانہ سلوک کیا تھا۔ بابر نے اپنی فیاضی و فراخدلی سے کام لیتے ہوئے کوہ نور ہیرا بطور تحفہ ہمایوں کو عطا کیا اور حسنِ کارکردگی کے اعتراف کے طور پر اسے مزید ستر لاکھ دام کے انعام سے بھی نوازا۔ آگرہ میں بابر ابراہیم لودھی کے محل میں ٹھہرا۔ بابر نے اپنی فطری فیاضی سے کام لیتے ہوئے سارا خزانہ اپنی فوج اور عوام میں تقسیم کر دیا۔ سپاہیوں کو ان کی سرفروشانہ خدمات کے صلے میں بیش قیمت انعامات عطا کئے۔ بلادِ اسلامیہ کے مقدس مقامات کو بھی بیش قرار نذرانے ارسال کئے علاوہ ازیں کابل کے تمام باشندوں کو چاندی کے سکے (ایک سکہ فی کس کے حساب سے) بطور انعامِ خسروانہ بھجوائے۔

Marfat.com

اہمیّت

۱۔ افغان حکومت کا خاتمہ: پانی پت کی پہلی لڑائی برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ایک اہم سیاسی موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن جنگ تھی۔ جس نے برصغیر کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ اس لڑائی سے افغان لودھیوں کی فوجی طاقت کا قطعی طور پر خاتمہ ہوگیا اور بقول ڈاکٹر اشتوری پرشاد:۔

"پانی پت کی لڑائی نے سلطنتِ دہلی بابر کو منتقل کردی۔ خاندانِ لودھی کا شیرازہ بکھر گیا اور چغتائی ترک ہندوستان کے فرمانروا ہوئے۔"

۲۔ ابراہیم لودھی کی موت: اس لڑائی میں ابراہیم لودھی کے پندرہ ہزار بہترین جنگجو جاں نثار کام آئے ابراہیم لودھی خود بھی اپنے جنگی حلیف راجہ بکرماجیت والئے گوالیار کے ہمراہ مارا گیا اور لودھیوں کی ظالمانہ حکومت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید رقمطراز ہیں:۔

"پانی پت کی لڑائی نے افغانوں کی قسمت پر مہر شکست ثبت کردی ان کے حوصلے پست ہوگئے۔ افغانوں میں ابراہیم کے عہد میں جو تھوڑا بہت اتحاد تھا اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔" [1]

"The Battle of Panipat, sealed the fate of the Afghans. It completely demoralised them and whatever little unity had existed under Ibrahim came to an end."

(S. A. Rasheed)

۳۔ توپخانہ سے روشناسی: پانی پت کی لڑائی اس وجہ سے بھی خاصی اہمیت کی حامل ہے کہ برصغیر کی فوجوں نے پہلی بار ایک نئے مگر انتہائی مؤثر و مہلک اسلحہ جنگ (توپخانہ) کو دیکھا اور وہ اس کی جنگی اہمیت سے روشناس ہوئے اس سے برصغیر پاک و ہند کے فنِ حرب میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔

۴۔ مغلیہ دور کا آغاز: پانی پت کی لڑائی میں بابر کی فتح سے برصغیر پاک و ہند سے پٹھانوں کی سیاسی اثر اور کہنہ تہذیب کا خاتمہ ہوگیا اور اس

---

[1] "اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان" جلد دوم

Marfat.com

کی جگہ ایک نئے دور اور نئی تہذیب کا آغاز ہوا۔ نیز نہ صرف مغل حکومت قائم ہوئی بلکہ بابر کی کامیابی سے زوال پذیر مسلم سیاست میں نئی جان پڑ گئی۔ برصغیر نے مغلوں کے زیر اقتدار تہذیب و ثقافت کے میدان میں نمایاں ترقی کی نیز ایک قابلِ فخر تمدن کا آغاز ہوا۔ پانی پت کی لڑائی نے بابر کو صرف دہلی اور آگرہ کا بادشاہ ہی نہیں بنایا تھا بلکہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور حکومتوں میں منقسم برصغیر کو ایک مضبوط مرکز کے تحت لانے کی راہ بھی ہموار کی۔ سیاسی ابتری کا خاتمہ ہوا اور ملک کو ایک واضح اور روشن مستقبل عطا ہوا۔

۵۔ افغانوں میں جذبۂ قومیت کی بیداری:

اس شکست سے افغانوں کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ ان کی باہمی نااتفاقی نے انہیں تاج و تخت سے محروم کر دیا ان کے اسی احساسِ ندامت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیر شاہ سوری نے افغانوں میں جذبۂ قومیت کو پوری شدت کے ساتھ از سرِ نو بیدار کیا ان میں خود اعتمادی اور قومی اتحاد کے جذبہ کو ابھارا۔

سلطان ابراہیم لودھی
۱۵۱۷ء تا ۱۵۲۶ء

۱۵۱۷ء میں سکندر لودھی کی وفات کے بعد ابراہیم لودھی سلطنت دہلی کا سلطان بنا۔ وہ لودھی خاندان کا آخری تاجدار تھا جسے کابل کے بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر نے ۲۱۔ اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت کے تاریخی میدان میں شکست دے کر سلطنتِ دہلی پر قبضہ کر لیا۔ ابراہیم لودھی طبعاً انتہائی ضدی، تند خو اور ایک ناتجربہ کار نوجوان بادشاہ تھا۔ ابراہیم لودھی حکمرانی کی مصلحتوں سے اس قدر ناآشنا تھا کہ خود اپنی ہی حکومت کے افغان امراء تک کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس کا جذبۂ خود پسندی پوری شدت سے عود کر آیا۔ چنانچہ اس نے شاہی اختیارات کا استعمال کر کے کچھ اس قسم کے استبدادی اور انتظامی اقدامات کئے جن سے بڑے بڑے افغان امراء کی قوت ختم ہو کر رہ گئی۔ ابراہیم لودھی اپنے امراء کی تذلیل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ دربار میں تمام امراء ہاتھ جوڑ کر مؤدبانہ طور پر کھڑے رہا کریں اس کا یہی طرزِ عمل اس کے خلاف افغان امراء کی سازشوں اور بغاوتوں کا باعث بنا۔ اس نے کئی امراء کو سازشوں کے الزام میں قتل کروا دیا۔ چنانچہ اس نے پنجاب کے حاکم دولت خاں لودھی کو بھی دہلی آنے کی دعوت دی۔ دولت خاں کو دہلی بلانے کا مقصد درحقیقت اس کی گوشمالی کرنا تھا کیونکہ دولت خاں صوبہ پنجاب کا حاکمِ اعلیٰ بننے کے بعد نہ صرف مطلق العنانی کے خواب دیکھنے لگا تھا بلکہ اس کے باغیانہ عزائم کی خبریں پایۂ تخت دہلی تک پہنچنے لگی تھیں۔ لیکن دولت خاں لودھی نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے خود جانا مناسب نہ سمجھا اور اپنے بیٹے دلاور خاں کو دہلی بھیجا۔ جہاں

Marfat.com

ابراہیم اسے ایک ایسے تہ خانے میں لے گیا جہاں باغی امرار کے سر ڈھیر لگے ہوئے تھے ابراہیم نے اسے بتایا کہ باغیوں کا یہ حشر ہوا کرتا ہے اور یہ سر ان باغیوں کے ہیں جنہوں نے میرے حکم سے سرتابی کی تھی۔ دلاور خاں نے واپس آکر جب اس تمام صورتِ حال سے اپنے باپ کو آگاہ کیا تو اس نے فوراً کابل کے بادشاہ بابر کو برصغیر پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور اپنے ہر ممکنہ تعاون کا یقین بھی دلایا تاکہ ابراہیم کی ظالمانہ حکومت کا قلع قمع کیا جا سکے۔

ابراہیم لودھی ایک ظالم اور بے وقوف بادشاہ تھا اس نے اپنے آمرانہ اور غیر دانشمندانہ رویہ سے اپنے تمام امرار کو اپنے خلاف کر لیا تھا وہ نہ صرف خود نااہل اور ناتجربہ کار تھا بلکہ اس کے فوجی سردار ناپختہ کار اور اس کی افواج نظم و ضبط اور جنگی اصولوں سے بے بہرہ تھیں۔ اس کی افواج کثیر التعداد ہونے کے باوجود میدان جنگ میں منظم نقل و حرکت سے نا آشنا تھیں۔ ڈاکٹر الیشوری پرشاد رقمطراز ہے:

"ابراہیم لودھی اگرچہ اپنے امرار کی قوت، اجارہ داری اور اثر و نفوذ کو ناپسند کرتا تھا اور اس نے سختی سے ان کو ختم کرنے کی کوشش کی مگر عوام کے مفاد کو اس نے کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس کے دور اقتدار میں اناج کی فراوانی تھی اور اشیائے ضرورت کی قیمتیں ارزاں تھیں اس نے کاشت کاروں کو بہت سی سہولتیں دے رکھی تھیں چنانچہ وہ کاشت کاروں سے مالیہ بھی صرف اناج کی صورت میں وصول کرتا تھا۔ سلطان کی طرف سے امرار اور جاگیرداروں کو بھی یہ ہدایت تھی کہ وہ بھی مالیہ اور مالگانہ کے عوض اناج وصول کریں۔"

بابر کی مشکلات

برصغیر پاک و ہند میں پانی پت کی عظیم الشان فتح نے اگرچہ بابر کے لئے شمالی برصغیر کی تسخیر کے لئے راہ ہموار کر دی تھی مگر اسے متعدد مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جب بابر آگرہ پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے آدمیوں اور آگرہ کے مقامی لوگوں کے درمیان باہمی نفرت اور دشمنی کا دور دورہ ہے۔ خوف و ہراس کی وجہ سے کاشتکار اپنی زمینیں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور ملکی سپاہی راہ فرار اختیار کر گئے ہیں جس کی وجہ سے مغل فوج اور فوجی گھوڑوں کے لئے رسد کی فراہمی میں بڑی دقتیں پیش آ رہی ہیں۔ امرار اور جاگیرداروں نے مغلیہ سیادت قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے نہ صرف اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے بلکہ انہوں نے مورچہ بندی بھی کر لی ہے علاوہ ازیں گنگا کے مشرقی علاقوں پر ابھی تک دشمن قابض ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاک و ہند کی شدید گرمی نے مغل امرار کو سخت عاجز کر دیا ہے اور وہ کابل جانے کے لئے بیتاب ہیں جن میں خواجہ کلاں جیسا ممتاز افسر بھی شامل ہے اس نے دہلی میں اپنی قیام گاہ کی دیوار پر یہ شعر لکھ دیا تھا ؎

Marfat.com

اگر بہ خیر و سلامت گذر بہ سِند کُنم [1]
سیاہ روئے شوم گر ہوائے ہند کُنم

تزک بابری میں ان مشکلات کے بارے میں بابر خود یوں رقمطراز ہے :-

" جونہی مجھے فوج میں بے چینی اور سرگوشیوں کا علم ہوا میں نے علماء اور ترک سرداروں کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ حکومت اور فتوحات ذرائع اور سامانِ حرب کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح شہنشاہیت اور فرمانروائی بغیر رعایا اور ماتحت صوبوں کے قائم نہیں رہ سکتی۔ سالہا سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد طویل مسافتوں اور گوناگوں مصائب سے گذر کر نیز اپنے سپاہیوں کو خطرات میں ڈال کر تائیدِ ایزدی کی بدولت میں نے زبردست دشمنوں کو شکستِ فاش دے کر متعدد صوبوں اور سلطنتوں کو زیر نگیں کیا جو آج ہمارے زیر اقتدار ہیں۔ اب وہ کونسی طاقت ہے کونسی دقت ہے جو کسی واضح سبب کے بغیر ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم اپنی فتوحات سے دستبردار ہو کر نا امیدی و نامرادی کے پیکر بن کر کابل کی راہ لیں۔ ہر وہ شخص جو دوستی اور وفاداری کا دم بھرتا ہے آئندہ ایسی تجویز پیش نہ کرے۔ ہر اس شخص کو چلے جانے کی اجازت ہے جو یہاں رہنے کی ہمت نہیں رکھتا یا اپنے عزم مراجعت سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔"

بابر کی اس صاف گوئی اور جذبہ خلوص کا نتیجہ یہ ہوا کہ معدودے چند ساتھیوں کے سوا تمام فوج نے اپنے اس عظیم سپہ سالار کا رنج و راحت میں ساتھ دینے کا عہد کیا۔ بابر نے بڑے عزم و استقلال اور غیر معمولی ہمت و حوصلہ کا مظاہرہ کر کے جلد ہی حالات پر قابو پا لیا۔ عوام میں اعتماد پیدا کرنے کے رواداری کی حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ نظم و نسق کے لئے ملک کے مختلف علاقوں میں نئے حکام و عمال مقرر کئے تاکہ امن و امان قائم ہو۔ بیانہ، دھولپور اور گوالیار کے علاوہ ملک کا بیشتر علاقہ بابر کے زیر نگیں آچکا تھا۔ ہمایوں نے جونپور اور کالپی کے علاقے بھی فتح کر لئے۔

جنگِ کنواہہ
۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء

سلطنتِ دہلی پر بابر کے حملہ آور ہونے کے وقت سے ریاست میواڑ کا فرمانروا رانا سنگرام سنگھ عرف رانا سانگا بڑی گہری نظر سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بابر بھی اپنے جدِ امجد امیر تیمور کی

---

[1] اگر میں خیریت و سلامتی کے ساتھ دریائے سندھ کے پار ہو جاؤں تو میں سیاہ رو ہو جاؤں اگر دوبارہ ہندوستان کی آرزو کروں۔

Marfat.com

مانند سرزمین پاک و ہند میں ایک طوفان کی طرح وارد ہوگا اور لوٹ مار کرنے کے بعد واپس لوٹ جائے گا۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ بابر برصغیر میں مستقل قیام کا ارادہ رکھتا ہے تو اس نے برصغیر پاک و ہند میں رام راج کے قیام کا خواب پریشان ہوتے دیکھ کر مغلوں کو بزورِ شمشیر سرزمین پاک و ہند سے نکالنے کا عزم صمیم کر لیا اور ایک لاکھ راجپوتوں کا لشکرِ عظیم لے کر کنواہہ آپہنچا۔ یہ مقام آگرہ سے ۳۷ میل دور واقع ہے۔

وجوہات

۱۔ بابر کا غیر متوقع قیام: ریاست میواڑ کا راجپوت فرمانروا رانا سانگا برصغیر پاک و ہند میں رام راج کے قیام کا خواہاں تھا اس نے بابر کو حملہ آور ہونے کی دعوت اس نظریہ کے تحت دی تھی کہ بابر سرزمین ہند پر اپنے جد امجد امیر تیمور کی مانند حملہ آور ہوگا اور لوٹ مار کرنے کے بعد واپس چلا جائے گا بعد ازاں میدان اس کے لئے خالی ہوگا۔ لیکن بابر کے غیر متوقع قیام اور مفتوحہ علاقوں کے نظم و نسق کی درستی کی طرف توجہ نے اس کو پریشان کر دیا۔ چنانچہ رانا سانگا نے اپنے رام راج کے قیام کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتا نہ دیکھ کر بابر کو ہندوستان سے بزورِ شمشیر نکالنے کا عزم کر لیا۔

۲۔ رانا سانگا کی وعدہ خلافی: پانی پت کی لڑائی سے قبل رانا سانگا نے کابل میں اپنا ایک وفد بھیج کر بابر کو برصغیر پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی تھی۔ بقول ارسکائن "رانا سانگا نے وعدہ کیا تھا کہ بابر کے حملے کے دوران وہ مشرقی جانب سے ابراہیم لودھی کے خلاف فوجی کارروائی کر کے بابر کی فوجی امداد کرے گا۔" لیکن پانی پت کی لڑائی میں رانا سانگا بابر کی فوجی امداد کرنے کی بجائے محض ایک خاموش تماشائی بنا رہا۔ بابر نے جب اس سے اس کی عہد شکنی کی شکایت کی اور اسے وعدہ خلافی کے جرم کا مرتکب ٹھہرایا تو رانا سانگا نے اسے اپنی راجپوتی آن کی توہین سمجھا جس کی وجہ سے جنگ کنواہہ ناگزیر ہو گئی۔

۳۔ سرحدی تنازعہ: ابراہیم لودھی کے دور سے ہی رانا سانگا اور حکومت دہلی کے درمیان بعض علاقوں کی ملکیت کے بارے میں تنازعہ موجود تھا دراصل رانا سانگا بیانہ، دھولپور، گوالیار اور دریائے گنگا کے مغربی علاقے پر تسلط چاہتا تھا۔ لیکن فوجی لحاظ سے ان علاقوں کی جو اہمیت تھی اس کے پیشِ نظر بابر نے ان پر خود قبضہ کر لیا۔ بابر کے اس اقدام نے رانا سانگا کو شدید طور پر بھڑکا دیا۔ اور نفرت و اختلاف کا وہ جذبہ جو بابر کے دہلی میں مستقل قیام کے فیصلے کو دیکھ کر رانا سانگا کے دل میں پیدا ہو چکا تھا شدید تر ہو گیا اور

Marfat.com

اس طرح یہ سرحدی تنازعہ جنگِ کنواہہ پر منتج ہوا۔

۴۔ افغانوں کی عبوری حکومت کا قیام :

ابراہیم لودھی کے اقتدار کے خاتمے کے بعد برصغیر میں بابر کے مستقل قیام کے پیشِ نظر تمام چھوٹے بڑے ہندو اور افغان سردار متفقہ طور پر بابر کے خلاف سازشوں میں مصروف ہوگئے تھے۔ افغان سردار بابر کو ایک غیر ملکی حملہ آور اور غاصب سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے محمود خاں لودھی کی سرکردگی میں ایک منظم سازش کے تحت، نہ صرف میواڑ میں مغل سلطنت کے مقابلے پر اپنی ایک خود مختار افغان حکومت قائم کر لی بلکہ رانا سانگا کی شہ پر بابر کے خلاف متحد ہو کر فوجی کارروائی کا بھی منصوبہ تیار کرنے لگے۔

واقعات

کنواہہ کی خونریز جنگ بروز ہفتہ ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو آگرہ سے ۳۷ میل اور فتح پور سیکری سے ۱۰ میل دور کنواہہ کے میدان میں لڑی گئی بابر کی فوج کی تعداد آٹھ یا دس ہزار تھی جبکہ رانا سانگا کی فوج کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔ ایک سو بیس رئیس، راجے اور کئی افغان سردار بھی رانا سانگا کے ہمرکاب تھے۔ ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی کی دس ہزار فوج اور حسن خاں میواتی کی بارہ ہزار فوج اس کے علاوہ تھی۔ مغل مؤرخین رانا سانگا کی فوج کی تعداد دو لاکھ کے قریب بتاتے ہیں جبکہ پروفیسر رش بروک ولیمز کا خیال ہے کہ بابر کی فوج آٹھ یا دس ہزار کے قریب تھی اور اس کے مقابلے میں راجپوتوں کی فوج بابر کی فوج سے سات یا آٹھ گنا زائد تھی۔

رانا سانگا کی فوج آندھی کی طرح آگرہ کی طرف بڑھ رہی تھی اس نے بابر کی جانب سے فوجی کمک کے پہنچنے سے قبل ہی بیانہ پر قبضہ کر لیا۔ بابر نے جو رانا سانگا کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے لشکر کے ساتھ فتح پور سیکری پہنچ چکا تھا، رانا سانگا کی فوج کی پیش قدمی روکنے کے لئے ڈیڑھ ہزار کا ایک ہراول دستہ بھیجا جو بیانہ کے قریب بری طرح سے شکست کھا کر اور ہراساں ہو کر واپس لوٹا ہراول دستہ کی شکست سے بابر کی فوج بد دل ہوگئی۔ انہی دنوں کابل کے ایک نجومی نے پیشگوئی کی تھی کہ مغلوں کو ایک جنگ میں شکست ہوگی جس کے باعث مغل فوج کا خوف بدحواسی میں تبدیل ہوگیا۔ مگر بابر نے اس وقت شایانِ شان اور مجاہدانہ عزم و استقلال کا ثبوت دیا اس نے اس جنگ کو کفر اور اسلام کی جنگ قرار دیتے ہوئے اپنی فوج میں جہاد کا اعلان کر دیا۔ شراب نوشی سے توبہ کر لی اور سونے چاندی کے تمام ظروف جن میں شراب بھری رہتی تھی یا جن میں شراب پی جاتی تھی توڑ دیئے اور ان کے ٹکڑوں کو غربا میں تقسیم کر دیا۔ غزنی سے آمدہ شراب کے مٹکیزوں میں نمک ڈال کر سرکہ بنوا دیا۔ مسلمانوں پر عائد کردہ اسٹمپ ٹیکس اور تمغا (مالِ تجارت پر ٹیکس)

Marfat.com

بھی معاف کردیا۔ بعدازاں اپنی فوج کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کی اس نے اپنے امراء اور سپاہیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"امیرو اور سپاہیو!

ہر کہ آمد بہ جہاں اہل فنا خواہد بود
آنکہ پائندہ و باقیست خدا خواہد بود

ہر شخص جو اس دنیا میں آیا اسے ایک دن ضرور مرنا ہے۔ ہمیشہ باقی رہنے والی صرف خدا کی ذات ہے دوسرے الفاظ میں جو بھی اس بزم حیات میں شریک ہوتا ہے وہ اس کے اختتام سے پہلے موت کا جام ضرور نوش کرتا ہے دارِ فنا میں آنے والے ہر شخص کو ایک نہ ایک دن اس ماتم کدہ سے رخصت ہونا ہے پس بدنامی کی زندگی سے نیک نامی کی موت بدرجہ افضل اور مومن کے شایان شان ہے۔

بنام نکو گر بمیرم رواست مرا نام باید کہ تن مرگ راست

خداوند تعالےٰ کا ہم پر کتنا بڑا فضل و احسان ہے کہ اس نے ہمیں یہ منصب مرحمت فرمایا ہے کہ عرصہ جہاد میں کام آئیں تو شہید کہلوائیں گے اور اگر دشمن پر فتحیاب ہوئے تو غازی کہلائیں گے آؤ ہم سب مل کر قرآن حکیم کی قسم کھائیں کہ ہم میں سے کوئی شخص بھی لڑائی سے منہ نہ موڑے گا اور آخری دم تک ڈٹ کر مقابلہ کرے گا۔" [1]

بابر کی اس پُرتاثیر اور پرجوش تقریر نے مغل فوج کے سوئے ہوئے عسکری جذبہ کو بیدار کردیا اور ان کے حوصلے بڑھ گئے سب سپاہیوں نے قرآن حکیم پر ہاتھ رکھ کر جنگ میں آخری دم تک ثابت قدم رہنے اور بابر سے وفاداری کی قسم کھائی اور کہا "جو بادشاہ سے پھرے خدا اور کلام خدا سے پھرے۔" [2]

رانا سانگا کی فوج کی کثیر تعداد کے پیش نظر بابر نے پانی پت کی لڑائی کے طریق جنگ کے مطابق اپنی فوج کی صف آرائی کی۔ میمنہ اور میسرہ دونوں جانب قند قیں کھود کر بازوؤں سے ہونے والے حملوں سے فوج کو محفوظ کیا۔ قلب کے سامنے ایک ہزار توپ گاڑیوں کو اس ترتیب سے کھڑا کیا کہ ہر دو گاڑیوں کے درمیان ساٹھ ستر گز کا فاصلہ رکھا تاکہ ایک سو شہسوار بآسانی ان کے درمیان سے گذر سکیں اور گاڑیوں کو لوہے کی زنجیروں سے باندھ دیا گیا گاڑیوں کے پیچھے امیر نظام الدین خلیفہ کی زیر کمان توپوں کو نصب کیا گیا چھوٹی توپوں کو استاد علی قلی کی

---

[1] "تزکِ بابری" صفحہ ۵۵۶ [2] "تزکِ بابری" صفحہ ۵۵۷

Marfat.com

کی سرکردگی میں قلب کے سامنے متعین کیا گیا جبکہ بندوقچیوں کو حسن علی خاں رومی کی کمان میں قلب کے دائیں بازو کے سامنے متعین کیا گیا صابر بیگ خود قلب میں کھڑا ہوا اور دائیں پہلو کی فوج کی کمان برصغیر کے امراء کے سانحہ ہمایوں اور دلاور خاں کے سپرد کی اور بائیں پہلو کی فوج کی قیادت پر مہدی خواجہ کو مامور کیا۔ رانا سانگا کی فوج قدیم روایات کے مطابق چار ڈویژن یعنی ہراول قلب اور دائیں بائیں پہلو میں منقسم تھی۔

جنگ کا آغاز ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو صبح نو بجے کے قریب استاد علی قلی کی توپوں کی گولہ باری سے ہوا۔ توپ کا پہلا ہی گولہ اس قدر خوفناک ثابت ہوا اور اس کی آواز اس قدر ہیبت ناک تھی کہ راجپوتوں اور رانا سانگا کے جنگی ہاتھیوں کے دل دہل کر رہ گئے۔ ابتدا میں راجپوتوں نے مغل فوج کے قلب کی مضبوطی کے پیش نظر مغل فوج کے دونوں بازوؤں پر دباؤ ڈالا جس سے شروع میں ان کا پلڑا بھاری رہا لیکن انہیں پسپا کر دیا گیا۔ پھر عین بابر کے میمنہ اور میسرہ کے تلغمہ دستوں نے راجپوت فوج کو گھیر کر قلب کی طرف دھکیلا تو مغل توپوں، بندوقچیوں اور شہسواروں نے راجپوتوں کی فوج میں کھلبلی مچا دی۔ بہادر راجپوت توپخانہ کی گولہ باری کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ مغلوں کے ایک حملے میں ہی سینکڑوں اور ہزاروں ساتھیوں کو ہلاک ہوتے دیکھ کر ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ رانا سانگا سخت زخمی ہوا۔ حسن خاں میواتی مارا گیا۔ محمود لودھی جان بچا کر بہار کی جانب بھاگ گیا اور میدان بابر کے ہاتھ رہا۔

جنگِ کنواہہ کے نتائج

۱۔ راجپوتوں کی قوت کا خاتمہ: "جنگِ کنواہہ تاریخ برصغیر پاک و ہند کی ایک فیصلہ کن جنگ تھی اور پانی پت کی پہلی لڑائی کی بہ نسبت اہم نتائج کی حامل تھی۔ جنگِ پانی پت سلطنتِ دہلی کے فرمانروا ابراہیم لودھی، جس کی قوت حکمرانی درحقیقت ختم ہو چکی تھی، کی شکست کا باعث بنی۔ لیکن جنگ کنواہہ طاقتور اور ذی اقتدار راجپوتوں کی شکست پر منتج ہوئی۔" [1]

اگرچہ یہ جنگ صرف دس گھنٹے لڑی گئی لیکن تاریخی لحاظ سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جو آغاز سے انجام تک پوری شدت سے لڑی گئی۔ راجپوتوں

---

[1] "ایڈوانس ہسٹری آف انڈیا" صفحہ ۴۲۹

Marfat.com

کو شکستِ فاش ہوئی۔ رانا سانگا شدید زخمی ہوا اور بالآخر وہ اسی شکست کے غم میں دو سال کے بعد وفات پا گیا۔ اس جنگ نے راجپوتی اقتدار کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ بڑے بڑے راجپوت سردار مارے گئے اور اس طرح ان کی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ تاریخ کے کسی دور میں متحد نہ ہو سکے۔

۲۔ رام راج کے قیام کی راجپوتی اُمید کا خاتمہ: جنگِ کنواہہ کے نتیجے کے طور پر بابر کو برصغیر سے نکالنے اور افغانوں اور مغلوں کو باہم متصادم کرنے کی راجپوتی سازش اور رام راج کے قیام کی امید ناکام ہو کر رہ گئی اور راجپوت کافی عرصہ تک عملی سیاسیات سے الگ رہنے پہ مجبور رہے۔

۳۔ نوزائیدہ مغل حکومت کو استحکام ملا: جنگ کنواہہ اپنے نتائج اور نوعیت کے لحاظ سے خاص اہمیت کی حامل ثابت ہوئی۔ پانی پت کی لڑائی نے تو صرف افغان اقتدار کو ختم کیا تھا لیکن جنگ کنواہہ نے افغان اور راجپوت دونوں کے اقتدار کو ختم کرتے ہوئے نوزائیدہ مغل حکومت کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع دیا۔ "پانی پت کی لڑائی نے بابر کو صرف تختِ دہلی کا وارث بنایا تھا۔ لیکن جنگ کنواہہ نے اسے شمالی برصغیر کا بادشاہ بنا دیا۔" [1]

۴۔ بابر کے مصائب کا خاتمہ: جنگِ کنواہہ کی فتح سے "بابر کی صحرا نوردی کے دن ختم ہو گئے اب خوش بختی اس کے دامن میں اور کامیابی اس کی ہمرکاب تھی اور اسے اب اس کا اہل بن کر دکھانا تھا۔" [2]

"His days of wandering in search of a fortune are now over ; the fortune is his and he has but to show himself worthy of it."

اس جنگ کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلا کہ بابر کی "سلطنت کا مرکز کابل سے ہندوستان (آگرہ) منتقل ہو گیا۔" [3]

"The centre of gravity of his power is shifted from Kabul to Hindustan."

رانا سانگا: ۱۵۰۹ تا ۱۵۲۹ء رانا سانگا کا اصل نام رانا سنگرام سنگھ تھا۔ وہ ایک مشہور راجپوت خاندان گوہل سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ۱۵۰۹ء میں میواڑ کی راج گدی

---

[1] رشبروک ولیمز [2] ایضاً [3] ایضاً

Marfat.com

پرتگال ہوا۔ چیتوڑ اس کا صدر مقام تھا۔ رانا سانگا ایک نہایت ہی قابل سپہ سالار، جنگجو یا نہ صلاحیتوں کا مالک اور ایک شاطر ڈپلومیٹ تھا۔ اسے فتوحات کا بہت شوق تھا۔ اس نے بیس سال کے قلیل عرصے میں اردگرد کی تمام ریاستوں پر قبضہ کر کے اور انہیں اپنا باجگذار بنا کر اپنی طاقت کی دھاک بٹھا دی۔ رانا سانگا دہلی و آگرہ کی اسلامی سلطنت کو مٹا کر تمام برصغیر پاک و ہند میں رام راج کے قیام کا خواہاں تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے تمام ہندو ریاستوں کو اپنی قیادت میں متحد کر لیا۔ اس نے دہلی اور آگرہ کی لودھی سلطنت کو ختم کرنے کے لئے منصوبے کے تحت باقاعدہ ایک سفارتی وفد کابل کے بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر کے پاس بھیج کر اُسے برصغیر پاک و ہند پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور فوجی امداد کا وعدہ کیا۔ اس کی دعوت ڈپلومیسی پر مبنی تھی جس کے دو نظریے تھے۔ ایک نظریہ تو یہ تھا کہ بابر حملہ آور ہو گا اور سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دینے کے بعد اپنے جدِ امجد امیر تیمور کی مانند لوٹ مار کر کے جس طرح آندھی کی طرح وارد ہو گا اسی طرح بگولے کی مانند واپس چلا جائے گا اور میدان اس (رانا سانگا) کے لئے صاف ہو گا جس کے بعد وہ آسانی سے برصغیر میں رام راجیہ قائم کر لے گا۔ دوسرا نظریہ اس کا یہ تھا کہ اگر بابر کے مقابلے میں ابراہیم لودھی کامیاب ہو گیا تو پھر بھی ابراہیم لودھی کی قوتِ مدافعت اس حد تک کمزور پڑ چکی ہو گی کہ کمزور اور تھکے ہوئے دشمن کو شکست دینا اس کے لئے آسان ہو گا اور وہ بآسانی اپنے مقصد (رام راجیہ کے قیام) کو پا لے گا۔

رانا سانگا کی دعوت پر جب بابر دہلی و آگرہ کی سلطنت پر حملہ آور ہوا تو رانا سانگا وعدہ خلافی کا مرتکب ہوا۔ اس نے وعدہ کے مطابق بابر کی کوئی مدد نہ کی بلکہ خاموش تماشائی بن کر حالات کا بنظرِ غائر جائزہ لیتا رہا لیکن جب اسے پانی پت کی پہلی لڑائی میں بابر کی کامیابی اور اس کے برصغیر میں مستقل قیام پذیر ہونے اور مغلیہ سلطنت قائم کرنے کے ارادہ کی خبر ملی تو وہ بدک اٹھا چنانچہ اس نے بزورِ شمشیر بابر کو برصغیر سے باہر نکال پھینکنے کی ٹھان لی۔ اور راجپوتوں کی ایک لاکھ فوج لے کر کنواہہ آ پہنچا۔ ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو کنواہہ کی جنگ میں رانا سانگا کا بابر سے آمنا سامنا ہوا جس میں رانا سانگا کو شکست ہوئی اور وہ شدید زخمی ہوا۔ انہی زخموں سے اس نے وفات پائی۔ بابر نے بھی تزکِ بابری میں رانا سانگا کی بہادری کی تعریف کی ہے۔ رانا سانگا کی تمام زندگی جنگ و جدل میں گذری تھی۔ ان جنگوں میں اس کی ایک آنکھ ایک بازو اور ایک ٹانگ ضائع ہو چکی تھی اس کے جسم پر اسی سے زیادہ زخموں کے نشان تھے۔ رانا سانگا کا خاندان بعد میں مغلوں کا مقابلہ کرتا رہا اور اکبر کے زمانے تک انہوں نے مغلوں کی اطاعت قبول نہیں کی۔ رانا پرتاپ اسی خاندان کا چشم و چراغ تھا جو تمام عمر اکبر سے تیغ آزمائی کرتا رہا۔ لیکن جہانگیر نے اپنی صلح جو پالیسی سے

Marfat.com

میواڑ کے گھرانے کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور انہوں نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی۔

بابر کی دیگر فتوحات

چندیری کی فتح
۱۵۲۸ء

۱۵۲۸ء میں بابر راجپوتوں اور افغانوں کے سازشی گٹھ جوڑ کو ختم کرنے کے لئے قلعہ چندیری پر حملہ آور ہوا جو بندھیل کھنڈ اور مالوہ کی سرحد پر واقع تھا اور جس پہ مشہور راجپوت سردار راجہ مدنی راؤ کی حکومت تھی۔ راجہ مدنی راؤ رانا سانگا کا ایک آزمودہ کار جرنیل تھا وہ بابر کی یلغار کے ڈر سے اپنے پانچ ہزار جانباز راجپوت سپاہیوں کے ساتھ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ بابر نے کشت و خون سے بچنے کے لئے چندیری کے محاصرہ سے قبل مدنی راؤ کو قلعہ چندیری کے عوض شمس آباد کی پیش کش کی لیکن مدنی راؤ نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس پر بابر نے آگے بڑھ کر چندیری کا محاصرہ کر لیا۔ ہر چند مدنی راؤ نے دیگر راجپوت سرداروں کی معیت میں بڑی پامردی اور بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن شکست اس کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی چنانچہ مجبور ہو کر راجپوتوں نے جوہر کی رسم ادا کی اور اپنے اہل و عیال کو زندہ جلا دیا۔ ازاں بعد برہنہ سر اور برہنہ پا ہو کر مغل فوج پر ٹوٹ پڑے اور مارے گئے۔ ۲۹ جنوری ۱۵۲۸ء کو بابر نے چندیری پر قبضہ کر لیا۔

گھاگرا کی لڑائی
۱۵۲۹ء

بابر کی راجپوتوں سے پیکار آزمائی کے دوران ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی نے بہار میں اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا اور متعدد افغان سردار اس کے جھنڈے تلے آ کر جمع ہو گئے تھے۔ بنگال کا حکمران نصرت شاہ بھی اس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ بابر اس افغان فتنہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ افغانوں سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے مشرق کی جانب روانہ ہوا۔ کئی افغان سرداروں نے مغل طاقت سے مرعوب ہو کر بابر کی اطاعت قبول کر لی۔

بابر کی آمد کی خبر سن کر محمود لودھی بنگال بھاگ گیا اور نصرت شاہ کے ہاں جا کر پناہ گزیں ہوا۔ نصرت شاہ اور بابر کے تعلقات دوستانہ تھے اس لئے بابر نے خط و کتابت کے ذریعے نصرت شاہ سے افغان فتنہ کو فرو کرنے کی خاطر راستہ مانگا اور انکار کی صورت میں جنگ کی دھمکی دی۔ آخر ۶ مئی ۱۵۲۹ء کو بابر نے گھاگرا کے مقام پر افغانوں کو فیصلہ کن شکست دی اور افغان طاقت کی بحالی کے خطرے کو وقتی طور پر ختم کر دیا۔

بابر نے نصرت شاہ والئے بنگال کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رُو سے دونوں حکمرانوں

Marfat.com

نے ایک دوسرے کے علاقے کا احترام کرنے کا وعدہ کیا۔ نصرت شاہ نے بابر کو مزید یقین دلایا کہ وہ آئندہ بابر کے کسی دشمن کو پناہ نہیں دے گا۔

بابر کی کامیابی کے اسباب

ظہیرالدین محمد بابر نومبر ۱۵۲۵ء میں محض بارہ ہزار فوج کے ساتھ برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوا تھا۔ اس قلیل فوج سے اس نے نہ صرف تمام پنجاب کو زیر نگیں کیا بلکہ پانی پت کی پہلی لڑائی (۲۱-اپریل ۱۵۲۶ء) اور جنگ کنواہہ (۱۶-مارچ ۱۵۲۷ء) جیسی دو فیصلہ کن جنگیں بھی لڑیں۔ قلیل التعداد فوج کے ساتھ اس قدر وسیع ملک کی تسخیر کے پیش نظر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بابر کی کامیابی کے اسباب کیا تھے۔ مؤرخین کے نزدیک بابر کی کامرانی کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:۔

۱۔ سیاسی استحکام کا فقدان: بابر کے حملے کے وقت برصغیر میں سیاسی استحکام کا فقدان تھا۔ تمام ملک میں ہر طرف لامرکزیت، طوائف الملوکی اور بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ برصغیر لاتعداد چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن کے حکمران باہمی چپقلشوں کا شکار تھے اس لئے پانی پت کی پہلی لڑائی کے وقت ہمسایہ ریاستیں تماشائی بنی رہیں اور ابراہیم لودھی کی مدد کو نہ پہنچیں۔

۲۔ بابر کی جنگی چالیں: بابر ایک قابل اور تجربہ کار جرنیل تھا اور تمام مؤثر فنونِ حرب اور جنگی چالوں سے بخوبی واقف تھا۔ ابراہیم لودھی اور رانا سانگا کی افواج بابر کی جنگی چالوں کے سامنے عاجز ہو کر رہ گئیں اور اس کی فوج کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ بابر نے اپنے فوجی دستوں کو اس ترتیب اور منضبط طریقے سے صف آرا کیا کہ قلعہ کی مانند انہیں محفوظ کر لیا۔ نیز اس نے توپوں اور بندوقچیوں کو ایسے منظم طریقے سے متعین کیا کہ پانی پت میں ابراہیم لودھی اور جنگ کنواہہ میں رانا سانگا کو ماتھا کھانی پڑی۔ یہ ایک مسلمہ اور تاریخی حقیقت ہے کہ بابر نے صرف اپنی جنگی چالوں اور فنون حرب کی مہارت سے اپنے سے دس گنا زیادہ راجپوتی فوج کو شکست دی۔ بابر نے وسط ایشیا میں اپنے دشمنوں سے بے شمار جنگیں لڑی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ فنِ حرب میں وہ ماہرانہ استعداد رکھتا تھا۔ دشمن کی کمزوریوں کو بھانپنا، موقعہ سے بروقت فائدہ اٹھانا، کڑے سے کڑے وقت میں بھی اپنے سپاہیوں کے حوصلے بڑھانا یہ سب ایسی باتیں تھیں جو اس کی کامیابی کا سبب بنیں۔ وہ ایک پیدائشی جرنیل تھا وہ اپنے سے کئی گنا

Marfat.com

زیادہ طاقت ور دشمن کا مقابلہ کرنا خوب جانتا تھا۔ لشکر کی حفاظت کے لئے خندق کا استعمال، گاڑیوں کا کھڑا کرنا۔ دستوں کی صحیح ترتیب، مورچہ بندی، تیر اندازوں، توپچیوں، بندوقچیوں اور تلغمہ دستوں کا تقرر یہ سب ایسی جنگی تدبیریں تھیں جن سے برصغیر کے حکمران بالکل ناواقف تھے۔

۳۔ بابر کی شخصیت:

بابر کی شخصیت گوناگوں قائدانہ صلاحیتوں کا مجموعہ تھی اور یہ کہنا بالکل درست ہے کہ بابر کی کامیابی میں اس کی اپنی شخصیت کا بھی بہت زیادہ دخل تھا۔ اس کی شخصیت میں بلا کی کشش اور مقناطیسی جاذبیت تھی۔ وہ بہت جلد دوسروں کو اپنا ہم خیال بنا لیتا تھا۔ اسے اپنی فوج میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔ سپاہی اس کی نگاہوں میں اپنی عزت و توقیر بڑھانے کے لئے بے جگری سے لڑتے تھے۔ بابر بھی نہ صرف اپنے سپاہیوں کی ہر سہولت کا زیادہ خیال رکھتا بلکہ ہمیشہ ان کو انعامات اور عطیات سے نوازتا رہتا تھا نیز جب کبھی اس کے سپاہی خوف و ہراس کا شکار ہوتے تو وہ ان میں جرأت و ہمت کی روح پھونک دیتا تھا۔

۴۔ بابر کی تقریری صلاحیت:

بابر میں تقریری صلاحیتیں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ عین لڑائی کے دوران پرجوش اور مؤثر تقریر سے اپنے بددل سپاہیوں کو دل بڑھا دیا کرتا تھا۔ اور اس کے سپاہی انتہائی وفادارانہ جذبے سے لڑتے تھے۔ اس کے برعکس افغان اور راجپوت فوج میں قومی جذبہ مفقود تھا۔ بابر اپنے سپاہیوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھا۔ جنگِ کنواہہ میں اس نے اپنی اسی تقریری صلاحیت سے کام لیتے ہوئے اپنے شکستہ دل سپاہیوں کے حوصلے بڑھا دیئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سپاہی ایک خاص جذبے سے لڑے اور کامیابی حاصل کی۔

۵۔ فوجی نظم و ضبط:

بابر کی کامیابی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ابراہیم لودھی کی فوج نہ تربیت یافتہ و منظم تھی اور نہ ہی وہ بابر کی فوج کی مانند جدید فنونِ حرب سے واقف اور جدید اسلحہ سے لیس۔ سپاہی بہادر ضرور تھے اور بے جگری سے لڑ کر جان پہ کھیل جانا بھی جانتے تھے۔ لیکن جدید فنونِ حرب سے نابلد اور فوجی نظم و ضبط سے بے بہرہ تھے۔

۶۔ جذبۂ جہاد:

جنگ کنواہہ میں بابر کی کامیابی زیادہ تر جذبۂ جہاد کی مرہونِ منت تھی۔ جنگ کنواہہ کے موقعہ پر اس نے اپنے سپاہیوں کو یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ یہ کفر اور اسلام کی جنگ ہے۔ نیز رانا سانگا ہندو اور بت پرست ہے اس سے لڑنا برصغیر سے بت پرستی کی لعنت کو ختم کرنے کے مترادف ہے اس جنگ میں

Marfat.com

ہیں ہمارا جو بھی سپاہی شہید ہوگا وہ جنت میں جائے گا اور جو فتح مند فوج کا فرد ہوگا وہ غازی کہلائے گا۔ یہ مغل فوج کے اسی جذبۂ جہاد کا اثر تھا کہ راجپوتوں جیسی بہادر قوم کو بھی میدان جنگ سے بھاگنا پڑا اور رانا سانگا جیسے جہاندیدہ شخص کو شکستِ فاش ہوئی۔

۷۔ آب و ہوا کا اثر: بابر کی کامیابی میں آب و ہوا نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ بابر کی فوج کے سپاہی سرد آب و ہوا کے عادی اور جفاکش تھے۔ نیز اُن میں قدرتی طور پر موسمیاتی شدت برداشت کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اس کے برعکس برصغیر کی افواج کاہل الوجود اور تساہل پسند تھیں یہی وجہ تھی کہ وہ بابر کی جفاکش فوج کا مقابلہ نہ کر سکیں۔

۸۔ توپ خانہ: مؤرخین کی متفقہ رائے ہے کہ بابر کی کامیابی کا اصل راز اس کے توپ خانہ میں مضمر تھا۔ پانی پت کی پہلی لڑائی اور جنگ کنواہہ میں بابر کے توپ خانے اور ماہر فن بندوقچیوں نے بہت اہم کردار ادا کیا چنانچہ ابراہیم لودھی اور رانا سانگا کی عظیم عسکری قوتیں بابر کے توپ خانہ کی گولہ باری سے بوکھلا اٹھیں۔ ان کے سپاہی اور جنگی ہاتھی اس تباہ کن آتشبازی سے گھبرا اٹھے۔ توپ خانے کی تباہ کاری ہی کی وجہ سے ابراہیم لودھی کے ہاتھی راجہ پورس کے ہاتھی ثابت ہوئے اور خود اپنی ہی فوج کی تباہی اور شکست کا سبب بنے۔ کیونکہ ہاتھی توپ خانے کی غیر متوقع گولہ باری اور آتشبازی سے ڈر کر ایسے دہشت زدہ ہوئے کہ اپنے ہی سپاہیوں کو روندتے ہوئے پیچھے کو بھاگ نکلے۔

بابر کے آخری ایام

شہزادہ ہمایوں جسے بدخشاں کا گورنر مقرر کیا گیا تھا، اپنے باپ کی اجازت لئے بغیر واپس آگرہ آ گیا۔ بعد ازاں ہمایوں کو اپنی جاگیر سنبھل میں جانے کو کہا گیا جہاں وہ بیمار پڑ گیا اور بیماری کی حالت میں آگرہ واپس لایا گیا۔ جب وہ کافی علاج کے باوجود روبہ صحت نہ ہوا تو بابر نے مشہور بزرگ ابوالبقا (جو اپنے زمانے کے ولی اللہ تھے) سے مشورہ لیا جنہوں نے ہمایوں کو اللہ تعالیٰ سے غیبی امداد کا طالب ہونے اور اپنی کوئی محبوب اور بیش قیمت چیز بطورِ صدقہ دینے کا مشورہ دیا۔ اس پر بابر نے کہا کہ میرے پاس سوائے میری جان کے اور کوئی چیز قیمتی نہیں ہے اس لئے میں اپنی زندگی کو اس پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ بابر نے خدا کے حضور دعا مانگی کہ اے خدا ہمایوں کی بیماری مجھے دیدے اور میرے عوض اسے صحت و زندگی عطا فرما۔ محققین کا کہنا ہے کہ بابر کی اس دعا کے بعد ہمایوں صحت یاب ہو گیا اور بابر چند دن بیمار رہ کر ۲۶۔ دسمبر ۱۵۳۰ء کو راہیِ ملک عدم ہوا۔ بابر کی موت کے بارے میں مغل مؤرخین لکھتے ہیں کہ باپ نے اپنی جان بیٹے پر نثار کر دی۔ بابر کو آرام باغ آگرہ میں بطورِ امانت دفن کر دیا گیا جہاں

Marfat.com

سے بعد میں اس کی وصیت کے مطابق اس کی نعش کو کابل بھجوایا گیا جہاں وہ اپنے محبوب باغ میں مدفون ہوا۔

تزکِ بابری

بابر کو قدرت سے بے پناہ قوتِ مشاہدہ ودیعت ہوئی تھی۔ یہی وجہ وہ زندگی کے اہم واقعات، شخصیات اور حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کا عادی تھا وہ ڈائری یا کتاب جس میں بابر نے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور اپنی زندگی کے اہم واقعات لکھے ہیں تزکِ بابری کہلاتی ہے[1]۔ اربابِ دانش کے نزدیک یہ کتاب ترکی نثر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اسے بابر نے اپنے فرصت کے اوقات میں اپنی مادری زبان ترکی میں تحریر کیا اس کا اندازِ بیان نہایت دلپذیر اور سادہ ہے لیکن طرزِ تحریر تنقیدی ہے تزک بابری مستند واقعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے اس کی حیثیت محض ایک معمولی خود نوشت یا سرگزشت کی نہیں بلکہ یہ اپنی تاریخی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے مطلع السعدین اور تاریخِ رشیدی سے بدرجہا اعلیٰ خصوصیت کی حامل ہے اس کو ایک مستند تاریخ شمار کیا جاتا ہے مشہور انگریز مورخ لین پول کی رائے کے مطابق:

> "یہ کسی معمولی سپاہی کی زبانی فوجی مقابلوں اور جوابی حملوں کی روئیداد پر مشتمل نہیں بلکہ یہ دنیا کے ایک ایسے مہذب انسان کے ذاتی تاثرات اور عمیق مطالعہ پر مشتمل ہے جسے مشرقی علوم پر پورا عبور حاصل تھا۔"

تزک بابری کا دو دفعہ فارسی زبان میں ترجمہ ہوا پہلی مرتبہ پیندا خاں کے قلم سے دوسری بار اکبر اعظم کی فرمائش پر عبدالرحیم خانخانان کے قلم سے تزک بابری کا متعدد یورپی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے خاص طور پر انگریزی اور فرانسیسی زبان میں کئی بار ترجمہ ہو چکا ہے ان میں لیڈن ارسکائن اور اے ایس بیوریج کے ترجمے زیادہ مشہور ہیں۔ تاریخ دان اے ایس بیوریج کے ترجمے کو تاریخی لحاظ سے مستند اور معتبر قرار دیتے ہیں۔

تزکِ بابری کی تاریخی اہمیت

تزکِ بابری ایک ایسی ڈائری اور سرگذشت ہے جو اگرچہ اپنے اندر ۱۹-۱۵۰۸ء، ۲۵-۱۵۲۰ء اور ۳۰-۱۵۲۹ء کے اہم وقفے رکھنے کی وجہ سے نامکمل اور غیر مسلسل ہے مگر تاریخی لحاظ

---

[1] یہ کتاب تین مختلف ناموں سے مشہور ہے (۱) تزکِ بابری (۲) واقعاتِ بابری (۳) بابر نامہ

Marfat.com

ہے اس کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک واحد مستند اور معتبر تاریخی کتاب ہے جو نہ صرف ظہیر الدین محمد بابر (۱۴۸۳ - ۱۵۳۰ء) کے حالاتِ زندگی اور سولھویں صدی عیسوی کے آغاز کے واقعات کا واحد ذریعہ ہے بلکہ سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں برصغیر پاک و ہند میں وقوع پذیر سیاسی و معاشی واقعات اور مذہبی حالات پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ تاریخی لحاظ سے اس میں سولھویں صدی کے آغاز کے سیاسی حالات غرض کے معیارِ زندگی اور تہذیب و تمدن کی بڑی خوش اسلوبی سے عکاسی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حکومت و دولت کے مختلف شعبوں کے متعلق بہت مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔ بابر نے تزک بابری میں اپنے کردار کی خامیوں کو نمایاں کرنے کے لحاظ نہیں کرتا۔ اس نے تزک بابری میں اپنے کردار کی خامیاں کوتاہیاں اور اپنے عزیز اپنے امراء اور احباب کی خامیاں بھی بیان کر دی ہیں۔ وہ محض خصائص اور کمزوریوں پر تنقید نہیں کرتا بلکہ واقعات کو گہرے مطالعہ اور تحقیق کے بعد پوری ذمہ داری سے بیان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تزک بابری نہ صرف حقیقت پسندی اور مورخانہ دیانت کا بہترین نمونہ ہے اور تاریخی حیثیت سے ایک بلند پایہ شاہکار ہے ان تاریخی خصوصیات کی بنا پر ہم اسے کلاسیکی معلومات کہہ سکتے ہیں۔

تزکِ بابری کی ادبی حیثیت:

تزک بابری کا اسلوب بیان جامع اور طرزِ تحریر انتہائی سادہ ہے۔ جا بجا فارسی کے اشعار و امثال کی برمحل شمولیت نے زبان اور اسلوب بیان کو نہایت پُرکشش اور موزوں بنا دیا ہے تزکِ بابری پڑھتے ہوئے قاری کو لحظہ بھر کے لئے بھی عدم دلچسپی کا احساس نہیں ہوتا۔ تزکِ بابری اپنے اندازِ نگارش اور واقعاتی مواد کے اعتبار سے سولھویں صدی کی ایک مستند اور معتبر تاریخ ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ ادبی شاہکار بھی ہے۔ مشہور مؤرخ لین پول Lane Poole کی یہ رائے کتنی صحیح ہے کہ:

"باوجودیکہ بابر کی عظیم الشان سلطنت اور پرشکوہ خاندان مدت ہوئی ناپید ہو چکے ہیں لیکن وہ اپنی پائیدار یادگار تزکِ بابری کی وجہ سے آج تک درخشندہ ستارے کی مانند زندہ ہے اور شہرت کے آسمان پر چمک رہا ہے۔" [1]

"The power and pomp of Babur's dynasty are gone, the record of his life – the *littera-scripta* that mocks at time – remains unaltered and imperishable."

Lane Poole

---

[1] "لین پول، انڈیا انڈر محمڈن رول" صفحہ ۱۰۶

Marfat.com

ارسکائن Erskine رقمطراز ہے کہ "تزک نگاری میں بابر کا کوئی مقابل نہ تھا اس کی شہرۂ آفاق تزکِ بابری ادبیات عالم میں ایک مسلّمہ شاہکار ہے"

سیرت و شخصیت

بابر اپنی دلکش اور مسحور کن شخصیت کے اعتبار سے تاریخ اسلام کا ایک نہایت منفرد اور مثالی کردار ہے وہ اپنی گوناگوں ذاتی صفات کے پیش نظر "اپنے زمانے کا نہ یک ترین ایشیائی فرمانروا تھا وہ کسی بھی دور اور کسی بھی ملک کے حکمرانوں کے مقابلے میں بلند مقام کا مستحق ہے"[1]

"Babur was the most brilliant Asiatic prince of his age and worthy of a high place among the sovereigns of any age or country." (V. A. Smith)

بابر کی شخصیت کے بارے میں مختلف مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے بہت کچھ لکھا ہے اس کی شخصیت اس قدر متنوع اور بوقلموں صفات کی حامل تھی کہ کسی مختصر پیرائے میں ان سب کا بآسانی تذکرہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک وفادار اور قابل اعتماد دوست، رنگین مزاج اور زندہ دل شہزادہ، ادب سے والہانہ دلبستگی رکھنے والا بلند پایہ مدبر، روشن دماغ اور ناقابلِ تسخیر عزائم کا پیکر اور رعایا پرور بادشاہ تھا۔ اس میں بیک وقت بذلہ سنجی، حاضر دماغی، اعلیٰ تدبر و فراست فیاضی و فراخ دلی، راہنمایانہ عزم و شعور، فاتحانہ جذبہ و احساس، مردم شناسی اور خوش اخلاقی و رواداری کی اعلیٰ صفات پائی جاتی تھیں تیمور اور نپولین کی مانند بابر ایک باہمت اور صاحب عزم انسان تھا۔ وہ فنون سپہ گری کا استاد، عقابی نظر کا حامل اور بلا کا موقعہ شناس تھا۔

ہمعصر اور زمانۂ حال کے سب مؤرخین کی متفقہ رائے ہے کہ قرون وسطیٰ کے تمام بادشاہوں میں بابر لائق اور جلیل القدر بادشاہ تھا۔ بابر کی لڑکی گلبدن بیگم نے بھی "ہمایوں نامہ" میں بابر کا تذکرہ توصیفی الفاظ میں کیا ہے۔ اس کا خالہ زاد بھائی اور تاریخ رشیدی کا مصنف مرزا حیدر بابر کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ بابر سے قبل نہ اس کے خاندان میں اور نہ ہی اس کی نسل میں سے کوئی بھی شخص اس جیسے تجربات اور حیران کن معرکوں سے دوچار ہوا ہوگا اور نہ ہی کوئی اس جیسی لاتعداد خوبیوں اور کمالات سے آراستہ تھا"

---

[1] وی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۴۲۰

Marfat.com

بقول ہیول :

"بابر اپنی دلآویز شخصیت، فنکارانہ مزاج اور رومانی زندگی کی بدولت تاریخ اسلام کی ایک نہایت ہی پرکشش ہستی ہے۔"

"His engaging personality, artistic temperament and romantic career make him one of the most attractive figures in the history of Islam." (Havel)

اب ہم اس کی سیرت و کردار کے چند اہم پہلوؤں کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں۔

بابر بحیثیت انسان

ایک انسان کی حیثیت سے بھی بابر ایک انفرادی شان رکھتا تھا۔ وہ ایک پُرشکوہ شخصیت، دلکش خدوخال اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ انتہا درجے کا بہادر اور نڈر تھا اس کی جسمانی قوت کا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بیک وقت اپنی دونوں بغلوں میں ایک ایک آدمی دبا کر قلعہ کی فصیل پر بے تکلف دوڑا کرتا تھا۔ تیراکی کا بے حد شوقین تھا۔ برصغیر پر حملہ کے دوران اس نے راستے کے تمام دریاؤں کو تیر کر عبور کیا۔ گنگا جیسے وسیع دریا کو صرف تینتیس ہاتھوں میں عبور کیا۔ بابر مروّت اور فیاضی کا پیکر اور انسانی ہمدردی کا بے پایاں جذبہ رکھتا تھا۔ اپنے قرابت داروں اور دوستوں سے ہمیشہ ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ کرتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے ہمایوں پر اپنی جان قربان کر کے پدرانہ شفقت اور جاں نثاری کا جو مظاہرہ کیا تھا سلاطین کی تاریخ میں اس کی مثال نا پید ہے

بابر اپنے دشمنوں تک سے فیاضانہ سلوک کرنے کا خوگر اور ایک صابر اور باہمت انسان تھا۔ مصائب کو ہمیشہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتا تھا۔ زندگی کی تلخ کامیوں اور بدقسمتی کے باوجود اس نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور افسردگی کو نزدیک نہ آنے دیا۔

وہ ہمہ وقت ہشاش بشاش رہتا اور زندہ دلی سے زندگی گذارنے کا عادی تھا۔ بابر میں نشاط کا مادہ ضرور تھا لیکن عیش پرست نہیں تھا۔ اس کی نادرِ روزگار خود نوشت تزک بابری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اوائل شباب میں اسے شراب یا اس نوع کے کسی بھی دوسرے نشے کی طرف کوئی رغبت نہ تھی بعد میں جب اسے شراب و افیون کی عادت ہوئی تو وہ ان کا رسیا ہو کر رہ گیا۔ لیکن تہذیب و شائستگی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اتنا بدمست بھی نہیں ہوتا تھا کہ اپنے فرائض منصبی سے غافل ہو جائے۔ بالآخر جنگِ کنواہہ کے موقع پر اس نے خلوص دل سے توبہ کی اور پھر تا عمر شراب کو منہ نہ لگایا۔

بابر وفات کا شوقین تھا اور اپنے مقاصد و عزائم کے حصول میں آلام اور

Marfat.com

خطرات سے کو ہیچ سمجھتا تھا۔ اگرچہ وہ ایک قسمت آزما سپاہی تھا لیکن ادب اور فنونِ لطیفہ سے خاص دلی انس رکھتا تھا۔ باغات لگوانے کا بے حد شوقین تھا۔ برصغیر میں چہار تختہ باغات اسی کی ایجاد ہیں۔ برصغیر میں بابر نے متعدد باغات لگوائے۔ بابر قول کا پکا اور راست بازی کا قائل تھا اپنے دشمنوں سے بھی دھوکہ اور فریب کو ناگناہ سمجھتا تھا۔ الغرض بابر بحیثیت انسان ایک عظیم المرتبت انسان تھا۔

رنگینیٔ طبع

بابر کے کردار کی بہترین خوبی یہ ہے کہ زمانہ جنگ ہو یا دورِ امن و امان وہ ہر حالت میں خوش طبع و خوش و خرم رہتا تھا۔ زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ یہ تھا کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ وہ اپیکیورین نظریہ کا معتقد تھا۔ "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

"O Babur, seize life's pleasure, which once departed can never, alas ! return."

Lane Poole

بابر کی محفل میں شعر و شاعری کے علاوہ شراب کے دور بھی چلتے تھے لیکن اس کی یہ عیش کوشی بادمستی کی حالت تک کبھی نہیں پہنچی تھی۔ اگرچہ بابر کو مصائب نے اوائلِ عمر ہی سے گھیر لیا تھا لیکن مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا تھا اس کی اس خوش طبعی نے اسے بڑی سے بڑی مشکلات میں بھی شکستہ دلی سے دور رکھا اور عزم و استقامت کا پیکر بنائے رکھا۔ بابر کی رنگینیٔ طبع اس کی مشکلات کا ایک قدرتی اور نفسیاتی ردِ عمل تھا۔

بابر بطور عالم و فاضل

بابر علم و ادب کا شیدائی اور مناظر قدرت کا پرستار تھا اسے فارسی اور ترکی زبان پر عبور حاصل تھا اس نے تزکِ بابری لکھ کر اپنے آپ کو زندۂ جاوید بنا لیا وہ علماء و فضلاء کی نہ صرف قدر افزائی ہی کرتا تھا بلکہ ان سے بیحد عزت و احترام سے پیش آتا تھا۔ اس کی نظم و نثر کا انداز بیان نہایت سادہ فطری اور پاکیزہ لیکن تنقیدی تھا اسے اگر ادیب بادشاہ کہہ کر پکارا جائے تو بجا ہے لیکن وہ سپاہی اول اور شاعر ادیب بعد میں تھا چنانچہ اس نے اپنے ادبی ذوق کو امورِ سلطنت اور فوجی مہمات میں کبھی حائل نہیں ہونے دیا۔

بابر کا مذہب

بابر راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھا۔ اگرچہ جنگ کنواہہ میں اس نے ہندوؤں کے خلاف جنگ کو جہاد قرار دیا تھا لیکن وہ متعصب اور تنگ نظر نہ تھا اور نہ ہی بہ نوک شمشیر کسی کو مسلمان بنانے کا قائل تھا۔ وہ اس قدر رواداری کا حامی تھا کہ اگرچہ چندیری، رنتھمبور اور اجودھیا میں ہندوؤں نے مساجد کو منہدم کروا دیا تھا مگر اس نے دشمنانِ اسلام کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے کی بجائے محض ان کی دوبارہ تعمیر پر ہی اکتفا کیا

Marfat.com

وہ ایران کے بادشاہ شاہ اسمٰعیل صفوی کا دوست تھا اگرچہ سمرقند کے حصول کے لئے شاہ اسمٰعیل صفوی کی مدد حاصل کرنے کے لئے اس نے شیعہ مذہب کے چند عقائد اختیار کر لئے تھے لیکن جلد ہی انہیں خیرباد کہہ دیا۔ بابر زندگی بھر توکل برخدا کا قائل رہا اس کا عقیدہ تھا کہ "خداوند تعالےٰ کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"Nothing happens but by the will of God."

وہ ہر جنگ سے قبل اللہ تعالےٰ سے فتح و کامرانی کے لئے دعا مانگتا اور حصول نصرت کے بعد اللہ تعالےٰ کا شکر گزار ہوتا تھا۔

بابر بطور سپہ سالار

بابر ایک اعلیٰ پایہ کا سپہ سالار تھا ایک تجربہ کار جرنیل کے تمام اوصاف اس میں بدرجہ اتم موجود تھے اس نے اپنی زندگی کے بیشتر فراز سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ عہد سے بعد تک اس کو اپنی جان اور سلطنت کی حفاظت کے لئے لڑنا پڑا تھا اس وجہ سے فنونِ سپہ گری و حرب سے وہ بخوبی طور پر واقف تھا۔ امیر تیمور اور نپولین بونا پارٹ کی مانند وہ ایک پیدائشی سپاہی اور عظیم فاتح تھا۔

وہ جسمانی طور پر بے حد مضبوط اور عزم و استقلال کا پتلا تھا۔ اس کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قیادت و راہنمائی کی استعداد بچپن ہی سے اس میں موجود تھی۔ اس کے سپاہی خوفناک خطرات میں نہ صرف اس کا ساتھ دیتے اور وفادار رہتے بلکہ ہر وقت اس کی خاطر لڑنے مرنے کو تیار رہتے تھے بابر بھی ان کے آرام و آسائش کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ ایک آزمودہ کار جرنیل ہونے کی حیثیت سے بابر متعدد ایسی جنگی چالیں جانتا تھا جن سے اس کے بڑے بڑے دشمن بھی عاجز آجاتے تھے عین لڑائی کے ہنگام وہ موقع و محل کی نزاکت کے پیش نظر فوری اور موثر تدابیر اختیار کرنے کی صلاحیتیں بھی رکھتا تھا۔ وہ اپنے نوجیوں کی نفسیات سے پورے طور پر آگاہ اور ان سے کام لینا جانتا تھا۔ فوجی نظم و ضبط کے معاملے میں نہایت محتاط اور سخت گیر تھا سپاہ کے حکم عدولی کرنے والے کو سنگین سزائیں دینے سے بھی نہیں چوکتا تھا اس نے اپنے سپاہیوں کو سختی سے متنبہ کر رکھا تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں مفتوحہ علاقوں میں لوٹ کھسوٹ اور جبر و دھاندلی نہ کریں اگر کسی سپاہی کے بارے میں اسے کوئی ایسی شکایت پہنچتی تو وہ اسے عبرتناک سزا دیا کرتا تھا۔

بابر بطور حکمران

بابر نہ صرف ایک کامیاب جرنیل اور سپاہی تھا بلکہ ایک عظیم حکمران بھی تھا۔ اپنی عسکری قوت کے ذریعے اس نے ایک وسیع حکومت قائم کر لی تھی جس کی حدود بدخشاں سے لے کر بہار تک اور ہمالیہ سے چندیری تک پھیلی ہوئی تھیں اگرچہ اس کی پوری زندگی جنگ و جدل کے ہنگاموں میں گزری جس کے باعث وہ اپنی وسیع

Marfat.com

سلطنت کے انتظام و انصرام کی طرف پوری توجہ مبذول نہ کر سکا۔ تاہم وہ ایک اچھے حکمران کی حیثیت سے حکومت کے اوّلین فریضہ قیامِ امن میں پوری طرح کامیاب رہا کیونکہ اس نے اپنی منظم و مضبوط فوج کے ذریعے ہر قسم کے جرائم کا انسداد کیا۔ اگرچہ وہ اپنی قائم کردہ حکومت کے لئے کوئی نیا انتظامی ڈھانچہ تشکیل نہ کر سکا تاہم اس میں ایک اچھے حکمران کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں۔ چنانچہ اس نے ذرائع رسل و رسائل کی بہتری، جرائم کا انسداد، ملک میں امن و امان کا قیام، رعایا کا تحفظ۔ کابل اور آگرہ کے درمیانی راستے پر جا بجا فوجی چوکیوں کا قیام، خوبصورت باغات و عمارات، عالیشان مساجد اور مضبوط پلوں کی تعمیر جیسے متعدد فلاحی اقدامات کئے۔

اہم تاریخیں

۱۴۸۳ء فروری۔ بابر کی پیدائش۔
۱۴۹۴ء جون۔ عمر شیخ مرزا کی وفات، بابر کی تخت نشینی، بابر کے چچا احمد مرزا کی وفات۔
۱۴۹۷ء سمرقند پر بابر کا قبضہ۔
۱۴۹۹ء فرغانہ پر بابر کا دوبارہ قبضہ۔
۱۵۰۰ء سمرقند پر بابر کا ناگہانی قبضہ۔
۱۵۰۱ء شیبانی خاں کے ہاتھوں بابر کی شکست۔
۱۵۰۲ء شاہ اسماعیل صفوی کا تختِ ایران پر بیٹھنا۔
۱۵۰۴ء کابل پر بابر کا قبضہ۔
۱۵۰۵ء برصغیر پاک و ہند پر بابر کا پہلا حملہ۔
۱۵۰۸ء مارچ۔ ہمایوں کی پیدائش۔ بابر کا بادشاہ کا لقب اختیار کرنا۔
۱۵۱۰ء دسمبر شیبانی خاں ازبک کی وفات۔ شہزادہ کامران کی پیدائش۔
۱۵۱۱ء اکتوبر سمرقند میں بابر کا فاتحانہ داخلہ۔
۱۵۱۲ء سمرقند سے بابر کا اخراج۔
۱۵۱۶ء شہزادہ عسکری کی پیدائش۔
۱۵۱۷ء سکندر لودھی کی وفات اور ابراہیم لودھی کی تخت نشینی۔
۱۵۱۹ء برصغیر پاک و ہند پر بابر کا دوسرا اور تیسرا حملہ۔ بنگال میں نصرت شاہ کی تخت نشینی
شہزادہ ہندال کی پیدائش۔

Marfat.com

۱۵۲۰ء برصغیر پر بابر کا چوتھا حملہ، سندھ پر شاہ بیگ ارغون کا قبضہ اور رانا سانگا کی مظفر شاہ ثانی والئے گجرات کے ہاتھوں شکست۔

۱۵۲۱ء ہمایوں کا بدخشاں کے گورنر کی حیثیت سے تقرر۔

۱۵۲۲ء قندھار پر بابر کا قبضہ۔ دیوا اور چیول پر پرتگیزوں کا قبضہ۔

۱۵۲۴ء ملتان پر شاہ بیگ ارغون کا قبضہ۔ عالم خاں لودھی کا بابر سے حصولِ امداد کے لئے کابل میں ورود۔ کوچین کے مقام پر پرتگیزی سیاح واسکوڈے گاما کی وفات۔

۱۵۲۵ء بابر کا پنجاب پر حملہ۔

۱۵۲۶ء پانی پت کی لڑائی میں بابر کی فتح اور ابراہیم لودھی کی شکست۔ مظفر شاہ ثانی والئے گجرات کی وفات، برصغیر میں مغلیہ سلطنت کا قیام۔

۱۵۲۷ء کنواہہ کی لڑائی میں بابر کے ہاتھوں رانا سانگا کی شکست۔

۱۵۲۸ء چندیری کی لڑائی کے دوران مدنی راؤ اور دیگر راجپوتوں کا رسمِ جوہر ادا کرنا اور بابر کی فتح۔ بابر کا دریائے گنگا کو تینتیس ہاتھوں میں تیر کر عبور کرنا۔

۱۵۲۹ء بابر اور والئے بنگال نصرت شاہ کے درمیان دوستانہ تعلقات کا قیام۔ گھاگرا کی لڑائی میں بابر کے ہاتھوں ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی کی شکست۔

۱۵۳۰ء آگرہ میں بابر کی وفات اور ہمایوں کی تخت نشینی۔

امتحانی سوالات

۱۔ بابر کے ابتدائی حالات اور سمرقند و فرغانہ سے اس کے اخراج کی داستان قلمبند کیجئے۔

۲۔ بابر کے کردار اور اہم کارناموں کا جائزہ لیجئے۔

۳۔ پانی پت کی پہلی لڑائی کی وجوہات، واقعات اور اہمیت بیان کیجئے۔

۴۔ کنواہہ کی لڑائی کی وجوہات، واقعات اور نتائج پر روشنی ڈالئے۔

۵۔ تزک بابری کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں اس کی تاریخی اور ادبی حیثیت واضح کیجئے۔ اور ثابت کیجئے کہ اُسے گنجینۂ معلومات یا علوم کیوں کہا جاتا ہے۔

۶۔ بابر کے سپاہیانہ اور عالمانہ کارناموں کا تذکرہ کیجئے۔

۷۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھئے:۔

۱۔ ابراہیم لودھی ۲۔ عالم خاں لودھی ۳۔ دولت خاں لودھی

۴۔ رانا سنگرام سنگھ عرف رانا سانگا۔

Marfat.com

تیسرا باب

نصیر الدین محمد ہمایوں

(۱۵۳۰ء ـــــ ۱۵۵۶ء) بمطابق (۹۳۷ھ ـــــ ۹۶۳ھ)

"اگر کبھی گرنے کا موقعہ پیدا ہوا تو ہمایوں ایسا انسان نہ تھا کہ اسے ہاتھ سے جانے دے۔ وہ زندگی بھر ٹھوکریں کھاتا رہا حتیٰ کہ آخری وقت بھی ٹھوکر کھا کر گرا اور موت کی آغوش میں جا پہنچا۔" [1]

لین پول

"ہمایوں ایک نہایت حوصلہ مند اور دلیر شہزادہ تھا جو محاصرہ اور جنگ ہر دو حالتوں میں خطرات کے مقابل بے دھڑک کود پڑتا تھا لیکن اس کی سہل پسندی، بیجا رحمدلی سیاسی استقامت اور مستقل مزاجی کے فقدان اور علاوہ ازیں فتحیابی کو دوامی بنا سکنے کی عدم صلاحیت نے اس کے کردار کی تمام عمدہ خصوصیات پر پانی پھیر دیا تھا۔" [2]

پروفیسر شیخ عبدالرشید

ابتدائی حالات ۱۵۰۸ء تا ۱۵۳۰ء

نصیر الدین محمد ہمایوں ۶ مارچ ۱۵۰۸ء کو کابل میں پیدا ہوا۔ ہمایوں کی ماں کا نام ماہم سلطانہ تھا۔ کامران، عسکری اور ہندال ہمایوں کے سوتیلے بھائی تھے۔ تیموری روایات کے مطابق ہمایوں کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ ہمایوں نے ترکی، عربی اور فارسی زبانوں میں مہارت پیدا کرنے کے بعد ریاضی، فلسفہ، نجوم اور علم ہیئت کی بھی تعلیم حاصل کی۔ اس نے ہندی زبان میں بھی کافی سوجھ بوجھ پیدا کر لی تھی۔ نیز وہ شعر و شاعری اور ادب میں کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ فنِ سپاہ گری اور فنِ حکمرانی بھی اس نے اپنی ابتدائی تعلیم میں سیکھا۔

ہمایوں چونکہ اوائل عمر سے ہی اپنے باپ بابر کے ساتھ متعدد فوجی مہمات اور انتظامی امور میں شریکِ کار رہا تھا اس لئے خاصا تجربہ کار ہو چکا تھا۔ امورِ سلطنت میں اسی استعداد و مہارت کی بنا پر اسے ۱۵۲۰ء میں ۱۲ سال کی عمر میں بدخشاں کا گورنر مقرر کیا گیا۔ برصغیر پاکستان و ہند کی مہم کے دوران ۱۸ سال کی عمر میں ہمایوں نے ابراہیم لودھی کے جرنیل حمید خاں کو حصار فیروزہ

---

[1] "میڈیول انڈیا انڈر محمڈن رول" صفحہ ۲۳۷ [2] "اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان" صفحہ ۳۵

Marfat.com

کے قریب شکست دے کر اپنی زندگی کی اوّلین فتح حاصل کی۔ پانی پت اور کنواہہ کی جنگوں میں اپنی فوجی مہارت کا مظاہرہ کرنے کے علاوہ ہمایوں نے سنبھل، جونپور اور غازی پور و کالپی کے مقامات پر ایسا فسادیوں کے خلاف مؤثر کارروائی کی۔

۱۵۲۶ء میں سنبھل، فیروزہ اور سنبھل کی جاگیریں ہمایوں کو بخشی گئیں۔ نیز ۱۵۲۸ء میں جنگ کنواہہ کے بعد اسے دوبارہ اپنی ولایت بدخشاں میں بھیجا گیا لیکن وہ دو سال کے بعد واپس آگرہ آگیا۔ اب اسے سنبھل کی جاگیر کے انتظام کے لئے روانہ کیا گیا جہاں سے وہ بیمار ہو کر واپس آگرہ لوٹا۔ اگرچہ ہمایوں کو پہلے ہی ولی عہد نامزد کر دیا گیا تھا مگر بابر نے اپنی بیماری کے دوران اسے امراء کے روبرو اپنا جانشین مقرر کیا۔

تخت نشینی

۳۰ دسمبر ۱۵۳۰ء

بابر نے ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو وفات پائی۔ لیکن ہمایوں ۳۰۔ دسمبر ۱۵۳۰ء کو تخت نشین ہوا۔ بابر کی وفات کے چار دن بعد ہمایوں کی تخت نشینی کا اصل سبب دراصل وزیر اعظم نظام الدین علی محمد خلیفہ کی وہ سازش تھی جو ہمایوں کو تخت و تاج سے محروم کرنے اور بابر کے بہنوئی (خانزادہ بیگم کے شوہر) مہدی خواجہ کو تخت نشین کرنے کے لئے کی جا رہی تھی۔ یہ سازش درحقیقت بابر کی علالت کے دوران ہی شروع ہو چکی تھی لیکن "طبقاتِ اکبری" کے مصنف نظام الدین احمد کے والد محمد مقیم نے نظام الدین علی محمد خلیفہ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ تم جس شخص (مہدی خواجہ) کو تخت نشین کرنے کی کوشش کر رہے ہو وہ خود تمہارے متعلق بھی معاندانہ عزائم رکھتا ہے اور تخت نشین ہونے کے بعد سب سے پہلے تمہیں ہلاک کرنے کا اعلان کر چکا ہے۔ اس پر نظام الدین خلیفہ علی محمد نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اس دوران میں ہمایوں سے یہ سازش مخفی نہ رہ سکی۔ چنانچہ ان چار دنوں میں اس سازشی فتنے کو فرو کرنے میں مصروف رہا۔

"طبقاتِ اکبری" کا مصنف نظام الدین احمد رقمطراز ہے کہ:

"آخر ۹ جمادی الاول ۹۳۷ھ بمطابق ۳۰ دسمبر ۱۵۳۰ء کو امیر نظام الدین خلیفہ کی مدد سے ہمایوں کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی تمام امراء اور شہزادگان نے اس کی وفاداری کا حلف اٹھایا اور تحائف پیش کئے۔ ہمایوں نے فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی سابقہ جاگیریں اور منصب بحال رکھے۔"

اپنے والد بابر کی وصیت کے مطابق ہمایوں نے اپنے بھائیوں سے بھی بہت فیاضانہ سلوک کیا اور ان کو اہم علاقے عطا کر کے سلطنت میں شریکِ کار بنایا اس نے مرزا کامران کو کابل اور قندھار، مرزا عسکری کو سنبھل اور مرزا ہندال کو الور اور میوات کے علاقوں پر مامور کیا۔

Marfat.com

علاوہ ازیں اپنے تمام رشتے داروں کو بھی عنایات خسروانہ سے نوازا۔ سلیمان مرزا کو بدخشاں کی گورنری کے منصب پہ بحال رکھا۔ محمد سلطان مرزا کو قنوج کا علاقہ دیا اور محمد زمان مرزا کو بہار میں جاگیر عطا کرنے کے علاوہ بہار کا گورنر بھی مقرر کیا۔

ہمایوں کی مشکلات

تخت نشین ہوتے ہی ہمایوں کو گوناگوں مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ وراثت میں ملا ہوا آگرہ کا تخت اس کے لئے پھولوں کی سیج کی بجائے کانٹوں کا بستر ثابت ہوا۔ کیونکہ یہ وراثت (سلطنت) جو ابھی نئی تسخیر شدہ تھی، غیر منظم اور غیر مستحکم تھی اس سلطنت کے بارے میں پروفیسر رش بروک ولیمز کی یہ رائے حقیقت پر مبنی ہے کہ "بابر نے اپنے بیٹے (ہمایوں) کو ایسی سلطنت ورثے میں دی تھی جو صرف مسلسل جنگی حالات کے تحت ہی قائم رہ سکتی تھی لیکن جو زمانۂ امن میں کمزور، کھوکھلی اور غیر مستحکم تھی۔"

"Babur bequeathed to his son a monarchy which could be held together only by the continuance of war conditions; which in time of peace was weak, structureless and invertebrate."

(Rushbrook Williams)

یہی وجہ تھی کہ ابتدا ہی سے ہمایوں کو مشکلات نے گھیر لیا جو مندرجہ ذیل تھیں:-

غیر مستحکم حکومت بابر نے اپنے قلیل عرصے میں ہی بے شمار فتوحات حاصل کر کے مغلیہ سلطنت کو وسعت دی تھی چنانچہ مغلیہ سلطنت کی حدود بلخ بدخشاں سے بنگال اور کوہ ہمالیہ سے چندیری اور گوالیار تک پہنچ گئیں لیکن بابر کو انتظامی اصلاحات نافذ کرنے اور نوزائیدہ سلطنت کے منتظم ڈھانچے کو سنوارنے کے لئے مہلت نہ ملی۔ چونکہ اسے برصغیر میں صرف پانچ سال رہنا نصیب ہوا اور اس قلیل عرصے میں بھی اسے زیادہ تر جنگ و جدل میں مصروف رہنا پڑا، نیز ابھی وہ سرزمین پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کی جڑیں مضبوط نہ کر پایا تھا کہ اسے موت نے آلیا، اسی لئے بابر کی قائم کردہ سلطنت غیر منظم اور غیر مستحکم ہی رہی۔ اگرچہ بابر نے افغانوں اور راجپوتوں کو شکست دے کر ان کی قوت کو کچل کر رکھ دیا تھا لیکن نہ ابھی راجپوت پوری طرح مطیع ہوئے تھے اور نہ ہی افغان ابھی اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو بھولے تھے۔

مالی ابتری پانی پت کی لڑائی کے بعد بابر کے ہاتھ بہت سا خزانہ لگا تھا جسے اس نے

Marfat.com

اپنی غیر دانشمندانہ فیاضی کی وجہ سے ضائع کر دیا۔ بابر کی موت کے وقت شاہی خزانہ کی حالت اچھی نہ تھی نیز فوجی جاگیر دار نئے بادشاہ کی کمزوریوں سے واقف تھے انہوں نے مالیہ اور خراج ادا کرنا بند کر دیا جس سے خزانہ شاہی اور بھی متاثر ہوا۔ اس لئے ہمایوں کو فوج منظم کرنے اور دیگر اخراجات کو پورا کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

بھائی اور رشتہ دار

نیک دل اور فرمانبردار ہمایوں نے اپنے باپ بابر کی وصیت کے بموجب اپنے بھائیوں سے بہتر سلوک کرتے ہوئے انہیں سلطنت کے بہترین حصے عطا کئے۔ کامران کو کابل و قندھار، ہندال کو الور اور عسکری کو سنبھل کا علاقہ دیا مگر اس کے بھائی "حضرت یوسفؑ کے بھائی نکلے"[1] انہوں نے نہ صرف ہمایوں کی مشکلات میں اضافہ کیا بلکہ اسے اقتدار سے محروم کر کے برسر اقتدار آنے کی سازشیں کرتے رہے۔ کامران نے آگے بڑھ کر پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ ہمایوں نے فراخدلی سے کام لیتے ہوئے اسے نہ صرف پنجاب بلکہ حصار فیروزہ کا علاقہ بھی بخش دیا۔ اس فیاضی کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر کی مرکزی قوت کا سرچشمہ اور بازوئے شمشیر زن (پنجاب) کامران کے قبضے میں چلا گیا۔ ہمایوں کی ایک بدقسمتی یہ بھی تھی کہ بھائیوں کے علاوہ اس کے رشتے دار بھی ناقابل اعتماد، بے وفا اور احسان فراموش ثابت ہوئے۔ انہوں نے نازک ایام میں بھی اسے بغاوتوں اور سازشوں سے پریشان کئے رکھا۔ ان رشتے داروں میں سے زمان مرزا ہمایوں کی رضائی بہن معصومہ بیگم کا خاوند جو والئے ہرات سلطان حسین بائقرا کا پوتا تھا اور تیموری شہزادہ محمد سلطان مرزا قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں ہمایوں کے اپنے قریبی رشتہ دار مہدی خواجہ، ہمایوں کی پھوپھی خانزادہ بیگم کے خاوند نے بھی بابر کے وزیر اعظم میر نظام الدین محمد علی خلیفہ کی وساطت سے ہمایوں کی وراثت پر قابض ہونا چاہا لیکن ناکام ہوا۔ مغل جاگیردار اور امرا بھی ہمایوں کے وفادار نہ تھے وہ بھی اپنی سازشوں اور بغاوتوں کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوئے۔

افغانوں کا معاندانہ رویہ

اگرچہ بابر نے پانی پت کی لڑائی ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو گھاگرہ کی لڑائی ۱۵۲۹ء میں ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی کو شکست دے کر افغانوں کے زور کو توڑ دیا تھا لیکن مکمل طور پر ابھی ان کی قوت کا خاتمہ ہوا تھا اور نہ ہی انہوں نے مغلیہ سیادت کو تسلیم کیا تھا۔ بعض کے مختلف حصوں میں افغان امرا کے پاس جاگیریں تھیں جنہیں ابھی تک افغان اقتدار کے بھولا بسرا خواب

---

[1] مولانا محمد حسین آزاد "قصص الہند"

Marfat.com

کھوئی ہوئی عظمت کی بحالی کے لئے بے قرار تھے۔ محمود لودھی کے علاوہ عالم لودھی بھی بمع اپنے بیٹے تاتار خاں کے بہادر شاہ والئے گجرات کے ہاں پناہ گزیں تھا اور آگرہ پر حملے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ بہار میں شیر خاں سوری افغانوں کی قوت کو بڑھانے اور افغان قوم میں جذبۂ قومیت پیدا کر کے اسے متحد کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا تاکہ کھویا ہوا تخت مغلوں سے چھین کر پھر سے افغان اقتدار قائم کر سکے۔

بہادر شاہ والئے گجرات

بہادر شاہ والئے گجرات بھی جو ہمایوں کا رقیب تھا عرصہ تک اس کے لئے بہت بڑی مصیبت اور خطرہ بنا رہا وہ ایک عرصے سے ہمایوں کے خلاف سرگرم عمل تھا اس نے مغلیہ سلطنت کے متعدد دشمنوں اور باغیوں کو پناہ دے رکھی تھی اور انہیں ہمایوں کے خلاف سازشیں کرنے پر اکسا رہا تھا اس نے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کر کے مالوہ پر قبضہ کر لیا تھا اور خاندیش، برار اور احمد نگر پر بھی اپنی بالادستی قائم کر لی تھی اب اس کی پیش قدمی راجستھان اور وسطِ ہند کی جانب تھی تاکہ دہلی اور آگرہ کے تخت کے حصول کے لئے راہ ہموار کر سکے۔

مغلیہ فوج

بابر کی وفات کے وقت مغلیہ فوج مختلف النسل افراد کا مجموعہ تھی اس میں ترک، افغان، منگول، ایرانی اور ہندوستانی سبھی قوموں کے لوگ شامل تھے۔ اس فوج میں یک جہتی، اتحادِ عمل اور اعلیٰ نظم و ضبط کا فقدان تھا۔ یہ فوج بادشاہ کی وفادار کم اور مالِ غنیمت کی خواہشمند زیادہ تھی۔ شیر شاہ سے مقابلہ میں اس فوج نے بالکل حوصلہ ہار دیا تھا۔ مغلیہ فوج میں اتحادِ عمل اور نظم و نسق کا یہ فقدان بھی ہمایوں کے لئے بہت سی مشکلات کا باعث ہوا۔

ہمایوں کی خود ساختہ مشکلات

ایسے مخالف اور نامساعد حالات میں اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ مغل فرمانروا ایک عظیم عسکری دماغ کا مالک اور اعلیٰ درجے کا سیاست دان ہوتا لیکن بابر کا وارث ہمایوں صرف ۲۳ سال کی عمر کا ایک ناتجربہ کار نوجوان تھا جس کی علمی لیاقت بے شک مسلمہ تھی لیکن وہ پرلے درجے کا تساہل پسند، عزم و استقلال سے عاری اور سیاسی بصیرت سے بالکل بے بہرہ تھا اس میں قوتِ فیصلہ کی بھی کمی تھی۔ زندگی کے بعض نازک مراحل پر بھی اس نے بے عملی کا مظاہرہ کیا اور قیمتی وقت کو عیش کوشی میں ضائع کر دیا وہ بے حد فیاض اور رحمدل تھا دشمنوں نے بارہا اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ ہمایوں ایک کام کو شروع کر کے اور اسے ادھورا چھوڑ کر دوسرے کام کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ اس کے کردار کی یہ خامی اس کے مصائب کا ایک اہم سبب ثابت ہوئی۔

Marfat.com

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمایوں دور اندیش نہیں تھا ورنہ شیر خاں اور بہادر شاہ والیٔ گجرات کو طاقت ور بن جانے کی مہلت نہ دیتا اور نہ ہی شہر "دین پناہ" کی تعمیر میں مصروف ہو کر اپنا قیمتی وقت ضائع کرتا۔ جن نامساعد حالات اور مشکلات کی موجودگی میں ہمایوں تخت نشین ہوا تھا وہاں ہمایوں جیسے تجربہ اور تدبر انسان کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ ہمایوں نے اپنے لئے بہت سی مشکلات خود پیدا کی تھیں جن میں سلطنت کی تقسیم، شیر خاں سے صلح، دین پناہ کی تعمیر، بہادر شاہ والیٔ گجرات کا بروقت سدباب نہ کرنا اور بے وفا بھائیوں کو بار بار معاف کر دینا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہمایوں کی فاش غلطیاں

سلطنت کی تقسیم

ہمایوں نے اپنی بادشاہت کے آغاز ہی میں ثابت کر دیا کہ وہ قوت فیصلہ، قوت ارادی اور زیرکی فراست سے یکسر عاری ہے۔ سب سے پہلی فاش غلطی جو اس نے کی وہ اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کے درمیان سلطنت کی تقسیم تھی۔ عقلمندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہمایوں اپنے حاسد بھائیوں کو اپنے کنٹرول میں رکھتا تاکہ وہ نت نئی سازشوں سے اس کے لئے مصائب کا باعث نہ بنتے لیکن ہمایوں نے جذباتیت سے کام لیتے ہوئے اپنے باپ کی وصیت "اپنے بھائیوں سے اچھا سلوک روا رکھنا" پر عمل پیرا ہو کر اپنے بھائیوں کو سلطنت کے اہم حصے عطا کر کے انہیں اقتدار میں شریک کر لیا۔

اس نے بدخشاں کی ولایت پر مرزا سلیمان کو بحال رکھا۔ محمد زمان مرزا اور محمد سلطان مرزا کو بہار اور قنوج کی جاگیریں عطا کیں۔ اپنے بھائی کامران کو کابل و قندھار کی حکومت سے نوازا عسکری کو سنبھل کا علاقہ دیا اور مرزا ہندال کو میوات یعنی گوڑگاؤں، متھرا اور آگرہ کے اطراف پر مشتمل موجودہ الور کی جاگیر بخش کر خوش کرنے کی کوشش کی۔ ہمایوں کے اس نیاضانہ سلوک کی شہہ پا کر مرزا کامران نے زبردستی پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ ہمایوں نے اس کے خلاف کوئی سخت اقدام کرنے کی بجائے ایک فرمان کے ذریعے پنجاب کے علاوہ حصار فیروزہ کا علاقہ بھی اسے بخش دیا۔ اس طرح سے ہمایوں نے نہ صرف اپنے باپ کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے کمزور کر دیا بلکہ قندھار، کابل، پنجاب، حصار فیروزہ کے علاقے کامران کو دے کر ایک سنگین سیاسی غلطی کی۔ کیونکہ یہی علاقے ملک کی فوجی قوت کے سرچشمے اور بازوئے شمشیر زن تھے۔ علاوہ ازیں پنجاب اور حصار فیروزہ پر کامران کا قبضہ تسلیم کر کے ہمایوں نے اپنے آپ کو قندھار،

Marfat.com

کابل پنجاب اور حصار فیروزہ کی درمیانی شاہراہ سے محروم کر کے وسط ایشیا سے اپنے تعلق کو منقطع کر لیا۔ مزید برآں سلطنت کی تقسیم نے امرا اور جاگیرداروں کو خود سر اور ان کے حوصلوں کو بلند کر دیا۔ اس طرح ہمایوں نے سلطنت کو تقسیم کر کے اپنے لئے لامتناہی مصائب پیدا کر لئے۔

کالنجر کی مہم

تخت نشین ہوتے ہی ہمایوں نے راجپوتانہ کی مکمل تسخیر کا عزم کر لیا۔ اور اپنی تخت نشینی کے چھ ماہ بعد اگست ۱۵۳۱ء میں بندھیل کھنڈ کے مشہور قلعہ کالنجر کا محاصرہ کر لیا۔ کیونکہ کالنجر کا ہندو راجہ رانا پرتاپ رودّر افغانوں کا طرفدار اور خیر خواہ تھا۔ نیز کالنجر کی تسخیر سے مغلیہ سلطنت کی جنوبی سرحدیں محفوظ ہو جاتی تھیں۔ یہ محاصرہ چند ماہ جاری رہا۔ ہمایوں نے قلعہ کو فتح کئے بغیر اتحالف قبول کر کے راجہ سے صلح کر لی اور افغانی فتنہ کے سدباب کیلئے تیزی سے مشرق کی جانب بڑھ گیا۔ کالنجر کو سر کئے بغیر راجہ سے صلح کرنا ہمایوں کی ایک فاش غلطی تھی۔ ہمایوں اگر مستقل مزاجی سے کام لیکر محاصرہ کو ذرا طول دیتا تو راجہ مجبور ہو کر نہ صرف ہتھیار ڈال دیتا بلکہ ہمایوں کا حلیف بھی بن جاتا۔

افغانوں کے خلاف مہم اور چنار کا پہلا محاصرہ ۱۵۳۲ء

کالنجر کو فتح کئے بغیر ہمایوں کے محاصرہ اٹھانے اور مشرق کی جانب بڑھ جانے کا اہم سبب محمد لودھی کی سرکردگی میں افغانوں کا مغل صوبہ جونپور پر حملہ تھا۔ افغانوں نے جونپور کے مغل گورنر جنید برلاس (بابر کے وزیر اعظم امیر نظام الدین خلیفہ کے چھوٹے بھائی) کو مار بھگایا تھا۔ ہمایوں نے اگست ۱۵۳۲ء میں دوراہہ کے مقام پر محمود لودھی کو شکست فاش دے کر اور جونپور پر قبضہ کر کے افغان سپاہ کو منتشر کر دیا اور وہ بہار کی جانب بھاگ گئی۔ بعد ازاں ہمایوں نے آگے بڑھ کر چنار کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا جو شیر خاں سوری کے قبضے میں تھا۔ جس نے دوراہہ کی لڑائی میں محمود لودھی کا ساتھ دیا تھا۔ چنار کا محاصرہ چار ماہ تک (ستمبر تا دسمبر ۱۵۳۲ء) جاری رہا۔ ہمایوں نے چنار کو فتح کئے بغیر شیر خاں سوری کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اس سے صلح کر لی۔ شیر خاں نے اپنے بیٹے قطب خاں کی سرکردگی میں پانچ سو افغان سپاہیوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ ہمایوں کی خدمت پر مامور کر کے اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اس طرح اپنے آپ کو مغلوں کا پرانا نمکخوار ظاہر کر کے ہمایوں کو صلح پر راضی کر لیا۔ ہمایوں کے لئے شیر خاں سوری کی طاقت کو کچلنے کا یہ ایک زریں موقعہ تھا لیکن ہمایوں نے بلاوجہ اسے اپنے ہاتھ سے کھو دیا اور شیر خاں کو اپنی قوت کو مزید مستحکم کرنے کا موقعہ دے کر خود آگرہ واپس آگیا۔ یہ ہمایوں کی تیسری فاش غلطی تھی۔

قیمتی وقت اور خزانہ کا ضیاع ۳۴-۱۵۳۳ء

اگرچہ گجرات اور کاٹھیاوار سے جس کا حکمران بہادر شاہ تھا

Marfat.com

جارحانہ اقدامات کی مسلسل خبریں آرہی تھیں مگر ہمایوں نے بہادر شاہ کے روز افزوں جارحانہ رویہ کا سدباب کرنے کی بجائے چنار سے واپس آکر ڈیڑھ سال کا قیمتی عرصہ عیش و نشاط کی محفلوں اور شاہی تفریحات میں ضائع کر دیا۔ شاہی خزانہ خالی تھا لیکن اس کے باوجود اس عرصے کے دوران اس نے اپنے امراء اور سرداروں کو بھاری انعامات، عطیات اور خلعت ہائے فاخرہ سے نوازا۔ علاوہ ازیں اس نے دہلی میں "دین پناہ" کے قلعے کی تعمیر میں بے جا خزانہ صرف کیا۔

بہادر شاہ کے خلاف مہم ۱۵۳۵-۳۶ء

بہادر شاہ والیٔ گجرات کے جارحانہ عزائم اور توسیع پسندی کی پالیسی نے ہمایوں اور اس کے مابین جنگ کو ناگزیر بنا دیا اس جنگ کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں۔

ا۔ ہمایوں نے فیاضانہ سلوک کرتے ہوئے اپنے قریبی رشتہ داروں محمد زمان مرزا اور محمد سلطان مرزا کو بہار اور قنوج کی جاگیریں عطا کیں۔ لیکن ۱۵۳۴ء میں انہوں نے ہمایوں کے خلاف بغاوت کر دی اور شکست کھائی۔ محمد زمان مرزا گرفتار ہوا۔ ہمایوں نے اسے اندھا کر دینے کے احکامات جاری کئے لیکن وہ فرار ہو کر بہادر شاہ والیٔ گجرات کے ہاں پناہ گزیں ہو گیا جہاں محمد سلطان مرزا پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ ہمایوں نے بہادر شاہ سے باغیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن اس نے انہیں واپس کرنے سے انکار کر دیا۔

ب۔ بہادر شاہ نے عالم خاں لودھی اور اس کے بیٹے تاتار خاں کو بھی پناہ دے رکھی تھی۔ نیز وہ ان کی پشت پناہی کرتے ہوئے انہیں مغلیہ علاقے پر حملہ کرنے کی بھی ترغیب دے رہا تھا حتیٰ کہ اس نے عالم خاں کے بیٹے تاتار خاں کو فوجی امداد دے کر مغل علاقہ بیانہ پر حملہ کرنے پر اکسایا۔ ہمایوں نے اس کی سرکوبی کے لئے عسکری اور ہندال کو بھیجا جن کے ہاتھوں وہ شکست کھا کر مارا گیا۔ اور بیانہ کے قلعہ پر مغلوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔

ج۔ بہادر شاہ والیٔ گجرات مہمات کا شوقین اور ایک اولوالعزم بادشاہ تھا وہ دہلی کا تخت حاصل کر کے تمام شمالی ہند کا شہنشاہ بننے کا خواہشمند تھا۔ اس نے ۱۵۳۱ء میں مالوہ اور ۱۵۳۲ء میں رائے سین پر قبضہ کر لیا مزید برآں اس نے اپنی فوج کو جدید فنون حرب اور جنگی ہتھیاروں سے لیس کر کے اور قسطنطنیہ کے مشہور و معروف توپچی رومی خاں کو اپنے توپ خانہ کا افسر اعلیٰ مقرر کر کے اپنی دفاعی حیثیت میں بے حد اضافہ کر لیا ازاں بعد اس نے اپنی سلطنت کی حدود کو وسعت دینے کی غرض سے ریاست میواڑ کے صدر مقام چتوڑ پر حملہ کر دیا۔ ۱۵۳۳ء میں چتوڑ کے رانا کو شکست دے کر اور رانا سے تحفے تحائف لے کر گجرات چلا گیا۔

Marfat.com

بہادر شاہ نے چتوڑ پر دوبارہ حملہ کیا تو رانا بکرماجیت کی والدہ رانی کرناوتی نے ہمایوں کو (ہندو رسم کے مطابق) راکھی بھیج کر اپنا منہ بولا بھائی بنا لیا۔ اور بہادر شاہ کے خلاف امداد کی طالب ہوئی اور اس سے درخواست کی کہ وہ فوراً اپنی بہن کی امداد کو پہنچے۔ ہمایوں نے درخواست کو قبول کرتے ہوئے فوراً لشکر شاہی لے کر چتوڑ کی جانب کوچ کیا۔ اور جنوری ۱۵۳۵ء میں رائے سین کا قلعہ فتح کرتا ہوا سارنگ پور آ پہنچا۔ اس اثنا میں ۸ مارچ ۱۵۳۵ء کو بہادر شاہ نے سخت مقابلہ کے بعد چتوڑ کے قلعہ کو فتح کر لیا۔ ہندو مؤرخین کی رائے ہے :-

"اگرچہ بہادر شاہ ہمایوں کی آمد کی خبر سے بدکا مگر اسے یقین تھا کہ مغل بادشاہ مسلم روایات کے مطابق ایک کافر کے مقابلے میں مسلمان پر حملہ آور نہ ہوگا لہٰذا اس نے محاصرہ کو جاری رکھا اس کا اندازہ ٹھیک نکلا ہمایوں جو سیاسی بصیرت سے عاری اور ضعیف الاعتقاد واقع ہوا تھا اس نے رانا جیسے کافر کے خلاف برسرِ پیکار بہادر شاہ پر حملہ کرنا گناہ تصور کیا اور اس طرح وہ راجپوتوں کی ہمدردی اور اعانت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ جس کی قدر و قیمت کو اس کے بیٹے اکبر نے محسوس کیا۔" [1]

لیکن یہ دلیل غلط اور تعصب پر مبنی ہے دراصل ہمایوں طبعاً تساہل پسند واقع ہوا تھا اس لئے وہ کبھی فوجی کارروائی میں تندہی سے اور بروقت عمل پیرا نہ ہوتا تھا۔ اس اثنا میں ہمایوں چتوڑ سے ۶۰ میل کی مسافت پر واقع قلعہ مندسور پہنچ گیا جہاں اپریل ۱۵۳۵ء میں بہادر شاہ اور مغل فوج کا آمنا سامنا ہوا توپخانہ کے افسر رومی خاں کے مشورے پر بہادر شاہ نے مورچہ بند ہو کر دفاعی جنگ لڑی۔ مگر ہمایوں نے جنگی قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسا طریق جنگ اختیار کیا کہ گجراتی توپیں مغل فوج کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں بلکہ مغلوں نے ایسی ناکہ بندی کی کہ بہادر شاہ کی مورچہ بندی خود اس کی فوج کے لئے قید خانہ بن گئی اور رسد کے ختم ہونے کی وجہ سے اس کی فوج قحط کا شکار ہو گئی۔ اس کے سپاہیوں نے چھپ چھپ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ بالآخر ۲۵ اپریل ۱۵۳۵ء کی رات کو بہادر شاہ نے فرار ہو کر قلعہ مانڈو میں جا پناہ لی۔ اس شاندار فتح سے نہ صرف بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ لگا بلکہ بہادر شاہ مشہور توپچی رومی خاں بھی ہمایوں کی ملازمت میں آ گیا۔

بہادر شاہ کے تعاقب میں ہمایوں مانڈو پہنچا وہ گجرات کی طرف بھاگ گیا۔ ازاں بعد

---

[1] ڈاکٹر اے۔ ایل سری واستوا۔ "دی مغل ایمپائر" صفحہ ۵۱

Marfat.com

چمپانیر اور کھمبایت سے ہوتا ہوا جزیرہ دیو میں جا پناہ گزیں ہوا۔ ہمایوں نے مانڈو پر تسلط جمانے کے علاوہ تمام گجرات اور مالوہ پر قبضہ کر لیا۔ ہمایوں کھمبایت تک بہادر شاہ کے تعاقب میں آیا بعد ازاں اس نے واپس چمپانیر آکر اس کا محاصرہ کر لیا۔ چمپانیر منوہر اختیار خاں نامی ایک گجراتی امیر کے قبضے میں تھا۔ یہ محاصرہ تقریباً چار ماہ تک جاری رہا۔ بالآخر ہمایوں نے قلعہ سر کرنے کے لئے خاص حکمت عملی سے کام لیا اور ایک رات اپنی فوج کو قلعہ کی ایک طرف حملہ کا حکم دیکر خود تین سو جانبازوں کے ساتھ فصیل میں میخیں گاڑھ کر اوپر چڑھ گیا اس کے جانبازوں نے محافظوں کو تہ تیغ کر کے قلعہ کا پھاٹک کھول دیا اس پر ۱۹ اگست ۱۵۳۵ء کو قلعہ دار اختیار خاں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ چمپانیر سے بہت سا خزانہ اور مال غنیمت ہمایوں کے ہاتھ لگا۔

مانڈو اور چمپانیر کی فتح ایک بہت بڑا کارنامہ تھا لیکن ہمایوں نے وہاں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کی بجائے کئی ہفتے نشاط آرائیوں اور جشن فتح منانے میں صرف کر دیئے اس سے نہ صرف چمپانیر سے حاصل کردہ خزانہ ختم ہو گیا بلکہ گجرات کے سیاسی انتشار اور بدنظمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہادر شاہ کے معتمد خاص عماد الملک نے احمد آباد میں مالیہ کی وصولی کے بہانے جمع کر بہت سے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا اور ایک مضبوط فوج قائم کر لی۔ عماد الملک کے اس اقدام سے ہمایوں کی آنکھیں کھول دیں چنانچہ اس نے اپنے بھائی عسکری مرزا کو عماد الملک کی گوشمالی کے لئے بھیجا بعد ازاں بذات خود پہنچ کر اکتوبر ۱۵۳۵ء میں احمد آباد کو فتح کر لیا۔ ہمایوں نے مرزا عسکری کو گجرات کا گورنر اور شہدو بیگ کو اس کا میر منشی مقرر کیا اور خود دیو پر حملہ کرنے کی تیاری میں لگ گیا جہاں بہادر شاہ پناہ گزین تھا لیکن مالوہ میں بدامنی اور انتشار کی اطلاع پا کر جزیرہ دیو پر چڑھائی کے ارادے کو ترک کر دیا اور ۲۲ فروری ۱۵۳۶ء کو مانڈو میں واپس آکر دوبارہ عیش و عشرت کی محفلوں میں مشغول ہو گیا۔ گجرات سے ہمایوں کے نکلتے ہی گجراتیوں نے بہادر شاہ کے حق میں بغاوت کر دی اس پر بہادر شاہ نے پرتگیزوں کی مدد سے گجرات پر حملہ کر کے بہت سے مغل علاقوں پر قبضہ کر لیا اور مرزا عسکری کو وہاں سے مار بھگایا۔ بجائے اس کے کہ مرزا عسکری بہادر شاہ کے خلاف کے لئے ہمایوں سے امداد حاصل کرتا وہ اپنے چند مشیروں کے مشورے پر ۱۲ اپریل ۱۵۳۶ء کو آگرہ روانہ ہو گیا تاکہ ہمایوں کی عدم موجودگی میں آگرہ کے تخت پر قبضہ کر لے چنانچہ ہمایوں کو مئی ۱۵۳۵ء میں مانڈو کو چھوڑ کر تیزی سے آگرہ روانہ ہونا پڑا۔ ادھر اس اثنا میں ہمایوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہادر شاہ نے ۲۲ اپریل ۱۵۳۶ء کو چمپانیر کے قلعہ پر قبضہ کر کے اپنی کھوئی ہوئی گجرات کی سلطنت دوبارہ حاصل کر لی۔ اس طرح ایک سال سے زائد عرصے تک قابض رہنے کے بعد مغلوں کو مرزا عسکری کی نااہلی اور ہمایوں کی بے عملی اور غلط

Marfat.com

کی وجہ سے مالوہ اور گجرات جیسے زرخیز اور وسیع علاقے سے ہاتھ دھونے پڑے۔

ہمایوں اور شیر خاں سوری کا مقابلہ

(اکتوبر ۱۵۳۷ء تا جون ۱۵۴۰ء)

چنار کا دوسرا محاصرہ

اکتوبر ۱۵۳۷ء

۱۵۳۳ء سے ۱۵۳۷ء تک ہمایوں گجرات کی تسخیر میں مشغول رہا جس کی وجہ سے وہ مشرقی علاقوں کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکا اس عرصے میں شیر خاں سوری نے اپنی قوت خطرناک حد تک بڑھالی۔ افغانوں میں قومی جذبہ بیدار کر کے ان کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا۔ چونکہ مغلوں کو ملک سے نکالنے کے لئے کافی وسائل کی ضرورت تھی اس لئے شیر خاں نے بہار و شاہ والئے گجرات سے رابطہ قائم کر کے مالی امداد حاصل کی اور بعد ازاں بنگال پر حملہ آور ہو کر بنگال کے حکمران سلطان محمود ثانی سے بھی ایک بھاری رقم حاصل کی اور جنوبی بہار کے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی پوزیشن کو مستحکم بنا لیا۔

۱۵۳۷ء میں ہمایوں کو شیر خاں سوری کی سرگرمیوں کی اطلاع ملی تو اس نے ہندو بیگ کو جونپور بھیجا تاکہ وہ شیر خاں کے عزائم کا جائزہ لے کر ایک تفصیل روئداد بھیجے۔ چالاک شیر خاں نے ہندو بیگ کو قیمتی تحائف پیش کئے اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ چنانچہ ہندو بیگ کی فراہم کردہ یقین دہانی پر ہمایوں شیر خاں کے خلاف فوجی کارروائی سے باز رہا۔ اس اثنا میں شیر خاں نے بنگال کی فتح کے لئے فوجی کارروائی کی۔ اور بنگال کے دارالخلافہ گور کا محاصرہ کر لیا اس پر ہمایوں نے مشتعل ہو کر افغانوں کے خلاف مؤثر کارروائی کرنے کی ٹھان لی اور آگے بڑھ کر چنار گڑھ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

چنار گڑھ کا قلعہ شیر خاں سوری کے قبضے میں تھا جو اسے چنار گڑھ کے سابق حاکم تاج خاں کی بیوہ لاڈ ملکہ سے شادی کر کے ملا تھا۔ شیر خاں کی عدم موجودگی میں قلعہ کا منتظم اعلیٰ اس کا بیٹا قطب خاں تھا قلعہ چھ ماہ کے محاصرے اور رومی خاں کی کوشش بسیار کے بعد بڑی مشکل سے فتح ہوا بعد ازاں ہمایوں نے رومی خاں کو قلعہ دار مقرر کیا اور خود شیر خاں کے تعاقب میں بنگال کی طرف روانہ ہوا جس نے اس عرصے میں نہ صرف تقریباً تمام بنگال کو زیر نگیں کر لیا تھا بلکہ مشرق کے اہم ترین قلعہ رہتاس پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور بنگال سے حاصل کردہ دولت کو وہاں محفوظ کر لیا تھا۔ چنار گڑھ کی فتح اگرچہ فوجی لحاظ سے ہمایوں کا ایک اہم کارنامہ تھا مگر اس کی تسخیر میں چھ

Marfat.com

ماہ کا قیمتی عرصہ ضائع کرنا اور شیر خاں کو بنگال کی تسخیر اور مالِ غنیمت کو گور سے رہتاس میں منتقل کرنے کا موقعہ دینا درحقیقت ہمایوں کی ایک فاش غلطی تھی۔

بنگال پر قبضہ ۱۵۳۸ء

چنار سے ہمایوں بنارس پہنچا جہاں اس نے شیر خاں سوری سے خط و کتابت کے ذریعے مغلیہ سیادت قبول کرنے کا مطالبہ کیا۔ آخر بہار سے افغان سرداروں کے مکمل اخراج اور دس لاکھ روپیہ سالانہ خراج کے عوض بنگال پر مغلیہ سیادت کے زیر نگیں شیر خاں کے قابض رہنے پر ہمایوں اس سے صلح کرنے پر راضی ہو گیا لیکن بعد ازاں اس نے محمود شاہ دمدمہ بنگال کے کہنے پر بنگال کی تسخیر کو شیر خاں سے صلح پر ترجیح دیتے ہوئے بنگال کی طرف کوچ کیا۔ شیر خاں نے کوئی مزاحمت نہ کی چنانچہ اگست ۱۵۳۸ء میں مغل بادشاہ فاتحانہ گور میں داخل ہو گیا۔ گور کے خوشگوار موسم نے ایک بار پھر ہمایوں کو بے عملی کا مظاہرہ کرنے یعنی عیش پرستی پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ وہ مہ و نگ عیش و نشاط کی محفلوں اور حرم کی لذت کوشیوں میں مصروف رہا ہمایوں نے گور کو جنت آباد کا نام دیا۔ اس عرصے میں شیر خاں نے رہتاس کے ناقابلِ تسخیر قلعہ کو اپنا مرکز بنا کر کڑا، قنوج اور سنبھل پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح اس نے مغل فوج کی رسد کے راستے یعنی آگرہ اور بنگال کی شاہراہ پر پوری طرح سے قبضہ کر کے ہمایوں کی واپسی کے راستے کو مسدود کر دیا۔ ہمایوں کو جب اس خطرناک صورت حال کا علم ہوا تو اس نے ہندال کو فراہمی رسد اور ذرائع آمد و رفت کے تحفظ کے لئے ترہٹ بھیجا لیکن بدطینت بھائی ترہٹ جانے کی بجائے سیدھا آگرہ پہنچا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اس نازک اور خطرناک صورتِ حالات کے پیش نظر ہمایوں نے مارچ ۱۵۳۹ء میں آگرہ واپس لوٹنے کی ٹھانی۔

چوسہ کی لڑائی
۲۶ جون ۱۵۳۹ء

ہمایوں نے جہانگیر قلی بیگ کو پانچ ہزار سپاہ کے ساتھ گور کا حاکم مقرر کیا اور خود آگرہ کی طرف کوچ کیا۔ گور سے ہمایوں مونگیر پہنچا مگر شیر خاں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ ہمایوں نے یہاں سے دریائے گنگا کو عبور کیا اور جرنیلی سڑک کے ذریعے آگرہ کی جانب روانہ ہوا یہ ہمایوں کی غلطی تھی کیونکہ اس تمام راستے پر شیر خاں کا مکمل قبضہ تھا اور وہ راستہ روکے خیمہ زن تھا۔ ہمایوں نے مجبوراً دریا کو واپس عبور کیا اور جب وہ چوسہ پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ شیر خاں بھی نواح میں پہنچ چکا ہے ہمایوں کے امراء نے اسے افغان فوج پر فوراً اور اچانک حملہ آور ہونے کا مشورہ دیا۔ لیکن بیوقوفی سے ہمایوں نے ان کی تجویز کو رد کر دیا اور دریا کو دوبارہ عبور کر کے شیر خاں کے انتظار میں کرم ناسا ندی کے مغربی کنارے پر خیمہ زن ہوا۔ دو تین ماہ تک دونوں فوجیں آمنے سامنے بغیر

Marfat.com

کسی مقابلہ کے پڑی رہیں۔ ہمایوں جنگ کو ٹالنا چاہتا تھا کیونکہ وہ معاملہ کو گفت و شنید سے سلجھانا چاہتا تھا جبکہ شیر خاں سوری جنگ میں کسی فائدے کے پیش نظر قصداً تاخیر سے کام لے رہا تھا تاکہ بارشوں اور طغیانیوں کے باعث تمام راستے مسدود ہو جائیں اس لئے اس نے جان بوجھ کر گفت و شنید کو طول دیا۔

جونہی موسم برسات شروع ہوا تمام راستے مسدود ہو گئے اور مغلیہ فوج ملیریا کے موسمی بخار میں مبتلا ہو گئی۔ اس صورت حال سے مجبور و لاچار ہو کر ہمایوں نے شیر خاں سے مفاہمت کے لئے بنگال، سہسرام اور چنار کے علاقے دینے کی پیش کش کی اور اس کے عوض صرف مغلیہ سیادت قبول کرنے کا مطالبہ کیا۔ شیر خاں نے بظاہر مفاہمت پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے اپنی فوجیں پیچھے ہٹا لیں مگر ۲۶ جون ۱۵۳۹ء کی رات کو ہمایوں کو غافل پا کر تین اطراف سے مغل فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس شبخون پر مغلیہ فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ نتیجتاً مغلوں کو شدید تباہی و شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ آٹھ ہزار کے قریب مغل سپاہی دشمن کے ہاتھوں ہلاک ہوئے یا بھاگتے ہوئے دریائے گنگا میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ ہمایوں نے خود اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ گھوڑے کے ذریعے دریائے گنگا کو عبور کرنا چاہا لیکن گھوڑا نیچے سے نکل گیا۔ ہمایوں ڈوبا ہی چاہتا تھا کہ نظام سقہ نے مشک کے سہارے اسے کنارے پر پہنچایا اور وہ بمشکل تمام جولائی ۱۵۳۹ء میں آگرہ پہنچا۔ بعد میں ہمایوں نے انعام کے طور پر اسے نصف یوم کی بادشاہت عطا کی۔ حرم کی مستورات جو پیچھے رہ گئی تھیں شیر خاں نے انہیں عزت و احترام کے ساتھ آگرہ پہنچا دیا۔

اس فتح نے شیر خاں کے وقار کو بلند کر دیا اور وہ مغلوں کو ہمیشہ کے لئے برصغیر سے نکالنے کے منصوبے سوچنے لگا اس نے بنگال کو دوبارہ فتح کر لیا اور شیر شاہ کا لقب اختیار کر کے گوڑ کے مقام پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ نیز خطبہ اور سکہ میں بھی اپنا نام جاری کر دیا۔

قنوج کی لڑائی
۱۷ مئی ۱۵۴۰ء

آگرہ پہنچ کر ہمایوں نے اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کو آنے والے خطرے کا احساس دلایا اور متحد ہو کر شیر شاہ کا مقابلہ کرنے کی اپیل کی کیونکہ وہ مغلیہ خاندان کے اقتدار کے لئے ایک عظیم خطرہ بن چکا تھا کچھ لوگوں نے آخر دم تک ساتھ دینے اور تعاون کرنے کا وعدہ کیا مگر وقت کی نزاکت کے باوجود کامران اپنی بیس ہزار فوج لے کر لاہور روانہ ہو گیا۔

ہمایوں نے بہرحال چالیس ہزار فوج اکٹھی کی اور شیر شاہ سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے قنوج پہنچا۔ شیر شاہ پہلے ہی دریائے گنگا کے مشرقی کنارے پر اپنی فوج کے ساتھ موجود تھا۔ چنانچہ کم و بیش ایک ماہ تک ہمایوں نے مغربی کنارے پر پڑاؤ ڈالے رکھا اس اثنا میں کئی سردار

Marfat.com

اور جرنیل اس کا ساتھ چھوڑ کر شیر شاہ سے جا ملے۔ چنانچہ ہمایوں نے جنگ چھیڑنے میں ہی مصلحت سمجھی اور دریا کو عبور کر کے مشرقی کنارے پر شیر شاہ کے مقابل ایک نشیبی مقام پر مورچہ بندی کی۔ کئی روز تک اکا دکا جھڑپیں ہوتی رہیں یہاں تک کہ موسم برسات شروع ہو گیا۔ مجبوراً ہمایوں کو اپنا کیمپ بدلنا پڑا کیونکہ نشیبی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس کے کیمپ میں پانی بھر گیا تھا۔ جب مغل فوج کیمپ منتقل کرنے میں مصروف تھی تو شیر شاہ نے مغلیہ فوج پر ہلہ بول دیا۔ قبل اس کے کہ مغلیہ فوج سنبھل کر منظم ہو سکتی، افغانوں نے مغلوں کو میدان سے مار بھگایا۔ تاریخ دشیدی کے مصنف مرزا حیدر کے بیان کے مطابق:

"اس کارزار میں چھتیس ہزار سوار افغان کی جان تک کوئی فرو گزاشت اور دشمن تک زخمی نہیں ہوا تھا کہ توپوں سے گولہ باری کی نوبت آئی اور بیشتر بیکار پڑی رہیں۔"

آخر ۱۷ مئی ۱۵۴۰ء کو ہمایوں سے برصغیر کی سلطنت چھن گئی۔ ایک ہاتھی پر سوار اس نے دریائے گنگا کو عبور کیا اور بمشکل تمام آگرہ پہنچا۔ ہمایوں نے شیر شاہ کے تعاقب کے ڈر سے دہلی سے لاہور کی راہ لی۔ شیر شاہ نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا اور برصغیر پر افغانوں کا اقتدار دوبارہ قائم ہو گیا۔ ہمایوں لاہور سے سندھ چلا گیا اور اس طرح جنگ تقریباً بڑی فیصلہ کن جنگ ثابت ہوئی۔ سلطنت دہلی مغلوں کے ہاتھ سے جاتی رہی اور شمالی برصغیر پر دوبارہ افغان اقتدار قائم ہو گیا۔

ہمایوں کی ناکامی کے اسباب

۱۔ سیاسی بصیرت کا فقدان: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمایوں میں سیاسی بصیرت، حکمتِ عملی اور دیگر چالوں کا فقدان تھا وہ پیش آئندہ واقعات کا قبل از وقت اندازہ لگانے کی صلاحیت سے یکسر عاری تھا جبکہ اس کا مدمقابل شیر خاں سوری ایک بیدار مغز فوجی جرنیل تھا۔ وہ جنگ کا نقشہ شطرنج کی چالوں کی مانند تیار کرتا اور بروقت یہ سرگرم عمل ہوتا تھا علاوہ ازیں شیر خاں سوری ہمایوں کی تمام کمزوریوں سے بخوبی آگاہ تھا اور ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ شیر خاں نے ہمایوں سے ہمیشہ موسم برسات میں جنگ کی اور اسے مات دی اس کے برعکس ہمایوں جنگی قابلیت سے عاری اور تساہل پسند تھا، وقت کی نزاکت کو نہ سمجھتا تھا اور بروقت سرگرم عمل نہ ہوتا تھا۔

Marfat.com

اس لئے اس کے مدِ مقابل اپنی قوت کو دوبارہ بحال کر لیتے تھے۔ ہمایوں ایک اعلیٰ جرنیل نہ تھا صرف بہادری کے جوہر دکھانا جانتا تھا اور شیر شاہ کی قابلیت کے سامنے بے بس تھا مغل مورخین شیر خاں کو دھوکے باز اور جھوٹا گردانتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمایوں سیاسی بصیرت کے فقدان ہی کی وجہ سے شیر خاں کی جنگی چالوں کو نہ سمجھ سکا اور ناکام ہوا۔

۲۔ ہمایوں کی سہل نگاری:

ہمایوں کی ناکامی کی دوسری اہم وجہ اس کی سہل نگاری تھی۔ ہمایوں شراب اور افیون کا رسیا، کتابوں کے مطالعہ کا شوقین اور عیش و عشرت کی محفلوں کا دلدادہ تھا اور ہمیشہ اپنے اسی شوق کی وجہ سے قیمتی وقت کو ضائع کر دینے کا عادی تھا۔ ہمایوں کے کردار کا یہ پہلو اس کی ناکامیوں کا بہت بڑا سبب تھا مشہور مورخ لین پول یوں رقمطراز ہے کہ:

"نوجوان شہزادہ ہمایوں جنگجویانہ اوصاف کا حامل اور بہادری کے جوہر دکھانا تو جانتا تھا لیکن عزم و استقلال سے عاری تھا ہر فتح کے بعد اپنے قیمتی وقت کو عیش و نشاط کی محفلوں یا افیونیوں کی جنت میں ضائع کر دیتا تھا جبکہ اس کے دشمن اس کی سرحدوں پر گرج رہے ہوتے تھے۔"[1]

محمود لودھی کو دورا ہہ کے مقام پر شکست دینے کی خوشی کا جشن منانے اور "دین پناہ" کی تعمیر میں پورا ڈیڑھ سال کا قیمتی وقت ضائع کرنا بے وقوفی تھی۔ جبکہ وہ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھرا ہوا تھا۔ بہادر شاہ والیٔ گجرات نے میواڑ پر حملہ کیا تو رانی درگاوتی نے ہمایوں کو اپنا منہ بولا بھائی کہہ کر امداد کی درخواست کی لیکن ہمایوں نے تساہل پسندی کی وجہ سے چتوڑ کے رانا کی بروقت امداد نہ کر کے راجپوتوں کی دائمی دوستی حاصل کرنے کا سنہری موقعہ ہاتھ سے کھو دیا۔ شیر خاں کے مقابلہ میں بھی ہمایوں نے ہمیشہ سہل نگاری کا مظاہرہ کیا اور شیر خاں کو کچلنے کی بجائے اسے مزید طاقت ور ہونے کا موقع دیا۔ بنگال میں گور کی فتح کے بعد چھ ماہ تک عیش و نشاط کی محفلوں میں مشغول رہنا اور قیمتی وقت ضائع کرنا سراسر بیوقوفی کے مترادف تھا۔

۳۔ بھائیوں اور امراء کی بے وفائی:

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ بھائیوں اور امراء کی بے وفائی کی بدولت نہ صرف ہمایوں کی مشکلات میں اضافہ ہوا بلکہ انہی کی سازشوں کی وجہ سے اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہمایوں نے جس قدر بھائیوں کی بہتری کا خیال کیا اسی قدر انہوں نے نازک مواقع پہ اس کو دھوکا دیا کامران

---

[1] "میڈیول انڈیا انڈر محمڈن رول" صفحہ ۱۹۔۲۱۸

Marfat.com

نے خاص طور پر ہمایوں کے لئے مشکلات پیدا کیں جبکہ عسکری نے بار بار سر کار یا۔ قنوج کی شکست کے بعد کسی بھائی نے بھی اس کی امداد نہ کی بلکہ اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی اسی طرح امرا نے بھی ہمایوں سے بے وفائی کی اور ہمیشہ غلط مشورے دیئے۔ شیر شاہ کی عسکری قوت اور عزائم کے بارے میں ہندو بیگ کی غلط رپورٹ بھی تباہ کن ثابت ہوئی۔

۴۔ افغانوں کا جذبہ قومیت:

پانی پت کی پہلی لڑائی میں ابراہیم لودھی کی شکست اور گنگا گڑھ کی لڑائی میں محمود لودھی کی شکست کے باوجود افغان اپنی عظمتِ رفتہ کو نہ بھولے تھے ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ افغان اقتدار دوبارہ بحال ہو۔ افغانوں میں یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ لودھی حکومت خواہ کتنی ہی بری تھی مگر افغانوں کی اپنی حکومت تھی جس میں انہیں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ اس احساسِ قومیت کے تحت وہ شیر خاں سوری کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ افغانوں کے اس جذبہ قومیت کی وجہ سے بھی ہمایوں کو ہزیمت ہوئی۔

۵۔ شیر خاں کی شخصیت:

ہمایوں کی ناکامی میں شیر خاں کی پُرشکوہ شخصیت کو بھی بہت دخل تھا۔ شیر خاں ایک عظیم قائد اور مدبر ہونے کے ساتھ ساتھ فن سپاہ گری کا استاد اور بلا کا موقع شناس تھا۔ وہ فوراً دشمن کی کمزوریوں کو بھانپ جاتا اور مناسب وقت پر ان سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ ہمایوں کے مقابلے میں اس نے ہر دفعہ نئی جنگی چال سے کام لیا اور ہمیشہ یہی کوشش کی کہ ہمایوں سے موسم برسات میں جنگ چھیڑی جائے۔ کیونکہ موسم برسات میں ہمایوں کی افواج موسمی بخار میں مبتلا ہو جاتی تھیں۔ افغان قوم نے اپنے باہمی اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیا اور شیر خاں کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی۔

۶۔ مغلیہ فوج:

مغلیہ افواج مختلف عناصر پر مشتمل تھیں۔ ان میں ایرانی، ترک، منگول، افغان اور ہندوستانی سبھی قوموں کے لوگ شامل تھے اسی وجہ سے یہ افواج اتحادِ باہمی، یک جہتی اور وحدتِ عمل سے قریب قریب محروم تھیں۔ بابر کی وفات کے بعد یہ فوج کمزور قیادت کی وجہ سے بدنظمی کا شکار ہو گئی۔ نیز وہ موسم برسات میں بالکل ناکارہ ہو کر رہ جاتی تھی۔ مغلیہ سپاہ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر افغانوں نے ہر محاذ پر ہمایوں کو شکست دی۔

۷۔ ہمایوں کا کردار:

ہمایوں کا اپنا کردار بھی اس کی ناکامی کا سبب ہوا۔ ہمایوں سہل انگار تو تھا ہی اس پر ہر کام کو ادھورا چھوڑ دینا بھی اس کی عادت میں شامل ہو چکا تھا۔ افیون اور شراب کی عادت نے اسے اس قدر سست اور کاہل بنا دیا تھا کہ وہ وقت کی نزاکت کو نہ سمجھتا تھا اور اپنے قیمتی وقت کو عیش و نشاط کی محفلوں میں ضائع کر دیتا تھا۔

Marfat.com

عزم و استقلال کا اس کے ہاں فقدان تھا۔ شیر شاہ اور بہادر شاہ والے گجرات کو ابتدا ہی میں کچلنے کی بجائے انہیں اپنی غفلت و لاپروائی سے مزید مضبوط اور طاقتور ہونے کا موقع دے کر ہمایوں نے سخت سیاسی غلطی کی جس کا خمیازہ اسے بعد میں بھگتنا پڑا۔ مزید برآں وہ ایک وقت میں کئی کئی منصوبے سوچنے کا عادی تھا جس کے باعث اس کی توجہ ہمیشہ منتشر رہتی تھی۔ دشمن کی میٹھی میٹھی باتوں پر اعتبار کر لینا اس کا شیوہ بن چکا تھا۔ عزم و استقلال کا فقدان اور ضرورت سے زیادہ سادہ لوحی اس کے کردار کی سب سے بڑی خامی تھی۔

۸۔ مستحکم حکومت کا فقدان:

ہمایوں نے بھی بابر کی طرح کبھی یہ کوشش نہ کی کہ مفتوحہ علاقوں کا اچھی طرح انتظام و انصرام کر کے مستحکم حکومت قائم کی جائے۔ اس کے برعکس اس نے ہمیشہ مفتوحہ علاقوں پر ایسے گورنر متعین کئے جن کی وفاداری مشکوک تھی۔ ہمایوں خود تو عیش و عشرت میں مشغول ہو جاتا اور اس کے مقرر کردہ گورنر اس کی غفلت اور لاپرواہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیتے۔ چنانچہ مالوہ اور گجرات کی فتوحات کے بعد ایسا ہی ہوا۔ علاوہ ازیں ہمایوں نے اپنی سلطنت کو اپنے بھائیوں کے مابین تقسیم کر کے اپنی مرکزی قوت کو کافی حد تک کمزور کر لیا۔ چنانچہ امراء اور جاگیرداروں کی خود مختاری اور بھائیوں کی سازشوں کی وجہ سے ہمایوں مستحکم حکومت قائم نہ کر سکا جس کے باعث اسے شیر خاں سوری کے مقابلے میں پسپائی اور ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔

ہمایوں کی جلاوطنی

قنوج کی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے تعاقب کے ڈر سے آگرہ میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے لاہور کی راہ لی۔ یہاں چاروں بھائی اور دیگر تیموری سردار جمع ہوئے مگر سب بھائیوں اور رفقاء کے مختلف الرائے ہونے کی وجہ سے اتفاق رائے اور اتحاد عمل کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ مرزا حیدر کی تجویز تھی کہ کشمیر کو فتح کر کے اور اسے مرکز بنا کر سلطنت کی بازیابی کے لئے کوشش کی جائے۔ مرزا ہندال کی رائے تھی کہ سندھ جایا جائے تاکہ ادھر سے گجرات کو فتح کر کے آگرہ کی بازیابی کے لئے پیش قدمی کی جائے۔ ہمایوں مرزا حیدر کی تجویز پر عمل پیرا ہونا چاہتا تھا بدیں وجہ اس نے مرزا حیدر کی سرکردگی میں کشمیر کی تسخیر کے لئے ایک ہزار دستہ بھی روانہ کیا لیکن بے وفا بھائی کامران نے مدد کی بجائے اس کی راہ روکنے کی تیاری کر لی۔ مجبوراً ہمایوں کو سندھ کا رخ کرنا پڑا۔ ہمایوں نے سندھ کے اہم قلعہ بھکر کو فتح کرنا چاہا مگر سندھ کے حاکم شاہ بیگ ارغون نے اس کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ ازاں بعد ہمایوں نے مرزا ہندال اور یادگار مرزا کی رفاقت سے سہوان کا محاصرہ کر لیا اسی محاصرہ کے دوران ۱۵۴۱ء میں ہمایوں کو ہندال کے کیمپ میں مرزا ہندال کے مرشد ایک شیعہ پیشوا

Marfat.com

میر بابا دوست عرف میر علی اکبر جامی کی لڑکی حمیدہ بانو کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہمایوں نے اس سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی جس کی ہندال نے شدید مخالفت کی کیونکہ وہ حمیدہ بانو کو اپنی بہن تصور کرتا تھا۔ خود حمیدہ بانو بھی اس رشتہ کے خلاف تھی لیکن حرم کی عورتوں کی کوشش سے ۲۹ اگست ۱۵۴۱ء کو ان کی شادی ہو گئی۔ مہوان کا محاصرہ بھی ناکام رہا۔ ازاں بعد ہمایوں نے بھکر میں دوبارہ قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ لیکن شاہ حسین بیگ ارغون والئے سندھ کی ڈپلومیسی اور بادگار ناصر مرزا (جسے شاہ حسین بیگ ارغون نے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا تھا) کی غداری کی وجہ سے ہمایوں کو یہ ارادہ بھی ترک کرنا پڑا۔

انہی ایام میں ہمایوں کو مارواڑ کے راجہ مالدیو نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیابی کے لئے امداد کا وعدہ کیا مگر رانا کی بدعہدی کی وجہ سے ہمایوں کو مارواڑ کے دارالسلطنت جودھپور کے قریب سے واپس لوٹنا پڑا۔ بالآخر وہ ۲۲ اگست ۱۵۴۲ء کو رانا ورصل والئے عمرکوٹ کے ہاں پناہ گزیں ہوا جس کی مہیا کردہ فوجی امداد سے اکتوبر ۱۵۴۲ء میں ہمایوں سندھ کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا لیکن ابھی عمرکوٹ سے ۱۵ میل کی مسافت پر تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ اس کے ہاں حمیدہ بانو بیگم مریم مکانی کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ ہمایوں نے اپنے لڑکے کا نام جلال الدین محمد اکبر رکھا۔

اسی اثنا میں شاہ بیگ ارغون نے ہمایوں کو پیشکش کی کہ اگر وہ قندھار جانا چاہے تو اسے سندھ سے گذرنے کی اجازت ہو گی علاوہ ازیں اسے قندھار تک رسد اور حمل و نقل کی سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی چنانچہ ہمایوں قندھار کی طرف روانہ ہو گیا۔ کابل اور قندھار کامران کے قبضے میں تھے۔ عسکری، کامران کی طرف سے قندھار کا گورنر تھا۔ اسے جب ہمایوں کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے بلوچی سرداروں کو لکھا کہ ہمایوں کو گرفتار کر لیا جائے اس پر ہمایوں اپنے چند جاں نثاروں سمیت تیزی سے ایران کی سرحد میں داخل ہو گیا البتہ اس کا کمسن بیٹا اکبر مستونگ کے مقام پر پیچھے رہ گیا جسے بعد ازاں عسکری کی بیوی سلطانہ بیگم نے پالا۔

ہمایوں ایران میں

ہمایوں نے ایران کی سرحد پار کی تو ایران کے بادشاہ شاہ طہماسپ کی ہدایت پر بیگلربیگی صوبہ سیستان کے گورنر نے ہمایوں کا خیر مقدم کیا۔ بعد میں شاہ طہماسپ سے اس کی ملاقات ہوئی جس نے ہمایوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ ہمایوں وہاں تقریباً دو سال تک شاہی مہمان کی حیثیت سے مقیم رہا۔ آخر شاہ طہماسپ نے ۱۵۴۵ء میں ہمایوں کو چودہ ہزار ایرانی فوج دینے کا وعدہ کیا لیکن ساتھ ہی دو شرائط پیش کیں اول یہ کہ ہمایوں شیعہ مذہب اختیار کرے اور اپنے مفتوحہ علاقوں میں شیعہ مذہب کی اشاعت کی اجازت

Marfat.com

دے۔ دوئم یہ کہ اپنے بھائی عسکری سے قندھار فتح کر کے ایرانی حکومت کے حوالے کرے ہمایوں نے تبدیلیٔ مذہب کی شرط کو تسلیم نہ کیا۔ البتہ حضرت علیؑ کی شان اقدس میں ایک رباعی لکھی جو اس کے دل میں حضرت علیؑ سے محبت کی غمازی کرتی تھی۔ ہمایوں نے مشہد مقدس کی زیارت بھی کی۔ اس پر شاہ ایران کے بھائی اور اس کی بہن نے ہمایوں کو فوجی امداد دینے کی سفارش کی چنانچہ صرف شرط تبدیلیٔ مذہب کے تحت اسے فوجی امداد مل گئی۔ اور ایران میں قیام کے دوران ہمایوں نے فنِ مصوری کے ماہر استاد میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد کو اس بات پر راضی کر لیا کہ سلطنت کی بازیابی کے بعد وہ اس کے دربار سے منسلک ہو جائیں گے۔ ایرانی فوج کی مدد سے ہمایوں نے ستمبر ۱۵۴۵ء میں قندھار کو فتح کر لیا۔ ہمایوں نے وعدہ کے مطابق قندھار مملکت ایران کے حوالے کر دیا۔ مگر جب قندھار سے حاصل کردہ مال غنیمت کی تقسیم اور کابل و غزنی کی تسخیر کے لئے فوجی امداد پر ہمایوں اور ایرانی سپہ سالار کے درمیان اختلاف رونما ہوا تو ہمایوں نے قندھار پر اپنا تسلط جما لیا اور ایرانیوں کی تسلی و تشفی کے لئے بیرم خاں کو قندھار کا گورنر مقرر کیا۔

فتح کابل

قندھار پر تسلط قائم کرنے کے بعد ہمایوں نے نومبر ۱۵۴۵ء میں کامران کو شکست دے کر کابل پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۵۴۶ء میں ہمایوں نے سلیمان مرزا کی گوشمالی کے لئے فوجی کارروائی کی جس نے بدخشاں میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اس اثنا میں کامران نے دوبارہ کابل پر قبضہ کر لیا لیکن ہمایوں نے بدخشاں سے واپس آ کر اپریل ۱۵۴۷ء میں دوبارہ کابل پر قبضہ کر لیا اور فراخدلی سے کام لیتے ہوئے کامران کو ایک بار پھر معاف کر دیا۔

۱۵۴۸ء میں جب ہمایوں بلخ کے حصول کی ناکام مہم پر گیا ہوا تھا کامران نے کابل پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر شکست کھائی اور برصغیر پاک و ہند کی طرف بھاگ گیا لیکن پنجاب میں سلطان احمد گکھڑ نے اسے گرفتار کر کے ہمایوں کے پاس کابل بھجوا دیا۔ ہمایوں نے جو پیشتر ازیں دو مرتبہ جرم بغاوت کو معاف کر چکا تھا امراء کے مشورے پر اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروا کر اندھا کر دیا اور عسکری کے ہمراہ حج کے لئے مکہ بھجوا دیا۔ جہاں اس نے ۵۔ اکتوبر ۱۵۵۷ء میں وفات پائی۔ مرزا ہندال پہلے ہی ایک شبخون کے دوران ہلاک ہو چکا تھا۔

تختِ دہلی کی بازیابی

۱۵۴۵ء میں شیر شاہ سوری نے وفات پائی اس کا جانشین اسلام شاہ سوری نہایت ہی ہوشمند اور زیرک حکمران تھا جس کی وجہ سے ہمایوں کو برصغیر پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہو سکی چنانچہ اس نے کابل کی حکومت پر ہی قناعت کرنے میں مصلحت سمجھی لیکن جب اسلام شاہ سوری کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں عادل شاہ، ابراہیم سوری اور سکندر خاں سوری کے درمیان حصولِ

Marfat.com

اقتدار کے لئے خانہ جنگی کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور ملک میں چاروں طرف انتشار پھیل گیا۔ ان حالات میں ہمایوں نے ۲۵ دسمبر ۱۵۵۴ء کو پشاور پر قبضہ کر لیا ہمایوں دریائے سندھ کو عبور کر رہا تھا کہ قندھار سے اس کا وفادار جرنیل بیرم خاں بھی اپنی افواج کے ساتھ اس سے آملا۔

ہمایوں براستہ پارہالا سیدھا کلانور ضلع گورداسپور (مشرقی پنجاب) پہنچا۔ یہاں ہمایوں نے اپنی افواج کو تین ڈویژنوں میں تقسیم کیا ایک ڈویژن کو شہاب الدین خاں کی زیر کمان لاہور کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ دوسرے ڈویژن کو بیرم خاں کی قیادت میں ہریانہ پر قبضہ کے لئے روانہ کیا جس پر تنبیب خاں نامی ایک افغان حکمران تھا۔ لاہور پر بغیر مقابلہ کئے قبضہ کر لیا گیا۔ چند روز بعد ۲۴۔ فروری ۱۵۵۵ء کو ہمایوں لاہور پہنچا جس نے لاہور شہر اور نواحی اضلاع کے انتظام و انصرام کا مناسب بندوبست کیا۔

اس اثنا میں بیرم خاں ہریانہ اور جالندھر پر قبضہ کرنے کے بعد لدھیانہ سے ۱۹ میل مشرق میں دریائے ستلج کے کنارے پر واقع ماچھیواڑہ کی طرف بڑھا۔ ۱۵ مئی ۱۵۵۵ء کو ماچھیواڑہ کے مقام پر تنبیب خاں، تاتار خاں اور چند دیگر مقتدر افغان امیروں کی سرکردگی میں افغان افواج کو شکستِ فاش دے کر سرہند پر قبضہ کر لیا۔ ماچھیواڑہ کی فتح سے تمام پنجاب پر مغلوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ سرہند کے مقام پر ہی ہمایوں بھی بیرم خاں سے آملا۔

سرہند پر مغلوں کے قبضہ سے سلطنت دہلی کا حکمران سکندر خاں سوری بھڑک اٹھا اور مغلوں کو پنجاب سے نکالنے کے لئے ۸۰ ہزار فوج کے ساتھ ۲۷ اپریل ۱۵۵۵ء کو دہلی سے روانہ ہوا۔ بالآخر ۲۲ جون ۱۵۵۵ء کو سکندر خاں سوری اور مغل فوج کے درمیان سرہند کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں سکندر خاں سوری کو شکست فاش ہوئی اور وہ بھاگ کر شمال مغربی پنجاب کے پہاڑی قلعہ مان کوٹ میں جا پہنچا۔ ہمایوں نے آگے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کر لیا اور ۲۳ جولائی ۱۵۵۵ء کو پندرہ سال کے بعد دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اگرچہ ہمایوں نے سکندر خاں سوری کے تعاقب میں سرہند کے مقام سے ہی ایک مہم روانہ کی مگر بعد ازاں اس نے شہزادہ اکبر کو اس کے اتالیق بیرم خاں کی زیر نگرانی پنجاب کا گورنر مقرر کر کے سکندر خاں سوری کی سرکوبی پر مامور کیا۔ آگرہ اور اس کے نواحی اضلاع پر قبضہ کرنے کے بھی انتظامات کئے گئے۔ اس طرح چند ماہ کے عرصہ کے اندر ہمایوں نے ان تمام علاقہ جات پر قبضہ کر لیا جو ۱۵ سال قبل اس کے زیر نگیں تھے۔

ہمایوں کی وفات
۲۷ جنوری ۱۵۵۶ء

دہلی کا تخت ہمایوں نے پندرہ سال کے طویل وقفے کے بعد حاصل کیا تھا لیکن اپنی اس عظیم فتح و کامرانی کے بعد وہ زیادہ عرصہ تک بادشاہت کے منصب و نشاط سے بہرہ یاب نہ ہو سکا اور تخت نشینی

Marfat.com

کے صرف چند ماہ بعد ۲۷ جنوری ۱۵۵۶ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گیا ۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء کی شام کو جبکہ وہ اپنے محل شیر منڈل میں واقع کتب خانہ کی بالائی منزل سے نیچے اتر رہا تھا مغرب کی اذان کی آواز سن کر احتراماً زینہ پر ہی بیٹھ گیا بعد میں جب اترنے لگا تو اس کا پاؤں پھسل گیا جس کے باعث وہ لڑھکتا ہوا سر کے بل نیچے آ رہا۔ آخر تین دن کی بیہوشی کے بعد ۲۷ جنوری ۱۵۵۶ء کو وفات پا گیا۔ بقول شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد اس کی تاریخ وفات یہ ہوئی "ہمایوں بادشاہ از بام افتاد" (۹۶۳ھ) مشہور مؤرخ لین پول نے ہمایوں کی ساری زندگی اور موت کے واقعہ کو چند الفاظ میں بیان کر کے کوزہ میں دریا بند کرنے کی کوشش کی ہے وہ رقمطراز ہے:

"اگر کبھی گرنے کا موقعہ پیدا ہوا تو ہمایوں ایسا انسان نہ تھا کہ اسے ہاتھ سے جانے دے۔ وہ زندگی بھر ٹھوکریں کھاتا رہا اور ٹھوکر کھا کر ہی موت کی آغوش میں جا پہنچا۔" [1]

"He tumbled through life and tumbled out of it."

(Lane Poole)

ہمایوں کا کردار

ہمایوں بحیثیت انسان

مؤرخین کی متفقہ رائے ہے کہ ہمایوں بحیثیت انسان ایک نیک سیرت، نرم دل، سادہ لوح اور سلجھا ہوا انسان تھا وہ بدلہ سنجی، ملنساری، خوش خلقی اور فیاضی طبع میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ باپ بھائی، بیٹے اور دوست کی حیثیت سے اس کا کردار برصغیر کے مسلم سلاطین کی تاریخ میں منفرد اور بے مثال تھا۔ اگرچہ اسے اپنی فیاضانہ سرشت اور نرم دلی کے باعث زندگی میں حوادث و مشکلات سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی اس روش کو کبھی تبدیل نہ کیا چنانچہ ایک نیک دل اور سعادتمند بیٹے کی حیثیت سے اس نے اپنے باپ کی وصیت کا احترام کرتے ہوئے اپنے بھائیوں کے ساتھ زندگی بھر مشفقانہ اور فیاضانہ سلوک کیا اور انہیں سلطنت کے بہترین حصے عطا کئے۔

بھائیوں کے علاوہ دیگر مخالفین اور رشتے داروں کے معاملے میں بھی ہمایوں نے ہمیشہ

---

[1] "میڈیول انڈیا انڈر محمڈن رول" صفحہ ۲۳۷

Marfat.com

دریا دلی کا مظاہرہ کیا لیکن انہوں نے ہمایوں کو بغاوتوں اور سازشوں سے ہمیشہ پریشان کئے رکھا۔ فتح کابل کے بعد جب کامران گرفتار کیا گیا اور مشیروں نے اس کے قتل کا مشورہ دیا تو ہمایوں نے انہیں جواب دیا کہ "میرا دماغ تمہارے مشورے کو مانتا ہے لیکن میرا دل اسے ماننے کو تیار نہیں"۔ ہمایوں جنگی اور بہادری کی عملاً جبلتوں میں کسی سے کم نہ تھا لیکن عیش و عشرت کا دلدادہ اور شراب و افیون کا رسیا تھا۔ منشیات کے استعمال نے اس کی دماغی اور جسمانی قوت کو اس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ وہ بہت زیادہ تساہل پسند اور عزم و استقلال سے عاری ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کبھی حالات کے مطابق کبھی سرگرم عمل نہیں ہوتا تھا۔ اور بیک وقت متعدد منصوبے سوچنے کا عادی تھا چونکہ اس میں قوت فیصلہ کا فقدان تھا اس لئے قیمتی وقت کو عیش کوشیوں میں ضائع کر دیتا تھا۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی بجائے وہ بالعموم جذبات کی رو میں بہہ جاتا تھا۔

ہمایوں کا مذہب

ہمایوں بھی بابر کی طرح راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھا۔ مذہبی فرائض کی ادائیگی کا بڑا پابند تھا صوفیا کرام کا بہت زیادہ معتقد تھا اور مذہب کے معاملے میں قطعی متعصب نہ تھا امورِ سلطنت میں ہمیشہ مذہبی رواداری کا قائل تھا۔ احکام شریعت اور امورِ مذہبی سے والہانہ عقیدت و وابستگی رکھتا تھا اور ان سے کبھی غافل نہ رہتا تھا چنانچہ وہ اکثر اوقات باوضو رہتا اور بے وضو ہونے کی صورت میں کبھی خداوند تعالیٰ کا نام زبان پر نہ لاتا تھا۔

بطورِ صاحبِ علم و فضل

ہمایوں ثقافت اور علم پروری میں بلند مقام کا حامل تھا اور علمی مشاغل کا دلدادہ تھا۔ اسے عربی، فارسی، ترکی اور ہندی چاروں زبانوں پر عبور حاصل تھا کتابوں سے اسے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ اس کی لائبریری میں نادر و نایاب کتابیں موجود رہتی تھیں۔ میدان جنگ میں کتابوں کا ذخیرہ اس کے ساتھ جاتا تھا تین تین روز لائبریری میں پڑا کتابوں کے مطالعہ میں مصروف رہتا تھا اہل علم کا بڑا قدردان تھا اور اکابران کی صحبت و مجالست سے فیض یاب ہوتا تھا اسے علم ہیئت اور ریاضی میں بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ ہمایوں کو فن تعمیر اور مصوری سے بڑا لگاؤ تھا۔ دہلی میں جمنا کے کنارے اس نے "دین پناہ" نامی شہر آباد کیا۔ علاوہ ازیں اس نے خوبصورت باغات اور محلات تعمیر کروائے۔ فن مصوری اور خوشنویسی سے بھی گہری وابستگی رکھتا تھا۔ ایران سے واپسی پر وہ مقتدر اہلِ علم و فن کی ایک جماعت اپنے ساتھ لایا تھا ان میں میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد جیسے دو عظیم المرتبت مصور بھی شامل تھے، جنہوں نے برصغیر میں ایرانی فن مصوری و نقاشی کی داغ بیل ڈالی۔

ہمایوں بطورِ جرنیل

تن آسان اور عیش کوش ہونے کے باوجود ہمایوں بہادری میں یکتا اور ایک ثابت قدم سپاہی تھا۔ خطرات سے وہ کبھی خائف نہ ہوتا

Marfat.com

تھا۔ لیکن عسکری تنظیم اور جنگی مصلحتوں سے عاری تھا اسے وقت کی نزاکت کا کبھی احساس نہ ہوتا تھا جنگی چالوں کے سمجھنے سے قاصر تھا اور اپنے حریفوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے کبھی بروقت مستعد نہیں ہوتا تھا بحیثیت جرنیل وہ اپنے باپ بابر کے مدبرانہ عسکری اوصاف سے بالکل عاری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیر شاہ کے مقابلہ میں اسے ہزیمت اٹھانی پڑی۔

ہمایوں بطور بادشاہ

باوجودیکہ ہمایوں کی سیرت اعلےٰ اوصاف سے مزین تھی لیکن وہ ناکام حکمران ثابت ہوا اور اپنے آپ کو ایک بیدار مغز اور منتظم حکمران ثابت نہ کر سکا اس نے برصغیر میں بابر کی موت کے پورے دس برس بعد تک حکومت کی لیکن اس عرصے میں وہ صرف فوجی مہمات میں ہی مصروف رہا اور عوام کی حالت سدھارنے کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ اور نہ ہی انتظامی اصلاحات نافذ کر سکا۔ برصغیر کے حالات اس بات کے مقتضی تھے کہ بادشاہ وقت آہنی قوت اور غیر متزلزل قوت ارادی کا حامل ہوتا تھا لیکن اس کے برعکس ہمایوں عیش پسندی، آرام اور سہل انگاری کا دلدادہ تھا اپنی انہی عادات کے باعث وہ اپنے کسی بھی منصوبے کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔

ہمایوں سیاسی بصیرت سے بھی عاری تھا کیونکہ اس نے اپنی سلطنت کو اپنے بھائیوں کے مابین تقسیم کر کے اپنی مرکزی حیثیت کو کمزور کر لیا۔ وہ وقت کی قدر نہ کرتا تھا اور ہر فتح کے بعد عیش و مسرت کے ہنگاموں میں اپنا بہت سا قیمتی وقت گذار دیتا تھا۔ اس کے دشمن اس کے دروازے پر دستک دے رہے ہوتے جبکہ وہ مطالعہ کتب اور عیش کوشی میں مصروف ہوتا علاوہ ازیں اس کے کردار میں بھی ایک بڑی خامی تھی کہ وہ پرلے درجے کا فیاض تھا وہ اپنے امراء اور سپاہیوں کو بڑے بڑے انعامات دینے کا دلدادہ تھا جس سے وہ ہمیشہ مالی ابتری کا شکار رہتا تھا اور اسی کی وجہ سے اس کی بہت سی سکیمیں بھی ادھوری رہ جاتی تھیں۔

اہم تاریخیں

۱۵۳۱ء لودھی سردار بہادر شاہ والئے گجرات کی پناہ میں چلے گئے۔ ہمایوں کا محاصرہ کالنجر، دمن اور منگلور پر پرتگیزوں کا قبضہ۔

۱۵۳۲ء چنار اور رہتاس پر شیر خاں سوری کا قبضہ، چنار پر ہمایوں کا محاصرہ، پرتگیزوں کا بمبئی اور تھانہ کے علاقوں سے خراج وصول کرنا اور بسین کو تاخت و تاراج کرنا۔

Marfat.com

۱۵۳۳ء بنگال کے حکمران نصرت شاہ اور اس کے بیٹے فیروز شاہ کا قتل، غیاث الدین محمود شاہ کا بنگال پر غاصبانہ قبضہ، چتوڑ پر بہادر شاہ والئے گجرات کا حملہ، دہلی میں دریائے جمنا کے کنارے "دین پناہ" کی تعمیر۔

۱۵۳۴ء محمد زمان مرزا کا بہادر شاہ والئے گجرات کے ہاں پناہ گزین ہونا اور دیو کے مقام پر پرتگیزوں کا قلعہ تعمیر کرنا۔

۱۵۳۵ء ہمایوں کا بہادر شاہ والئے گجرات کو شکست دینا اور مانڈو اور چمپانیر پر قبضہ۔

۱۵۳۶ء بہادر شاہ والئے گجرات کا ڈیو بنا، ہمایوں کا چتوڑ کو فتح کرنا۔

۱۵۳۸ء بابا گورونانک کی وفات۔ بنگال پر ہمایوں کا قبضہ۔

۱۵۳۹ء جنگِ چوسہ میں شیر خاں کے ہاتھوں ہمایوں کی شکست۔ شیر خاں سوری کا اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا۔ برصغیر میں کہ سیکنڈ سوسائٹی کا قیام۔

۱۵۴۰ء شیر شاہ سوری کے ہاتھوں قنوج کے مقام پر ہمایوں کی فیصلہ کن شکست۔ دہلی اور آگرہ پر شیر شاہ سوری کا قبضہ اور افغان حکومت کی بحالی۔ تاریخ رشیدی کے مصنف مرزا حیدر کے ہاتھوں کشمیر کی تسخیر اور ہمایوں کی جلاوطنی۔

۱۵۴۱ء اگست ہمایوں اور حمیدہ بانو بیگم کی شادی امرکوٹ کے مقام پر

۱۵۴۲ء اکتوبر اکبر اعظم کی پیدائش اور ہمایوں کا ایران جانا۔

۱۵۴۵ء مئی شیر شاہ سوری کی وفات۔ ہمایوں کا قندھار اور کابل کو فتح کرنا۔

۱۵۵۱ء ابوالفضل کی پیدائش۔ مرزا ہندال کی وفات۔ مرزا ہندال کی بیٹی سے اکبر کی نسبت۔

۱۵۵۲ء سکھ گورو انگد کی وفات اور گورو امرداس کی تخت نشینی۔

۱۵۵۳ء ہمایوں کا اپنے بھائی مرزا کامران کو بینائی سے محروم کر کے مکہ روانہ کرنا۔

۱۵۵۴ء عادل شاہ سوری کی تخت نشینی، کشمیر میں خوفناک زلزلہ۔

۱۵۵۵ء ماچھیواڑہ کے مقام پر بیرم خاں کے ہاتھوں افغانوں کی شکست۔ سرہند کے مقام پر ہمایوں کے ہاتھوں سکندر سوری کی شکست۔ مالوہ میں باز بہادر کی خود مختاری۔ برصغیر میں ہمایوں کی سرکردگی میں مغلیہ سلطنت کی دوبارہ بحالی۔

۱۵۵۶ء ہمایوں کی وفات۔ پانی پت کی دوسری لڑائی میں اکبر کے ہاتھوں ہیمو بقال کی شکست اور موت، کلانور ضلع گورداسپور کے مقام پر اکبر کی تخت نشینی۔

Marfat.com

امتحانی سوالات

۱۔ تخت نشینی کے بعد ہمایوں کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

۲۔ ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے مابین کشمکش کا احوال لکھئے اور ہمایوں کی ناکامی کے اسباب مختصر طور پر بیان کیجئے۔

۳۔ ہمایوں کو کن کن غلطیوں کی بنا پر برصغیر پاک و ہند سے جلاوطن ہونا پڑا۔

یا

آپ کو اس رائے سے کس حد تک اتفاق ہے کہ ہمایوں سے زندگی بھر فاش غلطیاں سرزد ہوئیں۔

۴۔ ہمایوں کے کردار کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالئے اور اس کی ناکامی کی وجوہات بیان کیجئے۔

۵۔ "ہمایوں کا کردار اس کا بدترین دشمن تھا" وضاحت کیجئے

یا

"اگر کبھی گرنے کا موقعہ پیدا ہوا تو ہمایوں ایسا انسان نہ تھا کہ اُسے ہاتھ سے جانے دے۔ وہ زندگی بھر ٹھوکریں کھاتا رہا اور ٹھوکر کھا کر ہی موت کی آغوش میں جا پہنچا۔"
لین پول کے اس مقولہ کی روشنی میں ہمایوں کی سیاسی غلطیوں اور کردار پر بحث کیجئے۔

Marfat.com

چوتھا باب

شیر شاہ سوری

"افسوس کہ اقتدار اس وقت میرے ہاتھ میں آیا جب میری زندگی کا سورج ڈھل رہا تھا۔" (شیر شاہ)

"شیر شاہ سوری تاریخ کی ان نامور اور شہرۂ آفاق شخصیتوں میں سے ہے جنہوں نے خاک سے ابھر کر عظمتوں کا بلند مقام حاصل کیا اور اپنی اولوالعزمی، خداداد لیاقت اور اعلیٰ فہم و فراست سے کام لے کر نمایاں کامیابی حاصل کی۔"[1] (ڈاکٹر تریپاٹھی)

شیر شاہ سوری ایک نہایت موقعہ شناس، دور اندیش، معاملہ فہم اور گہری ذہانت کا مالک تھا۔ وہ علاؤالدین خلجی، بابر، نپولین بوناپارٹ کی طرح خداداد فوجی قابلیت کا مالک اور ایک بیدار مغز اور موقعہ شناس جرنیل تھا اور جنگ جیتنے کے لئے ہر حربہ جائز خیال کرتا تھا۔ اس نے افغانوں میں جذبۂ قومیت پیدا کر کے ان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ نتیجتاً ایک کینہ پرور قوم باہمی اختلافات کو نظر انداز کر کے اور متحد ہو کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور اس کا یہی اقدام افغان اقتدار کے احیاء کا باعث بنا۔ شیر شاہ سوری ایک معمولی جاگیردار کا بیٹا تھا لیکن اپنی خداداد قابلیت عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کی بدولت اس نے حیرت انگیز ترقی کی اور مغل بادشاہ ہمایوں کو برصغیر پاک و ہند سے نکال کر افغان سلطنت کی بنیاد رکھی۔

ڈاکٹر تریپاٹھی رقمطراز ہے کہ "شیر شاہ سوری تاریخ کی ان نامور اور شہرۂ آفاق شخصیتوں میں سے ہے جنہوں نے خاک سے ابھر کر عظمتوں کا بلند مقام حاصل کیا اور اپنی اولوالعزمی، خداداد لیاقت اور اعلیٰ فہم و فراست سے کام لے کر نمایاں کامیابی حاصل کی۔" اس نے صرف پانچ سال حکومت کی لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے اپنی خداداد لیاقت اور قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملکی نظم و نسق کو سنوار کر ہر سرکاری شعبہ میں اصلاحات جاری کیں۔ وہ رضاداری کا علمبردار اور انصاف کا پیکر تھا۔ اس نے سارے ملک میں سڑکوں کا جال بچھا دیا۔ رفاہِ عامہ کے بے شمار کاموں کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس نے زراعت کو ترقی پذیر کر کے اپنے ملک کو اقتصادی طور پر خوشحال اور

---

[1] مغل ایمپائر۔

Marfat.com

فارغ البال بنا دیا اس نے برصغیر پاک و ہند پر ۱۵۴۰ء سے ۱۵۴۵ء تک حکومت کی وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے عوام کی فلاح و بہبود کی طرف پوری توجہ دی۔ مشہور مورخ (KEENE) کی اس رائے سے ہمیں اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ:

"کوئی حکومت بھی شیر شاہ کے پایہ کی ثابت نہ ہو سکی حتیٰ کہ انگریز بھی اس پٹھان بادشاہ کی سی فہم و فراست کا مظاہرہ نہ کر سکے۔"

"No Government, not even the British has shown so much wisdom as this Pathan King."

(Keene)

ابتدائی حالات

شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید خاں تھا۔ سلطان محمد حاکم بہار کی ملازمت میں تھا کہ تلوار سے ایک شیر کو ہلاک کیا اس پر سلطان محمد نے خوش ہو کر اسے شیر خاں کا خطاب عطا کیا۔ بعد ازاں فعل بادشاہ ہمایوں کو شکست دے کر جب وہ برصغیر پاک و ہند کا شہنشاہ بنا تو "شیر شاہ" کے لقب سے دہلی و آگرہ کے تخت پر متمکن ہوا۔

شیر شاہ کے باپ کا نام حسن خاں اور دادا کا نام ابراہیم سوری تھا جو ایک افغان قبیلہ "سور" سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قبیلہ پشاور کے نزدیک روہ (ROH) نامی پہاڑی علاقہ کا رہنے والا تھا۔ شیر شاہ کا دادا ابراہیم سوری گھوڑوں کی سوداگری کرتا تھا۔ کاروبار میں نقصان ہوا تو روزگار کی تلاش میں بہلول لودھی کے عہد میں برصغیر پاک و ہند میں چلا آیا۔ یہاں دونوں باپ بیٹا (ابراہیم سوری اور حسن خاں) پنجاب میں ہوشیار پور کے علاقہ ہریانہ (HARIANA) بکھیالہ (BAKHIALA) کے جاگیردار مہابت خاں سوری اور داؤد خاں ساہو خیل کے ہاں ملازم ہو گئے۔ لیکن ہوشیار پور سے دو میل دور پاجوارڑہ کے مقام پر رہائش پذیر ہوئے اور یہیں ۱۴۷۲ء یا ۱۴۸۶ء میں حسن خاں کی افغان بیوی کے بطن سے فرید خاں پیدا ہوا۔ اس کے سال ولادت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ [1] سکندر خاں لودھی نے جب جمال خاں کو بہار کا گورنر مقرر کر کے جونپور بھیجا تو اس نے حسن خاں کو اسلام آباد پورا اور خواص پور ٹانڈا کا علاقہ بطور جاگیر عطا کیا۔

شیر شاہ جونپور میں

حسن خاں جس قدر تلوار کا دھنی، بہادر اور تجربہ کار سپاہی تھا گھریلو معاملات کے طے کرنے میں وہ اتنا ہی ناتجربہ کار تھا اس کی چار

---

[1] ڈاکٹر اے ایل سری واستوا اور ڈاکٹر پی۔ سرن شیر شاہ کا سالِ ولادت ۱۴۷۲ء بتاتے ہیں۔ جبکہ ڈاؤد تا نوعگوئی رائے میں اس کا سن ولادت ۱۴۸۶ء ہے۔

Marfat.com

بیویاں اور آٹھ بیٹے تھے۔ فرید خاں (شیر شاہ) اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ حسن خاں اپنی سب سے چھوٹی بیوی کے دامِ محبت میں گرفتار تھا اور اس کی ہر فرمائش اور بات قبول کرنے پر مجبور تھا۔ اس لئے فرید خاں کو اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اپنی سوتیلی والدہ کے حسد اور اپنے والد حسن خاں کی بے توجہی کا شکار رہنا پڑا۔ چنانچہ سوتیلی ماں کی بدسلوکی اور اپنے باپ کی سرد مہری سے تنگ آکر وہ جونپور چلا گیا جو اس زمانے میں اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ اور "برصغیر پاک و ہند کا شیراز" تھا۔ فرید خاں نے یہیں پر اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی اس نے عربی اور فارسی زبان کے علاوہ دیگر علوم میں بھی مہارت پیدا کی۔

شیر شاہ بطورِ منتظم ۱۴۹۷ء تا ۱۵۱۸ء

فرید خاں (شیر شاہ) نے جلد ہی جونپور کے علمی حلقوں میں شہرت حاصل کر لی۔ عوام کے علاوہ جمال خاں حاکم جونپور بھی اس کی لیاقت اور علمی استعداد سے متاثر ہوا۔ اس کی بے مثال قابلیت سے متاثر ہو کر جمال خاں نے باپ بیٹے میں مصالحت کرا دی اور حسن خاں کو اپنے بیٹے کے جوہرِ استعداد کی قدر کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ حسن خاں نے فرید خاں کو اپنی جاگیر کا منتظم بنا دیا۔ فرید خاں نے جاگیر کے انتظام میں اپنی لیاقت اور حسنِ تدبر کا اس خوش اسلوبی سے مظاہرہ کیا کہ نہ صرف جاگیر کی آمدنی میں اضافہ ہوا بلکہ کاشتکار بھی خوشحال اور فارغ البال ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرید خاں اپنی جاگیر میں ہر دلعزیز ہو گیا لیکن اس کے اقتدار اور اس کی ہر دلعزیزی کو دیکھ کر اس کی سوتیلی ماں بیر حسد کی آگ میں جلنے لگی اور اس نے فرید خاں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ آخر تنگ آکر بیس سال کے بعد فرید خاں پھر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ آگرہ پہنچ کر اس نے ابراہیم لودھی کے ایک جرنیل دولت خاں کی ملازمت اختیار کر لی ساتھ ہی ابراہیم لودھی کے حضور درخواست گزاری کہ اس کے باپ کی جاگیر اس کے نام منتقل کر دی جائے۔ پہلے تو ابراہیم لودھی نے انکار کیا لیکن حسن خاں کی وفات کے بعد منتقلی کا شاہی پروانہ فرید خاں کے نام جاری کر دیا۔ چنانچہ فرید خاں مستقل طور پر سہسرام میں سکونت پذیر ہو گیا۔

حاکمِ بہار کی ملازمت

شیر شاہ کو اپنے باپ کی جاگیر کا شاہی پروانہ حاصل کر کے بھی آرام و سکون نصیب نہ ہوا۔ کیونکہ اس کے سوتیلے بھائی سلیمان نے محمد خاں سوری حاکم چنار (بہار) کی اعانت سے جاگیر کی ملکیت کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ محمد خاں شیر شاہ کے باپ حسن خاں کا دیرینہ دشمن تھا۔ اس نے اپنی دیرینہ دشمنی کی بنا پر اس خاندانی جھگڑے کو خوب ہوا دی اور دونوں جماعتوں کو جاگیر کی تقسیم کا مشورہ دیا۔ فرید خاں نے شاہی پروانے کی موجودگی میں اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کی خاطر بہار خاں

Marfat.com

لوہانی گورنر بہار کی ملازمت اختیار کرلی جہاں اس نے خوب ترقی کی اس جگہ اس نے شکار کے دوران تلوار کے ایک ہی وار سے شیر کو ہلاک کرکے خاں لوہانی سے شیر خاں کا خطاب حاصل کیا۔ بہار خاں لوہانی نے اسے اپنے بیٹے جلال خاں لوہانی کا اتالیق بھی مقرر کیا۔

شیر خاں بابر کی ملازمت میں

شیر خاں کا عروج لوہانی سرداروں اور افغان امرا کو ایک آنکھ نہ بھایا اور انہوں نے اس کے خلاف سلطان محمد شاہ حاکمِ بہار کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور سلطان کو بتایا کہ شیر خاں ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے تاکہ افغان اقتدار دوبارہ بحال کیا جا سکے۔ یہ چیز سلطان کی پالیسی کے خلاف تھی۔ چنانچہ سلطان محمد شاہ نے شیر خاں سے نجات حاصل کرنے کی خاطر محمد خاں سوری حاکمِ چونڈ کو شیر خاں اور سلیمان خاں کے گھریلو تنازعہ کے تصفیہ کے لئے ثالث مقرر کر دیا جس نے پھر ایک بار جاگیر کی تقسیم کی تجویز پیش کی اور شیر خاں کے انکار پر جاگیر پر زبردستی قبضہ کر لیا اس پر شیر خاں نے کڑہ اور مانک پور کے مغل گورنر جنید برلاس کی حمایت حاصل کی اور بعد ازاں آگرہ پہنچ کر اس کی وساطت سے اپریل ۱۵۲۷ء میں بابر کی ملازمت اختیار کر لی۔

جب بابر نے بہار کے افغانوں کے خلاف فوجی کارروائی کی تو شیر خاں نے مغل بادشاہ کی مفید خدمات انجام دیں۔ جن کے صلے میں ۱۵۲۸ء میں اس کی جاگیر بحال کر دی گئی۔ شیر خاں نے بابر سے سفارش کرکے اپنے دیرینہ مخالف محمد خاں سوری کی مفتوحہ جاگیر اسے واپس دلوا دی۔ اس طرح اس نے سیاسی بصیرت سے کام لے کر اپنے دیرینہ حریف کی ہمدردی حاصل کر لی۔ شیر خاں نے چندیری کی مہم میں مغل بادشاہ بابر کا ساتھ دیا جس میں اس نے اپنی جوانمردی، فوجی فہانت اور فہم و فراست سے بابر کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ جلد ہی بابر کی مردم شناس نگاہوں نے اس کی پیشانی پر عظمت کے نقوش پڑھ لئے اور اس نے اپنے وزیر امیر نظام الدین علی محمد خلیفہ سے کہا:

> "شیر خاں پر کڑی نگاہ رکھو۔ وہ چالاک آدمی ہے اس کی پیشانی سے بادشاہت کی علامات جھلکتی ہیں، مجھے متعدد افغان امرا سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو مرتبہ میں اس سے کہیں بڑے ہیں مگر کسی نے مجھے متاثر نہیں کیا جونہی یہ میری نگاہوں کے سامنے آیا میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اسے گرفتار کر لینا چاہیئے کیونکہ اس میں عظمت و جلالت کی صفات نظر آتی ہیں۔"

شیر خاں اپریل ۱۵۲۷ء سے جون ۱۵۲۸ء تک مغل دربار سے وابستہ رہا اس اثنا میں اس کی باریک بین نگاہوں نے مغلوں کی عادات و اطوار، مغلیہ انتظام سلطنت اور اس کے فوجی نظم و ضبط کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی خامیوں کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا یہیں سے اس نے

Marfat.com

یہ رائے قائم کرلی کہ مغلوں کی حکومت کو ختم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے لیکن ۱۵۲۸ء کے اواخر میں بابر کی قیافہ شناسی سے گھبرا کر بغیر اجازت مغلیہ کیمپ سے بھاگ کر واپس اپنی جاگیر سہسرام میں پہنچ گیا۔

شیر خاں کا عروج

اب شیر خاں نے بہار کے حاکم سلطان محمد شاہ کی ملازمت دوبارہ اختیار کرلی۔ سلطان نے اسے دوبارہ نوعمر جلال خاں کا اتالیق مقرر کردیا ۱۵۲۸ء میں سلطان محمد شاہ نے وفات پائی تو سلطان کی بیوہ دادو بی بی نے شیر خاں کو نابالغ شہزادہ جلال خاں کا سرپرست بنانے کے علاوہ بہار کا نائب منتظم اعلیٰ (ڈپٹی گورنر) بھی مقرر کردیا۔ نئے عہدے پر متمکن ہوکر شیر خاں نے بہار کے نظم و نسق کو بہتر بنایا۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کے لئے قبیلہ سور سے بہت بڑی تعداد میں اپنے حامیوں کو لاکر انہیں اہم عہدوں پر متعین کیا۔ دادو بی بی کی وفات کے بعد وہ بہار میں سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ (۱۵۲۶ء)

اگلے سال ۱۵۳۰ء میں شیر خاں نے اقتصادی اور فوجی لحاظ سے اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم بنانے کی غرض سے بہلول لودھی کی قریبی رشتہ دار اور قلعہ چنار کے سابق حاکم تاج خاں کی بیوہ لاڈ ملکہ سے شادی کرلی۔ لاڈ ملکہ قلعہ چنار کی وارث تھی۔ اس شادی سے بے شمار زر و جواہرات شیر خاں کے ہاتھ لگے جس سے اس کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ علاوہ ازیں "وہ افغانوں کا مقتدر سردار بن گیا۔"

دوراہہ کی جنگ میں ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی کی قیادت میں افغانوں کو ہمایوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تو شیر خاں کی پوزیشن اور بھی نمایاں ہوگئی اور وہ افغانوں کا لیڈر بن گیا۔ شیر خاں اس جنگ میں اگرچہ غیر جانبدار رہا تھا مگر جب اس نے ہمایوں بادشاہ کے مطالبہ پر چنار کا قلعہ مغلوں کے حوالے کرنے سے انکار کیا تو ہمایوں نے چنار کا محاصرہ کرلیا جو چار ماہ تک جاری رہا۔ محاصرہ کے دوران شیر خاں نے دور اندیشی سے کام لے کر محتاط پالیسی کا مظاہرہ کیا اور ہمایوں کو پہلا پھسلا کر نہایت ہی دل خوش کن الفاظ میں اسے اپنی اطاعت کا یقین دلادیا اور اسے اپنی وفاداری کا مکمل طور پر یقین دلانے کے لئے پانچ سو افغان سپاہیوں کا ایک دستہ اپنے بیٹے قطب خاں کی زیر کمان ہمایوں کی خدمت پر مامور کیا۔ اس پر ہمایوں نے محاصرہ اٹھا لیا۔ بعد ازاں پانچ سال تک بہادر شاہ والئے گجرات کے خلاف ہمایوں کی فوج کشی کے دوران شیر خاں نے اپنی قوت اور طاقت میں اضافہ کرکے اپنی پوزیشن کو بہت زیادہ مستحکم بنالیا۔

بنگال کی تسخیر

چنار سے ہمایوں کے واپس آگرہ چلے جانے کے بعد شیر خاں نے افغانوں کو بھرتی کرکے اپنی فوج کو از سر نو منظم کیا اور ۱۵۳۳ء

Marfat.com

میں والیٔ بنگال کے خلاف فوجی کارروائی کی۔ ۱۵۳۴ء میں سوراج گڑھ کی لڑائی میں محمود شاہ کو فیصلہ کن شکست دی۔ سوراج گڑھ کی فتح شیر خاں کی عروج پذیر زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوئی۔ اس فیصلہ کن فتح سے نہ صرف کثیر تعداد میں مال غنیمت اور اسلحہ اس کے ہاتھ آیا اور بہت سے علاقے پر اس کا قبضہ ہو گیا بلکہ وہ سارے بہار کا خود مختار حکمران بن گیا۔ شیر خاں نے ایک بار پھر بنگال پر حملہ کر دیا اور علاقے پر علاقہ فتح کرتا ہوا بنگال کے صدر مقام گور تک جا پہنچا۔ بالآخر غیاث الدین محمود شاہ نے تیرہ لاکھ روپے طلائی سکے ادا کر کے شیر خاں سے صلح کر لی۔ لیکن یہ صلح چند روزہ ثابت ہوئی۔ چونکہ شیر خاں کو فتوحات کا چسکا پڑ چکا تھا اور وہ سارے بنگال کو زیر نگیں کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اس لئے ۱۵۳۷ء جب غیاث الدین محمود شاہ خراج کی رقم ادا نہ کر سکا تو شیر خاں کو بنگال پر حملہ کا معقول بہانہ مل گیا۔ والیٔ بنگال نے شیر خاں کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمزور پا کر ہمایوں سے امداد کی درخواست کی لیکن شیر خاں نے اپنے بیٹے جلال خاں اور اپنے معتبر جرنیل خواص خاں کی زیر کمان فوج بھیج کر گور کی تسخیر کی مہم کو سخت کر دیا۔ تاکہ ہمایوں کی آمد سے قبل ہی بنگال کی تسخیر مکمل ہو جائے۔

ہمایوں سے مقابلہ

ہمایوں جو پہلے ہی شیر خاں کی مشرق میں فتوحات اور روز افزوں طاقت سے خطرہ محسوس کر رہا تھا محمود شاہ کے بلاوے پر مشرق کی طرف بڑھا اور ۱۵۳۷ء میں چنار کا محاصرہ کر لیا جو بالآخر چھ ماہ کے طویل محاصرے کے بعد فتح ہو گیا۔ شیر خاں نے مونگیر اور گور کے درمیانی علاقے فتح کر لئے اور گور کا محاصرہ بھی کر لیا۔ علاوہ ازیں بکمال عیاری برصغیر پاک و ہند کے ناقابل تسخیر قلعہ رہتاس گڑھ پر بھی قبضہ جما لیا جو ایک ہندو راجہ کے زیر نگیں تھا۔ یہ قلعہ اس وقت تک مسلمان فرمانرواؤں کی دسترس سے بچا ہوا تھا۔ شیر خاں نے بنگال سے حاصل کردہ تمام دولت کو یہاں محفوظ کر لیا۔

قلعہ چنار کی فتح کے بعد ہمایوں نے شیر خاں کو صلح کی دعوت دی اور مطالبہ کیا کہ شیر خاں اپنے زیر نگیں تمام علاقے اس کے حوالے کر دے اور اپنے لئے ایک چھوٹی جاگیر کا انتخاب کر لے لیکن شیر خاں نے ہمایوں کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اس پر ہمایوں نے اسے بہار حوالے کرنے کے لئے کہا اور سارا بنگال اس شرط پر دینا منظور کیا کہ وہ مغلیہ سیادت کو قبول کرنے کے علاوہ سالانہ دس لاکھ روپے بطور خراج ادا کرے۔ شیر خاں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ جھگڑے کا تصفیہ ہو چکا تھا لیکن ہمایوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور بنگال کی تسخیر کا مصمم ارادہ کر لیا۔ شیر خاں نے اس وعدہ خلافی کا برا منایا۔

ہمایوں بنگال کی تسخیر کے ارادے سے آگے بڑھا اور بغیر کسی مزاحمت کے فاتحانہ گور میں

Marfat.com

داخل ہوا اور کئی ماہ تک وہاں عیش و نشاط کی بزم آرائیوں میں مصروف رہا۔ ہمایوں کو یوں رنگ رلیوں میں مصروف دیکھ کر شیر خاں نے جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑھ کر بہار اور آگرہ کے درمیانی علاقے پر قبضہ کر لیا اس طرح اس نے آگرہ اور بنگال کے مابین ذرائع نقل و حمل کو منقطع کر دیا اور مغلیہ علاقوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ ہمایوں کو تمام حالات کا علم ہوا تو تیزی سے آگرہ کی طرف بڑھا مگر راستے میں (جون ۱۵۳۹ء) اسے چوسہ کے مقام پہ شیر خاں کے ہاتھوں سخت ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اور وہ بڑی مشکل سے نظام سقہ کی مدد سے دریائے گنگا کو عبور کر کے آگرہ پہنچا دوسرے سال ۱۵۴۰ء میں دوبارہ شیر خاں کے مقابل قنوج کے مقام پر صف آرا ہوا لیکن عبرتناک شکست سے دوچار ہو کر دہلی اور آگرہ کے تخت سے بھی محروم ہو گیا۔

شیر خاں کی تخت نشینی

چوسہ کی فتح سے شیر خاں کی زندگی میں بنیادی تبدیلی واقع ہوئی اور اس کے عزائم بلند تر ہو گئے۔ ڈاکٹر قانونگو رقمطراز ہیں کہ "۱۵۳۸ء میں شیر خاں اس بات پہ رضامند تھا کہ اسے مغل دربار میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہو جائے لیکن اب جبکہ اس نے اپنے ایک ہی حملے سے جونپور کے علاوہ بنگال اور بہار پر قبضہ کر لیا تھا وہ جائز طور پہ بادشاہ کہلانے کا مستحق تھا۔" چوسہ کی فتح کے بعد شیر خاں نے بنگال پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۵۳۹ء میں شیر شاہ کا لقب اختیار کر کے گور کے مقام پر اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہوئے تاج پوشی کی رسم ادا کی اور سوری حکومت کی بنیاد ڈالی۔ نیز اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔

شیر شاہ بطورِ شہنشاہِ ہند

(۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء)

ہمایوں کا تعاقب

۱۵۴۰ء میں قنوج کی لڑائی میں کامیابی کے بعد شیر خاں نے اپنے جرنیل شجاعت خاں کو گوالیار کی تسخیر کے لئے روانہ کیا اور خود آگرہ کی جانب روانہ ہوا۔ شیر شاہ کی آمد کی خبر سن کر ہمایوں لاہور کی جانب بھاگ گیا شیر شاہ جب ہمایوں کے تعاقب میں سرہند پہنچا تو اسے ہمایوں کی طرف سے پیغام ملا کہ کیوں نہ سرہند کو مغل اور افغان سلطنت کے درمیان سرحدی مقام بنا لیا جائے مگر شیر شاہ نے اس تجویز کو رد کر دیا اور مغل بادشاہ ہمایوں کا تعاقب جاری رکھا۔ ہمایوں نے لاہور پہنچ کر اپنے بھائیوں کو متحد کر کے شیر شاہ

Marfat.com

سے مقابلہ کرنا چاہا مگر اس کے بھائی راضی نہ ہوئے۔ چنانچہ مرزا کامران کابل روانہ ہو گیا اور ہندال نے سندھ کا رخ کیا۔ مجبوراً ہمایوں نے بھی خوشاب سے سندھ کا رستہ لیا۔ شیر شاہ خوشاب تک آیا یہاں سے اس نے خواص خاں اور قطب خاں کی سرکردگی میں دو مہمیں ہمایوں کے تعاقب میں بھیجیں اور انہوں نے بیکنڈ تک ہمایوں کا تعاقب کیا ازاں بعد واپس پلٹ کر خوشاب کے مقام پہ شیر شاہ سے آملے۔

گکھڑوں کی سرکوبی

شیر شاہ نے چند ماہ خوشاب میں قیام کیا یہاں بلوچی سرداروں نے حاضر ہو کر اس کی اطاعت قبول کی اس کے بعد وہ دریائے جہلم کے بالائی طاس کے علاقے کے سرکش اور باغی گکھڑوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ لیکن شیر شاہ ان کی قوت کو مکمل طور پہ ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور گکھڑ سردار رائے سارنگ کا رویہ بدستور جارحانہ رہا۔ چنانچہ شیر شاہ نے شمال مغربی سرحد کے تحفظ کے لئے جہلم سے دس میل کی مسافت پہ پہاڑی علاقے میں قلعہ رہتاس تعمیر کروانے کا فیصلہ کیا یہ قلعہ جو پہاڑ کے ناقابل تسخیر قلعہ رہتاس کی طرز پہ تھا راجہ ٹوڈرمل کی نگرانی میں مکمل ہوا۔ اس قلعہ پہ شیر شاہ نے ہیبت خاں نیازی کو پچاس ہزار افغان سپاہ کے ساتھ بطور حاکم اعلیٰ تعینات کیا۔ اسی دوران شیر شاہ نے مرزا حیدر کو کشمیر سے نکالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ بالآخر گکھڑوں کی مکمل سرکوبی کا کام اپنے جرنیلوں کے سپرد کر کے ۱۵۴۱ء میں بنگال کے گورنر خضر خاں کی بغاوت کی اطلاع پا کر واپس آگرہ لوٹ گیا۔

بنگال میں بغاوت ۱۵۴۱ء

شیر شاہ پنجاب سے سیدھا آگرہ پہنچا اور ازاں بعد باغی گورنر خضر خاں کی سرکوبی کے لئے بنگال روانہ ہو گیا۔ بغاوت کو کچلنے کے بعد اس نے صوبے کو متعدد سرکاروں (اضلاع) میں تقسیم کر دیا۔ ہر سرکار کے نظم و ضبط کے لئے الگ حاکم (شقدار) مقرر کیا اور امن و امان کے لئے کچھ فوج بھی اس کے ماتحت کی۔ علاوہ ازیں ان تمام سرکاروں (اضلاع) کے شقداروں کے اوپر ایک سویلین آفیسر قاضی فضیلت کو صوبے کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ اس اقدام سے نہ صرف امن و امان قائم ہو گیا بلکہ آئندہ بغاوت کے امکانات بھی ختم ہو گئے۔

شیر شاہ کی فتوحات

مالوہ ۱۵۴۲ء

بنگال سے واپسی کے بعد شیر شاہ نے ۱۵۴۲ء میں مالوہ پر حملہ کیا جس کی فتح سلطنت کی بقا اور استحکام کے لئے ناگزیر تھی۔ مالوہ پہ ملو خاں کی حکومت تھی ملو خاں (قادر شاہ) نے مغلوں کے خلاف، شیر شاہ کے لڑکے قطب خاں کو کوئی

Marfat.com

امداد نہ دی تھی جس کی وجہ سے ۱۵۴۰ء میں مرزا ہندال اور مرزا عسکری نے اسے گھیرے میں لے کر ہلاک کر دیا تھا۔ اپریل ۱۵۴۲ء میں شیر شاہ مالوہ کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا اور گوالیار کو فتح کرتا ہوا سارنگ پور جا پہنچا۔ قادر شاہ نے شیر شاہ کی طاقت سے مرعوب ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ شیر شاہ نے اپنے ایک جرنیل شجاعت خاں کو مالوہ کا گورنر مقرر کیا اور قلعہ رنتھمبور کو زیر کرنے کے بعد آگرہ لوٹ گیا۔

قلعہ رائے سین ۱۵۴۳ء

رائے سین کا قلعہ وسط ہند میں بندھیاچل کے پہاڑی سلسلے کی بلند چوٹی پر واقع تھا اور ایک اہم فوجی مرکز تھا رائے سین میں پورن مل ایک چوہان راجپوت کی حکومت تھی۔ ۱۵۴۲ء میں وہ شیر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے بہت سے تحفے تحائف دیئے بعد ازاں شیر شاہ کو بتایا گیا کہ پورن مل ایک ظالم اور متعصب ہندو ہے جس نے چندیری کے شہر کو تاخت و تاراج کرنے کے علاوہ مسلم آبادی کا قتل عام کیا اور مسلمان عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا ہے۔ مالوہ کی تسخیر کے بعد شیر شاہ بنگال اور بہار کے انتظامی امور کی دیکھ بھال میں مصروف تھا کہ شدید بخار میں مبتلا ہوا۔ اس نے منت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے صحت دی تو وہ پورن مل کو مسلم دشمنی کی سزا دے گا۔ چنانچہ ۱۵۴۳ء میں شیر شاہ نے قلعہ رائے سین پر قبضہ کرنے اور پورن مل کو مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانے کی سزا دینے کی غرض سے قلعہ رائے سین کا محاصرہ کر لیا۔ پورن مل نے مقابلہ کی ہمت نہ پا کر قلعہ بادشاہ کے حوالے کر دیا۔ مگر جب پورن مل کے ہاتھوں چندیری کی ستم رسیدہ مسلم بیواؤں نے فریاد کی اور اپنی المناک داستان سنائی تو شیر شاہ کا خون کھول اٹھا اور اس نے پورن مل پر لشکر کشی کا حکم دے دیا۔ پورن مل اور دیگر راجپوتوں نے اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھوں قتل کیا اور افغانوں پر پل پڑے لیکن سب افغانوں کی تلواروں کے گھاٹ اتر گئے۔ شیر شاہ نے قلعہ رائے سین میں مقید سینکڑوں مظلوم مسلمان عورتوں کو آزاد کیا اور انتقاماً پورن مل کی لڑکی کنور قاصہ اور اس کے تین بھتیجوں کو خواجہ سرا بنا دیا۔

ملتان اور سندھ

۱۵۴۲ء میں شیر شاہ نے پنجاب کے گورنر ہیبت خاں نیازی کو نواحی علاقوں کی فتح اور باغی سرداروں کی گوشمالی پر مامور کیا ہیبت خاں نیازی نے سب سے پہلے پاکپتن کا محاصرہ کر کے وہاں کے حاکم فتح خاں جاٹ کے خلاف فوجی کارروائی کی جس نے دہلی اور لاہور کی درمیانی سڑک کو غیر محفوظ بنا رکھا تھا۔ فتح خاں جاٹ گرفتار ہو کر قید ہوا اور بعد میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہیبت خاں نیازی نے ملتان کے حاکم بخشو لنگا کے خلاف فوج کشی کی اور ملتان پر قبضہ کر لیا۔ شیر شاہ نے بخشو لنگا اور اس کے بیٹے کی جان بخشی کرتے ہوئے ان کی جاگیر بحال رکھی۔ فتح جنگ خاں کو ملتان کا حاکم مقرر کیا۔ اور

Marfat.com

ہیبت خاں نیازی کو ان شاندار فتوحات کے صلے میں بیش قرار انعامات سے نوازا گیا۔ ملتان کے گورنر کو حکم دیا گیا کہ وہ ملتان کو آباد کرنے کی کوشش کرے اور قدیم سسٹم کے مطابق اس علاقے سے کل پیداوار کا ۱/۱۰ حصہ بطور مالیہ وصول کرے۔

قبل ازیں ۱۵۴۱ء میں شیر شاہ کے قیام خوشاب کے دوران سندھ فتح ہو چکا تھا اور اس پر وہاں کے ایک مقامی سردار اسماعیل خاں کو حاکم مقرر کر دیا گیا اس طرح پنجاب کے علاوہ ملتان اور سندھ کے علاقے بھی شیر شاہ کے زیر نگیں آ گئے۔

راجپوتانہ میواڑ کے راجہ رانا سانگا کی وفات کے بعد راجپوتانہ میں مارواڑ کی حکومت سب سے زیادہ مستحکم اور طاقتور تھی راجہ مالدیو راٹھور وہاں کا حکمران تھا جس نے ہمایوں کو فریب دے کر گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی۔ راجہ مالدیو ۱۵۳۱ء میں اپنے باپ راؤ گنگا جی کی وفات کے بعد مارواڑ کی راج گدی پر متمکن ہوا۔ لیکن اس نے پانچ چھ سال کے قلیل عرصے میں ہی اپنی سیاسی قابلیت سے بیکانیر، جیسلمیر، میواڑ اور امر کے متعدد علاقوں کو زیر نگیں کر کے اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع کر لیا تھا۔

راجہ مالدیو راٹھور کی بڑھتی ہوئی طاقت کو اپنی سلطنت کے لئے ایک خطرہ سمجھتے ہوئے ۱۵۴۳ء میں شیر شاہ نے ایک بہت بڑی فوجی جمعیت کے ساتھ مارواڑ پر حملہ کر دیا۔ اجمیر کے نواح میں راجپوتوں سے شاہی فوج کا مقابلہ ہوا۔ ایک ماہ تک دونوں فریق ایک دوسرے کے سامنے ڈٹے رہے۔ شیر شاہ نے راجپوتوں کی طاقت کو منتشر کرنے کے لئے ایک سیاسی چال چلی۔ اس نے ایک جعلی خط ریشمی خریطہ میں لپیٹ کر مالدیو کے خیمے کے نزدیک اس طرح پھینکوا دیا جس سے ظاہر ہو کہ اتفاقاً گر گیا ہے۔ خط مالدیو کے ٹھاکروں (راجپوت سرداروں) کی طرف سے شیر شاہ کے نام تھا جس میں شیر شاہ کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ راجہ کو دوران جنگ گرفتار کر کے اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ شیر شاہ کی یہ سیاسی چال کامیاب رہی اور یہ خط مالدیو کے ایک وزیر کے ہاتھ لگا جس نے اسے راجہ کے پاس بھجوا دیا۔ مالدیو خط کا مضمون پڑھ کر اپنے ٹھاکروں سے بدظن ہو گیا اور اسے اپنے سرداروں پر ذرہ برابر اعتماد نہ رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مالدیو میدان جنگ سے بھاگ نکلا لیکن اس سے راجپوت سرداروں کی رگ حمیت پھڑک اٹھی اور انہوں نے شیر شاہ کی فوج پر اس انداز سے حملہ کیا کہ شیر شاہ حیران رہ گیا اور بمشکل تمام راجپوتوں کو شکست دے سکا۔

اجمیر میں کامیابی کے بعد شیر خاں نے خواص خاں اور عیسےٰ خاں نیازی کو مارواڑ کی تسخیر پر مامور کیا۔ شاہی افواج نے ناگور، اجمیر، جودھپور اور مارواڑ کے اہم اضلاع پر قبضہ کر لیا جبکہ راجہ مالدیو نے جودھپور سے راہ فرار اختیار کر کے گجرات کے قریب قلعہ سوانا میں پناہ لی۔ شیر شاہ مارواڑ سے میواڑ

Marfat.com

کی طرف بڑھا جہاں کمسن رانا اودھے سنگھ کی حکومت تھی۔ رانا نے مقابلہ کئے بغیر ہی شیر شاہ کی اطاعت قبول کرلی۔ بعدازاں شیر شاہ راجپوتانہ اور سلطنت کے اہم مقامات کے درمیان ذرائع مواصلات کے تحفظ کے لئے فوجی دستے متعین کرتا ہوا آگرہ واپس لوٹ آیا۔

کالنجر کی مہم اور شیر شاہ کی وفات

۲۲- مئی ۱۵۴۵ء

راجپوتانہ کی مکمل تسخیر کے بعد شیر شاہ نے کالنجر کے خلاف فوج کشی کی۔ کیونکہ کالنجر کے راجہ کرت سنگھ نے شیر شاہ کے باغی ریوا کے راجہ پرھان بگھیلہ کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی اور شیر شاہ کے مطالبہ کے باوجود اسے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شیر شاہ نے نومبر ۱۵۴۴ء میں قلعہ کالنجر کا محاصرہ کرلیا جو کم و بیش سات ماہ جاری رہا۔

قلعہ کو فتح ہوتے نہ دیکھ کر شیر شاہ نے ۲۲- مئی ۱۵۴۵ء (۱۰ ربیع الاوّل ۹۵۲ھ) کو قلعہ کی دیواروں کو آتشیں گولہ باری سے اڑا دینے کا حکم دیدیا۔ اور گولہ باری کی خود نگرانی کرنے لگا۔ اتفاق سے ایک بارودی ہوائی قلعہ کے دروازے سے ٹکرا کر واپس بارود خانے میں آگری اور بارود کے ذخیرے میں آگ لگ گئی۔ آگ کے ایک دم بھڑک اٹھنے سے شیر شاہ بری طرح جھلس گیا۔ بادشاہ کی حالت مخدوش پاکر فوج نے قلعہ پر عام دھاوا بول دیا۔ مغرب کے قریب شیر شاہ کو اس کے جرنیلوں نے قلعہ کی مکمل تسخیر کی خوشخبری سنائی تو "اس کے چہرے پر مسرت و اطمینان کے آثار ظاہر ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے دم توڑ دیا" یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کا سبب موت ہی اس کی تاریخ وفات کا مظہر ہے۔ "ز آتش مرد" [1]

۹۵۲ھ

شیر شاہ سوری کا انتظامِ سلطنت

شیر شاہ سوری بغیر کسی شک و شبہ کے قرون وسطیٰ کا ایک بہت بڑا منتظم تھا اس کا نافذ کردہ نظام سلطنت علاؤ الدین خلجی کے انتظامی ڈھانچہ کی ایک اصلاح شدہ نقل تھی لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنے نظام سلطنت کی بنیاد عدل و انصاف، مذہبی رواداری اور سماجی بہبود پر رکھی اور اس کا یہی امتیاز اس کے عظیم المرتبت بادشاہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

---

[1] شیر شاہ آں کہ از مہابت او — شیر و بز آب را بہم مے خورد
از جہاں رفت و گفت پیر خرد — سال تاریخ او "ز آتش مرد"

Marfat.com

مرکزی نظام سلطنت دہلی کے دیگر حکمرانوں کی طرح شیر شاہ سوری بھی وسیع اختیارات کا حامل ایک مطلق العنان بادشاہ تھا اس کے وزراء اور حکام کے اختیارات محدود تھے ان کا فرض صرف بادشاہ کے احکامات کی تعمیل کرنا تھا۔ بادشاہ بذات خود حکومت کی تمام قوتوں کا سرچشمہ تھا اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود ایک مشفق حکمران تھا اس کے عہد حکومت میں رعایا کی فلاح و بہبود تمام امور سلطنت پر مقدم تھی اس نے نظم و نسق کو سنوارنے کے لئے دن رات محنت کی اس نے انتظامی سہولت کے لئے اپنی سلطنت کو سینتالیس ۴۷ حلقوں میں تقسیم کر رکھا تھا یہ حلقے سرکار کہلاتے تھے ہر سرکار کو مزید انتظامی حلقوں میں بانٹا ہوا تھا جن کو پرگنہ کہا جاتا تھا۔

شیر شاہ سوری ایک خود مختار اور مطلق العنان حکمران ہونے کے باوجود فرض شناسی، عدل و انصاف، رعایا پروری اور خلق خدا کی خدمت جیسے بلند اوصاف کا مالک تھا۔ وہ حکومت کے تمام جملہ شعبوں کی کارکردگی کا بطور خاص جائزہ لیتا رہتا تھا اس کا مقولہ تھا "صاحب اختیار انسان کو ہمیشہ مستعد اور سرگرم عمل رہنا چاہیئے"۔ اس کی مرکزی حکومت ذیل کے شعبوں میں منقسم تھی۔

۱۔ دیوان وزارت: دیوان وزارت کا سربراہ وزیر کہلاتا تھا۔ دیوان وزارت مالیہ اور مالیات کا شعبہ تھا۔ بایں وجہ حکومت کی آمدنی اور اخراجات کی نگرانی اس کے سپرد تھی۔ علاوہ ازیں دیگر وزراء کے فرائض کی نگرانی کے حقوق بھی اسے تفویض تھے شیر شاہ سوری چونکہ ماہر معاشیات تھا اس لئے بذات خود بھی اس شعبہ میں خاص دلچسپی لیتا تھا۔ عہد اکبری کے مؤرخین نے لکھا ہے کہ شیر شاہ سوری روزانہ حکومت کی آمدنی اور اخراجات کے گوشوارے کی پڑتال کیا کرتا تھا اور پرگنوں کی جانب سے واجب الادا رقوم کے بقایا جات کے متعلق معلومات حاصل کیا کرتا تھا۔

۲۔ دیوانِ عرض: اس شعبہ کا افسر اعلیٰ عارض ممالک کہلاتا تھا جدید اصطلاح میں یہ وزیر دفاع تھا۔ اگرچہ یہ افواج کا کمانڈر انچیف نہ تھا مگر فوج کی بھرتی، تنظیم، نظم و ضبط، اسلحہ کی فراہمی، افواج میں تنخواہوں کی تقسیم اور میدان جنگ میں افواج کو تعین کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ شیر شاہ سوری شعبۂ افواج میں ذاتی دلچسپی رکھتا تھا۔ معاصر مؤرخین کی تحریروں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ شیر شاہ فوج کی بھرتی اپنی نگرانی میں کرواتا اور ہر جوان کی تنخواہ خود مقرر کرتا تھا۔

۳۔ دیوان رسالت: دیوان رسالت شعبۂ امور خارجہ تھا جس کا افسر اعلیٰ وزیر خارجہ کہلاتا تھا۔ یہ وزارت خارجہ کے جملہ فرائض کا ذمہ دار تھا۔ دوسرے

Marfat.com

ممالک میں سفیروں کا تقرر، بیرونی ممالک کے سفیروں کا استقبال کرنا، بیرونی ممالک سے خط و کتابت اور صلح کی گفت و شنید کرنا، معاہدات کے مسودات تیار کرنا اور ان کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنا اس کے فرائض میں داخل تھا بعض اوقات اس محکمہ کو اوقاف و وظائف بھی تفویض کئے جاتے تھے۔

۴۔ دیوانِ انشاء: یہ شعبہ مرکزی حکومت کا سیکرٹریٹ تھا۔ شاہی احکام و فرامین کے مسودات کی تیاری کرنا، متعلقہ حکام کی طرف ان کی ترسیل اس کی ذمہ داری تھی حکومت کا جملہ ریکارڈ بھی اسی شعبہ کی تحویل میں ہوتا تھا۔

۵۔ دیوانِ قضاء: یہ شعبہ انصاف تھا جس کا سربراہ قاضی القضاۃ کہلاتا تھا۔ سرکاروں اور پرگنوں میں ماتحت قاضیوں کی تقرری اور ان کے فیصلوں کے خلاف درخواستوں (اپیلوں) کی سماعت قاضی القضاۃ کے فرائض میں شامل تھی۔

۶۔ دیوانِ بریدہ: یہ شعبہ ڈاک اور خبر رسانی کا ذمہ دار تھا اس کا افسرِ اعلیٰ بریدِ ممالک کہلاتا تھا ملک کے طول و عرض سے حکام اور عوام کے حالات اور ملک میں وقوع پذیر اہم واقعات کے متعلق بادشاہ کو خبریں مہیا کرنا اس شعبہ کا فرض اولین تھا۔ سلطنت کے جملہ جاسوس اور شاہی ڈاک کے ہرکارے اس شعبہ سے منسلک ہوتے تھے۔

۷۔ خانِ سامان: خانِ سامان شاہی محل اور اس سے متعلقہ شعبہ جات کا افسرِ اعلیٰ ہوتا تھا شاہی محل کے تمام مصارف اور خوراک کی ذمہ داری اس کے سپرد تھی شاہی کارخانوں اور ذخیروں کا بندوبست اور نگرانی بھی اسی کے ذمہ ہوتی تھی۔ قرب شاہی اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے خانِ سامان کا عہدہ خاصی اہمیت کا حامل تھا۔

صوبائی نظام

شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں صوبائی نظم و ضبط کے سلسلے میں دو نظریات ہیں ڈاکٹر قانونگو کی رائے ہے کہ "شیر شاہ کے دور میں نظم و ضبط کے سلسلے میں "سرکار" سے بڑا حلقہ سلطنت میں کوئی نہ تھا اور صوبہ اور صوبائی گورنروں کی اصطلاح اکبر کی ایجاد ہے" ڈاکٹر سرن کی رائے اس کے برعکس ہے کہ "شیر شاہ نے فوجی گورنر مقرر کئے تھے اور صوبوں کا وجود اکبر سے قبل برصغیر میں موجود تھا" لیکن یہ دونوں نظریات صحیح نہیں ہیں حقیقت یہ ہے کہ سلاطین دہلی کے عہد کے علاوہ شیر شاہ سوری اور اس کے بیٹے اسلام شاہ کے دور میں بھی صوبوں کے مشابہ انتظامی حلقے موجود تھے لیکن اپنی حدود اور آمدنی کے لحاظ سے وہ یکساں نہ تھے۔ وہ صوبوں کی بجائے "اقطاع" کہلاتے تھے اور ان پر کسی خاص معتبر جرنیل یا امیر کو سربراہ مقرر کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ پنجاب، مالوہ اور اجمیر پر شیر شاہ نے فوجی گورنر مقرر کئے تھے جو کہ افواج کے کمانڈر بھی تھے۔

Marfat.com

سرکار (اضلاع)

شیر شاہ نے انتظامی سہولت کے تحت ملک کو متعدد انتظامی حلقوں میں تقسیم کر رکھا تھا جو سرکار (اضلاع) کہلاتے تھے۔ ان حلقوں کی تعداد سینتالیس تھی۔ ہر سرکار کے انتظام کے لئے دو افسر مقرر تھے جن کو شقدارِ شقداران اور منصفِ منصفان کہا جاتا تھا۔

ا۔ شقدارِ شقداران کے فرائض میں سرکار (اضلاع) میں امن و امان قائم رکھنا، باغی زمینداروں کی گوشمالی کرنا، حکومت کے احکام پر عمل درآمد کرانا اور پرگنے کے شقدار کے کام کی نگرانی کرنا شامل تھا۔ فرائض کی انجام دہی کے لئے تھوڑی سی فوج بھی اس کے زیرِ کمان ہوتی تھی۔

ب۔ منصفِ منصفان کی حیثیت ایک جج کی سی ہوتی تھی اس کا کام دیوانی مقدمات کا فیصلہ، پرگنہ کے منصف کا تقرر، مالیہ کی وصولی کی نگرانی، پرگنوں کے باہمی تنازعات کا تصفیہ کرنا اور کسانوں کی شکایات کا ازالہ کرنا ہوتا تھا۔

پرگنہ (تحصیل)

شیر شاہ نے انتظامی نظام کو مزید مؤثر بنانے کے لئے سرکاروں کو متعدد پرگنوں (تحصیلوں) میں تقسیم کر رکھا تھا۔ پرگنہ کے انتظام کے لئے پانچ اہم سرکاری افسر مقرر تھے جن میں شقدار اور منصفِ اعلیٰ انتظامی آفیسر تھے یہ دونوں "سرکار" کے افسران کے ماتحت ہوتے تھے اور ان کا کام بھی ان سے ملتا جلتا ہی تھا۔

ا۔ شقدار کے فرائض میں پرگنہ میں امن و امان قائم رکھنا اور باغیوں کا انسداد تھا۔ نیز شاہی فرمان پر عملدرآمد کرانا اور فوجی نوعیت کی ڈیوٹی سرانجام دینا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ شقدار پرگنہ کے افسرِ اعلیٰ کی حیثیت رکھتا تھا۔

ب۔ منصف پرگنہ کا دوسرا شاہی افسر تھا جس کے ذمہ انتظامی معاملات کو سلجھانا، مقدمات کا فیصلہ کرنا اور مالیہ وصول کرنے والے افسر "امین" کے کام کی نگرانی کرنا ہوتا تھا علاوہ ازیں قانون گو (خزانچی) پرگنے کے خزانے کا نگران ہوتا تھا۔ وہ کارکن پرگنہ کی آمدن حساب کتاب کا ریکارڈ رکھنے پر متعین تھے۔ ایک فارسی زبان میں اور دوسرا ہندی میں حساب کتاب ضبطِ تحریر میں لاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر پرگنے میں ایک قانون گو مزروعہ زمینوں کے ریکارڈ اور مالی امور کی نگرانی کے فرائض سرانجام دینے پر مامور تھا۔

دیہات

پرگنہ متعدد دیہات پر مشتمل ہوتا تھا اور دیہات کے انتظام و انصرام کے لئے چوکیدار، پٹواری اور مقدم مقرر تھے۔ دیہات کے باہمی تنازعات کا فیصلہ علاقائی روایات کے مطابق پنچائتیں کرتی تھیں۔ مقدم (نمبردار) کو دیہات میں اہم مقام حاصل تھا کاشتکاروں سے مالیہ وصول کرنا اور اسے شاہی خزانہ میں جمع کرانا اس کے فرائض میں داخل تھا۔

Marfat.com

شیر شاہ کا حکم تھا کہ سرکاری افسر بلا ضرورت دیہات کے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ ڈاکٹر سری واستوا شیر شاہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ:

"شیر شاہ نے دیہات کی خود مختاری کو برقرار رکھا اور دیہاتی کمیونٹی سے پٹواری اور چوکیدار کے ذریعے براہ راست رابطہ قائم کر کے اپنی اعلیٰ فہم و فراست کا ثبوت دیا۔ ہر گاؤں میں ایک پنچایت قائم تھی جو نہ صرف تنازعات کا تصفیہ کرتی تھی بلکہ دیہات کے تحفظ، تعلیم طفلاں، صحت و صفائی، آبپاشی اور دیگر معاملات کا بندوبست بھی کرتی تھی۔" [1]

عدالتی نظام

شیر شاہ سوری عدل و انصاف میں برصغیر پاکستان و ہند کا عمر دراز حکمران تھا۔ اس کا عدالتی نظام مثالی اور حق و انصاف پر مبنی تھا کیونکہ اس میں انصاف میں امیر یا غریب کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ وہ مذہب و ملت اور عزیز و اقارب کے امتیاز کے بغیر سب سے یکساں سلوک روا رکھنے کا حامی تھا اس کا مقولہ تھا کہ "انصاف سب سے بڑا مذہبی فریضہ ہے۔" شاہی خاندان کے افراد بھی شیر شاہی انصاف کے سامنے سرنگوں رہتے تھے۔ ہر اتوار، منگل، کی شام کو عام عدالتی اجلاس لگایا کرتا تھا جہاں فریادی عوام کی فوراً داد رسی کی جاتی تھی ملک میں باقاعدہ عدالتی نظام قائم تھا جس میں مندرجہ ذیل شاہی عہدیدار تھے:

۱۔ قاضی القضاۃ: چیف قاضی یا قاضی القضاۃ عدالت عالیہ کا سربراہ تھا۔ سارے سلطنت میں عدل و انصاف کی نگرانی کرتا تھا اور ماتحت قاضیوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں بھی سنتا تھا۔

۲۔ میر عادل: مرکزی دیوانی عدالت کا سربراہ تھا اور دیوانی مقدمات سنتا تھا۔

۳۔ قاضی: ہر اہم شہر اور سرکار (ضلع) میں قاضی مقرر تھے جو فوجداری مقدمات کی سماعت کرتے تھے۔

۴۔ منصفِ منصفان: سرکار (ضلع) میں دیوانی عدالت کا افسر اعلیٰ تھا اور صرف دیوانی مقدمات کی سماعت کرتا تھا۔

۵۔ منصف یا امین: پرگنے کی دیوانی عدالت کا سربراہ منصف یا امین کہلاتا تھا۔

---

[1] "دی مغل ایمپائر"، صفحہ ۱۰۶

Marfat.com

ہندوؤں کو اپنے باہمی تنازعات مقامی پنچائتوں سے طے کرانے کی اجازت تھی مگر فوجداری مقدمات صرف ملکی قانون کے مطابق ہی طے پا سکتے تھے۔ شیر شاہ ہر ایک مجرم کو بلا لحاظ منصب مرتبہ سزا دیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ کے انصاف کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ شاہی افراد اور اعلیٰ حکام بھی اس کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے وہ سخت سزائیں دیا کرتا تھا۔ اس کے انصاف کے سلسلے میں یہ واقعہ بے حد مشہور ہے کہ ایک مرتبہ اس کا بھتیجا ہاتھی پر سوار گذر رہا تھا کہ اس نے کسی صراف کی بیوی پر جبکہ وہ اپنے گھر میں نہا رہی تھی ایک ککوری پھینکی۔ صراف نے شیر شاہ سے شکایت کی۔ شیر شاہ نے فوراً حکم دیا کہ صراف بھی شہزادے سے ویسا ہی سلوک کرے۔

مالوہ کے گورنر شجاعت خاں نے دو ہزار سپاہیوں کی جاگیر پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ شیر شاہ کو معلوم ہوا تو وہ سخت برہم ہوا۔ باوجودیکہ شجاعت خاں نے جاگیر واپس کر دی لیکن وہ شیر شاہ کی سزا سے نہ بچ سکا۔ طبقات اکبری کے مصنف نظام الدین احمد کی تحریر سے مترشح ہے کہ شیر شاہ کے دورِ حکومت میں ہر تاجر اپنے مال کے لٹ جانے کے اندیشہ کے بغیر بے خوف و خطر سفر کر سکتا تھا اور جنگل میں سو سکتا تھا۔ شیر شاہ کے منصفانہ جلال اور عدالتی گرفت کے ڈر سے خود ڈاکو اور چور بھی تاجروں کے مال کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

پولیس نظام شیر شاہ کا پولیس نظام بڑا موثر اور مستعد تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں پولیس کا علیحدہ کوئی نظام نہ تھا بلکہ فوج ہی ملکی سرحدوں کی حفاظت کے علاوہ قیام امن کے لئے پولیس کے فرائض انجام دیتی تھی۔ سرکار (اضلاع) میں امن و امان کے تحفظ کی ذمہ داری شقدارِ شقداران پر تھی جو اپنے حلقہ اختیار کی حدود میں مکمل امن و امان قائم رکھنے کے فرائض ادا کرتا تھا۔ پرگنے میں یہی فرائض شقدار ادا کرتا تھا جس کے فرائض منصبی میں جرائم پیشہ عناصر پر کڑی نگاہ رکھنا اور انہیں سزا دلوانا بھی شامل تھا۔

دیہات میں قیام امن کے لئے شیر شاہ نے ہمیشہ مقامی ذمہ داری کے اصول کو ملحوظ رکھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ دیہات میں ہونے والے جرائم میں مقامی مقدم (نمبردار) یا کوئی بڑے زمیندار کا ہاتھ ہوتا ہے اور چوروں اور ڈاکوؤں کے متعلق انہیں پوری معلومات حاصل ہوتی ہیں اس لئے چوری یا ڈاکہ کی صورت میں مجرموں کا پتہ چلانے کی ذمہ داری مقدم پر ڈال دی جاتی تھی۔ مجرموں کا سراغ نہ ملنے کی صورت میں یا اوقات مقدم کو گرفتار کر لیا جاتا اور اسے اپنی رہائی کے عوض یا تو چور کی نشاندہی کرنا پڑتی یا چوری سے ہونے والے نقصان کی تلافی کرنا پڑتی تھی۔ قتل کی واردات کے سلسلے میں مقدم کو کچھ مہلت دی جاتی تاکہ وہ قاتل کا پتہ چلائے یا اس کی نشاندہی کرے ورنہ خود سزا بھگتے۔ اس مقامی ذمہ داری کے اصول کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں جرائم کا مکمل طور پر قلع قمع ہو گیا۔

Marfat.com

مسافر بلاخوف وخطر دور دراز کا سفر کرتے تھے ڈاکٹر قانونگو رقمطراز ہے کہ:

"مقامی ذمہ داری کا سسٹم قرون وسطیٰ کے زمانے کے عین موافق تھا۔"

قرون وسطیٰ کے تمام مورخین شیر شاہ کے پولیس نظام کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔ "شیر شاہ کے دورِ حکومت میں مسافر اور راہگیر سفر کے دوران اپنے تحفظ کی ذمہ داری سے مبرا اور جنگل میں قیام پذیر ہونے کے خطرات اور ڈر سے بالکل آزاد ہو گئے تھے وہ کسی خوف وخطر کے بغیر رات کو جنگل اور آبادی میں پڑاؤ ڈال دیتے۔ اپنے مال اور جانوروں کو بغیر کسی تحفظ و نگرانی کے چھوڑ کر اطمینان اور بے فکری کی نیند سوتے تھے جیسے وہ اپنے ہی گھروں میں آرام کر رہے ہوں۔ مقامی زمیندار یا مقدم اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں ان مسافروں کا نقصان نہ ہو جائے اور بعد میں ان کی جواب طلبی ہو خود ان کی نگرانی کرتے تھے۔"

"شیر شاہ کے دور میں ایک معذور اور ضعیف بوڑھیا اپنے سر پر سونے کے زیورات سے بھری ہوئی ٹوکری رکھ کر بغیر کسی خوف وہراس کے سفر کر سکتی تھی اور کوئی چور یا ڈاکو شیر شاہ کی شدید اور عگین سزا کے ڈر سے اسکے قریب آنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔"[1]

تجارت

شیر شاہ نے ملکی معاشیات کے استحکام اور تجارت کو ترقی پذیر کرنے کے لئے ان تمام گوناگوں ٹیکسوں کو منسوخ کر دیا جو ہر صوبے اور سرکار (اضلاع) کی سرحد اور ہر اہم شاہراہ کے ناکہ پر وصول کئے جاتے تھے بلکہ صرف دو قسم کے محصول رائج کئے ایک محصول اس وقت وصول کیا جاتا جب غیر ملکی مال مشرق میں سنارگاؤں اور مغرب میں رہتاس گڑھ یا کسی دیگر سرحد سے ملک میں داخل ہوتا تھا اور دوسرا محصول صرف مال کی فروخت کے وقت وصول کیا جاتا تھا۔ اگرچہ محصول کی حتمی شرح کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے تاہم اندازہ ہے کہ مال کی قیمت فروخت پر ۲½ فیصد سرکاری محصول وصول کیا جاتا تھا۔ شیر شاہ نے تمام داخلی محصولات منسوخ کر دیئے تھے ان اقدامات سے نہ صرف تجارت ترقی پذیر ہوئی بلکہ لوگ خوشحال ہو گئے۔ ملک کی معاشی حالت مستحکم ہو گئی۔

ذرائع رسل و رسائل

شیر شاہ سوری ہمیشہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ اس نے اپنے پانچ سالہ دورِ حکومت میں رفاہِ عامہ کے متعدد کام کئے جن کی وجہ سے برصغیر کی تاریخ میں اس کی شخصیت ایک نمایاں اور ممتاز مقام کی حامل ہے اس نے تجارت کو فروغ دینے کے لئے ملک میں سڑکوں کا جال بچھا دیا اس کی تعمیر کردہ چار سڑکیں اپنی شہرت کے لحاظ سے خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔ پہلی سڑک سنارگاؤں (مشرقی پاکستان)،

---

[1] عباس سروانی "تاریخ شیر شاہی"

Marfat.com

سے شروع ہو کر آگرہ، دہلی اور لاہور سے ہوتی ہوئی دریائے سندھ تک چلی گئی ہے اس کی لمبائی ڈیڑھ ہزار کوس تھی۔ یہ سڑک جرنیلی سڑک یا شاہراہ عظیم کے نام سے مشہور ہے۔ دوسری سڑک آگرہ سے مے کر نیا رس تک اور تیسری آگرہ سے جودھپور اور چتوڑ تک تعمیر کروائی۔ چوتھی سڑک لاہور اور ملتان کو ملاتی تھی۔ یہ سڑکیں ایک منصوبہ کے تحت تعمیر کی گئیں کیونکہ یہ اہم شہروں سے ہوتی ہوئی گذرتی تھیں۔ ان سڑکوں پہ دونوں طرف سایہ دار درخت لگوائے اور ہر دو کوس کی مسافت پہ سرائیں تعمیر کروائیں جن کی کل تعداد سترہ سو تھی۔ ان سراؤں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ خوراک اور رہائش کا انتظام تھا۔ ہر سرائے کے ساتھ مسجد اور کنواں تعمیر کیا گیا۔ مسجد کے لئے امام اور مؤذن اور مسافروں کے سامان کی حفاظت کے لئے چوکیدار مقرر تھے۔ سراؤں کے دروازوں پہ ٹھنڈے پانی کے مٹکے رکھوائے تاکہ راہ چلتے مسافر اپنی پیاس بجھا سکیں۔ سراؤں میں محکمہ جاسوسی اور ڈاک کے ملازمین کے آرام اور رہنے کے لئے اور ان کے گھوڑوں کے تحفظ کا باقاعدہ انتظام کیا۔ امن و امان کے قیام اور جرائم کے انسداد کے لئے ہر سرائے میں پولیس افسر شقدار کو متعین کیا ان سراؤں کے اخراجات کی کفالت کے لئے نواحی علاقے کی کچھ زمین وقف کر دی جاتی تھی۔

سڑکوں کی تعمیر اور سراؤں کے قیام سے نہ صرف محکمہ جاسوسی اور ڈاک کو بہت فروغ ہوا بلکہ ملکی تجارت ترقی پذیر ہوئی اور ملک کو معاشی استحکام ملا۔ سڑکوں پہ سراؤں کا قیام اگرچہ سلاطین دہلی کے دور میں بھی موجود تھا لیکن شیر شاہ نے اسے مزید بہتر بنایا بقول ڈاکٹر قانونگو "یہ سڑکیں اور سرائیں گویا سلطنت کی رگیں تھیں جو شیر شاہ سوری کے انتظام سلطنت کی کامیابی کی ضامن ثابت ہوئیں کیونکہ ان کے ذریعے نہ صرف فوجوں کی آمد و رفت میں سہولت اور آسانی پیدا ہو گئی بلکہ تجارت بھی ترقی پذیر ہوئی۔"

عمارات

شیر شاہ سوری کو عمارات تعمیر کرانے کا بہت شوق تھا۔ دہلی کا پرانا قلعہ اور قلعہ رہتاس گڑھ (جہلم) اس کی مشہور ترین عمارتیں ہیں ڈاکٹر قانونگو رقمطراز ہے کہ:

"شیر شاہ ملکی دفاع کے استحکام کے لئے ہر سرکار (ضلع) میں قلعہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن وہ اپنے مختصر ترین دور حکومت کی وجہ سے اپنے اس جامع منصوبہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔"

اس نے اپنے تعمیر کردہ دہلی کے پرانا قلعہ میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کروائی جو فن تعمیر کا ایک نادر شاہکار ہے۔

سہسرام (بہار) میں شیر شاہ کا اپنا مقبرہ سوری خاندان کے فن تعمیر کا ایک بے نظیر شاہکار ہے۔ یہ مقبرہ ایک مصنوعی جھیل میں بلند چبوترے پر واقع ہے جو فن تعمیر کے لحاظ سے اسلامی

Marfat.com

اور مبدد فنِ تعمیر کے امتزاج کی ایک بہترین مثال ہے۔ اگرچہ اس مقبرہ کا بیرونی حصہ سادہ ہے لیکن اندرونی حصہ دلکشی، زیبائش اور شان و شوکت کا مرقع ہے مشہور مؤرخ ہیول کی رائے ہے کہ

"یہ مقبرہ شیر شاہ کی باوقار شخصیت کی زندہ تصویر ہے۔"

سکہ جات

شیر شاہ نے ملکی کرنسی کی از سر نو اصلاح کی اور معیاری سکے جاری کئے اس کے رائج کردہ سکے ساخت اور نفاست میں لاجواب ہیں شیر شاہ نے سابق حکمرانوں کے تمام سکے ختم کر دیئے اور نئے سکے جاری کئے جو بناوٹ میں گول اور وزن میں معیاری اور ساخت و نفاست میں دیدہ زیب تھے سونے اور چاندی کے سکوں کے علاوہ اس نے تانبے کے سکے بھی جاری کئے جو دام کہلاتے تھے اس نے سکوں کو عام آدمی تک کی غرض سے ۱/۲، ۱/۴، ۱/۸، ۱/۱۶ کے حساب سے چھوٹے سکوں میں تقسیم کیا۔ ان سکوں پر ایک طرف بادشاہ کا نام، سن اور سنٹ (ٹکسال) کا نام فارسی اور ناگری رسم الخط میں تحریر تھا اور دوسری طرف درمیان میں کلمہ اور اس کے چاروں طرف خلفائے راشدین کے اسمائے مبارکہ بھی کندہ ہوتے تھے شیر شاہ کے جاری کردہ سکوں کو اب بھی قومی عجائب گھر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

شیر شاہ کے معیاری سکوں کے اجرا سے مالی نظام بہتر ہوا اور تجارت میں زبان آسانی اور سہولت پیدا ہو گئی۔ شیر شاہی سکوں کے معیار کو مغلوں اور انگریزوں نے بھی قائم رکھا یاد رہے کہ اعشاری نظام رائج ہونے کے باوجود لوگوں نے ذہنوں سے یہ تصور کلی طور پر محو نہیں ہو سکا کہ ایک روپیہ کے سولہ آنے، آٹھ دونیاں، چار چونیاں اور دو اٹھنیاں ہوتی تھیں۔

جاسوسی نظام

سلطنت کے امور سے باخبر رہنے کے لئے شیر شاہ سوری نے علاء الدین خلجی کے جاسوسی نظام کو دوبارہ رائج کیا اور داروغہ ڈاک چوکی کو محکمہ جاسوسی کا سربراہ مقرر کیا جس کے ماتحت متعدد مخبر اور جاسوس تعینات کئے جو بادشاہ کو ملک بھر کے اہم واقعات و حالات اور مختلف علاقوں میں اشیاء کے بھاؤ سے باخبر رکھتے تھے۔ خبر رسانی اور جاسوسی کا یہ نظام اس قدر منظم اور مستعد تھا کہ شیر شاہ تمام علاقوں کے حالات و واقعات سے آگاہ ہو جاتا تھا اور بغاوتوں اور شورشوں کے خلاف بروقت اور مؤثر اقدام کر سکتا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ شیر شاہ کے بہترین نظام سلطنت کا انحصار بڑی حد تک اس کے کامیاب نظام جاسوسی پر تھا۔ شاہی ڈاک کی ترسیل تیز رفتار ہرکاروں کے ذریعہ ہوتی تھی جن کے لئے ہر سرائے میں تازہ دم اور برق رفتار گھوڑے ہر وقت تیار رکھے جاتے تھے۔

خیرات اور عوام کی بہبود

شیر شاہ کو اس بات کا کامل احساس تھا کہ بادشاہ کا فرض محض حکمرانی نہیں کہ ملک میں امن و امان کو برقرار رکھے اور

Marfat.com

اسے بیرونی خطرات سے محفوظ رکھے بلکہ عوام کی اخلاقی اور مادی بہبود بھی اس کا فرض منصبی ہے چنانچہ اس نے نادار اور بے سہارا عوام کی بہبود و امداد کے لئے نہ صرف امدادی و خیراتی ادارے قائم کئے بلکہ ان کی نہایت فراخدلی سے سرپرستی کی۔ اس کا شاہی لنگر خانہ جس سے ہزارہا مستحقین، لاچار، معذور لوگوں اور مسافروں کو کھانا میسر آتا تھا، کا یومیہ خرچ پانچسو اشرفی تھا۔ مزید براں شیر شاہ نے عوام کی بہبود پر بے دریغ روپیہ خرچ کرنے کے علاوہ علماء طالب علموں اور مساجد کے آئمہ کو وظائف دینے کا اہتمام کیا اور علم و ادب کی سرپرستی بھی کی۔ اس نے غریبوں اور مسکینوں کے لئے ملک میں جا بجا لنگر خانے قائم کئے۔

مذہبی پالیسی

شیر شاہ سوری شرعی احکام کا پابند ایک سنی مسلمان تھا اور مذہب کے معاملے میں تعصب اور تنگ نظری سے بالا، رواداری کی حکمت عملی کا حامی تھا غیر مسلم رعایا سے اس کا سلوک مشفقانہ تھا۔ ڈاکٹر قانونگو اس کی رواداری کی پالیسی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "شیر شاہ ہندوؤں کے ساتھ رواداری کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ اس کا یہ رویہ حقارت آمیز نہ تھا بلکہ وہ ہندوؤں کو عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔" اس نے ہندوؤں کو نہ صرف سلطنت کے اہم عہدوں پر متعین کیا بلکہ ہندوؤں میں اشاعتِ تعلیم کے لئے بھاری رقوم صرف کیں۔ سراؤں میں ہندوؤں کے قیام کا علیحدہ بندوبست کیا اور ہندی ادب کی ترقی کے لئے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ اپنے نئے رائج کردہ سکوں پر ناگری رسم الخط میں اپنا نام کندہ کروایا۔ ایسا کرنے سے بقول ڈاکٹر سری واستوا:

> "شیر شاہ مسلمانوں کو ناراض کئے بغیر ہندوؤں کی ہمدردیاں جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔ محکمہ مال اور جاسوسی میں کثیر تعداد میں ہندوؤں کی تعیناتی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ شیر شاہ نے اپنی ہندو رعایا سے روادارانہ پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔"

نظامِ مالیہ

شیر شاہ سوری کی حیران کن فتوحات اور اس کے دیگر سنہری کارناموں کو اگر تاریخ کے صفحات سے خارج کر دیا جائے تب بھی اس کا نام محض اپنے نظام مالیہ کی منفرد خوبیوں کی وجہ سے برصغیر کی تاریخ کی پیشانی پر درخشندہ ستارے کی مانند چمکتا رہے گا کیونکہ اس نے نظم و نسق کو سنوارنے کے علاوہ مالیہ کی وصولی کے لئے گراں قدر اصلاحات نافذ کر کے زراعت کو ترقی دی۔ علاؤالدین خلجی کے سوا قرونِ وسطیٰ کے حکمرانوں میں کسی نے بھی زمین کی پیمائش نہیں کروائی تھی لیکن شیر شاہ نے تمام مزروعہ زمینوں کی پیمائش کروائی اور نہایت ہی منصفانہ شرح مالیہ مقرر کی۔ شیر شاہ کے پاس مکمل اور آزمائش شدہ مالیہ کا نظام موجود تھا جسے وہ اپنے باپ کی جاگیر سہسرام میں آزما چکا تھا، ماہر معاشیات ہونے کی وجہ سے امورِ مالیات میں خاصہ تجربہ رکھتا تھا نظامِ

Marfat.com

مالیہ کے لئے اس کی نافذ کردہ اصلاحات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :-

۱۔ زمین کی پیمائش : سکندری گز کو معیاری پیمانہ قرار دیتے ہوئے رسی کی جریب سے سلطنت کی تمام مزروعہ زمین کی پیمائش کروائی۔ ساری زمین کو بیگھوں میں تقسیم کیا ۳۶۰۰ سکندری مربع گز کا ایک بیگھہ قرار دیا۔ ہر بیگھہ کا الگ الگ خسرہ نمبر متعین کیا اور ایک مقررہ رجسٹر میں ان کے ضابطہ اندراج کا اصول متعین کیا۔ پیداواری لحاظ سے اچھی، درمیانہ اور معمولی زمین کی پیداوار کے اعداد جمع کر کے پیمائش شدہ زمین کے فی بیگھہ پیداواری اوسط کا تعین کیا۔ راجپوتانہ، مالوہ اور ملتان میں پیمائش کا یہ طریقہ اختیار کرنے کی بجائے قدیم جاگیرداری سسٹم کو برقرار رکھا گیا۔

۲۔ مالیہ کی شرح : زمین کی پیمائش اور اسے بیگھوں میں تقسیم کرنے اور ہر بیگھہ کی پیداواری اوسط معلوم کرنے کے بعد مالیہ کی سرکاری شرح مقرر کی گئی۔ پروفیسر قانونگو کا خیال ہے کہ شیر شاہ نے اوسط پیداوار کا ۱/۴ حصہ سرکاری حصہ مقرر کیا جبکہ ڈاکٹر سرن اور ڈاکٹر ترپاٹھی کی رائے میں شیر شاہ نے اوسط پیداوار کا ۱/۳ حصہ بطور سرکاری مالیہ وصول کرنے کا حکم نافذ کیا تھا۔ تاہم اتفاق رائے ۱/۳ پر ہے مگر کاشت کاروں کو یہ اجازت تھی کہ وہ اپنی پیداوار کے مطابق نقدی کی بجائے جنس کی صورت میں بھی مالیہ ادا کر سکتے ہیں۔ تاہم نقدی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ کاشت کاروں سے مالیہ وصول کرنا اور اسے سرکاری خزانہ میں جمع کرانا مقدم (ممبردار) کے فرائض میں داخل تھا۔

۳۔ تشخیصِ مالیہ (پٹہ اور قبولیت) : مالیہ کی تشخیص کے بعد شاہی آفیسر (امین) کاشت کار کو ایک پٹہ دیتا تھا جس میں اس کی زمین کے رقبے کے علاوہ مالیہ کی واجب الادا رقم کا اندراج ہوتا تھا اس کے جواب میں امین، کاشتکار یا زمیندار سے دستخط شدہ قبولیت وصول کرتا تھا جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ حکومت کا تشخیص کردہ مالیہ کاشت کار کو قبول ہے۔

نظام مالیہ کا مندرجہ بالا سسٹم ساری سلطنت میں رائج نہ تھا بلکہ راجپوتانہ، مالوہ اور ملتان میں مالیہ کی تشخیص اور وصولی کا قدیم جاگیرداری سسٹم برقرار رکھا گیا جو غلہ بخشی یا بٹائی، لنک یا مکتائی اور نقدی یا ضبطی سسٹم کے تین طریقوں پر مشتمل تھا۔

ا۔ **غلہ بخشی یا بٹائی :** سرکاری افسر فصل کی کٹائی کے وقت کھیت پر پہنچ جاتے اور پیداوار کے تین حصے کر کے ایک حصہ بطور سرکاری مالیہ وصول کر لیتے۔

ب۔ **لنک یا مکتائی :** اس کی رو سے بعض اوقات حکومت کے کارکن اور زمیندار قبل از وقت

Marfat.com

پیداوار کا اندازہ لگا کر سرکاری مالیہ مقرر کر لیتے۔

ج۔ **نقدی یا ضبطی سسٹم:** سرکاری افسر پچھلے کئی سالوں کی پیداوار کا اوسط نکال کر فی بیگھہ مالیہ مقرر کر لیتے تھے اور زمیندار کے متفق ہونے پر مالیہ تشخیص کر لیا جاتا تھا۔

۴۔ جریبانہ و دیگر ٹیکس:

سرکاری مالیہ کے علاوہ زمیندار کو تین ٹیکس بھی ادا کرنے ہوتے تھے۔

ا۔ جریبانہ ٹیکس یا پیمائش ٹیکس جس کی شرح ۲½ سے ۵ فیصد ہوتی تھی۔ یہ زمین کی پیمائش کرنے والے افسران کو ادا کرنا ہوتا تھا۔

ب۔ محاصلانہ Mahasilana ٹیکس جس کی شرح بھی ۲½ سے ۵ فیصد ہوتی تھی یہ مالیہ وصول کرنے والے افسر کو بطور عوضانہ ادا کرنا ہوتا تھا۔

ج۔ دہ اسٹری Dah-Astri ٹیکس سات چھٹانک فی بیگھہ کی شرح سے گاؤں کے مشترکہ اخراجات کے لئے وصول کیا جاتا تھا۔

شیر شاہ کی طرف سے سرکاری اہل کاروں کو ہدایت تھی کہ مقررہ ٹیکسوں کے علاوہ مزید کچھ بھی وصول نہ کیا جائے۔

۵۔ زمینداروں کی بہبود کے لئے ہدایت:

شیر شاہ کو ہمیشہ اپنی رعایا کا مفاد ملحوظ رہتا تھا فیروز شاہ تغلق کے بعد شیر شاہ پہلا افغان بادشاہ تھا جو زمینداروں کی فلاح و بہبود کو اوّلین حیثیت دیتا تھا کیونکہ اس کا مقولہ تھا کہ سارے ملک کی بہتری کا دارومدار ملک کے لاکھوں کسانوں کی بہتری پر ہے۔ چنانچہ

ا۔ محکمہ مال کے افسران کو خصوصی ہدایت تھی کہ مالیہ تشخیص کرتے وقت نرمی روا رکھیں لیکن وصولی کے وقت کسی قسم کی رو رعایت نہ کریں۔

ب۔ فوج کو ہدایت تھی کہ فصلوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے لیکن اگر فوجی نقل و حرکت کے وقت راستہ کی تنگی کی وجہ سے فصلوں کو نقصان پہنچ جائے تو باقاعدہ طور پر زمینداروں کو اس کا عوضانہ ادا کیا جائے۔

ج۔ قحط سالی یا فصلوں کی تباہی کی صورت میں نہ صرف مالیہ معاف کرنے کا اعلان کیا بلکہ نقادی قرضے جاری کرنے کا حکم صادر کیا جو معمولی اور آسان قسطوں میں واپس کئے جا سکتے تھے۔

نتائج شیر شاہ کا نظام مالیہ آئندہ بادشاہوں خصوصاً مغلوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ زمین کی باقاعدہ پیمائش اور ہر ٹکڑے کی علیحدہ ملکیت مقرر کر کے

Marfat.com

خسرہ نمبر الاٹ کرنے سے زمین کی قدر و قیمت بڑھ گئی اس مالیاتی نظام سے نہ صرف حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوا بلکہ کسانوں کی بھی کایا پلٹ گئی۔

نظام مالیہ حکومت اور کسانوں دونوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا کیونکہ اس نظام کے نفاذ کی بدولت کسانوں کو قبل از وقت واجب الادا مالیہ معلوم ہو جاتا تھا۔ اسی طرح حکومت کو بھی پیش از وقت اپنی آمدنی سے آگاہی ہو جاتی تھی۔ مزید براں شیر شاہی نظام مالیہ کی وجہ سے نہ صرف زراعت ترقی پذیر ہوئی بلکہ کاشتکار خوشحال ہو گئے۔ مورخین کی متفقہ رائے ہے کہ شیر شاہ اگر چند سال اور زندہ رہتا تو کاشتکار طبقہ اتنا خوشحال ہو جاتا کہ زمیندار طبقہ بالکل ناپید ہو جاتا۔

اکبر کا پیشرو

شیر شاہ ۶۸ سال کی پختہ عمر میں برصغیر پاک و ہند کا شہنشاہ بنا وہ کہا کرتا تھا افسوس کہ میرے ہاتھ اس وقت اقتدار آیا جب میری زندگی کی شام ہو چکی تھی۔ شیر شاہ کو صرف پانچ سال بادشاہت کرنے کا موقعہ ملا مگر اس قلیل عرصے میں اس نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے وہ ہمیشہ اس کے نام کو تاریخ میں زندہ رکھیں گے مورخین نے بجا طور پر اسے اکبر کا پیشرو قرار دیا ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر کی اکثر اصلاحات شیر شاہ کے انتظامی خطوط پر ہی نافذ کی گئیں جن میں فوجی اور مالیاتی نظام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اکبر نے شیر شاہ کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے گوناگوں اصلاحات نافذ کیں۔ شیر شاہ نے بلا تمیز مذہب و ملت رواداری کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے اپنی رعایا کو مذہبی آزادی عطا کی اور غیر مسلموں سے بہتر سلوک روا رکھا۔ اکبر نے بھی شیر شاہ کی مانند رواداری کی پالیسی اختیار کی اور نہ صرف غیر مسلموں سے بہتر سلوک کیا اور جزیہ ٹیکس اور یاترا (پلگرام) ٹیکس معاف کیا بلکہ ایک نیا مذہب دین الٰہی رائج کر کے عقیدہ اور نظریاتی طور پر مسلمان اور ہندو کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اکبر نے شیر شاہ کے نقش قدم پر چل کر ہی مذہبی آزادی دی لیکن دونوں کی مذہبی پالیسی میں بہت فرق تھا کیونکہ شیر شاہ پختہ عقیدے کا سنی مسلمان تھا اور اس نے ہندوؤں کے خلاف جنگ کو جہاد قرار دیا تھا جبکہ اکبر مذہبی عقائد اور نظریاتی طور پر آزاد خیال ہو گیا تھا۔

شیر شاہ نے فوجی اصلاحات نافذ کرتے ہوئے ایک مرکزی فوج قائم کی اور فوج کو نقد تنخواہ دینے کا طریقہ رائج کیا نیز اس نے علاؤ الدین خلجی کی مانند فوجی گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ بھی رائج کیا اور ساتھ ہی سپاہیوں اور فوجی گھوڑوں کے حلیئے وغیرہ ریکارڈ کرنے کا اہتمام کیا۔ اکبر اعظم نے بھی فوجی اصلاحات نافذ کرتے وقت شیر شاہ کے جاری کردہ خطوط کو مدنظر رکھا اور نہ صرف جاگیرداری سسٹم ختم کر کے منصبداری نظام رائج کیا بلکہ باقاعدہ شیر شاہ کی طرح فوج اور منصبداروں کو نقد تنخواہ دینے کا اہتمام کیا۔

Marfat.com

شیر شاہ سوری نے بہتر نظام سلطنت نافذ کر کے مغلیہ نظام سلطنت کے لئے ایک خاکہ مہیا کیا۔ اس کی انتظامی صلاحیت مسلمہ تھی اور اس کا پانچسالہ عہد حکومت برصغیر کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکبر اعظم نے مغلیہ نظام سلطنت کی استواری کے لئے شیر شاہ کے نظام سلطنت اور نظام مالیہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ اکبر اعظم کا نافذ کردہ نظم و نسق جس شخص (راجہ ٹوڈرمل) کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مرہون منت تھا۔ وہ بھی درحقیقت شیر شاہ سوری کا ہی ایک تربیت یافتہ افسر تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اکبر اس لحاظ سے خوش قسمت بادشاہ تھا کہ اسے شیر شاہ سوری کا نظام ورثے میں ملا جس کے خطوط پر چل کر اس نے شہرت دوام حاصل کی اور اکبر اعظم کہلایا۔ اس لئے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شیر شاہ سوری کا عہد حکومت اکبر اعظم کے لئے مشعل راہ تھا اور وہ ہر طرح سے اکبر کا پیشرو تھا۔

شیر شاہ سوری کا کردار

شخصیت

شیر شاہ سوری تاریخ کی ان نامور اور شہرہ آفاق شخصیتوں میں سے ہے جنہوں نے پستی سے ابھر کر عظمتوں کا بلند مقام حاصل کیا اور اپنی بہادری، قابلیت اور طاقت کے بل بوتے پر نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ شیر شاہ کی پرورش نہ کسی شاہی خاندان میں ہوئی تھی اور نہ وہ کسی بڑے مذہبی یا فوجی رہنما کے خاندان کا چشم و چراغ تھا وہ محض اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر شہرت و عظمت کے عروج تک پہنچا اور پاک و ہند کا شہنشاہ بن گیا وہ ایک نیک دل، جرأت و استقلال کا پیکر اور ناقابل تسخیر قوت ارادی کا مالک تھا وہ نہ صرف ایک مشفق اور انصاف پسند حکمران تھا بلکہ موقعہ شناس اور مدبر سیاستدان تھا اور دشمن کی خامیوں سے فائدہ اٹھانا خوب جانتا تھا۔

شیر شاہ کی تمام زندگی آغاز تا انجام مسلسل جد و جہد اور بلند حوصلگی کی مظہر تھی اگرچہ بادشاہ بننے کے وقت وہ کافی معمر تھا مگر اس کے عزم و ارادہ اور قوت عمل میں نوجوانوں جیسا جوش و خروش تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ "بلند مرتبہ لوگوں کو ہمیشہ سرگرم عمل رہنا چاہیئے" مذہبی رواداری، عوامی بہبود اور معاشرتی اصلاح جیسے اعلیٰ و ارفع اصول اس کی زندگی کے نصب العین تھے۔

اس کا روزمرہ کا معمول

شیر شاہ سوری ۶۸ سال کی پختہ عمر میں برصغیر کا شہنشاہ بنا لیکن پیرانہ سالی کے باوجود اس کی بلند حوصلگی، آہنی قوت ارادی اور مسلسل جد و جہد میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ امور سلطنت کی دیکھ بھال میں وہ ہمیشہ نوجوانوں کی سی

Marfat.com

مستعدی اور جدوجہد کا مظاہرہ کرتا تھا۔ مورخین کی متفقہ رائے ہے کہ وہ دن بھر میں سولہ گھنٹے سے بھی زیادہ وقت امورِ سلطنت کی نگہداشت پر صرف کرتا تھا۔

عباس سروانی اور رزق اللہ مشتاقی دونوں مورخین ہمیں بتاتے ہیں کہ "شیر شاہ سوری کا معمول تھا کہ وہ ہر روز رات کے پچھلے پہر بیدار ہو جاتا اور تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر امورِ سلطنت میں مشغول ہو جاتا تھا حتیٰ کہ نماز فجر کا وقت ہو جاتا۔ فجر کی نماز بالعموم وہ اپنے امرائے دربار کی معیت میں باجماعت ادا کرتا۔ ازاں بعد سب سے پہلے مختلف شعبہ جات کے افسران سے دن بھر کے تمام واقعات سے آگاہی حاصل کرتا۔ چار گھنٹے تک وہ مختلف علاقوں سے آئی ہوئی رپورٹیں سنتا اور پھر اپنے احکامات جاری کرتا۔ اس کے بعد سرداروں اور سپاہیوں کے ہمراہ خود جا کر فوج کا معائنہ کرتا۔ گھوڑوں کے داغنے کی بابت دریافت اور نئے سپاہیوں کی بھرتی کی نگرانی کرتا۔ اس کے بعد ناشتہ سے فارغ ہو کر دربار منعقد کرتا اور امورِ سلطنت کی انجام دہی میں مصروف ہو جاتا۔ حسابات کی جانچ پڑتال کرتا، ملک کے چاروں طرف سے موصول شدہ اپیلوں کا فیصلہ صادر کرتا، بیرونی ممالک کے نمائندوں اور سفیروں سے ملاقات کرنا یہ اس کا سب سے زیادہ اور روزمرہ کا معمول تھا۔ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد بادشاہ تھوڑی دیر آرام کرتا تھا اور امورِ سلطنت سے متعلق کوئی اہم مصروفیت نہ ہونے کی صورت میں شام تک تلاوتِ قرآن مجید میں مصروف رہتا تھا۔" [1]

بحیثیت انسان

شیر شاہ سوری کا بچپن اس کی سوتیلی ماں کے مخالفانہ اور حاسدانہ رویہ کی وجہ سے بہت ناگفتہ بہ حالات میں بسر ہوا۔ یہ گھریلو ماحول کا اثر تھا کہ اس میں ایک متمول گھرانے کی سی شائستگی اور حلیمی نہ تھی لیکن بحیثیت انسان وہ فرض شناس، ہمت و استقامت کا پیکر اور جفاکش انسان تھا اگرچہ وہ ۶۸ سال کی عمر میں تختِ شاہی پر متمکن ہوا تھا لیکن اس نے امورِ سلطنت کی تشکیل و تکمیل میں ہمیشہ نوجوانوں کی سی گرم جوشی اور تندہی کا مظاہرہ کیا وہ اس قدر منتظم اور محنتی تھا کہ امورِ سلطنت کی انجام دہی کے لئے ہر روز سولہ گھنٹے لگاتار کام کرتا تھا۔ اس نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کبھی کاہلی اور بے دلی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنے اصولوں کا کاربند اور احساسِ فرض کا پابند رہا۔ اگرچہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور شعائرِ اسلامی کا سختی سے پابند تھا لیکن اس نے اپنی غیر مسلم رعایا کو ہر قسم کی مذہبی آزادی عطا کر رکھی تھی وہ رحم دل، نیک سیرت، خدا ترس، روادار اور انصاف پسند حکمران تھا اپنا بیشتر وقت تلاوتِ قرآن حکیم اور مذہبی فرائض کی انجام دہی میں گزارتا تھا۔ اگرچہ وہ مذہبی تعصب اور

---

[1] "واقعات مشتاقی"

Marfat.com

طبقاتی نفرت کے دور میں صاحبِ اقتدار ہوا لیکن اس نے رواداراتہ پالیسی اپنائی اور دوسروں کو بھی ہمیشہ رواداری کا سبق دیا۔ اس نے نہ صرف ہندوؤں کو مذہبی آزادی دی بلکہ انہیں سلطنت کے اہم عہدوں پہ فائز کیا۔ شیر شاہ سوری کو مطالعہ تاریخ سے بہت زیادہ دلچسپی تھی عربی اور فارسی زبان پہ اسے عبور حاصل تھا چونکہ خود صاحبِ علم اور علم دوست تھا اس لئے تعلیم و تعلّم کی اشاعت کا دلدادہ تھا اور علماء و فضلاء کا قدردان تھا۔ علاوہ ازیں وہ فن تعمیر سے بھی گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔ تمام مؤرخین اس کی علم دوستی اور ادبی سرپرستی کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

بحیثیت جرنیل

شیر شاہ نے اگرچہ اپنی زندگی کا آغاز ایک سویلین کی حیثیت سے کیا تھا لیکن وہ فنون حرب سے بھی واقفیت رکھتا تھا اپنے باپ کی جاگیر کے منتظم کی حیثیت سے اسنے باغی زمینداروں کے خلاف کامیاب فوجی کارروائی کر کے پہلی بار ایک تجربہ کار سپاہی ہونے کا ثبوت دیا۔ بعدازاں اس نے مغل بادشاہ ہمایوں کو جنگ چوسہ اور جنگ قنوج میں شکست دے کر ایک تجربہ کار سپہ سالار کی حیثیت سے اپنی شخصیت کا لوہا منوایا۔ دہلی اور آگرہ کا بادشاہ بن کر اور حیران کن فتوحات حاصل کر کے اس نے نہ صرف ایک آزمودہ کار جرنیل ہونے کا ثبوت دیا بلکہ اپنی خداداد فوجی قابلیت کی بدولت شہنشاہ کے منصب جلیلہ تک جا پہنچا۔ ایک آزمودہ کار جرنیل کی حیثیت سے اس نے ہر جنگ میں اپنی عسکری صلاحیت اور اپنی مدبرانہ جنگی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ میدان جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وہ ہر ایک حربہ کو بروئے کار لانا جائز سمجھتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی فتح کے بعد قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ کا مظاہرہ نہ کیا۔ جنگی قیدیوں سے اس کا سلوک ہمیشہ فیاضانہ ہوتا تھا۔ جنگ کے ایام میں وہ اپنی فوج کے ہر قسم کے مصائب میں برابر کا شریک ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی فوج میں بڑا ہر دلعزیز تھا۔ چوسہ کی لڑائی سے قبل جب ہمایوں کے سفیر اسے ملنے گئے تو انہوں نے اسے اپنے سپاہیوں کے ہمراہ مورچے کھودتے ہوئے پایا۔

بحیثیت حکمران

شیر شاہ ایک جلیل القدر اور عظیم المرتبت حکمران تھا وہ سلاطین دہلی میں پہلا سامان فرمانروا تھا جس نے مختصر عہدِ حکومت میں گوناگوں مگر مفید اصلاحات نافذ کر کے تاریخ میں شہرتِ دوام حاصل کی۔ چنانچہ آنے والے حکمرانوں بالخصوص اکبر اعظم کے لئے اس کی اصلاحات مشعلِ راہ ثابت ہوئیں اسی وجہ سے اسے اکبر کا پیشرو بھی کہا جاتا ہے وہ رواداری کی پالیسی کا حامی تھا اس نے ہندوؤں کو سلطنت کے اہم مناصب عطا کئے۔

شیر شاہ سوری عدل گستری میں بلند مقام رکھتا تھا اس کے دربارِ عدل میں ہر فریادی کی

Marfat.com

رسائی ممکن تھی۔ انصاف کے معاملہ میں وہ اپنے رشتہ داروں کا بھی کوئی لحاظ نہ کرتا تھا وہ مالی طرف اور ایک شفق حکمران تھا اسکی طرف سے شاہی خزانے سے ہر روز ایک ہزار رقم غریبوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ غریبوں اور محتاجوں کے لئے لنگر خانے قائم تھے جن کا یومیہ خرچ پانچسو اشرفی تھا۔ اس نے ملک بھر میں مسافروں کے آرام کے لئے سڑکیں بنوائیں جن کے دو رویہ سایہ دار درخت لگوائے اور ہر دو کوس کے فاصلے پر سرائیں بھی تعمیر کرائیں تاکہ مسافر وہاں آرام کر سکیں۔ شیر شاہ نے عوام کی سہولت کے لئے ڈاک کا انتظام بھی کیا۔ بحیثیت حکمران وہ ایک کامیاب ترین حکمران تھا۔ ایک فرض شناس حکمران کی حیثیت سے رعایا کی فلاح و بہبود اس کا سب سے بڑا نصب العین تھا۔ اس نے نظم و نسق کو استوار کرنے کے لئے دن رات محنت کی اگرچہ وہ ایک مطلق العنان بادشاہ تھا لیکن اس کی مطلق العنانی فرض شناسی اور خلق خدا کی خدمت کے لئے بے پناہ جذبہ سے عبارت تھی۔ وہ حکومت کے ہر شعبے کی خود نگرانی کرتا تھا بلاشبہ اس کا نظام سلطنت مثالی تھا جس کے خطوط پر اکبر اعظم نے مغلیہ نظام سلطنت کو استوار کیا۔

شیر شاہ سوری کے جانشین

"مطلق العنان طرز بادشاہت کی یہ بدقسمتی ہے کہ اعلیٰ حکمرانوں کے جانشین اہل اور قابل حکمران ثابت نہیں ہوتے" [1] ایچ۔ جی۔ کینے

شیر شاہ سوری کے جانشین عادل خاں اور جلال خاں اس کا صحیح نعم البدل ثابت نہ ہوئے جس سے سوری سلطنت زوال پذیر ہوئی اور افغان جذبۂ قومیت اور باہمی اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا۔ حکومت کا انتظام منتشر اور فوجی نظام درہم برہم ہو گیا۔ ۲۲۔ مئی ۱۵۴۵ء کو کالنجر کے مقام پر شیر شاہ کی وفات کے وقت اس کا بڑا لڑکا عادل خاں رنتھمبور کے دور افتادہ مقام پر مقیم تھا۔ چنانچہ امرا نے اس کے چھوٹے لڑکے جلال خاں کو جو کالنجر سے صرف پچاسی میل کے فاصلے پر واقع ریوا (REWA) میں تخت نشین کر دیا۔ جلال خاں اسلام شاہ کا لقب اختیار کر کے ۲۷۔ مئی ۱۵۴۵ء کو تخت پر بیٹھا۔ اس نے ۱۵۵۳ء تک حکومت کی۔

اسلام شاہ سوری : ۱۵۴۵ء تا ۱۵۵۳ء

اسلام شاہ کا اصل نام جلال خاں تھا۔ وہ شیر شاہ کا چھوٹا بیٹا تھا وہ اعلیٰ انتظامی قابلیت کا مالک اور ایک تجربہ کار

---

[1] "دی نال آف دی مغل ایمپائر"

Marfat.com

جرنیل تھا۔ فارسی اور ہندی زبانوں پر اسے پورا عبور حاصل تھا اسلام شاہ فارسی اور ہندی کا شاعر اور مختلف علوم و فنون کا سرپرست بھی تھا۔ اس کے عہد میں شعر و ادب اور علوم و فنون کو خوب ترقی ہوئی وہ بنیادی طور پر ایک سپاہی تھا۔ اس لئے اس نے تخت نشین ہوتے ہی مرکزیت کے استحکام، ملکی انتظام اور امن و امان کی بحالی کی طرف توجہ مبذول کی۔ مستعدی اور انتظامی قابلیت میں بلاشبہ وہ اپنے باپ کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔

اسلام شاہ ۲۷۔ مئی ۱۵۴۵ء کو کالنجر کے مقام پر تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے عہد کا آغاز کالنجر کے راجہ کرت سنگھ اور اس کے ۷۰ سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار کر کیا تھا۔ اس نے اپنی فوج کی حمایت حاصل کرنے کی خاطر تمام فوج کو ایک مہینے کی تنخواہ انعام کے طور پر عطا کی اور اپنے خاص دستہ کے چھ ہزار فوجیوں کو ترقی دینے کے علاوہ ساری فوج میں سپاہی سے لے کر افسر تک کے منصب کو بڑھا دیا۔ تمام جاگیریں ضبط کر لیں اور نقد تنخواہ کا طریقہ رائج کیا۔ ملک میں جاسوسی کے نظام کو از سر نو مستحکم بنیادوں پر منظم کیا اور ملکی انتظام کو مزید بہتر بنانے کی خاطر اس نے مجرموں کے لئے سخت سزائیں مقرر کیں۔

اسلام شاہ ایک اعلیٰ درجے کا منتظم تھا اس کا فوجی نظام نہایت اعلیٰ تھا۔ فوجی طاقت کے بل بوتے پر اس نے تمام بغاوتوں کو کچل دیا۔ اور امراء کی قوت کو ختم کر کے انہیں اپنا اطاعت گزار بنا لیا اس نے ایک فرمان کے ذریعے افغان امراء کے لئے سرخ خیمے کا استعمال، رقاصہ لڑکیوں اور نرہا تھی کا رکھنا ممنوع قرار دیا۔ اس نے آٹھ ورق پر مشتمل سرکاری ضوابط کی ایک کتاب مرتب کروائی۔ جس کو ہر سرکار (ضلع) اور پرگنہ (تحصیل) میں بھجوایا گیا اور ہر جمعہ کے دن تمام حکام کے سامنے اسے پڑھ کر سنانے کا اہتمام کیا۔ تاکہ حکام اپنے فرائض منصبی اور عوام اپنے حقوق سے باخبر ہوں۔ اس موقعہ پر ایک خاص دربار بھی منعقد کیا جاتا تھا۔ ایک بلند پلیٹ فارم پر بادشاہ کا خیمہ نصب کر دیا جاتا جس میں تخت پر بادشاہ کا جوتا اور تیر کمان رکھ دیئے جاتے اور اضلاع کے جملہ حکام دست بستہ کھڑے ہو کر تعظیم کے طور پر ان کو آداب بجا لاتے۔

معاملات حکومت میں اسلام شاہ کی روز افزوں سخت گیری اور متعدد دیگر پابندیوں کے باعث افغان امراء دل برداشتہ ہو کر سرکشی پر آمادہ ہو گئے۔ نتیجہ کے طور پر اس کے خلاف متعدد باغیوں اور سازشیوں نے سر اٹھایا مگر اس نے فوجی طاقت کے بل بوتے پر سب کو کچل دیا۔ ان میں بادشاہ کا بڑا بھائی عادل خاں، خواص خاں، قطب خاں، جلال خاں سوری، زین خاں، ہیبت خاں نیازی اور اعظم ہمایوں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسلام شاہ نے قطب خاں، جلال خاں سوری اور زین خاں نیازی وغیرہ کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا جہاں انہیں بارود

Marfat.com

سے ہلاک کر دیا گیا نتیجتاً امرار کے دلوں میں دہشت پیدا ہو گئی اس طرح اسلام شاہ نے آہستہ آہستہ تمام افغان باغی سرداروں کو ختم کر دیا۔ مگر ان اقدامات نے بادشاہ کو امرار اور عوام میں غیر مقبول بنا دیا اور اس سے نہ صرف افغان اتحاد منتشر ہو کر رہ گیا بلکہ افغان دربار فرقہ بندیوں اور سازشوں کا گہوارہ بن گیا لیکن اس انتشار کے باوجود داخلی طور پر اسلام شاہ نے امن و امان کو بحال رکھا۔

اسلام شاہ علوم و فنون کا سرپرست اور علماء و فضلاء کا قدر دان تھا۔ مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری جیسے فضلاء اور رام داس اور سورداس جیسے ہندی شعراء اس کے دربار کی زینت تھے۔ اسے فن تعمیر سے بھی خاص لگاؤ تھا اس کی تعمیرات میں دہلی کا قلعہ اسلام گڑھ اور شمال مغربی سرحد کے تحفظ کے لئے قلعہ مان کوٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس نے اپنے والد شیر شاہ کی تعمیر کردہ سراؤں کے درمیان ہر کوس پر مزید ایک سرائے تعمیر کروائی اور ان سراؤں میں دو گھوڑ سوار اور کچھ پیادے متعین کئے تاکہ بنگال جیسے انتہائی دور افتادہ علاقوں سے روزانہ باقاعدگی سے خبریں پہنچ سکیں۔ ان سراؤں میں غریب مسافروں کی حفاظت اور آرام و آسائش کا پورا انتظام کیا۔ نیز ان سراؤں میں باقاعدہ خیرات کی تقسیم کا انتظام بھی کیا اور حکومت کی جانب سے دی جانے والی مہولتوں اور تحفظات کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین کوئی امتیاز روا نہ رکھا۔

اسلام شاہ سے کشمیر کے حکمران مرزا حیدر کے دوستانہ مراسم استوار ہوئے۔ مرزا نے کشمیری غالیچے اور شالیں دربار دہلی میں تحفتہً بھیج کر دوستانہ تعلقات کو مزید مستحکم بنایا وہ ایک آزمودہ کار سپاہی اور اعلیٰ درجے کا منتظم تھا لیکن امرار کے حق میں اس کی پالیسی جابرانہ اور سخت گیر تھی اس کا دور حکومت اس کے باپ شیر شاہ کی مانند تھا لیکن وہ ان خوبیوں سے عاری تھا جن کی وجہ سے اس کا باپ شیر شاہ تمام افغان سرداروں کا متفقہ رہنما بن گیا تھا۔ وہ سردار جو شیر شاہ کے معمولی اشارے پہ اپنی جان تک قربان کر دینے پہ آمادہ ہو جاتے تھے اسلام شاہ نے ان سب کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے امرار میں بہت غیر مقبول تھا اس نے صرف اپنی قوت کے بل بوتے پہ حکومت کی اور دشمنوں پر رعب و دبدبہ طاری رکھا لیکن اس کی منتشرانہ پالیسی افغانوں کے قومی اتحاد کے خاتمے کا سبب بنی۔ یہاں تک کہ ۱۵۵۳ء میں اسلام شاہ کے وفات پاتے ہی اس طاقتور حکومت کا شیرازہ ایک دم بکھر گیا۔

محمد عادل شاہ
۱۵۵۳ء - ۵۷ء

اسلام شاہ کی وفات کے بعد امرار نے اس کے بارہ سالہ لڑکے فیروز کو تخت پر بٹھایا مگر تین دن کے بعد اس کے ماموں اور شیر شاہ کے بھتیجے مبارز خاں نے اس کو ہلاک کر کے تخت شاہی پر قبضہ کر لیا۔

Marfat.com

تخت نشین ہو کر مبارز خاں نے محمد عادل شاہ کا لقب اختیار کیا۔ لیکن عوام میں پہلے عدلی اور پھر اندھلی کے لقب سے مشہور ہوا۔ وہ پرلے درجے کا عیاش اور عیش و نشاط کا دلدادہ تھا وہ نہایت نااہل حکمران ثابت ہوا کیونکہ امور سلطنت سے بے خبر اور انتہا درجے کا فضول خرچ تھا۔ بدمعاش اور اوباش طبقے میں بہ دلعزیز اور مہذب طبقہ میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ فن موسیقی کا استاد تھا۔ عہد اکبری کا مشہور و معروف موسیقار تان سین اور حاکم مالوہ باز بہادر اس کے شاگردوں میں شامل تھے

محمد عادل شاہ نے تخت پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا اسلئے اس نے امرا اور سرداروں کو بیش بہا انعامات اور عطیات سے نواز کر انہیں اپنا وفادار بنانے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس نے خواص خاں کے بھائی شمشیر خاں کو اپنا وزیر مقرر کیا لیکن اسے اپنے ہندو وزیر ہیمو بقال پر بہت اعتماد تھا۔ ہیمو بقال دہلی کے نواحی قصبہ ریواڑی کا رہنے والا تھا۔ ابتدا میں وہ ریواڑی کی گلیوں میں نمک فروخت کیا کرتا تھا۔ لیکن اپنی تجارتی قابلیت کی بدولت ترقی کر کے محمد عادل شاہ کا منظور نظر وزیر بن گیا جس نے اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ اس پر وفادار امرا سخت دل برداشتہ ہوئے۔ ملک کے طول و عرض میں بغاوت اور بد امنی کے آثار نظر آنے لگے یہاں تک کہ امرا میں سرکشی اور خود مختاری کا رجحان پیدا ہو گیا۔ افغان اتحاد نہ صرف پاش پاش ہو گیا بلکہ سارے ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی اور مرکزی طاقت کمزور اور منتشر ہو کر رہ گئی۔ ۱۵۵۵ء میں جب مغل بادشاہ ہمایوں دوبارہ برصغیر میں وارد ہوا تو تخت دہلی کے لئے سوری خاندان کے افراد میں باہمی کشمکش جاری تھی۔ چنانچہ :-

۱۔ عادل شاہ سوری جب بہار میں تاج خاں خراسانی کی گوشمالی کے لئے مشرق کی طرف روانہ ہوا تو اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس کے بہنوئی ابراہیم سوری نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس پر عادل شاہ کو چنار میں پناہ گزین ہونا پڑا۔

۲۔ انہی ایام میں شیر شاہ کے بھتیجے احمد خاں سوری نے پنجاب میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے سکندر سوری کا لقب اختیار کیا اس نے دہلی کے بادشاہ ابراہیم سوری کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر اپنا تسلط جما لیا۔ چنانچہ ابراہیم سوری کو سنبھل میں پناہ لینی پڑی۔

۳۔ محمد خاں سوری بنگال میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر چکا تھا اور سلطان محمد کا لقب اختیار کر کے تسخیر دہلی کی تیاریاں کر رہا تھا۔

۴۔ باز بہادر نے مالوہ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔

سوری سلطنت کا خاتمہ : ہمایوں نے افغانوں کی اس خانہ جنگی اور حصول اقتدار کی کشمکش

Marfat.com

سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۵۵۵ء میں برصغیر پر چھا گیا اس نے سکندر شاہ سوری کو سرہند کے مقام پر شکست دی اور دہلی، آگرہ پر قبضہ کر کے مغلیہ سلطنت کو دوبارہ بحال کر دیا اس طرح شیر شاہ سوری کی قائم کردہ سوری سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

سوری سلطنت کے زوال کے اسباب

۱۔ **شیر شاہ کے جانشین:** شیر شاہ سوری کے جانشین بالکل نااہل تھے ان میں کوئی بھی شیر شاہ کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا مالک نہ تھا اور نہ ہی کوئی تعمیری کام سرانجام دینے کی استعداد رکھتا تھا وہ سیاسی بصیرت سے عاری اور جور و استبداد کی حکمت عملی کے حامل تھے۔ رعایا کے تمام فرقوں کی حمایت اور تائید حاصل کرنے کی بجائے انہوں نے فرقہ پرستی اور گروہ بندی کو ہوا دی نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی جس نے سوری سلطنت کے زوال کی راہ ہموار کی۔

۲۔ **اسلام شاہ کی سخت گیر پالیسی:** اسلام شاہ نے اپنے باپ کی پالیسی پر چل کر مرکزیت کو مضبوط رکھنے کے لئے افغان امراء کی قوت کو ختم کرنا چاہا تو افغان امراء دل برداشتہ ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو گئے اسلام شاہ نے اپنی متشددانہ پالیسی کے ذریعے ان میں سے بہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اکثر کو قید میں ڈال دیا۔ اس طرح شیر شاہی عہد کے عظیم المرتبت امراء ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔ یہ افغان امراء شیر شاہ کے وفادار حلیف اور جاں نثار ساتھی تھے شیر شاہ کی کامیابی انہی امراء کی شجاعت اور فرمانبرداری کی مرہون منت تھی لیکن اسلام شاہ نے ان کے کارناموں کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا بلکہ ان کو ختم کر کے اپنی ہی سلطنت کے ستونوں کو منہدم کر دیا۔ بالفاظ دیگر ان کے خاتمے نے سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں خواص خاں ایسے بااعتماد افسران کے بغیر مستحکم سلطنت کا قیام ناممکن تھا۔ محمد عادل شاہ اپنے پیشرو اسلام شاہ سے بھی زیادہ بیوقوف ثابت ہوا اس نے افغان امراء میں پھیلی ہوئی بے چینی کو ختم کر کے ان کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ ہیمو بقال کو سیاہ سفید کا مختار بنا کر افغان امراء کو اور بھی ناراض کر لیا۔

۳۔ **افغان اتحاد کا خاتمہ:** شیر شاہ سوری افغان اتحاد کا علمبردار تھا اس نے افغان قوم میں جو مغلوں کے مقابلے میں مردہ ہو چکی تھی حب الوطنی

Marfat.com

اور قومیت کا جذبہ بیدار کیا اور اسے ایک پلیٹ فارم پہ متحد کر کے ایک قوم بنا دیا تھا۔ اس نے ان کے باہمی اختلافات کو ختم کر کے ان میں یک جہتی کی روح پھونک دی تھی مگر یہ جذبہ اس کے جانشینوں میں مفقود تھا۔ وہ افغان اتحاد کو استحکام نہ دے سکے بلکہ ان کے عہد میں افغان فرقہ بندیوں اور باہمی اختلافات کا شکار ہو گئے۔ مزید برآں شیر شاہ کے جانشینوں نے قومی مفاد کو نظر انداز کر کے ذاتی مفاد کی خاطر آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر تریپاٹھی رقمطراز ہے کہ "حب الوطنی کا وہ جذبہ جس سے شیر شاہ نے افغان سرداروں کو ابھارا اور متحد کیا تھا اسلام شاہ کے ہاتھوں بالکل تباہ ہو گیا۔"

۴۔ اخلاقی اقدار کا تنزل: شیر شاہ کے بعد افغان قوم ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہو گئی۔ افغانوں میں خود اعتمادی، دلیری اور عزت نفس کا احساس تک ختم ہو گیا۔ افغان اپنے قول و فعل میں سچے نہ رہے نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات ہیمو بقال بھی افغان امرا کو ڈانٹ دیتا تھا تو وہ اس کے سامنے دم نہ مارتے تھے۔

۵۔ ملکی معیشت کی تباہی: شیر شاہ کے جانشینوں نے زراعت کی ترقی اور کاشتکاروں سے بے اعتنائی برتی اور ان کے تحفظ کے لئے مناسب اقدامات نہ کئے نتیجتاً زراعت زوال پذیر ہوئی کاشتکار بدحالی کا شکار ہو گئے اور ملک میں قحط سالی کے حالات پیدا ہو گئے جس سے ملکی معیشت تباہ ہو کر رہ گئی۔ مزید برآں حکام خورد برد اور رشوت ستانی جیسی لعنتوں کے شکار ہو گئے۔ افسران مالیہ وصول کر کے خود ہضم کر جاتے اور ان سے کوئی باز پرس نہ ہوتی تھی۔

۶۔ ناقص نظامِ سلطنت: شیر شاہ سوری کے مثالی نظام سلطنت اور عدل و انصاف کے بعد اس کے جانشینوں نے اپنا زیادہ وقت عیش و عشرت اور راگ رنگ کی محفلوں میں صرف کیا اور امور سلطنت کی طرف کوئی توجہ نہ دی جس کے باعث نظام سلطنت تیزی سے روبہ انحطاط ہونے لگا۔ مقدمات کے فیصلے عدل و استحقاق کی بجائے اپنی مرضی و منشا کے مطابق کئے جانے لگے حکومت کا رعب اور دبدبہ بکسر ختم ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ سوری سلطنت جس کا بانی شیر شاہ جیسا بہادر اور مدبر انسان تھا، لاقانونیت کی شکار ہو کر اپنے زوال کو پہنچی۔

Marfat.com

اہم تاریخیں

۱۵۴۲ء مالوہ پر شیر شاہ کا قبضہ۔ عمر کوٹ کے مقام پر اکبر اعظم کی پیدائش۔

۱۵۴۳ء شیر شاہ کے ہاتھوں قلعہ رائے سین کی فتح۔ ہمایوں کا اپنے بیٹے اکبر کو عسکری مرزا کے پاس چھوڑ کر براستہ قندھار ایران جانا۔

۱۵۴۴ء شاہِ ایران شاہ طہماسپ کا جلاوطن مغل بادشاہ ہمایوں کا استقبال کرنا اور اُسے چند شرائط پر کابل اور برصغیر کی تسخیر کے لئے فوجی امداد دینا۔ چتوڑ۔ ناگپور اور اجمیر پر شیر شاہ کا قبضہ۔

۱۵۴۵ء قندھار پر ہمایوں کا قبضہ۔ کالنجر کے مقام پر شیر شاہ سوری کی وفات اور دہلی میں اسلام شاہ سوری کی تخت نشینی۔

۱۵۴۶ء پرتگیزوں کے ہاتھوں گجرات کی بندرگاہوں کی تاخت و تاراج۔

۱۵۴۸ء تحریکِ مہدویت کے بانی شیخ علائی کا قتل۔

۱۵۵۱ء ابوالفضل کی پیدائش۔ مرزا ہندال کی وفات۔ مرزا ہندال کی لڑکی سے اکبر کی نسبت کا طے پانا۔

۱۵۵۳ء ہمایوں کا مرزا کامران کو اندھا کر کے مکہ معظمہ بھجوانا، جہاں اس نے ۱۵۵۷ء میں وفات پائی۔

۱۵۵۴ء دہلی میں محمد شاہ عادل کی تخت نشینی۔ محمد شاہ عادل کے خلاف امرار کی بغاوت۔ کشمیر میں خوفناک زلزلہ۔

۱۵۵۵ء ابراہیم خاں اور سکندر شاہ سوری کی سرہند کے مقام پر ہمایوں کے ہاتھوں شکست۔ مالوہ میں باز بہادر کی خود مختاری۔ مغلیہ سلطنت کی بحالی۔

۱۵۵۶ء ۲۷ جولائی۔ ہمایوں کی موت۔ پانی پت کی دوسری لڑائی میں ہیمو بقال کی شکست۔ اکبر کی تخت نشینی اور کابل میں حکیم مرزا کی خود مختاری۔

Marfat.com

امتحانی سوالات

۱۔ شیر شاہ کی ابتدائی زندگی اور اس کے عروج کا حال قلمبند کیجئے۔

۲۔ شیر شاہ سوری کی فتوحات مختصر طور پر بیان کیجئے۔

۳۔ شیر شاہ کی نافذ کردہ اصلاحات کا جائزہ لیجئے۔

۴۔ شیر شاہ سوری کے انتظام سلطنت پر تفصیلی روشنی ڈالئے۔

۵۔ شیر شاہ سوری کے نافذ کردہ نظام مالیہ کا تفصیلی جائزہ لیں۔

۶۔ شیر شاہ کی اصلاحات بیان کرتے ہوئے ثابت کیجئے کہ وہ اکبر کا پیشرو تھا۔

۷۔ شیر شاہ سوری کا کردار بیان کرتے ہوئے ثابت کیجئے کہ وہ ایک عظیم سپاہ سالار تھا۔

۸۔ سوری سلطنت کے زوال کے اسباب بیان کریں

۹۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ تحریر کیجئے :۔

(ا) اسلام شاہ سوری۔

(ب) عادل شاہ سوری۔

Marfat.com

پانچواں باب

جلال الدّین محمد اکبر

(۱۵۵۶ء ـــــ ۱۶۰۵ء) مطابق (۹۶۳ھ ـــــ ۱۰۱۴ھ)

"ایک پیدائشی لیڈر، بہادر سپاہی، پختہ کار جرنیل، زیرک حکمران اور ایک مدبر سیاستدان کی حیثیت سے اکبر کا ہر دور کے عظیم ترین حکمرانوں سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔" [1]

(پروفیسر شیخ عبدالرشید)

جلال الدین محمد اکبر ایک خوش قسمت اور نیک طالع حکمران تھا۔ وہ ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء کو تخت نشین ہوا۔ برصغیر پاک و ہند پر اس کا پچاس سالہ عہدِ حکومت مغلیہ دور کا ایک نہایت ہی زرین اور تاریخی دور ہے۔ وہ برصغیر کی تاریخ کے ممتاز تاجداروں میں سے ایک تھا اور مغلیہ دور کا عظیم ترین حکمران تھا اگرچہ وہ کتابی علوم سے نابلد تھا لیکن اس کی فہم و فراست، دُور اندیشی اور انتظامی قابلیت قابلِ ستائش تھی۔ اس کے دور میں علوم و فنون کو خوب ترقی ہوئی۔ اس کی گراں قدر اصلاحات، حیران کُن فتوحات اور شہرۂ آفاق نظام سلطنت نے مغلیہ سلطنت کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ اکبر نے اپنی مذہبی پالیسی اور اپنے حسنِ سلوک سے نہ صرف اپنی مسلم رعایا کو مغلیہ سلطنت کا حلقہ بگوش بنایا، امورِ سلطنت میں ہم آہنگی اور ملک میں امن و امان کی فضا پیدا کی بلکہ اپنی سیاسی بصیرت اور دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ہندوؤں اور راجپوتوں سے قرابت کے رشتے استوار کر کے انہیں اپنا وفادار اور اطاعت گذار بنا لیا چنانچہ وہ مغلیہ سلطنت کے ستون ثابت ہوئے۔ اور ان کے ذہنوں سے مغلوں کو غیر ملکی سمجھنے کا تصور تک دور ہو گیا۔ مؤرخین اکبر کو سلطنت مغلیہ کا اصلی بانی اور تنظیم دہندہ ہونے کے باعث اکبر اعظم کہتے ہیں۔

ابتدائی زندگی

اکبر ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء[2] بمطابق ۵ رجب ۹۴۹ھ کو عمر کوٹ (سندھ) کے مقام پر رانا ورصل کے محل میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ہمایوں اور ماں

---

[1] "دی شارٹ ہسٹری آف پاکستان" صفحہ ۷۵

[2] ابوالفضل۔ نظام الدین۔ پروفیسر عبدالرشید اور ڈاکٹر سری واستو۔ بعض تاریخ دانوں نے ڈاکٹر وی اے سمتھ کے حوالے سے اکبر کی تاریخ پیدائش ۲۲۔ نومبر ۱۵۴۲ء لکھی ہے جسے مستند مؤرخین نے اپنی تحقیقات سے غلط قرار دیا ہے۔

Marfat.com

حمیدہ بانو بیگم جلاوطنی کے ایام میں جودھپور سے ۲۲ اگست ۱۵۴۲ء کو عمر کوٹ پہنچ کر راجپوت راجہ رانا ورصل کے ہاں پناہ گزین ہوئے تھے جس نے ٹھٹھہ اور بھکر کی تسخیر کے لئے ہمایوں کو فوجی امداد مہیا کی تھی۔ ہمایوں اکتوبر ۱۵۴۲ء کے دوسرے ہفتہ میں اپنی مہم پر روانہ ہوا اور ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ تردی بیگ خاں نے اسے ولادتِ فرزند کی خوشخبری آکر سنائی۔ ہمایوں نے جس کی مالی حیثیت اس قابل نہ تھی کہ اپنے امرا کو اس مسرت وانبساط کے موقعہ پہ بیش قیمت تحائف اور عطیات سے نوازتا چینی کی ایک رکاب میں مشک نافہ رکھ کر یہ کہتے ہوئے تھوڑا تھوڑا بانٹ دیا کہ "یہی ایک تحفہ ہے جو میں اپنے بیٹے کی پیدائش پر پیش کر سکتا ہوں، مجھے یقین ہے جس طرح اس مشک کی خوشبو نے اس خیمہ کو معطر کر دیا ہے اسی طرح ایک دن اس کی شہرت چہار اطرافِ عالم میں پھیلے گی۔"

اکبر کی دیکھ بھال پر کئی نرسیں (خاوہ ایں) مامور تھیں۔ کچھ اسے دودھ پلاتی تھیں اور دوسری اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ان نرسوں میں اہم ترین نرس جیجی انگہ تھی جس کے خاوند شمس الدین نے ہمایوں کو ۱۵۴۰ء میں قنوج کی جنگ کے بعد ڈوبتے ہوئے بچایا تھا اور جسے ہمایوں نے 'انکہ' کا خطاب دیا تھا۔ ایک اور اہم ترین اور قابلِ ذکر نرس ماہم انگہ تھی جس کا بیٹا ادھم خاں تھا۔

نومبر ۱۵۴۷ء میں جب اکبر پانچ سال کا ہوا تو اس کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ یکے بعد دیگرے کئی اساتذہ اس کی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے لیکن اکبر حروف ابجد بھی یاد نہ کر سکا اور وہ تاعمر ناخواندہ رہا لیکن اس نے بلا کا حافظہ پایا تھا۔ وہ تعلیم سے گریزاں، کھیل تماشہ اور کبوتر بازی، گھوڑے اونٹ اور شکاری کتے پالنے کا شوقین تھا یہی وجہ تھی کہ وہ گھوڑسواری، شمشیر زنی اور جنگی مشقوں میں ماہر تھا۔

نومبر ۱۵۵۱ء میں مرزا ہندال کی وفات کے بعد اکبر کو نہ صرف غزنی کا حاکم مقرر کیا گیا بلکہ مرزا ہندال کی لڑکی رقیہ بیگم سے اس کی نسبت بھی طے کر دی گئی۔ اکبر ۱۵۵۴ء تک غزنی کا گورنر رہا۔ دہلی پر ہمایوں کے دوبارہ قبضہ کے چند ماہ بعد اکبر کو لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا اور بیرم خاں کو اس کا نگران و اتالیق مقرر کیا گیا۔ اس وقت اکبر کی عمر تیرہ سال تھی۔

نخست نشینی
۱۴ فروری ۱۵۵۶ء

۲۴۔ جنوری ۱۵۵۶ء کو نماز مغرب کے وقت ہمایوں دہلی میں اپنی لائبریری کے زینے سے پھسل کر سخت زخمی ہوا اور تین دن کی مسلسل بیہوشی کے بعد ۲۷ جنوری ۱۵۵۶ء کو اس سرائے فانی سے کوچ کر گیا۔ بیرم خاں کی معیت میں شہزادہ اکبر پنجاب میں سکندر سوری کی سرکوبی میں مصروف تھا کہ گورداسپور (مشرقی پنجاب) سے

Marfat.com

اتالیق بیرم خاں نے فوری اقدام کرتے ہوئے کلانور کے ایک باغ میں ۱۸ × ۳ فٹ کا اینٹوں کا ایک چبوترہ تعمیر کروا کر اکبر کی رسم تاجپوشی ادا کی اور اس کی بادشاہت کا اعلان کیا اکبر نے اپنے استاد بیرم خاں کو نائب السلطنت مقرر کیا۔

۱۵۵۶ء میں برصغیر کی حالت

۱۵۵۶ء میں برصغیر پاک و ہند کی سیاسی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سیاسی انتشار اور بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ عوام کی معاشی حالت بہت ہی دگرگوں اور خستہ تھی۔ مسلسل خانہ جنگی اور دو سال کی متواتر خشک سالی کی وجہ سے ملک کے اکثر حصوں بالخصوص دہلی و آگرہ کے نواحی علاقوں میں شدید قحط پھیلا ہوا تھا۔ لاکھوں لوگ بھوکوں مر گئے تھے۔ "دارالسلطنت تباہ و برباد ہو گیا تھا اور چند گھروں کے سوا وہاں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ طاعون کی وبا پھوٹ نکلی تھی جس نے برصغیر کے اکثر شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہزارہا لوگ بھوک اور بیماری کے باعث لقمۂ اجل ہو گئے تھے یہاں تک کہ لوگ انسانی گوشت کھانے پر مجبور ہو گئے اور گھروں میں جا کر تنہا انسانوں کا شکار کرنے لگے۔"

ہمایوں کی وفات کے وقت ہر چیز تشنۂ تکمیل تھی۔ اس کا جانشین اکبر تیرہ سال کا نوعمر شہزادہ تھا۔ اس کی حالت اس قدر کمزور تھی کہ اس کے اتالیق بیرم خاں کے سوا ہر شخص نے برصغیر چھوڑ کر کابل چلے جانے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ اس کے راستے میں مشکلات کے پہاڑ حائل تھے۔ اکبر پنجاب کے کچھ حصے کا برائے نام بادشاہ تھا۔ سارے ملک میں متعدد ایسے دعویدار تھے جو خود مختار ہونے کے علاوہ تخت دہلی کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔

شیر شاہ سوری کے جانشینوں میں سے سکندر سوری اگرچہ ہمایوں کے ہاتھوں سرہند کے مقام پر شکست کھا چکا تھا لیکن اطاعت گذار نہ ہوا تھا اور شوالک کی پہاڑیوں میں واقع قلعہ مان کوٹ میں محصور تھا۔ وہ دہلی اور پنجاب کی بادشاہت کا دعویدار تھا۔ عادل شاہ سوری (عدلی) مشرقی صوبوں پر قابض چنار میں مقیم تھا۔ اس کا ہندو جرنیل ہیمو بقال مغلیہ اقتدار کو ختم کر کے بظاہر سوری حکومت کی بحالی کا نعرہ لگا رہا تھا لیکن دراصل وہ رام راجیہ کی بحالی کا خواہاں تھا۔ بنگال پر محمد خاں سوری کی حکومت تھی۔ بازبہادر نے مالوہ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ شمالی برصغیر کی دیگر مسلم ریاستیں گجرات، سندھ، ملتان اور کشمیر بھی خود مختار اور دہلی سلطنت سے لاتعلق تھیں۔ راجستھان کی راجپوت ریاستیں جو سوری سلطنت کے زوال کے بعد کافی طاقتور اور خود مختار ہو گئی تھیں اور سلطنت دہلی کی غلامی سے اپنے آپ کو آزاد تصور کرتی تھیں اب مسلم قوت سے پنجہ آزمائی کے لئے موقعہ کی تلاش میں تھیں۔ ان ریاستوں میں میواڑ، جیسلمیر، بوندی اور جودھپور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

Marfat.com

دکن کا علاقہ شمالی ہندوستان کی سیاست سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ دکن کی بہمنی سلطنت پانچ چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستوں برار، احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ اور بیدر میں بٹ چکی تھیں۔ ان ریاستوں پر خانہ جنگ سلطان حکمران تھے اور یہ باہمی عداوتوں اور دوسرے نگر کے خلاف نبرد آزمائی میں مصروف تھیں۔ اس طرح دکن بھی سیاسی انتشار کا شکار تھا۔ اودھ بحیرۂ عرب اور مغربی ساحل پر پرتگیز اپنی قوت کو مستحکم بنا رہے تھے۔

کابل کا علاقہ اکبر کے بھائی مرزا محمد حکیم جو ماہ بیگم کے بطن سے تھا کے زیر نگیں تھا۔ کابل میں مرزا محمد حکیم نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اور اب ہندوستان کی سلطنت کے حصول کے لئے پر تول رہا تھا۔ سلطنت کے ان دعویداروں کے علاوہ اکبر کو اپنے ان امراء کے زور کو توڑ کر اطاعت گذار بنانا بھی مقصود تھا جو اس کی بادشاہت کے خلاف تھے۔

اس طرح اکبر کی تخت نشینی کے وقت برصغیر پاک و ہند کی حالت تشویشناک تھی لیکن خوش قسمتی سے اکبر کو بیرم خاں جیسا قابل، با اعتماد اور آہنی عزم رکھنے والا نائب السلطنت مل گیا جس نے نوعمر اکبر کو حوصلہ کے ساتھ تمام مصائب و مشکلات پر قابو پانے کی ترغیب دی اور فوج کو دہلی کی جانب کوچ کا حکم دیا۔

ہیمو بقال

اکبر کا سب سے بڑا رقیب اور دشمن محمد عادل شاہ سوری (عدلی) کا ہندو وزیر ہیمو بقال تھا جس کا نصب العین مغلیہ اقتدار کو ختم کرنا تھا۔ وہ ریواڑی نواح دہلی کا باشندہ تھا اور شروع میں اپنے قصبہ کی گلیوں میں نمک بیچا کرتا تھا۔ ہیمو بقال سب سے پہلے سرکاری ملازمت میں بطور منڈی کے تولے یعنی ترازو بردار کی حیثیت سے داخل ہوا اور جلد ہی اپنی ذہانت اور کاوش سے اسلام شاہ کا منظور نظر بن گیا جس نے اسے اپنے دربار میں مختلف عہدوں پر مامور کیا۔ ہیمو منتظم اور جرنیل ہونے کی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کی وجہ سے محمد عادل شاہ عدلی کا دست راست بن گیا اور وزیر اعظم مقرر ہوا۔

وہ پہلا ہندو تھا جو ایک مسلمان بادشاہ کا وزیر مقرر ہوا اس نے بادشاہ کے لئے افغان اور ترک افواج کے ذریعے چوبیس جنگیں لڑیں جن میں سے بائیس جنگیں اس نے جیتیں۔ وہ آگرہ پر حملہ آور ہونے کے لئے افغان فوج کو منظم کر رہا تھا کہ ہمایوں نے ۲۷ جنوری ۱۵۵۶ء کو وفات پائی۔ ہیمو نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گوالیار کے رستے آگرہ پر حملہ کر دیا اور وہاں کے گورنر سکندر خاں ازبک کو بھگا کر آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں ۷ اکتوبر ۱۵۵۶ء کو دہلی کے مغل گورنر تردی بیگ کو قطب مینار سے پانچ میل مشرق میں واقع تغلق آباد کے مقام پر شکست دے کر دہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح گوالیار سے دریائے ستلج تک کا تمام علاقہ ہیمو کے قبضہ میں آگیا اور اس

Marfat.com

نے اپنے آقا محمد عادل شاہ عالی سے غداری کرتے ہوئے اور اسے بالکل نظر انداز کر کے راجہ بکرماجیت کا لقب اختیار کیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس نے آگرہ اور دہلی سے حاصل کردہ مالِ غنیمت افغان امراء اور افواج میں فیاضانہ تقسیم کر کے اپنا طرفدار بنا لیا۔ اس طرح اپنی پوزیشن کو مستحکم کر لیا۔

پانی پت کی دوسری لڑائی

۵۔ نومبر ۱۵۵۶ء

اکبر بیس ہزار فوج کے ساتھ جالندھر کے مقام پر خیمہ زن تھا جبکہ اسے دہلی و آگرہ پر ہیمو بقال کے قبضے کی خبر ملی۔ وکیل سلطنت بیرم خاں نے فوراً جید ناچیدہ امراء اور جرنیلوں پر مشتمل جنگی کونسل طلب کی تاکہ ہیمو کے ناگہانی حملے کے متعلق غور و خوض کیا جا سکے جنگی کونسل کی اکثریت نے اُسے دارالخلافہ کے ہاتھ سے چھن جانے کے بعد مایوس کن حالات کے پیش نظر کابل لوٹ جانے کا مشورہ دیا اور جواز یہ پیش کیا کہ ہیمو بقال جیسے خطرناک اور طاقتور دشمن سے ٹکر نہیں لینی چاہیئے کیونکہ اس کے پاس ایک لاکھ افغانوں کی زبردست فوج ہے لیکن بیشتر دل اور وفادار بیرم خاں جو مغلیہ اقتدار کو ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا کی رائے تھی کہ کابل لوٹنا پسپائی کا باعث ہوگی لہٰذا برصغیر میں قسمت آزمائی کی جائے اکبر نے بیرم خاں کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ہیمو سے ٹکرانے کا مصمم ارادہ کیا اور ۱۳۔ اکتوبر ۱۵۵۶ء کو جالندھر سے ہیمو سے نبرد آزما ہونے کے لئے کوچ کیا۔

سرہند کے مقام پر سنبھل، آگرہ اور دہلی کے شکست خوردہ مغل گورنر، اکبر کے حضور پیش ہوئے اور کابل واپس چلے جانے کا مشورہ دیا۔ ان گورنروں کی آمد سے مغل امراء اور فوج میں بددلی پھیل گئی مگر بیرم خاں نے آہنی عزم کا ثبوت دیتے ہوئے اور اپنی سخت گیری سے کام لے کر حالات کو یکسر بدل دیا۔ اس نے دہلی کے گورنر تردی بیگ کو غداری اور بزدلی کی پاداش میں سولی پر لٹکا دیا۔ تردی بیگ کا حشر دیکھ کر تمام امراء اور فوج پر بیرم خاں کی ہیبت طاری ہو گئی ساتھ ہی بیرم خاں نے فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ علاوہ ازیں اس نے علی قلی خاں شیبانی کی سرکردگی میں ایک ہراول دستہ روانہ کیا جس نے کامیابی سے ہیمو بقال کے ہراول دستہ کو شکست فاش دیکر اس کے بہترین توپ خانہ پر قبضہ کر لیا۔

آخر ۵۔ نومبر ۱۵۵۶ء کو پانی پت کے تاریخی میدان میں اکبر اور ہیمو بقال کی فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ بیرم خاں نے میدان جنگ میں اپنی بیس ہزار مضبوط فوج کو اس ترتیب سے متعین کیا کہ علی قلی خاں شیبانی کو جسے بعد میں اکبر نے خانِ زمان کا خطاب دیا مرکزی کمان سونپی۔ عبداللہ خاں ازبک کو بائیں طرف کا کمانڈر مقرر کیا۔ سکندر خاں کو دائیں جانب تعینات کیا اور اکبر کو فوج کے عقب میں ایک محفوظ مقام پر رکھا تاکہ فوج کی نگاہ میں رہے اور فوج کے حوصلے بلند رہیں۔

Marfat.com

ہیمو بقال کی فوجی طاقت ایک لاکھ راجپوت اور افغان سپاہیوں پہ مشتمل تھی جن کی حفاظت کیلئے فوج کے پیچھے بندوقچی اور تیر انداز مقرر تھے لیکن توپ خانہ نہ تھا۔ ہیمو بقال نے جو ایک بہت بڑے ہاتھی پہ سوار تھا اپنے کو درمیان رکھا اور اپنے بھتیجے رامیہ کو بائیں جانب اور شادی خاں ککڑ کو دائیں جانب کی کمان پہ مقرر کیا۔ اگرچہ لڑائی کے آغاز میں ہیمو بقال کا پلڑا بھاری رہا لیکن بیرم خاں نے اپنی فوج اور سرداروں کی ہمت بندھائی اور علی قلی خاں کو ہیمو کی افواج کے قلب پہ حملہ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ علی قلی خاں اپنے ساتھیوں کو لے کر تیر کی مانند دشمن فوج کے قلب پہ ٹوٹ پڑا لشکر جرار کے زعم میں سرمست ہیمو بقال کے لئے اس میدان میں شکست مقدر ہو چکی تھی۔ کیونکہ عین اس وقت جب ہنگامۂ جنگ نقطۂ عروج پہ تھا اور توپ خانہ کی عدم موجودگی کے باوجود اس کی فوج اپنے مخالف پہ غلبہ حاصل کر رہی تھی ایک تیر پیغام اجل لے کر ہیمو کی آنکھ میں ترازو ہو گیا جو ہاتھی پہ بیٹھا اپنی فوج کو بہادری سے لڑا رہا تھا۔ تیر کے لگنے سے وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ ہیمو کی فوج سمجھی کہ اس کا سردار ہلاک ہو گیا ہے چنانچہ وہ بددل ہو کر میدان سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اگرچہ مہاوت نے ہیمو کو ایک محفوظ مقام پہ پہنچانے کی کوشش کی لیکن ایک مغل آفیسر شاہ قلی بہرام نے اسے گرفتار کر کے اکبر کے حضور پیش کیا۔ ابوالفضل کے قول کے مطابق "بیرم خاں نے اسے تلوار کے ایک ہی وار سے ہلاک کر دیا" جبکہ ایک ہمعصر مؤرخ عارف قندھاری کا بیان ہے کہ "بیرم خاں نے اکبر کو ہیمو کا قہر کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کی دعوت دی تاکہ اکبر غازی کہلا سکے اور اکبر نے ہیمو کو اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

مغل فاتحین نے ۶ نومبر ۱۵۵۶ء کو دہلی پہ قبضہ کر لیا بعد ازاں آگرہ کو بھی تسخیر کر لیا گیا۔ ہیمو کی بیوہ بہت سا خزانہ لے کر فرار ہو گئی تھی بیرم خاں نے پیر محمد شیروانی کو اسے گرفتار کرنے کے لئے بھیجا لیکن وہ بچ کر نکل گئی۔ البتہ ہیمو کا باپ گرفتار ہوا جسے ہلاک کر دیا گیا اس فوج نے واپسی پہ اجمیر اور ناگپور کو بھی فتح کیا۔ پانی پت کی دوسری لڑائی برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لڑائی کے بعد ہندوؤں کی سلطنت کی بحالی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

بیرم خاں

اکبر اعظم کا اتالیق اور ہمایوں بادشاہ کا وفادار اور جاں نثار جرنیل بیرم خاں بدخشاں کا باشندہ تھا اور شیعہ عقائد کا حامی تھا۔ بیرم خاں نے ساری عمر وفاداری سے ہمایوں کا ساتھ دیا۔ جنگ قنوج میں وہ اگرچہ شیر شاہ سوری کے ہاتھوں گرفتار ہوا مگر اپنی ہوشیاری سے چالاکی سے فرار ہو گیا اور ہمایوں سے جا ملا۔ بیرم خاں ہی کے مشورے سے ہمایوں نے ایران جانا منظور کیا۔ قیام ایران کے دوران بیرم خاں کی دانشمندی سے ہی ہمایوں کو شاہ ایران طہماسپ سے فوجی امداد ملی۔ بیرم خاں نے ایک وفادار خادم کی حیثیت سے ہر مہم میں ہمایوں کا ساتھ دیا۔

Marfat.com

۱۵۴۵ء میں کابل کی فتح کے بعد ہمایوں نے اسے اکبر کا اتالیق مقرر کیا اور ساتھ ہی والہانہ عقیدت کی بنا پر اسے خان خاناں کا خطاب عطا کیا۔ بیرم خاں کی مدد ہی سے ہمایوں نے ۱۵۵۵ء میں سکندر سوری کی افواج کو سرہند کے مقام پر شکست فاش دے کر دہلی اور آگرہ میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت بحال کی۔ ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کی وفات کے بعد بیرم خاں نے اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیتے ہوئے اکبر کی بادشاہت کا اعلان کیا۔

بیرم خاں اگرچہ اکبر کو تعلیم نہ دے سکا لیکن اس نے اپنی سیاسی بصیرت سے کام لیکر مغلیہ سلطنت کو مشکلات کے زعفے سے بچا لیا۔ اکبر نے اسے وکیل سلطنت مقرر کیا اور خان خاناں کا خطاب عطا کیا۔ وکیل سلطنت ہو کر بیرم خاں جلد ہی ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا لیکن اس قدر اقتدار کے باوجود اس کی وفاداری ہر قسم کے شکوک سے بالاتر تھی۔ وہ اعلیٰ پائے کا جرنیل اور کمال درجے کا موقعہ شناس تھا۔ اگرچہ تردی بیگ کے قتل کی وجہ سے لوگ اسے جابر کہتے ہیں لیکن بیرم خاں نے محکم گیری کی پالیسی کی بدولت ہی مغلیہ سلطنت کو استحکام بخشا۔ بیرم خاں علم و ادب اور خردمندی میں یکتا تھا اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ حالات کو بخوبی سمجھتا تھا اور موقع و محل کے مطابق مناسب اقدام کرتا تھا۔ ترک امرا اس کے خلاف تھے لیکن وکیل سلطنت بننے کے بعد بیرم خاں نے اپنے مخالفین کو خوب سزائیں دیں۔ بیرم خاں چار سال تک یعنی ۱۵۵۶ء تا ۱۵۶۰ء وکیل سلطنت رہا اس دوران اس نے کئی گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور مغل حکومت کو مضبوط و مستحکم بنایا۔

بیرم خاں کا زوال

بیرم خاں چار سال تک ۱۵۵۶ء تا ۱۵۶۰ء نائب السلطنت رہا اس دوران وہ مغل سلطنت کے عروج و استحکام کے لئے ہمہ تن کوشاں رہا لیکن اچانک ۱۵۶۰ء میں اس کے اقتدار کا دور ختم ہو گیا جس کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں:۔

۱۔ ۱۵۶۰ء میں اکبر اپنی عمر کی اٹھارہویں منزل میں داخل ہوا اب وہ بالغ ہو چکا تھا اور زیادہ دیر تک اپنے نائب السلطنت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی حکمران بن کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس میں اب عملاً حکمران بننے کا شعور پیدا ہو چکا تھا اس لئے اس نے بیرم خاں کو نائب السلطنت کے عہدے سے ہٹا کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

۲۔ بیرم خاں کا اقتدار حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ دربار اور محل میں ایسے لوگوں کا ایک گروہ پیدا ہو چکا تھا جو بیرم خاں کے نامحدود اختیارات سے حسد کرتے تھے یہ لوگ اسے اپنے اقتدار کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتے تھے۔ ان لوگوں میں اکبر کی والدہ حمیدہ بانو بیگم، دائی انگہ اکبر کا رضائی بھائی ادھم خاں اور شہاب الدین انکہ پیش پیش تھے۔ یہ لوگ بیرم خاں کے خلاف اکبر کو بدظن کرتے رہتے تھے اس گروہ نے بھی اکبر میں عنانِ حکومت خود سنبھالنے

Marfat.com

احساس پیدا کر دیا۔

۳۔ بعض تاریخوں میں بیرم خاں پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ مرزا کامران کے بیٹے ابوالقاسم مرزا کا حامی تھا اور اسے دہلی کے تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔

۴۔ بیرم خاں عقائد کے لحاظ سے شیعہ تھا لیکن درباری امراء کی اکثریت سنی العقیدہ تھی، ان کو یہ شکایت تھی کہ بیرم خاں اپنے عقیدہ کے لوگوں سے امتیازی سلوک روا رکھتا ہے نیز اسی دوران بیرم خاں نے ایک شیعہ عالم شیخ گدائی کو صدر الصدور کے اہم مذہبی عہدہ پر تعینات کر دیا اس سے درباری امراء اس کے اور بھی خلاف ہو گئے۔

۵۔ بیرم خاں کے دور اقتدار میں چونکہ ایرانی النسل امراء کو بہت عروج حاصل تھا اس لئے چغتائی امراء اس کے خلاف ہو گئے۔ نیز چغتائی امراء تردی بیگ کے قتل کو بیرم خاں کی انتقامی کارروائی تصور کرتے تھے۔

۶۔ بیرم خاں کو اپنی بے لوث خدمات پر ناز تھا اگرچہ وہ مغل سلطنت کا وفادار اور اس کی استواری کے لئے ہمہ تن کوشاں تھا لیکن لوگ اس کے لامحدود اختیارات سے حسد کرنے لگے تھے۔

۷۔ اکبر کو اپنے نائب السلطنت سے ذاتی شکایت بھی تھی وہ یہ کہ اسے ذاتی مصارف کیلئے مناسب رقم نہیں ملتی تھی لیکن اس کے برعکس بیرم خاں اپنے احباب، ملازمین اور رشتے داروں پر انعام و اکرام کی بارش کرتا تھا۔ 'سلطان' اور 'خان' کے خطابات کے علاوہ انہیں پنج ہزاری جیسے اعلیٰ اعزازات بھی عطا کئے جا رہا تھا مگر شاہی ملازمین اور شاہی افراد ان انعامات اور نوازشات سے یکسر محروم تھے بلکہ ان سے سخت رویہ روا رکھا جاتا تھا۔

۱۵۶۰ء میں جب اکبر آگرہ سے اپنی والدہ کی مزاج پرسی کے لئے دہلی آیا تو اکبر کی دائی ماہم انکہ، والدہ حمیدہ بانو بیگم، ادھم خاں اور دہلی کے گورنر شہاب الدین نے ایک متفقہ سازش کے تحت اکبر کو مجبور کیا کہ وہ عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیکر بیرم خاں کے اقتدار کو ختم کر ڈالے آخر اکبر نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے بعد اپنے نائب السلطنت بیرم خاں کو مندرجہ ذیل پیغام روانہ کیا:۔

"چونکہ مجھے آپ کی دیانتداری، وفاداری اور خلوص نیت پر اعتماد تھا اس لئے میں نے حکومت کے کل اختیارات سونپ رکھے تھے اور خود سیر و تفریح میں مصروف رہا۔ اب میں نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ میری خواہش کے مطابق آپ حج بیت اللہ کے لئے مکہ روانہ ہو جائیں۔ آپ کی کفالت کے لئے بہترین اور موزوں جاگیر وقف کر دی جائے گی۔"

Marfat.com

بیرم خاں کو اس کے احباب نے بغاوت برپا کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن وفادار جرنیل نے اپنی دیانتداری اور خلوصِ نیت کا پورا ثبوت دیتے ہوئے حکم شاہی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اقتدار سے دستبردار ہو کر فریضۂ حج کے لئے روانہ ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنے مشیروں کے کہنے پر بیرم خاں کے ایک پرانے معزول شدہ ملازم ملّا پیر محمد کو بیرم خاں کے تعاقب میں روانہ کیا تاکہ وہ جلد سے جلد اسے برصغیر کی سرحد عبور کرا دے۔ چونکہ بیرم خاں کو اس شخص سے نفرت تھی اس لئے وہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا لیکن جالندھر کے قریب شاہی افواج سے شکست کھا کر گرفتار ہوا اور اکبر کے روبرو پیش کیا گیا۔ اکبر نے قراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے معاف کر دیا اور اس کے سامنے تین تجاویز رکھیں اولاً کالپی اور چندیری کے علاقوں کا گورنر بن جائے۔ ثانیاً دربار میں شہنشاہ کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے رہے۔ ثالثاً فریضہ حج کے لئے مکہ روانہ ہو جائے بیرم خاں نے آخری تجویز قبول کرتے ہوئے فریضۂ حج کے لئے جانا منظور کیا۔ اکبر نے اس کے زادِ راہ کا پورا بندوبست کیا۔ لیکن بیرم خاں کو مکہ پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ گجرات کے نزدیک پٹن کے مقام پر ۱۵۶۱ء میں مبارک خاں لوہانی نے اسے ہلاک کر دیا۔ مبارک خاں کے باپ کو بیرم خاں نے ۱۵۵۵ء میں ماچھی واڑہ کی لڑائی میں ہلاک کیا تھا۔ اکبر کو جب اپنے اتالیق کے انجام کا پتہ چلا تو اس نے اس کے چار سالہ بیٹے عبدالرحیم کو شاہی سرپرستی میں لے لیا اور بیرم خاں کی بیوہ سلیمہ بیگم سے خود شادی کر لی۔ عبدالرحیم کو اکبر نے اعلیٰ تعلیم دلوائی جب وہ بڑا ہوا تو ۱۵۸۴ء میں وہ اکبر کا مشیرِ خاص بنا اور خانِ خاناں کے خطاب سے مشرف ہوا۔

تبصرہ بیرم خاں کے خاندان مغلیہ پر بڑے احسانات تھے برصغیر کے تخت پر ہمایوں کی بحالی اور نامساعد حالات کے باوجود اکبر کے تخت کا تحفظ بیرم خاں کی بے مثال وفاداری اس کے عزم و حوصلہ کی ہی بدولت تھا۔ اس نے چار سالہ دورِ نیابت کے دوران مغلیہ سلطنت کی بنیادوں کو استحکام بخشا۔ اجمیر، گوالیار، جونپور اور سنبھل کے علاقے تسخیر کر کے مغلیہ سلطنت کی حدود کو وسعت دی۔ نوجوان بادشاہ اکبر شکار اور دیگر تفریحی مشاغل میں مصروف رہتا تھا اور امورِ سلطنت سے اسے کوئی سروکار نہ تھا اس وقت بیرم خاں نے اپنے حسنِ تدبر سے نظامِ مملکت کو منظم کیا اور امن و امان قائم کیا اور سلطنت میں کوئی خرابی نہ آنے دی۔ لیکن بیرم خاں کے زوال اور موت کی داستان اکبری عہد کا ایک نہایت ناخوشگوار سانحہ ہے۔ بیرم خاں کے مخالفین نے ایک سازش کے تحت نوجوان بادشاہ کو اس بات پر اکسایا کہ وہ اپنے سرپرست بیرم خاں سے ہر قیمت پر نجات حاصل کرے۔ چنانچہ انہوں نے بیرم خاں کو مکمل طور پر تباہ و برباد کرنے کی غرض سے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ وہ بغاوت پر مجبور ہو جائے لیکن بیرم خاں نے اپنے احباب کی سازشی تحریکات کے

Marfat.com

باوجود آخری وقت تک وفاداری کا ثبوت دیا اور شاہی فرمان کے آگے سر جھکا دیا۔ اگر اس کے مخالفین ملا پیر محمد کو اسے مکہ مکرمہ کی طرف جلد از جلد روانہ کر دینے کی زیادتی نہ کرتے تو بظاہر بیرم خاں کی بغاوت کا کوئی جواز نہ تھا بیرم خاں درحقیقت اپنی خودداری کو قائم رکھنے کے لئے بادلِ ناخواستہ آمادۂ بغاوت ہوا تھا اور وہ اپنے گرفتار کیے جانے پر خوش تھا۔

ہمعصر مورخین بیرم خاں کی بیدار مغزی، وسیع النظری، عزم و استقلال اور وفاداری کی تعریفیں کرتے ہیں ابوالفضل بھی اس کی توصیف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "بیرم خاں درحقیقت ایک شریف الطبع، انسان اور اعلیٰ خوبیوں کا مالک تھا۔" ڈاکٹر وی اے سمتھ رقمطراز ہے:

"بیرم خاں کے زوال اور اس کی موت کی داستان ایک ناخوشگوار احساس کی غمازی کرتی ہے۔ بیرم خاں نے ہمایوں اور اکبر دونوں باپ بیٹے کی اس وقت مدد کی جبکہ وہ بے آسرا تھے۔ تخت کی بازیابی کے سلسلے میں ہمایوں اور اکبر دونوں ہی اس کے مرہون منت تھے۔ حالات کا تقاضا یہ تھا کہ زمام اختیار سنبھالنے سے قبل اکبر کو اپنے خاندان کے محسن کی علیحدگی کے لئے ایسے خوشگوار حالات اور ماحول پیدا کرنا چاہیئے تھا کہ بیرم خاں کسی طرح بھی مایوس و ملول نہ ہوتا لیکن بیرم خاں کے لاتعداد دشمن اس کے اخلاق کو آسان اور خوشگوار نہیں بنانا چاہتے تھے وہ ہر حالت میں اس کی تذلیل کے درپے تھے اگر ان کے سامنے کچھ دشواریاں نہ ہوتیں تو وہ یقیناً اسے ہلاک کر ڈالتے۔ بغاوت کے دوران وہ بڑی بے دلی سے لڑا کیونکہ وہ دل سے اکبر کا وفادار تھا۔ بغاوت کے بعد اس سے فراخدلانہ سلوک نوجوان بادشاہ کی فراخدلی کا مظہر ہے۔" [1]

ماہم انگہ بیرم خاں خانِ خاناں کے زوال کے بعد عنانِ اقتدار اکبر کی دایہ ماہم انگہ کے ہاتھ آئی جو نائب السلطنت کے خلاف سازش میں شریک اپنے بیٹے ادھم خاں، پیر محمد شیروانی، منعم خاں اور شہاب الدین ایسے لوگوں کی سرپرست تھی۔ اکبر بدستور امورِ سلطنت میں کوئی دلچسپی نہ لیتا تھا اور سیاحت اور سیر و شکار جیسی تفریحات میں مصروف رہتا تھا معاملات سلطنت پورے دو سال تک ماہم انگہ کے زیر اختیار رہے۔ جس کے بعض ناخوشگوار نتائج آمد ہوئے ماہم انگہ کے دورِ اقتدار کا اہم واقعہ مالوہ کی تسخیر ہے۔

ماہم انگہ کا زوال اور ادھم خاں کا قتل: ماہم انگہ کے اقتدار سے نجات پانے

---

[1] "اکبر" وی اے سمتھ "صفحہ ۴۸-۴۷

Marfat.com

قید کر دیا گیا۔

اسیر گڑھ: اسیر گڑھ ریاست خاندیش کا ایک مشہور ترین قلعہ تھا جو برصغیر کے مضبوط ترین اور ناقابل تسخیر قلعوں میں شمار ہوتا تھا۔ شمالی برصغیر اور دکن کی درمیانی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے فوجی اہمیت کا حامل تھا۔ خاندیش کے حاکم راجہ علی خاں فاروقی نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی تھی اور احمد نگر کے محاصرہ کے دوران مغل فوج کی معیت میں مارا گیا تھا۔ احمد نگر کی فتح سے قبل اس کے جانشین میراں بہادر شاہ نے خود مختاری اختیار کرتے ہوئے مغلیہ سیادت سے منہ موڑ لیا اور قلعہ اسیر گڑھ میں محصور ہو بیٹھا۔ چنانچہ ۱۵۹۹ء کے اوائل میں اکبر نے خاندیش میں پہنچ کر اس کے دارالسلطنت برہانپور پر قبضہ کر لیا۔ اور پھر قلعہ اسیر گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ نے طول کھینچا تو اکبر نے ابوالفضل کو محاصرہ پر مامور کیا۔ اگرچہ ۲۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو میراں بہادر شاہ نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی لیکن محصورین بدستور مغلیہ پر ڈٹے رہے آخر ۶ جنوری ۱۶۰۱ء کو قلعہ فتح ہو گیا اور خاندیش کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ یہ عہد اکبری کی آخری فتح تھی۔

اکبر کی دکن پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغلیہ سلطنت کی حدود دریائے نربدا سے لے کر دریائے کرشنا کے بالائی حصہ تک پھیل گئیں لیکن اس سے اکبر کے اصل عزائم پورے نہ ہو سکے۔ کیونکہ پورا دکن باجگذار نہ بن سکا اور اسے شہزادہ سلیم کی بغاوت کے پیش نظر کام ادھورا چھوڑ کر شمال کی طرف واپس لوٹنا پڑا۔ اکبر نے دکن کے علاقہ اپنی توسیع پسندانہ پالیسی کا آغاز کر کے اپنے جانشینوں کے لئے نئے مسائل پیدا کئے۔ جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کو یہ پالیسی ورثہ میں ملی جس کو جاری رکھنے پر وہ ہر طرح سے مجبور تھے۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکنی ریاستوں کو فتح کر کے اور ان کا مغلیہ سلطنت سے الحاق کر کے اکبر کے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

اکبری دور کی بغاوتیں

عبداللہ خاں ازبک کی بغاوت
۱۵۶۴ء

مغل امراء جو ہمایوں کے زمانے سے ہی مغلیہ سلطنت کے لئے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے تھے اکبر کی تمام ملک کو ایک مرکز کے تحت لانے کی پالیسی سے متفق نہ تھے۔ وہ دراصل مطلق العنان ہونے کے آرزومند تھے تاکہ وہ اپنے علاقوں میں من مانی کارروائیاں کر سکیں۔ ادھم خاں، پیر محمد شیروانی اور خانِ زماں علی قلی خاں شیبانی اپنے اپنے صوبوں میں مختارِ مطلق تھے۔ مالوہ کے گورنر عبداللہ خاں ازبک نے بھی

Marfat.com

ان کے خطوط پر چلنا چاہا اور بغاوت کر دی۔ جولائی ۱۵۶۴ء میں اکبر اس کی سرکوبی کو پہنچا اکبر کی آمد پر عبداللہ خاں ازبک مانڈو سے بھاگ کھڑا ہوا لیکن اکبر نے اس کا تعاقب کر کے اسے شکست فاش دی اس کے ہاتھیوں اور حرم پر قبضہ کر لیا۔ نیز قارا بہادر خاں کو مالوہ کا گورنر مقرر کیا۔

ازبک بغاوت ۱۵۶۴ء تا ۱۵۶۷ء

اکبر کے درباری امراء میں ازبک کافی اہمیت اور اثر و رسوخ کے حامل تھے۔ انہوں نے مغلیہ سلطنت کے قیام میں بڑی جانفشانی اور مردانگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ پانی پت کی دوسری لڑائی ۱۵۵۶ء کا فاتح خانِ زماں علی قلی خاں شیبانی جس نے جونپور کے صوبہ کو زیر نگیں کیا تھا اسی وقت سے وہاں کا گورنر تھا۔ اس کا بھائی بہادر خاں، ان کا چچا ابراہیم خاں، خانِ عالم (سکندر خاں) گورنر اودھ اور عبداللہ خاں ازبک جسے حال ہی میں مالوہ سے نکال دیا گیا تھا۔ ازبک امراء کے سردار تھے۔ وہ سلطنت کے اہم عہدوں پر تعینات تھے۔ اور فوج میں بھی ان کا کافی اثر و نفوذ تھا۔ ازبک بڑے خود سر تھے اور اکبر کی نظم و ضبط کی پالیسی سے متفق نہ تھے کیونکہ وہ مطلق طور پر مختارانہ حقوق کے خواہاں تھے۔ ازبک امراء کا خیال تھا کہ اکبر ان کی پوری قوم سے متنفر ہے اور ان کی حیثیت کو کمزور کرنے کے درپے ہے اور اسی لئے عبداللہ خاں ازبک کو مالوہ سے نکال باہر کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ازبک متحد ہو گئے اور انہوں نے اکبر کے خلاف بغاوت کر دی انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ ابراہیم خاں اور خانِ عالم دونوں قنوج پر حملہ آور ہوں اور خانِ زماں علی قلی خاں اور اس کا بھائی بہادر خاں مانک پور کو فتح کریں۔ چنانچہ طے شدہ منصوبہ کے مطابق خانِ زماں اور اس کے بھائی نے شاہی افواج کو شکست دے کر مانک پور پر قبضہ کر لیا۔ ادھر خانِ عالم اور ابراہیم خاں نے مئی ۱۵۶۵ء میں ایک دوسری فوج کو شکست دی اس سے حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ بادشاہ کو بذاتِ خود ازبکوں کے مقابلہ پر آنا پڑا۔ خان عالم بھی خانِ زماں کے پاس مانک پور پہنچ گیا لیکن جب انہیں لکھنؤ پر اکبر کے قبضہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے مانک پور سے فرار ہو کر جاجی پور (بہار) میں جا پناہ لی۔

ازبک دو سال سے زائد عرصہ تک باغی رہے اور شکست کھانے کے باوجود اکبر کی اطاعت گذار نہ ہوئے اس پر بادشاہ کو ان کے خلاف سخت فوجی کارروائی کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ بالآخر جنوری ۱۵۶۷ء میں ازبکوں کو شکستِ فاش ہوئی اور خانِ زماں علی قلی خاں مارا گیا اس کا بھائی بھی گرفتار ہو کر قتل ہوا اس طرح امراء کے اس باغی گروہ کا یکسر خاتمہ ہو گیا جو حصولِ اقتدار میں بادشاہ کا حریف تھا۔ ازبکوں کے زوال کے بعد اکبر کلی طور پر خود مختار ہو گیا۔ اس نے امراء کے مرتبہ کو اس حد تک محدود کر دیا کہ وہ محض سلطنت کے ملازم ہو کر رہ گئے جن کو اکبر اپنی مرضی کے مطابق متعین

Marfat.com

اور برخاست کر سکتا تھا۔

مرزاؤں کی بغاوت

اکبر لاہور میں تھا کہ اُسے سنبھل اور اعظم پور کے اضلاع میں چغتائی مرزاؤں کی بغاوت کی خبر ملی۔ ابراہیم حسین مرزا، محمد حسین مرزا، مسعود حسین مرزا اور عاقل حسین مرزا سب کے سب امیر تیمور کی اولاد اور اکبر کے رشتہ دار تھے انہیں اکبر سے یہ شکایت تھی کہ شاہی خاندان کے افراد ہونے کے باوجود اکبر نے انہیں مناسب مراتب و وظائف عطا نہیں کئے۔ بادشاہ کے حکم پر منعم خاں نے انہیں شکست فاش دے کر مالوہ کی طرف بھگا دیا۔ لیکن وہ ۱۵۷۳ء تک اپنے گوریلا طریق جنگ سے اکبر کے لئے دردِ سر بنے رہے بالآخر ازبک بغاوت کے خاتمے کے ساتھ ہی مرزاؤں کی بغاوت بھی فرو ہو گئی کیونکہ شاہی افواج نے انہیں چُن چُن کر شکست دی حتیٰ کہ وہ مالوہ سے گجرات بھاگ گئے جہاں ۱۵۷۳ء میں گجرات کی مہم کے دوران انہیں بالکل ختم کر دیا گیا۔

شہزادہ سلیم کی بغاوت
۱۵۹۹ء تا ۱۶۰۴ء

۱۵۹۹ء میں جب اکبر میراں بہادر شاہ والئے خاندیش کے خلاف فوجی کارروائی کا پروگرام بنا رہا تھا اس نے شہزادہ سلیم کو اجمیر کا گورنر بناتے ہوئے رانا امر سنگھ والئے میواڑ کو اطاعت گذار بنانے کا کام سپرد کیا۔ سلیم نے میواڑ کے پہاڑوں اور جنگلوں میں اس مشقت طلب مہم سے اعراض کرتے ہوئے رانا کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اس پر اکبر سلیم سے ناراض ہو گیا اور اس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے دانیال میں دلچسپی لینی شروع کر دی کیونکہ منجھلا بیٹا مراد ۲ مئی ۱۵۹۹ء کو کثرتِ شراب نوشی کے باعث فوت ہو گیا تھا۔ ابوالفضل بھی شہزادہ سلیم کی جس تساہل پسندی اور خودسری کی وجہ سے اس کے خلاف ہو چکا تھا۔ ان حالات نے شہزادہ سلیم کو جس کی عمر اب اکتیس سال ہو چکی تھی بغاوت پر اکسایا۔ شہزادہ سلیم نے اجمیر کے سابق حاکم شہباز خاں کمبوہ کی بے شمار دولت پر قبضہ کر کے الہ آباد کے راستے آگرہ کا رخ کیا۔ اس نے اپنی دادی اماں سے بھی ملاقات کرنے سے گریز کیا جو اسے بغاوت سے باز رکھنے کے لئے آگرہ سے آ رہی تھی۔ سلیم تیز رفتاری سے دریائے جمنا کو عبور کر کے الہ آباد پہنچ گیا اور بغاوت برپا کرتے ہوئے تیس لاکھ روپے پر مشتمل بہار کے شاہی خزانہ پر قبضہ کر لیا۔ اس نے الہ آباد، اودھ اور بہار کے صوبوں میں اپنے وفادار آفیسر متعین کئے اور بادشاہ کا لقب اختیار کرتے ہوئے ایک خود مختار حکمران کی مانند حکومت کرنی شروع کر دی۔

ان دنوں اکبر خاندیش میں سیر گڑھ کی فتح میں مصروف تھا اس نے بغاوت کی خبر سن کر شہزادہ سلیم کو اطاعت گذار اور فرمانبردار ہونے کی تلقین کی۔ سلیم نے بہانہ سازی سے کام لیا لیکن وہ بغاوت پر قائم رہا۔ اس پر بادشاہ نے سلیم کے ہم مکتب شریف کو اس کے پاس الہ آباد بھیجا تاکہ وہ اس کو

Marfat.com

راہِ راست پر لائے۔ لیکن شہزادے نے شریف کو اپنا طرفدار اور ہمنوا بنا لیا اور اپنا وزیر مقرر کر دیا۔

اسیر گڑھ کی فتح کے بعد اکبر نے دکن کی نیابت پر شہزادہ دانیال کو متعین کیا اور خود آگرہ کی جانب روانہ ہوا تاکہ سلیم کے بارے میں مناسب اقدامات کر سکے۔ اکبر نے ۲۳ اگست ۱۶۰۲ء کو آگرہ پہنچ کر سلیم سے مراسلت کے ذریعے گفت و شنید شروع کی لیکن شہزادہ کے مطالبات ناقابل قبول ہونے کی وجہ سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سلیم نے بادشاہ کی طرف سے اڑیسہ اور بنگال کی نیابت قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق اس نے اپنے نام کے سکے بھی جاری کروا دیئے۔

اب اکبر نے اپنے لائق اور دور اندیش وزیر ابوالفضل کو دکن سے طلب کیا تاکہ اس کے مشورے کے مطابق سلیم کے خلاف مناسب اقدام کرے۔ لیکن شہزادہ نے ابوالفضل کو ۱۲ اگست ۱۶۰۲ء کو نارواڑ کے نواح میں نبدھیل کھنڈ کے ایک باغی سردار بیر سنگھ دیو سے قتل کروا دیا۔ اکبر کو ابوالفضل کے قتل کا بہت رنج ہوا اس نے غصے سے بیر سنگھ دیو کی گرفتاری اور قتل کا حکم صادر کر دیا لیکن بیر سنگھ شہزادہ سلیم کی پناہ میں محفوظ رہا۔ اب سلیمہ بیگم نے باپ بیٹے میں صلح کرانے کے لئے مداخلت کی اور سلیم کے پاس الہ آباد پہنچی اور اسے آگرہ پہنچ کر باپ سے معافی مانگنے پر راضی کر لیا۔ ۱۶۰۳ء میں سلیم کو اس کی دادی مریم مکانی نے اکبر کے حضور پیش کیا جہاں سلیم نے روتے ہوئے اپنا سر اکبر کے پاؤں پر رکھ دیا اور اپنے گناہوں کے لئے معذرت چاہی۔ بادشاہ نے اسے معاف کرتے ہوئے اٹھا کر گلے لگا لیا اور بارہ ہزار اشرفی اور سات سو ستر ہاتھیوں پر مشتمل شہزادہ کا تحفہ قبول کر لیا۔

اکتوبر ۱۶۰۳ء میں میواڑ کی مہم دوبارہ شہزادہ سلیم کے سپرد کی گئی لیکن فتح پور سیکری پہنچ کر اس نے بادشاہ سے الہ آباد جانے کی اجازت چاہی تاکہ مہم کے لئے زیادہ سے زیادہ فوج کا انتظام کر سکے باوجودیکہ اکبر کو معلوم تھا کہ شہزادہ میواڑ کی مہم سے پہلو تہی کر رہا ہے۔ بادشاہ نے اسے الہ آباد جانے کی اجازت دے دی۔ الہ آباد پہنچ کر سلیم خراب کار سیاں بن گیا اور خود مختارانہ و جابرانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے ظلم و تشدد پر اتر آیا۔ جس کی وجہ سے ۱۶۰۳ء ہی میں اس کی پہلی بیوی مان بائی (راجہ مان سنگھ کی بہن اور شہزادہ خسرو کی والدہ) نے بھاری مقدار میں افیون کھا کر خودکشی کر لی جس کی وجہ سے سلیم اور مان سنگھ کے تعلقات بگڑ گئے۔ سلیم نے اس واقعہ کی خبر اکبر تک پہنچانے والے کو زندہ چنوا دیا۔ نیز اپنے ایک ملازم کو اتنا مارا کہ وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا ان حالات نے اکبر کو سخت برہم کر دیا اور وہ سلیم کو فرمانبردار بنانے کے لئے الہ آباد کی طرف روانہ ہوا لیکن بادشاہ اور اپنی والدہ کی بیماری کی وجہ سے راستے ہی سے واپس لوٹ آیا۔ حمیدہ بانو بیگم نے ۱۰ ستمبر ۱۶۰۴ء کو ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اکبر کا تیسرا بیٹا دانیال بھی کثرتِ شراب نوشی سے اپریل ۱۶۰۴ء میں فوت ہو چکا تھا۔ پانچ ماہ کے قلیل عرصے میں دو شدید المیوں نے خاندانِ مغلیہ کے اس عظیم بادشاہ کی

Marfat.com

کمر توڑ کر رکھ دی۔

اب اکبر کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ شہزادہ سلیم سلطنت کا کاروبار سنبھالنے کے لئے ہوشمند ہو جائے۔ ۱۶ر نومبر کو شہزادہ سلیم آگرہ پہنچا تاکہ اپنے باپ سے اپنے بھائی اور دادی کی تعزیت کر سکے اور انتظامِ سلطنت میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹا سکے۔ سلیم جب دربارِ عام میں حاضر ہوا تو اکبر نے ناراضگی کا کوئی اظہار نہ کیا لیکن بعد ازاں اسے گرفتار کروا کر محل کے اندر طلب کیا اور اس کی بداعمالیوں پر سرزنش کرتے ہوئے اس کے منہ پر زور سے طمانچہ رسید کیا اور سالیوا ہن کے معالج راجہ کے زیرِ نگرانی حمام میں قید کر دیا۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ شہزادہ پہ دیوانگی کا اثر ہے جس کے لئے اسے مناسب علاج کی ضرورت ہے۔ دس دن کی قید کے بعد جس میں اسے شراب اور افیون سے محروم رکھا گیا تھا اسے آزاد کر دیا گیا اور اس کی رہائش کے لئے ایک بہترین جگہ کا بندوبست کیا گیا بعد ازاں شہزادہ نے اس اندیشہ کے تحت کہ اگر وہ بدستور نافرمانبردار رہا تو اس کی بجائے اس کے بیٹے خسرو کو ولیعہد نہ بنا دیا جائے بادشاہ کی مرضی کے مطابق اطاعت قبول کر لی۔ اس کا اندیشہ صحیح نکلا کیونکہ درباری امراء دو حصوں میں بٹ چکے تھے جن میں مان سنگھ اور خان اعظم مرزا عزیز کوکہ شہزادہ خسرو کی کھلم کھلا حمایت کر رہے تھے جس کی عمر اگرچہ صرف سترہ سال تھی لیکن وہ کافی اثر و نفوذ کا مالک تھا۔ سلیم نے بغیر کسی عذر کے مغربی صوبوں کی نیابت قبول کر لی چونکہ شہزادہ دانیال کی وفات کی وجہ سے اب تک خالی پڑی ہوئی تھی لیکن اس نے وہاں کے انتظام و انصرام کے لئے اپنے نائب کو روانہ کر دیا اور خود اپنے باپ کی وفات تک آگرہ ہی میں مقیم رہا۔

اکبر کی وفات

۲۵-۲۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء

۳- اکتوبر ۱۶۰۵ء کو اکبر پیچش کے مرض میں مبتلا ہو گیا اس کی حالت سلیم اور اس کے بیٹے خسرو کے باہمی اختلاف اور امراء کی سازشوں کی وجہ سے اور بھی خراب ہو گئی کہا جاتا ہے کہ مان سنگھ اور عزیز کوکہ نے سلیم کو گرفتار کرنا چاہا تاکہ خسرو کی ولیعہدی کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔ شاہی معالج حکیم علی بادشاہ کی بیماری کی صحیح تشخیص کرنے میں ناکام رہا۔ آخر آٹھ دن کے بعد اس نے پیچش کو روکنے کیلئے ایک سخت نسخہ دیا جس کے استعمال سے بادشاہ کو بخار بھی ہو گیا۔ ۱۲ اکتوبر کو اکبر کی حالت مزید ابتر ہو گئی اور اس نے اپنی نازک حالت کے پیشِ نظر سلیم کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اس دن سلیم بادشاہ کے حضور حاضر ہوا بادشاہ نے اشارہ سے شہزادہ کو دستارِ شاہی سر پہ رکھنے اور ہمایوں بادشاہ کی تلوار باندھنے کا حکم دیا اس کے بعد اکبر پیچش سے اس قدر نڈھال ہو گیا کہ ۲۵ اور ۲۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء کی درمیانی رات کو اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

تاریخ وفات ہوئی: "الف کشیدہ ملائک ز قوت اکبر شاہ"

Marfat.com

پوشلہو (BOTELHO) کے قول کے مطابق اکبر اسلامی عقیدہ پہ مرا لیکن اس کے مذہبی عقیدہ کے بارے میں کوئی مستند تاریخی شہادت نہیں ہے اس کی تجہیز و تکفین اسلامی عقیدہ کے مطابق ہوئی اور اسے آگرہ سے پانچ میل دور سکندرہ میں دفن کیا گیا۔

اکبر کی راجپوت پالیسی

اکبر نے اپنی بادشاہت کا آغاز تشدد کی بجائے مصالحت کی حکمتِ عملی سے کیا۔ اس نے اپنے حسن سلوک سے ہندو رعایا کا دل موہ لیا اور راجپوتوں کے خلاف جنگ کی قدیم پالیسی کو ترک کر کے صلح جوئی اور مصالحت پر مبنی پالیسی اختیار کی اس سے راجپوت نہ صرف اطاعت گذار بن گئے بلکہ انہوں نے مغلیہ سلطنت کو استحکام بخشنے میں بھی جانفشانی سے حصہ لیا۔ اکبر کی صلح کل پالیسی کی بدولت برصغیر کے ہندو مغلوں کو غیر ملکی سمجھنے کی بجائے روشن خیال حکمران سمجھنے لگے۔ اکبر اعظم نے نہ صرف جزیہ ٹیکس اور یاترا ٹیکس اور یاترا (پلگرم ٹیکس) معاف کر کے ہندوؤں اور راجپوتوں کو اپنا گرویدہ اور وفادار بنایا بلکہ غیر مسلم رعایا کو اہلیت اور ذہانت کی بنا پر اعلیٰ عہدے عطا کرنے کی پالیسی بھی اختیار کی علاوہ ازیں راجپوت حکمرانوں سے رشتے ناطے استوار کر کے اکبر نے مغلیہ سلطنت کی بنیادوں کو تقویت و محکمی عطا کی۔ اکبر کی راجپوت پالیسی بہت کامیاب رہی جس کی متعدد وجوہات تھیں جو درج ذیل ہیں:۔

راجپوتوں کی قدیم نفرت و دشمنی ختم کرنے کی خواہش:

۱۔ "راجپوتوں سے اکبر کا فیاضانہ سلوک اس کے لیے مقصد احساس کا نتیجہ یا محض ان کی بہادری کریم النفسی اور حب الوطنی کا بہادرانہ اعتراف نہ تھا بلکہ یہ لبرل پالیسی کا نتیجہ تھا جو روشن خیالی، صلاحیتوں کا اعتراف، انصاف اور خوش اسلوبی پہ مبنی تھی"۔ [1] اکبر دور اندیش ہونے کے علاوہ ایک جہاندیدہ سیاستدان تھا اس کی دور بین نگاہوں نے آغاز بادشاہت میں ہی بھانپ لیا تھا کہ برصغیر پاک و ہند کی ہندو اکثریت کے تعاون کے بغیر سرزمین پاک و ہند میں مغل حکومت کی بنیادیں زیادہ گہری نہیں ہو سکتیں اس لئے وہ راجپوتوں کے دلوں سے نفرت و دشمنی کے قدیم جذبات ختم کر کے مغلیہ سلطنت کو استحکام بخشنا چاہتا تھا اکبر یہ جان گیا تھا کہ اس کے پیشرو مسلمان بادشاہ بلبن، علاؤالدین بلبن، علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق محض اس لئے اپنی سلطنت کو استواری نہ دے سکے کہ انہوں نے راجپوتوں کی بادشاہ پرستی وفاداری اور بہادری کے فطری جوہروں سے فائدہ اٹھانے کی بجائے انہیں بزورِ شمشیر

---

[1] ڈاکٹر اے ایل سری واستوا (مغل ایمپائر صفحہ ۱۶۸)

Marfat.com

اپنا اطاعت گذار بنانا چاہتا تھا لیکن اکبر نے اپنی سلطنت کو مضبوط بنانے کی غرض سے راجپوتوں کو ساتھ ملانے کی پالیسی اختیار کی اور ان قدیم دشمنوں سے جنگ کرنے کی بجائے ان کی دوستی اور ان کے تعاون کے حصول کو قرین مصلحت اور بہتر سمجھا۔

۲۔ مغل امراء کی باہمی کشمکش :

اکبر نے اپنے تلخ تجربہ کی بنا پر یہ جان لیا تھا کہ اس کے مغل امرار جو اپنے آپ کو چغتائی خون بتاتے ہیں اجنبی تصور کرتے ہیں کبھی مغلیہ سلطنت کے وفادار ثابت نہیں ہو سکتے جب تک ان کا مفاد اکبر سے وابستہ ہے وہ وفادار بنے رہیں گے لیکن اس کے بعد کسی وقت بھی اسے تنہا چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ نیز مغل امرار آئے دن ایک دوسرے کے خلاف سازشوں اور باہمی کشمکش میں مشغول رہتے تھے وہ اکبر کے خلاف بھی سازشیں کرتے رہتے تھے۔ بیرم خاں خانخاناں کی وفات کے بعد تو ازبک امرار اکبر کے لئے اچھا خاصا دردِ سر بن گئے تھے چنانچہ ان حالات اور سازشوں سے اکبر پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی تھی کہ مغل امرار اس کے دائمی وفادار اور جاں نثار نہیں ہو سکتے اس بنا پر اکبر نے ایک ایسے گروہ کی ضرورت محسوس کی جو بوقتِ ضرورت ان باغی عناصر کی سرزنش کر سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے اکبر نے وفاداری اور مصالحت کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے راجپوتوں کی طرف نہ صرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا بلکہ انہیں سلطنت کے اہم عہدوں پر تعینات کیا۔ نیز اکبر راجپوت امرار کی موجودگی سے مغل اور ازبک امرار کی اجارہ داری کو ختم کر کے دربار میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے کا بھی متمنی تھا۔

۳۔ راجپوتوں کی فطری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی پالیسی :

اکبر کی دور بین نگاہوں نے بادشاہت کے آغاز ہی میں بھانپ لیا تھا کہ راجپوتوں کے تعاون کے بغیر مغلیہ حکومت مستحکم نہیں ہو سکتی کیونکہ راجپوت اپنی عسکری صلاحیت کے اعتبار سے ہندوؤں کے فوجی قائد تھے اور اپنی بہادری، آن، شجاعت اور حب الوطنی کی وجہ سے مشہور تھے وہ اپنی آن کی خاطر اور آزادی کے تحفظ کے لئے جان تک کی بازی لگا دیتے تھے۔ لڑنا مرنا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ چونکہ وہ مغلوں کے سخت دشمن تھے اس لئے ان کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کر کے ہی انہیں تابع فرمان بنایا جا سکتا تھا۔ مزید برآں اکبر راجپوتوں کی فطری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے راجپوتوں سے جنگ کرنے کی بجائے انہیں مغلیہ سلطنت کا وفادار بنانے کی پالیسی پر عمل کیا تاکہ وہ نہ صرف مغل سلطنت کی وسعت پذیری کے سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہوں بلکہ اس کی ترقی اور مضبوطی کے لئے بھی ان کا تعاون میسر آ سکے۔

Marfat.com

۴۔ اکبر کے ذاتی رجحانات: اکبر اوائل عمر ہی سے رواداری کا حامل تھا اس میں تعصب نام کو بھی نہ تھا اکبر اپنی صلح کل پالیسی کے تحت ہر مذہب کو آزادی دینے کا حامی تھا یہی وجہ تھی کہ اکبر نے نہ صرف جزیہ ٹیکس اور پانڑا ٹیکس کی منسوخی کا فرمان جاری کیا بلکہ ہر مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی کا بھی حکم جاری کیا وہ اپنی سلطنت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا دیکھنا چاہتا تھا اور راجپوتوں کو سلطنت کے اہم عہدوں پر مقرر کر کے دربار میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنا چاہتا تھا۔

راجپوت دوستی کے حصول کے لئے اکبر کے اقدامات

۱۔ راجپوتوں سے رشتے ناطے: اکبر نے اپنی نئی راجپوت پالیسی کا آغاز راجہ بہاری مل والئے جے پور کی بیٹی کے ساتھ شادی سے کیا۔ راجہ بہاری مل نے سانبھر کے مقام پر حاضر ہو کر نہ صرف اکبر کی اطاعت قبول کی بلکہ اپنی لڑکی جودھا بائی کی شادی اکبر سے کر دی۔ راجہ بہاری مل پہلا راجپوت حکمران تھا جس نے اکبر کی اطاعت قبول کی اکبر نے جے پور کی آزادی کو مغلیہ سلطنت کے زیر سایہ برقرار رکھا اور راجہ بہاری مل کے بیٹے بھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کو شاہی ملازمت میں لے کر اعلیٰ عہدوں پہ مامور کیا ڈاکٹر بینی پرشاد کی رائے میں "اس شادی سے برصغیر کی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔"

۱۵۷۰ء میں بیکانیر اور جیسلمیر کے راجاؤں نے بھی اکبر کی سیادت کو قبول کر کے اور اپنی بیٹیوں کو اس کے نکاح میں دے کر اس سے قرابت داری کے تعلقات استوار کئے۔ ۱۵۸۴ء میں شہزادہ سلیم کی شادی راجہ بھگوان داس کی بیٹی مان بائی (شاہ بیگم) سے ہوئی۔ نیز شہزادہ سلیم کی شادی مارواڑ کی راجکماری سے بھی ہوئی۔ ان شادیوں سے راجپوت اکبر کے رشتہ دار بن گئے اور اس طرح اکبر کی حکومت کی حفاظت ان کی اوّلین ذمہ داری بن گئی۔ راجپوتوں سے رشتے ناطے کرنے کی پالیسی اکبر کی فہم و فراست اور سیاسی بصیرت کا نتیجہ تھی اس سے اکبر کا مقصد ہندو رعایا میں وسیع تر قومیت اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنا تھا تاکہ صرف تنخواہ دار فوجی ہی مغلیہ سلطنت کے محافظ نہ ہوں بلکہ غیر مسلم رعایا بھی اس کی بقا اور استحکام کے لئے کوشاں رہے۔

۲۔ غیر مسلموں کی اہم عہدوں پر تعیناتی: اکبر نے غیر مسلموں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اپنی روادارانہ پالیسی کے تحت انہیں حکومت کے فوجی اور غیر فوجی شعبوں میں اہم منصبوں پہ مامور کیا۔ چنانچہ راجہ بہاری مل، راجہ بھگوان

Marfat.com

داس اور راجہ مان سنگھ کو اکبر نے نہ صرف بہت سی فوجی مہمات کا کمانڈر مقرر کیا بلکہ انتظام سلطنت اور بندوبست اراضی کو بہتر بنانے کے سلسلے میں راجہ مان سنگھ اور راجہ ٹوڈرمل کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اکبر کو اپنے ان وفادار منصب داروں پر بہت زیادہ اعتماد تھا کہا جاتا ہے کہ اکبر کی نصف فوج غیر مسلموں پر مشتمل تھی۔

۳۔ اکبر کی روادارانہ پالیسی:

اکبر نے بادشاہ ہوتے ہی اپنی ہندو رعایا کو نہ صرف مذہبی آزادی عطا کی بلکہ ہندو مذہب پر عہد قدیم کی جاری کردہ تمام پابندیوں کو یہ یک قلم منسوخ کر دیا۔ مزید براں اپنی فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے یاترا (یاتری) ٹیکس اور ۱۵۶۴ء میں جزیہ ٹیکس ایسے امتیازی ٹیکس بھی معاف کر دیئے۔ اگرچہ ان ٹیکسوں کی تنسیخ سے معاشی طور پر حکومت کو نقصان ہوا لیکن اس سے ہندو رعایا بہت خوش ہوئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعصب کی خلیج کو ختم کرنے میں اکبر کامیاب ہو گیا۔ اس پالیسی سے ہندو اور راجپوت رعایا پر بہت اچھا اثر پڑا اور وہ ہمیشہ کے لئے مغلیہ سلطنت کے محافظ اور اکبر کے وفادار دوست بن گئے۔

۴۔ اکبر کی سوشل اصلاحات:

اکبر نے راجپوتوں اور ہندوؤں کو مزید اعتماد میں لینے کی خاطر ہندو مت کی سربرتی کو اپنا شعار بنایا اور خود ماتھے پر ہندوؤں کی طرح تلک لگانا شروع کر دیا۔ ہندوؤں کو مذہبی آزادی دیتے ہوئے انہیں نئے مندر تعمیر کرنے کی اجازت بھی عطا کی۔ گاؤکشی کو ممنوع قرار دیا۔ دختر کشی پر پابندی لگا دی۔ ہندو مت کی معاشرتی اصلاح کی خاطر رسم ستی اور بچپن کی شادی کو ممنوع قرار دیا اور ہندو بیواؤں کو دوبارہ شادی کی اجازت دی اس سے ہندوؤں نے اکبر کو اپنا خیر خواہ اور محافظ تصور کرنا شروع کر دیا۔

راجپوت پالیسی کے نتائج

اکبر کی رواداری اور ہندوؤں اور راجپوتوں سے اچھے سلوک کی پالیسی نے برصغیر کی اسلامی سلطنت میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اس پالیسی کی عدم موجودگی کی وجہ سے افغان عہد حکومت کو استواری حاصل نہ ہو سکی تھی۔ اکبر کی اس پالیسی کے دور رس نتائج برآمد ہوئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ راجپوت مغلیہ سلطنت کے محافظ ثابت ہوئے:

اکبر کی دور اندیشی ٹھیک ثابت ہوئی کہ راجپوتوں کی دشمنی سے نقصان اور ان کی دوستی میں فائدہ ہے جونہی اکبر کی راجپوت پالیسی کی وجہ سے راجپوت اکبر کے رشتے دار بنے، وہ مغلیہ سلطنت کے وفادار اور محافظ بن گئے۔ اکبر نے انہیں حکومت کی انتظامیہ میں اعلیٰ مناصب عطا کئے اور اہم عہدوں پر تعینات کیا۔ راجہ مان سنگھ اور راجہ ٹوڈرمل

Marfat.com

نے مغلیہ نظام سلطنت اور نظام مالیہ کو بہتر بنانے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے مورخین کی متفقہ رائے ہے کہ مغلیہ سلطنت کی استواری صرف راجپوتوں کی وجہ سے ہوئی بلاشبہ اکبر کی اس پالیسی کو اکبر کی دوراندیشی، سیاست دانی اور تدبر کا ایک شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ راجپوتوں کے اقتدار کا خاتمہ: اکبر کی رواداری سے متاثر ہو کر راجہ بہاری مل کی طرح راجستھان کے دیگر راجپوتوں نے بھی اکبر سے رشتے ناطے کر کے اطاعت قبول کر لی لیکن میواڑ کے حکمران ایسی اطاعت کو اپنی بے عزتی تصور کرتے رہے اور عملاً اکبر سے برسرپیکار رہے۔ بہاری مل کی لڑکی کی شادی سے راجپوتوں کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے جس سے راجپوتوں کی متحدہ طاقت کو بہت نقصان پہنچا۔ ہندو مورخین کا خیال ہے کہ اکبر کی راجپوت پالیسی کی وجہ سے مغلیہ خاندان کو دائمی استحکام حاصل ہوا جبکہ ہندو ازم کو اس سے شدید نقصان پہنچا۔

۳۔ مغلیہ سلطنت کو استحکام ملا: مشہور انگریز مورخ لین پول کا خیال ہے کہ "اکبر کی قیمتی اصلاحات میں ہندوؤں اور راجپوتوں کا بہت ہاتھ تھا۔" اکبر نے راجپوتوں کی امداد سے نہ صرف سلطنت میں ایک بہتر نظام حکومت قائم کیا بلکہ عوام کی بہبودی کے لئے متعدد قیمتی اصلاحات جاری کر کے سلطنت کو استواری بخشی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اکبر صرف راجپوتوں ہی کی وجہ سے اپنی سلطنت کو خاطر خواہ وسعت دینے میں کامیاب ہوا۔

تبصرہ: اکبر کی راجپوت پالیسی از حد کامیاب ثابت ہوئی اس کی حکمت عملی بحیثیت مجموعی مصالحانہ اور فیاضانہ تھی لیکن اس نے سلطنت کی وسعت اور مرکزیت میں کسی قسم کی مزاحمت برداشت نہ کی اور مخالفین کو سختی سے کچل دیا۔ رواداری نہ فراخدلی پر مبنی یہ پالیسی مفید نتائج کی حامل ثابت ہوئی۔ راجپوت دشمن نہ صرف حکومت کے جاں نثار بن گئے بلکہ انہوں نے اپنے ہم قوموں کے خلاف اکبر اعظم کا ساتھ بھی دیا، راجپوتوں نے فوجی، انتظامی، مالی اور ادبی میدان میں بھی مغلیہ سلطنت کی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ اس سے برصغیر کی سیاسی وحدت، قیام امن اور خوشحالی میں بڑی مدد ملی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے مغلوں کو گوناگوں سیاسی فائدے حاصل ہوئے لیکن اسلامی نقطہ نگاہ سے اکبر کی راجپوت پالیسی درست نہ تھی کیونکہ اس سے اسلام کی اشاعت رک گئی انگریز مورخین اکبر کی راجپوت پالیسی کی تعریفیں کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اکبر کی لبرل ازم کی بدولت مغلیہ سلطنت کو نہ صرف استحکام ملا بلکہ برصغیر کی دو بڑی قومیں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئیں جس سے باہمی مفاہمت کی فضا پیدا ہوئی اور ملک میں اتحاد و اتفاق اور یگانگت کا دور دورہ ہوا جس سے ملک کو ثقافتی، صنعتی، زرعی اور تجارتی ترقی کے مواقع حاصل ہوئے۔

اکبر کی مذہبی پالیسی اکبر ایک مطلق العنان حکمران تھا وہ علاؤ الدین خلجی کی مانند مذہب کی

Marfat.com

بالادستی کو ختم کر کے شاہی اقتدار اور سیاست کی سربلندی کا خواہاں تھا اگرچہ وہ کتابی اور مذہبی تعلیم سے بے بہرہ تھا مگر تنقید اور بحث و مباحثے کا شوقین تھا۔ تنگ نظری اور کورانہ تقلید کی بجائے ہر چیز کی تہ تک پہنچنے کا حامی تھا اور آزاد خیال اور روادار واقع ہوا تھا اکبر ایک روشن خیال ماحول میں پیدا ہوا تھا۔ ہمعصر مؤرخ عبدالقادر بدایونی ہمیں بتاتا ہے کہ اکبر اپنے عہدِ حکومت کے ابتدائی بائیس سال تک ایک راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھا۔ شعائرِ دین کا پابند اور نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرتا تھا۔ محل کی مسجد میں اکثر خود جاروب کشی کرتا اور اذان دیتا تھا۔ سادی ساری رات عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتا اور یا ہو، یا ہادی کا ورد کیا کرتا تھا۔ علماء، مشائخ اور صوفیائے کرام بالخصوص خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کا بہت معتقد تھا۔ چنانچہ ہر سال زیارت کے لئے اجمیر شریف جایا کرتا تھا۔ شیخ سلیم چشتی سے اس کی روحانی عقیدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ملکہ مریم زمانی امید سے ہوئی تو اسے شیخ کے تکیہ میں بھیج دیا جہاں جہانگیر پیدا ہوا۔ اکبر نے اس کا نام شیخ کے نام پر سلیم رکھا وہ پیروں اور فقیروں کی ہم نشینی اور خدمت کا بیحد شائق تھا۔ لوگوں کو حج پر جانے کی نہ صرف ترغیب ہی دیتا بلکہ بیشمار لوگوں کو حج پر جانے کے لئے عطیات بھی دیا کرتا تھا۔ مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی کو اپنا رہنما تصور کرتا تھا ان کے جوتے سیدھے کرتا اور ان کے گھروں میں جا کر وعظ سنا کرتا تھا لیکن ۱۵۷۸ء میں اس کے مذہبی نظریات میں انقلاب رونما ہوا اس نظریاتی انقلاب کے عوامل اور مقاصد حسب ذیل تھے۔

آزاد خیالی اور رواداری :

اکبر نے اپنی بادشاہت کے آغاز سے ہی تیموری روایات پر چلتے ہوئے مذہبی رواداری کو اپنا شعار بنایا اگرچہ وہ پیدائشی سنی مسلمان تھا لیکن اوائل عمر سے ہی آزاد خیال اور وسیع النظر واقع ہوا تھا کورانہ تقلید اور فرضی و خود ساختہ قسم کے ڈھکوسلوں کا سخت مخالف تھا اکبر کے اتالیقوں نے بھی اسے وسیع النظر اور روشن خیال ہونے میں بہت مدد دی تھی۔ اس کا استاد عبداللطیف ایرانی آزاد خیال، تعصب سے بالا اور صلح کل کی حکمت عملی کا حامل تھا اس نے اپنے نوجوان شاگرد (اکبر) کے ذہن کو مذہبی رواداری کے سانچہ میں ڈھال کر وسیع النظر اور آزاد خیال بنا دیا۔ شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹوں فیضی اور ابوالفضل کی صحبت نے بھی اکبر کو تنگ نظر علماء سے متنفر اور آزاد خیال ہونے میں مدد دی چنانچہ اکبر نے مذہبی رواداری کو اپنا رہن سہن بناتے ہوئے سب سے پہلے جنگی قیدیوں کو غلام بنانا ممنوع قرار دیا اور ہندوؤں سے یاترا (پلگرام) ٹیکس و جزیہ ٹیکس وصول کرنا منع کر دیا نیز ہندوؤں کے لئے اعلیٰ سرکاری عہدوں کے دروازے کھول دیئے اس طرح شہری حقوق اور کاروبار سلطنت میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو مساوی مقام عطا کر کے اپنی آزاد خیالی کا مظاہرہ کیا۔

Marfat.com

سیاسی مصلحت: اکبر کے مذہبی خیالات کے تغیر میں سیاسی مصلحت بھی کارفرما تھی اس کی اولین خواہش یہ تھی کہ اسے مغلیہ سلطنت کے استحکام کیلئے برصغیر پاک و ہند کے تمام باشندوں کا تعاون حاصل ہو۔ نیز وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین صلح جوئی اور اتحاد کی فضا پیدا کر کے مذہبی نفرت اور متعصبانہ ذہنیت کو یکسر ختم کرنا چاہتا تھا تاکہ مغلیہ سلطنت کو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کی بھی حمایت اور اعانت حاصل ہو جائے اور دونوں قومیں مغلیہ سلطنت کی ترقی و وسعت اور استحکام کے لئے جدوجہد کریں اور ایسی مذہبی فضا کا حامی و خواہاں تھا جو صلح و آشتی اور باہمی میل ملاپ کا موجب بنے اور سلطنت میں مکمل امن و سکون قائم ہو جائے۔

مذہبی تحریکیں: سولہویں صدی عیسوی کا آغاز برصغیر پاک و ہند میں مذہبی احیا کا دور تھا اس عہد میں اسلام اور ہندو مت میں کئی نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں جنہوں نے عوام کے ذہنوں میں ہیجان کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی اور مذہبی طور طریقوں کی تبدیلی پر سوچ و بچار کرنے لگے تھے۔ گذشتہ دو صدیوں میں برصغیر میں بڑے وسیع پیمانے پر اشاعت اسلام ہوئی تھی۔ چنانچہ اسلامی توحید اور سماجی مساوات کے اصولوں نے ہندو معاشرے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس سے ہندوؤں میں بھگتی تحریک کا آغاز ہوا اس تحریک کے رہنماؤں نے ہندو سماج کی اصلاح، رواداری باہمی محبت اور توحید پرستی پر زور دیا۔ اور چھوت چھات اور باہمی نفرت کے خلاف پرچار کیا دوسری طرف تصوف، تحریکِ مہدویت اور فلسفہ و منطق نے برصغیر کے مسلمانوں کے ذہنی افکار میں تلاطم پیدا کر دیا۔ چنانچہ اسلامی تصوف میں صرف سخت ریاضت اور مجاہدات کا رجحان عام ہوا بلکہ فقر و فاقہ جیسے راہبانہ خیالات کو مقبولیت ہوئی اور ویدانتی فلسفہ کے زیر اثر وحدت الوجود نے ایک ہمہ گیر فلسفہ کی صورت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ شرعی اعمال کی اہمیت کم ہونے لگی پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں ملا سید محمد جونپوری نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کر کے تحریک مہدویت کا آغاز کیا تو زہد و نفس کشی اور کتاب و سنت کی پابندی کا رجحان عام ہوا۔ اسی طرح افغانستان میں تحریک روشنیہ نے بھی عوام کے ذہنوں میں تلاطم پیدا کر دیا علاوہ ازیں وسط ایشیا سے آئے ہوئے فضلا نے فلسفہ و منطق کی تبلیغ کر کے لوگوں کے ذہنوں میں انقلاب پیدا کر دیا اس سے آزاد خیالی کو تقویت ہوئی اور لوگوں نے ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا۔ ان تحریکوں نے نئے نظریات کو جنم دیا اکبر بھی ان تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

راجپوت بیویاں: ۱۵۶۲ء میں راجہ بہاری مل والئے جے پور کی لڑکی جودھا بائی سے شادی کرنے کے بعد اکبر نے متعدد دیگر راجپوت راجکماریوں سے شادیاں کیں۔ اگرچہ شرعِ اسلام کی رو سے مشرک عورت سے شادی اسے حلقہ بگوش اسلام کئے بغیر

Marfat.com

ناجائز ہے۔ مگر اکبر نے انہیں اسلام قبول کرنے کی کوئی دعوت نہ دی اور مذہبی معاملات میں آزاد روی اختیار کرتے ہوئے انہیں مکمل مذہبی آزادی دی۔ ان کے مذہبی خیالات سے بھی اکبر بہت متاثر ہوا اور ان کی خوشنودی کی خاطر اس نے کئی ایک ہندوانہ عقائد اپنا لئے جس سے اس کے مذہبی رجحانات میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی اور اس نے آزاد روی اختیار کرتے ہوئے اسلام اور ہندو ازم کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔

علماء کی باہمی مخالفت :

علماء کی باہمی مخالفت اور ان کے فروعی اختلافات سے بھی بادشاہ کا دل کھٹا ہو گیا تھا اکثر علماء تعصب و تنگ نظری سے کام لیتے ہوئے ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے تھے چنانچہ صدر الصدور شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری جن کا بادشاہ بہت احترام کرتا تھا نے اپنے اختیارات کو ناجائز استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ شیخ عبدالنبی نے ہندو رانی جودھا بائی (مریم زمانی) کے پروہت کو اکبر سے اجازت لئے بغیر قتل کروا دیا تھا۔ کیونکہ اس نے بزرگانِ اسلام کی شان میں گستاخی کی تھی اور ایک مسجد کے سامان پر قبضہ کر لیا تھا اس سے اکبر علماء کے خلاف ہو گیا۔ چنانچہ اس نے علماء کے زور کو کم کرنے اور مذہبی معاملات کو اپنے کنٹرول میں لینے کا فیصلہ کر لیا انہی ایام میں ۱۵۶۷ء میں شیخ مبارک نے اپنے بیٹے فیضی کو اور ۱۵۷۴ء میں ابوالفضل کو اکبر کے حضور پیش کیا چونکہ وہ تینوں باپ بیٹا جاہ طلب تھے اور آزاد خیال واقع ہوئے تھے اس لئے انہوں نے تصوف اور مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اکبر کے مذہبی خیالات کو غلط رُخ پر ڈالنے میں مدد دی۔ وہ برسر اقتدار علماء کے ہاتھوں سخت ایذا رسیدہ تھے کیونکہ ان علماء نے شیخ مبارک پر مہدویت کا حامی ہونے کا الزام لگا کر اسے طرح طرح کی تکالیف اور ایذائیں پہنچائی تھیں۔ اب ان تینوں باپ بیٹا نے بادشاہ کا قرب حاصل کر کے اُسے ان علماء سے نہ صرف متنفر کر دیا بلکہ ان کی تقلید سے بھی منحرف کر دیا۔ شاہی لائبریری میں تاریخ، فلسفہ، مذہب اور سائنس کے موضوعات پر بے شمار کتب تھیں فیضی نے بطور لائبریرین اکبر کو یہ کتابیں پڑھ کر سنائیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر کی آزاد خیالی کو مزید پختگی ملی اور وہ مذہبی لگاؤ کھو بیٹھا اور اس نے ہر مذہب کے متعلق بے لاگ تحقیق و تنقید شروع کر دی۔

عبادت خانہ :

۱۵۷۵ء میں اکبر نے مذہبی بحث و مباحث کے لئے فتح پور سیکری میں ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کروائی جس کا نام عبادت خانہ رکھا اس میں علماء کو بے لاگ مذہبی مباحث کی مجالس منعقد کرنے کی دعوت دی۔ اکبر خود بھی بڑے شوق سے ان میں شرکت کرتا تھا۔ شروع میں مسلم علماء کو مدعو کیا گیا راسخ العقیدہ سنی علماء کے رہنما صدر الصدور عبدالنبی اور مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری نے ان مباحث میں اہم کردار ادا کیا لیکن انہوں نے فقہ کے

Marfat.com

اختلافی مسائل اور فروعات میں ایک دوسرے کے خلاف "تنگ نظری" کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف نام لے لیکر ایک دوسرے کی تذلیل کرنی شروع کردی بلکہ بادشاہ کا احترام بھی کھو بیٹھے یہاں تک کہ ایک رات بقول عبدالقادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ " ان علماء نے ایک دوسرے کی تذلیل کرنے اور کافر کہنے میں اتنا زور صرف کیا کہ ان کی گردن کی رگیں پھول گیں۔ خوفناک شور ہونے لگا اور ہلڑ مچ گیا۔ بادشاہ ان کے غیر مہذب رویئے سے طیش میں آگیا۔" ایسی ہلڑ بازیاں بسا اوقات ہونے لگیں اس سے بادشاہ کے دل میں مذہب کے خلاف مزید شبہات پیدا ہونے لگے چنانچہ ۱۵۷۸ء میں اس نے دوسرے مذاہب کے علماء و فضلاء کو بھی مباحث میں شرکت کی دعوت دی۔ ساتھ ساتھ اسلام پر سے بادشاہ کا اعتقاد اٹھنے لگا اور وہ دوسرے مذاہب میں دلچسپی لینے لگا۔

اکبر نے دوسرے مذاہب مجوسیت، ہندومت، جین مت اور عیسائیت کے علماء کو بھی مذہبی مباحث میں مدعو کیا۔ اکبر کی خواہش تھی کہ تمام مذاہب کے علماء جذبات سے بالاتر ہو کر حقیقت کا اظہار کریں تاکہ وہ راستی کی طرف اس کی رہنمائی کر سکیں مگر اکبر کی کسوٹی پر کسی عالم کا رنگ نہ جم سکا۔ اکبر نے جو سیاسی سطح پر علماء کی بالادستی کو ناپسند کرتا تھا ۲۲ جون ۱۵۷۹ء کو فتح پور سیکری کی مسجد کے منبر سے خطبہ کے طور پر فیضی کی ایک رباعی پڑھی تاکہ مذہبی اور سیاسی لحاظ سے عوام کی نگاہ میں علماء کی بجائے بادشاہ کا تقدس اور احترام قائم ہو جائے۔

اجتہاد کا دعویٰ : ستمبر ۱۵۷۹ء میں اکبر کے اشارے پر ابوالفضل اور فیضی نے والد شیخ مبارک نے ایک محضر نامہ تیار کیا جس میں اکبر کو سارے ملک میں دینی اور مذہبی متنازعہ فیہ مسائل کے فیصلہ کے لئے عادل مطلق تسلیم کیا گیا تھا یعنی وہ غلطیوں سے مبرا اور اصلی مجتہد ہے، دینی متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق اس کا فیصلہ آخری ہوگا۔ اس محضر نامہ پر مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی اور شیخ مبارک کے علاوہ دیگر شاہی علماء نے بھی دستخط ثبت کئے۔ اس طرح بادشاہ کو اجتہاد کے درجہ پر پہنچا دیا گیا اور امام عادل کی حیثیت سے اس کا مقام اس عہد کے تمام آئمہ اور فقہاء سے بلند قرار دیدیا گیا جس سے دینی مسائل کے فیصلوں میں اس کی مخالفت ناممکن ہوگئی۔ عبدالقادر بدایونی اور نظام دین کے ملفوظات میں یہ محضر نامہ بدیں الفاظ محفوظ ہے۔

" اب جبکہ یہ صغیر امن و امان کا مرکز اور عدل و انصاف کا گہوارہ بن گیا ہے اور علماء و فضلاء کی ایک بھاری تعداد عرب و عجم سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہو چکی ہے اور انہوں نے برصغیر کو اپنا وطن بنا لیا ہے تو اب ہم علماء جو نہ صرف قانون کے عقائد سے بعض میں ماہر فقہ کے اصولوں سے باخبر اور عقل و دلیل میں یکتا ہیں بلکہ اپنی دیانتداری اور زہد و

Marfat.com

تقوی کی وجہ سے مشہور و معروف ہیں۔ اولاً آیتِ قرآن "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولوا الامر منکم" (اطاعت کرو اللہ کی، اس کے رسول ؐ کی اور جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں)، اور ثانیاً مستند حدیث "یقیناً قیامت کے روز اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزیز امامِ عادل ہوگا۔" ثالثاً "جو کوئی امیر کی اطاعت کرتا ہے وہ میری (اللہ کی) اطاعت کرتا ہے اور جو کوئی اس کے خلاف بغاوت کرتا ہے میرے (اللہ کے) خلاف بغاوت کرتا ہے۔" کے عمیق معنوں کو عقل و فہم اور دلائل کی بنیاد پر تسلیم کرتے ہیں اور اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک عادل بادشاہ کا مرتبہ مجتہد سے بلند تر ہے۔"

"مزید برآں ہم اعلان کرتے ہیں کہ بادشاہِ اسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علی العالمین ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی (خدا اس کی مملکت کو دوام بخشے) عادل، عاقل اور خدا ترس بادشاہ ہے۔ اس لئے اگر آئندہ کوئی مذہبی مسئلہ پیدا ہو جس پر مجتہدین مختلف رائیں رکھتے ہوں تو جہاں پناہ اپنی اعلیٰ فہم و فراست سے کام لے کر قومی مفاد اور سیاسی مصلحت کے پیشِ نظر ان متضاد آراء پر اپنا شاہی حکم جاری کر سکتے ہیں۔ ہم اس بات پر متفق ہیں کہ اس قسم کا فرمان ہم پر اور پوری قوم پر قابلِ نفاذ ہوگا۔"

"علاوہ ازیں ہم اعلان کرتے ہیں کہ بادشاہ بوقتِ ضرورت نئے احکام جاری کرنے کا مجاز ہے اور ہم اور پوری قوم ان احکام کی پابند ہوگی بشرطیکہ اس قسم کا حکم نہ صرف قرآن کے مطابق ہو بلکہ اس میں قوم کا مفاد بھی مضمر ہو۔ اس کی مخالفت آخرت کی تباہی کا موجب ہوگی اور اس جہان میں مال و جائداد کی ضبطی اور مذہبی مراعات سے محرومی پر منتج ہوگی۔"

"یہ مسودہ (محضر نامہ) نیک نیتی سے تیار کیا گیا اس سے خدا کی برتری کا اظہار اور اسلام کی اشاعت مقصود ہے اور ہم بڑے بڑے علماء و فضلاء نے ماہِ رجب نو سو ستاسی ہجری میں اس پر دستخط ثبت کئے ہیں۔"

اس محضر نامہ پر علمائے وقت کے جبراً دستخط کرائے گئے اس طرح بادشاہ کو اجتہاد کے منصب پر پہنچا دیا گیا۔ مندرجہ بالا محضر نامہ جس کو مشہور مورخ دی اے سمتھ "اعلانِ معصومیت" قرار دیتا ہے نے اکبر کو مجتہدین کی متضاد آراء میں سے کسی ایک کو قبول کرنے کا اختیار عطا کر دیا اور متنازعہ فیہ مسائل میں اسے خود مختارانہ پالیسی اختیار کرنے کا حق عطا کر دیا۔ اس طرح اکبر نے اپنے آپ کو اُن

Marfat.com

حقوق کا حامل بنا لیا جو قبل ازیں صرف علماء بالخصوص صدالصدور کو حاصل تھے تاہم یہ کہنا غلط ہے کہ اکبر اس محضر نامہ کی رو سے بادشاہ ہونے کے علاوہ مذہبی پیشوا بھی بن گیا۔

محضر نامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وی اے سمتھ رقمطراز ہے کہ "اس محضر نامہ نے اکبر کو دائرہ اسلام میں سب سے زیادہ قوت اور اختیار سے مزین کیا اس محضر نامہ کا دیگر مذاہب سے کوئی تعلق نہ تھا تاہم بدایونی کی یہ رائے مبنی بر حقیقت ہے کہ اس سے بادشاہ کی عقلی برتری اور فوقیت قائم ہو گئی اور اس کی مخالفت ناممکن بنا دی گئی۔"

اگرچہ عبادت خانہ میں مذہبی مباحث جاری رہے مگر اکبر نے اب مختلف مذاہب کے رہنماؤں سے علیحدہ پرائیویٹ مجالس کا بھی اہتمام کیا۔ سنی عقیدہ سے ہٹ کر وہ شیعہ عقیدہ کی جانب متوجہ ہوا۔ حکیم ابوالفتح اور ملا محمد یزدی نے بادشاہ کو شیعہ عقیدہ اپنانے پر اکسایا لیکن اکبر شیعہ عقیدہ میں بھی سکون نہ پاتے ہوئے صوفیانہ مسلک کی جانب متوجہ ہوا۔ شیخ فیضی اور بدخشاں کے مرزا سلیمان نے اسے صوفی ازم کے تمام اصولوں سے آشنا کیا لیکن اس نے صوفی مسلک کو بھی اپنے ذہنی سکون کے لئے ناکافی پایا تب اس نے غیر مسلم مذاہب کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔

مجوسیت: اکبر مجوسیت (آتش پرستی) سے بہت متاثر ہوا۔ مجوسی مذہب کے رہنما دستور مہیار جی رانا (Dastur Mahyarji Rana) نے اکبر کو مجوسی مذہب کی تعلیم سے آشنا کیا۔ شاہی محل میں الفضل کے زیر اہتمام آگ بھی روشن کی گئی حتیٰ کہ اکبر نے پارسی مذہب کے عقائد کو اپناتے ہوئے ۱۵۸۰ء میں سورج، آگ اور روشنی کی باقاعدہ پرستش شروع کر دی۔ اکبر نے پارسی تہواروں کے منانے کا اہتمام کرنے کے علاوہ قدیم پارسی کیلنڈر بھی جاری کیا۔

عیسائیت: اکبر نے گوا سے پرتگیزی پادریوں کو طلب کیا تاکہ وہ ان سے عیسائیت کے اصولوں سے آگاہ ہو سکے۔ ۱۹ فروری ۱۵۸۰ء کو پہلا پرتگیزی پادریوں کا مشن ریڈلفو اکیوا ویرا (Ridolfo Aquaviva) انتونیو مونسٹریٹ (Antonio Monserrate) اور ایمری کوئنز (Anriquez) کی سرگردگی میں فتح پور سیکری پہنچا۔ جو اپریل ۱۵۸۲ء تک اکبر کے دربار میں ٹھہرا۔ دوسرا مشن ایڈورڈ لیوٹن (Edward Leioton) اور کرسٹوفر ڈی ویگا (Christopher De-Vaga) کی سرکردگی میں ۱۵۹۱ء سے ۱۵۹۲ء تک اکبر کے پاس رہا۔ تیسرا مشن مئی ۱۵۹۵ء میں جیرم زیویر (Jerome Xavier) ایمرنوائل پنہیرو (Emmanuel Pinheiro) اور بینیڈکٹ ڈی گوز (Benediot de-goes) پر مشتمل لاہور کے مقام پر اکبر کے حضور حاضر ہوا جو ۱۶۰۵ء میں اکبر کی وفات تک اس کے ہاں مقیم رہا۔ اکبر چونکہ عیسائی مذہب سے پورے

Marfat.com

طور پر آگاہ ہونا چاہتا تھا اس لئے وہ ایک ہوشیار شاگرد کی مانند اکثر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہ السلام کے مجسموں کے سامنے تعظیماً کھڑا ہو جاتا اور بسا اوقات چرچ میں بھی حاضری دیتا اس نے عیسائیوں کو لاہور اور آگرہ میں گرجا گھر تعمیر کرنے اور ان میں مذہبی فرائض کی آزادانہ ادائیگی کی اجازت کے علاوہ تبلیغ عیسائیت کی بھی کھلی اجازت دی۔ اکبر نے عیسائی پادریوں کو ہر ممکن سہولت فراہم کی اور انہیں اپنے مہمانِ خاص کی حیثیت سے اپنے دربار میں رکھا۔

جین مت: اکبر عیسائیت سے زیادہ جین مت سے متاثر ہوا۔ ۱۵۸۲ء میں اس نے جین مت کے پیشوا ہیرا وجے سوری کو گجرات سے بلایا اکبر اس کے کردار اور اخلاق سے بہت ہی متاثر ہوا چنانچہ اس کی تبلیغ پر اس نے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ پرندوں کو آزاد کر دیا اور مخصوص دنوں میں جانوروں کے ذبیحہ کو ممنوع قرار دے دیا نہ صرف شکار کھیلنا ترک کر دیا بلکہ گوشت کھانا بھی چھوڑ دیا۔ ہیرا وجے سوری کے علاوہ جین مت کے متعدد پیشوا اکبر کے حضور حاضر ہوئے جنہوں نے جین مت کے اصولوں اور اپنے کردار سے اس حد تک اکبر کو متاثر کیا کہ اس نے ایک فرمان کے ذریعے جانوروں کے ذبیحہ کو سختی سے ممنوع قرار دیا اور حکم عدولی پر سزائے موت کا حکم دیا۔

ہندومت: ہندو مورخین کی رائے میں اکبر ہندومت سے سب سے زیادہ متاثر ہوا چنانچہ اس نے ہندومت سے پوری آگاہی حاصل کرنے کے لئے متعدد ہندو پیشواؤں کو بھی دعوت دی جن میں سے پرشوتم اور دیوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہندو رانیوں اور ہندو امراء کی دربار میں موجودگی کے باعث ہندومت کی طرف اکبر کا رجحان قدرتی تھا۔ چنانچہ اس نے ہندومت کے بہت سے عقائد اپنانے کے علاوہ ہندو تہواروں دیوالی، دسہرہ، ہولی اور بسنت کے منانے کا بھی خاص اہتمام کیا۔ بادشاہ نے ہندوؤں کی طرح ماتھے پر تلک لگانا، جھروکہ درشن میں بیٹھنا اور ہندو راجاؤں کی مانند حکومت کرنی شروع کی۔ علاوہ ازیں اس نے ہندوؤں کو مذہبی آزادی عطا کی اور گاؤکشی کو ممنوع قرار دیا۔ ہندومت کی اصلاح کی خاطر رسم ستی کو ممنوع قرار دے کر ہندو بیوہ کو شادی کی اجازت عطا کی۔ مگر کسی بھی مذہب نے اکبر کو اس حد تک متاثر نہیں کیا کہ وہ کلی طور پر اس کا پیروکار بن جاتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر کسی مذہب کا بھی رنگ نہ جم سکا۔

نظریہ الفی: اکبر مہدویت تحریک سے بھی بہت متاثر ہوا۔ جاہ پسند درباری خوشامدیوں نے اس کے دماغ میں ایک نیا خیال جاگزیں کر دیا کہ آنحضرتؐ کے دین کی مدت کل ایک ہزار (الف) سال تھی جو پوری ہو چکی ہے اندریں صورتِ حال وقت کے تقاضوں کے مطابق اور دین میں تغیر و اشتہار کے امکانات کے پیشِ نظر ایک نئے دین اور نئے مبلغ و شارع

Marfat.com

کی ضرورت ہے۔ جاہ پسند، خوشامدی مصاحبوں نے اکبر کو اس امر کا یقین دلایا کہ حقیقتاً وہ اس منصب کا صحیح اہل ہے۔ ان خوشامدیوں نے بہت سی جھوٹی دلیلیں اور پیش گوئیاں پیش کر کے اکبر کو صاحبِ زمان ثابت کرنے کی کوشش کی۔ جاہ طلب برہمنوں نے بھی بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور انعام و اکرام حاصل کرنے کے لئے بوسیدہ کاغذ کے پرزوں پر اقوال پیش کئے۔ عبدالقادر بدایونی کے قول کے مطابق "گجرات کے صدر حاجی ابراہیم سرہندی نے شیخ ابن عربی کی کتاب سے ایک جعلی عبارت نقل کر کے بادشاہ کو بھیجی جس کا مفہوم یہ تھا کہ صاحبِ زمان کے حرم میں بہت سی عورتیں ہوں گی اور وہ داڑھی منڈا ہوگا۔"

اکبر کتابی علوم سے بے بہرہ ہونے کے باعث ان مصاحبوں، دانشوروں اور مختلف المذاہب خوشامدی علماء کی ان دلیلوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس نے ان پیش گوئیوں اور دلائل کو سچ سمجھتے ہوئے اپنی شخصیت کو ویسا ہی قیاس کرنا شروع کر دیا اور نئے سال کے سکوں کا نام بھی الفی رکھا اور ان پر سنِ الف (ہزار) کی تاریخ کندہ کرائی۔ علاوہ ازیں اس نے تاریخِ الفی کے نام سے ایک نئی تاریخ مرتب کرنے کا بھی حکم دیا جسے ملا احمد ٹھٹھوی، نقیب خاں اور جعفر بیگ نے مرتب کیا۔

دینِ الٰہی

اکبر نے روایات اور شریعتِ اسلامی سے بالاتر ہو کر اپنی سلطنت میں ہر فرقہ کو مکمل مذہبی آزادی دی۔ فطری طور پر اسے ان تنگ نظر اور متعصب مذہبی دیوانوں کے مواعظ سے دکھ ہوتا تھا جو ایک دوسرے کے خلاف بلاوجہ مذہبی نفرت پھیلا رہے تھے وہ اپنی پوری سلطنت میں تمام مذاہب کے درمیان ہم آہنگی اور امن و سکون کی فضا پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ ۱۵۸۱ء میں جب وہ کابل کی مہم سے کامیاب واپس لوٹا اور ملک میں صورتِ حالات بھی ہر اعتبار سے پُرامن اور سازگار تھی اس نے تمام علماء و فضلا اور منصب داروں کا اجلاس بلایا۔ اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جب وہ سیاسی طور پر ایک بادشاہ کے ماتحت ہیں تو انہیں مذہبی لحاظ سے بھی ہم آہنگ اور متحد ہونا چاہیئے اور ایسے نظریئے کو اپنا مسلک بنانا چاہیئے جو تمام مذاہب کی خوبیوں سے مزین ہو اور اس کا نام توحیدِ الٰہی ہونا چاہیئے۔ اس طرح اکبر نے سرکاری مذہب کا اعلان کیا جس کو دینِ الٰہی یا توحیدِ الٰہی کا نام دیا گیا۔

نئے مذہب دینِ الٰہی کا بنیادی اصول کامل رواداری یعنی صلح کل کی پالیسی پر مبنی تھا بادشاہ نے اس مذہب کے بنیادی اصول تمام مذاہب کے عقائد سے لئے تھے یعنی خدا کی وحدانیت کو اسلام سے، سورج، آگ اور روشنی کے احترام کو مجوسیت سے، گوشت خوری کے پرہیز کو جین مت اور گئو رکھشا کو ہندو مت سے اخذ کیا تھا لیکن اس مذہب کا اصل بنیادی نقطہ بادشاہ کی ذات سے پوری عقیدت اور اس سے وفاداری تھا۔

Marfat.com

دینِ الٰہی کے عقائد و رسوم

۱۔ طریقۂ بیعت: اکبر دینِ الٰہی کا پیشوا ہونے کی حیثیت سے لوگوں کو دینِ الٰہی قبول کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ دینِ الٰہی میں شامل ہونے والے ہر آدمی کے لئے لازم تھا کہ وہ راجے پر ٹیک لگائے، اتوار کے روز بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو اور اپنی پگڑی کو سر سے اتار کر ہاتھ میں تھام لے نیز اپنا سر بادشاہ کے قدموں میں رکھ دے اس سے یہ مراد تھی کہ بیعت کرنے والے نے دھوکہ بازی اور خود غرضی کو ترک کر دیا ہے۔ اور وہ دل و جان سے اپنے مذہبی پیشوا کے حضور حاضر ہے۔ اکبر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا، اپنے ہاتھوں سے اس کے سر پہ پگڑی رکھتا اور ساتھ ہی ایک تمغہ دیتا جس پہ اللہ اکبر لکھا ہوتا تھا۔

۲۔ سلام کا طریقہ: دینِ الٰہی کے اراکین جب آپس میں ملتے تو السلام علیکم کی بجائے اللہ اکبر اور جل جلالہ، کہہ کر ایک دوسرے کا استقبال کرتے تھے۔

۳۔ دعوتِ عظیم: اکبر نے حکم دیا کہ موت کے چالیس دن بعد کی دعوت کا اہتمام زندگی ہی میں کرنا چاہیئے۔

۴۔ یومِ ولادت: اکبر نے ایرانی تہذیب کے زیرِ اثر اپنے مریدین کو حکم دیا کہ وہ یومِ ولادت خوب دھوم دھام سے منایا کریں اور خود اپنے ہاتھ سے خیرات تقسیم کیا کریں۔

۵۔ گوشت سے اجتناب: اکبر کے دینِ الٰہی میں گوشت کھانا ممنوع تھا۔ قصاب، مچھیرے اور شکاری کے ساتھ کھانا کھانے کی بھی ممانعت تھی البتہ گوشت دوسروں کو دیا جا سکتا تھا لیکن گوشت کو ہاتھ لگانا گناہ تھا۔

۶۔ تجہیز و تکفین: مردے کی تجہیز و تکفین کے متعلق حکم تھا کہ مردے کے گلے میں پختہ رسّے اور کچا اناج باندھ کر دریا میں ڈال دیا جائے جب لاش کے تمام گناہ دھل جائیں تو لاش کو دریا سے نکال کر نذرِ آتش کر دیا جائے یا اگر دفن کیا جائے تو سر مشرق کی طرف اور پاؤں مغرب کی طرف کئے جائیں۔

۷۔ سونے کے متعلق حکم: اس مذہب کے پیروکار سر مشرق کی طرف اور پاؤں مغرب کی جانب کر کے سوئیں۔

۸۔ معاشرتی احکام: دینِ الٰہی کے تحت بوڑھی حاملہ اور بانجھ عورتوں سے شادی ممنوع تھی۔

Marfat.com

خلافتِ اسلام احکام

عبدالقادر بدایونی اور عیسائی مشنریوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے دین الٰہی کے نفاذ کے بعد چند ایسے احکامات جاری کئے جن کا مقصد محض مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنا تھا ان احکامات کا مختصر ذکر حسب ذیل ہے :-

۱۔ محمد، احمد اور مصطفےٰ ایسے نام رکھنے ممنوع قرار پائے۔

۲۔ نئی مساجد کی تعمیر بند اور قدیم مساجد منہدم کر دی گئیں۔ نیز اذان کی ممانعت کر دی گئی۔

۳۔ نماز، روزے اور حج پر پابندی عائد کر دی گئی۔ علومِ اسلامیہ کی حوصلہ شکنی کی گئی۔

۴۔ گاؤکشی اور گائے کا گوشت کھانا ممنوع قرار پایا۔ نیز پیاز اور لہسن کے استعمال پر بھی پابندی عائد کر دی۔

۵۔ مردوں کے لئے ریشمی لباس اور سونے کے زیورات پہننا جائز قرار پایا۔ نیز بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز ہونا لازمی قرار پایا۔

۶۔ بارہ سال کی عمر سے قبل ختنہ ممنوع قرار دے دیا گیا البتہ اس کے بعد لڑکے کو یہ اختیار حاصل تھا کہ ختنہ کرائے یا نہ کرائے۔

۷۔ محل میں سور اور کتے پالے گئے جنہیں بادشاہ ہر صبح باقاعدگی سے دیکھتا تھا۔

۸۔ ایک جوا گھر خاص دربار میں قائم کیا گیا۔

تبصرہ

دینِ الٰہی اکبر کی آزاد خیالی کا مظہر تھا۔ اکبر نے اپنی سلطنت کے مختلف النوع لوگوں کو پوری طرح متحد کرنے کے لئے دین الٰہی رائج کیا تاکہ برصغیر کے سب لوگ ایک مذہب پر متفق ہو کر اپنے اختلافات کو ختم کر دیں۔

ایک مذہب کی حیثیت سے اکبر کا وضع کردہ "دین الٰہی" بالکل ناکام رہا۔ کیونکہ مذاہب کسی انسانی منصوبے کے تحت عالمِ وجود میں نہیں آتے بلکہ ہمیشہ خداوند تعالےٰ کی طرف سے مبعوث پیغمبر ہی اس منصب کو بجا لاتے ہیں۔ لیکن اکبر کا وضع کردہ مذہب اس کی خود پسندی، آشفتہ خیالی اور کم علمی کا نتیجہ تھا۔ بقول وی۔ اے سمتھ "دین الٰہی" اکبر کی فہم و فراست کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی حماقت کی یادگار ہے۔"

اگرچہ اکبر آزاد خیال اور روادارانہ حکمت عملی کا حامی تھا لیکن سیاست کے ساتھ ساتھ مذہب کے میدان میں بھی وہ کسی کو اپنا حریف برداشت کرنے کو تیار نہ تھا وہ ایک مطلق العنان حکمران تھا اس لئے تخت اور مذہب دونوں پر اپنی مطلق العنانی قائم رکھنے کا خواہاں تھا۔ وی۔ اے سمتھ کی رائے مبنی بر حقیقت ہے کہ "اکبر کا وضع کردہ دین الٰہی مضحکہ خیز شاہی غرور اور بے لگام مطلق العنانی کا نتیجہ تھا۔"

Marfat.com

وہ ان پڑھ تو تھا ہی درباری خوشامدیوں اور جاہ پسندوں کی باتوں میں آگیا اور ابوالفضل جیسے چرب زبان مشیر کی اعانت اور ہندو بیویوں کے اثر نے اسے اس خیال پہ ابھارا کہ وہ نئے مذہب کے ذریعے ہندومت اور اسلام کو یکجا کر کے ہندی قومیت کو پیدا کرے لیکن وہ اس مقصد میں بری طرح ناکام رہا۔

اکبر کا یہ خود ساختہ مذہب جسے اس نے "دین الٰہی" کا نام دیا دراصل پارسی، جین مت اور ہندومت کا مرکب تھا جس کے ذریعے اس نے مذہبی حلقوں میں برتری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن عوام نے اسے اپنے مذاہب میں مداخلت سمجھتے ہوئے اسے مطلقاً درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ نیز اس سے مسلمانوں کا جذبۂ قومیت اور سلطنت کے استحکام کے لئے ان کی حمایت سرد پڑ گئی جس سے بالآخر مغل حکومت کو نقصان پہنچا۔ دین الٰہی کے بارے میں مورخین کی آراء میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے اس لئے ان کی آراء کا حوالہ دینا نہایت ضروری ہے۔

عبدالقادر بدایونی اور پرتگیزی عیسائی مشنری رقمطراز ہیں کہ "دین الٰہی کا نفاذ کر کے اکبر مذہب اسلام سے منحرف ہو گیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے اسلامی شرع کے برعکس کئی ایک احکام جاری کئے"۔ لیکن جدید تحقیق سے یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ بدایونی اور پرتگیزی مشنریوں کی رائے قابلِ اعتماد نہیں ہے بلکہ تعصب پر مبنی ہے۔

ابوالفضل اکبر کی تعریف کرتے ہوئے اسے ایک صوفی منش انسان شمار کرتا ہے اور دین الٰہی کے بارے میں لکھتا ہے۔ "دین الٰہی کی بنیاد عقل پر ہے اور یہ صلح کل یا کامل رواداری کے اصول کا فطری نتیجہ ہے"۔ جبکہ جہانگیر تحریر کرتا ہے کہ "ابوالفضل کے قتل کے ساتھ اکبر کی بداعتقادی کا خاتمہ ہو گیا تھا اور مرتے وقت وہ مسلمان تھا"۔

اے ایس بیورج رقمطراز ہے کہ "اکبر نے اپنا آبائی مذہب ترک نہیں کیا تھا وہ محض آزاد خیال تھا لیکن اکبر کا فقیر نہ تھا"۔

کاؤنٹ نوبرے کی رائے ہے کہ "اکبر کا دین الٰہی کوئی نیا مذہب نہ تھا بلکہ محض ایک نیا عقیدہ تھا جو صوفیانہ خیالات اور ہندومت اور مجوسیت کے اصولوں پر مشتمل تھا"۔

پروفیسر سری رام شرما رقمطراز ہے کہ "دینِ الٰہی کو مذہب کا درجہ دینا بہت بڑی مبالغہ آمیزی

Marfat.com

ہے دین الٰہی کی نہ کوئی کتاب تھی نہ مذہبی علماء نہ رسومات اور نہ ہی مذہبی معتقدات یہ محض ایک شاہی حکم تھا مذہب نہ تھا۔"

الیشوری پرشاد کا قول ہے کہ "اکبر کا ایجاد کردہ مذہب محض ایک عقیدہ تھا جو تمام مذاہب کی خوبیوں پر مشتمل تھا اس میں فلسفہ تصوّف اور قدرتی مناظر کی پرستش کی جھلک تھی جو بادشاہ کی اپنی ذات تک محدود تھی۔"

ڈاکٹر اے ایل سری واستوا کی رائے ہے کہ "نیا مذہب اس کی صلح کُل حکمتِ عملی اور برصغیر کے باشندوں کو جذبۂ قومیت عطا کرنے کے نظریہ کا نتیجہ تھا۔"

سر ولزلے ہیگ کا قول ہے کہ "اکبر نے اپنے مشیروں کے اکسانے پر ایک نیا مذہب رائج کیا وہ اس بات کا خواہاں تھا کہ برصغیر کے تمام لوگ اس کی مرضی کے تابع ہوں حالانکہ اس چیز کی اجازت نہ مذہبِ عیسائیت دیتا ہے اور نہ دینِ اسلام۔"

نظامِ مالیہ

اگرچہ سولھویں صدی عیسوی میں موجودہ دور کا سائنٹیفک مالیاتی نظام وجود میں نہ آیا تھا تاہم اکبر کا نافذ کردہ مالیاتی نظام اپنے وقت کے مطابق بہت ہی ترقی پذیر اور مضبوط تھا اکبر نے اس کے نفاذ کے سلسلے میں مظفر خاں، شہاب الدین احمد اور راجہ ٹوڈرمل جیسے ماہرینِ معاشیات کی صلاحیتوں اور تجربات سے فائدہ اٹھایا اور کافی غور و خوض اور تجربات کے بعد تمام مملکت کے لئے انصاف پر مبنی یکساں طور پر مفید مالیاتی نظام قائم کیا اس نظام میں عوام کی خوشحالی اور حکومت کی مالی ضروریات کو بالعموم اور ملکی حالات کی ترقی کو بالخصوص مدِ نظر رکھا گیا تھا۔

۱۵۸۲ء میں اکبر نے راجہ ٹوڈرمل کو مرکزی دیوان مقرر کیا۔ یہ شخص شیر شاہ سوری اور مظفر خاں ترینی جیسے ماہرِ معاشیات کا تربیت یافتہ تھا اس نے اپنی خداداد انتظامی قابلیت اور مالیاتی نظام میں وسیع تجربے کی بنا پر شیر شاہ سوری کے نظامِ مالیہ کی تصحیح اور اس میں نئی اصلاحات کا اضافہ کر کے نظام مالیہ کی از سرِ نو تنظیم کی۔ اکبر نے ٹوڈرمل کے بندوبست کو بہت پسند کیا اور اسے آئینِ دہ سالہ کی رو سے لاہور، ملتان، دہلی، آگرہ، الہ آباد، مالوہ، اجمیر اور اودھ کے صوبوں میں نافذ کر دیا۔ چونکہ یہ نظام چند ضوابط کے تحت نافذ ہوا بدیں وجہ نظامِ ضبطی کہلایا اس کو آئینِ دہ سالہ یا رعیت واڑی سسٹم یا ٹوڈرمل کا بندوبستِ اراضی بھی کہتے ہیں۔ چونکہ یہ نظام اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد تک رائج رہا اس لئے اسے مغلیہ نظامِ مالیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ نظام مندرجہ ذیل اصولوں پر قائم تھا۔

پیمائشِ اراضی

نظامِ ضبطی کے تحت تمام مزروعہ زمین کی پیمائش کرائی گئی اگرچہ اکبر سے قبل شیر شاہ سوری نے بھی مزروعہ زمین کی پیمائش کروائی تھی مگر اس کا طریق

Marfat.com

پیمائش ناقص تھا کیونکہ اس نے پیمائش کے لئے رسی کی جریب استعمال کی تھی جو موسم گرما اور سرما میں بڑھ جاتی تھی اور برسات کے موسم میں سکڑ جاتی تھی جس کی وجہ سے اس سے صحیح پیمائش نہ ہوتی تھی علاوہ ازیں بدعنوان سرکاری کارکن بھی اس سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ اکبر نے رسی کی جریب کی بجائے بانس کی جریب رائج کی جو بانس کے ٹکڑوں کو لوہے کے کڑوں سے جوڑ کر بنائی گئی تھی اور جس کے دونوں جانب لوہے کے کُنڈے ہوتے تھے جس کا بارش کے دنوں میں سکڑنے یا گرمی یا سردی کے موسم میں بڑھنے کا کوئی احتمال نہ تھا۔ مزید برآں اکبر نے سکندر لودھی کے رائج کردہ گز کے مطابق ۳۲ انچ کا گز رائج کیا اور بیگھہ کو ۶۰ × ۶۰ گز ۳۶۰۰ مربع گز کا قرار دیا۔ اس طرح اکبر نے ہر گاؤں پرگنہ، سرکار اور صوبہ بلکہ ساری سلطنت کی مزروعہ زمین کی پیمائش کروائی اور کھتونی اور خسرہ نمبر کے تحت اس کا باقاعدہ ریکارڈ قائم کیا۔

اراضی کی تقسیم

اکبر کے نظام ضبطی کے تحت سلطنت کی ساری مزروعہ زمین کو چار درجوں (حصّوں) میں تقسیم کیا گیا۔ یہ تقسیم زمین کی کسی خاص قسم یا اس کی زرخیزی کی بنا پر نہیں بلکہ زمین کی مسلسل کاشت کے تحت کی گئی تھی۔

ا۔ پولاج: وہ زمین جو باقاعدگی سے زیر کاشت آتی تھی۔

ب۔ پرَوتی: وہ زمین جو بالعموم ہمیشہ زیر کاشت آتی تھی لیکن جسے کبھی کبھار خالی چھوڑنا پڑتا تھا تاکہ اپنی قوتِ زرخیزی دوبارہ حاصل کرے۔

ج۔ چاچر: وہ زمین جس کو پیداواری قوت کی بحالی کے لئے دس سال کے عرصے میں تین یا چار سال کے لئے خالی چھوڑنا پڑتا تھا۔

د۔ بنجر: وہ زمین جو دس سال میں پانچ سال تک بغیر کاشت کے پڑی رہتی تھی۔

اس تقسیم کے تحت ہر صوبے کی زمین کا باقاعدہ سرکاری ریکارڈ رکھا جاتا تھا اور پہلے دو درجوں پولاج اور پرَاوتی کی زمین کو مزید تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا تھا مثلاً عمدہ، متوسط اور خراب۔

لگان کا تعین

عمدہ، متوسط اور خراب ٹکڑوں کی اوسط پیداوار کی قیمت کا تہائی حصہ لگان متعین کیا جاتا تھا۔ لگان کا تعین ہمیشہ سرکاری ریکارڈ یعنی جمعبندی کے مطابق ہوتا تھا جس کو عامل گزار یا عامل تیار کرتا تھا۔ جمعبندی کھیتوں کی صحیح پیداواری نوعیت سے متعلق قانونگو یا پٹواری کے مہیا کردہ گوشواروں کے مطابق تیار کی جاتی تھی۔ جمعبندی کی تیاری یا مالیہ کی رقم کے تعین میں ہمیشہ اراضی کی تقسیم، زمین کی زرخیزی اور گذشتہ دس سال کی سالانہ اوسط پیداوار کو مدنظر رکھا جاتا تھا یعنی مالیہ کے تخمینے کے لئے فی بیگھہ پیداوار کے تین درجوں (عمدہ پیداوار، متوسط پیداوار اور خراب پیداوار) کی اوسط کو فی بیگھہ اوسط پیداوار قرار دیا اور اس طرح دس سالوں ۱۵۷۱ء تا

Marfat.com

۱۵۸۰ء کی سالانہ اوسط پیداوار کے اعداد جمع کرکے اور اسے دس پر تقسیم کرکے کسی علاقے کی فی بیگھہ اوسط پیداوار معلوم کر لی جاتی، اس اوسط پیداوار کی قیمت کے ایک تہائی (۱/۳) حصہ کو اس علاقے کے لئے فی بیگھہ سرکاری مالیہ تشخیص کیا جاتا۔ مندرجہ ذیل مثالیں اکبری لگان کو سمجھنے کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔

۱۔ اجناس کی شکل میں لگان کا تعین فی بیگھہ :۔

قسم اراضی	سال	فصل	قسم پیداوار	حاصل پیداوار
پولاج اور پرافتی	۱۵۷۱ء	گندم	عمدہ۔ متوسط اور خراب	۲۴ من
〃 〃	۱۵۷۲ء	〃	〃 〃 〃	〃 ۲۲
〃 〃	۱۵۷۳ء	〃	〃 〃 〃	〃 ۱۸
〃 〃	۱۵۷۴ء	〃	〃 〃 〃	〃 ۲۰
〃 〃	۱۵۷۵ء	〃	〃 〃 〃	〃 ۱۶
〃 〃	۱۵۷۶ء	〃	〃 〃 〃	〃 ۱۸
〃 〃	۱۵۷۷ء	〃	〃 〃 〃	〃 ۲۲
〃 〃	۱۵۷۸ء	〃	〃 〃 〃	〃 ۱۸
〃 〃	۱۵۷۹ء	〃	〃 〃 〃	〃 ۲۸
〃 〃	۱۵۸۰ء	〃	〃 〃 〃	〃 ۲۴

میزان = ۲۱۰ من

اوسط پیداوار = ۲۱۰ ÷ ۱۰ = ۲۱ من

سرکاری شرح لگان = ۲۱ ÷ ۳ = ۷ من فی بیگھہ

۲۔ نقدی کی شکل میں لگان کا تعین :۔

سال	نرخ گندم فی من
۱۵۷۱ء	۱ روپیہ فی من
۱۵۷۲ء	۱ روپیہ 〃
۱۵۷۳ء	۲ روپے 〃
۱۵۷۴ء	۲ روپے 〃
۱۵۷۵ء	۳ روپے 〃
۱۵۷۶ء	۳ روپے 〃

Marfat.com

۱۵۷۷ء	۴ روپے فی من
۱۵۷۸ء	۴ روپے "
۱۵۷۹ء	۵ روپے "
۱۵۸۰ء	۵ روپے "

میزان = ۳۰ روپے فی من

اوسط قیمت = ۳۰ ÷ ۱۰ = ۳ روپے فی من

نقد شرحِ لگان = اوسط پیداوار فی بیگھہ × اوسط قیمت فی من / ۳

= ۳ × ۲۱ / ۳ = ۲۱ روپے فی بیگھہ

لگانِ اراضی کی وصولی

لگان کی وصولی سال میں دو بار کی جاتی تھی اولاً خریف (ہاڑی) کی فصل کے بعد اور ثانیاً ربیع (ساونی) کی فصل کے بعد۔ لگان نمبردار کی وساطت سے عامل گذار اور اس کا ماتحت پٹواری وصول کرتا تھا جس کے لئے نمبردار کو لگان کا ۲½ فیصد عوضانہ ملتا تھا۔ سرکاری کارکنوں کو حکومت کی طرف سے ہمیشہ یہ ہدایت ہوتی تھی کہ کاشت کار سے گذشتہ لگان پہلے وصول کیا جائے۔

لگان کی وصولی سے قبل کاشت کار کو حکومت پٹہ اور قبولیت کا پروانہ جاری کرتی تھی۔ پٹہ پر زیرِ کاشت زمین کا رقبہ اور واجب الادا لگان کی رقم درج ہوتی تھی اور قبولیت پر کاشت کار اپنے دستخط کرکے اسے حکومت کو واپس کرتا تھا۔ پٹواری اور خزانچی کا فرض تھا کہ کاشت کار کو لگان کی وصولی کی رسید جاری کرے۔

کاشتکار کی فلاح کیلئے احکام

۱۔ اکبر نے کاشت کاروں کی امداد کے لئے موجودہ تقاوی قرضہ کی طرز پر شاہی خزانے سے آسان شرائط پر قرض کے اجرا کا طریقہ رائج کیا۔ یہ قرضہ آسان قسطوں میں ادا ہو سکتا تھا۔

۲۔ لگان زیرِ کاشت رقبہ پر عائد کرنے کا حکم۔

۳۔ فصل تباہ یا خراب ہو جانے کی صورت میں یا قحط سالی کے ایام میں لگان کو معاف یا کم کر دینے کا حکم دیا۔

۴۔ محکمۂ مال کا حساب کتاب ہندی کی بجائے فارسی میں لکھنے کا اہتمام کیا۔

اکبر کے نظامِ مالیہ کے اثرات

اکبر کا نافذ کردہ نظامِ مالیہ نہ صرف حکومت کیلئے

Marfat.com

مفید ثابت ہوا بلکہ کاشت کاروں کے لئے بھی بہت سود مند ثابت ہوا۔ سرکار اور کاشت کار کے مابین فاصلے اٹھ گئے اور انہیں زمیندار اور نمبردار (مقدم) کے ظلم سے چھٹکارا مل گیا۔ شرح لگان متعین کرنے سے سرکاری ملازموں کے لئے رشوت کے دروازے بند ہو گئے۔ مقررہ شرح کی وجہ سے سرکاری آمدنی مستقل ہو گئی اور شاہی خزانہ پُر ہو گیا۔ اکبر کے نظام مالیہ نے نہ صرف زراعت کی ترقی کے لئے راستہ ہموار کیا اور اجناس کی فراوانی کی وجہ سے اشیائے خوردنی کی قیمتیں خاصی کم ہو گئیں بلکہ کاشت کار آسودہ و مطمئن ہو گئے اور حکومت کو مالی استحکام میسر ہوا۔

اکبر کا منصب داری سسٹم

اکبر کا ایجاد کردہ منصب داری سسٹم اس کا ایک عظیم کارنامہ شمار ہوتا ہے اکبر سے قبل برصغیر میں جاگیرداری نظام قائم تھا۔ فوج کے افسروں اور امرار کو تنخواہ کی بجائے بڑی بڑی جاگیریں دی جاتی تھیں۔ یہ لوگ جو جاگیردار کہلاتے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے نہ صرف جاگیر کا انتظام کرتے اور حکومت کو لگان وصول کر دیتے بلکہ جنگ کی صورت میں اپنی قائم کردہ فوج سے بادشاہِ وقت کی مدد بھی کرتے تھے۔ ایسے جاگیرداروں کے لئے لازمی تھا کہ وہ جاگیر کے انتظام اور بادشاہ کی فوجی امداد کے لئے مقررہ تعداد میں گھوڑے رکھیں اور باقاعدہ تربیت یافتہ فوج قائم کریں۔

ہمایوں کی کمزور قیادت کی وجہ سے مغلیہ جاگیردار آرام طلب اور اپنے فرائض سے غافل ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی بددیانتی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ وہ مقررہ تعداد میں فوج نہ رکھتے تھے لیکن جاگیر کی آمدنی سے پوری فوج کا خرچ وصول کر لیتے تھے۔ معائنہ کے وقت بیگاری لوگ، اور لاغر قسم کے گھوڑے پکڑ کر فوج کی مقررہ تعداد دکھا دیتے تھے۔ لیکن بادشاہ یا معائنہ پارٹی کے جانے کے بعد ان بیگاری لوگوں کو چھٹی دے دی جاتی تھی۔ اس طرح یہ جاگیردار حکومت کو دھوکہ دیکر مالا مال ہوتے تھے اس بددیانتی سے مغلیہ فوج کے معیار اور وقار کو بھی شدید نقصان پہنچ رہا تھا۔ بادشاہت کے آغاز ہی میں اکبر پر یہ چیز واضح ہو گئی تھی کہ جاگیرداری نظام متعدد نقائص کا شکار ہو چکا ہے۔ نیز جاگیرداروں کی مہیا کردہ فوج بادشاہ کی بجائے جاگیرداروں کی زیادہ فرمانبردار اور وفادار ہوتی ہے۔

اکبر نے جاگیرداروں کی بدعنوانیوں کے سدِباب اور امرار کی بغاوتوں کے پیشِ نظر جاگیرداری نظام کو ختم کرنے اور مغلیہ فوج کی تنظیم نو کا عزم کر لیا اور اس نے شہباز خاں میر بخشی کی سرکردگی میں منصبداری سسٹم رائج کیا اور اس کے تحت تمام فوج کو از سرِ نو منظم کیا۔

۱ منصب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی جگہ، مرتبہ یا عہدہ کے ہیں۔ منصب

Marfat.com

کا مقصد عہدیداروں کی درجہ بندی کرنا اور ان کے عہدوں اور مراتب کے مطابق ان کی تنخواہیں اور فرائض متعین کرنا تھا۔ حکومت کے تمام حکام منصبدار کہلاتے تھے۔ منصبدار کا لفظ صرف اعلیٰ افسران کے لئے مخصوص تھا دیگر سرکاری ملازمین کے لئے روزنامدار کا لقب استعمال ہوتا تھا۔ منصبداری محض فوجی عہدہ نہ تھا بلکہ ایک منصبدار کو فوجی اور سول دونوں نوعیت کے عہدوں پر تعینات کیا جا سکتا تھا ہر منصبدار کے عہدے اور مرتبے کا اندازہ اس کے منصب سے ہوتا تھا وہ سرکاری و درباری تقریبات میں بھی اپنے ذاتی منصب کے مطابق جگہ پاتا تھا۔

ذات و سوار

منصبداروں کے مراتب کی درجہ بندی کے لئے ذات و سوار کی اصطلاحیں رائج کی گئی تھیں۔ ذاتی منصب کے مطابق منصبدار کی تنخواہ اور الاؤنس (بھتہ) مقرر ہوتے تھے۔ اکبر نے منصبداروں کے مختلف گریڈ (درجے) مقرر کئے جو بیس ۲۰ سے لے کر دس ہزاری ذات و سوار تک جاتے تھے۔ اس کی اصطلاح کے متعلق بعض مؤرخین میں اختلاف ہے۔ بلوچمین کی رائے ہے کہ 'ذات' سے مطلب سپاہیوں کی مقررہ تعداد تھی جس کا اہتمام منصبدار کو کرنا ہوتا تھا جبکہ 'سوار' کے معنی منصبدار کے اسپ سوار فوج کی مقررہ تعداد تھی جسے وہ اپنی زیر کمان رکھنے کا مجاز تھا۔ اس کے برعکس ارون کی رائے میں 'ذات' صرف پیادہ فوج کی مقررہ تعداد کو ظاہر کرتی ہے جبکہ سوار ذات کی مانند ایک مرتبہ و اعزاز تھا۔ ڈاکٹر تیرپاٹھی کا خیال ہے کہ سوار ایک اضافی مرتبہ تھا لیکن اس پر اپنے منصب کے مطابق مقررہ سواروں کا اہتمام کرنے کی پابندی نہ تھی تاہم الاؤنس کی صورت میں اسے اتنی تعداد کا اضافی خرچہ ضرور ملتا تھا۔ کتاب "منصبداری سسٹم" کے مصنف مشہور محقق عبدالعزیز رقمطراز ہیں کہ ذات کے مرتبہ کے مطابق منصبدار پر لازم تھا کہ وہ مقررہ تعداد میں ہاتھی، گھوڑے اور باربرداری کے جانور اور چھکڑوں کا اہتمام کرے جبکہ 'سوار' کا مرتبہ منصبدار کے زیر کمان اصل شہسواروں کی تعداد کو ظاہر کرتا تھا۔

مناصب کی درجہ بندی

منصبداری سسٹم کے آغاز میں اکبر نے پنج ہزاری سے اوپر کے مناصب شاہی خاندان کے افراد کے لئے وقف کئے۔ لیکن راجہ مان سنگھ، راجہ ٹوڈرمل اور مرزا عزیز کوکہ کو ہفت ہزاری مناصب عطا کئے۔ اس لئے خیال اغلب ہے کہ بعد ازاں ہشت ہزاری سے اوپر کے مناصب شاہی خاندان کے افراد کے لئے وقف کئے گئے۔ شروع میں اکبر نے ہر منصبدار کے لئے ایک ہی گریڈ مقرر کیا تھا لیکن بعد ازاں پنج ہزاری منصب سے کمتر کے لئے تین گریڈ (درجے) مقرر کئے گئے۔

درجۂ اوّل: پنج ہزاری ذات و سوار

درجۂ دوم: پنج ہزاری ذات و ڈھائی ہزار سوار

Marfat.com

درجہ سوم: پنج ہزاری ذات و ایک ہزار سوار

سب منصبداروں کے لئے لازم نہ تھا کہ وہ اپنے مرتبے یا منصب کے مطابق فوج قائم کریں۔ اگرچہ منصبداروں کے لئے لازم تھا کہ وہ کچھ فوج قائم کریں۔ مگر ایسا صرف ان کے مرتبے کے مطابق ہوتا تھا ورنہ منصب کا مطلب صرف شاہی افسران کے مراتب اور مشاہروں کا تعین تھا۔ نیز یہ بھی ضروری نہ تھا کہ اعلیٰ مرتبہ کا منصبدار صرف اعلیٰ عہدے پر ہی فائز ہو۔ مثال کے طور پر راجہ مان سنگھ کا منصب ہفت ہزاری تھا لیکن وہ کبھی بھی وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر متعین نہیں ہوا جبکہ شاہی وزراء کے مناصب راجہ مان سنگھ سے کہیں کمتر تھے۔ ابوالفضل کا منصب متعدد شاہی منصب داروں کے مناصب سے کمتر تھا اس کے باوجود وہ وزیرِ اعظم مقرر ہوا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ کسی منصبدار کو عہدوں پر متواتر تعینات کیا جاتا رہے۔ بعض منصبدار ایسے بھی تھے جو کسی عہدے پر متعین نہ تھے لیکن وہ دربار میں حاضر رہتے اور وقتاً فوقتاً شاہی خدمات سرانجام دیتے رہتے تھے یہی وجہ تھی کہ ایک منصبدار کو فوج کی بجائے سول محکمہ میں بھی متعین کیا جا سکتا تھا۔

تعیناتی و تنزلی

منصبداروں کی تعیناتی، ترقی اور تنزلی کے کوئی خاص قواعد مقرر نہ تھے ہر منصبدار کا تقرر، تبادلہ، ترقی اور تنزلی کا دارومدار بادشاہ کی مرضی پر تھا معمولی منصب سے لیکر اعلیٰ سے اعلیٰ منصب بھی عطا ہو سکتا تھا۔ عام معمول اور قاعدہ یہ تھا کہ منصبدار کو نمائش یا معائنہ کے موقع پر فنون حرب میں اس کی افواج کی اعلیٰ مہارت اور کارکردگی پر ترقی دی جاتی تھی۔ بعض اوقات بادشاہ اعلیٰ شاہی خدمات کی انجام دہی پر بھی منصبدار کا مرتبہ بڑھا دیتا تھا۔ یہ منصب موروثی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ استحقاق کی بنیاد پر دیا جاتا تھا۔ منصبداروں کی افواج کا معائنہ کرنے اور ان کے کام کی نگرانی کے لئے میر بخشی کی زیر نگرانی ایک علیحدہ محکمہ تھا، جو نہ صرف منصبداروں کے حساب کی جانچ پڑتال کرتا تھا بلکہ منصب داروں کے متعلق مکمل ریکارڈ بھی رکھتا تھا۔

تنخواہ

منصب داروں کے لئے بڑی بڑی تنخواہیں مقرر تھیں جو بعض اوقات نقد دی جاتی تھیں۔ اور بعض اوقات جاگیر عطا کر دی جاتی تھی جس کا سرکاری مالیہ بھی معاف ہوتا تھا۔ اکبر جاگیر کی بجائے عموماً نقد تنخواہیں دیا کرتا تھا۔ اگر وہ کسی منصبدار کو جاگیر عطا بھی کرتا تھا تو وہ زیادہ عرصے کے لئے نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ کسی منصبدار کا عہدہ مستقل نہ ہوتا تھا اور اس کا تبادلہ ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں ہوتا رہتا تھا۔ ہر منصب دار مقامی آبادی سے نہ صرف افواج کو تنخواہ ادا کرتا بلکہ اپنے گھوڑوں، ملازموں اور سدھائے ہوئے چیتوں کے چارے کے مصارف بھی لیتا تھا اس تمام خرچ کا باقاعدہ حساب کتاب رکھا جاتا تھا۔

برنیئر۔ منوچی اور مونڈلسلو جیسے غیر ملکی سیاحوں کا بیان ہے کہ ہماری تنخواہوں کی درجہ

Marfat.com

سلاطینِ معصومیت کیا گیا اور اُسے منصب اجتہاد پر فائز کیا گیا۔ شیخ مبارک نے ہی تیار کیا تھا۔

شیخ فیضی

فیضی شیخ مبارک ناگوری کا بڑا لڑکا تھا۔ ۱۵۴۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوا۔ اوائل عمر سے ہی اعلیٰ فکر و فہم اور قابل رشک ذہنی استعداد رکھتا تھا۔ چنانچہ بڑی تھوڑی مدت میں اس نے عربی، فارسی اور ہندی پر عبور حاصل کر لیا اور علم الکلام، جیومیٹری اور شعر گوئی میں اس قدر شہرت و ناموری حاصل کی کہ ۱۵۶۷ء میں دربار اکبری میں پہنچ گیا۔ شاعری میں نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ شناسیوں کے باعث ملک الشعراء کا خطاب پایا۔ اور بادشاہ کا مصاحب خاص بنکر کتب خانۂ شاہی کا مہتمم و نگران مقرر ہوا۔ وہ بادشاہ کو مختلف مضامین کی کتابیں پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ عربی زبان میں قرآن حکیم کی بے نقط تفسیر "سواطع الالہام" ہے جس سے اس کے تبحرِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے ایک سو ایک کتابیں مختلف مضامین پر مشتمل تحریر کیں۔ بقول ابوالفضل وہ بے حد متواضع، خوش طبع، زندہ دل اور آزاد خیال شخص تھا۔ شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے فرائض بھی اسی نے سرانجام دیئے تھے۔ اسی زمانے میں پند و نصائح پر مشتمل بچوں کے لئے ایک کتاب "مُوارد" کے نام سے تصنیف کی۔ اکبر کے مذہبی خیالات کو بدلنے میں اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا اس نے پچاس سال کی عمر میں ۱۵۹۷ء میں وفات پائی۔

ابوالفضل

شیخ مبارک ناگوری کا بیٹا تھا۔ ۶ جنوری ۱۵۵۱ء کو آگرہ کے مقام پر پیدا ہوا۔ ابوالفضل بلا کی ذہنی بصیرت رکھنے والا نجیب علم و کمال اور اکبری عہد کا ایک عظیم ترین صاحب قلم تھا۔ ۱۵۷۴ء میں علامہ فیضی کی وساطت سے اکبر کے حضور پیش ہوا اور جلد ہی خداداد قابلیت، فہم و فراست اور علمی استعداد کی بدولت بادشاہ کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور بادشاہ کا مصاحبِ خصوصی بن گیا۔ بادشاہ کو اس پر اس قدر اعتماد تھا کہ تمام اہم قومی معاملات میں بھی اس سے مشورہ طلب کرتا تھا اور بالعموم ان کے مطابق عمل پیرا ہوتا تھا۔ اس کی معاملہ فہمی، دانشمندی اور عقل و فراست سے متاثر ہو کر اکبر نے اسے چار ہزاری کا منصب عطا کر کے اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔ حکومت کے جملہ احکام و فرامین اسی کے قلم سے جاری ہوتے تھے۔ فارسی انشا پردازی میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ اسی لئے مختلف فرمانرواؤں کے نام جاری ہونے والے شاہی خطوط وہی تحریر کرتا تھا۔ وہ الفاظ و معانی کا بے مثال گنجینہ تھا۔ ہر دقیق اور مشکل بات کو بصورت الفاظ میں بیان کرتے میں صاحب کمال تھا۔ آئین اکبری اور اکبر نامہ جیسی شہرۂ آفاق تاریخی کتب کے علاوہ اس نے انشائے ابوالفضل بھی ترتیب دی جو سیاسی خطوط پر مشتمل اور ادبی شاہکار سے انشا پردازی کا ایک نادر شاہکار ہے۔ وہ لسانی و خوش کلامی سے دوسروں کو متاثر کرنے کے فن میں یکتا تھا۔ چنانچہ دربارِ اکبری سے وابستہ ہونے کے بعد شاہ کی خوشنودی کو اس نے اپنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ وہ

Marfat.com

جاہ پرست بھی واقع ہوا تھا۔ چونکہ وہ اکبر کے خود ساختہ مذہب "دین الٰہی" کا مؤید اور سلیم کے باغیانہ رویّہ کے خلاف تھا اس لئے شہزادہ سلیم اس کا شدید مخالف ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب شہنشاہِ اکبر نے سلیم کو راہِ راست پر لانے کے لئے اسے مشورہ کرنے کے لئے دکن سے بلوا بھیجا تو شہزادہ نے اُسے ۱۶۰۲ء میں بیر سنگھ بندھیلہ سے راستے ہی میں ہلاک کروا دیا۔ ابوالفضل کی اس طرح سفاکانہ ہلاکت کا اکبر کو اس قدر شدید صدمہ ہوا کہ کئی روز تک اس کے ہوش و حواس مختل رہے۔ نیز وہ تین روز تک شدتِ غم و اندوہ سے کچھ نہ کھا سکا۔ وہ اکثر اس غم سے افسردہ خاطر رہتا اور انتہائے اضطراب میں کہا کرتا "کاش سلیم ابوالفضل کو ہلاک نہ کرتا۔ اگر اسے تخت و تاج کی آرزو تھی تو وہ مجھے قتل کروا لیتا مگر اسے چھوڑ دیتا۔"

ابوالفضل امرائے دربار اور ہمعصر منصبداروں میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا وقت کے بڑے بڑے جید علماء اور مدبرین اس کی بیباکانہ طرزِ تحریر سے خائف رہتے تھے عبداللہ خان ازبک کہا کرتا تھا کہ میں اکبر کی تلوار سے اتنا خائف نہیں جس قدر ابوالفضل کے قلم سے خوفزدہ ہوں۔

عبدالرحیم خان خاناں

عبدالرحیم خان خاناں اکبر کے اتالیق بیرم خاں کا لڑکا تھا بیرم خاں کی وفات کے بعد اکبر نے اسے شاہی سرپرستی میں لے لیا اور اُسے اعلیٰ تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کیا وہ بلا کا ذہین تھا وہ مروّجہ علوم کے علاوہ نہ صرف فارسی ترکی اور عربی زبانوں پر مکمل عبور رکھتا تھا بلکہ ہندی میں بھی اسے مہارتِ کاملہ حاصل تھی۔ فارسی اور ہندی کا بلند پایہ شاعر تھا اس کے ہندی زبان میں کہے گئے دوہے آج بھی ہندی ادب کا انمول سرمایہ ہیں۔ خود صاحبِ علم و ادب تھا اور علماء و فضلاء کی سرپرستی کرتا تھا اس کی ذاتی لائبریری کئی ہزار نایاب کتابوں پر مشتمل تھی۔ شعراء کا بے حد قدردان تھا انہیں بیش بہا انعام و اکرام سے نوازتا تھا متعدد ملکی و غیر ملکی شعراء ہمہ تن اس کے جلو میں رہتے تھے۔

عبدالرحیم اکبر کا مشیر اور اعلیٰ عسکری صلاحیتوں کا حامل جرنیل تھا۔ گجرات کی مہم میں اعلیٰ عسکری قابلیت اور جوانمردی کا مظاہرہ کرنے پر اکبر نے اسے ہفت ہزاری کا بلند ترین منصب عطا کیا۔ اور خان خاناں کے خطاب سے نوازا۔ اس نے سندھ کی تسخیر اور دکن کی مہمات میں بھی نمایاں حصہ لیا وہ جہانگیر کے عہد میں اہم عہدوں پر فائز رہا اس کا شمار اکبر کے نورتنوں میں ہوتا تھا اس نے ۱۶۲۷ء میں وفات پائی۔

مرزا عزیز کوکہ

اکبر کا منصبدار عزیز کوکہ اکبر کا دودھ بھائی تھا وہ اکبر کی آیا جیجی انگہ کا بیٹا تھا اور اس کے بچپن کا ساتھی تھا۔ بادشاہ ہو کر اکبر نے اسے خان اعظم کا لقب عطا کیا۔ مرزا عزیز کوکہ اعلیٰ فہم و فراست کا مالک ایک عالم و فاضل شخص تھا۔ نیز اعلیٰ فوجی

Marfat.com

قابلیت کا مالک اور تجربہ کار جرنیل تھا گجرات، بنگال اور بہار کی فتوحات میں اس نے اعلیٰ عسکری صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ اکبر کو اس سے بہت زیادہ والہانہ محبت تھی۔ مرزا عزیز کوکہ نے اکبر کے رائج کردہ دین الٰہی کی سخت مخالفت کی اور اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ناراض ہو کر مکہ معظمہ چلا گیا لیکن نامساعد حالات کے تحت واپس آگیا اور دینِ الٰہی قبول کر کے اکبر کا مرید بن گیا۔ وہ شہزادہ خسرو کا خسر تھا یہی وجہ تھی کہ اکبر کے آخری ایام میں اس نے مان سنگھ سے گٹھ جوڑ کر کے جہانگیر کو گرفتار کر کے شہزادہ خسرو کی ولیعہدی کے لیے راہ ہموار کرنے کی ناکام کوشش کی۔ جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد اسے معاف کر دیا اور دکن کے مغلیہ علاقے کا گورنر مقرر کیا۔ اس نے ۱۶۲۴ء میں وفات پائی۔

تان سین عہدِ اکبری کا شہرۂ آفاق موسیقار تان سین گوالیار کا نومسلم تھا اور دربارِ اکبری کے نورتنوں میں ایک امتیازی اور انفرادی شہرت و اہمیت رکھتا تھا۔ درباگ راگنیوں کا شہنشاہ سمجھا جاتا تھا چونکہ اکبر خود فن موسیقی کا دلدادہ تھا اس لیے مغلیہ دربار سے تان سین کی وابستگی سے فن موسیقی کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ وہ بلاشبہ موسیقی کا استاد سمجھا جاتا ہے۔ میاں کی ملہار، میاں کی ٹوڈی، میاں کی سارنگ جیسے سحر انگیز اور دلنواز راگوں کا اختراع اسی کا مرہونِ منت ہے۔ وہ تاحیات دربارِ اکبری سے وابستہ رہا۔ فن موسیقی میں وہ عادل شاہ سوری کا شاگرد تھا اس نے ۱۵۸۸ء میں گوالیار کے مقام پر وفات پائی۔

راجہ بھگوان داس وہ راجہ بہاری مل والیٔ جے پور کا بیٹا تھا۔ ۱۵۶۲ء میں جب راجہ بہاری مل نے اکبر کی اطاعت قبول کی اور اپنی لڑکی جودھا بائی کی شادی اکبر سے کر دی تو راجہ بھگوان داس مع اپنے باپ بہاری مل اور بیٹے مان سنگھ کے شاہی منصب دار بنا۔ اور سلطنت کے اہم عہدوں پر متمکن رہا۔ بھگوان داس کو کشمیر کی تسخیر کے علاوہ متعدد فوجی مہمات پر مامور کیا گیا جن میں اس نے اپنی اعلیٰ فوجی مہارت اور تنظیمی قابلیت کا ثبوت دیا۔ اکبر نے اسے پنج ہزاری منصب عطا کیا اور امیر الامرا کے خطاب سے نوازا۔ ۱۵۸۵ء میں راجہ بھگوان داس کی بیٹی مان بائی سے شہزادہ سلیم کی شادی ہوئی۔ جہانگیر کا سب سے بڑا لڑکا شہزادہ خسرو مان بائی کے ہی بطن سے پیدا ہوا۔ راجہ بھگوان داس نے ۱۵۸۹ء میں وفات پائی۔

مان سنگھ اکبر کا نامور ترین اور قابل جرنیل مان سنگھ راجہ بھگوان داس کا بیٹا تھا۔ اس نے ۱۵۶۲ء میں اکبر کی ملازمت اختیار کی اور پنج ہزاری منصب پایا۔ وہ ایک بہادر سپاہی اور مستقل مزاج سپہ سالار تھا اور اکبر کا نہایت وفادار منصبدار تھا۔ اس کی عسکری قابلیت اور تنظیمی صلاحیت مسلمہ تھی۔ اکبر نے اسے متعدد فوجی مہمات کے علاوہ کئی ایک اہم

Marfat.com

عہدوں پر نامور کیا۔ نظام سلطنت کے نفاذ میں اس کی ذہنی استعداد کا بہت دخل تھا۔ ۱۵۷۶ء میں ہلدی گھاٹ کے معرکہ میں اس نے میواڑ کے رانا پرتاپ کو شکست فاش دیکر اپنی بہادری کا لوہا منوایا۔ مرزا حکیم کی وفات کے بعد اکبر نے اُسے ہفت ہزاری کا منصب عطا کر کے کابل کا گورنر متعین کیا۔ اس نے اکبر کے رائج کردہ دین الٰہی کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اکبر کے آخری ایام میں جبکہ وہ بنگال کا گورنر تھا اس نے مرزا عزیز کوکہ سے مل کر جہانگیر کے خلاف سازش کی تاکہ اسے تخت سے محروم کر کے شہزادہ خسرو کو تخت نشین کیا جا سکے۔ لیکن یہ سازش ناکام ہوئی۔ مان سنگھ نے ۱۶۱۴ء میں وفات پائی۔

راجہ بیربل

اکبر کا منظور نظر مصاحب بیربل ۱۵۲۸ء میں کالپی کے مقام پر پیدا ہوا بیربل فن موسیقی میں خصوصی مہارت، حاضر جوابی، شاعرانہ کمالات اور بے مثال ظریفانہ ذہانت کی وجہ سے اکبر کے نورتنوں میں شامل ہوا۔ شروع میں وہ راجہ بگوان داس کی ملازمت میں رہا۔ مگر بہت جلد اپنی بذلہ سنجی، شاعرانہ اوصاف اور ظرافت و خوش طبعی کی وجہ سے اکبر کا قریب ترین مصاحب بن گیا وہ ہندی کا ایک نامور شاعر تھا۔ اکبر نے اسے راجہ کا خطاب اور کوی راج کا لقب عطا کیا اور دو ہزار کے منصب سے بھی نوازا۔ شروع میں اکبر نے اسے کانگڑہ کا فوجدار بنا کر روانہ کیا مگر بعد میں اسنے مستقل طور پر دربار شاہی کی زینت بنا لیا۔ بیربل واحد ہندو تھا جس نے اکبر کا رائج کردہ مذہب دین الٰہی قبول کیا۔

حکیم ابوالفتح

حکیم ابوالفتح عرف ملّا دوپیازہ اکبری دربار کا ایک مشہور مصاحب تھا جو محض اپنے ظریفانہ مزاج، لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کی وجہ سے اکبر بادشاہ کا منظور نظر تھا۔ وہ ایران سے برصغیر میں آیا تھا اکبر نے اسے اپنا منصبدار بنا کر اپنے دربار کی زینت بنا لیا۔ ایک ہی دربار سے منسلک ہونے کے باعث راجہ بیربل اور حکیم ابوالفتح کی آپس میں حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی میں خوب ٹھنتی تھی۔

خواجہ باقی باللہ بیرنگ رح

آپ برصغیر پاک و ہند میں نقشبندی سلسلہ کے بانی تھے آپ کا اصل نام رضی الدین تھا لیکن محمد باقی باللہ کے لقب سے مشہور تھے آپ ۱۵۶۴ء میں کابل (افغانستان) میں پیدا ہوئے۔ باطنی علوم کی تکمیل کے بعد مرشد کے حکم پر تبلیغ دین کے لئے برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے لاہور میں ایک سال مقیم رہنے کے بعد دہلی میں مقیم ہوئے جہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی آپکے ہی مرید تھے۔ آپ نے ۱۶۰۳ء میں صرف ۴۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

برصغیر میں آپ کی آمد کے وقت اکبری عہد کی لادینیت اپنے عروج پر تھی چنانچہ آپ

Marfat.com

نے اکبر کے گمراہ کن نظریات کے انسداد کے لئے دربار اکبری کے امراء میں اثر و رسوخ پیدا کیا تاکہ ان سے کام لے کر احیائے دین کے لئے کوشش کی جائے۔ شیخ فرید جیسے اعلیٰ اقتدار کے حامل امراء آپ کے حلقۂ مریدی میں شامل ہو گئے۔ آپ کی موت کے بعد آپ کے مشن احیائے دین کو مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے جاری رکھا۔

اہم تاریخیں

۱۵۵۶ء کالانور (گورداسپور) کے مقام پر اکبر کی تاجپوشی۔ پانی پت کی دوسری لڑائی میں ہیمو بقال کی شکست۔

۱۵۶۰ء بیرم خاں کا زوال۔ اکبر کا خود مختار اور مطلق العنان ہونا۔

۱۵۶۱ء پٹن (گجرات) کے مقام پر بیرم خاں کا قتل۔ مالوہ میں ادھم خاں کے ہاتھوں باز بہادر کی شکست۔

۱۵۶۲ء اکبر کا شمس الدین اتکہ کے قتل کے جرم میں ادھم خاں کے قتل کا حکم صادر کرنا۔ جے پور کی راجکماری جودھا بائی سے اکبر کی شادی، اکبر نے قیدیوں کو غلام بنانا ممنوع قرار دیا۔

۱۵۶۳ء مالوہ میں عبداللہ ازبک کی بغاوت، یاترا ٹیکس کی منسوخی۔

۱۵۶۴ء شیکسپیئر کی پیدائش۔ جزیہ ٹیکس کی منسوخی، گونڈوانہ کی تسخیر۔

۱۵۶۸ء قلعہ چتوڑ پر اکبر کا قبضہ۔

۱۵۶۹ء قلعہ رنتھمبور اور کالنجر پر اکبر کا قبضہ۔ شہزادہ سلیم کی پیدائش۔

۱۵۷۰ء شہزادہ مراد کی پیدائش۔ فتح پور سیکری کی تعمیر۔

۱۵۷۲ء گجرات کی تسخیر۔ رانا اودے سنگھ کی وفات کے بعد رانا پرتاپ کا میواڑ کی راج گدی پر بیٹھنا۔

۱۵۷۴ء سکھ گورو رام داس کے بعد گورو رام داس کی مسند نشینی۔ شہزادہ منر کی تعمیر۔

۱۵۷۵ء بہار۔ بنگال پر اکبر کا قبضہ۔ فتح پور سیکری میں عبادت خانہ کی تعمیر۔

۱۵۷۶ء ہلدی گھاٹ کی لڑائی میں رانا پرتاپ کی شکست۔

۱۵۷۹ء ستمبر۔ اکبر کا اجتہاد کے درجہ پر پہنچنا۔

۱۵۸۱ء دین الٰہی کا تقاضہ۔ گورو رام داس کے بعد گورو ارجن دیو کی مسند نشینی، گرنتھ صاحب کی ترتیب۔

Marfat.com

۱۵۸۶ء راجہ بیربل کی وفات ۔ شہزادہ دے پور کی تعمیر۔ کشمیر پہ اکبر کا قبضہ۔
۱۵۸۹ء کابل میں اکبر کی آمد۔ راجہ بھگوان داس اور راجہ ٹوڈرمل کی موت۔ بنگال کی گورنری پہ مان سنگھ کی تقرری۔
۱۵۹۵ء قندھار پہ اکبر کا قبضہ، فیضی اور عبدالقادر بدایونی کی وفات۔
۱۵۹۷ء رانا پرتاپ کی وفات، رانا امر سنگھ کا میواڑ کی راج گدی پہ بیٹھنا۔
۱۶۰۰ء اسیر گڑھ (خاندیش پر) اکبر کا قبضہ۔ ملکہ انگلستان الزبتھ اول کا لندن کمپنی کو تجارت کا پروانہ عطا کرنا۔
۱۶۰۱-۰۲ء شہزادہ سلیم کی بغاوت۔ ابوالفضل کا قتل۔
۱۶۰۳ء ملکہ الزبتھ کی موت اور جیمز اول کی تخت نشینی، سلیم کو تخت سے محروم کرنے کے لئے مان سنگھ اور عزیز کوکہ کی سازش۔
۱۶۰۴ء جہانگیر کی بیوی مان بائی کی خودکشی۔ اکبر کی ماں حمیدہ بانو بیگم کی وفات۔
۱۶۰۵ء اکبر کی وفات اور جہانگیر کی تخت نشینی۔

امتحانی سوالات

۱۔ اکبر کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے اکبر کی تخت نشینی کے وقت برصغیر پاک و ہند کی سیاسی حالت قلمبند کیجئے۔
۲۔ بیرم خاں کا عروج و زوال تفصیل سے بیان کیجئے۔
۳۔ عہد اکبری کی فتوحات اور مغلیہ سلطنت کی وسعت پذیری کا مختصر حال تحریر کیجئے۔
۴۔ اکبر کی راجپوت پالیسی بیان کیجئے۔ اکبر نے اس پالیسی کو کامیاب بنانے کے لئے کون سے ذرائع اختیار کئے ان کے اثرات بیان کیجئے۔
۵۔ اکبر کے مذہبی خیالات نے کیسے نشوونما پائی۔ اس کے مذہبی خیالات کی ارتقائی منزلیں واضح کیجئے۔
۶۔ اکبر کی مذہبی پالیسی کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔ نیز 'دین الٰہی' پر ایک مدلل مضمون تحریر کیجئے۔
۷۔ اکبر کی دکن پالیسی کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔
۸۔ اکبر کے [illegible] ماری سسٹم کے بارے میں تفصیلی طور پر لکھیں۔

Marfat.com

۹- اکبر کے نظامِ مالیہ (ضبطی سسٹم) کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔ اس کی خصوصیات اور خامیوں کی وضاحت کیجئے۔

۱۰- اکبر کے کردار کا جائزہ لیجئے۔

۱۱- مندرجہ ذیل پر نوٹ تحریر کیجئے:-

(ا) ہیمو بقال (ب) پانی پت کی لڑائی ۱۵۵۶ء

(ج) اکبر کے ابتدائی احکامات (د) راجہ ٹوڈرمل

(ر) عبدالرحیم خانِ خاناں (ز) ابوالفضل

Marfat.com

چھٹا باب

نورالدین محمد جہانگیر

(۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء)

"جہانگیر کو سنگدل، متلون مزاج، جابر اور افیون و شراب کا رسیا کہنا سراسر زیادتی ہے اس کی شہرت اپنے باپ کی عظمت اور اپنے بیٹے کی درخشاں شان و شوکت کے سامنے ماند پڑ گئی۔ بحیثیت مجموعی اس کا عہد امن و سکون اور خوشحالی کا عہد ہے اس کے عہد میں علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا۔ مصوری منتہائے کمال کو پہنچی اور صنعت و حرفت ترقی پذیر ہوئی" [1]

بینی پرشاد

ابتدائی زندگی

نورالدین محمد جہانگیر شہنشاہ اکبر کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ ۱۵۶۸ء تک اکبر کا کوئی فرزند زندہ نہیں بچا تھا جو اس کی وسیع و عریض اور عظیم الشان سلطنت کا وارث ہوتا۔ چنانچہ اس نے اپنے وارث کے لئے نہ صرف خدائے بزرگ و برتر کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگیں اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رح کے دربار پر حاضری دی اور منتیں مانگیں بلکہ فتح پور سیکری کے مشہور بزرگ شیخ سلیم چشتی رح کی خدمت میں حاضر ہو کر دعائیں بھی کرائیں بالآخر ۳۰ اگست ۱۵۶۹ء کو فتح پور سیکری کے مقام پر سلیم چشتی رح کے تکیہ میں جے پور کی راجکماری جودھا بائی عرف مریم زمانی کے بطن سے فرزند پیدا ہوا جس کا نام شیخ سلیم چشتی کے نام پر محمد سلطان سلیم رکھا گیا۔ اکبر کو اس کی پیدائش پر اس قدر روحانی مسرت ہوئی کہ اس نے اپنی منت کے مطابق پیدل چل کر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی۔ اکتوبر ۱۵۷۳ء میں شہزادہ سلیم کی رسم ختنہ ادا کی گئی۔ اکبر کا دوسرا بیٹا شہزادہ مراد ۸ جون ۱۵۷۰ء اور شہزادہ دانیال ۱۰ ستمبر ۱۵۷۲ء کو پیدا ہوا لیکن آخرالذکر دونوں شہزادے کثرتِ شراب نوشی کے باعث جوانی کی موت مر گئے۔

اکبر خود تو تعلیم سے بے بہرہ تھا لیکن اس نے اپنے بچوں کی تعلیم کا نہایت اعلیٰ انتظام کیا۔ سلیم کی تعلیم و تربیت کے لئے عبدالرحیم خان خاناں کو اتالیق مقرر کیا گیا۔ سلیم قدرتی طور پر ذہین اور زیرک واقع ہوا تھا۔ اس نے جلد ہی عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت پر عبور حاصل کر لیا۔ اس نے علم تاریخ، جغرافیہ

---

[1] ہسٹری آف جہانگیر۔

Marfat.com

علمِ نباتات، موسیقی اور فنِ مصوری بھی سیکھا۔ اسے شعر و ادب اور فنِ مصوری سے خاص انس تھا۔ اس نے اپنے جدِ امجد بابر کی مانند اپنی سرگذشت تحریر کی جو "تزکِ جہانگیری" کے نام سے مشہور ہے۔ عمر کی پختگی کے ساتھ سلیم نے فنونِ حرب اور امورِ جہانبانی کے رموز کی آموختگی میں بھی خاص دلچسپی لی۔ ۱۵۷۷ء میں سلیم کو دو ہزاری منصب عطا ہوا۔ جسے ۱۵۸۵ء میں بارہ ہزاری بنا دیا۔ ۱۵۸۱ء میں مہمِ کابل کے دوران اُسے فوج کی کمان سونپی گئی۔ بعد ازاں مزید کئی ایک مہمات اس کی سرکردگی میں روانہ کی گئیں۔ نیز جب اکبر دکن کی مہم پر روانہ ہوا تو اسے نائب السلطنت مقرر کیا گیا۔

شہزادہ سلیم اپنی عمر کی پندرھویں بہار میں تھا کہ ۱۳ فروری ۱۵۸۵ء کو راجہ بھگوان داس والیٔ امبر کی بیٹی مان بائی عرف شاہ بیگم سے اس کی پہلی شادی ہوئی۔ شادی کی رسوم ہندوانہ اور اسلامی دونوں طریقوں سے انجام پائیں۔ ۱۶ اگست ۱۵۸۷ء کو مان بائی کے بطن سے شہزادہ خسرو پیدا ہوا جو اپنے باپ کی طرح حسین و جمیل تھا۔ ۱۶۰۴ء میں مان بائی شاہ بیگم نے شہزادہ خسرو کے اپنے باپ کے خلاف باغیانہ عزائم کی وجہ سے بھاری مقدار میں افیون کھا کر خودکشی کر لی۔ اس کی موت کا سلیم پر اتنا اثر ہوا کہ سلیم نے چار دن تک کچھ نہ کھایا۔ جہانگیر نے کئی شادیاں کیں۔ اس کی بیویوں میں مان بائی عرف شاہ بیگم، صاحبِ جمال (شہزادہ پرویز کی ماں)، شہزادہ خرم (شاہجہان) کی والدہ جودھا بائی عرف جگت گوسائیں اور نور جہاں جس کی پچھلگ لڑکی لاڈلی بیگم کی شادی جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار سے ہوئی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کی شادیوں کی تعداد کے بارے میں اکثر مؤرخین خاموش ہیں۔ فادر زیویر (Father Xavier) رقمطراز ہے کہ "۱۵۹۷ء تک اس کی منکوحہ بیویوں کی تعداد انیس سے کم نہ تھی۔"

سلیم اوائلِ عمر سے ہی عیش و عشرت اور مے نوشی کا دلدادہ تھا۔ اس کی عیش کوشی سے اکبر سخت پریشان تھا۔ وہ ہر طرح کا زور ڈال کر سلیم کو راہِ راست پر لانے کا خواہاں تھا لیکن اس چیز نے شہزادہ سلیم کو اپنے باپ سے ناراض کر دیا۔ اور اس نے اپنے باپ کی وفات سے قبل ہی حصولِ تخت کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔ بعض یورپین مورخین کے نزدیک اکبر اور شہزادہ سلیم کے مابین شکر رنجی کی اصل وجہ اکبر کی اسلام کشی یا دین ہتی تھی۔ کیونکہ شہزادہ سلیم راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بائیس سال کی عمر میں (۱۵۹۱ء) حصولِ تخت کے لئے اکبر کے خلاف سازشیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ ۱۵۹۱ء میں اکبر دکن کی مہم پر روانہ ہوا تو اس نے سلیم کو نائب السلطنت تعین کرتے ہوئے اسے رانا امر سنگھ والیٔ میواڑ کے خلاف فوجی کارروائی کا حکم دیا۔ اس نے الہ آباد پہنچ کر علمِ بغاوت بلند کر دیا۔

اکبر کے پاس اتنے وسیع ذرائع تھے کہ وہ بغاوت کو آسانی سے کچل سکتا تھا لیکن وہ جہانگیر کے

Marfat.com

خلاف تشدید قسم کی تادیبی کارروائی کرنا بھی مناسب نہ سمجھتا تھا کیونکہ اپنے دو بیٹوں مراد اور دانیال کی وفات کے بعد جہانگیر ہی اس کی تمام تر پدری محبت کا محور اور امیدوں کا مرکز تھا۔ آخر سلیمہ بانو بیگم کی کوشش سے باپ بیٹے میں صلح ہو گئی اور سلیم نے اپنی دادی مریم مکانی کی معیت میں حاضر ہو کر معافی مانگ لی۔

تخت نشینی
۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء

سلیم ۳۶ سال کی عمر میں بروز جمعرات ۲۴۔ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو قلعہ آگرہ میں اپنے باپ کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے شاہی تاج اپنے سر پر رکھا اور نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی کا لقب اختیار کیا۔ تخت نشینی کی خوشی میں ہزارہا قیدیوں کو رہا کیا اور اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ عوام کے دل جیتنے کے لئے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جہانگیر نے ابوالفضل کے بیٹے عبدالرحمٰن کے منصب کو دو ہزاری کر دیا۔ خانِ زماں مرزا عزیز کوکہ اور راجہ مان سنگھ جنہوں نے جہانگیر کو تخت سے محروم کرنے کے لئے سازش کی تھی، کے مناصب، اعزازات اور جاگیروں کو بحال رکھا۔ ابوالفضل کے قاتل بیر سنگھ بندھیلہ کے منصب کو بڑھا کر سہ ہزاری کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں اکبری عہد کے تمام امراء کے ساتھ فیاضی کا سلوک کیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد بڑی دانائی اور تدبر کا ثبوت دیا اور بڑی ہوشمندی سے عنانِ حکومت سنبھالی۔

ابتدائی احکام

تخت نشین ہوتے ہی جہانگیر نے بارہ اصلاحی احکام نافذ کئے جو دستور العمل کہلائے اور سلطنت کے ہر فرد و بشر پر ان کی پابندی لازمی قرار پائی۔ وہ بارہ اصلاحی احکام یا قوانین مندرجہ ذیل تھے:۔

۱۔ **بعض محاصل کی تنسیخ:** تمغہ۔ میر بحری اور کئی دیگر ایسے ناپسندیدہ محاصل کی تنسیخ کا حکم جاری کیا گیا جو جاگیروں، سرکاروں (اضلاع) اور صوبے کے حکام اپنے مفاد کے لئے کاشتکاروں سے جبراً وصول کرتے تھے۔

۲۔ **چوری اور ڈاکہ زنی کا انسداد:** شاہراہوں کے تحفظ اور چوری و ڈاکہ زنی کے انسداد کے لئے جہانگیر نے حکم جاری کیا کہ شاہراہوں کے متصل سرائیں، مساجد اور کنوئیں تعمیر کئے جائیں اور بستیاں آباد کی جائیں۔

۳۔ **تحفظِ تجار اور فاتونِ وراثت کی اصلاح:** حکام کو ہدایت کی گئی کہ تحفظ تجار کا خیال رکھیں اور ان کی مرضی کے بغیر شاہراہوں پر ان کا مال نہ کھولا جائے۔ مزید برآں کسی ہندو یا مسلمان کی موت کی صورت میں متوفی کی جائیداد بحق سرکار ضبط کرنے کے بجائے اس کے ورثاء کے سپرد کی جائے صرف

Marfat.com

لاوارثوں کی متاع بحقِ سرکار ضبط ہو اور اسے اشاعت اسلام اور رفاہِ عامہ سے متعلقہ عمارات کی تعمیر و مرمت پر خرچ کیا جائے۔

۴۔ امتناعِ منشیات : شراب اور دیگر تمام منشیات کی تیاری، فروخت اور استعمال کی ممانعت کی گئی۔

۵۔ بہیمانہ سزاؤں کی موقوفی : مجرموں کی ناک اور کان کاٹنے کی بہیمانہ سزاؤں کی موقوفی کا حکم جاری کیا گیا اور سرکاری حکام کو عوام کے گھروں میں قیام کرنے کی شدید ممانعت کر دی گئی۔

۶۔ غصبی کی ممانعت : جاگیرداروں اور محکمہ مال کے حکام کو تنبیہہ کی کہ کسی کاشت کار کو اس کی اراضی سے جبراً بیدخل نہ کیا جائے نیز شاہی اجازت کے بغیر اپنے اضلاع کے عوام سے میل جول اور راہ و رسم پیدا نہ کی جائے۔

۷۔ شفاخانوں کا قیام : جہانگیر نے بڑے بڑے شہروں میں شفاخانوں کے قیام کا حکم جاری کیا جہاں مریضوں کی دیکھ بھال اور ان کے مفت علاج کے بندوبست کا حکم دیا گیا۔

۸۔ مخصوص ایام میں ذبیحہ کی ممانعت : شہنشاہ نے اپنے باپ اکبر کی مانند ہفتہ کے بعض مخصوص دنوں میں (جمعرات ہفتہ اور اتوار) جانوروں کے ذبیحہ کی ممانعت کر دی۔

۹۔ اتوار کا احترام : اکبر کی روایت کے مطابق اتوار کے احترام کا حکم دیا اور اس روز جانوروں کا ذبیحہ ممنوع قرار دیا گیا۔

۱۰۔ مناصب اور جاگیروں کی توثیق : عہدِ اکبری کے تمام منصبداروں کے مناصب اور جاگیرداروں کی جاگیروں کی عام توثیق کا حکم جاری کیا گیا۔

۱۱۔ اوقاف کی توثیق : بادشاہ نے علماء فضلاء اور مستحق لوگوں کے تمام وقف جاگیروں اور وظیفوں کی توثیق کر دی۔ عہد اکبری کے صدر میر ال صدر جہاں کو غرباء کی روزانہ دیکھ بھال پر مامور کیا۔

۱۲۔ قیدیوں کی عام معافی : ان تمام قیدیوں کو جو عہد اکبری سے قید خانوں یا قلعوں میں مقید تھے، عام معافی کے تحت رہا کر دیا گیا۔

Marfat.com

زنجیرِ عدل

جہانگیر عدل و انصاف کا دلدادہ تھا اس کی یہ دلی تمنا تھی کہ بلا کسی تخصیص کے رعایا کے ہر فرد کو یکساں طور پر انصاف میسر ہو اور ہر شخص حکام کے ظلم سے محفوظ رہے چنانچہ اس نے دریائے جمنا کے کنارے سے قلعہ آگرہ کے شاہ بُرج تک ایک زنجیر بند صوادی جو زنجیر عدل کہلاتی تھی۔ اس زنجیر کے کھینچنے سے شاہی محل میں گھنٹیاں بجنی شروع ہو جاتی تھیں اور جہانگیر بہ نفسِ نفیس خود نمودار ہو کر ہر فریادی کی دادرسی کرتا تھا۔ جہانگیر برصغیر کا نوشیروانِ عادل تھا جس کے عدل و انصاف میں کوئی لچک نہ تھی اس کے فیصلوں اور منصفانہ کردار کے سامنے خود اس کی محبوب ملکہ نور جہاں کو بھی جھکنا پڑا تھا۔ زنجیر عدل تمام کی تمام خالص سونے کی تھی جو تیس گز لمبی اور ساٹھ طلائی گھنٹیوں سے مزین تھی اور اس کا وزن چار من تھا۔

خسرو کی بغاوت

اپریل۔ مئی ۱۶۰۶ء

جہانگیر کی تخت نشینی کے چند ماہ بعد اس کے بڑے لڑکے شہزادہ خسرو نے بغاوت کر دی۔ قبل ازیں وہ درباری امراء کے ایک گروہ، اپنے ماموں راجہ مان سنگھ اور خسر عزیز کوکہ کی پشت پناہی سے حصولِ تخت کے لئے سازش کر چکا تھا لیکن جہانگیر نے اس کی خطا معاف کرتے ہوئے اسے قلعہ آگرہ میں نظر بند کر دیا تھا۔ لیکن حصول اقتدار کی ہوس نے اسے زیادہ دن تک نظر بند نہ رہنے دیا۔ چنانچہ وہ حصولِ تخت کی سکیم کے تحت ۱۶۔ اپریل ۱۶۰۶ء کی شام کو ۳۵ گھوڑ سواروں کی معیت میں اپنے دادا اکبر اعظم کے مقبرے پر فاتحہ خوانی کے بہانے قلعہ سے نکلا اور تیزی سے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ متھرا کے مقام پر حسین بیگ بدخشانی اپنے تین ہزار سواروں کے ہمراہ اُس سے آملا۔ اس طرح راستے میں اس کی فوج کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی۔ پانی پت کے مقام پر لاہور کا دیوان عبدالرحمان جو آگرہ آرہا تھا بھی شہزادے سے مل گیا۔ شہزادے نے عبدالرحمن کو اپنا وزیر مقرر کیا خسرو ترن تارن پہنچا تو سکھوں کے پانچویں گورو ارجن دیو نے نہ صرف اس کی کامیابی کے لئے دعا کی بلکہ اسے مالی امداد بھی دی۔ لاہور کے گورنر دلاور خاں نے شہزادہ کا ساتھ دینے سے انکار کرتے ہوئے قلعہ کے دروازے بند کر لئے چنانچہ شہزادے نے قلعہ لاہور کا محاصرہ کر لیا۔

جونہی شہزادے خسرو کے فرار کی اطلاع بادشاہ کو ہوئی اس نے شیخ فرید بخاری کو فوج کی کمان دیکر باغی شہزادے کے تعاقب میں بھیجا۔ دوسرے دن بادشاہ خود بھی اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ بادشاہ کی آمد کی اطلاع پاکر خسرو لاہور کا محاصرہ اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جہانگیر نے شہزادے کو راہ راست پر لانے کے لئے نامہ و پیام کے ذریعہ بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر دریائے چناب کے کنارے بھیروال کے میدان میں شاہی افواج سے شہزادے کا آمنا سامنا ہوا۔ باوجودیکہ شہزادے کی فوج کی تعداد شاہی افواج سے کہیں زیادہ تھی لیکن شہزادے کو بری طرح شکست ہوئی اس موقعہ پر

Marfat.com

عبدالرحمٰن اور حسین بیگ جیسے وفادار مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ یہاں سے کابل جایا جائے اور اسے زیر نگیں کر کے بھرپور فوجی جمعیت کے ساتھ دوبارہ دہلی پہ حملہ آور ہوا جائے اس تجویز کے تحت خسرو ابھی شاہ پور کے نزدیک دریائے چناب عبور کرنے کی کوشش میں تھا کہ گرفتار کر لیا گیا۔

یکم مئی ۱۶۰۷ء کو لاہور میں مرزا کامران کے باغ میں خسرو مع اس کے ساتھیوں کے دربار میں بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ شہزادہ پابہ زنجیر تھا۔ اس کی دائیں جانب حسین بیگ اور بائیں جانب عبدالرحمٰن بھی پابہ زنجیر تھا۔ شہزادہ شاہی عتاب کے ڈر سے سخت لرزاں و ترساں تھا اور زار و نزار رو رہا تھا اس نے چاہا کہ بادشاہ کے پاؤں میں گر کر معافی کا خواستگار ہو لیکن جہانگیر نے غضبناک ہو کر اسے اپنی جگہ کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ اور سخت سرزنش کرنے کے بعد اس کو قید کرنے کا حکم دیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں حسین بیگ اور عبدالرحمٰن کو بیل اور گدھے کی کھالوں میں بند کر کے اور گدھے پر الٹے رخ بٹھا کر سارے شہر میں گھمانے کا حکم دیا۔ حسین بیگ تو بارہ گھنٹے کے اندر اندر مر گیا البتہ عبدالرحمٰن چوبیس گھنٹوں کی سخت اذیت برداشت کرنے کے بعد بھی بچ رہا۔ خسرو کے دوسرے حامیوں کے لئے باغ سے شہر تک دو رویہ سولیاں کھڑی کی گئیں اور ان پہ باغیوں کو لٹکا دیا گیا اور طنزاً خسرو کو بغاوت کا عبرتناک انجام دکھانے کے لئے ایک ہاتھی پہ سوار کر کے ان کے پاس سے گذارا گیا اس سے شہزادہ اس قدر متاثر ہوا کہ وہ کئی دن تک روتا رہا۔

بغاوت کے دوران شہزادہ خسرو کی امداد و حمایت کرنے کی بنا پہ سکھ گورو ارجن دیو پر دو لاکھ روپیہ جرمانہ عائد کیا گیا لیکن اس نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اس کی جائیداد بحق سرکار ضبط کر کے زید بخاری کو عطا کر دی گئی اور گورو کو موت کی سزا دی گئی۔ مشہور مورخ ڈاکٹر بینی پرشاد رقمطراز ہے کہ اگر گورو ایک باغی کی اعانت نہ کرتا تو وہ زندگی کے باقی ماندہ ایام پرامن طور پر گذارتا لیکن اس کے خلاف تعزیری کارروائی نے سکھوں اور مغل حکومت کے درمیان مخاصمت کی فضا پیدا کر دی جس کے بعد ازاں بہت بھیانک نتائج برآمد ہوئے سکھوں نے گورو کے قتل کو مذہبی رنگ دیکر مغلوں کے خلاف بغاوت کر دی اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک باغی رہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سکھ گورو نے مذہبی پیشوا ہونے کے باوجود عملی سیاست میں حصہ لیتے ہوئے باغی شہزادہ کی امداد کی تھی جس کی وجہ سے یہ ناخوشگوار صورتحال پیدا ہوئی۔

۱۶۰۷ء میں کابل سے واپسی پہ جہانگیر کو معلوم ہوا کہ اسے قتل کرنے اور شہزادہ خسرو کو تخت نشین کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔ اس پر بادشاہ نے سازش کے سرغنوں نورالدین، اعتمادالدولہ کے بیٹے شریف، بیداغ ترکمان اور خواجہ سرا اعتبار خاں کو موت کے گھاٹ اتروا دیا اور شہزادہ خسرو کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروا کر اسے اندھا کر دیا۔

Marfat.com

بعد ازاں ۱۶۱۰ء میں خسرو کے حامیوں میں سے ایک شخص نے جعلی خسرو بنکر علمِ بغاوت بلند کیا اور پٹنہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن شاہی افواج نے اسے گرفتار کر کے کیفر کردار کو پہنچا دیا۔ ۱۶۲۰ء میں خسرو کو شہزادہ خرم (شاہجہان) کے سپرد کیا گیا۔ شاہجہان نے اسے ۱۶۲۲ء میں برہان پور میں ہلاک کروا دیا اور باپ کو اطلاع بھجوا دی کہ شہزادہ خسرو قدرتی موت مر گیا ہے۔ اگرچہ تزک جہانگیری میں جہانگیر خود بھی رقمطراز ہے کہ مرحوم قولنج کی مرض سے فوت ہوا۔ لیکن بیشتر تاریخی شواہد سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی موت میں شاہجہان ملوث تھا جو اپنے بھائی کو اپنا رقیب سمجھتا تھا اس لئے اس نے اسے اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ خسرو کی نعش کو برہان پور سے الہ آباد میں خسرو باغ میں دفن کر دیا گیا۔ جہاں اس کا مقبرہ آج بھی اس کے عبرتناک و دردناک انجام کی یاد دلا رہا ہے۔

ملکہ نور جہاں
۱۵۷۷ء تا ۱۶۴۵ء

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں شہنشاہ جہانگیر اور نور جہاں کی شادی خاص اہمیت کی حامل ہے ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے بردوان کے جاگیردار شیر افگن کی بیوہ مہرالنسا سے شادی کی اور اسے اولاً نور محل اور بعد ازاں نور جہاں کے خطاب سے نوازا۔ نور جہاں کا اصلی نام مہرالنسا تھا وہ ایرانی النسل مرزا غیاث بیگ کی لڑکی تھی ۱۵۷۷ء میں مرزا غیاث بیگ ایران سے ہجرت کر کے روزگار کی تلاش میں برصغیر آ رہا تھا کہ قندھار کے نزدیک مہرالنسا پیدا ہوئی۔ غربت اور اقتصادی بدحالی سے مجبور ماں باپ نے نوزائیدہ بیٹی کو راستے ہی میں ایک درخت کے نیچے مقدر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ لیکن بعد ازاں ایک قافلے کے سردار ملک مسعود کی وساطت سے مہرالنسا پرورش کے لئے اپنے ہی والدین کے سپرد ہوئی۔ ملک مسعود ہی کی وساطت سے مرزا غیاث بیگ کو اکبر کے دربار میں ملازمت بھی مل گئی جہاں وہ اپنی لیاقت اور ذہانت کی وجہ سے جلد ہی دیوانِ بیوتات (شاہی کارخانوں کا نگران وزیر) کے منصب تک پہنچ گیا۔ مرزا غیاث بیگ نہایت زیرک اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس کی سخاوت مشہور تھی لیکن رشوت ستانی کے لئے سخت بدنام تھا۔ ۱۵۹۵ء میں اکبر نے اسے سہ صد کا منصب عطا کر کے کابل کا دیوان مقرر کر دیا۔ جہانگیر کے عہد میں اسے اعتماد الدولہ کا خطاب ملا۔

۱۵۹۴ء میں جب مہرالنسا اپنی عمر کے سترھویں سال میں تھی وہ اعلیٰ تہذیب و شائستگی سے آراستہ حسن خداداد کا ایک شاہکار تھی۔ مرزا غیاث بیگ نے شہنشاہ اکبر کے ایما پر اس کی شادی علی قلی خاں استجلو سے کر دی جو ایک ایرانی مہاجر تھا اور عبدالرحیم خان خاناں کی ملازمت میں تھا ازاں بعد وہ اعلیٰ فوجی صلاحیت کی بنا پر شاہی ملازمت میں متعین ہوا۔ ۱۵۹۹ء میں چتوڑ کی مہم شہزادہ سلیم کے سپرد ہوئی تو علی قلی خاں استجلو کو شہزادے کے فوجی دستہ میں شامل کر دیا گیا اس دوران جب ایک شکار میں اس نے تن تنہا ایک شیر کو ہلاک کیا تو شہزادہ نے اس کی جرأت و بہادری سے خوش ہو کر

Marfat.com

اسے "شیر افگن" کا خطاب دیا۔ لیکن جب شہزادہ سلیم نے علمِ بغاوت بلند کیا تو وہ دوبارہ اکبر کی ملازمت میں چلا آیا۔ ۱۶۰۵ء میں جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے نہ صرف شیر افگن کی خطا معاف کر دی بلکہ اسے بنگال میں بردوان کا فوجدار مقرر کرتے ہوئے اسے جاگیر بھی عطا کی۔

۱۶۰۶ء میں جب جہانگیر کو معلوم ہوا کہ شیر افگن بنگال کے افغانوں سے ساز باز کر کے سرکشی پر آمادہ ہے تو اس نے بنگال کے نئے گورنر قطب الدین خاں کو شیر افگن کے عزائم معلوم کرنے اور اس کے رویے کی نگرانی کا حکم دیا اور بصورتِ سرکشی اس کی گوشمالی کی تاکید کی۔ علاوہ ازیں اسے دربارِ شاہی میں حاضر کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ۷ اپریل ۱۶۰۷ء کو شیر افگن اپنے دو محافظوں کے ساتھ جوابدہی کے لیے گورنر قطب الدین خاں کے کیمپ میں پہنچا۔ جہاں گورنر کے سپاہیوں نے ایکدم اسے گھیرے میں لے لیا۔ قطب الدین کے سپاہیوں کے اس اقدام کے خلاف شیر افگن نے اس سے احتجاج کیا اور غضبناک ہو کر اسے تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ اس پر قطب الدین کے محافظوں نے شیر افگن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

جب جہانگیر کو گورنر بنگال قطب الدین خاں کی ہلاکت کی خبر پہنچی تو وہ سخت برہم ہوا۔ شیر افگن کی بیوہ مہرالنسا اور اس کی کمسن بیٹی لاڈلی بیگم کو دربار میں پیش کیا گیا۔ مغلیہ دستور کے مطابق مہرالنسا اور اس کی بیٹی کو شاہی سرپرستی میں لیکر بادشاہ کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کی مقربِ خاص بنا دیا گیا یہاں مہرالنسا کی قسمت نے پلٹا کھایا اور وہ نہ صرف برصغیر کی ملکہ بنا دی گئی بلکہ نورجہاں بن گئی۔ مارچ ۱۶۱۱ء میں جشنِ نوروز کے دوران مینا بازار کی سیر کرتے ہوئے جہانگیر نے اچانک مہرالنسا کو دیکھا اور اس کی خوبصورتی، رعنائی اور حاضر جوابی سے اتنا متاثر ہوا کہ مئی ۱۶۱۱ء میں اس سے شادی کر لی اور نورمحل کا خطاب عطا کیا لیکن بعد میں نورجہاں کے تاریخی لقب سے نوازا۔

"عہدِ جہانگیری کا اہم ترین واقعہ نورجہاں سے جہانگیر کی شادی ہے پورے پندرہ سال تک وہ معزز خاتون (نورجہاں) سلطنتِ مغلیہ کی سب سے اہم اور مقتدر شخصیت رہی۔ آہستہ آہستہ جہانگیر امورِ سلطنت کی نگرانی و انجام دہی سے غافل ہوتا چلا گیا۔ اور نورجہاں تمام اقتدار کی حامل اور سیاہ و سفید کی مالک بن گئی۔" [1]

نورجہاں اور جہانگیر

شیر افگن کی ہلاکت اور نورجہاں سے جہانگیر کی شادی کے بارے میں مؤرخین متضاد نظریات رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نورجہاں اور جہانگیر آغازِ شباب سے ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ مولانا نور بین آزاد "نفس الہند"

---

[1] بینی پرشاد "ہسٹری آف جہانگیر"

Marfat.com

ہیں نور جہاں اور جہانگیر کی محبت کا افسانہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ مینا بازار میں شہزادہ جہانگیر ہاتھوں میں دو کبوتر لئے باغ کی ایک روش پر جا نکلا۔ پھول توڑنے کی غرض سے اس نے اپنے دونوں کبوتر مہر النسار کو پکڑا دیئے جو البیلے پن سے چمن میں گھوم رہی تھی۔ اتفاقاً ایک کبوتر پھڑک کر مہر النسار کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جب شہزادہ متوجہ ہوا اور پوچھا کہ میرا کبوتر کیا ہوا! اس نے کہا صاحب عالم رد تو اڑ گیا۔ شہزادے نے پوچھا کیونکر؟ اس نے بھولپن سے دوسرا کبوتر ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے کہا اس طرح۔ مہر النسار کے اس بھولپن پر شہزادہ جہانگیر فدا ہو گیا۔

اکبر کو شہزادے کی اس محبت کا علم ہوا تو اس نے اس کو ناپسند کیا اور مہر النسار کی شادی علی قلی خاں استجلو شیر افگن سے کر دی۔ جب جہانگیر تخت شاہی پر متمکن ہوا تو اس نے شیر افگن کو ہلاک کروا کر مہر النسار سے خود شادی کر لی۔ ڈاکٹر بینی پرشاد کی رائے میں "شہزادے نے مہر النسار کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا اور نہ ہی اکبر نے ان کی شادی کی ممانعت کی۔ اس لئے شیر افگن کی موت سے جہانگیر کا کوئی تعلق نہ تھا اس نے مہر النسار کو پہلی مرتبہ ۱۶۱۱ء میں دیکھا۔" [1] اپنی رائے کے متعلق مؤرخ نے یہ دلائل پیش کئے ہیں۔

۱۔ "کسی ہمعصر مؤرخ نے اس امر کے بارے میں اشارتاً بھی کچھ ذکر نہیں کیا کہ جہانگیر مہر النسا سے شادی پر مصر تھا جبکہ اکبر نے اس شادی کی اجازت نہ دی اور نہ ہی کسی مؤرخ نے شیر افگن کی موت کا ذمہ دار جہانگیر کو ٹھہرایا ہے۔

۲۔ "کسی ہمعصر یورپین سیاح نے بھی اس افسانہ کے متعلق نہیں لکھا حالانکہ یہ لوگ مغل بادشاہوں کی نجی زندگی سے متعلق ہر قسم کی افواہوں اور من گھڑت افسانوں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔"

۳۔ "اکبر کا سلیم کو مہر النسار سے شادی کرنے سے منع کرنے کا بھی کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اس دور میں ایسی شادیاں عموماً ہوتی رہتی تھیں۔"

۴۔ "اگر اکبر نے اس شادی کی مخالفت کی ہوتی تو وہ اتنا غافل اور کوتاہ اندیش نہ ہو سکتا تھا کہ وہ خود اپنے ہی حکم سے ۱۵۹۹ء میں استجلو خاں کو شہزادہ سلیم کے ماتحت متعین کرتا اور استجلو خاں شہزادہ سلیم کا رقیب ہوتا تو یہ کیونکر ممکن ہوا کہ شہزادہ نے اسے شیر افگن کے خطاب سے نوازا اور اہم عہدے پر ترقی دی۔"

۵۔ قطب الدین کو بنگال کا گورنر بنانے کا مقصد صرف اپنے سیاسی حریف مان سنگھ کو ایک اہم صوبے کی گورنری سے علیحدہ کرنا تھا نہ کہ شیر افگن کو ہلاک کروا کر مہر النسار کو اپنے تصرف میں

---

[1] ہسٹری آف جہانگیر

Marfat.com

لانا۔ کیونکہ ایسا ہی سلوک مرزا عزیز کوکہ سے بھی کیا گیا جو مان سنگھ کی طرح بادشاہ کا سیاسی مخالف تھا۔"

۶۔ "نورجہاں کے اعلیٰ کردار کی روشنی میں اس امر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے محبوب اور بہادر خاوند کے قاتل سے شادی پر رضامند ہوتی۔"

۷۔ "شیر افگن کی بیوہ کو شاہی دربار میں پیش کرنا مغلیہ دستور کے عین مطابق تھا اور اسے سلیمہ بیگم کی متقرب خاص مقرر کرنا بھی دستور کے خلاف نہ تھا۔"

اس کے برعکس ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی رائے میں یہ امر قابل زیاں نہیں ہے۔ جہانگیر شہزادگی کے ایام میں نورجہاں سے محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کا خواہشمند تھا اس لئے شیر افگن کے قتل میں بھی اس کا ہاتھ تھا۔[1] ان کا استدلال یہ ہے:۔

۱۔ ڈاکٹر بینی پرشاد کے دلائل جن سے انہوں نے جہانگیر کو معصوم ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے حقیقت کے منافی ہیں زمانہ حال کے اندین مؤرخین اپنے پیشرو کی بہ نسبت زیادہ مستند معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔

۲۔ شیر افگن کے خلاف کوئی خاص باغیانہ عزائم کے الزامات نہ تھے بلکہ محض ایک شبہ کی بنا پر قطب الدین کو بردوان بھیجا گیا تھا کہ اگر وہ نافرمانی کا مرتکب ثابت ہو تو اس کی سرزنش کی جائے لیکن اس کی گرفتاری کا بعجلت عمل میں لایا جانا اور وضاحت کا موقع دیئے بغیر اسے گھیرے میں لے لینا ہمارے شبہ کو اور تقویت پہنچاتا ہے۔

۳۔ جہانگیر نے اپنی سوانح عمری میں نورجہاں سے شادی کے اسباب و وجوہ کو تحریر نہ کرنا ہمارے شبہ کی مزید تقویت کا باعث ہے کیونکہ اس نے "تزک جہانگیری" میں اپنی زندگی کے معمولی معمولی واقعات کا بھی صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

۴۔ بادشاہ کے حکم سے مہرالنسار کو شاہی دربار میں لانا اور دارالسلطنت میں اس کے باپ اور بھائی کی موجودگی کے باوجود اسے شاہی حرم میں سلیمہ بیگم کی نگرانی میں دینا ایک حیران کن امر ہے کیونکہ دوسرے باغی امراء کے متعلقین کے ساتھ کبھی ایسا نہیں کیا گیا۔

۵۔ ایک ولندیزی ہمعصر مؤرخ ڈی لاٹ (De-Leat) کی تصنیف آفاق کتاب "دسکرپشن آف انڈیا اینڈ فرمگینٹ آف انڈین ہسٹری" سے بھی صاف عیاں ہے کہ جہانگیر اپنے ابا رشہزادگی سے ہی مہرالنسار سے محبت کرتا تھا۔ جہانگیر نے شیر افگن کی موت کے فوراً بعد اس سے انس لئے

---

[1] "اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا"

Marfat.com

شادی نہ کی کہ عوام کے ذہنوں سے شیر افگن کی موت کے متعلق شکوک و شبہات دور ہو جائیں۔ نیز دانو جہاں کے جذبات کو کبھی مشتعل نہ کرنا چاہتا تھا۔

الغرض دلائل کی روشنی میں ڈاکٹر اشتوری پرشاد کا فیصلہ یہ ہے کہ "اگرچہ کوئی ایسا ٹھوس ثبوت موجود نہیں جس کی بنا پر بادشاہ کو مورد الزام ٹھہرایا جا سکے۔ تاہم شیر افگن کے قتل کے حالات انتہائی مشتبہ نوعیت کے ہیں۔"

تبصرہ نور جہاں اور جہانگیر کی داستان کے اہم ترین اور متنازعہ فیہ پہلو یہ ہیں:۔

کیا جہانگیر ایام شہزادگی میں مہر النساء کا جذبۂ محبت اور اس سے شادی کا خواہاں تھا؟ اور کیا جہانگیر کے باپ اکبر نے اس شادی کی مخالفت کی؟ کیا شیر افگن کی موت میں جہانگیر کا ہاتھ تھا؟ اگر جہانگیر نور جہاں سے شادی کا متمنی تھا تو اس نے ۱۶۰۷ء میں مہر النساء سے اس وقت شادی کیوں نہ کی جب اسے دربار میں پیش کیا گیا تھا؟ ان پہلوؤں کی وضاحت کے بارے میں مؤرخین مختلف نظریئے رکھتے ہیں (جن کی تفصیل اوپر آ چکی ہے) اگرچہ قطعیت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس ضمن میں کس نظریہ میں صداقت ہے۔ لیکن تحقیق اور تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات نہایت وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شہزادہ سلیم ایام شہزادگی میں نہ مہر النساء کی محبت میں مبتلا ہوا اور نہ اس سے شادی کا آرزومند رہا کیونکہ زمانۂ حال کے تمام مؤرخین نے اپنی تحقیق سے اس تمام داستان کو سراسر غلط قرار دیا ہے۔

نور جہاں کا کردار جہانگیر سے شادی کے وقت نور جہاں کی عمر چونتیس برس کی تھی جبکہ جہانگیر اپنی عمر کی بیالیسویں بہار میں تھا۔ نور جہاں نسوانی حسن کا ایک مثالی تماشا تھی اور اس عمر میں بھی اس کے حسن و جمال میں ایک الھڑ دوشیزہ کی سی کشش اور دلآویزی تھی۔ اس کی صحت قابل رشک تھی اس پر وہ اپنے حسن و رعنائی کو آرائش جمال کے نت نئے اسلوب اور ملبوسات میں پرکشش جدت طرازیوں سے سحر انگیز اور نظر نواز بنائے رکھتی تھی۔ حسن و خوبی اور آرائش کے علاوہ ملکہ اعلیٰ تعلیم، شائستگی، سخن آرائی، بذلہ سنجی، فن کارانہ مزاج، خداداد لیاقت اور تنظیمی صلاحیت کے اوصاف سے مزین فسرت کا ایک لاثانی شاہکار تھی اور جہانگیر کی مانند شعر و شاعری، موسیقی اور مصوری کی دلدادہ تھی۔ وہ فی البدیہہ اور برجستہ اشعار کہنے میں صاحب کمال تھی۔ اس کا یہ ساحرانہ جوہر ذات بھی جہانگیر کے لئے اس کی طرف زیادہ راغب ہونے کا باعث ہو۔ اس کی بدیہہ گوئی کے بہت سے واقعات ہیں۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے عید کا چاند دیکھ کر نور جہاں کا صرف دیکھا اور کہا:

ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد

Marfat.com

نورجہاں نے برجستہ کہا کہ:

کلیدِ میکدہ گم گشتہ بُود، پیدا شُد

نورجہاں نے تخلیقی ذہن پایا تھا اس نے کئی نئے فیشن ایجاد کئے۔ لباس کی بے شمار نئی طرزیں رائج کیں گلاب کا عطر ایجاد کیا اور جواہرات کے نئے نمونے تخلیق کئے۔ دربار کو نئے انداز سے آراستہ کیا اس سے قبل دربار کی ظاہری شان و شوکت دوبالا ہوگئی۔ وہ طبعاً فیاض اور سخاوت کا پیکر تھی۔ وہ نہ صرف بیواؤں اور یتیم لڑکیوں کا سہارا تھی بلکہ یتیم لڑکیوں کی شادی اور جہیز کا اہتمام کرنا اور بے کسوں کی امداد کرنا اس کا ایک اصول تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جب کسی مجرم نے عتاب شاہی سے بچنے کے لئے اس کی پناہ لی تو اسے معافی مل جاتی تھی۔

بہادری اور دلیری کے اعتبار سے نورجہاں مردانہ صفات کی پیکر تھی۔ قدرت نے اسے اعلیٰ فہم و فراست اور معاملہ فہمی سے نوازا تھا اور مملکت اور پیچیدہ درباری سیاسی مسائل کی گتھیاں اس قدر آسانی سے سلجھاتی اور فیصلے کرتی کہ بڑے بڑے امراء دنگ رہ جاتے اور انہیں اس کی سیاسی بصیرت کے آگے سر جھکانا پڑتا تھا۔ تمام امورِ سلطنت کی خود نگرانی کرتی تھی۔ بعض اوقات شاہی احکامات اور فرمان بھی جاری کرتی تھی۔ اگرچہ وہ ایک نازک اندام حسینہ اور دلربائی کا مجسمہ تھی مگر مضبوط قلب و جسم اور قوتِ ارادی کی مالک تھی۔ اکثر شاہی شکار کی مہمات میں شامل ہوتی اور بسا اوقات اپنے ہاتھ سے شیر کا شکار کرتی۔ نازک اور مشکل ترین مرحلوں پر اس کی حاضر جوابی اور شعوری صلاحیت زیادہ اجاگر ہو جاتی تھی۔ جب مہابت خاں نے جہلم کے قریب بادشاہ کو اپنی حراست میں لیا تو نورجہاں نے فوج کی کمان خود سنبھالی اور ہاتھی پر سوار ہو کر دریا کو عبور کیا اور بادشاہ کو رہا کرانے کی جرأت مندانہ کوشش کی۔ نورجہاں میں جاہ و اقتدار کی ہوس بہت زیادہ تھی وہ اپنے اقتدار کے سامنے کسی کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو برداشت نہیں کرتی تھی۔

ملکہ کا اقتدار

نورجہاں نے شادی کے بعد جلد ہی اپنے بے مثال حسن، فن کارانہ مزاج اور فراست و ذہانت جیسی خوبیوں سے جہانگیر کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ۱۶۱۳ء میں وہ "بادشاہ بیگم" یعنی شاہی حرم کی ملکہ نتیجہ خاتون بن گئی۔ ازاں بعد اسے جہانگیر کے دل پر اس قدر قابو حاصل ہو گیا کہ وہ امورِ سلطنت میں بھی دخل دینے لگی۔ یہاں تک کہ حکومت کا ہر کام اس کے مشورے سے طے ہونے لگا۔ جہانگیر جو پہلے ہی تساہل پسند اور عیش و نشاط کا دلدادہ تھا، امورِ سلطنت اور عملی سیاست میں ملکہ کی دلچسپی سے اور بھی تن آسان ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ملکہ کی خداداد ذہانت، مستقل مزاجی اور والہانہ محبت سے متاثر ہو کر تمام کاروبارِ سلطنت اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ احکاماتِ شاہی پر ملکہ کا نام جہانگیر کے ساتھ آنے لگا اور نہ صرف شاہنامہ پر بھی اس کا نام تھا بلکہ سکوں پر بھی

Marfat.com

اس کا نام کندہ ہونے لگا۔ روپے اشرفی پر یہ شعر کندہ تھا:۔

بہ حکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
بنامِ نورجہاں پادشاہ بیگم زر

مُہر کا سجع تھا کہ:

نورِ جہاں گشت بفضلِ اللہ
ہمدم و ہمسر از جہانگیر شاہ [1]

رفتہ رفتہ جہانگیر امورِ سلطنت سے غافل ہو گیا اور ملکہ سیاہ و سفید کی مالک بن گئی۔ بسا اوقات ملکہ جھروکہ درشن میں بیٹھتی اور دربارِ عام میں امورِ سلطنت سرانجام دیتی۔ مجرموں کو معاف کرتے اور شاہی افسروں کو ترقی دیتے میں جہانگیر سے زیادہ نورجہاں اپنے اختیارات استعمال کرتی تھی۔ جہانگیر صرف نام کا بادشاہ ہو کر رہ گیا تھا اس کو صرف شراب نوشی و عیش کوشی سے سروکار تھا اور کاروبارِ سلطنت پر ملکہ چھائی ہوئی تھی۔ خود جہانگیر 'تزکِ جہانگیری' میں رقمطراز ہے کہ "میں نے اپنی سلطنت شراب کے ایک جام اور بھنے ہوئے گوشت کی ایک قاب کے عوض اپنی چہیتی ملکہ کے سپرد کر دی ہے"

جہانگیر سے شادی کے چند ہی سال بعد نورجہاں اس قدر با اختیار ہو گئی کہ اس نے اپنے با اثر حامیوں کا ایک خاص جتھہ قائم کیا جو "نورجہانی جتھہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ جتھہ ملکہ نورجہاں کے باپ مرزا غیاث الدین اعتماد الدولہ، بھائی آصف جاہ، والدہ عصمت بیگم، ملکہ کی بھتیجی ارجمند بانو بیگم کے خاوند شہزادہ خرم (شاہجہان) پر مشتمل تھا۔ ملکہ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اس کے اراکین کو بلند ترین مناصب اور مراتب عطا ہوئے۔ یہ جتھہ ۱۶۱۱ء سے ۱۶۲۲ء تک برسرِ اقتدار رہا۔ اس دوران اراکین جتھہ کی فطری صلاحیتیں سلطنت کی فلاح و بہبود اور استحکام حکومت کے لئے وقف رہیں۔ نتیجتہً باغیوں کا قلع قمع ہوا۔ فتوحات حاصل ہوئیں اور مملکت میں ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا۔

۱۶۲۲ء میں اعتماد الدولہ کی وفات کے بعد یہ جتھہ کمزور پڑ گیا۔ نیز ملکہ کی جاہ طلبی اور ہوسِ اقتدار اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے جہانگیر کی مسلسل بیماری اور امورِ سلطنت سے اس کی عدم دلچسپی سے فائدہ اٹھا کر بلا شرکتِ غیرے اقتدارِ اعلیٰ سنبھال لیا۔ اس کی عنایات کا مرکز شہزادہ خرم نہ تھا بلکہ اس کا پسندیدہ شہزادہ شہریار تھا۔ ملکہ کی ہوسِ اقتدار اور اس کے پیدا کردہ سازشی ماحول کی وجہ سے شہزادہ خرم اور مہابت خاں جیسے اعلیٰ جرنیل کی بغاوتیں برپا ہوئیں۔ قندھار پر ایران کا قبضہ ہو گیا شاہی دربار سازشوں کا اڈہ بن گیا اور ملک میں بدنظمی اور خانہ جنگی پھیلنے لگی۔ ملکہ نے اپنے اقتدار کو برقرار

---

[1] شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد۔ قصص التقدیس ص ۱۰۰ تا ۱۰۴

Marfat.com

رکھنے کی پوری سعی کی لیکن ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کی وفات کے ساتھ ہی ملکہ کے اقتدار کا ستارہ بھی زوال پذیر ہو گیا۔ شہزادہ خرم شاہجہان کے لقب سے تخت تیموریہ کا وارث ہوا تو ملکہ نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور جہانگیر کی وفات کے بعد ۱۸ سال (۱۶۴۵ء) میں اپنی وفات تک، شاہی قلعہ لاہور میں مقیم رہی۔ شاہجہان نے دو لاکھ روپیہ سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

عملی سیاست سے دستبرداری کے بعد یتیم لڑکیوں کی تعلیم اور شادی کا اہتمام کرتا اور ہر روز اپنے خاوند کی قبر پہ فاتحہ خوانی کے لئے جاتا ملکہ نور جہاں کے مشاغل و معمولات تھے۔ جہانگیر کا مقبرہ شاہجہان نے ملکہ نور جہاں کی نگرانی میں تعمیر کروایا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ جہانگیر کا مقبرہ نور جہاں نے تعمیر کروایا تھا البتہ نور جہاں نے اپنا مقبرہ اپنے ذاتی مصارف سے خود اپنی زندگی میں ہی تعمیر کروایا۔ اس کی لوحِ مزار پر لکھا ہوا شعر آج تک زبان زدِ خواص و عوام ہے:

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد، نے صدائے بلبلے

نور جہاں کے اثر و نفوذ کے اثرات

پندرہ سال تک نور جہاں صاحب اقتدار اور مغلیہ سلطنت کی اہم ترین اور مقتدر شخصیت رہی۔ آغاز میں اس کے اثر و نفوذ کا بہت اچھا اثر ظاہر ہوا۔ جہانگیر کی طبیعت اعتدال پر آ گئی۔ اس نے ملکہ کی خواہش پہ شراب نوشی کم کر دی اور غصہ پہ قابو پا کر وحشیانہ سزائیں دینے سے اجتناب کرنا شروع کیا۔ ملکہ نے امورِ سلطنت میں بادشاہ کا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو وقتی طور پر ملک کا نظم و نسق بہتر ہو گیا۔ اس کے جمالیاتی ذوق کی بدولت مغلیہ دربار کی شان و شوکت میں چار چاند لگ گئے۔ نیز ملکہ کی فن موسیقی اور فن مصوری کی سرپرستی نے مغلیہ دربار کی ظاہری شہرت و عظمت کو دوبالا کر دیا۔ گلاب کا عطر پان میں چونے کا استعمال، لباسوں کی نئی طرزیں، خس کی ٹٹی، چاندنی کا فرش اور جواہرات کے نئے نمونوں کی تخلیق نور جہاں کی ذہانت و طباعی کے کرشمے تھے جو اس کے اثر و نفوذ کی بدولت سوسائٹی میں مروج و متداول ہوئے۔ ملکہ کی طبیعت بے حد فیاض واقع ہوئی تھی۔ یتیم اور بے سہارا لڑکیوں کی شادی کا اہتمام کرنا اور بے کسوں کو سہارا دینا اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ یوں امورِ حکومت میں ملکہ کا اثر و نفوذ بالعموم رعایا کی بہبود، حاجتمندوں کی دستگیری اور بالخصوص علوم و فنون کی ترقی و سرپرستی کیلئے نہایت مفید ثابت ہوا۔

لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ملکہ کے روز افزوں اثر و نفوذ اور اقتدار پسندی کے باعث درباری سازشوں، ملکی سیاست اور سلطنت کے نظم و نسق پہ تباہ کن اور دور رس اثرات مرتب ہونے لگے۔ ۱۶۲۲ء کے بعد خاصی شدید صورت اختیار کر گئے کیونکہ ملکہ اپنے عہد اقتدار میں مسلسل درباری خواہاں اور درباری سازشوں میں شامل رہی جس سے کئی پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے۔

Marfat.com

تک نور جہاں اپنے جتھہ کی راہنما رہی اور اس کی سرکردگی میں یہ جتھہ دربار میں بے پناہ اثر و رسوخ اور قوت کا حامل رہا اور اس نے ہر مخالف کو بری طرح دبائے رکھا۔ ملکہ نے اپنے باپ بھائی اور دیگر رشتہ داروں کو سلطنت کے اہم عہدوں پر متعین کیا۔ اس عرصہ میں وہ شہزادہ خرم کو حامی رہی جس کی وجہ سے اُسے نہ صرف اہم مراتب اور مراعات سے نوازا گیا بلکہ اس کی ولیعہدی کو یقینی بنا دیا گیا لیکن جونہی ملکہ نے شہزادہ شہریار سے اپنے سابقہ خاوند کی لڑکی لاڈلی بیگم کی شادی کی۔ شہزادہ شہریار اس کی خصوصی توجہ کا مرکز بن گیا اور اس کی یہ کوشش اور خواہش رہی کہ شہریار ولیعہد مقرر ہو تاکہ اس کا اقتدار برقرار رہے حالانکہ اسے علم تھا کہ شہزادہ شہریار بالکل نااہل ہے اس کی نااہلی اور غیر مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ اسے بالعموم "نا شدنی" کہہ کر پکارتے تھے۔ شہزادہ خرم جس نے سلطنت کی ترقی و استحکام کے لئے نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں نے ملکہ کے بدلے ہوئے رویہ سے بدظن ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ الغرض امورِ سلطنت میں ملکہ کی مداخلت سے ملک میں بدنظمی اور خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ قندھار پر ایرانیوں نے قبضہ کر لیا ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور امیر الامراء مہابت خاں جیسے وفادار جرنیل نے بھی بغاوت کا پرچم لہرا دیا۔

جہانگیر کے آخری ایام میں ملکہ کو اختیارِ کلی حاصل کرتے اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے سوا دیگر امورِ سلطنت سے کوئی دلچسپی نہ رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دربار سازشوں کا اڈا بن گیا۔ قندھار مغلیہ سیادت سے آزاد ہو گیا۔ بغاوتیں رونما ہونے لگیں۔ انصاف میں خلل پیدا ہوا اور ملک میں سازشوں، من مانیوں اور رشوت ستانیوں کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ کیونکہ نور جہاں عورت ہونے کی حیثیت سے سخت گیری کی پالیسی کو اپنا نہ سکتی تھی۔ اس کا بھائی آصف جاہ بھی اس سے بدظن ہو گیا کیونکہ وہ اپنے داماد شہزادہ خرم کا طرفدار تھا۔ اس کے علاوہ نور جہاں کی اقتدار پسندانہ پالیسی کے باعث دیگر امراء بھی بدظن ہو گئے کیونکہ اس نے اپنے مخالف امراء کی تذلیل کرنا شروع کر دی تھی۔

بہرحال نور جہاں اپنے داماد شہریار کو ولیعہد سلطنت نہ بنا سکی۔ کیونکہ جہانگیر کی وفات کے بعد آصف جاہ نے شہریار کو گرفتار کر کے شہزادہ خرم کے لئے حصولِ تخت کا راستہ ہموار کر دیا۔ بالآخر ملکہ کو سیاست سے دستبردار ہونا پڑا۔ مشہور مؤرخ الفنسٹن کی رائے ہے کہ:

"نور جہاں کا اقتدار اگرچہ عام لوگوں کے لئے مفید تھا لیکن انجام کار سلطنت کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔"

Marfat.com

عہدِ جہانگیری کی فتوحات

بنگال کے افغان

بنگال کی تسخیر اکبر کے عہد میں ہوئی اور اسے باقاعدہ طور پر سلطنت مغلیہ میں مدغم کر لیا گیا لیکن وہاں کے افغان حکمران دلی طور پر اطاعت گذار نہ تھے وہ اکبر کی جارحانہ پالیسی سے غیر مطمئن رہتے۔ کیونکہ اکبر نے اپنے افغان امرا کے مقابلہ میں راجپوت امرا کو ترجیح دینے شروع کر دی تھی۔ جہانگیر نے تخت نشینی کے بعد اپنے بچپن کے ساتھی مہابت خاں کو جو دلی افغانوں کی بغاوت کچلنے میں پیش پیش تھا، بنگال کا صوبیدار مقرر کیا۔ مہابت خاں نے تخت نشینی کے بعد اپنوں سے بے وفائی کی اور بنگال میں پہنچ کر بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ بنگال میں پٹھان سرداروں کی نمایاں حیثیت تھی۔ ان میں بایزید، عثمان خاں لوہانی، مسند علی خاں اور دلاور خاں قابل ذکر ہیں۔ ان سرداروں نے مہابت خاں کی سرکردگی میں کھلم کھلا بغاوت کر دی۔

۱۶۰۸ء میں جہانگیر نے اسلام خاں کو بنگال کا گورنر مقرر کیا اور اسے اختیار دیا کہ وہ بغاوت کچلنے کے لیے جو مناسب سمجھے کرے۔ اسلام خاں نے باغی افغانوں کے خلاف فوجی کارروائی کے لیے صوبائی صدر مقام کو راج محل سے جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں منتقل کر دیا۔ ۱۶۱۰ء میں افغانوں کے خلاف منظم فوجی کارروائی کی گئی جس میں افغانوں کو شکست فاش ہوئی اور بنگال پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔

اس تصادم میں شکست سے بنگال میں افغان قوت کا خاتمہ ہو گیا اور صوبے میں مکمل امن و امان بحال ہو گیا۔ جہانگیر نے اپنی حکمت عملی اور بہادری سے کام لیتے ہوئے افغانوں سے مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔ ان کے دلوں سے نفرت اور کدورت دور کرنے کے لیے ان بہادروں کا اعزاز کیا اور انہیں بلند مناصب سے نوازا۔ بادشاہ نے دولت خاں لودھی کے بیٹے خان جہاں لودھی کو ہفت ہزاری منصب سے نواز کر دکن کا صوبیدار مقرر کیا۔ دلاور خاں کو چہار ہزاری ذات و سوار کا منصب عطا کیا اور لاہور کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس طرح فراخدلی سے کام لیکر جہانگیر نے افغانوں کے دلوں کو جیت لیا اور وہ مغلیہ سلطنت کے وفادار اور جاں نثار بن گئے۔

میواڑ کی مہم

اکبر اعظم کے عہد میں ریاست میواڑ کے صدر مقام چتوڑ کے علاوہ کئی اور علاقوں پر بھی مغلیہ تسلط قائم ہو گیا تھا۔ لیکن اکبر رانا پرتاپ سنگھ کو اپنا گرویدہ نہ بنا سکا تھا۔ ۱۵۹۷ء میں رانا پرتاپ کی وفات کے بعد اس کا لڑکا رانا امر سنگھ ریاست میواڑ کی راج گدی پر بیٹھا۔ وہ بھی میواڑ کی آزادی کے لیے مغلوں کے خلاف برسرپیکار رہا۔ ۱۶۰۵ء میں شہنشاہ جہانگیر نے تخت نشینی کے فوراً بعد اپنے دوسرے بیٹے شہزادہ پرویز و آصف خاں

Marfat.com

جعفر بیگ کی سرکردگی میں بیس ہزار سواروں پر مشتمل ایک مہم رانا امر سنگھ کی گوشمالی کے لئے بھیجی۔ رانا کا ایک چچا ساگر مغلوں کا پنشن خوار تھا جہانگیر نے اسے بھی شہزادہ کی امداد کے لئے مہم کے ساتھ بھیجا۔ درّہ دیوار کے مقام پر مغلوں اور راجپوتوں کا مقابلہ ہوا لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ دریں اثنا خواجہ حسرو کی بغاوت کی وجہ سے اس فوج کو واپس بلا لیا گیا اور رانا امر سنگھ کے چچا ساگر کو چتوڑ کا رانا متعین کیا گیا۔

۱۶۰۸ء میں جہانگیر نے رانا کی سرکوبی کے لئے بارہ ہزار سواروں، پانچ سو احدیوں، دو ہزار بندوقچیوں، ساٹھ ہزار پیادوں اور اسّی توپوں پر مشتمل ایک دوسری مہم مہابت خاں کی سرکردگی میں روانہ کی۔ اگلے سال ۱۶۰۹ء میں عبداللہ کی زیر کمان رانا کے خلاف ایک تیسری مہم روانہ کی لیکن دونوں مہمیں نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئیں بعد ازاں راجہ باسو اور مرزا عزیز کوکہ کو بھیجا گیا اگرچہ رانا کو شکستیں ہوئیں مگر اسے اطاعت گذار بنانے کا اصل مقصد پورا نہ ہو سکا۔ ۱۶۱۳ء میں جہانگیر خود بھی اجمیر پہنچ گیا تاکہ رانا کے خلاف فوجی کارروائی کی خود نگرانی کر سکے۔ آخر ۱۶۱۴ء میں جہانگیر نے یہ اہم شہزادہ خرم کے سپرد کی جس نے میواڑ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اہم مقامات کو نذر آتش کر دیا، اور پہاڑی درّوں کی ناکہ بندی کر کے اس خوبی سے راجپوتوں کو گھیرا کہ رانا امر سنگھ مغلیہ سیادت قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔ رانا نے اپنے سرداروں شبھ کرن اور ہری داس کو صلح کی بات چیت کے لئے شہزادہ خرم کے پاس بھیجا جس نے انہیں پورے اعزاز سے شہنشاہ کے پاس اجمیر بھیج دیا۔ شہنشاہ ان سے بڑی محبت سے پیش آیا۔ نیز اس نے کمال مہربانی سے رانا کی تمام تجاویز کو منظور کر کے ایک فرمان کے ذریعے شہزادہ خرم کو رانا سے صلحنامہ طے کرنے کا کلی اختیار تفویض کر دیا۔

رانا امر سنگھ نے بذات خود شہزادہ خرم سے ملاقات کی۔ شہزادہ نے رانا امر سنگھ کا شاہانہ استقبال کیا اور تعظیماً اسے اپنے پہلو میں بٹھایا۔ تحفے تحائف کا تبادلہ بھی ہوا۔ بعد ازاں رانا کا بیٹا راجکمار کرن بھی شہزادہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کا بھی شاہانہ استقبال کیا گیا اور اسے پنج ہزاری منصب سے نوازا گیا۔ اس طرح ۱۶۱۵ء میں صلحنامہ طے پایا۔ اس صلحنامہ کی رو سے :

۱۔ رانا نے جہانگیر کی اطاعت قبول کر لی۔

۲۔ جہانگیر نے میواڑ کے تمام مقبوضہ علاقے مع چتوڑ رانا کو واپس کر دیئے۔

۳۔ علاقہ چتوڑ کی قلعہ بندی اور مرمت ممنوع قرار پائی۔

۴۔ رانا کو شاہی دربار میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا گیا اور اس کی بجائے اس کا بیٹا رانا کی جگہ شاہی خدمات کی بجا آوری پر مامور ہوا۔

۵۔ رانا کے گھرانے کو بادشاہ اور شاہی گھرانے سے رشتہ ناطہ کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

۱۶۱۵ء کا یہ صلحنامہ مغل۔ راجپوت تعلقات کے سلسلے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

Marfat.com

اس صلحنامہ نے دو سلگر منتوں کے مابین ایک صدی پرانے اختلافات کی خلیج کو پاٹ دیا۔ اس سے راجپوتانے کی عظیم ریاست کا راجہ جس نے اکبر اعظم کے سامنے جھکنا گوارا نہ کیا تھا۔ مغلیہ دربار کا اطاعت گذار ہوگیا۔ اس معاہدہ کو جہانگیر کی سیاسی فتح اور شہزادہ خرم کی ذاتی فتح قرار دیا جا سکتا ہے۔ ریاست میواڑ کی سالمیت اور تحفظ کا تقاضا بھی یہی تھا کہ مغلوں وسائل کی عدم موجودگی کی وجہ سے مغلیہ سلطنت سے باوقار صلح کر لی جائے۔ اگر رانا امر سنگھ اس موقعہ سے فائدہ نہ اٹھا کر اپنی بدحال ریاست کے لئے صلح نہ کرتا تو سخت کم فہمی کا ثبوت دیتا۔" [1]

کانگڑہ کی فتح ۱۶۲۰ء

کانگڑہ کا قلعہ دشوار گذار پہاڑوں میں واقع ہونے کی وجہ سے شمال مشرقی پنجاب کا ایک مضبوط ترین اور ناقابلِ تسخیر قلعہ تھا۔ اکبر نے اس کی تسخیر کا کام پنجاب کے صوبیدار مرتضیٰ خاں کے سپرد کیا لیکن اسے کامیابی نہ ہو سکی۔ آخر شہزادہ خرم کو اس مہم پر مامور کیا گیا۔ شہزادہ نے چودہ ماہ کے طویل اور شدید محاصرہ کے بعد محصورین کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ کانگڑہ کی فتح سے جہانگیر بہت خوش ہوا۔ نومبر ۱۶۲۱ء میں وہ خود کانگڑہ پہنچا۔ اس نے جوالا مکھی پہاڑ پر قربانی دینے کے علاوہ قلعہ میں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔

کشتواڑ کی فتح ۱۶۲۲ء

اگرچہ کشمیر عہد اکبری ہی میں فتح ہو چکا تھا لیکن کشتواڑ کا علاقہ بدستور آزاد تھا۔ ۱۶۲۲ء میں جہانگیر نے کشمیر کے صوبیدار دلاور خاں کو کشتواڑ کی تسخیر پر مامور کیا۔ کشتواڑ کے راجہ نے مقابلہ کی سکت نہ پاتے ہوئے مغلیہ دربار میں حاضر ہو کر مغلیہ سیادت قبول کر لی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد کشتواڑ کے عوام نے راجہ کے ظلم و جور کے خلاف شورش برپا کر دی اس پر مغل فوج نے پہنچ کر وہاں امن و امان بحال کیا۔

دکن

جہانگیر نے اکبر کی توسیع پسندانہ پالیسی کو جاری رکھا چنانچہ اس نے تمام برصغیر کو مغلیہ اقتدار کے زیر نگیں کرنے کے لئے سارے دکن کی تسخیر کا منصوبہ مرتب کیا۔ قبل ازیں اکبر نے سارے خاندیش اور ریاست احمد نگر کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ احمد نگر کے سلطان نظام شاہ کا حبشی وزیر ملک عنبر ایک زبردست سیاستدان اور اعلیٰ پایہ کا جرنیل تھا اس نے ریاستی نظم و نسق کو از سر نو بنانے کے علاوہ نظامِ مالگذاری کو منظم کر کے ریاست کی اقتصادی حیثیت کو مستحکم بنایا۔ ۱۶۰۹ء میں اس نے مغلوں کے مقابلے کے لئے اپنی فوج کو از سر نو منظم کیا اور مرہٹوں کو ریاستی فوج میں بھرتی کر کے انہیں چھاپہ مار جنگ کی تربیت دی۔ مرہٹے اپنے علاقے کے تمام ذرائع آمد و رفت اور نشیب و

---

[1] ڈاکٹر اے ایل سری واستوا۔ مغل ایمپائر ۱۰۰ صفحہ

Marfat.com

قرار سے بخوبی آگاہ تھے انہوں نے مغل فوج پر اچانک، اور کامیاب چھاپے مارنے شروع کر دیئے اس سے دکن میں مغلیہ اقتدار کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ ملک عنبر نے تمام مفتوحہ علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور دکن کے مغل صوبیدار عبدالرحیم خان خاناں کو معزول کر کے شہزادہ پرویز کو آصف خاں کی زیر نگرانی خاندیش اور برار کا گورنر مقرر کر کے دکن کی مہم پر مامور کیا لیکن وہ بھی خان خاناں سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ ازاں بعد خان جہاں لودھی اور عبداللہ خاں جیسے عظیم عسکری دماغ رکھنے والے مغل جرنیلوں کو بھی آزمایا گیا لیکن ملک عنبر کی جنگی چالوں کے سامنے یہ مغل جرنیل بھی بے بس ہو کر رہ گئے اور جیتا ہوا علاقہ حاصل نہ کر سکے۔

۱۶۱۱ء میں مغلوں نے احمد نگر پر چہار اطراف سے بھرپور یلغار کرنے کی سکیم بنائی۔ طے یہ ہوا کہ عبداللہ خاں گجرات کی جانب سے، خان جہاں لودھی، مان سنگھ اور امیر الامراء مہابت خاں برار اور خاندیش کی طرف سے ایک وقت حملہ آور ہوں۔ لیکن عبداللہ خاں کی جلد بازی سے سکیم ناکام ہو کر رہ گئی۔ جس نے برار اور خاندیش سے اپنے ہمراہی جرنیلوں کا انتظار کئے بغیر ہی پیش قدمی کر دی۔ لیکن ملک عنبر کے چھاپہ ماروں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور اسے گجرات کی جانب پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس پر جہانگیر سخت سیخ پا ہوا۔ اس نے دکن کی کمان پھر ایک دفعہ خان خاناں کے سپرد کر دی۔ خان خاناں نے ملک عنبر کو شکست فاش دی لیکن مغل جرنیلوں کی باہمی رقابت کے باعث فیصلہ کن شکست نہ دے سکا۔

ملک عنبر کے مقابلے میں مغلوں کی مسلسل شکست کا داغ دھونے کے لئے ملکہ نور جہاں کے مشورے پر شہزادہ پرویز کو الہ آباد کا گورنر متعین کیا گیا اور دکن کی مہم شہزادہ خرم کے سپرد کی گئی۔ ۱۶۱۶ء کے آغاز میں شہزادہ خرم کو "شاہ سلطان" کا خطاب عطا کر کے دکن روانہ کیا گیا۔ بادشاہ خود مانڈو میں جا مقیم ہوا تاکہ مغل فوج کا حوصلہ بلند رہے۔ شہزادہ خرم نے مارچ ۱۶۱۷ء میں برہان پور پہنچ کر ملک عنبر سے شہزادہ کی متعدد ناکامیوں، شہرت اور اعلیٰ فوجی قوت کے پیش نظر تمام مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے صلح کر لی۔ نظام شاہ نے باج ادا کرنے کا اقرار کرنے کے علاوہ بالا گھاٹ، احمد نگر اور دیگر قلعے مغلوں کے حوالے کر دیئے۔ سلطان نے بذات خود شہزادہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سولہ لاکھ روپیہ کا نذرانہ پیش کیا۔ جہانگیر نے شہزادہ خرم کی اس کارکردگی سے خوش ہو کر اسے "شاہجہان" کا خطاب عطا کیا۔ لیکن یہ صلح عارضی ثابت ہوئی۔ کیونکہ ملک عنبر نے محض شہزادہ کی فوجی قوت سے مرعوب ہو کر وقتی طور پر صلح کر لی تھی۔ دو سال بعد اس نے دوبارہ جنگ شروع کر دی۔

۱۶۲۰ء میں ملک عنبر نے بیجاپور اور گولکنڈہ کو ساتھ ملا کر اپنے تمام علاقے مغلوں سے آزاد کرا لئے اور قلعہ احمد نگر میں متعین مغل گورنر خان خاناں کو چھاپہ مار طریق جنگ سے اس قدر پریشان کیا کہ اسے بسیا ہو کر برہان پور میں پناہ لینی پڑی۔ دکنی گوریلوں نے مانڈو تک مغل علاقے کو تاخت و تاراج کیا۔ اس

Marfat.com

بہ ۱۶۲۱ء میں ایک بار پھر دکن کی مہم شہزادہ خرم کے سپرد کی گئی۔ لیکن گڑھ گئے کی مہم میں مصروف ہونے کی وجہ سے شہزادہ کچھ تاخیر سے پہنچا۔ دکن جانے سے پہلے شہزادہ نے اصرار کیا کہ اس کے بڑے لڑکے شاہ شجاع کو اس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ بادشاہ نے شہزادہ کی خواہش کو پورا کر دیا۔ اس نے اس مہم میں اپنی بہادری و مستعدی کا مظاہرہ کیا کہ ملک عنبر نے گھبرا کر مغلوں کے تمام علاقے واپس کر دیئے۔ اور ساٹھ لاکھ روپیہ سالانہ باج دینا منظور کیا۔ [illegible] لاکھ روپیہ سالانہ باج دینا منظور کیا۔ [illegible] کے بادشاہ دکن جیسے دور دراز علاقے میں [illegible] نے نور جہاں کی سوتیلی لڑکی [illegible] سے فائدہ اٹھا کر بہت سے [illegible] اس کے جانشین عبدالحق سے [illegible] خرید لیا۔ [illegible] جاگیر ہونی تھی ملک عنبر کی موت کے بعد [illegible] کی بجائے مقامی حکام کو کسی زبردست [illegible]

مسئلہ قندھار
۱۶۰۶ء تا ۱۶۲۲ء

قندھار ایک قلعہ [illegible] واقع ہے۔ [illegible] کے درمیان [illegible] جو کہ [illegible] بلکہ [illegible] کی وجہ سے [illegible] کی حیثیت رکھتا تھا۔ قندھار پر قبضہ کرنے کی خاطر [illegible] سے متصل گرد و نواح [illegible] سے [illegible] مشرق و مغرب کی درمیانی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے [illegible] کی [illegible] کی بجائے متنازعہ علاقوں کو کسی زبردست [illegible]

بابر اس کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ ۱۵۲۲ء میں اس نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۴۵ء میں ہمایوں نے بھی اسے فتح کیا لیکن ایران کے بادشاہ طہماسپ سے معاہدہ کے مطابق اسے ایران کے حوالے نہ کیا بلکہ ہرم خاں کو اس کا حاکم مقرر کیا۔ تاہم ۱۵۵۸ء میں ہمایوں کی وفات کے بعد اکبر کی [illegible] سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایرانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اکبر جیسا توسیع پسندانہ پالیسی کا حامل اور [illegible] بادشاہ اس کے چھن جانے کے واقعہ کو فراموش نہ کر سکا اس نے قندھار کی بازیابی سے قبل سندھ اور بلوچستان کو زیر نگیں کیا۔ لیکن ۱۵۹۴ء میں قندھار کے ایرانی گورنر شاہ حسین مرزا نے خود ہی قندھار کا قلعہ اکبر کے حوالے کر دیا۔

ہمایوں کی تخت نشینی کے وقت شاہ عباس صفوی (۱۵۸۷ء تا ۱۶۲۹ء) ایران کا بادشاہ تھا۔

Marfat.com

وہ اپنے دور کا ایک عظیم المرتبت فرمانروا تھا وہ قندھار جیسے اہم مقام کے نقصان کو فراموش نہ کر سکتا تھا۔ اس کی نگاہیں مسلسل قندھار پر لگی ہوئی تھیں۔ اکبر کی وفات اور شہزادہ خسرو کی بغاوت سے پیدا شدہ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ عباس صفوی نے خراسان کے سرداروں کو اکسا کر قندھار پر حملہ کر دیا۔ مگر قندھار کے مغل حاکم شاہ بیگ خاں نے ایرانیوں کے حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ۱۶۰۷ء کے اوائل میں جہانگیر قندھار کے دفاعی امور کی نگرانی کے لئے بہ نفس نفیس کابل پہنچا اور مرزا غازی کی سرکردگی میں شاہ بیگ خاں کی امداد کے لئے ایک امدادی فوج روانہ کی۔ چنانچہ مغل کمک کی آمد کی اطلاع پاکر ایرانی محاصرہ اٹھا کر خراسان کی جانب بھاگ گئے۔ حصولِ مقصد میں ناکامی کے بعد شاہ عباس صفوی نے جہانگیر سے معذرت کرتے ہوئے یہ عذر اختیار کیا کہ خراسانی سرداروں نے ایرانی حکومت کو اطلاع دیئے بغیر قندھار پر حملہ کر دیا تھا جس پر خراسانی سرداروں کی گوشمالی کر دی گئی ہے۔ شاہ عباس صفوی نے سیاسی حکمت عملی کا سہارا لیتے ہوئے یکے بعد دیگرے چار سفارتیں اور بیش قیمت تحائف بھیج کر جہانگیر سے گہرے مراسم قائم کر لئے۔ جہانگیر بھی بے فائدہ جنگ مول نہ لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے شاہ ایران کی خیر سگالی اور دوستی کے پیش نظر ایرانی حکومت کے پیش کردہ جواز کو منظور کر لیا نتیجتاً جہانگیر رفتہ رفتہ قندھار کے دفاعی استحکام سے غافل ہو گیا۔

شاہ عباس صفوی مغل دربار کے سیاسی حالات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ۱۶۲۱ء میں جب تخت و تاج کی وراثت کے سوال پر شہزادہ خرم (شاہجہان) اور ملکہ نور جہاں کے مابین شدید اختلافات نے سر اٹھایا تو شاہ عباس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قندھار پر اچانک دھاوا بول دیا جہانگیر اس وقت کشمیر میں تھا اس نے شہزادہ خرم (شاہجہان) کو قندھار روانہ ہونے کا حکم دیا۔ لیکن شہزادہ نور جہاں کے بدلے ہوئے رویہ سے سخت برگشتہ خاطر تھا۔ شاہجہان نے جو ان دنوں دکن میں تھا قندھار جانے میں پس و پیش سے کام لیا اور چند شرائط پیش کیں۔ (تفصیل آگے آئے گی) بادشاہ نے ان شرائط کو رد کر دیا۔

اس اثنا میں ۴۵ دن کے سخت محاصرے کے بعد ایرانیوں نے قندھار فتح کر کے قلعہ پر اپنا پرچم لہرا دیا۔ ادھر شاہجہان نے بغاوت کر دی جس کی وجہ سے جہانگیر قندھار کی طرف کوئی مہم روانہ نہ کر سکا اور ایرانیوں نے قندھار پر مضبوطی کے ساتھ اپنا تسلط قائم کر لیا۔ شاہ عباس صفوی نے جہانگیر کے دربار میں اپنا سفیر بھیج کر قندھار پر اپنا خاندانی حق اور اس پر قبضے کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی اور دوستانہ تعلقات کی استواری پر زور دیا۔ مگر اس کے جواب میں جہانگیر نے شاہ عباس پر بے وفائی اور ریاکاری کا الزام لگایا بعد ازاں دونوں حکومتوں کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ جہانگیر اس کے بعد بھی شہزادہ خرم کی بغاوت کے باعث قندھار کی بازیابی کے سلسلے میں کوئی فوجی اقدام نہ کر سکا۔ جس کی وجہ سے قندھار پر ایران کا تسلط برقرار رہا۔

Marfat.com

شہزادہ خرّم (شاہجہان) کی بغاوت

اسباب: شراب و افیون کا رسیا اور دمہ کا مریض ہونے کی وجہ سے جہانگیر کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ چنانچہ حصول تخت کے مسئلہ کے باعث مغلیہ دربار مختلف سازشوں کا مرکز بن گیا۔ ملکہ نورجہاں گو شہزادہ خرم کی خرد مندی اور فوجی صلاحیت کی بہت معترف تھی لیکن چار باتوں ہونے کے باعث وہ جہانگیر کی موت کے بعد شہزادہ خرم کے اقتدار کو اپنے لئے خطرہ تصور کرتی تھی چنانچہ وہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی خاطر جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار کی طرفدار بن گئی۔ اپریل ۱۶۲۱ء میں اس نے اپنی پھلگ بیٹی لاڈلی بیگم کی شادی شہزادہ شہریار سے کر دی اور اس کے منصب کو بڑھا کر آٹھ ہزاری ذات و چہار ہزاری سوار کر دیا اور اس کے ساتھ ہی بڑی شد و مد کے ساتھ شہریار کو ولیعہد بنانے کی تگ و دو کرنے لگی حالانکہ اسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ شہریار بالکل نااہل ہے۔ اس سے نورجہاں اور آصف جاہ کے تعلقات بگڑ گئے۔ کیونکہ شہزادہ خرم آصف جاہ کا داماد تھا۔ ۱۶۲۱ء میں نورجہاں کی دختر عصمت بیگم اور ۱۶۲۲ء میں اعتماد الدولہ کی وفات سے نورجہاں جیسے تنہا ہو گیا۔ اس سے نورجہاں اور شہزادہ خرم کی آپس میں ٹھن گئی۔

۱۶۲۲ء میں ایرانیوں نے قندھار کا محاصرہ کیا تو شہزادہ خرم کو فی الفور قندھار پہنچنے کا حکم دیا گیا۔ اس نے نورجہاں کے بدلے ہوئے رویہ کے پیش نظر دکن جیسے اہم علاقے کو چھوڑ کر جانا مناسب نہ سمجھا شہزادہ نے اس خدشہ کے پیش نظر کہ مبادا ملکہ نورجہاں اسے برہنپور سے باہر بھیج کر جہانگیر کی موت کے بعد اپنے داماد شہریار کو تخت پہ بٹھا دے۔ قندھار کی مہم پہ جانے سے ٹال مٹول سے کام لیا اور بادشاہ کے سامنے چند شرائط پیش کرتے ہوئے درخواست کی کہ:

۱۔ اسے پنجاب کا گورنر متعین کر دیا جائے۔
۲۔ تمام فوج کو اس کی کمان میں دے دیا جائے۔
۳۔ خاندان کی محفوظ رہائش کے لئے قلعہ رنتھمبور دیا جائے۔
۴۔ مہم کے اخراجات کے لئے ایک بھاری رقم فراہم کی جائے۔

اگر یہ شرائط پوری کر دی گئیں تو وہ موسم برسات کے بعد قندھار کی مہم پر روانہ ہو جائے گا۔ نورجہاں نے نزاکت حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہانگیر کے کان بھر دیئے کہ شہزادہ خرم باغیانہ عزائم رکھتا ہے۔ چنانچہ جہانگیر نے شہزادہ خرم کی شرائط کو رد کر دیا اور سرزنش کرتے ہوئے لکھا کہ اگر وہ موسم برسات کے بعد قندھار جانا چاہتا ہے تو فی الفور اپنے زیر کمان شاہی افسران اور افواج کو مرکز بھیج دے۔ اسی اثنا ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلتی پہ تیل کا کام کیا اور جس نے اختلافات کی خلیج کو مزید وسیع کر دیا۔ شہزادہ خرم نے کچھ عرصہ پیشتر بادشاہ کے حضور عرضی بھیج کر دھولپور کا پرگنہ بطور

Marfat.com

جاگیر عطا کرنے کی درخواست کی تھی احدشاہی منظوری سے قبل ہی اس نے دریا خاں کو بھیج کر متذکرہ جاگیر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ ملکہ نورجہاں نے متذکرہ جاگیر اس سے چھین کر شہریار کے نام کرالی تھی اور شہریار کی طرف سے تربیت الملک کو وہاں کا فوجدار متعین کیا تھا۔ شہریار کے فوجدار شریف الملک سے شہزادہ خرم کے نمائندہ دریا خاں کی جھڑپ ہوگئی جس کے نتیجہ میں شریف الملک کی ایک آنکھ جاتی رہی اور اس کے کئی آدمی ہلاک ہوگئے۔ ملکہ نے اس واقعہ کو شہزادہ خرم کی جارحیت قرار دیتے ہوئے خوب ہوا دی۔ اس پر بادشاہ نے شہزادہ خرم کی تمام مراعات منسوخ کرتے ہوئے دربار میں اس کی حاضری ممنوع قرار دیدی اور شہزادہ شہریار کو بارہ ہزار کا منصب اور حصار فیروزہ کی جاگیر جو عموماً ولیعہد کو دی جاتی تھی عطا کرکے قندھار کی مہم پہ مامور کیا۔ ان حالات کے تحت ۱۶۲۳ء میں شہزادہ خرم نے بغاوت برپا کردی۔

واقعات شہزادہ خرم کی بغاوت کی اطلاع پاکر ملکہ نورجہاں نے اپنے بھائی آصف جاہ کو آگرہ سے شاہی خزانہ لانے کے لئے بھیجدیا تاکہ وہ اپنے داماد شہزادہ خرم کی حمایت نہ کرسکے۔ نیز مغلیہ افواج کے بہترین جرنیل مہابت خاں کو کابل سے طلب کرکے چھ ہزاری ذات و پنج ہزاری سوار کا منصب عطا کرکے شہزادہ خرم کی گوشمالی پہ مامور کیا۔ اس نے مارچ ۱۶۲۴ء میں شہزادہ خرم کو بلوچ پور کے مقام پہ شکست دی۔ شہزادہ خرم مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے مانڈو کی جانب بھاگ گیا۔ دریں اثنا ملکہ نورجہاں نے شہزادہ پرویز کو بھی بہار سے بلالیا اور اسے چالیس ہزار ذات و تیس ہزار سوار کا اعلیٰ ترین منصب عطا کرکے مہابت خاں کی ہمراہی میں شہزادہ خرم (شاہجہان) کی سرکوبی پہ مقرر کیا۔

شاہی افواج کے زبردست تعاقب کی بنا پر شاہجہان کو مانڈو سے بھاگ کر اسیر گڑھ میں پناہ لینی پڑی۔ اپنے کنبہ کے افراد کو اسیر گڑھ چھوڑ کر شاہجہان دکن میں مغل مقبوضات کے دارالحکومت برہان پور پہنچا جہاں اس نے احمد نگر کے حبشی وزیر ملک عنبر سے امداد حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس نے عبدالرحیم خان خاناں کو مہابت خاں سے صلح کی بات چیت کے لئے بھیجا مگر وہ شاہی افواج کے ساتھ مل گیا۔ اس پر شہزادہ دریائے تاپتی کو عبور کرکے گولکنڈہ چلا گیا اور وہاں سے تلنگانہ اور مسولی پٹم پہنچا۔ بعدازاں اڑیسہ پہنچ کر اور وہاں کے گورنر احمد بیگ خاں کو شکست دے کر اڑیسہ اور بنگال کے صوبوں پر قبضہ کرلیا۔

اڑیسہ اور بنگال کو زیر نگیں کرنے کے بعد شاہجہان نے بہار، اودھ، الہ آباد اور آگرہ کی فتح کی سکیم مرتب کی۔ تاکہ وہ اپنے باپ جہانگیر سے اپنی مرضی کی شرائط منوا سکے۔ شاہجہان نے بہار کے ناقابل تسخیر قلعہ رہتاس اور جونپور پر قبضہ کرکے دریائے گنگا کو بنارس کے نزدیک عبور کیا۔

Marfat.com

اور کانٹٹ KANTIT کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ مارچ ۱۶۲۴ء میں اگر شہزادہ پرویز اور مہابت خاں برہان پور سے نہ پہنچ جاتے تو اس نے الہ آباد اور اودھ کو فتح کر لیا ہوتا مگر ان کی آمد سے الہ آباد کا محاصرہ اٹھا کر اسے بھوسی میں پناہ لینی پڑی۔ بعد ازاں وہاں سے رہتاس گڑھ پہنچی۔ ممتاز محل جو بڑی سے بڑی مشکل میں بھی ہمیشہ اپنے خاوند شاہجہاں کے ساتھ رہی تھی شہزادہ مراد کی پیدائش کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی اور سفر کے قابل نہ رہی اس پر شاہجہان کو اسے رہتاس میں ہی چھوڑنا پڑا اور خود بنگال چلا گیا۔

بنگال سے شاہجہان دوبارہ دکن پہنچا۔ اس مرتبہ مغلیہ سلطنت کے قدیم دشمن ملک عنبر نے شہزادہ کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ شاہجہان نے ملک عنبر کی مدد سے برہان پور کا محاصرہ کیا مگر وہ اسے فتح نہ کر سکا کیونکہ مہابت خاں جو سایہ کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا آ دھمکا۔ اس کی آمد پر شہزادہ برہان پور سے پسپا ہو کر روہان گڑھ (بالا گھاٹ) میں جا پناہ گزین ہوا۔ جہاں وہ اچانک سخت بیمار پڑ گیا۔ نیز اس کے وفادار اور بہترین جرنیل عبداللہ خاں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ان حالات سے پریشان ہو کر اور تین سال تک سرگرداں رہنے کے بعد بالآخر شاہجہان نے مہابت خاں سے صلح کر لی اور اپنے باپ جہانگیر سے معافی کا خواستگار ہوا۔ دریں اثنا مہابت خاں کا بڑھتا ہوا اقتدار اور شہزادہ پرویز سے اس کا گٹھ جوڑ ملکہ نور جہاں کو کھٹکنے لگا تھا۔ چنانچہ اس نے بادشاہ سے باغی شہزادہ کی معافی کی درخواست منظور کرنے کی سفارش کی۔ بادشاہ نے شاہجہان کو معاف کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ رہتاس اور ایسیر گڑھ کے قلعوں سے دستبردار ہو جائے اور اپنے دو بیٹوں دارا شکوہ (۱۰ سال) اور اورنگ زیب (۸ سال) کو بطور یرغمال شاہی دربار میں بھیجے۔ شاہجہان نے نہ صرف شاہی فرمان کی تعمیل کی بلکہ اپنے باپ کی خدمت میں دس لاکھ روپے کے بیش بہا تحائف بھی روانہ کئے۔ جہانگیر نے شہزادہ کو بالا گھاٹ کا گورنر مقرر کرتے ہوئے ناسک میں قیام پذیر ہونے کا حکم دیا۔

اس طرح تین سال کے کشت و خون کے بعد اپریل ۱۶۲۶ء میں شاہجہان کی بغاوت ختم ہو گئی اس بغاوت نے انفرادی اور مالی اعتبار سے مغل سلطنت کو ناقابل برداشت نقصان پہنچایا۔

مہابت خاں کی بغاوت

مارچ ۱۶۲۶ء

شاہجہان کے اطاعت گذار ہونے کے فوراً بعد ملکہ نور جہاں نے شہزادہ پرویز اور مہابت خاں کے گٹھ جوڑ کو توڑنے کی تدابیر اختیار کیں۔ شاہجہان کی بغاوت کے دوران مہابت خاں پرویز کا حامی بن گیا تھا اور اسے ولیعہد مقرر کرانے کی فکر میں تھا۔ نور جہاں ان دونوں کے گٹھ جوڑ کی موجودگی میں اپنے داماد شہریار کی کامیابی کو مشکوک تصور کرتی تھی۔ چنانچہ ملکہ نے اپنے بھائی آصف جاہ کو اپنے ساتھ ملا کر مہابت خاں کے بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار کا خاتمہ کرنے کی ٹھانی۔ در پردہ آصف جاہ بھی مہابت خاں کا دشمن تھا کیونکہ اس نے اس کے داماد شہزادہ خرم

Marfat.com

(شاہجہان) کو سخت تنگ کیا تھا۔ چنانچہ ایک شاہی فرمان کے ذریعے مہابت خان کو بنگال کا گورنر مقرر کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ وہ فوراً بنگال روانہ ہو جائے۔ اس کی جگہ خان جہان لودھی کو شہزادہ پرویز کا مشیر مقرر کیا گیا۔ لیکن شہزادے پرویز نے مہابت خاں کو فارغ کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ اس پر ایک سخت سرزنش آمیز فرمان کے ذریعے مہابت خاں کو دربار میں طلب کر لیا گیا اور شہزادے پرویز کو برہان پور ہی میں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد شہزادہ پرویز نے خان جہان لودھی کو بطور مشیر اور اس کی تقرری کے شاہی فرمان کو تسلیم کر لیا اور مہابت خاں نافرمانی کی تاب نہ لاتے ہوئے بنگال روانہ ہو گیا۔

مہابت خاں کا اصلی نام زمان بیگ تھا جہانگیر نے اس کی دلیری اور عسکری ذہانت و صلاحیت سے متاثر ہو کر اسے مہابت خان کا خطاب عطا کیا تھا۔ مہابت خاں نے شاہجہاں کے خلاف جرأت مندانہ تدبر سے کامیاب فوجی اقدامات کر کے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ لیکن اس کا یہ بڑھتا ہوا اقتدار ملکہ نور جہاں کو کھٹکنے لگا۔ چنانچہ اس نے اس کی تذلیل کرنے اور اس کے اقتدار کو ختم کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ اس کے خلاف غبن اور بدعنوانی کے متعدد الزامات عائد کرتے ہوئے اسے حکم دیا کہ شاہجہان کی بغاوت کے دوران بنگال اور بہار سے حاصل کردہ ہاتھیوں کو فی الفور بادشاہ کے حضور پیش کرے اور شاہجہان کی سرکوبی پر صرف کردہ رقم اور بنگال کے معطل شدہ جاگیرداروں سے وصول شدہ بھاری رقم کا حساب دے۔ مہابت خاں جو پہلے ہی نور جہاں کو ایک معمولی عورت سمجھتا تھا اور اسکے سیاسی اقتدار کو ناپسند کرتا اور شہزادہ پرویز کو ولیعہد مقرر کرانے کے لئے جہانگیر کو نور جہاں کے چنگل سے آزاد کرانے کا خواہاں تھا، ملکہ کے اس اقدام پر سخت سیخ پا ہوا اور اپنے اقتدار و وقار کے تحفظ کی خاطر چار ہزار جانثار راجپوت سپاہیوں کے ساتھ دربار شاہی میں حاضری کے لئے پنجاب کی طرف روانہ ہوا تاکہ بذات خود بادشاہ کے حضور حاضر ہو کر اپنی پوزیشن کو واضح کر سکے اور اگر وہ اس میں ناکام رہے تو اچانک حملہ کر کے بادشاہ کو اپنے قبضے میں لے کر نور جہاں کے اقتدار کو ختم کر کے رکھ دے۔

مارچ ۱۶۲۶ء میں جہانگیر کشمیر سے واپسی پر کابل جا رہا تھا اور شاہی کیمپ دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر تھا کہ چار ہزار بہادر راجپوت سپاہیوں کی معیت میں مہابت خاں آ پہنچا۔ اس کی آمد کی خبر سے شاہی کیمپ میں کھلبلی مچ گئی۔ بادشاہ نے مہابت خاں کو مع اپنی فوج کے پیچھے ٹھہرنے کا حکم دیا۔ نور جہاں کے ایما پر مہابت خاں کی مزید تذلیل کی گئی اور اس سے اپنی لڑکی کی شاہی اجازت حاصل کئے بغیر خواجہ عمر نقشبندی کے لڑکے برخوردار سے طے کرنے کی جواب طلبی کی گئی۔ نیز اس کے داماد برخوردار کو شاہی دربار میں طلب کر کے اس کی سخت بے عزتی کی گئی اس کے ہاتھوں کو گردن کے ساتھ باندھ کر اور ننگے سر قید خانے بھجوا دیا گیا۔ مزید برآں جہیز میں ملے ہوئے تمام سامان

Marfat.com

ضبط کر لیا گیا۔ یہ بے عزتی مہابت خاں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ اس نے بادشاہ کو گرفتار کر کے نور جہاں کے اقتدار کو ختم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

دوسرے دن علی الصبح شاہی محافظ فوج مع دیگر سامان کے دریا عبور کر چکی تھی اور شاہی جوڑے کو ابھی دریا عبور کرنا تھا کہ مہابت خاں نے اچانک پہنچ کر بادشاہ کو حراست میں لے لیا۔ اگلے دن نور جہاں نے شاہی افواج کی معیت میں بادشاہ کو مہابت خاں کی حراست سے آزاد کرانے کی سرتوڑ کوشش کی مگر ناکام رہی۔ آخر ملکہ نے بادشاہ کی رفاقت حاصل کرنے کی خاطر اپنے آپ کو بھی مہابت خاں کی قید میں دیدیا۔ نور جہاں کا بھائی آصف جاہ بھاگ کر اٹک میں قلعہ بند ہو گیا لیکن بالآخر گرفتار ہوا۔

مہابت خاں بادشاہ اور ملکہ کو اپنی حراست میں لے کر بہت خوش تھا اب وہ جملہ شاہی اختیارات کا مالک تھا اور اپنی مرضی کے مطابق بادشاہ سے شاہی احکام جاری کروا تا تھا اس نے بادشاہ کے ظاہری تقدس کو برقرار رکھا اور حسب سابق شاہی آداب بجالاتا رہا۔ اس نے ملکہ کی پوزیشن کو کمزور کرنے کے لئے اہم عہدوں پر اپنے خاص آدمی متعین کئے۔ دو ماہ پنجاب میں گذارنے کے بعد جب بادشاہ نے کابل جانے کی خواہش کی تو وہ بادشاہ اور ملکہ کو نظر بندی کی حالت میں اپنی فوج کی حفاظت میں کابل لے گیا۔

مہابت خاں محض ایک سپاہی تھا۔ سیاستدان اور منتظم نہ تھا چنانچہ جلد ہی اس کے رائج کردہ انتظامی امور کی برائیاں ظاہر ہونی شروع ہو گئیں اس سے ملک میں بدامنی پھیلنے لگی اور عوام مہابت خاں سے نفرت کرنے لگے۔ نور جہاں جو پہلے ہی در پردہ مہابت خاں کی حراست و نظر بندی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدابیر سوچنے میں مصروف تھی نے سیاسی شعور اور فراست سے کام لیکر ان حالات سے پورا فائدہ اٹھایا اور خفیہ طور پر مزید شاہی فوج بھرتی کر لی۔ علاوہ ازیں ملکہ نے بھاری رشوت اور بھاری انعام واکرام کا لالچ دیکر مہابت خاں کی راجپوت فوج کے امراء سے ساز باز کر کے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس طرح ملکہ نے مہابت خاں کو بے یار و مددگار بنا کر رکھ دیا۔

کابل سے واپسی پر نور جہاں کے سوچے سمجھے دانشمندانہ منصوبہ کے تحت رہتاس کے قریب بادشاہ جہانگیر شاہی افواج کے معائنہ کے بہانے مہابت خاں سے الگ ہو گیا اب جہانگیر کے زیر کمان ایک بھاری فوج تھی اور وہ مہابت خاں کے چنگل سے بالکل آزاد تھا۔ بادشاہ کے جانے کے بعد مہابت خاں کو محسوس ہوا کہ وہ بے یار و مددگار ہو کر رہ گیا ہے اس پر وہ آصف جاہ، شہزادہ دانیال کے بیٹے اور چند دیگر شاہی امراء کو بطور یرغمال لیکر لاہور کی طرف بھاگ کھڑا ہوا لیکن اسے ایک سخت فرمان کے ذریعے حکم دیا گیا کہ ان امراء کو چھوڑ کر فی الفور شاہجہان کے مقابلہ کے لئے دکھن روانہ ہو جاؤ اس طرح مہابت خاں کا سودل کا اقتدار ختم ہوا اور اس نے دکن پہنچ کر شہزادہ خرم (شاہجہان)

Marfat.com

کی ملازمت اختیار کر لی جو ایک بار پھر اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ ۱۶۲۶ء میں شہزادہ پرویز بھی وفات پا چکا تھا۔

جہانگیر کی وفات

شاہجہاں اور مہابت خاں کے گٹھ جوڑ کے سدباب کے لئے ملکہ نورجہاں سازبازمیں مصروف تھی کہ ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو جہانگیر کی موت نے حالات کو یکسر بدل دیا۔ جہانگیر کی صحت سخت خراب تھی اور کشمیر سے لاہور واپس آرہا تھا کہ راستے میں بھمبر کے قریب راجوری کے مقام پر اسے دمہ کا شدید دورہ پڑا جس کی تاب نہ لاتے ہوئے ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو وفات پا گیا۔ اس نے برصغیر پر بائیس سال تک حکومت کی۔ وفات کے وقت اس کی عمر اٹھاون سال تھی۔ اس کی تاریخ وفات ہوئی:

"جہانگیر از جہاں رفت"

جہانگیر کی نعش کو لاہور لایا گیا اور اس کی وصیت کے مطابق اسے شاہدرہ کے قریب دلکشا[1] باغ میں دفن کیا گیا جہاں شاہجہاں نے نورجہاں کی نگرانی میں ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کروایا۔

جہانگیر کا کردار

شخصیت: جہانگیر ایک دلچسپ اور مسحور کن شخصیت کا مالک تھا وہ اعلیٰ تعلیم و تہذیب سے آراستہ نہایت زیرک، ادب دوست، روشن خیال، فیاض اور عدل گستر بادشاہ تھا۔ عالی ظرف، شائستگی کا پیکر اور شگفتہ مزاج تھا۔ خون ریزی سے احتراز اور دشمنوں کو معاف کر دینا اس کا شیوہ تھا۔ ایام شباب میں وہ ایک دلپذیر نگاہ خوبرو نوجوان تھا۔ اسکی آنکھوں کی کشش سحر انگیز اور شیریں کلامی مسحور کن تھی جو دشمنوں کا دل موہ لیتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں اس کے دبدبہ و جلال کی آئینہ دار اور رعب شاہی کا ایک امتیازی نشان تھیں جہانگیر شراب اور افیون کا دلدادہ ہونے کے علاوہ ورزش، سیر و شکار اور جانوروں کو لڑانے کا بڑا شوقین تھا۔

یورپین مؤرخ اسے کردار و مزاج کے اعتبار سے مجموعہ اضداد قرار دیتے ہوئے اسے ایک متلون مزاج شقاک، شاہد و شراب کا رسیا اور بحیثیت انسان ایک ناکام حکمران قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس برصغیر کے مؤرخ اسے عالی ظرف، انصاف پسند اور مشفق حکمران ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت ان دونوں کے بین بین ہے۔ بحیثیت انسان جہانگیر ایک فرض شناس، شائستہ مزاج، حلیم الطبع، رحمدل، ہمدرد اور ملنسار انسان تھا وہ اپنے باپ اور خاندان کے افراد کی بیحد عزت کرتا تھا۔ اپنے بیٹوں سے اسے والہانہ محبت تھی گو اس نے سازشی اور مفاد پرست حاشیہ نشینوں کے

---

[1] پہلے یہ مہدی قاسم خاں کا باغ کہلاتا تھا۔ مہدی قاسم خاں اکبر کا منصبدار تھا۔ بعدازاں نورجہاں نے اس باغ کا نام دلکشا باغ رکھا۔

Marfat.com

اکبر نے پر باپ کے خلاف ایک عرصہ تک باغیانہ روش اختیار کئے رکھی مگر بعد میں دادی اور سوتیلی والدہ سلیمہ بیگم کی مداخلت سے اور احساسِ ندامت سے مجبور ہو کر باپ سے معافی مانگ لی۔ باپ کی وفات کے بعد کافی عرصہ تک وہ پیادہ پا سکندرہ میں باپ کی قبر پر جاتا رہا اور احتراماً اپنے باپ کی قبر کو بوسہ دیتا تھا۔

جہانگیر نے کئی شادیاں کیں وہ اپنی تمام بیویوں سے یکساں محبت کرتا تھا۔ اسے اپنی پہلی بیوی جے پور کی راجکماری مان بائی کی موت کا اس قدر صدمہ ہوا کہ شدتِ غم سے مغلوب ہو کر چار یوم تک اس نے کھانا نہ کھایا۔ نور جہاں سے اسے والہانہ اُنس اور اس کی فراست و ذہانت پر بے حد اعتماد تھا۔ کاروبارِ سلطنت کے سلسلے میں ہمیشہ اس سے مشورہ لیتا تھا۔ وہ ایک بہترین اور وفادار دوست بھی تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اپنے تمام دوستوں اور ان امراء کے مراتب بڑھا دیئے جنہوں نے تخت نشینی میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ اسے اپنی رعایا سے بھی مشفقانہ محبت تھی۔ اور وہ رعایا کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتا تھا۔

علوم و فنون سے دلبستگی

جہانگیر صاحبِ علوم و فنون اور شائستگی و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ اس نے عبدالرحیم خاں خاناں سے عربی، فارسی ہندی اور ترکی کی زبانیں سیکھیں۔ فارسی زبان پر اسے اس قدر عبور حاصل تھا کہ اس نے عبدالرحیم خان خاناں کی مدد سے 'تزکِ بابری' کا فارسی میں ترجمہ کیا نیز اپنے دادا بابر کی مانند اپنی سرگذشتِ زندگی تحریر کی جو 'تزکِ جہانگیری' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب جہانگیر کی زندگی اور اس کے عہد حکومت کے حالات پر فارسی نثر کا ایک بہترین شاہکار ہے جس میں اس نے بابر کی مانند ہر چیز اور واقعہ کو بلا کم و کاست لکھ دیا ہے۔ جہانگیر ادب اور موسیقی کا شائق، شاعرانہ دماغ کا مالک اور مصورانہ آنکھ رکھتا تھا۔ تاریخ اور جغرافیہ کے مضامین میں گہری دلچسپی کے علاوہ اسے فنِ مصوری اور فنِ تعمیر سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ سلیقہ مندی، جمالیاتی ذوق اور حسن و زیبائش کا پرستار تھا اپنے عہد حکومت میں اس نے متعدد مقامات پر خوبصورت اور عالی شان باغات لگوائے۔ کشمیر جنت نشان سے اسے والہانہ عشق تھا۔ موسم گرما عموماً وہ کشمیر میں گذارا کرتا تھا۔

جہانگیر فنِ مصوری کا ماہر اور ایک اچھا نقاد تھا۔ اس کے عہد میں فنِ مصوری منتہائے کمال کو پہنچا۔ فنِ مصوری میں اپنی استادانہ مہارت کا ذکر جہانگیر "تزکِ جہانگیری" میں یوں کرتا ہے۔ "فنِ مصوری میں میری مہارت اور اس سے لگاؤ کا یہ حال ہے کہ محض تصویر دیکھ کر مصور کا نام بتا سکتا ہوں اور اگر کوئی تصویر کئی مصوروں کی مہارت کا شاہکار ہو تو بتا سکتا ہوں کہ تصویر کے کون سے حصے پر کس مصور نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔"

اسے فنِ تعمیر سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ اس نے سکندرہ میں اپنے باپ اکبر کے مقبرے کو سی طرز پر

Marfat.com

از سرِ نو تعمیر کروایا۔ آگرہ میں اعتماد الدولہ کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ اس کے عہد میں پچی کاری کے فن کو عروج حاصل ہوا۔ فنِ تعمیر کے ارتقا میں جہانگیر کے عہد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کی وجہ سے اسے 'فنکار بادشاہ' بھی کہتے ہیں۔

رنگین مزاجی

جہانگیر اپنے جدِ امجد بابر کی مانند رنگین طبع اور حسن و زیبائش کا دلدادہ تھا۔ قدرت کے حسین شاہکاروں، مرغزاروں بہتی ہوئی جوئباروں، وادیوں اور پہاڑوں کے حسین مناظر سے اسے والہانہ محبت تھی۔ اس کے جمالیاتی ذوق کا یہ حال تھا کہ اس نے تفریحِ طبع کے لئے شاہی محل میں بارہ سنگے اور ہرن پال رکھے تھے۔ نئے نئے خوشنما باغات لگوانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا دلدادہ تھا۔ چونکہ نورجہاں میں ساحرانہ قسم کے نسوانی حسن کے ساتھ ساتھ یہ دونوں صفات بھی بدرجۂ اتم موجود تھیں اس لئے جہانگیر اسے دل و جان سے چاہنے لگا تھا۔

جہانگیر کا مذہب

جہانگیر عقائد کے لحاظ سے راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھا۔ وہ خدا کی وحدانیت پر ایمان رکھتا تھا۔ اکبری دور کے الحاد کو ناپسند کرتا تھا۔ ہندو اور عیسائی رہنماؤں سے محبت کے باوجود وہ ان کے خیالات سے متاثر نہ تھا۔ اس نے ہندو مذہب کے بیشتر عقائد کو لغو قرار دیا۔ مسلم صوفیا کا بڑا معتقد تھا۔ جہانگیر اپنے باپ اکبر کی مانند مذہبی رواداری کا حامی تھا اور ہمیشہ صلح کل پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ گو اس نے مشہور صوفی اور عالمِ دین حضرت احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کو کچھ عرصہ گوالیار کے قلعہ میں نظر بند رکھا مگر اس کا یہ اقدام محض چند سیاسی وجوہ کی بنا پر تھا۔ مجدد الف ثانیؒ نے جہانگیر کی مذہبی پالیسی کی نہ صرف تعریف کی بلکہ اسے بادشاہِ اسلام کے نام سے بھی یاد کیا۔ جہانگیر نے اپنی غیر مسلم رعایا کو مذہبی آزادی عطا کی اور کبھی کسی کو مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا شکار نہ بنایا۔ سکھ گورو ارجن دیو کو مذہبی تعصب کی بنا پر موت کی سزا نہیں دی گئی تھی بلکہ اس کا اصل باعث سکھ گوروؤں کا سیاسی طرزِ عمل تھا۔ علاوہ ازیں غیر ملکیوں کے ساتھ بھی اس کا سلوک نہایت فیاضانہ تھا۔ ڈاکٹر سری واستوا جہانگیر کی مذہبی رواداری کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ:

> "جہانگیر مذہبی رواداری کا حامی تھا اس نے غیر مسلموں کو نہ صرف نئے مندر تعمیر کرنے کی اجازت دی، بلکہ ہندوؤں کو یاترا ٹیکس (پلگرم ٹیکس) کی ادائیگی سے بھی مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے انہیں مقدس مذہبی مقامات کی یاترا کی کھلی اجازت دی۔"

جہانگیر بطور بادشاہ

جہانگیر ایک کامیاب حکمران تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کا منتظم، عدل و انصاف کا پیکر اور ایک صائب الرائے حکمران تھا۔ اس نے اپنے باپ کے قائم کردہ انتظامی ڈھانچہ کو خوش اسلوبی سے برقرار رکھا مگر وہ اپنے باپ اکبر جیسا مدبر سیاستدان نہ تھا کہ

Marfat.com

انتظامی امور میں اصلاحات نافذ کرتا۔ منصف مزاج ہونے کے باوجود وہ ایک مطلق العنان بادشاہ تھا اس لئے مجلسِ مشاورت کی کچھ زیادہ پرواہ نہ کرتا تھا اور نہ ہی کسی کی مخالفت برداشت کرتا تھا اپنے احکام کی بے چون و چرا تعمیل کراتا تھا۔ لیکن رعایا کی بہبود کا ہر وقت خیال رکھتا تھا۔ ظالموں اور شر پسندوں کو سخت سزائیں دیتا تھا۔ عدل کے معاملے میں صداقت پسند اور غیر جانبدار واقع ہوا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس کا عدل اس کی دوامی شہرت کا باعث اور تاریخ میں عدلِ جہانگیر کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے آگرہ کے قلعہ کی دیوار کے ساتھ زنجیرِ عدل لگادی تھی تاکہ فریادی زنجیرِ عدل کھینچ کر فوری انصاف طلب کر سکے۔

جہانگیر اپنے باپ اکبر کا صحیح نعم البدل اور ایک عظیم حکمران تھا اس کا عہد اس لئے اہم نظر نہیں آتا کہ وہ اکبر اور شاہجہان کے عظیم الشان ادوارِ حکومت میں گھرا ہوا ہے۔ جہانگیر کے کردار کے بارے میں مورخین کے اقوال کافی دلچسپ ہیں ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:۔

۱۔ اے ایل سری واستوا:

"کو جہانگیر کو نہ عظیم المرتبت حکمران کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی مدبر سیاستدان اور اعلیٰ درجے کا منتظم شمار کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ وہ ایک کامیاب اور مشفق حکمران تھا اور رعایا کے ہر طبقہ میں ہر دلعزیز تھا۔ دیگر حکمرانوں کی مانند وہ بے شمار خوبیوں اور خامیوں کا حامل تھا۔"

۲۔ ایس لین پول:

"اپنے کردار کی خامیوں کے باوجود وہ (جہانگیر) غیر دانشمند نہ تھا، بلکہ زیرک اور ہوشمند تھا۔ اس نے اکبر کی جاری کردہ رواداری کی پالیسی اور انتظامی امور کو برقرار رکھ کر اپنی اعلیٰ خردمندی کا ثبوت دیا۔"

۳۔ ڈاکٹر وی اے سمتھ:

"جہانگیر سفاکی، منصف مزاجی، نرم دلی، خود غرضی اور سلیقہ شعاری جیسی متضاد صفات کا مالک تھا۔"

عہدِ جہانگیری کے دوران برصغیر میں یورپی اقوام کی آمد

سولھویں صدی عیسوی میں یورپی باشندے برصغیر پاک و ہند میں تجارت کی غرض سے وارد ہوئے اکبر نے یورپی باشندوں سے فراخدلانہ سلوک روا رکھا اور انہیں کافی تجارتی مراعات عطا کیں۔ جن کے

Marfat.com

باعث انہوں نے ساحلی علاقوں میں نہ صرف اپنے قدم جما لئے بلکہ تجارتی کوٹھیاں قائم کر کے تجارت سے خوب نفع کمایا۔ اکبر نے متعدد پرتگیزی جیسوئٹ پادریوں کو اپنے دربار میں طلب کیا اور انہیں مذہبی مباحثوں میں شرکت کی دعوت دی۔ انہیں مذہبی آزادی عطا کی اور خاص مراعات دینے کے علاوہ عیسائیت کی اشاعت کی بھی اجازت دی۔ نتیجتہً برصغیر میں عیسائیت کو خوب فروغ ہوا۔ شہزادہ سلیم کے ان پادریوں سے دوستانہ تعلقات تھے۔

جہانگیر کے عہد میں بہت سے پادری سفیر اور سیاح شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔ چونکہ جہانگیر بڑا فراخدل اور فیاض طبع حکمران تھا اس لئے اس نے پرتگیزوں کو بہت سی تجارتی مراعات دیں۔ لیکن ۱۶۱۳ء میں پرتگیزوں نے 'سورت' کے قریب چار شاہی جہازوں کو لوٹ کر جہانگیر کو ناراض کر دیا۔ سورت کے گورنر مقرب خاں نے گوشمالی کر کے ان کی طاقت کو کچل دیا اور ان کو دی گئیں تمام مراعات منسوخ کر دیں حتیٰ کہ پرتگیزوں کو مغلیہ سلطنت کی حدود سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ لاہور اور آگرہ کے پرتگیزی گرجوں کو بند کر دیا گیا۔ آخر پرتگیزوں نے معافی مانگ لی۔ گو ۱۶۱۵ء میں انہیں معافی مل گئی مگر ان کی طاقت دوبارہ بحال نہ ہو سکی۔

جہانگیر کے عہد میں انگریزی سفیر اور سیاح بھی برصغیر میں وارد ہوئے برصغیر میں ان کی آمد کا مقصد شاہی دربار میں پرتگیزوں کے اثر و نفوذ کو ختم کرنا اور اپنی قوم کے لئے تجارتی مراعات حاصل کرنا تھا پرتگیزوں کے غلط اقدام سے جہانگیر بہت برہم تھا۔ چنانچہ اس نے انگریزی سیاحوں اور سفیروں کو تپاک و احترام سے نوازا اور انہیں تجارتی مراعات عطا کیں۔ انگریز سیاح اور سفیر جو عہد جہانگیری میں برصغیر پاکستان و ہند میں وارد ہوئے ان میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

ولیم ہاکنز (۱۶۰۸ء تا ۱۶۱۳ء) ولیم فنچ (۱۶۰۸ء تا ۱۶۱۱ء) نیکولس ونگٹن (۱۶۱۲ء تا ۱۶۱۶ء) سر تھامس رو (۱۶۱۷ء تا ۱۶۱۹ء) ایڈورڈ ٹیری (۱۶۱۶ء تا ۱۶۱۹ء)' ان انگریز سفیروں اور سیاحوں نے جہانگیر کی سیرت اور مغل دربار کے اہم واقعات پر کافی روشنی ڈالی ہے ان میں ولیم ہاکنز اور سر تھامس رو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ نہ صرف مغل دربار میں زیادہ عرصہ قیام پذیر رہے بلکہ انہوں نے اپنی قوم کے لئے بہت سی تجارتی مراعات بھی حاصل کیں اور بادشاہ کی سیرت اور مغلیہ سلطنت کے اہم واقعات کو اپنے سفر ناموں میں درج کیا یہاں مختصر طور پر ان کا علیحدہ علیحدہ جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ولیم ہاکنز

اگست ۱۶۰۸ء میں کیپٹن ولیم ہاکنز بحیثیت سفیر شاہ انگلستان جیمز اوّل کا خط لیکر ہیکٹر نامی جہاز کے ذریعے سورت پہنچا۔ اپریل ۱۶۰۹ء میں بیش قیمت تحفے تحائف کے ساتھ جہانگیر کے حضور پیش ہوا۔ ولیم ہاکنز ترکی اور فارسی زبان میں گفتگو کر سکتا تھا اس لئے اُسے

Marfat.com

بادشاہ سے خطاب کرتے وقت مترجم کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ تین سال تک شاہی دربار میں مقیم رہا وہ اپنی قوم کے لئے تجارتی مراعات چاہتا تھا۔ لیکن پرتگیزی مبلغ جیسوئٹ فادر پنہیرو (JESUIT FATHER PINHEIRO) کی سازشوں کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ آخر ۱۶۱۳ء میں ہاکنز واپس انگلستان چلا گیا ہاکنز کے بعد یکے بعد دیگرے ہال کینک اور ولیم ایڈورڈ شاہ انگلستان جیمز اول کے خطوط لیکر مغلیہ دربار میں پہنچے لیکن وہ بھی انگریزوں سے پرتگیزوں کی قدیم مخاصمت کا شکار ہو کر ناکام واپس لوٹے۔ انگریزی سفراء میں اہم ترین ہدف سر تھامس رو تھا جو اپنے مشن میں کامیاب ہوا۔

سر تھامس رو

۱۸ ستمبر ۱۶۱۵ء کو تھامس رو برصغیر میں سورت کے مقام پر پہنچا اسے انگلستان کے شاہ جیمز اول نے اپنا سفیر بنا کر جہانگیر کے دربار میں بھیجا تھا۔ جہانگیر نے اس کا اچھی طرح سے استقبال کیا۔

"سر تھامس رو ایک صاحب علم شخص تھا اور شاہی آداب سے واقف ایک تجربہ کار سیاستدان تھا۔ اپنی قوم کے لئے تجارتی مراعات کے حصول کے مشن پر مامور موزوں ترین شخص تھا۔"[1]

وہ جہانگیر کے دربار میں تین سال تک مقیم رہا۔ مانڈو اور احمد نگر کے سفر میں بادشاہ کا ہمرکاب رہا۔ سر تھامس رو اپنی قوم کے لئے برصغیر کی بندرگاہوں میں آزادانہ تجارتی حقوق کا خواہاں تھا۔ لیکن جہانگیر نے ایک فرمان کے ذریعے صرف سورت میں انگریزوں کو تجارتی مراعات عطا کیں۔ یہ فرمان برصغیر میں انگریزی اقتدار کی بنیاد بنا مانڈو اور احمد نگر کی سیاحت کے بعد سر تھامس رو ۱۷ فروری ۱۶۱۹ء کو واپس انگلستان لوٹا۔ سر تھامس رو اور اس کے ساتھی پادری ایڈورڈ ٹیری دونوں نے برصغیر پاکستان و ہند کے چشم دید حالات کے علاوہ جہانگیر کی سیرت پر بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"بادشاہ ایک ہنس مکھ اور خوش اخلاق شخص ہے۔ دن میں تین بار صبح، دوپہر اور شام کو دربار عام لگاتا ہے عرض داشتیں سنتا اور فیصلے صادر کرتا ہے۔ شہنشاہ شراب کا بڑا رسیا ہے بڑا متلون مزاج ہے۔ کبھی سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سخت سزائیں دیتا ہے اور کبھی رحمدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انعامات سے نوازتا ہے۔ میدان جنگ میں مستعد ہے۔ مذہبی معاملات میں اپنے باپ اکبر کی روادارانہ پالیسی کا حامی ہے۔ انصاف پرور اور رحمدل ہے۔ سال میں ایک بار اس کو جواہرات، سونے چاندی اور ریشم سے تولنے کی رسم شان و شوکت سے منائی جاتی ہے۔ بعد ازاں جواہرات اور سونے چاندی کو خیرات میں دیدیا جاتا ہے۔"

"مغل دربار بڑا پرشکوہ ہے۔ بادشاہ ایک مرصع تخت پر بیٹھتا ہے اور امراء دست بستہ

---

[1] وی اے سمتھ۔ دی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا۔ صفحہ ۳۶۸

Marfat.com

کھڑے ہوتے ہیں۔ امرار بڑے خوش اخلاق ہیں۔ لیکن ذاتی طور پر وہ طمع خور اور عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں۔ دربار امرار کی سازشوں کا اڈہ ہے۔"

"ملک صوبوں میں منقسم ہے۔ صوبوں پر مرکزی گرفت ڈھیلی ہے۔ صوبیدار سخت گیر اور ظالم ہیں اور آمرانہ اختیارات کے مالک ہیں۔ مگر وہ غیر ملکیوں سے بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں۔ سزائیں سخت ہیں۔ بندرگاہوں پر بڑی دشواری پیش آتی ہے کیونکہ بندرگاہوں پر مامور افسر خود سر اور ظالم ہیں تاجروں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش نہیں آتے ہیں۔ شاہی فوج کا وقار اور دبدبہ زائل ہو چکا ہے۔ شہنشاہ اور اس کے درباری فنونِ لطیفہ کے شائق ہیں۔ دربار میں باکمال مصور موجود ہیں۔ بادشاہ فنِ مصوّری کا بہت اچھا نقاد ہے۔ صوبہ دکن کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ عوام سخت پریشان ہیں برصغیر کے عوام مچھلیوں کی مانند زندگی بسر کرتے ہیں۔ بڑی مچھلی چھوٹی کو کھاتی ہے اور سڑکیں غیر محفوظ ہیں۔"

مجدّد الف ثانی رح
۱۵۶۴ء تا ۱۶۲۴ء

آپ کا اسم مبارک شیخ احمد سرہندی ہے آپ عہدِ جہانگیر کے مشہور ترین بزرگ تھے۔ موصوف ۲۶ جون ۱۵۶۴ء کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ عبدالاحد اپنے وقت کے مشہور ترین عالم دین تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ اور لاہور میں حاصل کی۔ اسلامی علوم پر کامل عبور حاصل کرنے کے بعد ۱۵۹۰ء میں آپ آگرہ چلے گئے جو ارباب علم و دانش کا گہوارہ تھا وہاں آپ نے علمی استعداد سے بہت جلد اہل دین و دانش میں نمایاں مقام حاصل کر لیا ابوالفضل اور فیضی جو علم و فضل کے اعتبار سے عہد اکبری کے انتہائی نامور علماء تھے آپ کے علمی کمالات کے بہت معترف تھے۔ اس زمانہ میں فیضی نے شہرہ آفاق تفسیر "سواطع الالہام" لکھی ہے آپ کی عملی استطاعت سے استفادہ کیا۔ قیام آگرہ کے دوران آپ کو دربارِ اکبری کے ان علماء کے خیالات کے مطالعہ کا موقعہ ملا جو کہ اس عہد کی لادینیت کے ذمہ دار تھے آپ نے ان کے باطل اور گمراہ کن عقائد و تعلیمات پر بھرپور تنقید کی اور دین اسلام کے بارے میں عامۃ الناس کی اصلاحِ فکر و عمل کے لئے عربی اور فارسی میں متعدد کتب لکھیں۔

۱۵۹۹ء میں آپ دہلی چلے گئے اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ حضرت باقی باللہ سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور صوفی اور عالم دین تھے یہاں آپ نے طریقت کی تمام منزلیں بڑی تیزی سے طے کیں اور اپنے مرشد کے حکم پر غیر اسلامی عقائد اور رسموں کے خلاف سرگرمی و مستعدی کے ساتھ پند و موعظ کا سلسلہ شروع کیا۔ خود آپ کے مرشد نے آپ کی روحانیت کا اعتراف یہ کہکر کیا کہ "شیخ احمد ایک ایسا چراغ ہیں جس سے جہاں روشن ہو گا۔" اپنے مرشد کی وفات کے بعد آپ نے

Marfat.com

سرہند میں مقیم ہو کر رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کی ذات میں بے پناہ کشش تھی اور آپ کی تحریریں اثر آفرینی کے اعتبار سے سحر انگیز تھیں۔ آپ نے ارباب اقتدار کو خطوط لکھ کر حقیقی اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ آپ کے تربیت یافتہ خلفاء نے برصغیر کے کونے کونے اور افغانستان و ترکستان میں پہنچ کر آپ کی روحانی تعلیمات کو عام کر دیا اور اس زندیقیت کے خلاف ایک زبردست تحریک چلائی جو اکبری عہد میں پورے ملک میں پھیل گئی تھی جس میں احیائے اسلام کو نصب العین بنایا گیا۔ انہی کوششوں کی وجہ سے آپ کو مجدد الف ثانی (دوسرے ہزار کا مجدد) قرار دیا گیا۔ اگرچہ آپ نے متعدد کتب تصنیف کیں۔ مگر آپ کی سب سے مشہور تصنیف آپ کے مکتوبات کا مجموعہ ہے ان میں آپ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام اور شرک میں بُعد المشرقین ہے۔ یعنی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ آپ نے اپنے خطوط میں دلائل و براہین کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ درحقیقت دین اسلام ہی انسانی فلاح و نجات کا واحد راستہ ہے آپ نے ایک اسلام دشمن ہندو ہردے رام کے اس نظریہ و دعویٰ کہ "رام اور رحیم میں کوئی فرق نہیں ہے" کی پرزور تردید کی۔

آپ کے مقاصد کو جہانگیری دربار میں غلط رنگ دیا گیا۔ دربار میں آپ کا سب سے زیادہ مخالف اور طاقتور گروپ ملکہ نور جہاں کے حامی ایرانی علماء کا تھا۔ جہانگیر نے آپ کو دربار میں طلب کر لیا آپ نے بادشاہ وقت اور درباری علماء کے اعتراضات کا جواب تو نہایت مسکت اور پُرسکون دیا۔ لیکن درباری آداب کے مطابق بادشاہ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر برہم ہو کر جہانگیر نے آپ کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا جہاں آپ دو سال تک قید رہے۔ دورانِ قید کئی قیدی آپ کے خیالات و تعلیمات کے فیضان سے مشرف بہ اسلام ہوئے اس اثنا میں بادشاہ کے دل میں آپ کے لئے احترام پیدا ہو چکا تھا اس نے آپ کو ایک ہزار روپیہ نذرانہ اور خلعت پیش کرتے ہوئے آپ کو سرہند واپس جانے کی اجازت دیدی مگر آپ نے لشکر شاہی میں رہ کر تبلیغ کو جاری رکھنا زیادہ مناسب سمجھا۔

آپ تقریباً تین سال تک لشکرِ شاہی کے ساتھ رہے اس دوران متعدد بار بادشاہ سے ملاقات کی اور کئی درباری امراء کو اپنا معتقد بنایا۔ اس سے بادشاہ اور امراء میں احیائے شریعت کا عام رجحان پیدا ہو گیا۔ آپ نے اپنی مساعی جمیلہ سے ان ملحدانہ رجحانات کا یکسر قلع قمع کر دیا جو دین اسلام میں رخنہ اندازی کر رہے تھے۔ عہدِ اکبری کی لادینیت کے خلاف سخت جہاد کیا۔ آپ نے عوام، امراء اور صوفیاء کے عقائد و اعمال کی بھی اصلاح کی۔ شریعت اور طریقت میں ہم آہنگی پیدا کی آپ نے سلسلہ نقشبندیہ کے افکار کی اشاعت پر زور دیا۔ اس طرح آپ نے اسلامی معاشرہ میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر کے مجدد الف ثانی ہونے کے دعویٰ کو درست ثابت کیا آپ نے ۱۶۲۴ء میں سرہند کے مقام پر وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے آپ کا مزارِ مبارک آج بھی مرکزِ فیض اور مرجعِ خلائق ہے۔

Marfat.com

اہم تاریخیں

۱۶۰۵ء جہانگیر کی تخت نشینی

۱۶۰۶ء شہزادہ خسرو کی بغاوت، شیر افگن کی ہلاکت

۱۶۰۸ء شاہ انگلستان جیمز اول کا سفیر کیپٹن ہاکنز سورت کے مقام پر پہنچا۔

۱۶۰۹ء ملک عنبر کو دکن میں عروج حاصل ہوا۔ ولیم ہاکنز آگرہ میں جہانگیر کے حضور پیش ہوا۔

۱۶۱۱ء نور جہاں سے جہانگیر کی شادی۔

۱۶۱۲ء جہانگیر نے انگریزوں کو سورت اور احمد آباد کے مقامات پر تجارتی کوٹھیاں تعمیر کرنے کی اجازت عطا کی۔ ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد پڑی۔

۱۶۱۴ء رانا امر سنگھ والئے میواڑ نے مغلیہ سیادت قبول کر لی۔ راجہ مان سنگھ کی وفات۔

۱۶۱۵ء انگریزی سفیر سر تھامس رو کا برصغیر میں وارد ہونا۔

۱۶۱۸ء دوہد کے مقام پر اورنگ زیب عالمگیر کی پیدائش۔

۱۶۱۹ء انگریزی سفیر سر تھامس رو کا برصغیر سے واپس جانا۔

۱۶۲۲ء قندھار پر ایرانیوں کا قبضہ، شہزادہ خرم کی بغاوت۔

۱۶۲۳ء مشہور ہندی شاعر تلسی داس کی وفات۔

۱۶۲۴ء مجدد الف ثانیؒ کی وفات۔ عبدالرحیم خان خاناں نے وفات پائی۔

۱۶۲۶ء مہابت خاں کا بادشاہ اور ملکہ نور جہاں کو حراست میں لینا۔ ملک عنبر کی وفات۔

۱۶۲۷ء جہانگیر کی وفات۔

امتحانی سوالات

۱۔ جہانگیر کی تخت نشینی اور ابتدائی حالات کا جائزہ لیجیے۔

۲۔ شہزادہ خسرو کی بغاوت کا حال لکھیے اور اس کے نتائج قلمبند کیجیے۔

۳۔ جہانگیر کے عہد کے اہم واقعات پر روشنی ڈالیے۔

۴۔ نور جہاں کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے نور جہاں اور جہانگیر کے تعلقات کا تنقیدی

Marfat.com

جائزہ لیجئے۔

۵۔ نورجہاں کی سیرت قلمبند کیجئے۔ نیز عہدِ جہانگیری کی ملکی سیاست پر اس کے عمل دخل کے اچھے اور برے نتائج واضح کیجئے۔

۶۔ آپ کو اس رائے سے کس حد تک اتفاق ہے کہ جہانگیر کے عہد میں ہونیوالی بغاوتوں میں سے چند جہانگیر پر نورجہاں کے اثر کا نتیجہ تھیں۔

۷۔ ''اُس (جہانگیر) کی شہرت اپنے باپ کی عظمت اور بیٹے کی شان و شوکت کے سامنے ماند پڑ گئی۔'' ان الفاظ کو مدنظر رکھ کر جہانگیر کے کردار پر روشنی ڈالیئے اور برصغیر کی تاریخ میں اس کے صحیح مقام کا تعین کیجئے۔

۸۔ ایران کے صفوی بادشاہوں اور برصغیر پاک و ہند کے مغل حکمرانوں (بابر تا جہانگیر) کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالیئے۔

۹۔ عہدِ جہانگیری کے دوران برصغیر میں یورپی اقوام کی آمد پر روشنی ڈالتے ہوئے کیپٹن ولیم ہاکنز اور سر تھامس رو پر ایک مدلل مضمون تحریر کیجئے۔

۱۰۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ تحریر کیجئے :۔

ا۔ مسئلہ قندھار (۱۶۰۶ء تا ۱۶۲۲ء)

ب۔ جہانگیر کی دکن پالیسی۔

ج۔ ریاست میواڑ کی اطاعت۔

د۔ شاہجہان کی بغاوت۔

ر۔ مہابت خاں کی بغاوت۔

س۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ۔

Marfat.com

ساتواں باب

شہاب الدّین محمّد شاہجہاں

(۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء)

"ہندوستان کا وہ فرمانروا جس کا عہد زرّیں مغل دور کا منتہائے کمال تھا۔ جس نے بڑی شان و شوکت سے بادشاہت کی۔ مگر جس کا ابتدائی دور شدید کشمکش اور درشت نوردی میں گذرا اور جس کا انجام نہایت ہی عبرتناک ہوا وہ تاج محل کا بانی اور ہندوستان میں مغل تہذیب کا روشن مینار تھا۔" خافی خاں

ابتدائی حالات
۱۵۹۲ء تا ۱۶۲۷ء

شہاب الدین محمد شاہجہان کا اصلی نام خرم تھا وہ جنوری ۱۵۹۲ء بروز جمعرات بمقام لاہور ایک راجپوت راجکماری جودھا بائی عرف جگت گوسائیں کے بطن سے پیدا ہوا۔ جگت گوسائیں موٹا راجہ اودھے سنگھ کی بیٹی تھی خرم جہانگیر کا تیسرا بیٹا تھا۔ وہ ابتدا ہی سے ذہین زیرک، چاق و چوبند اور بلند عزائم کا مالک تھا۔ تیموری روایات کے مطابق چار سال، چار ماہ اور چار دن کی عمر کا ہوا تو اکبر نے اس کی ابتدائی تعلیم کا مناسب بندوبست کیا۔ ابوالفضل کی زیر نگرانی شہزادہ خرم نے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جملہ مروجہ علوم کی تحصیل بھی کی۔ اس نے فنون سپہ گری میں دسترس حاصل کرنے کے علاوہ جسمانی تربیت بھی حاصل کی۔ جس کے باعث نوعمری میں ہی اس میں شجاعت و مردانگی کے جوہر نمودار ہونے لگے تھے۔ شہزادہ خرم کی عسکری ذہانت اور شجاعت مسلم تھی۔ جس کا اس نے متعدد فوجی مہمات میں مظاہرہ کر کے ایک عظیم جرنیل اور فاتح ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔

جہانگیر کے ابتدائی عہد میں شہزادہ خسرو کی بغاوت اور شہزادہ پرویز کی نالائقی و کثرت مے نوشی کے باعث شہزادہ خرم اپنے باپ جہانگیر کا منظور نظر بن گیا۔ خرم کو پہلی بار امور سلطنت کے فرائض سونپتے ہوئے اس وقت نائب السلطنت مقرر کیا گیا جب ۱۶۰۶ء میں شہزادہ خسرو نے بغاوت کی۔ اور اس کی سرکوبی کے لئے جہانگیر خود اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ ۱۶۰۸ء میں اسے دربعہد کے لئے وقف حصار فیروزہ کی جاگیر ملی۔ ۱۶۱۰ء میں خرم کی شادی مظفر حسین صفوی کی بیٹی سے ہوئی ۱۶۱۱ء میں اسے دس ہزار ذات و پنج ہزار سوار کے منصب سے نوازا گیا۔ ۱۶۱۲ء میں بیس سال کی عمر میں اس کی دوسری شادی آصف خاں کی بیٹی اور نور جہاں کی بھتیجی ارجمند بانو بیگم سے ہوئی۔

Marfat.com

جسے شہزادہ خرم نے ممتاز محل کے خطاب سے نوازا۔ اس شادی سے شہزادہ خرم کو آصف خاں اور نور جہاں کی حمایت اور سرپرستی حاصل ہو گئی۔ اور نہ صرف اس کے مراتب میں اضافہ ہوا بلکہ تیس ہزار سوار کا اعلیٰ ترین منصب عطا ہوا۔ اس کی روز افزوں ترقی کے پیش نظر لوگوں کا یہ یقین راسخ ہو گیا کہ شہزادہ خرم ہی اپنے باپ کا جانشین ہو گا۔ چنانچہ عوام نے اسے برصغیر کے ہونیوالے شہنشاہ کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا۔

شہزادہ خرم کو اہم فوجی مہمات پہ مامور کیا گیا۔ جہانگیر کے عہد کی بیشتر شاندار فتوحات اسی کی مرہون منت ہیں۔ رانا امر سنگھ والئے میواڑ کی اطاعت، کانگڑہ کی تسخیر اور دکن میں ملک عنبر کے خلاف کامیاب مہمات اس کی عسکری قابلیت، اولوالعزمی، مستقل مزاجی، خردمندی اور سیاسی بصیرت کی مظہر تھیں جہانگیر اس کی کامرانیوں پہ اس قدر خوش ہوا نہ صرف اسے "شاہجہان" کا خطاب دیا بلکہ گجرات کا صوبہ بھی اس کی نیابت میں شامل کر دیا گیا۔

دس سال تک نور جہانی جتھہ کی حمایت اور سرپرستی سے مستفید ہونے کے بعد ۱۶۲۲ء میں اچانک خرم کا ستارۂ اقبال گردش میں آ گیا۔ ملکہ نور جہاں نے اس کی حمایت ترک کر کے اپنے داماد شہزادہ شہریار کی سرپرستی اور حمایت شروع کر دی اس سے شاہجہان کو اپنی ولیعہدی خطرے میں نظر آئی اور اس نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی۔ کئی سال یہ یشان اور سرگرداں رہنے کے بعد بالآخر ۱۶۲۶ء میں اس نے اپنے باپ سے معافی مانگ لی اور اس کے حکم کے مطابق دکن میں بالا گھاٹ کے صوبیدار کی حیثیت سے ناسک میں مقیم ہو گیا۔ یہیں پر اسے اپنے باپ جہانگیر کی وفات کی خبر ملی۔

تخت نشینی ۱۶۲۸ء

جہانگیر کی وفات کے فوراً بعد حصولِ تخت کی جدوجہد شروع ہو گئی۔ نور جہاں نے شاہی اقتدار کو اپنے دائرہ اختیار میں رکھنے کی خاطر اپنی آخری کوشش کو بروئے کار لاتے ہوئے لاہور میں اپنے داماد شہریار کو ملکہ کے مغل امراء کی حمایت حاصل کر کے اور دفاعی پوزیشن کو مضبوط تر کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے۔ نور جہاں نے اپنے بھائی آصف جاہ کو بھی قید کرنے کی کوشش کی جو کہ حصول تخت کے سلسلے میں اپنے داماد شہزادہ خرم (شاہجہان) کا طرفدار تھا۔ آصف جاہ نے اپنی بصیرت سے کام لیکر ملکہ کی سعی کو ناکام بنا دیا۔ اس نے نہ صرف ایک تیز رفتار قاصد دکن بھیج کر شہزادہ خرم کو جہانگیر کی وفات سے مطلع کرتے ہوئے جلد پایۂ تخت پہنچنے کی تاکید کی بلکہ سرکردہ مغل امراء کو شہزادہ خرم کا طرفدار بنا کر اپنے ساتھ ملا لیا اور وقتی طور پر خسرو کے بیٹے داور بخش کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ دریں اثنا شہریار نے اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہوئے لاہور کے شاہی خزانہ پر قبضہ کر لیا۔ علاوہ ازیں مغل امراء کی

Marfat.com

جائیدادوں کو بھی ضبط کر لیا اور زر کثیر صرف کر کے ایک بھاری فوج منظم کر لی۔ نتیجتہً آصف جاہ اور شہریار کی افواج لاہور کے نواح میں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں۔ اس جنگ میں شہریار شکست کھا کر گرفتار ہوا اور بعد ازاں آنکھوں سے محروم ہوا۔

شاہجہان تیزی سے شمال کی جانب بڑھ رہا تھا۔ راستے میں رانا کرن والئے میواڑ اور دیگر متعدد امراء نے اس کا استقبال کیا اور مبارک باد پیش کی۔ ادھر دارالسلطنت میں شاہجہان کے ایک خفیہ پیغام پر آصف جاہ نے داور بخش "قربانی کے بکرے" اور تخت کے دیگر تمام دعویداروں شہریار (ناشدنی) اور شہزادہ دانیال کے دونوں لڑکوں طہمورس اور ہوشنگ کو موت کے گھاٹ اتار کر شاہجہان کے لئے حصولِ تخت کے لئے راہ ہموار کر دی۔ فروری ۱۶۲۸ء کے آغاز میں شاہجہان بڑی دھوم دھام سے آگرہ میں داخل ہوا اور ۴ فروری[1] ۱۶۲۸ء کو ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہجہان صاحبقران ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ آصف جاہ کو آٹھ ہزاری ذات و سوار کے منصب سے نوازتے ہوئے وکیلِ سلطنت (وزیر) کے منصبِ جلیلہ پر فائز کیا۔ امیر الامراء مہابت خاں کو خان خاناں کے خطاب کے علاوہ سات ہزار ذات و سوار کے منصب سے نوازا اور دیگر حامی امراء پر انعام کرام کی بارش کر دی۔

نورجہاں عملی سیاست سے دستبردار ہو گئی۔ اس کے لئے دو لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا اور لاہور میں سکونت پذیر ہونے کی اجازت عطا ہوئی۔ نورجہاں نے اپنے بقیہ ایامِ زندگی اپنی بیوہ بیٹی لاڈلی بیگم کے ہمراہ لاہور میں گذارے۔ اس نے ۱۶۴۵ء میں وفات پائی۔

احیائے دین

عہدِ اکبری میں متعدد ایسی رسوم رواج پا چکی تھیں جو خلافِ شرع تھیں۔ شاہجہان حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کا مرید اور ان کی تحریک احیائے دین کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا متمنی تھا چنانچہ اس نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی خلافِ شرع مروجہ رسوم کے انسداد کے لئے احکامات جاری کئے جن کی رو سے:

۱۔ شرعی احکام کی پابندی لازمی قرار دی، ارتداد کو جرم قرار دیا۔ نیز مسلمان عورتوں سے غیر مسلموں کی شادی ممنوع قرار دی۔

۲۔ رائج سنِ شمسی کی بجائے سرکاری تحریروں میں سن ہجری کے اجراء کا حکم دیا۔ علاوہ ازیں غیر اسلامی تقریبات کی بجائے اسلامی تقریبات کو تزک و احتشام سے منانے کا اہتمام کیا۔ نیز ان تقریبات پر عطیات اور خیرات کی تقسیم کے علاوہ مقدس مقامات کو نذرانے روانہ کرنے

---

[1] ۴ فروری ۱۶۲۸ء ایل سری واسٹوا "دی مغل ایمپائر" صفحہ ۱۸۱

Marfat.com

کا بھی بندوبست کیا۔

۳۔ درباری آداب میں خلاف شرع رسوم کو ختم کر دیا۔ بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی رسم کو سختی کے ساتھ ممنوع قرار دیا اور زمین بوسی[1] کا طریقہ رائج کیا لیکن بعد میں "چہار تسلیم[2]" کا طریقہ نافذ کیا لیکن علماء و صوفیاء اور سادات کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے انہیں صرف اسلامی طور پر سلام کہنے کا حکم دیا۔

۴۔ نو مسلموں کی حوصلہ افزائی اور دیکھ بھال کے لئے ایک الگ شعبہ قائم کیا اور اکبری دستور کے مطابق مذہبی رواداری کو بحال رکھتے ہوئے غیر مسلموں کو مذہبی آزادی اور حسب سابق اعلیٰ مراتب و مناصب عطا کئے۔ جھروکہ درشن کو جاری رکھا۔

۵۔ آگرہ کا نام اکبر آباد رکھا۔

شاہجہانی عہد کی بغاوتیں

ججھار سنگھ بندھیلہ کی بغاوت

۱۶۲۸ء تا ۱۶۲۹ء

ججھار سنگھ بندھیلہ ریاست بندھیل کھنڈ کا حکمران اور بیر سنگھ بندھیلہ کا لڑکا تھا جس نے جہانگیر کے ایما پر ابوالفضل کو قتل کیا تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد جہانگیر نے اسے نہ صرف اعلیٰ منصب سے نوازا بلکہ جاگیر بھی عطا کی اور ہمیشہ اس پر نوازشیں کرتا رہا۔ بیر سنگھ نے جہانگیر کی نوازشوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ہمسایہ زمینداروں کو تنگ کر کے بہت سی دولت جمع کر لی۔ اس نے جہانگیر کی وفات سے کچھ عرصہ قبل وفات پائی اس کا بیٹا جھار سنگھ بندھیل کھنڈ کی راج گدی پر بیٹھا ورثہ میں زر کثیر ملنے کے باعث وہ سرکش و مغرور ہو گیا۔ شاہجہان تخت نشین ہوا تو وہ مبارکباد پیش کرنے اور شاہی خدمت کے لئے دربار شاہی میں حاضر ہوا اور ریاست کے امور پر اپنے بیٹے بکرماجیت کو مامور کیا لیکن بکرماجیت اچھا منتظم ثابت نہ ہوا۔ اس نے جلد ہی اپنے ظالمانہ رویئے اور مالیہ کی جبری و ناجائز وصولی سے رعایا کو برگشتہ کر لیا۔ چنانچہ شکایات پہنچنے پر شاہجہان نے مالیہ کی سابقہ وصولی کے جائزہ کا حکم دیا۔ اس حکم سے برگشتہ ہو کر جھار سنگھ آگرہ سے واپس اڑچھا (ORCHHA) بندھیل کھنڈ آ گیا اور علم بغاوت بلند کر دیا۔

---

[1] زمین بوسی میں پہلے زمین کو دائیں ہاتھ سے چھوتے تھے اور پھر اس ہاتھ کی پشت کو چومتے تھے۔

[2] چہار تسلیم سے مراد جھکنا اور اس کے بعد پیشانی، آنکھوں اور بازوؤں کو چھونا تھا۔

Marfat.com

مہابت خاں کی زیرِ کمان ایک فوجی مہم جھجھار سنگھ کی گوشمالی کے لئے بندھیل کھنڈ بھیجی گئی۔ علاوہ ازیں بطور کمک و مزید فوجی مہمات مشرقی علاقہ سے عبداللہ خاں اور دکن کی جانب سے خاں جہان کی سرکردگی میں روانہ کی گئیں۔ شاہجہان بذات خود بھی ان مہمات کی نگرانی کیلئے گوالیار پہنچ گیا۔ جھجھار سنگھ شاہی افواج کے مقابلے کی تاب نہ لاسکا اور شکست کھا کر اطاعت گذار ہوا۔ فروری ۱۶۲۹ء میں شاہجہان نے اس کی بعض جاگیروں کو بحق سرکار ضبط کر کے اسے معاف کر دیا اور دکن میں شاہی خدمات پر مامور کیا اس نے خاں جہان لودھی کی بغاوت کے دوران شاہی فوج کی معیت میں اہم کردار ادا کیا۔ اس پر شاہجہان نے خوش ہو کر اسے راجہ کا خطاب دیا۔

۱۶۳۴ء میں اڑچھا (بندھیل کھنڈ) واپس آکر جھجھار سنگھ نے ۱۶۲۹ء کے علاقائی نقصان کی تلافی کے لئے ریاست گونڈوانہ کو اپنے زیر تسلط لانے کی سکیم بنائی۔ ۱۶۳۵ء میں شاہجہان کی مرضی کے خلاف اس نے قلعہ چوڑاگڑھ پر قبضہ کر کے پریم نارائن ولیئے گونڈوانہ کو قتل کر دیا۔ مقتول راجہ کے بیٹے کی درخواست پر شاہجہان نے جھجھار سنگھ کو ہدایت کی کہ پانچ لاکھ روپے جرمانہ ادا کرنے کے علاوہ مقبوضہ علاقہ اصل وارث کے سپرد کر دے۔ لیکن جھجھار سنگھ نے حکم عدولی کرتے ہوئے پھر ایک بار علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس پر شاہجہان نے شہزادہ اورنگ زیب کو اس کی گوشمالی پر مامور کیا۔ جس نے جھجھار سنگھ کو شکستِ فاش دی۔ مگر وہ مع اپنے بیٹے بکرماجیت کے گونڈ قبائل کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ بندھیل کھنڈ کو جھجھار سنگھ کے ایک قریبی رشتہ دار دیوی سنگھ کے حوالہ کیا گیا جو مغلیہ دربار کا وفادار تھا۔

خان جہان لودھی کی بغاوت

۱۶۲۸ء - ۱۶۳۱ء

خان جہان لودھی ایک مشہور افغان سردار اور مغلیہ جرنیل تھا۔ اس نے اپنی غیر معمولی صلاحیت کے باعث جہانگیر کے عہد میں بہت عروج حاصل کیا۔ جہانگیر نے اسے دکن کی نیابت پر مامور کیا تھا۔ اپنی نیابت کے دوران اس نے بالا گھاٹ کا مغل علاقہ نظام شاہ کے ہاتھ میں تین لاکھ روپیہ کے عوض فروخت کر دیا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد اس نے نور جہاں کی حمایت کی اور اپنے صدر مقام برہان پور سے نکل کر مانڈو پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اور شاہجہان کے بھیجے ہوئے سفیر سے بڑی بے اعتنائی اور سرد مہری سے پیش آیا۔ لیکن بالآخر اطاعت گذار ہوا۔ شاہجہان نے اسے دکن کی نیابت پر بحال رکھتے ہوئے اسے بالا گھاٹ کا علاقہ واپس لینے کی تاکید کی مگر وہ اس میں ناکام رہا اس پر اسے دربار میں طلب کر لیا گیا اور اس کی جگہ مہابت خاں کو دکن کی نیابت پر متعین کیا۔ دربار میں خان جہان لودھی اپنے مرتبے سے غیر مطمئن تھا اور اس خدشہ میں مبتلا تھا کہ بادشاہ اس کی تذلیل کے درپے ہے۔ کیونکہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے

Marfat.com

مہابت خاں کو 'خان خاناں' کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ بادشاہ نے اسے مطمئن کرنے کے لئے تحریری امان بخشی عطا کی۔ مگر اس کا دل خدشات سے آزاد نہ ہوا۔ اور آخر ایک دن اپنے کنبہ کے کے افراد کے ساتھ دکن کی طرف فرار ہو گیا۔ شاہی فوج نے تعاقب کر کے اسے دریائے چمبل کے قریب دھولپور کے مقام پر جا گھیرا۔ لڑائی میں ہزیمت اٹھانے کے بعد خان جہان لودھی اپنے بیٹوں اور کچھ وفاداروں کی ہمراہی میں دریا کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس کا خزانہ اور حرم شاہی فوج کے قبضے میں آیا۔ ازاں بعد وہ بندھیل کھنڈ اور گونڈوانہ کے راستے دکن پہنچا جہاں احمد نگر کے نظام شاہی سلطان نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

سنگین حالات کے تحت دسمبر ۱۶۲۹ء میں شاہجہان بذاتِ خود خاں جہان لودھی کی سرکوبی کے لئے دکن پہنچا۔ اس نے مرہٹوں کو بھاری رقمیں دے کر شاہی ملازمت میں لے لیا۔ نیز احمد نگر بیجاپور اور گولکنڈہ کے باہمی حسد و مخاصمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خان جہان لودھی کو بے بس کرنے کے لئے اس پر تین اطراف سے ہلہ بولنے کی سکیم مرتب کی۔ چنانچہ گجرات کی طرف سے رسد کے راستے کے تحفظ اور شمال مغربی جانب سے احمد نگر کو گھیرے میں لے لینے کے لئے ابوالحسن کی سرکردگی میں ایک فوج دھولپور روانہ کی۔ دوسری فوج جنوبی برار میں دیوں گاؤں پر متعین کی تاکہ شمال مشرق سے دشمن پر حملہ کیا جا سکے تیسری فوج کو تلنگانہ روانہ کیا تاکہ وہ اس جانب سے خان جہان لودھی پر حملہ آور ہو۔ خاں جہان لودھی کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ دولت آباد میں پناہ گزین ہونے کے لئے بیجاپور بھاگ گیا۔ مگر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا کیونکہ شاہی افواج نے مرہٹہ سردار شاہ جی بھونسلہ کی معیت میں اس کا تعاقب جاری رکھا۔

خاں جہان لودھی نے شمال مغربی برصغیر کے افغانوں کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے مالوہ کے راستے پنجاب جانے کی کوشش کی۔ لیکن شاہی افواج نے بندھیل کھنڈ کے راجہ جھجھار سنگھ بندھیلہ کی مدد سے کالنجر کے نواح میں اسے فیصلہ کن شکست دی۔ خان جہان لودھی نے بچ کر فرار ہونے کی ناکام کوشش کی لیکن ہلاک ہوا۔

جگت سنگھ کی بغاوت ۱۶۳۹ء

جگت سنگھ کانگڑہ کے علاقے کا ایک جاگیردار تھا۔ جہانگیر اس پر بہت مہربان تھا۔ شاہجہان نے تخت نشین ہو کر اس کی جاگیر اور منصب کو بحال رکھا۔ مگر جگت سنگھ نے سرکشی اختیار کرتے ہوئے نہ صرف دربار میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا بلکہ ریاست چمبہ پر حملہ آور ہو کر اس پر قبضہ کر لیا۔ شاہجہان نے اس کی گوشمالی کے لئے فوجی کارروائی کی۔ شاہی فوج نے اس کے مشہور قلعوں ماؤ۔ نورپور اور تارا گڑھ پر قبضہ لیا۔ اس پر ۱۶۴۲ء میں اس نے اطاعت قبول کر لی اور

Marfat.com

معافی کا خواستگار ہوا۔ شاہجہان نے اسے معافی دیتے ہوئے اس کی جاگیر اور منصب کو بحال رکھا۔

پرتگیزوں کی گوشمالی

اکبر اور جہانگیر کی طرف سے پرتگیزوں کو بنگال میں خاصی تجارتی مراعات حاصل تھیں۔ ہگلی ان کا تجارتی مرکز تھا جہاں انہوں نے کارخانے قائم کر رکھے تھے اور ان کی حفاظت کے لئے انہوں نے ہگلی کی مضبوط قلعہ بندی کر رکھی تھی حکومت کی طرف سے انہیں نمک کی تجارت کی اجارہ داری حاصل تھی جس کے عوض وہ دس ہزار ٹنکہ سالانہ حکومت کو ادا کرتے تھے۔ لیکن شاہی مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے متعدد ایسی حرکات کا ارتکاب کیا کہ حکومت کو ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ حکومت کی اس تادیبی کارروائی کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں۔

۱۔ تجارتی حقوق سے تجاوز کرتے ہوئے پرتگیزوں نے مقامی تاجروں سے ناجائز ٹیکس وصول کرنے شروع کر دیئے۔

۲۔ چٹاگانگ پرتگیزی قزاقوں کا مسکن بن چکا تھا۔ یہ قزاق فرنگی کہلاتے تھے ہگلی کے پرتگیز تاجر ان کے ساتھ مل کر غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔ وہ اکثر میلوں اور اجتماعی تقریبات میں بہلا پھسلا کر چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے انہیں جبراً غلام بنا لیتے تھے اور انہیں بیرونی ممالک میں لے جا کر فروخت کر دیتے تھے۔

۳۔ پرتگیزی پادری بے حد تنگ نظر، شقی القلب اور متعصب تھے۔ لوگوں کو جبراً عیسائی بنا لینا ان کا معمول بن چکا تھا۔

۴۔ عہد جہانگیری میں شاہجہان کی بغاوت کے دوران پرتگیزوں نے نہ صرف شاہجہان کی کشتیوں کو لوٹا بلکہ ممتاز محل کی دو کنیزوں کو بھی جبراً اغوا کر کے لے گئے۔

۵۔ ان کی درازدستیاں اور دیدہ دلیریاں یہاں تک بڑھ گئی تھیں کہ انہوں نے مغلیہ سلطنت کے دشمن شاہ ارکان کو گولہ بارود مہیا کرنے سے بھی باک نہیں کیا تھا۔

۶۔ پرتگیزوں نے ڈھاکہ کے ایک نواحی قصبہ کو تاخت و تاراج کر کے لوٹ لیا جس میں قصبہ کی مستورات کی عزت و عصمت بھی محفوظ نہ رہی۔

شاہجہان نے ان کی چیرہ دستیوں کا فوری انسداد ضروری تصور کرتے ہوئے ۱۶۳۲ء میں بنگال کے صوبیدار قاسم خاں کو پرتگیزوں کی گوشمالی پر مامور کیا جس نے ہگلی کا محاصرہ کر لیا جو تین ماہ جاری رہا۔ پرتگیزوں نے مدافعت کی سکت نہ پا کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر مغلیہ فوجوں نے برق رفتاری سے ان کا تعاقب کیا۔ نتیجۃً سراسیمگی کی حالت میں بھاگتے ہوئے بہت سے پرتگیزی دریائے ہگلی کی طوفانی لہروں کی نذر ہو گئے اور جو ڈوبنے سے بچ رہے انہیں گرفتار کر کے غلام بنا لیا گیا اس فوجی

Marfat.com

میں کم و بیش دس ہزار پرتگیز ہلاک ہوئے اور چار ہزار چار سو قیدی بنے۔ اس طرح ہگلی سے پرتگیزوں کی طاقت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دی گئی۔ چونکہ پرتگیز مقامی لوگوں کو جبراً عیسائی بنا لیتے تھے اس لئے انتقاماً پرتگیزی قیدیوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی جنہوں نے بخوشی اسلام قبول کیا اور انہیں رہا کر دیا گیا اور دوسروں کے مساوی حقوق عطا کئے گئے بقیہ قیدیوں کو غلام بنا کر تقسیم کر دیا گیا۔

ممتاز محل

۱۵۹۴ء تا ۱۶۳۱ء

ممتاز محل شاہجہان کی چہیتی بیوی تھی۔ اس کا اصل نام ارجمند بانو بیگم تھا۔ آصف جاہ کی بیٹی اور نور جہاں کی بھتیجی تھی۔ ارجمند بانو بیگم حسن و جمال کا پیکر اور اعلیٰ تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ تھی۔ وہ ۱۵۹۴ء میں لاہور کے مقام پر پیدا ہوئی۔ ۱۶۰۷ء میں شہزادہ خرم (شاہجہان) سے ارجمند بانو بیگم کی نسبت طے پائی اور ۱۶۱۲ء میں ان کی شادی کی تقریبات بڑے تزک و احتشام سے منائی گئیں۔ شادی کے بعد شاہجہان نے ارجمند بانو بیگم کو ممتاز محل کے خطاب سے نوازا۔ شاہجہان کو اس سے بے پناہ محبت تھی ممتاز محل نے بھی زندگی بھر نہایت جاں نثاری اور محبت سے شاہجہان کا ساتھ دیا۔ شاہجہاں کے ہاں ممتاز محل کے بطن سے چودہ بچے پیدا ہوئے جن میں سے سات (چار لڑکے اور تین لڑکیاں) زندہ رہے جن کے نام یہ ہیں :-

۱- جہاں آرا بیگم (پیدائش ۱۶۱۴ء اجمیر) ۲- داراشکوہ (۱۶۱۵ء اجمیر) ۳- شاہ شجاع (۱۶۱۶ء اجمیر) ۴- روشن آرا بیگم (۱۶۱۷ء برہان پور) ۵- اورنگ زیب (۱۶۱۸ء دھار) ۶- مراد بخش (۱۶۲۴ء رہتاس) ۷- گوہر آرا بیگم (۱۶۳۱ء برہان پور)۔

شاہجہان نے اپنی ملکہ ممتاز محل کو تخت نشینی کے وقت ملکہ زمان کا خطاب دیا علاوہ ازیں شاہجہان نے اس کے مرتبے کو بڑھا دیا اور دس لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ شاہجہان کو اپنی ملکہ ممتاز محل پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے شاہی مہر تک ملکہ کے سپرد کر دی تھی وہ پابند صوم و صلوٰۃ اور متقی مسلمان خاتون تھی اس نے ہمیشہ بادشاہ کی خدمت، اولاد کی تربیت اور خیراتی کاموں کو اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھا۔ نور جہاں کی مانند کبھی ملکی سیاست میں مداخلت نہ کی اس کی یہی خوبی اس کی ہر دلعزیزی کا باعث بنی۔

۱۶۳۱ء میں شاہجہان دکن میں خان جہان لودھی کی سرکوبی میں مصروف تھا کہ برہان پور کے مقام پر گوہر آرا بیگم پیدا ہوئی۔ زچگی سے ممتاز محل اس قدر کمزور ہو گئی کہ اسے بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے حتیٰ کہ ۷- جون ۱۶۳۱ء کو وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئی۔ اسے برہان پور میں بطور امانت دفن کر دیا گیا۔ بعد میں علم الدین وزیر خاں بانی مسجد وزیر خاں لاہور نے اس کی نعش کو برہانپور سے لا کر آگرہ میں دفن کیا۔ ملکہ کی آخری آرامگاہ پر شاہجہان نے خالص سنگ مرمر

Marfat.com

کا ایک عظیم الشان اور یکتائے روزگار روضہ (تاج محل) تعمیر کرا کے ممتاز محل کے نام اور اپنی والہانہ محبت کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

ممتاز محل کی وفات کے بعد شاہجہان نے کوئی دوسری شادی نہیں کی بلکہ اپنی باقیماندہ ۳۵ سالہ زندگی سوگواری میں گذار دی۔ بادشاہ کو ملکہ کی وفات کا اس قدر صدمہ تھا کہ وہ سات دن تک جھروکہ درشن میں نہ آیا اور شدتِ غم کی وجہ سے دو برس کے قلیل عرصے میں اسکے تمام بال سفید ہو گئے۔

قندھار کی بازیابی ۱۶۳۸ء

ایک صدی کے زائد عرصہ سے قندھار برصغیر کی مغل حکومت اور ایران کی صفوی سلطنت کے مابین نزاع کا باعث بنا ہوا تھا۔ جہانگیر کے عہد کے آخری ایام (۱۶۲۲ء) میں ایرانیوں نے قندھار پہ قبضہ کر لیا تھا۔ شاہجہان اس کی بازیابی کے لئے بہت کوشاں تھا اور مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ شاہِ ایران سے وہی سیاسی کھیل کھیلنا چاہتا تھا جو شاہِ ایران عباس صفوی جہانگیر سے کھیل چکا تھا۔ اس نے ایرانی سفیر کے استقبال اور دکن کی مہمات پر افواج کی روانگی میں اپنی عسکری قوت اور فہم و تدبر کا بھرپور مظاہرہ کیا تاکہ ایرانی حکمران کو فوجی قوت سے مرعوب کیا جا سکے شاہجہان نے ظاہری طور پہ ایران سے دوستانہ مراسم قائم رکھے لیکن در پردہ قندھار کی بازیابی کی تگ و دو میں بھی مصروف رہا۔

شاہجہان کی تخت نشینی کے اگلے سال ایران کے عظیم بادشاہ عباس صفوی نے وفات پائی اس کا جانشین ایک نابالغ لڑکا تھا جو ترکوں کے ایران پر حملہ آور ہونے کے خطرہ کے پیش نظر قندھار کے تحفظ کی طرف زیادہ توجہ مبذول نہ کر سکا۔ اس وقت قندھار کا ایرانی گورنر علی مردان خان تھا ۱۶۳۸ء میں شاہجہان نے کابل کے گورنر سعید خاں کی وساطت سے علی مردان خاں سے ساز باز کرنا چاہی مگر علی مردان خاں آمادہ نہ ہوا اس پہ شاہجہان نے فوجی قوت کے بل بوتے پہ قندھار پہ قبضہ کرنے کی ٹھانی اور زور شور سے حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ علی مردان خاں کو مغل بادشاہ کی تیاریوں کا علم ہوا تو اس نے بھی اپنی دفاعی پوزیشن کو مستحکم کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی اس نے شاہ ایران سے مزید فوجی امداد کی درخواست کی۔ مگر شاہِ ایران جو پہلے ہی اس سے بدظن تھا اس کی درخواست سے یہ سمجھا کہ مغل حملے کا خطرہ ایک بہانہ ہے اصل میں وہ اپنی قوت میں اضافہ اور ذاتی اقتدار کے لئے یہ چال چل رہا ہے۔ چنانچہ شاہِ ایران نے فوجی امداد بھیجنے کی بجائے اپنے امراء کے مشورے پہ علی مردان خاں سے آمد و خرچ کا حساب کتاب مانگا۔ نیز اسے دربار میں طلب کر کے گرفتار اور اقتدار سے محروم کرنے کی کوشش کی۔ شاہِ ایران کے اس غیر متوقع ناروا سلوک پہ علی مردان خاں بدظن ہو گیا اور مغل شہنشاہ کی پناہ لینے پہ مجبور ہو گیا۔ اس نے سعید خاں گورنر کابل سے نامہ و پیام کر کے قلعہ قندھار مغلوں کے حوالے کر دیا اور خود شاہجہان کی ملازمت اختیار کر لی۔ آگرہ میں شاہجہان نے

Marfat.com

اس کا شاہانہ استقبال کیا اور خوش ہو کر اسے خلعتِ فاخرہ اور ہفت ہزاری منصب سے نوازا۔ علاوہ ازیں اسے پنجاب اور کشمیر کا صوبیدار متعین کیا۔

وسط ایشیائی پالیسی

وسط ایشیا تیموریوں کا وطن تھا۔ اسی خطۂ ارض میں تیمور کا پایہ تخت سمرقند واقع تھا۔ گو مغلوں نے برصغیر پاک و ہند میں عظیم مغلیہ سلطنت قائم کر لی تھی۔ مگر وہ اپنی خاندانی میراث وسط ایشیا کو دل سے نہ بھلا سکے تھے۔ بابر نے کئی بار سمرقند کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کے جانشین مناسب موقع میسر نہ آنے کی وجہ سے اس خواہش کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ فاتحانہ شہرت کا مالک ہونے کی حیثیت سے شاہجہان کے دل میں بیرونی فتوحات یعنی وسط ایشیا کی تسخیر کی امنگ پیدا ہوئی۔

بابر کے زمانے سے ہی وسط ایشیا پر ازبک حکمران تھے۔ شاہجہان کے عہد میں سمرقند و بخارا پر امام قلی کی حکومت تھی اور بلخ و بدخشاں پر اس کا چھوٹا بھائی نذر محمد حکمران تھا۔ ۱۶۲۹ء میں نذر محمد نے کابل پر حملہ آور ہو کر اس کے اہم درہ بامیان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن بعد ازاں شاہجہان کی فوجی قوت اور عسکری صلاحیت سے متاثر ہو کر نہ صرف مغل بادشاہ سے معافی مانگ لی بلکہ اپنی فوجیں بھی بھیجے ہٹا لیں۔ اس سے شاہجہان اور ازبکوں کے تعلقات خوشگوار ہو گئے۔ تیس سال کامیاب حکومت کرنے کے بعد امام قلی کی پسپائی جاتی رہی۔ اس پر ۱۶۴۲ء میں اس کے بھائی نذر محمد نے سارے وسط ایشیا پر قبضہ کر لیا۔ نذر محمد ایک غیر مقبول بادشاہ تھا۔ چنانچہ ۱۶۴۵ء میں عوام نے اس کے خلاف بغاوت برپا کر دی اور فوج نے اس کے لڑکے عبدالعزیز کو بادشاہ تسلیم کر لیا اس پر نذر محمد اور اس کے بیٹے عبدالعزیز کے مابین حصول اقتدار کی کشمکش کا آغاز ہوا اور نذر محمد نے مغل شہنشاہ شاہجہان سے فوجی امداد کی درخواست کی۔ مغل شہنشاہ کے لئے وسط ایشیا پر قبضہ کرنے کی خواہش کی تکمیل کا یہ سنہری موقع تھا چنانچہ شاہجہان نے فوراً بظاہر نذر محمد کی امداد کے طور پر مگر در اصل وسط ایشیا کی تسخیر کے لئے مغلیہ فوج روانہ کر دی۔

بلخ کی پہلی مہم ۱۶۴۶ء

۱۶۴۶ء میں شاہجہان نے ازبک حکمرانوں کے باہمی تنازعوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلخ اور بدخشاں کے اہم شہروں کی تسخیر کے لئے پچاس ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ فوج شہزادہ مراد اور علی مردان خاں کی زیر قیادت روانہ کی۔ نذر محمد حاکم بلخ و بدخشاں نے شاہجہان سے اپنے بیٹے عبدالعزیز کے خلاف فوجی امداد طلب کی تھی لہٰذا مغلیہ فوج نے پہلے نذر محمد کی امداد کی لیکن بعد ازاں اس فوج نے بخارا اور سمرقند پر قبضہ کرنے کی غرض سے نذر محمد کو شوارگھان کے مقام پر شکست دی جس سے وہ ایران بھاگ گیا اور بلخ و بدخشاں کے علاقے مغلوں کے تسلط میں آ گئے۔ اس کامیابی کی

Marfat.com

سے شاہجہان بہت خوش ہوا لیکن ایران کے صفوی بادشاہ عباس ثانی نے ان حالات کے پیش نظر نذر محمد کی امداد کا اعلان کر دیا۔ اس طرح وسط ایشیا کی تسخیر شاہجہان کے لئے ایک کڑوا نوالہ بن گئی۔ شہزادہ مراد جو نہایت تساہل پسند اور آرام طلب تھا جنگ سے اکتا گیا اور بادشاہ کی اجازت کے بغیر ہی بدخشاں سے واپس برصغیر لوٹ آیا۔ ادھر مغل فوج مصائب میں گھر گئی۔ وسط ایشیا کی شدید سردی ان کے لئے قطعی ناقابل برداشت تھی نیز ازبک قبائل نے مغل فوج کو قزاقانہ طریق جنگ سے خوب تنگ کیا۔ اس پر شاہجہان نے علامی سعداللہ خاں چغتائی کو فوری طور پر بلخ روانہ کیا جس نے حالات کو سدھارنے کے لئے مناسب انتظامات کئے اور اہم ناکوں پر فوجی دستے تعینات کئے تاکہ ازبک گوریلوں کے حملوں کا سدباب ہو سکے۔

بلخ کی دوسری مہم ۱۶۴۷ء

شاہجہان نے اپنے عظیم مقصد کے حصول کے لئے اگلے سال ۱۶۴۷ء میں اورنگ زیب کو بلخ کی مہم پر روانہ کیا اور خود بھی اس کی راہنمائی کیلئے کابل پہنچ گیا اور اورنگ زیب کو شروع میں متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ مغل فوج کی تعداد پچیس ہزار تھی مگر وہ مستحکم مقامات پر بٹی ہوئی تھی نیز وسط ایشیا کے جغرافیائی حالات ایسے تھے کہ ناواقفیت کی بنا پر مغل فوج ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی مزید برآں ازبکوں نے قزاقانہ طریق جنگ اختیار کر رکھا تھا جس کے باعث مغل فوج خاصی پریشان تھی ان حالات کے باوجود اورنگ زیب نے ازبکوں کو بری طرح شکست دی اور بلخ میں تانخانہ داخل ہوا بعدازاں عبدالعزیز شاہ بخارا کی گوشمالی کے لئے آگے بڑھا جو ایک عظیم لشکر کی معیت میں مقابلہ پر آیا۔ اس جنگ کے دوران جبکہ ہر طرف سے دشمن کی فوجیں مغلیہ فوج پر تیر برسا رہی تھیں اور گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا، نماز ظہر کا وقت آگیا اورنگ زیب گھوڑے سے بکمال متانت اترا نماز کی صف تمام کی اور سکون و اطمینان کے ساتھ فرائض و نوافل کی ادائیگی میں مصروف ہو گیا۔ عبدالعزیز خاں شاہ بخارا یہ عجیب و انگیز سماں دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ بقول مستعد خاں مصنف "مآثر عالمگیری" پکار اٹھا کہ "ایسے شخص سے لڑنا تقدیر سے لڑنا ہے"۔ تاہم اس لڑائی میں اورنگ زیب فتحیاب ہوا اور شاہ بخارا نے صلح کی درخواست کی۔ نذر محمد نے بھی ایرانی فوجی امداد سے بلخ کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ بعدازاں اس نے شاہجہاں سے درخواست کی کہ بدخشاں اسے واپس دیدیا جائے۔ دریں اثنا شاہجہان کو بھی احساس ہو چکا تھا کہ وسط ایشیا کی تسخیر اور اس پر قابض رہنا امر دشوار ہے۔ چنانچہ شاہجہان نے نذر محمد کی درخواست پر بدخشاں اسے دیدیا۔ نیز مغل فوج نے بھی ماوراء النہر کی آب و ہوا کو ناقابل برداشت پا کر وہاں رہنے سے انکار کر دیا چنانچہ اکتوبر ۱۶۴۷ء میں بلخ بھی ان کے حوالے کر دیا گیا اور مغلیہ فوج کو واپسی کا حکم ہوا۔ واپسی میں قبائلیوں کے ناگہانی

Marfat.com

حملوں، دشوار گذار راستوں اور برفباری کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔

تنقیدی جائزہ

شاہجہان کی وسط ایشیائی پالیسی بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ اگرچہ مغل افواج نے مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور نہایت بے جگری سے ازبکوں سے جنگ اور فتوحات حاصل کیں لیکن مغلیہ سلطنت سے مفتوحہ علاقوں کا الحاق کسی طور پر ممکن نہ ہو سکا۔ کیونکہ نہ صرف مقامی آبادی مغلوں کی مخالفت پر اتر کھڑی ہوئی بلکہ سرحدی قبائل نے بھی اپنی قزاقانہ کارروائیوں سے ان کو زک پہنچائی۔ نیز وسط ایشیا کی آب و ہوا بھی مغلوں کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ جس سے انہوں نے وہاں ٹھہرنے سے انکار کر دیا۔ مزید برآں وسط ایشیا کے جغرافیائی حالات بھی مغلوں کے لئے مصائب کا باعث ثابت ہوئے۔ ازبک جغرافیائی حالات سے واقفیت کی بنا پر پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے اور مغلیہ فوج کی نقل و حرکت اور رسد کی فراہمی میں مانع ہوتے تھے شاہجہان نے طاقت کے نشہ میں مسحور ہو کر وسط ایشیا کی تسخیر کا حسین و جمیل خواب دیکھا تھا لیکن متذکرہ بالا مشکلات کے باعث شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

"ان جنگوں پر صرف دو سال کی مدت میں شاہجہان نے چار کروڑ روپیہ صرف کیا جبکہ مفتوحہ علاقوں سے صرف ڈھائی لاکھ روپیہ بطور مالیہ وصول ہوا۔ میدان جنگ میں پانچسو سپاہیوں کی ہلاکت کا نقصان، اس پر مستزاد تھا۔ نیز دوران واپسی کم و بیش پانچ ہزار مغل سپاہی موسم کی شدت اور قبائلیوں کے حملوں کا نشانہ ہو گئے۔ اس قدر مالی اور جانی نقصان کے باوجود مغل حکومت کے وقار میں کوئی اضافہ نہ ہوا نہ مغل سلطنت وسعت پذیر ہوئی۔ کسی حکمران سے بھی دوستانہ تعلقات استوار نہ ہو سکے اور نہ ہی بلخ کے تخت پر کوئی حلیف حکمران متمکن ہوا اس کے برعکس بلخ اور دیگر تعلقوں میں جمع پانچ لاکھ روپیہ مالیت کی گندم اور رسد کے ذخائر سے ہاتھ دھونے پڑے۔ نذر نذرانہ کے بڑے لڑکے کو ۵۰ ہزار اور اس کے سفیروں کو ساڑھے ۲۲ ہزار روپیہ نقد بطور تحفہ دینے پڑے۔ یہ تھی وہ بھاری قیمت جس کا بوجھ شاہجہان کی وسعت پسندانہ پالیسی کی وجہ سے برصغیر کو اٹھانا پڑا۔"[1]

مسئلہ قندھار

۱۶۳۸ء میں قندھار کے ایرانی گورنر علی مردان خان نے شاہ ایران کے ناروا سلوک سے تنگ آ کر قلعہ قندھار مغل بادشاہ شاہجہان کے حوالے کر دیا تھا (تفصیل پہلے آ چکی ہے) ایرانی قندھار کے اس نقصان کو فراموش نہ کر سکے وسط ایشیا میں مغل افواج کی ناکامی سے ان کی ہمت بڑھ گئی چنانچہ شاہ عباس ثانی (۱۶۴۲ء تا ۱۶۶۷ء) نے قندھار کی بازیافتگی کے لئے قسمت آزمائی کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس نے اہم سرحدی مقامات پر رسد

---

[1] "اورنگ زیب" از جادو ناتھ سرکار جلد اول ایڈیشن سوم صفحہ ۹۹ — ۱۰۰

Marfat.com

کی فراہمی اور دفاعی پوزیشن کو مزید مستحکم بنانا شروع کر دیا۔ ۱۶۴۸ء میں ایرانی فوج نے خراسان کی جانب سے پیش قدمی کر کے قندھار کے نواحی فوجی مرکز بست (BIST) کا محاصرہ کر لیا۔ ایرانیوں کی پیشقدمی کی خبر شاہجہان کو ہوئی تو اس نے شہزادہ اورنگ زیب کو قندھار کی حفاظت کا حکم دیا اس اثنا میں ۶ دسمبر ۱۶۴۸ء کو ایرانی افواج نے بست کو فتح کر کے قندھار کا محاصرہ کر لیا۔ قندھار کا مغل قلعہ دار دولت خاں ایک کمزور طبع انسان تھا۔ اس نے بڑی بے دلی سے قلعہ کا دفاع کیا۔ انجام کار حوصلہ ہار کر اور برصغیر سے امداد کی امید نہ پا کر اس نے ہتھیار ڈال دیئے اس طرح ۵۷ دن کے محاصرہ کے بعد ۱۱ فروری ۱۶۴۹ء کو قندھار پر دوبارہ ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا۔

قندھار کی پہلی مہم
۱۶۴۹ء

اس ہزیمت سے شاہجہان کو سخت قلق ہوا۔ اس نے ساٹھ ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ فوج کے ساتھ اورنگ زیب اور وزیر غلامی سعد اللہ خان چلیپوئی کو قندھار کی باریابی کی مہم پر مامور کیا اس فوج نے کابل اور غزنی کے راستے قندھار پہنچ کر ۱۶ مئی ۱۶۴۹ء کو قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس مہم کی نگرانی اور فوج کی حوصلہ افزائی کے لئے بادشاہ بذات خود بھی کابل پہنچ گیا۔ لیکن ایرانیوں کی مضبوط مورچہ بندی اور اعلیٰ عسکری مہارت کے مظاہرہ کی وجہ سے قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ چنانچہ موسم سرما کی آمد کے پیش نظر ساڑھے تین ماہ بعد ستمبر ۱۶۴۹ء میں مغل فوج بادشاہ کے حکم پر محاصرہ اٹھا کر واپس آ گئی۔

قندھار کی دوسری مہم
۱۶۵۲ء

تین سال کی متواتر تیاری کے بعد ۱۶۵۲ء میں شاہجہان نے قندھار کی فتح کا ایک بار پھر عزم کیا قندھار کی اس دوسری مہم پر شہزادہ اورنگ زیب اور علامی سعد اللہ خاں کو ہی مامور کیا گیا۔ شاہجہان نے مہم کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے پچاس ہزار سوار، دس ہزار پیادہ فوج تیس ہزار بڑی اور بیس ہزار چھوٹی توپوں کے علاوہ متعدد جنگی ہاتھیوں اور اونٹوں پر مشتمل مضبوط فوج روانہ کی۔ دو کروڑ روپیہ بھی ضروری اخراجات کے لئے شہزادہ کے سپرد کیا۔ علاوہ ازیں بادشاہ بذات خود بھی پچاس ہزار فوج کے ہمراہ کابل میں قیام پذیر ہوا تاکہ بوقت ضرورت مزید کمک روانہ کر سکے۔

۲۲ مئی ۱۶۵۲ء کو محاصرہ کا آغاز ہوا اور دو ماہ دس دن تک جاری رہا۔ سر توڑ کوشش کے باوجود ایرانیوں کی اعلیٰ توپوں کے سامنے مغلوں کی بہادری بے بس ہو کر رہ گئی۔ قندھار اور کابل کے درمیان واقع غزنی پر ازبکوں کے امکانی حملوں اور ازبکوں کے ایرانیوں سے مل جانے کے اندیشہ کے پیش نظر شاہجہان نے اورنگ زیب کو محاصرہ اٹھا کر واپسی کا حکم دیا۔ شہزادہ نے بادشاہ سے مزید مہلت کی درخواست کی۔ لیکن بادشاہ کے انکار پر اورنگ زیب نے محاصرہ اٹھا لیا اور اپنے نئے عہدے نیابت دکن پر روانہ ہو گیا۔

Marfat.com

قندھار کی تیسری مہم ۱۶۵۳ء

فروری ۱۶۵۳ء میں شاہجہان نے قندھار کی بازیافتگی کی مہم شہزادہ دارا شکوہ کے سپرد کی۔ چونکہ دارا شکوہ اورنگ زیب کی جنگی مہارت اور فوج میں اس کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے اس سے حسد کرتا تھا اس لئے قندھار کی مہم سر کرنے کے لئے بادشاہ کو اپنی خدمات کی پیش کش کی۔ وہ اورنگ زیب کی ناکامی پر بہت خوش تھا اس نے اپنے فہم و تدبر کی بڑھانکتے ہوئے بادشاہ کو ایک ہفتہ کے اندر قندھار کی فتح کا یقین دلایا اس کی اس پر اعتماد پیش کش اور یقین دہانی سے خوش ہو کر بادشاہ نے دارا شکوہ کو "شاہ بلند اقبال" کے خطاب سے نواز کر اسے ایک عظیم الشان مغل فوج کی معیت میں روانہ کیا جو ستر ہزار سواروں، پانچ ہزار پیادہ، ساٹھ ہزار بڑی توپوں اور دس ہزار زنبوروں پر مشتمل تھی۔

دارا شکوہ نے سب سے پہلے قندھار کے نواحی علاقہ بست اور گرشک پر قبضہ کیا تاکہ ایرانیوں کو مزید رسد اور کمک نہ پہنچ سکے۔ بعد ازاں ۲۳ اپریل ۱۶۵۳ء کو قندھار کا محاصرہ کیا جو پانچ ماہ سے زائد عرصہ تک جاری رہا۔ قلعہ کی فصیل کو خاصا نقصان پہنچانے کے باوجود مغل فوج ایرانیوں کی بھاری گولہ باری کے باعث قلعہ میں داخل ہونے میں ناکام رہی یہاں تک کہ موسم سرما کی آمد، رسد کی قلت، گولہ بارود کی کمی اور سرحدی قبائل کی شورش کی وجہ سے دارا کو اکتوبر ۱۶۵۳ء کے اوائل میں محاصرہ اٹھانا پڑا اور یہ مہم بھی ناکام ثابت ہوئی۔

نتائج: قندھار کی تسخیر کے لئے تین مہمیں (۱۶۴۹ء، ۱۶۵۲ء اور ۱۶۵۳ء) بھیجی گئیں لیکن قندھار کی بازیافتگی ممکن نہ ہو سکی اور تینوں مہمیں بری طرح ناکام ہوئیں اور قندھار مغلوں کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ ان مہمات پر کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ ہزاروں مغل سپاہی ہلاک ہوئے۔ مغل حکومت کے وقار کو ناقابل تلافی زک پہنچی اور دنیا پر اس کی عسکری اور سیاسی عظمت کا پول کھل گیا۔ اس عظیم کامیابی نے ایرانیوں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ طویل عرصہ تک برصغیر کی حکومتوں پر ایرانیوں کی عسکری قوت کا دبدبہ طاری رہا اور شمال مغربی سرحد پر ایرانی حملہ کا خدشہ ایک گھمبیر بادل کی طرح منڈلاتا رہا جو ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ والی ایران اور بعد ازاں احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی صورت میں حقیقی شکل میں نمودار ہوا۔

شاہجہان کی دکن پالیسی

شاہجہان نے تخت نشین ہو کر دکن میں اپنے باپ دادا کی توسیع پسندانہ پالیسی کو جاری رکھا۔ دکن میں مغلوں کی پیش قدمی کا آغاز اکبر کے عہد میں ہوا تھا مگر اب تک صرف خاندیش، برار اور احمد نگر کے بعض حصے مغلوں کے تسلط میں آئے تھے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں مغلیہ حکومت کی باجگذار

Marfat.com

ہونے کے باوجود ابھی تک مکمل طور پر آزاد نہیں۔ احمد نگر کے بیشتر حصے پر مرتضےٰ نظام شاہ کی حکومت تھی جس کے وزیر ملک عنبر نے جہانگیر کے دورِ حکومت میں مغلوں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا تھا۔

جب شاہجہان تخت شاہی پر متمکن ہوا تو دکن کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ دکن کے حکمرانوں نے کئی ایک علاقے دبا لئے تھے۔ اور در پردہ مغلوں کے خلاف مرہٹوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ نیز وہ اپنے ہم عقیدہ شاہ ایران کو اپنا محافظ سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں دکن کے مغل صوبیدار خان جہاں لودھی نے بالاگھاٹ کا مغل علاقہ نظام شاہ کے ہاتھ فروخت کر کے در پردہ اس سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ شاہجہاں جو عہدِ شہزادگی ہی سے دکنی ریاست سے خاصی واقفیت رکھتا تھا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے سرکش حکمرانوں کی سرکوبی کرنے اور دکن میں مغلیہ وقار بحال کرنے کا خواہاں تھا اور مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ اسی اثنا میں خان جہاں لودھی نے بغاوت برپا کر دی اور نظام شاہ کے دربار میں پناہ گزیں ہو گیا چنانچہ یہ واقعہ دکن پر فوج کشی کا فوری سبب بن گیا۔ شاہجہان بذات خود فوجی کارروائی کی نگرانی کے لئے فوج کے ساتھ دکن کی جانب روانہ ہوا اور برہان پور میں قیام پذیر ہوا۔

احمد نگر کی تسخیر ۱۶۳۳ء

احمد نگر کا لائق وزیر ملک عنبر فوت ہو چکا تھا اب اس کا لڑکا فتح خان نظام شاہ کا وزیر تھا وہ جاہ پرست اور خود غرض واقع ہوا تھا اس لئے بدانتظامی کے باعث ریاست میں ہر طرف افراتفری اور بدنظمی کا دور ہو گیا۔ اس نے مرتضیٰ نظام شاہ کو قید کر دیا اور بعد ازاں مغل وزیر آصف جاہ کے ایما پر اسے قتل بھی کروا دیا۔ اور نظام شاہی تخت پر اس کے دس سالہ بیٹے حسین شاہ کو بٹھلا دیا نیز اقتدار اعلےٰ کے حصول کیلئے در پردہ جوڑ توڑ کرتا رہا۔ ۱۶۳۰ء میں ریاست شدید قحط کی لپیٹ میں آنے کے باعث ریاست کی حالت سخت خراب ہو گئی۔ ان حالات کے پیش نظر شہ بیجاپور اور شاہ جی مرہٹہ نے مل کر نظام شاہی پایہ تخت دولت آباد پر حملہ کر دیا۔ فتح خاں نے دکن کے مغل صوبیدار مہابت خاں سے امداد کی درخواست کی اور اس امداد کے عوض دولت آباد کا شہر اس کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا۔ اس پیش کش پر مہابت خاں نے پوری طاقت سے حملہ آور فوج کو پسپا کر دیا۔ ازاں بعد فتح خاں کی نیت بدل گئی اور اس نے بیجاپوری فوج کے سپہ سالار ان دلاور خاں سے بھاری رشوت لے کر دولت آباد کا قلعہ مہابت خاں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اس پر ۱۶۳۳ء میں مہابت خاں نے قلعہ دولت آباد کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور نظام شاہی خاندان کے آخری بادشاہ حسین نظام شاہ کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا۔ فتح خاں کو پٹنہ و دیگر لاہور میں رہنے کی اجازت عطا کی گئی اس طرح ریاست احمد نگر کا باقاعدہ طور پر مغلیہ سلطنت کے ساتھ الحاق کر لیا گیا۔ شاہ جی مرہٹہ نے ۱۶۳۶ء میں نظام شاہی خاندان کے ایک فرد کو تخت نشین کر کے کٹھ پتلی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن مغلیہ طاقت کے مقابلے

Marfat.com

پراسے منہ کی کھانی پڑی۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کی اطاعت

۱۶۳۶ء

بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمرانوں نے احمد نگر کے دگرگوں حالات اور خان جہاں لودھی کی بغاوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد نگر کے بیشتر علاقوں پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ حکومت بیجاپور نے مرہٹہ سردار شاہ جی کو اپنی ملازمت میں لے کر اور اس کے ساز شی گٹھ جوڑ سے دولت آباد پر قبضہ کرنے کی کوشش کر کے شاہجہان کو مشتعل کر دیا۔ نیز ریاست گولکنڈہ اور بیجاپور کے فرمانرواؤں کے خلاف شاہجہان کے اشتعال کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مغل حکومت کے خلاف مرہٹوں اور مغلیہ سلطنت کے باغیوں کو امداد دے رہے تھے۔ علاوہ ازیں دونوں ریاستوں کی افواج مغلیہ علاقوں کو بھی تاخت و تاراج کرتی رہتی تھیں۔ ان حالات کے پیش نظر گولکنڈہ اور بیجاپور کے سلاطین کی قرار واقعی گوشمالی کیلئے ۱۶۳۶ء میں شاہجہان دوبارہ برہان پور آیا۔

برہان پور سے شاہجہان نے سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں میں سفیر بھیج کر انہیں مغلیہ سیادت قبول کرنے کی دعوت دی۔ نیز مرہٹہ سردار شاہ جی سے قطع تعلق کر لینے کا حکم دیا۔ مزید برآں انہیں اس امر سے بھی آگاہ کیا کہ انکار کی صورت میں ان کے خلاف سخت فوجی کارروائی کی جائے گی۔ اس پر عبداللہ قطب شاہ والئے گولکنڈہ نے نہ صرف مغلیہ سیادت قبول کر لی بلکہ دو لاکھ ہون (طلائی سکہ) سالانہ خراج ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ علاوہ ازیں خطبہ اور سکہ میں شاہِ ایران کا نام ہٹا کر مغل بادشاہ شاہجہان اور خلفائے راشدین کے نام شامل کر کے کامل اطاعت گذاری کا یقین دلایا۔ لیکن محمد عادل شاہ والئے بیجاپور نے مغلیہ سیادت قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس پر شاہی افواج نے تین اطراف سے خان جہان، خان زمان اور خانِ دوران کی قیادت میں بیجاپور پر ہلہ بول دیا۔ اس سہ طرفہ بھرپور حملہ سے ریاست میں تباہی مچ گئی۔ بالآخر محمد عادل شاہ نے مجبور ہو کر ۱۶۳۶ء میں صلح کی درخواست کی اور مغل بادشاہ کی تمام شرائط کو تسلیم کرتے ہوئے مغلیہ سیادت قبول کر لی۔ نیز بیس لاکھ سالانہ باج ادا کرنا بھی منظور کر لیا۔ ساتھ ہی اس نے گولکنڈہ سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے اور اس کی سرحدوں کا احترام کرنے کا وعدہ کیا۔ نیز شاہ جی مرہٹہ سے دوستانہ تعلقات بھی قطع کر لئے اور وعدہ کیا کہ اگر شاہ جی مرہٹہ نے مغل بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کی تو وہ نہ صرف اسے ملازمت میں نہیں رکھے گا بلکہ اس کے خلاف ہر مغل اقدام کی حمایت بھی کرے گا۔ شاہجہان نے مفتوحہ ریاست احمد نگر کا کچھ علاقہ بیجاپور کو عطا کیا۔

دکنی مہم کو کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچانے اور ۱۴ جولائی ۱۶۳۶ء کو شہزادہ اورنگ زیب کو دکن کا سوبیدار مقرر کر کے شاہجہان واپس آگرہ آ گیا۔

Marfat.com

"اس طرح بالآخر چالیس سالہ (۱۵۹۵ تا ۱۶۳۶ء) پرانا دکنی قضیہ طے ہوا۔ بادشاہی وقار بلند ہوا۔ سلطنت کی حدود وسعت پذیر ہوئیں اور جنوبی دکن کی ریاستیں مغلیہ اقتدار کے زیر نگیں ہو گئیں۔" [1]

اورنگ زیب کی نیابتِ دکن

پہلا تقرر: ۱۶۳۶ء

۱۶۳۶ء میں جب شاہجہان نے شہزادہ اورنگ زیب کو نیابت دکن پر مامور کیا اس وقت اورنگ زیب اپنی عمر کے اٹھارہویں سال میں تھا یہ ایک بہت بڑی اور اہم ذمہ داری تھی۔ اس وقت دکن میں مغلیہ سلطنت خاندیش، برار، تلنگانہ اور دولت آباد کے چار صوبوں پر مشتمل تھی۔ اس میں کل چوراسی قلعے تھے۔ اس سارے علاقے سے پانچ کروڑ روپیہ سالانہ لگانِ مالیہ وصول ہوتا تھا۔ تاہم اورنگ زیب نے نوعمری کے باوجود غیر معمولی فراست اور انتظامی صلاحیت کا ثبوت دے کر اس ذمہ داری کو بطریق احسن پورا کیا۔ اس نے مرہٹہ سردار شاہوجی کو پے در پے شکستیں دیکر اسے سپر ڈالنے اور مغلیہ اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ نیز اس کے قلعے بھی چھین لئے۔ علاوہ ازیں اس نے بگلانہ کا علاقہ فتح کر کے وہاں کے ہندو راجہ کو شاہی ملازمت میں لے لیا اور اسے سہ ہزاری کا منصب عطا کیا۔

۱۶۴۴ء میں اورنگ زیب اپنی بڑی بہن جہاں آرا بیگم کی عیادت کے لئے آگرہ پہنچا، جو کپڑوں میں آگ لگنے کے باعث بری طرح جھلس گئی تھی۔ ابھی اورنگ زیب کو آگرہ آئے ہوئے تین ہفتے ہی گذرے تھے کہ اس نے نیابتِ دکن سے استعفیٰ دیدیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ دارا شکوہ حسد کی بنا پر اس کی ہر تجویز کی مخالفت کر کے دکن کے داخلی معاملات میں مداخلت کرتا تھا اور اس کے خلاف شاہجہان کے کان بھر کر دکن کے انتظامی امور و معاملات میں رخنہ اندازی کا موجب بنتا تھا دارا شکوہ کے اس حاسدانہ رویہ کے علاوہ شاہجہان بھی ہر موقعہ اور ہر معاملہ میں دارا شکوہ کی حمایت کرتا تھا۔ فروری ۱۶۴۵ء میں اسے گجرات کا گورنر مقرر کیا گیا جہاں وہ ۱۶۴۷ء تک مامور رہا۔ اس کے بعد اسے وسط ایشیا کی مہم پر متعین کیا گیا۔

دوسرا تقرر ۱۶۵۳ء

۱۶۵۳ء میں اورنگ زیب کو دوسری بار دکن کی نیابت پر مقرر کیا گیا۔ ان دنوں دکن کی حالت بہت ناگفتہ بہ تھی۔ مسلسل جنگوں کی

---

[1] جادوناتھ سرکار "اورنگ زیب"

Marfat.com

وجہ سے ہر طرف بدنظمی اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت بالکل تباہ و برباد ہو کر رہ گئی تھی۔ کاشتکار طبقہ تباہ حال اور غربت کا شکار تھا۔ نظم و نسق درہم برہم تھا اور رشوت ستانی عام تھی۔ حکومت کی آمدنی اس حد تک کم ہو گئی تھی کہ باوجودیکہ مالگذاری کا سالانہ تخمینہ تین کروڑ ۶۴ لاکھ روپے تک تھا۔ سرکاری خزانے میں صرف ایک کروڑ روپیہ وصول ہوتا تھا۔ مالیات میں خسارہ کے باعث نہ صرف فوجی تنظیم متاثر ہوئی بلکہ ملک میں بدامنی اور اقتصادی بدحالی پھیل گئی اور اکثر و بیشتر باجگذار ریاستوں نے خراج کی ادائیگی میں پس و پیش کرنا شروع کر دیا۔

اورنگ زیب نے نظم و نسق اور امن و امان کی بحالی کے لئے انتظامی اصلاحات نافذ کیں بددیانت اور نااہل افسروں کو برطرف کر کے رشوت ستانی کا انسداد کیا دیوانی اور فوجی نظام کو از سر نو منظم کیا۔ نظام مالیہ کی اصلاح کے لئے مرشد قلی خاں کی امداد سے مالگذاری کی اصلاحات نافذ کیں۔ مرشد قلی خاں نے راجہ ٹوڈرمل کے خطوط پر مزروعہ اراضی کی پیمائش کی اور نئی جمعبندی تیار کی۔ نیز زمین کی کل پیداوار کی اوسط پر شرح مالیہ مقرر کی۔ مالیہ کی وصولی کے لئے نئے عامل اور مقدم مقرر کئے۔ دکن کا یہ بندوبست اراضی "دھارا مرشد قلی خاں" کہلاتا ہے۔ مالیہ کی تشخیص میں کاشتکار کے حالات کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ مزارعین کو تقاوی قرضے دینے کا بھی بندوبست کیا گیا تاکہ زراعت ترقی پذیر ہو۔ اورنگ زیب نے نااہل جاگیرداروں سے جاگیریں چھین لیں۔ ان پر نئے جاگیردار مقرر کئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ اور دکن میں ایک بار پھر خوشحالی کا دور دورہ شروع ہو گیا اور حکومت کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوا۔

گولکنڈہ پر حملہ ۱۶۵۶ء: ۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب نے شاہجہان کے حکم پر گولکنڈہ پر دوبارہ حملہ کر دیا۔ جس کی حسب ذیل وجوہات تھیں:۔

۱۔ عبداللہ قطب شاہ والئے گولکنڈہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مغلیہ سیادت سے منحرف ہو کر شاہِ ایران سے دوبارہ تعلقات استوار کر لئے تھے۔

۲۔ قطب شاہ نے ۱۶۳۶ء میں دو لاکھ ہون (طلائی سکہ) سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ خراج باقاعدہ ادا نہیں کرتا تھا اور ہمیشہ اس کی ادائیگی میں پس و پیش سے کام لیتا تھا جب اورنگ زیب نے خراج کے عوض چند اضلاع مغلیہ حکومت کے حوالے کرنے کی تجویز پیش کی تو اس نے اس تجویز کی بھی کوئی پرواہ نہ کی۔

۳۔ گولکنڈہ کی افواج نے کرناٹک کے تقریباً تین سو میل وسیع علاقہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا اور اس کے لئے مغل حکومت سے قطعاً کوئی اجازت نہ لی۔ بعدازاں قطب شاہ نے یہ علاقہ اپنے وزیر میر جملہ کو عطا کر دیا۔ میر جملہ ایرانی نژاد تھا اور ایک جوہری کی حیثیت سے دکن

Marfat.com

میں وارد ہوا تھا وہ اپنی خداداد قابلیت اور ذہنی استعداد کی بدولت ترقی کر کے قطب شاہ کا وزیر اور ریاست میں ایک نہایت ہی بااثر اور مقتدر شخصیت بن گیا تھا۔ اس پر قطب شاہ نے اس کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور ریاست میں اس کی غیر معمولی مقبولیت اور اثر و نفوذ سے حسد کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے میر جملہ کو قید کر کے اندھا کر ڈالنے کی سازش کی لیکن وہ فرار ہو کر کرناٹک چلا گیا۔ قطب شاہ نے اس کے بیٹے محمد امین اور اس کے خاندان کے افراد کو زنداں میں ڈال کر اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی۔ اس پر میر جملہ نے شہزادہ اورنگ زیب کے حضور حاضر ہو کر مغل بادشاہ سے امداد اور پناہ چاہی۔ اورنگ زیب پہلے ہی گولکنڈہ کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کے لئے مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ ان حالات کے تحت اس نے شاہجہان سے گولکنڈہ پر حملہ آور ہونے کی اجازت طلب کی۔ ساتھ ہی قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ سے محمد امین اور اس کے خاندان کے افراد کی رہائی کا مطالبہ کیا اور انکار کی صورت میں فوج کشی کی دھمکی دی۔

۱۶۵۶ء کے اوائل میں مغل افواج نے اورنگ زیب کے لڑکے شہزادہ محمد کی زیر قیادت حیدرآباد پر قبضہ کر لیا۔ قطب شاہ مغل حملہ کی تاب نہ لا کر گولکنڈہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ شاہی افواج نے گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا۔ اورنگ زیب بذات خود مہم کی نگرانی کر رہا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے اس کی خدمت میں قیمتی تحائف بھیجکر صلح کی گفت و شنید کرنا چاہی لیکن اورنگ زیب نے جو گولکنڈہ کے الحاق کا تہیہ کر چکا تھا، صلح کی پیشکش کو رد کر دیا۔ قطب شاہ نے اپنی بوڑھی والدہ کو اورنگ زیب کے حضور بھیجکر خطا بخشی اور معافی کی درخواست کی۔ اورنگ زیب نے قطب شاہ سے خراج کی تمام رقوم کی ادائیگی، ایک کروڑ روپیہ بطور تاوانِ جنگ اور اپنی (قطب شاہ کی) لڑکی کی شہزادہ محمد سے شادی کر دینے کی شرط پہ معافی دینے کا وعدہ کیا۔ ابھی صلح کی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ قطب شاہ کے کارندوں نے آگرہ پہنچ کر شہزادہ دارا شکوہ کی حمایت حاصل کر لی۔ دارا شکوہ کو چونکہ اپنے بھائی اورنگ زیب سے سخت عناد تھا اور وہ کسی طرح بھی اورنگ زیب کی کامیابی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس نے بادشاہ کے سامنے قطب شاہ کی بے بسی اور اورنگ زیب کی بے رحمی کی داستان اس انداز سے سنائی کہ شاہجہان نے قطب شاہ کو معافی دینے اور گولکنڈہ کا محاصرہ اٹھا لینے کا حکم صادر کر دیا۔ چنانچہ محاصرہ اٹھا لیا گیا اور قطب شاہ نے اورنگ زیب کی شرائط پر مشتمل صلحنامہ پر دستخط کئے جس کی رو سے:۔

۱۔ عبداللہ قطب شاہ نے ہمیشہ اطاعت گذار رہنے کا حلف اٹھایا۔

۲۔ سابقہ خراج کی رقوم کے علاوہ پندرہ لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کیا۔

۳۔ میر جملہ کی جاگیر بحال کی گئی اور اس کے بیٹے محمد امین کو بھی رہا کیا گیا۔

Marfat.com

۴- مغلوں کا حلیف بننا منظور کیا۔

۵- اپنی لڑکی کی شادی شہزادہ محمد سے کر دی۔

میر جملہ نے بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لی اور وزیر اعظم علوی سعد اللہ خاں چینیوٹی کی وفات کے بعد شاہجہان نے اسے شش ہزاری منصب عطا کر کے اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔

بیجاپور پر حملہ ۱۶۵۷ء

گولکنڈہ کے سلطان سے تصفیہ کرنے کے بعد اورنگ زیب نے اپنی توجہ بیجاپور کی طرف مبذول کی۔ جس پر فوج کشی کرنے کی وجوہات مندرجہ ذیل تھیں :-

۱- عادل شاہ والئے بیجاپور نے عرصہ سے خراج کی ادائیگی نہ کی تھی۔

۲- والئے بیجاپور نے شاہجہان کی اجازت کے بغیر کرناٹک پر فوج کشی کی تھی۔

۳- نومبر ۱۶۵۶ء میں محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد شاہجہان کی اجازت کے بغیر اٹھ سالہ علی عادل شاہ کو تخت نشین کیا گیا جس سے بیجاپور کا دربار سازشوں کا اڈہ بن گیا۔ کیونکہ عوام کی نگاہ میں نئے سلطان کی نسبی حیثیت مشکوک تھی اس لئے ریاست میں سخت بدامنی و انتشار پھیل گئی۔

اورنگ زیب نے ان حالات سے بادشاہ کو مطلع کیا اس پر شاہجہان نے اسے بیجاپور کے خلاف فوجی کارروائی کی اجازت دیدی۔ میر جملہ کو شہزادہ اورنگ زیب کی امداد پر مامور کیا شاہی فوج نے بیجاپور پر حملہ آور ہو کر بیدر کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ بیدر کے قلعہ دار سیدی مرجان (Sidi Merjan) نے مغل حملہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن مغل فوج نے شدید گولہ باری سے قلعہ کی فصیل کو کافی نقصان پہنچایا۔ اتفاق سے قلعہ میں آگ لگ جانے سے سیدی مرجان شدید زخمی ہو گیا اور قلعہ پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ ازاں بعد مغل افواج نے کلیانی کو بھی فتح کر لیا۔ بیدر اور کلیانی کی فتح کے بعد بیجاپور کی مکمل تسخیر کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔ مگر دربار شاہی میں اورنگ زیب کی کامیابیوں سے اس کے مخالف اور رقیب پیدا ہو گئے جن اُٹھے۔ سلطان عادل شاہ کے کارندوں دارا شکوہ کی وساطت سے بادشاہ سے لڑائی بند کرنے کا فرمان جاری کروا لیا۔ جس سے بیجاپور کی زوال پذیر ریاست مغلیہ سلطنت میں مدغم ہونے سے بچ گئی۔ آخر کار ۱۶۵۷ء کے صلحنامہ کی رو سے سلطان والئے بیجاپور نے ایک کروڑ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کیا۔ نیز کلیانی، بیدر اور پرندہ کے علاقے مغلوں کے حوالے کئے۔

نتیجہ : یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شاہجہان کے عہد حکومت میں دکن میں مغلیہ پیش قدمی خاطر کامیابی سے ہمکنار رہی جس سے مغلیہ سلطنت کی سرحدیں مضبوط ہو گئیں۔ احمد نگر کا مکمل الحاق عمل میں آیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ مغلیہ سلطنت کی باجگذار ریاستیں بن گئیں۔ اورنگ زیب نے اپنی

Marfat.com

تنظیمی اور ذہنی صلاحیتوں سے کام لیکر دکن میں گوناگوں اصلاحات نافذ کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف دکن میں نظم ونسق مستحکم اور امن وامان بحال ہوا بلکہ ذرائع صنعت وحرفت اور تجارت کو فروغ حاصل ہوا اور عوام آسودہ حال ہو گئے۔

اورنگ زیب ریاست بیجاپور اور گولکنڈہ کو فتح کر کے مغل سلطنت سے ان کے مکمل الحاق کا خواہاں تھا۔ وہ اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ لیکن شاہجہان نے داراشکوہ کے مشورہ پر عمل کر کے دکنی ریاستوں کی مکمل تسخیر کا سنہری موقع کھو دیا اور ان سے محض خراج وصول کرتے اور مغلوں کی سیادت منوانے پر ہی قناعت کی۔ دکن کی زوال پذیر ریاستوں کو باجگذار بنانے کی شاہجہانی پالیسی سلطنت مغلیہ کے لئے ناقابل تلافی نقصان کا موجب ہوئی۔ کیونکہ ابھرتی ہوئی مرہٹہ قوم کو دکنی ریاستوں کے عدم استحکام سے فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت کو مستحکم بنانے کا موقع مل گیا۔ شاہجہان کی یہ سیاسی غلطی اس کے جانشین اورنگ زیب کے لئے مسلسل ومستقل پریشانیوں کا باعث ہوئی اور اسے مرہٹوں کے استیصال کے لئے اپنے تمام فوجی ذرائع کے علاوہ اپنی زندگی کے آخری ۲۵ سال پایہ تخت سے دور دکنی مہمات کی بھینٹ چڑھانا پڑے۔

شاہجہان کے بیٹوں کے مابین جنگِ تخت نشینی

(۱۶۵۷ — ۵۸ء)

جنگ تخت نشینی سے شاہجہان کا سنہری دور بدامنی اور انتشار کا شکار رہا۔ یہ جنگ شاہجہان کی بیماری کے دوران اس کے بیٹوں کے مابین لڑی گئی۔ شاہجہان ۶ ستمبر ۱۶۵۷ء کو سخت بیمار پڑ گیا اور جب بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے اپنے چہیتے فرزند اکبر داراشکوہ کو جانشین اور نائب السلطنت مقرر کر دیا۔ جس نے اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کی غرض سے غیر دانشمندانہ اقدام کرتے ہوئے دربار میں مقیم شہزادوں کے سفیروں کی نقل وحرکت پر پابندی عائد کر دی اور دکن گجرات اور بنگال کی سمت تمام ذرائع آمد ورفت پر سنسر بٹھا دی اس سے کئی افواہوں نے جنم لیا اور شہزادوں میں قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں یعنی شاہجہان کا انتقال ہو چکا ہے اور داراشکوہ اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے درپے ہے۔ چنانچہ انہوں نے تخت کا وارث بننے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اور اپنے فوجی اور مالی ذرائع سے ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے ہوئے۔ شاہجہان کے بیٹوں کے مابین جنگ تخت نشینی بادشاہ کی زندگی میں ہی اس کی بیماری کے ایام میں لڑی گئی۔ قبل اس کے کہ جنگ تخت نشینی کے اسباب اور واقعات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے شاہجہان کے چاروں بیٹوں کی عادات وخصائل

Marfat.com

کا جائزہ ازحد ضروری ہے ان کی سیرتوں کا اجمالی جائزہ مندرجہ ذیل ہے :۔

۱۔ داراشکوہ : داراشکوہ شاہجہان کا سب سے بڑا لڑکا تھا اس کی عمر ۴۲ سال تھی۔ اگرچہ وہ پنجاب کا گورنر تھا مگر باپ کا منظور نظر ہونے کی وجہ سے عموماً اپنے باپ کے پاس دارالسلطنت آگرہ میں رہتا تھا اسے باپ کی جانب سے شصت ہزاری کا فقید المثال منصب اور شاہِ بلند اقبال کا خطاب بھی مل چکا تھا۔ نیز جہاں آرا بیگم المعروف بہ بیگم صاحبہ کی حمایت بھی اسے حاصل تھی۔ وہ مذہبی اعتبار سے آزاد خیال اور اکبر کے نظریات کا حامی تھا وہ ملّا شاہ بدخشی کا مرید تھا۔ اگرچہ اسے میاں میر لاہوری سے بھی بہت عقیدت تھی مگر مجذوب سرمد اور جوگی لال داس کا بڑا معتقد تھا۔ اپنی آزاد خیالی کے سخت وہ ہندو مت، اسلام اور عیسائیت میں کوئی فرق نہیں سمجھتا تھا۔ عہد اکبری کے مذہبی اعتقادات کے احیار کا پرجوش خواہشمند تھا وہ خود سر اور مغرور تھا اور دوسروں کی رائے قبول کرنے کا قطعی حامی نہ تھا۔

داراشکوہ اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ تھا۔ عربی فارسی اور ہندی پر اسے پورا عبور حاصل تھا۔ اس نے مسلم صوفیا کی سوانح حیات پر مشتمل بلند علمی معیار کی حامل دو کتابیں 'سفینۃ الاولیاء' اور 'سکینۃ الاولیا' لکھیں۔ ان کے علاوہ مجمع البحرین بھی تحریر کی۔ جس میں اسلامی تصوف اور ہندو ویدانت کو ایک ہی چیز ثابت کیا۔ اس نے اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا جس کا نام "سرِ اکبر" رکھا۔ اس کتاب میں اس نے اپنشدوں کو قرآن مجید کا ماخذ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ان مذہبی خیالات کو دربار کے سنی امرا سخت ناپسند کرتے تھے اور اس کی تخت نشینی کو اسلام کیلئے نقصان دہ سمجھتے تھے۔

داراشکوہ گو گرم مزاج، فیاض اور ذہین شہزادہ تھا۔ لیکن تنظیمی صلاحیتوں سے عاری، عسکری قابلیت سے بے بہرہ اور انتہا درجہ کا کوتاہ بین تھا وہ پہلے درجے کا خوشامد پسند اور مغرور تھا۔ ڈاکٹر برنیر داراشکوہ کا قریبی دوست تھا وہ اس کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :

> "داراشکوہ بڑا خود پسند اور خود رائے تھا اس کو یہ گھمنڈ تھا کہ وہ اپنی عقلمندی اور خوش تدبیری سے ہر امر کا بندوبست کر سکتا ہے اور کوئی فرد و بشر ایسا نہیں جو اسے صلاح و مشورہ دے سکے۔ وہ اپنے حاشیہ نشینوں اور صلاح کاروں سے بڑی نخوت و اہانت سے پیش آتا تھا وہ ڈرانے دھمکانے میں بڑا تیز تھا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے امرار کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتا اور ان کی تذلیل کر دیتا تھا۔"

۲۔ شاہ شجاع : شاہجہان کا دوسرا بیٹا شاہ شجاع بنگال کا گورنر تھا تخت نشینی کی جنگ کے وقت اس کی عمر ۴۱ برس کی تھی وہ نہایت سمجھدار، سیر چشم، مستقل مزاج اور بہادر تھا مگر حد سے زیادہ تساہل پسند، رقص و سرود اور شراب کا رسیا تھا وہ اپنی خواہشات کا

Marfat.com

اسیر اور فطری طور پر عیش و نشاط کا دلدادہ تھا۔ بقول لین پول "شاہ شجاع کا حرم اس کے کردار اور زندگی کا قبرخانہ تھا۔" وہ شیعہ عقائد کا حامی تھا۔

۳۔ اورنگ زیب: شاہجہان کا تیسرا بیٹا اورنگ زیب دکن کا گورنر تھا وہ اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ لائق، سمجھدار، مستقل مزاج اور بہادر تھا۔ وہ عسکری قابلیت میں لاثانی، تجربہ کار جرنیل، مردم شناس اور ایک مدبر سیاستدان تھا۔ اسے اپنی طبیعت اور کردار پر پوری طرح قابو تھا۔ نازک ترین لمحات میں بھی مایوس اور ہراساں نہ ہوتا تھا اور وہ گہری سوجھ بوجھ رکھنے والا اور ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک تھا اس کے قریبی دوست بھی اس کے دلی جذبات معلوم نہیں کر سکتے تھے۔ وسط ایشیا اور دکن کی مہمات میں اس کی عسکری صلاحیت نے مغل فوج کو اس کا بے حد گرویدہ بنا دیا تھا۔ مغل سپاہی اسے اپنا ہیرو سمجھتے تھے۔ دکن میں نظم و نسق کی بحالی کے سلسلے میں اس نے اپنی بہترین تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے اپنے مخالفین سے بھی خراج تحسین حاصل کیا تھا اورنگ زیب کی نجی زندگی محض سادہ اور ظاہری نمود و نمائش کوششوں سے مبرا تھی۔ وہ سنی العقیدہ، متقی، پرہیزگار اور صوم و صلوٰۃ کا پابند مسلمان تھا۔ برصغیر میں احیائے دین کو اپنا مذہبی فریضہ خیال کرتا تھا۔ بقول مشہور مورخ لین پول "اسے ہر دنیاوی آسائش کے مقابلہ میں مذہب زیادہ عزیز تھا۔" حقیقتاً وہ اسلام پسند عناصر کی امیدوں کا مرکز تھا۔

۴۔ مراد بخش: شاہ جہان کا سب سے چھوٹا بیٹا مراد بخش تھا جو جنگ تخت نشینی کے وقت تک اپنی زندگی کی ۳۳ بہاریں دیکھ چکا تھا وہ گجرات کا گورنر تھا۔ فنون سپہ گری میں یکتا اور شجاعت و دلیری کا پتلا تھا۔ لیکن تند خو کم ظرف، رندانہ مزاج اور لاابالی طبیعت کا مالک تھا۔ مے نوشی کا متوالا اور سادہ لوحی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ سیاست اور تدبر سے بالکل کورا تھا۔

جنگِ تخت نشینی کے اسباب

۱۔ قانون وراثت کا فقدان: تیموریوں کے ہاں شروع سے ہی قانون وراثت کا فقدان تھا۔ شاہی خاندان کا ہر فرد تاج و تخت کو اپنا جائز حق سمجھتا تھا اور "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے اصول کے پیش نظر تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کامران، ہندال، عسکری، مرزا محمد حکیم، جہانگیر، خسرو اور شاہجہان کی حصول اقتدار کے لئے کشمکش اور باہمی جنگ تیموریوں کی انہی قدیم روایات کی مظہر ہے۔ اس لئے شاہجہان کے بیٹوں کے مابین جنگِ تخت نشینی عین مطابق تھی۔

Marfat.com

۲۔ تحفظِ ذات : قانون وراثت کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہر تیموری شہزادہ اپنے ذاتی تحفظ کی خاطر جان کی بازی لگا کر قسمت آزمائی کرتا تھا اگر کوئی شہزادہ پرامن رہ کر زندگی گذارنا چاہتا تو بھی اس کی جان محفوظ نہ تھی۔ بدیں وجہ ہر مغل شہزادے کے لئے یہ لازمی تھا کہ اپنے فوجی ذرائع سے کام لیکر حصول اقتدار کے لئے لڑائی لڑے کیونکہ اسی صورت میں زندگی کے کچھ امکانات موجود تھے۔ چنانچہ تخت یا تختہ کے اصول کے تحت شاہجہان کے چاروں بیٹے حصول اقتدار کی خانہ جنگی میں مصروف ہو گئے۔

۳۔ شاہجہان کی جانبداری : شاہجہان نے اگرچہ اپنے بیٹوں کو سلطنت کے اہم صوبوں میں بطور گورنر تعینات کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود شاہجہان کو دارا شکوہ جو پنجاب کا گورنر تھا سے بہت زیادہ محبت تھی۔ اس غیر معمولی محبت کے پیش نظر دوسرے شہزادوں کا یہ خدشہ بجا نہ تھا کہ تخت نشینی کے سلسلے میں شاہجہان ہر جائز و ناجائز طریقہ سے دارا شکوہ کی ہی حمایت کرے گا۔ اس سے شہزادوں میں باپ پر بداعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ نتیجتاً انہیں اپنی حفاظت کے سلسلے میں خانہ جنگی پر مجبور ہونا پڑا۔

۴۔ دارا شکوہ کی غلط روش : دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے مابین دیرینہ رقابت تھی۔ دارا شکوہ ہمیشہ اورنگ زیب کی ہر کامیابی اور شہرت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور اس سے حسد کرتا تھا اور اسی حسد کی بنا پر اورنگ زیب کو ریاکار ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ نیز وہ اپنے بھائی کی ہر سکیم اور ہر کامیابی کو ناکام بنانے میں کوشاں رہتا تھا۔ دارا کی یہ غلط روش نہ صرف اسے اپنے بھائیوں سے دور لے گئی بلکہ یہ اس کی خیر مقبولیت اور شکست کا بھی سبب بنی۔

۵۔ مذہبی اختلاف : شاہجہان کے بیٹوں کے مذہبی نظریات اور کردار مختلف تھے۔ دارا آزاد منش انسان تھا اور اکبر کی رواداری پالیسی کا علمبردار تھا۔ جبکہ اورنگ زیب راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھا اور نقشبندی صوفیاء کے زیر اثر تھا۔ شاہ شجاع شیعہ عقائد کا حامی اور عیش و نشاط کا رسیا تھا۔ مراد سرے سے مذہبی آدمی ہی نہ تھا بدیں وجہ دربار میں شہزادوں کے حامیوں کے مختلف گروہ موجود تھے جن کا آپس میں تصادم ناگزیر تھا۔

۶۔ فوری وجہ : شاہجہان کی شدید بیماری کے دنوں میں دارا نے اس کی علالت کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنے کے لئے بنگال، گجرات اور دکن کے راستے بند کروا دیئے اس سے ان افواہوں کو اور تقویت پہنچی کہ شاہجہان وفات پا چکا ہے اور دارا اس خبر کو قصداً چھپا رہا ہے۔ دارا نے شاہجہان کو صحبت کرکے باہر نہیں آنے دیا تاکہ اس خبر کی تردید ہو سکے۔

Marfat.com

اس سے خانہ جنگی کا راستہ ہموار ہوا۔ مزید برآں دارا نے اورنگ زیب کو کمزور کرنے کے لئے دکن سے شاہی توپخانہ اور مرکزی شاہی فوج بلالی۔ نیز میر جملہ کو جو اورنگ زیب کا حامی تھا وزارت سے الگ کر دیا۔ علاوہ ازیں اورنگ زیب کے وکیل عیسیٰ بیگ کو قید کر دیا اور برار کا علاقہ اورنگ زیب سے لے کر مراد کو دینا چاہا تاکہ دونوں بھائیوں میں باہمی کشیدگی اور رنجش پیدا ہو لیکن مراد نے برار کا علاقہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ مزید برآں مالوہ کے گورنر شائستہ خاں کو واپس بلا لیا کیونکہ وہ اورنگ زیب کا طرفدار تھا۔

واقعات

دارا شکوہ کے غیر دانشمندانہ اقدامات اور شاہجہان کے انتقال کی افواہوں سے شہزادہ شجاع، اورنگ زیب اور مراد یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئے کہ شاہجہان وفات پا چکا ہے اور دارا اپنی حیثیت کو مضبوط و مستحکم کرنے میں مصروف ہے۔ چنانچہ انہوں نے دارا سے مقابلہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

شہزادہ مراد نے سب سے پہلے اپنے صوبے کے دیوان علی نقی کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیا۔ اور مشہور تجارتی شہر سورت جو جہاں آرا بیگم کی جاگیر تھا، کو لوٹ لیا۔

شہزادہ شجاع نے اپنے صوبے بنگال کے دارالسلطنت راج محل میں اپنی تاجپوشی کی رسم ادا کرتے ہوئے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کروانے کے بعد اپنی افواج کی جمعیت میں آگرہ کی جانب کوچ کیا۔ اس کے برعکس ——

شہزادہ اورنگ زیب دکن میں مقیم خاموشی سے ان تمام حالات کا جائزہ لیتا رہا کیونکہ اس کے نزدیک باپ کی زندگی میں برسر بغاوت ہونا جرم تھا وہ چاہتا تھا کہ باپ کے متعلق صحیح حالات معلوم ہو جائیں دریں اثنا اس نے میر جملہ کی وساطت سے امراء اور افواج کو اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور ساتھ ہی اسلحہ و بارود بھی جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس نے نہ صرف گولکنڈہ اور بیجاپور کے مابین صلح کروانے کی بلکہ ان کو اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ نیز نامہ و پیام کے ذریعے مراد کو جلد بازی اور غلط اقدام سے باز رہنے کی بھی تلقین کی۔ علاوہ ازیں اس نے حصول تخت کے لئے کمال دانشمندی سے شہزادہ مراد سے باہمی سمجھوتہ کر لیا۔ یہ طے پایا کہ دونوں بھائی دارا کے خلاف متحدہ طور پر فوجی کارروائی کریں گے کامیابی کی صورت میں مال غنیمت کا ۱/۳ حصہ اور پنجاب، افغانستان، کشمیر اور سندھ کا علاقہ شہزادہ مراد کو ملے گا اور باقی سلطنت پر اورنگ زیب کا تسلط ہو گا۔

معرکہ بہادر پور ۲۴ فروری ۱۶۵۸ء اورنگ زیب اور مراد ابھی ابتدائی تیاریوں میں ہی مصروف

Marfat.com

تھے کہ فروری ۱۶۵۸ء کے آغاز میں شاہ شجاع راج محل سے روانہ ہو کر اپنی افواج کے ساتھ بنارس تک بڑھ آیا۔ داراشکوہ جو سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت مراد اور شجاع کو نیچا دکھانے کے بعد اورنگ زیب سے نپٹنا چاہتا تھا نے اپنے فرزند اکبر سلیمان شکوہ اور راجہ جے سنگھ والئے امبر کو شجاع کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے روانہ کیا ۲۴ فروری ۱۶۵۸ء کو بنارس سے پانچ میل شمال مشرق میں واقع بہادر پور کے مقام پر دونوں افواج کا سخت مقابلہ ہوا جس میں شجاع کو شکست فاش ہوئی اور وہ واپس بنگال کی طرف بھاگ نکلا شاہی دستوں نے راجہ جے سنگھ کی سرکردگی میں منگھیر تک اس کا پیچھا کیا۔

معرکۂ دھرمت
۱۵۔ اپریل ۱۶۵۸ء

دریں اثنا فروری ۱۶۵۸ء تک اورنگ زیب پوری تیاری کر چکا تھا اس نے نہ صرف گولکنڈہ اور بیجاپور کے حکمرانوں کو اپنا دوست بنا لیا تھا بلکہ اپنے توپ خانہ میں یورپین توپچیوں کو بھی بھرتی کر لیا تھا ازاں بعد اورنگ زیب اپنی افواج کی معیت میں اورنگ آباد سے روانہ ہوا اور برہان پور میں ایک ماہ کے قیام کے بعد دریائے نربدا کو عبور کر کے دیپالپور پہنچا جہاں مراد بھی اپنی افواج کے ساتھ اس سے آملا۔ داراشکوہ نے دونوں بھائیوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے راجہ جسونت سنگھ والئے اودھے پور اور قاسم خاں کی زیر کمان شاہی افواج روانہ کیں۔ اورنگ زیب نے اجمیر کے مقام پر مقیم شاہی سالاروں کو کہلا بھیجا کہ ہمارا راستہ نہ روکا جائے۔ چونکہ ہم لڑنے نہیں آئے بلکہ بادشاہ کی عیادت کے لئے آگرہ جا رہے ہیں مگر شاہی افواج نے آگے بڑھ کر راستہ روکا اس پر ۱۵ اپریل ۱۶۵۸ء[1] کو اجمین سے چودہ میل کی مسافت پر واقع دھرمت کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں شاہی فوج کو شکست ہوئی۔ راجہ جسونت سنگھ بھاگ کر اپنے وطن مارواڑ چلا گیا۔

معرکۂ ساموگڑھ
۲۹۔ مئی ۱۶۵۸ء

دھرمت کی فتح نے اورنگ زیب کے وقار کو اور بلند کر دیا اس نے فتح کی یادگار کے طور پر میدان جنگ کے قریب ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام فتح آباد رکھا۔ بعد ازاں دونوں بھائی گوالیار کے راستے آگرہ روانہ ہوئے اور دریائے چنبل کو عبور کر کے آگرہ سے آٹھ میل دور ساموگڑھ کے مقام پر پہنچ گئے۔

دھرمت کی شکست اور شہزادوں کی آگرہ کی جانب برق رفتار پیش قدمی سے دارالسلطنت آگرہ میں ہلچل مچ گئی۔ شاہجہان تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے دہلی جا رہا تھا۔ مگر بلوچ پور کے مقام سے ہی لوٹ آیا اس نے چاہا کہ خود آگے بڑھ کر خانہ جنگی کا خاتمہ کر دے لیکن داراشکوہ مصالحت کے خلاف

---

[1] لے ایل۔ سری واستوا کی رائے ہے کہ دھرمت کی لڑائی ۲۵ اپریل ۱۶۵۸ء کو لڑی گئی

Marfat.com

تھا۔ اس نے شاہجہان کی ایک بھی نہ مانی کیونکہ اس کی افواج کی تعداد اورنگ زیب اور مراد کی متحدہ افواج سے کہیں زیادہ تھی۔

داراشکوہ اپنی پچاس ہزار فوج، جو محض ظاہری طور پر ایک عظیم فوج دکھائی دیتی تھی، کی معیت میں ساموگڑھ پہنچ گیا۔ اس کا ہراول دستہ با اعتماد راجپوت سرداروں کی زیر کمان تھا۔ جبکہ میمنہ کی قیادت پر خلیل اللہ اور میسرہ پر سپہرہ شکوہ مامور تھا اور خود دارا ایک بلند قامت ہاتھی پر سوار مرکز میں تھا۔

بالآخر ۲۹۔ مئی ۱۶۵۸ء کو ساموگڑھ کے مقام پر دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں۔ داراشکوہ نے اپنے توپخانہ کو اورنگ زیب کے فوجی دستوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے شدید گولہ باری کا حکم دیا۔ اس سے تمام گولہ بارود ابتدا میں ہی ختم ہو کر رہ گیا۔ بعد ازاں دارا شکوہ کی فوج کے بائیں بازو نے اورنگ زیب کی فوج کے دائیں بازو پر زور حملہ کیا لیکن پسپا ہونے پر مجبور ہوا۔ اس کے بعد اورنگ زیب کی فوج کے مرکزی حصہ پر حملہ کیا گیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ مگر شاہی فوج کے بائیں بازو کا کمانڈر قاسم خاں مارا گیا اس پر شاہی فوج کے دائیں بازو نے اپنے کمانڈر خلیل اللہ کی سرکردگی میں اور راجپوتوں کی معیت میں شہزادہ مراد پر اس قدر زبردست حملہ کیا کہ مراد کے ہاتھی کا ہودہ تیروں سے چھلنی ہو گیا نیز شہزادہ مراد کے چہرے پر تین زخم آئے لیکن وہ مستقل مزاجی سے مقابلے پر ڈٹا رہا اورنگ زیب اور مراد نے اپنے ہاتھیوں کے پاؤں میں زنجیریں ڈلوا رکھی تھیں تاکہ وہ اپنی جگہ سے بھاگ نہ سکیں ادھر بدقسمتی سے دارا شکوہ کا ہاتھی ایک تیر لگنے سے شدید زخمی ہو گیا۔ علاوہ ازیں چند گولے بھی ہاتھی پر آ پڑے اس سے دارا گھبرا کر ہاتھی سے نیچے اتر آیا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دارا شکوہ کے اس اقدام نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور میدان جنگ اورنگ زیب اور مراد کے ہاتھ رہا۔ دارا کے دس ہزار سپاہی جنگ میں کام آئے جبکہ اس نے خود بھاگ کر جان بچائی آگرہ میں آنے کے بعد دارا نے اپنے باپ سے ملے بغیر دہلی کا رخ کیا۔ شاہجہان نے اطلاع پا کر دہلی کے گورنر کو لکھا کہ دارا کو ہر قسم کی امداد بہم پہنچائے۔

آگرہ پر قبضہ

"ساموگڑھ کے معرکہ نے عملی طور پر شاہجہان کے بیٹوں کے مابین جنگِ تخت نشینی کا فیصلہ کر دیا۔" [1]

آگرہ پہنچ کر اورنگ زیب اور مراد قلعہ کے باہر ہی باغِ نور بخش خیمہ زن ہوئے جہاں متعدد مغل امراء اور فوجی آفیسر فتح مند شہزادوں سے آ کر مل گئے۔ اورنگ زیب نے باپ کے حضور ایک

---

[1] ۔ وی۔ اے۔ سمتھ، ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۴۸۳

Marfat.com

تفصیلی عرضداشت روانہ کی جس میں دارا کی بدسلوکیوں کا تذکرہ لکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف اپنی فوجی کاروائی کے لئے معذرت بھی چاہی۔ شاہجہان نے بیٹے کی بہادری اور عسکری صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے ایک مرصع تلوار ارسال کی جس پر عالمگیر کا خطاب کندہ تھا اور ساتھ ہی اسے اپنے حضور طلب کیا۔ اورنگ زیب باپ کے پاس جانے کو تیار ہو گیا۔ لیکن شائستہ خاں اور دیگر مشیروں نے شاہجہان کی خواہش کو سازش پر محمول کرتے ہوئے اورنگ زیب کو قلعہ میں جانے سے روک دیا۔ شاہجہان کے سفیر خلیل اللہ خاں نے بھی قلعہ کے مخدوش حالات کے تحت واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ قلعہ میں جانا خطرے سے خالی نہیں۔

اس پر اورنگ زیب نے آگرہ شہر پر قبضہ کر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ شاہجہان اپنی حفاظت کے لئے قلعہ بند ہو کر مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا اس پر اورنگ زیب نے توپ خانہ کی گولہ باری سے قلعہ کی فصیل کو اڑا دینے کا حکم دے دیا۔ لیکن ناکامی کی صورت میں دریائے جمنا سے قلعہ کے اندر پانی کی بہم رسانی کا سلسلہ منقطع کر کے شاہجہان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ تین دن تک محصور رہنے کے بعد قلعہ کے دروازے کھول دیئے گئے اورنگ زیب نے اپنے فرزند اکبر شہزادہ محمد سلطان کو قلعہ دار مقرر کر کے قلعہ کا انتظام سنبھالنے پر متعین کیا۔ اس طرح ۸ جون کو قلعہ آگرہ پر اورنگ زیب کا قبضہ ہو گیا۔

شاہجہان نے جہاں آرا بیگم کی وساطت سے اورنگ زیب سے ملنے اور تصفیہ کا پروگرام بنایا تاکہ ساری سلطنت کو بیٹوں کے درمیان تقسیم کرنے کی تجویز پیش کر سکے اورنگ زیب اپنے باپ سے ملنے کے لئے قلعہ کی جانب روانہ ہوا لیکن راستے سے ہی واپس آ گیا کیونکہ اس کے آفیسروں نے ماہر دل نامی ایک قاصد کو پکڑ کر اس کے حضور پیش کیا جو دارا شکوہ کی طرف شاہجہان کا یہ خصوصی پیغام لے کر جا رہا تھا کہ ——— "تم مطمئن ہو کر دہلی سے آگے مت بڑھو اور وہیں قیام کرو۔ ہم اس مہم کا یہیں فیصلہ کئے دیتے ہیں" ——— اس پر اورنگ زیب نے شاہجہان کو مثمن برج میں نظر بند کر دیا جہاں اس نے آٹھ سال کی نظر بندی کے بعد ۲۲ جنوری ۱۶۶۶ء کو وفات پائی اور تاج محل میں اپنی ملکہ ممتاز محل کے پہلو میں دفن ہوا۔

مراد کی اسیری

قلعہ آگرہ پر قابض ہونے کے بعد اورنگ زیب، شہزادہ مراد بخش کی معیت میں دارا شکوہ کے تعاقب میں دہلی روانہ ہوا۔ راستے میں اورنگ زیب کو معلوم ہوا کہ مراد بخش اپنے وعدہ سے منحرف ہو چکا ہے اور حصول اقتدار کے لئے نئی فوج بھرتی کر کے اپنی عسکری قوت میں اضافہ کر رہا ہے اور انتشار پھیلانے کی کوشش میں ہے اورنگ زیب نے عہد نامہ کے مطابق اس کے پاس مال غنیمت کا ½ حصہ بھیجتے ہوئے اسے عہد نامہ کی پابندی

Marfat.com

کی تلقین کی اور ساتھ ہی اپنے ہاں دعوت پر بلایا جس میں مراد کو خوب شراب پلائی گئی اور جب وہ سو رہا تھا تو اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اسے پہلے سلیم گڑھ اور بعد ازاں گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا جہاں بعد میں دیوان علی نقی کے بیٹوں کی شکایت پر دیوان علی نقی کو ہلاک کرنے کے الزام میں اس پر مقدمہ چلایا گیا اور دسمبر ۱۶۶۱ء میں قصاصِ قتل کے طور پر اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

اورنگ زیب کا اعلان بادشاہت
۲۱ جولائی — ۱۶۵۸ء

دہلی پہنچ کر ۲۱ جولائی ۱۶۵۸ء کو اورنگ زیب نے ایک نہایت سادہ تقریب میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور عالمگیر کا لقب اختیار کیا ازاں بعد وہ داراشکوہ کے تعاقب میں پنجاب کی طرف روانہ ہوا۔ داراشکوہ لاہور اور سندھ سے ہوتا ہوا گجرات روانہ ہو گیا۔ اورنگ زیب ابھی ملتان ہی پہنچا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ شاہ شجاع بنگال سے دوبارہ آگرہ کی طرف بڑھ رہا ہے اس پر وہ ملتان سے برق رفتاری سے واپس لوٹا۔

معرکہ کھجواہ
جنوری ۱۶۵۹ء

شاہ شجاع الہ آباد سے ۹۵ میل مغرب میں کھجواہ کے مقام پر پہنچا تھا کہ اورنگ زیب نے اسے جا لیا۔ اگرچہ شاہ شجاع کے پاس عمدہ توپخانہ تھا اور وہ پوری تیاری سے آگرہ کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اورنگ زیب نے جنوری ۱۶۵۹ء میں اسے شکستِ فاش دی چنانچہ شجاع واپس بنگال کی طرف بھاگ گیا۔

اورنگ زیب نے شہزادہ محمد سلطان اور میر جملہ کو شجاع کے تعاقب پر مامور کیا۔ شاہی افواج راج محل میں داخل ہوئیں جہاں شہزادہ محمد سلطان جو شاہ شجاع کی بیٹی پر فریفتہ تھا شاہی افواج سے بھاگ کر شاہ شجاع سے جا ملا۔ تاہم میر جملہ نے مہم کو جاری رکھا اور شجاع کو بنگال سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ وہ چٹاگانگ کی طرف بھاگ گیا اور شاہِ اراکان کے ہاں جا پناہ گزین ہوا۔ اس کے انجام کے متعلق کئی ایک افسانے اور روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ شاہِ اراکان نے اپنی بادشاہت کے خلاف سازش کے الزام میں اسے قتل کروا دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ماگھ قبائل کے لوگوں نے اسے ہلاک کر دیا۔ شہزادہ محمد سلطان کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ شاہی افواج میں واپس آ گیا لیکن اورنگ زیب نے اسے قید کی سزا دی چنانچہ وہ اپنی بقیہ عمر گوالیار کے قلعہ میں ہی نظر بند رہا۔

معرکہ دیورائے
مارچ ۱۶۵۹ء

دریں اثنا داراشکوہ کو اپنی قوت کو دوبارہ مستحکم کرنے کا موقع مل گیا۔ گجرات کے صوبیدار شاہ نواز خاں نے اس کو فوجی امداد مہیا کی۔ چنانچہ وہ ۲۲ ہزار فوج اور اعلیٰ توپخانہ کی معیت میں آگرہ کی طرف بڑھا دریں اثنار

Marfat.com

راجہ جسونت سنگھ نے بھی اسے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس پر دارا اجمیر پہنچا لیکن بعد ازاں راجہ جسونت سنگھ نے اجمیر کی طرف اورنگ زیب کی پیشقدمی کی خبر پا کر دارا کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اور ساتھ ہی اورنگ زیب کی اطاعت بھی قبول کر لی۔ اس پر دارا نے اجمیر سے چار میل جنوب میں واقع دیورائے کی پہاڑی پر مورچہ بندی کر لی جہاں تین دن تک شاہی فوجوں سے زبردست جنگ ہوئی۔ بالآخر دارا کو شکست ہوئی اور وہ گجرات کی طرف بھاگ نکلا۔

دارا کی گرفتاری

اب احمد آباد کے حاکم نے دارا کی امداد کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ کاٹھیاواڑ سے دوبارہ سندھ پہنچ گیا۔ شاہی جرنیل راجہ جے سنگھ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ دارا درۂ بولان اور قندھار کے راستے ایران جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے داور کے بلوچی سردار ملک جیون کے ہاں پناہ لی۔ ملک جیون پر دارا کے بہت احسانات تھے لیکن بلوچی سردار نے اسے دغا دیا اور شہزادہ کو گرفتار کر کے شاہی فوج کے حوالے کر دیا۔

دارا اور اس کے چھوٹے بیٹے سپہر شکوہ کو دہلی میں لایا گیا جہاں باپ بیٹے کو ایک ہاتھی پر بٹھا کر تمام شہر میں پھرایا گیا اور پھر قید میں ڈال دیا گیا۔ بعد میں علماء کی رائے سے دارا پر ارتداد کا الزام لگا کر اس کے قتل کا فتویٰ صادر کیا گیا اور ۹ ستمبر ۱۶۵۹ء کو اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کی نعش کو مقبرۂ ہمایوں میں دفن کیا گیا۔ دارا کے اس حسرت ناک انجام سے اہالیان دہلی کو بہت افسوس ہوا۔

سلیمان شکوہ کا انجام

دارا کا فرزند اکبر سلیمان شکوہ بہادر پور کے معرکہ میں فتح پانے کے بعد کامران واپس لوٹ رہا تھا کہ اسے راستے میں سامو گڑھ کے میدان میں اپنے باپ (دارا) کی شکست کی اطلاع ملی اس پر فوج نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا چنانچہ وہ گڑھوال کے راجہ کے ہاں پناہ گزین ہونے پر مجبور ہو گیا۔ خانہ جنگی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اورنگ زیب نے سلیمان شکوہ کو گڑھوال کے راجہ کی وساطت سے گرفتار کر کے گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ ازاں بعد زہر دیکر ہلاک کروا دیا۔

دارا کے چھوٹے لڑکے سپہر شکوہ اور مراد کے لڑکے ایزد بخش کو معاف کر دیا گیا۔ لیکن انہیں قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا جہاں وہ تمام عمر نظر بند رہے۔ اورنگ زیب نے اپنی دونوں لڑکیوں کی شادی ان سے کر دی اس طرح اورنگ زیب نے تخت کے دعویداروں پر فتح پائی اور بلا شرکت غیرے تخت طاؤس کا مالک بنا۔

Marfat.com

اورنگ زیب کی کامیابی کے اسباب

تخت نشینی کی جنگ میں اورنگ زیب کی کامیابی میں کئی عناصر کارفرما تھے۔ حالات کا گہرا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی خوش قسمتی کے علاوہ بہت سی وجوہات تھیں جن کی بنا پر اسے تخت نشینی کی جنگ میں کامیابی ہوئی ذیل میں ان وجوہات کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ شاہجہان کی کمزوری

اورنگ زیب کی کامیابی کی سب سے پہلی وجہ شاہجہان کی طبعی کمزوری، مجبوری اور بیماری تھی وہ مکمل طور پہ دارا شکوہ کے زیر اثر تھا۔ جس کی وجہ سے شاہجہان کو دارا کو نائب السلطنت بنانا پڑا جس نے برسر اقتدار آنے کی خاطر نہ صرف باپ کی بیماری کی خبر کو عملاً چھپا کر غلط افواہوں (موت کی افواہ) کو تقویت دی بلکہ بادشاہ کو جھروکہ درشن میں آکر غلط افواہوں کی تردید کرنے سے روک کر جنگ تخت نشینی کے لئے راستہ ہموار کیا۔ دارا کا یہی اقدام اورنگ زیب کی کامیابی کا باعث ہوا۔

۲۔ اورنگ زیب کی عسکری قابلیت

اورنگ زیب ایک بہترین جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ زیرک سیاستدان اور اعلیٰ عسکری ذہانت کا مالک تھا۔ اس کی جوانمردی کی پہلے ہی فوجوں میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ سپاہیوں کو اس کی قائدانہ صلاحیتوں پہ پورا اعتماد تھا وہ جنگی چالوں سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ جنگ تخت نشینی میں اورنگ زیب نے سرگرمی اور برق رفتاری سے فوجی کارروائیاں کرکے اپنے حریفوں کو حیرت میں ڈال دیا اور کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ اس نے دور اندیشی اور دانشمندی سے کام لیکر نہ صرف اپنے تمام دشمنوں کا صفایا کر دیا بلکہ جے سنگھ اور راجہ جسونت سنگھ جیسے اعلیٰ فوجی دماغوں کو اپنی ملازمت میں لیکر ان کی عسکری صلاحیتوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جے سنگھ کو دارا کی گرفتاری پر مامور کیا۔ علاوہ ازیں اس نے دارا کے حامی امرار کی خطاؤں کو معاف کرکے انہیں اپنا ہمنوا بنا لیا۔

۳۔ دارا کی غلطیاں

شاہجہان کی بیماری اور خانہ جنگی کے دوران دارا فاش غلطیوں کا مرتکب ہوا اور انہی کی پاداش میں اس نے اورنگ زیب سے مات کھائی۔ باپ کی بیماری کی خبر پہ پابندی لگا کر ملک میں سنسنی خیز قسم کی افواہوں کو پھیلنے کا موقع دیکر دارا نے اپنی حیثیت کو مستحکم بنانے کی پوری کوشش کی لیکن وہ اورنگ زیب کے جاسوسوں پہ قابو نہ پا سکا۔ روشن آرا بیگم دربارِ آگرہ کے تمام حالات سے اورنگ زیب کو باخبر رکھتی تھی نیز دارا نے اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کا انتظار کئے بغیر ساموگڑھ کی جانب روانہ ہو کر سخت غلطی کا ارتکاب

Marfat.com

کیا۔ مزید برآں سامو گڑھ کے معرکہ میں عین لڑائی میں ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہونا بھی اس کی ایک شدید فوجی اور سیاسی غلطی تھی۔ جس سے اس کی افواج نہ صرف بددل ہو گئیں بلکہ حوصلہ ہار کر بھاگ کھڑی ہوئیں کیونکہ اس کے سپاہیوں نے سمجھا کہ ان کا شہزادہ ہلاک ہو چکا ہے۔

۴۔ مذہبی جذبات

اورنگ زیب کو کامیابی اس کی اسلام دوستی کی وجہ سے بھی ہوئی۔ کیونکہ اورنگ زیب راسخ العقیدہ سنی مسلمان ہونے کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں کا ہیرو تھا۔ وہ احیائے اسلام کا علمبردار اور اکبر کی رواداری پالیسی نیز بھگتی تحریک کا سخت مخالف تھا۔ وہ نقشبندی صوفیاء کا معتقد اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فرزند خواجہ محمد معصوم کا مرید تھا اس لئے برصغیر کے مسلمانوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں اس کے برعکس دارا اکبر کی رواداری کا حامی اور ہندو وانہ عقائد کا معتقد تھا۔ نیز اس کی مذہبی آزاد خیالی الحاد کے درجے تک پہنچ چکی تھی۔

۵۔ اورنگ زیب کی صفات

سب مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ اورنگزیب کی کامیابی کا دارومدار اس کی ذاتی صفات پر ہے۔ اورنگ زیب لیاقت، تنظیم اور ہردلعزیزی اور مدبرانہ چالوں میں اپنے رقیبوں کی بہ نسبت بلند مقام کا حامل تھا۔ نیز وہ ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک تھا اور اپنی جنگی چالوں سے دشمن کو بے بس کر دیتا تھا۔ وہ صبر و تحمل کا مجسمہ اور مستقل مزاجی کا پتلا تھا اس نے صبر سے کام لیکر اپنے تمام رقیبوں اور تخت کے دعویداروں کو ختم کر ڈالا اس کے بھائیوں میں کوئی بھی اس کے پایہ کا فوجی جرنیل نہ تھا ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی رائے ہے کہ "اورنگ زیب کی کامیابی کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ مستعد اور باعمل انسان تھا۔"

۶۔ فوجی وجوہات

اورنگ زیب کا توپ خانہ دارا کے توپخانہ سے بدرجہا بہتر تھا چونکہ دکنی فتوحات کے سلسلے میں مغلیہ سلطنت کا بہترین توپخانہ اورنگ زیب کے پاس منتقل کیا گیا تھا اس لئے اس کی فوجی پوزیشن اپنے بھائیوں کی بہ نسبت بہت مستحکم تھی۔ نیز فوج کو پرتگیزوں اور فرانسیسیوں سے جدید ٹریننگ دلوانے اور بیرحملہ کے بھی مل جانے سے اورنگ زیب کی فوجی طاقت اور برتری بدرجہا بڑھ گئی تھی یہی وجہ تھی کہ سامو گڑھ کے معرکہ میں اس کی فوج نے بہترین جنگی مہارت اور مستعدی کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے اورنگزیب فتح یاب ہوا۔ دارا کا اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کا انتظار نہ کرنا اور سامو گڑھ روانہ ہو جانا بہت بڑی فوجی غلطی تھی۔ علاوہ ازیں سلیمان شکوہ نے بھی بزدلی کا مظاہرہ کیا کہ بغیر مقابلہ میں آئے بھاگ کھڑا ہوا۔ نیز اپنے باپ کی مانند غلط میزبان راجہ گھڑوال کے ہاں [illegible] اسے

Marfat.com

بعد میں اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔

عہد شاہجہانی میں فن تعمیر کا ارتقاء

شاہجہان کا دور مغلیہ فن تعمیر کے انتہائی عروج و ارتقار کا دور ہے۔ جونہی ہم اس دور میں داخل ہوتے ہیں ہمیں مغلیہ فن تعمیر منتہائے کمال کو پہنچا ہوا نظر آتا ہے عمارات میں سفید سنگ مرمر کا فراوانی سے استعمال اس متعل شہنشاہ کے اعلیٰ اور پاکیزہ ذوق پر دلالت کرتا ہے شاہجہان کی بنوائی ہوئی عمارات میں نفاست، پاکیزگی اور محبت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے شاہجہان کو بلاشبہ عمارات کا شہزادہ اور "انجینیر بادشاہ" کہا جاسکتا ہے۔ مورخین نے اس کے عہد کو مغلیہ فن تعمیر کا سنہری زمانہ کہا ہے۔ اس زمانے میں فن تعمیر کا معیار ہر اعتبار سے بلند ترین اور اپنی دیدہ زیبی، سحر انگیزی اور مقصدیت کی وجہ سے ضرب المثل ہو گیا تھا اس کی عمارتوں میں تنوع، زیبائش، تناسب و توازن کشش و جاذبیت اور نسوانی حسن موجود ہے۔ اور ان کی نزاکت و نفاست، دلکشی اور حسین نقش و نگار کو دیکھ کر انسان عش عش کر اٹھتا ہے شاہجہانی عمارات کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان سے ہندوانہ اثرات کے بجائے خالص اسلامی جاہ و جلال جھلکتا ہے لاہور میں آصف جاہ کے مقبرہ کی تعمیر کے بعد گنبد میں غیر معمولی بلندی اور دوہری ساخت قطعی طور پر ترک کر دی گئی۔ شاہجہان کی تمام عمارتوں میں موزونیت پر زور دیا گیا ہے اکثر عمارات سے مردانہ جلال کی بجائے نسوانی نفاست و نزاکت جھلکتی ہے الغرض فنکارانہ بے ساختہ پن، شاعرانہ بانکپن اور دلربائی شاہجہانی عمارتوں کا طرۂ امتیاز ہے اس عہد کی عمارتوں میں میناکاری، پچی کاری اور کاشی کاری کا فنکارانہ امتزاج شاہجہان کے جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار اور مغلیہ فن تعمیر کا نشانِ ارتقار ہے۔ ان عمارات میں سنگِ مرمر کے علاوہ صوبہ بہار کا سرخ پتھر بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔

شاہجہانی عمارات میں دروازوں کے رُخ، گنبد و محرابوں کا تناسب، فرش اور دیواروں کی موٹائی سب کچھ سوچ سمجھ کر بنائے گئے ہیں۔ نیز ان عمارات کے متونوں میں جدت مغلیہ فن تعمیر کے کمال کی عمازی کرتی ہے۔

عام طور پر تمام مغلیہ عمارات باغات کے وسط میں تعمیر کی گئی ہیں جہاں پانی کا قوارہ کے ذریعہ خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے۔ شاہی قلعوں سے شعلئ جلال و جمال جھلکتا ہے مثال کے طور پر دہلی کا لال قلعہ۔ اس قلعہ کے اندر دیوانِ عام، دیوان خاص، خوابگاہیں، حمام اور شیش محل موجود ہیں۔ قلعہ لاہور میں مثمن برج اور نولکھا پویلین بناوٹ و تزئین کے اعتبار سے نادر ترین

Marfat.com

نمونے ہیں۔ یہ عمارات شاہجہان کے شاعرانہ دماغ اور مصورانہ ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔ درج ذیل سطور میں شاہجہانی عہد کی چند اہم عمارات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

روضۂ تاج محل

روضۂ تاج محل آگرہ شاہجہانی عہد کا تعمیراتی شاہکار ہے۔ یہ روضہ شاہجہان نے اپنی چہیتی ملکہ ارجمند بانو بیگم المعروف ممتاز محل کی آخری آرامگاہ پر تعمیر کروایا۔ جو ہفت عجائباتِ عالم میں شمار ہوتا ہے۔ ممتاز محل نے ۱۶۳۱ء میں وفات پائی۔ شاہجہان نے اگلے سال ملکہ کی آخری آرامگاہ پر اس عالیشان روضہ کی تعمیر شروع کرا دی۔ تاج محل کے بیرونی دروازے پر جو کتبہ ہے اس کے مطابق اس کی تاریخ تکمیل ۱۶۴۸ء ہے یعنی یہ روضہ ۱۷ برس میں تکمیل کو پہنچا۔ شاہجہان نامہ کے مصنف عبدالحمید لاہوری کے بیان کے مطابق اس پر ۵۰ لاکھ روپیہ صرف ہوا اور ۱۲ سال میں یہ تعمیر ہوا جبکہ ٹریور میئر لکھتا ہے کہ روضہ کی تعمیر پر تین کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ معین الدین احمد کے قول کے مطابق اس کا ماڈل تیار کرنے والا ایک ایرانی انجنیئر استاد عیسیٰ تھا۔ جو میر عبدالکریم کے ساتھ روضہ کی تعمیر کا نگران اعلیٰ بھی تھا۔ کتبے امانت خاں شیرازی نے تحریر کیے اور گنبد کی تعمیر اسماعیل خاں رومی کے ہاتھوں انجام پائی۔

روضہ تاج محل کی عمارت کا احاطہ ایک سو چھیاسی مربع فٹ ہے گنبد کا قطر اٹھاون فٹ اور بلندی اکیس فٹ ہے۔ یہ سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ تاج محل بلاشبہ ازدواجی محبت کی حسین ترین یادگار ہے اور شاہجہان کے جذبۂ محبت کی ایک بے مثل تصویر ہے جو سنگ مرمر پر منقش کی گئی ہے۔ تاج محل مغلیہ عہد کی عظیم ترین اور حسین ترین عمارات میں سے ایک ہے اور اپنی خوبصورتی اور جدت فن کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ دریائے جمنا کے کنارے سنگ مرمر کا یہ شاہکار چاندنی رات میں عجیب نظارہ پیش کرتا ہے اور اس کی خوبصورتی کے بارے میں مختصر ترین الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج تک چشم آدم نے کرہ ارض پر اس سے زیادہ مسحور کن، وجدان انگیز، شعریت پرور اور حسن آفرین عمارت نہیں دیکھی ہوگی دنیا کا شاید ہی کوئی شاعر، مصور، سیاح اور مفکر ہوگا جس نے تاج محل کو انسانی محبت، خلوص و وارفتگی اور جذبہ کی شدت کا بہشت آفریں شاہکار قرار نہ دیا ہو۔

قلعہ آگرہ

یہ تاریخی قلعہ ۱۵۶۴ء میں اکبر نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ شاہجہان کی نظربندی کی یادگار ہے۔ سنگ سرخ سے تعمیر شدہ یہ قلعہ شاہی دبدبہ اور وقار کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس میں دریا کی سمت شاہجہان کا تعمیر کردہ مثمن برج اپنی خوبصورتی اور آسائش کے لحاظ سے ایک حسین شاہکار ہے یہاں سے تاج محل صاف نظر آتا ہے یہیں شاہجہان نے نظربندی کے ایام گذارے مثمن برج کے علاوہ اس میں جھروکہ درشن، دیوان خاص اور دیوان عام شاہجہانی دور کے مغلیہ فن تعمیر کے نادر نمونے ہیں۔

Marfat.com

موتی مسجد آگرہ

یہ مسجد اپنی خوبصورتی، موزونیت، لطافت اور دلکشی کے اعتبار سے متعلیہ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ مسجد محض سادہ، عظمت و تقدس کی مظہر اور سنگ مرمر کا ایک حسین شاہکار ہے۔ بناوٹ کے اعتبار سے انتہائی نفیس اور عمدہ ہے اس کی تعمیر میں عمارتی مسالہ اس قدر مہارت سے استعمال کیا گیا ہے کہ کہیں کوئی جوڑ دکھائی نہیں دیتا اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ جیسے شفاف سنگ مرمر کے بڑے ٹکڑے سے کاٹ کر اسے زمین پر رکھ دیا گیا ہے۔ موتی مسجد کی لمبائی دو سو چونتیس فٹ اور چوڑائی ایک سو ستر فٹ ہے۔ اس کی تعمیر ۱۶۴۸ء میں شروع ہوئی اور عرصہ چار برس میں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ فن کی سادگی، پاکیزگی اور تناسب کی موزونیت نے اسے فن تعمیر کا ایک غیر فانی اور بے مثل شاہکار بنا دیا ہے اس کی تعمیر پر تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

جامع مسجد دہلی

اگر آگرہ کی موتی مسجد پاکیزگی، نفاست اور فن تعمیر کی ندرت و نزاکت کی آئینہ دار ہے تو شاہجہان کی جامع مسجد دہلی وجاہت اور شان و شوکت کی مظہر ہے اسے مسجد جہاں نما بھی کہا جاتا ہے برصغیر کی یہ عظیم ترین مسجد چھ سال میں دس لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوئی۔ یہ ایک بلند مقام پر بنائی گئی ہے قلعہ دہلی کے عین سامنے واقع یہ مسجد دو سو دس فٹ لمبی اور ایک سو بیس فٹ چوڑی ہے۔ اس میں لال قلعہ دہلی کی مانند سرخ پتھر بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ اندرونی حصہ میں سنگ مرمر اور سنگ رخام استعمال کیا گیا ہے اس کا گنبد نیلا پر شکوہ ہے۔ اس کی بنیاد ۱۶۵۰ء میں رکھی گئی اور یہ چھ سال کے عرصہ میں تیار ہوئی۔ بلندی نفاستِ تعمیر، جلال و جبروت اور تعمیراتی حسن و تناسب کے لحاظ سے جامع مسجد دہلی فی الواقعی ایک پر شکوہ اور عظیم مسجد ہے اور متعلیہ عہد کے ذوقِ تعمیر کا یگانۂ روزگار شاہکار ہے۔

لال قلعہ دہلی

شاہجہان کو آگرہ کی آب و ہوا راس نہ آئی تو اس نے دہلی کے قریب اپنی سلطنت کا نیا دارالحکومت تعمیر کروایا اور اس کا نام شاہجہان آباد رکھا شاہجہان نے اسے خوبصورت عمارات سے مزین کیا۔ شاہجہان آباد میں اس نے اپنے لئے ایک محل اور سنگ سرخ کا ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کروایا جو لال قلعہ دہلی کے نام سے مشہور ہے۔ دریائے جمنا کے کنارے واقع یہ قلعہ آٹھ سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ قلعہ کا طول ۳۲۰۰ فٹ اور عرض ۱۶۰۰ فٹ ہے قلعہ میں متعدد شاندار عمارات تعمیر کرائی گئیں جن میں حسن و آرائش کے لحاظ سے دیوان خاص نہ صرف بے نظیر ہے بلکہ شاہجہان کی عظمت و شوکت کا مظہر ہے۔ دیوان خاص کو خوبصورت اور سحر انگیز نقش و نگار سے اس قدر مرصع و آراستہ کیا گیا تھا کہ شاہجہان نے اس کی خوبصورتی کے پیش نظر اسے فردوس برزمیں اور اس کی سنگ مرمر کی نہر کو "نہر بہشت" کے

Marfat.com

نام سے موسوم کیا ـــــ دیوان خاص کی پیشانی پر سعد اللہ خاں کا یہ شعر آج بھی کندہ ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

لال قلعہ کی دیگر عمارات میں ممتاز محل، رنگ محل اور شاہ برج خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

لاہور کی عمارات

لاہور میں شاہجہان کے تعمیراتی شاہکاروں میں جہانگیر کا مقبرہ جو نور جہاں کی زیر نگرانی تعمیر ہوا۔ آصف جاہ کا مقبرہ، شاہی قلعہ لاہور میں شیش محل، نولکھا پیویلین، دیوانِ خاص، چہل ستون والا دیوان عام، خوبگاہ، مسجد وزیر خاں اور شالامار باغ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شالامار باغ اپنی اس تعمیراتی طرز و خصوصیت کے لحاظ سے دنیا بھر میں منفرد و مثالی ہے کہ یہ نہ صرف ایک سہ نخلہ باغ ہے بلکہ اپنے طول و عرض۔ تہہ ہائے گل اور موزوں روشوں کے اعتبار سے آج بھی اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتا۔ اگرچہ عمارات کو سکھوں کی دستبرد سے بہت نقصان پہنچا مگر یہ اپنی خوبصورتی، زیبائش، موزونیت اور طرز کے لحاظ سے اب بھی مغلیہ فن تعمیر کے فقید المثال شاہکار ہیں۔ ان عمارتوں میں سنگ مرمر اور سنگ سرخ کے علاوہ چمکدار رنگین ٹائیلوں کا استعمال ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔

ٹھٹھہ کی عمارات

ٹھٹھہ میں شاہجہانی دور کی دو خوبصورت اور عالیشان مسجدیں ہیں۔ ٹھٹھہ کی جامع مسجد ۱۶۴۷ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ سندھ کی عظیم ترین مسجد ہے۔ ٹھٹھہ کی مسجدوں میں رنگین ٹائلوں کا استعمال اس علاقہ کی آب و ہوا کو مدنظر رکھ کر کیا گیا تھا اب بھی ان کا رنگ جاذب نظر ہے اور آنکھوں کو ٹھنڈک اور سرور بخشتا ہے۔

تختِ طاؤس

شاہجہان شان و شوکت کا بڑا دلدادہ تھا اس نے دربار میں بیٹھنے کے لئے تختِ طاؤس بنوایا جس کو لال قلعہ دہلی کے اندر دیوان خاص میں نصب کیا گیا۔ یہ ۱½ ۳ گز لمبا۔ ڈھائی گز چوڑا اور پانچ گز اونچا تھا۔ یہ سات سال کی محنت اور ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ تختِ طاؤس کے دونوں جانب سونے کے دو جڑاؤ مور تھے جو اپنی چونچوں میں بیش بہا موتیوں کے ہار لئے یوں کھڑے تھے گویا ابھی محوِ رقص ہوا چاہتے ہیں۔ یہ تخت زمرد سے مرصع بارہ ستونوں پر قائم تھا اور شاہجہان کی جدت پسندی اور ذوقِ سلیمہ کا آئینہ دار تھا۔ نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں برصغیر پر حملہ آور ہوا تو وہ بے شمار زر و جواہرات کے ساتھ تختِ طاؤس کو بھی ہمراہ لے گیا۔ شاہجہان کا یہ تختِ طاؤس جو تمام کا تمام بیش قیمت زر و جواہرات سے مرصع تھا اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کرتا تھا اپنی بناوٹ، مرصع کاری اور لاگت کے اعتبار سے نوادراتِ زمانہ میں شمار ہوتا تھا۔

Marfat.com

عہدِ مغلیہ کا سنہری دَور

شاہجہان کا تیس سالہ (۱۶۲۷ تا ۱۶۵۸ء) عہد حکومت مغلیہ سلطنت کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے۔ اس عہد میں خوشحالی اور امن وامان کا دور دورہ تھا۔ نظام سلطنت عمدہ، عدالتی نظام محکم، عدل وانصاف مثالی اور خزانہ شاہی دولت سے بھرپور تھا۔ شاہجہان کا دربار شان وشوکت اور آرائش کے لحاظ سے بے مثل تھا اس دور میں بحیثیتِ مجموعی امن وامان اور سکون قائم رہا۔ نیز اس دور میں علوم وفنون اور زراعت وتجارت کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا۔ حکومت کے انصاف اور اس کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ ہندو اور مسلم رعایا نہ صرف امن وچین کی زندگی بسر کر رہی تھی بلکہ سب کو بلا تمیز مذہب وملت یکساں طور پر ترقی کے مواقع حاصل تھے۔

امن وامان کا دور:

شاہجہان کا دورِ حکومت مغلیہ سلطنت کا بہترین زمانۂ امن تھا اس دور میں بحیثیت مجموعی داخلی اور خارجی اعتبار سے مکمل امن وامان اور سکون قائم رہا۔ اگرچہ اس عہد کے آغاز میں چند بغاوتیں رونما ہوئیں لیکن شاہجہان نے انہیں خوش اسلوبی سے کچل دیا۔ راجپوت شاہجہان کے وفادار تھے۔ دکن کی شیعہ ریاستیں گولکنڈہ اور بیجاپور اطاعت قبول کر کے باجگذار بن چکی تھیں۔ عبدالحمید لاہوری کے قول کے مطابق "اگرچہ شاہجہان کی حدودِ سلطنت کافی وسیع تھیں لیکن اس تیس سالہ دور میں کسی کو سرکشی اور امن وامان کو تباہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی"۔ [1]

اطالوی سیاح منوچی تحریر کرتا ہے "شاہجہان کا نظم ونسق نہایت عمدہ تھا وہ ایک جفاکش اور فرض شناس، رحمدل اور مشفق حکمران تھا اس نے امن وامان قائم کر کے رعایا کو خوشحالی سے ہمکنار کیا"۔

خوشحالی کا زمانہ:

شاہجہان کا عہد آسودگی اور خوشحالی کا عہد تھا۔ عوام آسودہ حال اور تجارت ترقی پذیر تھی۔ شاہجہان کے انجینئر متصدار علی مردان خاں نے ہزیں کھدوا کر ملک کو زراعتی اعتبار سے خوشحال بنا دیا تھا۔ کاشتکار آسودہ حال اور فارغ البال تھے۔ زراعت اسقدر ترقی پذیر تھی کہ صوبوں سے وصول ہونیوالے مالیہ کی آمدن ۴۵ کروڑ روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی اور اشیائے خوردنی بافراط اور ارزاں ہوگئیں مال ودولت کی فراوانی کا عالم

---

[1] پادشاہ نامہ

Marfat.com

یہ تھا کہ شہنشاہ سرکاری تقریبات پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتا تھا اور تمام تہوار بڑی شان و شوکت سے منائے جاتے تھے۔

انتظامِ سلطنت: شاہجہان کو نظم و نسق سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ عدل و انصاف کو برقرار رکھنے کے لئے سخت ترین سزائیں دیا کرتا تھا۔ فرانسیسی سیاح ٹریورنیئر شاہجہان کے انتظامِ سلطنت کے بارے میں لکھتا ہے کہ "شاہجہان اگرچہ عدل و انصاف میں سخت گیر تھا لیکن اس نے ملکی مالیات اور نظم و نسق کو سنوار کر دیگر حکمرانوں پر سبقت حاصل کی۔ وہ بادشاہ ضرور تھا لیکن اس کی حکمرانی میں پدرانہ عنصر غالب تھا وہ رعایا کو اپنے بچے اور خاندان کے افراد سمجھتا تھا۔" اس عہد میں کئی ایک انتظامی اصلاحات نافذ ہوئیں۔ بادشاہ نے بدھ کا دن مقدمات سننے کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ تنازعات کے تصفیہ کے لئے مقامی طور پر عدالتیں قائم تھیں جن کے فیصلوں کے خلاف صوبائی قاضی یا دیوان کے ہاں اپیل کی جا سکتی تھی۔ صوبائی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں مرکزی دیوان یا قاضی القضاۃ سنتا تھا اس کے اوپر بادشاہ کی عدالت تھی۔ سلطنت میں مساوی انصاف پر مبنی ایک مثالی نظام قائم تھا۔

صنعتی و تجارتی ترقی: شاہجہان کے عہد میں صنعتی و تجارتی ترقی اپنے عروج پر تھی۔ برصغیر مغربی یورپی اور ایشیائی ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات قائم تھے۔ برصغیر کا مال ایشیا اور یورپ کی تمام منڈیوں میں جاتا تھا۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں حکومت کے زیرِ نگرانی روئی۔ ریشم اور متعدد دیگر صنعتی کارخانے قائم تھے جہاں قیمتی ملبوسات اور دیگر سامان تیار ہوتا تھا۔ ان کارخانوں میں ہزاروں کاریگر اور مزدور معقول مشاہروں پر ملازم تھے۔ صنعت ترقی پذیر تھی اور مزدور طبقہ آسودہ حال تھا۔ برنیئر رقمطراز ہے کہ "برآمدی تجارت کیلئے یہاں اشیاء کی اس قدر فراوانی ہے کہ کوئی ملک اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتا۔ ریشم، شکر، روئی اور سوتی کپڑا، تلمی شورہ، افیون، مصالحہ جات اور ادویہ ایشیا اور یورپ کے ممالک کو بھیجی جاتی ہیں۔ مغربی ساحل پر سورت ایک بڑا تجارتی شہر ہے۔ وہاں کا ایک تاجر پیرجی جوہرہ دنیا کا دولتمند ترین سوداگر شمار کیا جاتا ہے۔ تجارتی قافلوں اور سوداگروں کے تحفظ کے لئے سارے ملک میں قلعہ نما سرائیں موجود ہیں جن کے دروازے سرِشام بند کر دیئے جاتے ہیں۔" الغرض برصغیر کو ضروریاتِ زندگی کا گھر کہا جاتا تھا۔ صنعت و حرفت اور تجارت ترقی پذیر تھی۔ سڑکیں محفوظ اور تجارت پیشہ لوگ بے خوف و خطر سفر کرتے تھے۔

عوامی فلاح و بہبود: شاہجہان کو اپنی رعایا سے پدرانہ قسم کی محبت تھی۔ بدیں وجہ وہ ہر لمحہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ ابتدائی دور

Marfat.com

میں دکن اور گجرات میں قحط پڑا تو بادشاہ نے قحط زدگان میں نقد روپیہ تقسیم کرنے کے علاوہ نہ صرف اناج تقسیم کیا بلکہ ہر جگہ شاہی لنگر خانے کھول دیئے۔ مزید برآں حکومت نے قحط زدہ علاقوں میں ستر لاکھ روپیہ واجب الوصول مالیہ بھی معاف کر دیا۔ اسی طرح ۱۶۴۱ء میں کشمیر اور ۱۶۴۶ء میں پنجاب میں قحط پڑا تو جگہ جگہ شاہی لنگر خانے قائم کئے گئے اور حکومت نے امدادی کاموں پر چالیس ہزار روپیہ خرچ کیا۔

علوم و فنون کی ترقی :

شاہجہان علوم و فنون کا دلدادہ اور جوہر شناس بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کو بھی بہت ترقی حاصل ہوئی۔ بڑے بڑے جید علماء اور شعراء شاہجہانی دربار سے وابستہ تھے۔ اس عہد میں متعدد کتابوں کے فارسی میں تراجم شائع ہوئے اور علماء فضلاء و شعراء اور فنکاروں کی قدر افزائی ہوئی۔ شاہجہان انہیں فیاضانہ انعام و اکرام سے نوازتا رہتا تھا۔ اس کے عہد میں علم نجوم، علم موسیقی، فن مصوری اور خوش نویسی کو حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ مشہورِ زمانہ موسیقار تان سین کا داماد لال خاں عہدِ شاہجہانی کا مشہور ترین موسیقار تھا۔ شاہجہان نے اسے "گن سمندر" کا خطاب دیا تھا۔ شاہجہان کا عہدِ حکومت فن تعمیر کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اس عہد میں بے شمار مشہورِ زمانہ عمارات تعمیر ہوئیں جو حسن و نزاکت اور زیبائش و دلآویزی کے نادر ترین تعمیراتی شاہکار ہیں۔ اس عہد کی سب سے زیادہ مشہور عمارت تاج محل آگرہ ہے جس کا دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے جو فن تعمیر کا ایک غیر فانی اور بے مثال شاہکار ہے بلاشبہ "وہ ایک خواب ہے جسے سنگ مرمر میں ڈھال دیا گیا ہے"۔

اسی طرح آگرہ کی موتی مسجد جسے پتھر کی زبان میں شاعری A POEM OF FERVENT STONE کہا گیا ہے۔ شاہجہان کا تختِ طاؤس جو سات سال کی محنتِ شاقہ سے تین کروڑ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا تھا بھی شاہجہان کے جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار تھا۔ سر ولیم ہنٹر تحریر کرتے ہیں "شاہجہان کے دور میں سلطنت مغلیہ نے شاہانہ استحکام اور شان و شوکت کے لحاظ سے اپنی انتہائی رفعتوں کو چھو لیا"۔

شاہجہان کا ذاتی کردار :

اس عہد کو سنہری اور رنگین بنانے میں شاہجہان کے کردار کو بھی بہت دخل حاصل ہے اس کے کردار کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اسے علوم و فنون سے گہری دلچسپی تھی رعایا کی فلاح و بہبود کا ہمیشہ خیال رکھتا تھا اور شان و شوکت کا بے حد دلدادہ تھا۔ اس کی درباری آرائش اپنے باپ جہانگیر اور دادا اکبر سے بہت بڑھ گئی تھی۔ اپنی رعایا سے اس کا رویہ مشفقانہ اور پدرانہ تھا۔ اس نے تمام عمر مذہبی رواداری کو بحال رکھا۔ شاہجہان نے اپنے عہد اقتدار میں سلطنت مغلیہ کو ہر پہلو سے ترقی و استحکام سے ہمکنار کیا۔

Marfat.com

شاہجہان کے آخری ایام

شاہجہان کی زندگی کے آخری آٹھ سال قلعہ آگرہ کے مثمن برج میں بحالتِ نظربندی گذرے جہاں اسے بادشاہت کے سوا زندگی کی ہر ایک راحت و آرائش میسر تھی۔ اس کی چہیتی بیٹی جہاں آرا بیگم ہر وقت اس کی خدمت میں رہتی تھی۔ مگر اورنگ زیب کے مامور کردہ محافظوں کی موجودگی کے بغیر وہ کسی سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ خط و کتابت اور مراسلت پر بھی پابندی عائد تھی۔ شروع میں شاہجہان نے اورنگزیب کے خلاف اپنی خفیہ کارروائیاں جاری رکھیں اس نے شہزادوں مراد، شاہ شجاع اور کابل کے گورنر مہابت خاں کو خفیہ خط و کتابت کے ذریعہ اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اورنگزیب نے اس کی کسی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا بلکہ مزید احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہوئے شاہجہان کی نگرانی پر مامور خواجہ سراؤں اور ملازمین کو ہٹا دیا اور ان کی جگہ اپنے خاص داروغہ سرا مامور کئے۔ شاہی خط و کتابت کی نگرانی سخت کر دی گئی جس پر شاہجہان بہت برہم ہوا۔ جس کے جواب میں اورنگزیب نے کسی قسم کے اشتعال و ناراضگی کی بجائے مودبانہ انداز میں تحریر کیا:

"یہ گنہگار سراپا تقصیر نہیں جانتا کہ کیا طریق کار اختیار کرے تاکہ عالی جاہ کے عتاب سے محفوظ رہے۔"

بہرحال کچھ عرصہ گذرنے کے بعد شاہجہان کی خفگی و ناراضگی جاتی رہی بلکہ اس نے اورنگزیب کو ایک خط کے ذریعہ معاف بھی کر دیا اور باقاعدہ امور سلطنت میں مفید مشورے دینے لگا۔ اس کی زندگی کے آخری ایام عبادت گذاری میں بسر ہوئے۔ جنوری ۱۶۶۶ء میں اسے شدید علالت نے آگھیرا۔ مرنے سے پیشتر اس نے وصیت تحریر کرائی اور بالآخر ۲۲۔ جنوری ۱۶۶۶ء کو چوہتر سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مرتے وقت اس کی نگاہیں تاج محل پر جمی ہوئی تھیں وصیت کے مطابق اسے تاج محل آگرہ میں ممتاز محل کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

کردار: شاہجہان مغل حکمرانوں میں سب سے زیادہ پرشکوہ شخصیت کا حامل تھا وہ ایک خوبرو انسان تھا اس کے خدوخال میں بڑی کشش تھی۔ اس کا قد درمیانہ اور رنگ کسی قدر سفید تھا اس کی پیشانی کشادہ آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ تھیں۔ حسن اخلاق کا مجسمہ اور عادات و اطوار کے اعتبار سے اعلیٰ شائستگی کا پیکر تھا اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت شہنشاہ اکبر کے زیر نگرانی ہوئی تھی اسے فارسی، عربی، ترکی اور ہندی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ شجاعت اور فوجی قابلیت کے لحاظ سے وہ سلطنت مغلیہ کا ایک بہترین جرنیل تھا۔ اس کی جنگی قابلیت ہی سے خوش ہو کر جہانگیر نے شاہجہان کا خطاب دیا تھا۔ وہ فنونِ لطیفہ کا سرپرست، موسیقی، مصوری، فنِ تعمیر اور آرائش کا دلدادہ تھا۔

Marfat.com

شاہجہان ایک شفیق باپ اور ایک پرخلوص اور وفادار خاوند تھا۔ اپنی بیوی ارجمند بانو بیگم ممتاز محل کا بہت گرویدہ تھا۔ اس کی وفات پر اس نے اتنے غم و اندوہ کا اظہار کیا کہ سات روز تک جھروکہ درشن میں نہ آیا شدت غم کے باعث دو برس کے قلیل عرصہ میں ہی اس کے تمام مال سفید ہو گئے۔ بعض مورخین بالخصوص وی اے سمتھ شاہجہان کو نافرمان بیٹا اور ظالم ثابت کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ شاہجہان نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت برپا کر کے نافرمان بیٹا ہونے کا اور خسرو کو قتل کروا کر نیز تخت کے دیگر دعویداروں کا صفایا کروا کر اپنے ظالم ہونے کا ثبوت دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے ابتدا میں باپ کی نافرمانی کی اور علم بغاوت بلند کیا اور حصولِ تخت کے لئے اپنے بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگے مگر مغل بادشاہوں کی تاریخ میں قانون وراثت کے فقدان کے باعث ایسی مثالیں عام تھیں اور شاہجہان کے دور تک ایک خاندانی روایت کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ اس نے تخت نشین ہو کر نہ صرف اپنی نافرمانی کی تلافی کی بلکہ باپ سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے جہانگیر کے مزار پر ایک خوبصورت اور مغلیہ فن تعمیر کا شاہکار مقبرہ تعمیر کروایا۔

شاہجہان راسخ العقیدہ سنی مسلمان، مذہبی فرائض کا پابند اور دین اسلام کا خیر خواہ تھا۔ وہ حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانی کا مرید تھا اور شیخ کی "تحریکِ احیائے دین" کا زبردست حامی تھا۔ تخت نشین ہو کر اس نے صحیح اسلامی روایات قائم کرتے ہوئے دربار میں رائج غیر شرعی رسومات کو یکسر ختم کر دیا۔ اکبر اعظم کی مانند رواداری پالیسی کا حامی تھا اس نے ہندوؤں کو مکمل مذہبی آزادی اور حسبِ سابق بلند مناصب اور اعلیٰ عہدے عطا کئے۔ بقول لین پول؛

"شاہجہان اپنی نرم دلی اور خیر اندیشی کے لئے مشہور تھا۔ اور اپنی رعایا میں بیحد مقبول اور ہر دلعزیز تھا۔"

شاہجہان کو مغل حکمرانوں کی تاریخ میں بجا طور پر عمارات کا شہزادہ اور انجینئر بادشاہ شمار کیا جاتا ہے وہ نہایت سلجھے ہوئے ذوق کا آدمی اور شکوہ و تجمل کا دلدادہ تھا۔ اس کا یہ ذوق و شوق علوم و فنون کی ترقی اور تعلیم و تعلم کے نشوونما کا باعث بنا۔ اس کے دربار میں شعراء، علماء اور موسیقاروں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ فارسی اور ہندی ادبیات نے بہت ترقی کی مصوری و نقاشی کا درجہ بلند ہوا۔ مغلیہ فن تعمیر منتہائے کمال کو پہنچا۔

شاہجہان ایک رحمدل، عادل، امن پسند اور فرض شناس حکمران تھا۔ گو وہ شیر شاہ سوری کی مانند مطلق العنان حکمران تھا مگر جبر و استبداد کا قائل نہ تھا۔ امور سلطنت کی طرف ذاتی توجہ دیا کرتا تھا۔ تمام شکایتوں کو دور کرنا اپنا فرض منصبی خیال کرتا تھا۔ قحط کے زمانے میں اس نے قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لئے ہر ممکن امداد فراہم کی۔ بہت سے لنگر خانے جاری کئے اور محاصل معاف کر دیئے۔

Marfat.com

اس کے عہدِ حکومت کا نظم و نسق عمدہ اور عدالتی نظام قابلِ قدر تھا وہ انسدادِ جرائم کے لئے مجرموں کو سخت سزائیں دیتا تھا۔ شاہجہان نے مسافروں کی سہولت کے لئے قلعہ نما سرائیں تعمیر کروائیں جس سے ملک میں صنعت و حرفت اور تجارت ترقی پذیر ہوئی اور عوام خوشحال ہو گئے۔ اس کا دربار شاہانہ جاہ و جلال، شان و شوکت اور جمال و آرائش کے اعتبار سے انتہائی پرشکوہ دربار تھا۔ الغرض اگر اسے ایک مثالی حکمران کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

شاہجہان کے کردار کے بارے میں مؤرخین کے اقوال کافی دلچسپ ہیں ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

۱۔ ٹریور ہیئر:

"اس نے (شاہجہان نے) اپنی رعایا پر ایک بادشاہ کی بجائے ایک شفیق باپ کی مانند حکومت کی وہ اعلیٰ انتظام سلطنت، نظم و ضبط، مالیات اور عدلِ محکم میں دوسرے فرمانرواؤں پر سبقت لے گیا۔"

۲۔ وی۔ اے۔ سمتھ:

"شاہجہان کے ذاتی کردار کا جائزہ لیا جائے یا اس کے نظامِ حکومت کی خوبیوں کا بلاشبہ اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ اس کا عہدِ حکومت مغلیہ خاندان اور سلطنت مغلیہ کے انتہائی عروج کا عہد ہے۔"[1]

۳۔ پروفیسر ایس اے رشید:

"امن و امان اور خوشحالی کے لحاظ سے شاہجہان کا دورِ حکومت برصغیر میں اسلامی حکومت کا پرشکوہ اور درخشندہ ترین دور تھا۔ یہ تجارت، صنعت و حرفت، لسانیات، ادب اور فنونِ لطیفہ نیز فنِ تعمیر کے ارتقاء کا دور تھا۔"[2]

شاہجہانی عہد کی معروف شخصیتیں

۱۔ آصف خاں: آصف خاں کا اصل نام ابوالحسن تھا۔ وہ مرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ کا بیٹا ملکہ نورجہاں کا بھائی اور ملکہ ارجمند بانو بیگم ممتاز محل کا باپ تھا۔

---

[1] "دی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا"، ایڈیشن سوم صفحہ ۴۰۰

[2] "دی شارٹ ہسٹری آف پاکستان" جلد سوم صفحہ ۸۶

Marfat.com

وہ اعلیٰ درجہ کا سیاستدان اور ایک ممتاز جرنیل تھا۔ اس نے حصول تخت میں اپنے داماد شاہجہان کی بڑی دانشمندی سے مدد کی۔ شاہجہان نے تخت نشین ہو کر اسے نہ صرف وزیر اعظم مقرر کیا اور پچاس لاکھ روپیہ سالانہ آمدن کی جاگیر عطا کی بلکہ نو ہزاری ذات و سوار کے منصب اور یمین الدولہ کے لقب سے بھی نوازا۔ آصف جاہ نے اپنے عہد وزارت میں نہایت دیانتداری اور جانفشانی سے امور سلطنت کی انجام دہی کی۔ اسے ہندی اور سنسکرت سے بڑا لگاؤ تھا۔ ۱۶۴۱ء میں اس نے لاہور میں وفات پائی اور شاہدرہ میں دفن ہوا۔ ۱۶۴۱ء میں اس نے اس کی آخری آرامگاہ پر دوہرے گنبد کا ایک خوب صورت اور عالیشان مقبرہ تعمیر کروایا۔ جو ساخت کے لحاظ سے متعلیہ فن تعمیر کا ایک نادر شاہکار تھا جس کی زیبائش و آرائش سنگ مرمر سے کی گئی لیکن سکھوں کے دور حکومت میں اس کا تمام سنگ مرمر اتار کر اس کی آرائش کو ختم کر دیا گیا۔ آج کل یہ مقبرہ خستہ حالت میں دکھائی دیتا ہے۔

۲۔ علی مردان خان

علی مردان خان اپنے باپ گنج علی خاں کی وفات کے بعد ناظم قندھار مقرر ہوا۔ شاہ ایران نے علی مردان خان کو اس کے باپ کے خطاب کی نسبت سے بابائے ثانی کے خطاب سے نوازا۔ علی مردان خان کی ترقی سے ایرانی دربار کے امرا نہ صرف جلتے اور حسد کرتے تھے بلکہ بادشاہ کو اس کے خلاف بدظن کرنے میں بھی کوشاں رہتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ اس سے بدظن رہنے لگا۔ علی مردان خاں نے اپنے سترہ سالہ فرزند اکبر محمد علی خاں کو ایرانی دربار میں بھیج کر غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہا لیکن شاہ طہماسپ امرا کے بہکانے پر اس کے خلاف اس قدر غلط فہمیوں میں مبتلا ہو چکا تھا کہ اس نے علی مردان خاں کی گرفتاری اور قتل کا حکم دیدیا۔ اس پر ۱۶۳۷ء میں علی مردان خاں نے شاہ ایران کے رویے سے برگشتہ ہو کر کابل کے مغل گورنر سعید خاں سے ساز باز کر کے قندھار مغلوں کے حوالے کر دیا اور خود ۱۶۳۸ء میں لاہور پہنچ کر شاہجہان کی اطاعت قبول کر لی۔ شاہجہان نے نقد انعام کے علاوہ اسے خلعت فاخرہ عطا کی۔ نیز شش ہزاری ذات و سوار کا منصب دیکر ناظم کشمیر مقرر کیا۔ بعد ازاں ۱۶۳۹ء میں اس کو امیر الامرا کا خطاب اور ہفت ہزاری ذات و سوار کا منصب دیکر پنجاب کا صوبیدار بنا دیا گیا۔ ۱۶۴۵ء میں علی مردان خاں کو پہلے شہزادہ مراد کے ساتھ اور بعد میں اورنگ زیب کے ہمراہ بدخشاں کی مہم پر روانہ کیا گیا۔ ان لڑائیوں میں اس نے ازبکوں کیساتھ کچھ ایسی جرأت و شجاعت سے جنگ لڑی کہ اورنگزیب نے اسے مرحبا آفرین لکھ بھیجا۔

۱۶۵۷ء میں امیر الامرا علی مردان خاں بعارضہ اسہال بیمار ہوا اور مغل بادشاہ کی اجازت سے کشمیر روانہ ہوا لیکن راستے ہی میں اپریل ۱۶۵۷ء میں انتقال کر گیا۔ اس کی وصیت کے

Marfat.com

مطابق اسے اس کی ماں کے پہلو میں امیرالامرا کے باغ میں دفن کیا گیا جہاں علی مردان خان نے اپنی زندگی ہی میں ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کروا رکھا تھا۔

علی مردان خاں ایک زبردست انجینئر تھا اسے باغات و عمارات کی تعمیر کا بڑا شوق تھا اس نے متعدد نہریں جاری کر کے ملک کی زراعت کو ترقی دی جن میں دہلی کی نہر جو شہر اور قلعہ کے درمیان جاری ہے۔ دوسری دہلی سے حصار جانے والی نہر نیز شالامار باغ کو سیراب کرنے کے لئے مادھوپور کے مقام سے دریائے راوی سے نکالی ہوئی اسی میل لمبی نہر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ نہر راستے میں واقع اراضی کو بھی سیراب کرتی تھی۔ پنجاب کی صوبیداری کے زمانے میں اس نے شاہجہان کی فرمائش پر شالامار باغ تعمیر کروایا۔ اور امیرالامرا کے باغ میں اپنی والدہ کی آخری آرام گاہ پر ایک مقبرہ تعمیر کروایا جو مغلیہ فن تعمیر کا ایک خوبصورت شاہکار ہے۔ اس میں تین قبریں ہیں ایک قبر بچہ ہے جو غالباً علی مردان خاں کی والدہ کی ہے باقی دو قبریں خام ہیں ایک نواب علی مردان خاں کی دوسری اس کے کسی فرزند یا خویش کی ہے۔ علی مردان خاں کا یہ مقبرہ ریلوے جنرل سٹور مغلپورہ لاہور میں واقع ہے۔

۳۔ علامی سعداللہ خاں چنیوٹی

سعداللہ خاں چنیوٹی عہد شاہجہانی کا ایک ممتاز اور جید عالم تھا۔ وہ چنیوٹ کے ایک غریب خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس نے محض اپنی خداداد قابلیت اور علمی استعداد کی بدولت ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اور ۱۶۴۰ء میں شاہی ملازمت پر متعین ہوا۔ شاہجہان نے اس کی تنظیمی قابلیت اور دیانتداری سے متاثر ہو کر ۱۶۴۶ء میں اسے بلخ کی مہم پر مامور کیا اور بعد ازاں ہفت ہزاری ذات و سوار کا منصب عطا کر کے وزیر مقرر کیا۔ اس نے اپنی تنظیمی قابلیت سے سلطنت کے نظم و نسق کو بہتر بنا کر امن و امان قائم کیا۔ وہ علوم و فنون کا سرپرست اور اہل علم و فن کا قدردان تھا۔ اس نے اپنے آبائی وطن چنیوٹ میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کروائی جس کے مینار نیز ہوا سے جھولتے تھے۔ وہ اب بھی موجود ہے۔ سعداللہ خاں نے ۷ اپریل ۱۶۵۶ء کو وفات پائی۔

۴۔ میر جملہ

میر جملہ کا اصل نام محمد سعید تھا وہ اصفہان کے ایک مشہور خاندان سادات کا چشم و چراغ اور شیعہ مذہب کا حامی تھا۔ ۱۶۲۰ء میں وہ جواہرات کے ایک تاجر کے ہمراہ دکن کی ریاست گولکنڈہ پہنچا۔ کچھ عرصہ کے بعد تاجر نے وفات پائی تو میر جملہ اس کی تمام جائیداد کا وارث بن گیا۔ اس سے اس کی اہمیت و شہرت میں خاصا اضافہ ہوا چنانچہ اس کی ثروت و امارت سے متاثر ہو کر عبداللہ قطب شاہ والئے گولکنڈہ نے اسے دربار شاہی

Marfat.com

ہیں ایک خصوصی مرتبہ عطا کیا۔ وہ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی استعداد و قابلیت کی بدولت ریاست گولکنڈہ کی وزارت عظمیٰ کے منصب تک پہنچ گیا۔

میر جملہ توپیں ڈھالنے کے فن میں بہت ماہر تھا۔ اس نے بحیثیت وزیر اعظم گولکنڈہ کی افواج کو از سر نو منظم کیا اور کرناٹک کے علاقہ کو فتح کر کے ریاست کی حدود کو بھی وسعت دی۔ عبداللہ قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ نے میر جملہ کو کرناٹک میں جاگیر عطا کی۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد میر جملہ کی روز افزوں طاقت و مقبولیت سے حاسد و بدگمان ہو کر والیٔ گولکنڈہ اس کے زوال کے درپے ہوا، اور اسے گرفتار کر کے اندھا کر دینے کی سازش کی۔ مگر میر جملہ نے دکن میں مغل مقبوضات کے مغل صوبیدار شہزادہ اورنگ زیب کی پناہ حاصل کر کے مغلیہ ملازمت اختیار کر لی۔ اورنگ زیب نے اسے سفارشی مکتوب دے کر اپنے باپ شاہجہان کے پاس آگرہ روانہ کیا جہاں شاہجہان نے اسے اپنا وزیر اعظم بنا لیا اور چھ ہزاری ذات و سوار کا منصب عطا کیا۔ میر جملہ اعلیٰ عسکری صلاحیتوں سے مزین ایک کامیاب جرنیل اور منتظم تھا۔ وہ شہزادہ اورنگ زیب عالمگیر کا بڑا گہرا دوست تھا۔ اورنگ زیب نے تخت نشین ہونے کے بعد اسے بنگال کا گورنر مقرر کر کے آسام کی تسخیر پر مامور کیا۔ میر جملہ آسام کی مہم سے کامیاب لوٹ رہا تھا کہ راستے میں اس نے مارچ ۱۶۶۳ء میں وفات پائی۔

شاہجہانی دور کے غیر ملکی سیاح

سترھویں صدی عیسوی میں برصغیر پاک و ہند کی عظمت و شوکت اور مال و زر کی داستانیں تمام یورپ میں گونج رہی تھیں۔ چنانچہ شاہجہان کے دور میں بہت سے یورپی سیاح برصغیر میں وارد ہوئے۔ شاہی دربار کے تزک و احتشام اور جاہ و جلال نیز ملک میں مال و زر کی کثرت نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ ان سیاحوں نے اپنے سیاحت ناموں میں برصغیر کے حالات، شاہجہان کے کردار اور اس کے عہد حکومت پر خاصی روشنی ڈالی ہے ان سیاحوں میں برنیئر، ٹریورنیئر، مینڈیسلو پیئر منڈی اور منوچی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ **برنیئر:** یہ ایک فرانسیسی ڈاکٹر تھا۔ وہ شاہجہان کے بیٹوں کے مابین تخت نشینی کی جنگ کے دوران ۱۶۵۸ء کو برصغیر پاک و ہند میں آیا۔ اس نے مغلیہ دربار کی شان و شوکت، ملک میں دولت کی بہتات اور تجارتی ترقی کی بہت تعریف کی

Marfat.com

کی ہے وہ صوبہ بنگال کی زرخیزی اور تجارتی خوشحالی کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔ وہ عظیم مغل فوج اور سلطنت کی آمدنی و اخراجات کے بارے میں بھی اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔

۲۔ **ٹوکیو رنیئر:** یہ ایک فرانسیسی جوہری تھا وہ کافی عرصہ برصغیر میں مقیم رہا۔ وہ شاہجہان کے نظم و نسق، عدل و انصاف اور رعایا سے اس کے سلوک کی مدح سرائی کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ "شاہجہان نے اپنی رعایا پر ایک بادشاہ کی بجائے ایک مشفق باپ کی مانند حکومت کی وہ اعلیٰ انتظامِ سلطنت، نظم و ضبط، مالیات اور عدلِ محکم میں دوسرے فرمانرواؤں پر سبقت لے گیا۔"

۳۔ **مینڈلسلو:** مینڈلسلو ایک جرمن نژاد سیاح تھا۔ ۱۶۳۳ء میں ڈیوک آف ہولسٹن کے سفیروں کے ہمراہ ایرانی شہنشاہ کے حضور حاضر ہوا تھا۔ وہاں سے وہ برصغیر پہنچا۔ اس نے سورت اور آگرہ کی سیاحت کی۔ وہ آگرہ کی خوبصورتی اور شان و شوکت کی بہت تعریف کرتا ہے۔ لیکن شاہجہان کے انتظامِ سلطنت کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "شاہراہیں غیر محفوظ اور صوبائی حکومتیں راشی اور بددیانت ہیں۔"

۴۔ **پیٹر منڈی:** یہ ایک انگریز تاجر تھا وہ برصغیر میں اس زمانے میں وارد ہوا جب جنوبی برصغیر میں قحط پھیلا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف قحط سالی کے مصائب بیان کرتا ہے بلکہ شاہراہوں کے غیر محفوظ ہونے کا بھی ذکر کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ مجرموں کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔

۵۔ **منوچی:** یہ ایک اطالوی سیاح تھا اس کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ "شاہجہان کا نظم و نسق سلطنت نہایت عمدہ ہے اس نے امن و امان قائم کرکے رعایا کو خوشحالی سے ہمکنار کیا ہے۔ وہ رحمدل اور مشفق حکمران ہے اور اپنی رحمدلی و فراخدلی کی بنا پر رعایا میں ہر دلعزیز ہے۔"

اہم تاریخیں

۱۶۲۸ء شاہجہان کی تخت نشینی۔
۱۶۳۰ء دکن میں قحط۔ سیواجی مرہٹہ کی پیدائش۔
۱۶۳۱ء ارجمند بانو بیگم ممتاز محل کی وفات۔ ہگلی کے پرتگیزوں کے خلاف فوجی کارروائی۔

Marfat.com

۱۶۳۴ء جھجھار سنگھ بندھیلہ کی بغاوت، سات سال میں تختِ طاؤس کا ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوتا۔ بنگال میں انگریزوں کو تجارت کرنے کے اجازت نامہ کا اجراء

۱۶۳۸ء قندھار کے ایرانی گورنر علی مردان خاں کا قلعہ قندھار مغلوں کے حوالے کرنا۔

۱۶۴۵ء تاج محل کی تعمیر کا پایۂ تکمیل کو پہنچنا۔

۱۶۴۶ء بلخ کی تسخیر پہ شہزادہ مراد کا تقرر۔ قندھار پر ایران کا قبضہ۔

۱۶۴۷ء بلخ اور بدخشاں کی مہم پہ اورنگ زیب کا تقرر۔

۱۶۴۸ء قندھار پہ ایرانیوں کا قبضہ۔ منوچی کی برصغیر میں آمد۔

۱۶۵۱ء ہگلی کے مقام پہ انگریزوں کی پہلی تجارتی کوٹھی کا قیام۔

۱۶۵۳ء قندھار کی مہم پہ دارا شکوہ کا تقرر اور دکن کی نیابت پر اورنگ زیب کی تقرری۔

۱۶۵۶ء وزیر علامی سعداللہ خاں چنیوٹی کی وفات۔ گولکنڈہ پر اورنگ زیب کا حملہ۔ میر جملہ کا شاہجہان کے حضور کوہِ نور ہیرا پیش کرنا۔

۱۶۵۷ء بیجاپور کے خلاف اورنگ زیب کی فوجی کارروائی۔ جنگ تخت نشینی کا آغاز اور اس میں اورنگ زیب کی کامیابی۔

۱۶۵۸ء شاہجہان کی قلعہ آگرہ کے مثمن برج میں نظربندی، اورنگ زیب کی تخت نشینی۔

۱۶۶۶ء شاہجہان کی وفات۔

امتحانی سوالات

۱۔ شاہجہان کی ابتدائی زندگی اور اس کی تخت نشینی کے حالات پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ شاہجہان کے عہد میں مختلف بغاوتوں اور پرتگیزوں کے خلاف فوجی کارروائی کا حال قلم بند کیجیے۔

۳۔ شاہجہان کی 'وسط ایشیائی پالیسی' کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔ یا

"وسط ایشیا کی تسخیر شاہجہان کا محض ایک حسین خواب تھا جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔" تبصرہ کیجیے۔

۴۔ صلحنامۂ بیجاپور ۱۶۳۶ء تک دکن میں مغلوں کی وسعت پذیری کا حال تحریر کیجیے۔

۵۔ شاہجہان کے بیٹوں کے درمیان جنگ تخت نشینی کا حال بیان کیجیے اور اس میں اورنگزیب

Marfat.com

کی کامیابی کی وجوہات واضح کیجئے

۶۔ شاہجہان کے بیٹوں کے درمیان جنگ تخت نشینی کے اسباب قلمبند کریں۔

۷۔ "شاہجہان کو بلاشبہ عمارات کا شہزادہ اور انجینئر بادشاہ" کہا جاتا ہے۔ تشریح کیجئے۔

۸۔ شاہجہان کے عہد کو مغلوں کا سنہری زمانہ گنا جاتا ہے، وضاحت کیجئے۔

۹۔ شاہجہان کے کردار کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالئے۔

۱۰۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ تحریر کیجئے۔

۱۔ ممتاز محل
۲۔ تاج محل
۳۔ داراشکوہ
۴۔ جہاں آرا بیگم
۵۔ آصف جاہ
۶۔ نواب علی مردان خان
۷۔ علامی سعداللہ خاں چنیوٹی
۸۔ میر جملہ
۹۔ مسئلہ قندھار
۱۰۔ شاہجہانی دور کے غیر ملکی سیاح

Marfat.com

آٹھواں باب

محی الدّین محمّد اورنگ زیب عالمگیر

(۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء)

"اورنگ زیب نہایت سنجیدہ اور متین تھا اس کی زبان سے کبھی کوئی نامناسب لفظ نہیں نکلتا تھا۔ نہایت رحمدل اور وسیع الظرف تھا۔ اہل کمال کا نہایت قدردان تھا۔ لوگوں سے نہایت اخلاق سے پیش آتا تھا۔ نہایت خشک زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ لہو و لعب کی باتوں سے قطعاً محترز تھا۔ اسلامی دنیا میں اس کے بعد آج تک اس کے برابر کا شخص پیدا نہیں ہوا۔" (شبلی نعمانی)

ابتدائی حالات
۱۶۱۸ء تا ۱۶۵۸ء

اورنگ زیب عالمگیر ۲۴۔ اکتوبر ۱۶۱۸ء کو اجین کے نزدیک گجرات اور راجپوتانہ کے سرحدی مقام دوحد میں پیدا ہوا۔ وہ شاہجہان کا تیسرا بیٹا تھا اور اپنے دوسرے بھائیوں کی بہ نسبت زیادہ لائق، محنتی، ہوشمند اور بیدار مغز سیاستدان تھا۔ شاہجہان کی جہانگیر کے خلاف بغاوت کے ایام میں اسے بڑے سخت حالات سے گذرنا پڑا۔ شاہجہان نے اطاعت قبول کرتے ہوئے جب اپنے باپ جہانگیر سے معافی مانگ لی تو اورنگ اور دارا کو بطور یرغمال شاہی دربار میں بھیجا گیا۔ ان حالات کی بنا پر مغلیہ روایات کے برعکس اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا آغاز دس برس کی عمر سے ہوا۔ وہ نہایت زیرک اور ذہین واقع ہوا تھا۔ عہدِ طفلی ہی میں اس نے عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا اسے دینی علوم سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ بچپن سے ہی سلیم الفطرت، متین، وسیع الظرف، بہادر، لہو و لعب سے مبرّا اور زاہدانہ زندگی کا خوگر تھا وہ دنیاوی الائشوں سے یکسر بیگانہ اور اعلیٰ عادات و اخلاق کا پیکر تھا اور تیموری شہزادوں کے بالکل برعکس مصوری، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ کا قطعی شائق نہ تھا بلکہ فنونِ حرب کا ماہر اور جنگی مہمات کا ہیرو تھا۔ اس نے پندرہ سال کی عمر میں ایک غضبناک ہاتھی کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اپنے باپ شاہجہان سے "بہادر" کا خطاب حاصل کیا۔

۱۶۳۴ء کے اواخر میں اسے دو ہزاری ذات اور چار ہزاری سوار کا منصب عطا ہوا ازاں بعد اسے پہلی عسکری مہم کی قیادت سونپتے ہوئے بندھیل کھنڈ کے باغی سردار ججھار سنگھ

Marfat.com

بندھیلہ کی سرکوبی پر مامور کیا گیا۔ بعد میں ۱۶۳۶ء میں صرف سترہ برس کی عمر میں اسے دکن جیسے اہم صوبے کا گورنر مقرر کیا گیا۔ جہاں وہ ۱۶۴۴ء تک مقیم رہا۔ قیام دکن کے دوران اس نے مرہٹوں کے خلاف سخت کارروائی کی اور صوبے میں نظم و نسق کو درست کرنے کے علاوہ امن و سکون کی فضا پیدا کر کے اپنی اعلیٰ تنظیمی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ ۱۸ مئی ۱۶۳۷ء کو اس کی شادی ایران کے شاہی خاندان کے ایک رکن شاہنواز کی بیٹی دِل رس بانو بیگم سے ہوئی۔ ۱۶۴۴ء میں جب اورنگزیب اپنی بڑی بہن جہاں آرا بیگم کی عیادت کے لئے آگرہ آیا جو کپڑوں میں آگ لگ جانے کی وجہ سے سخت زخمی ہو گئی تھی، تو اس نے اپنے حلاف دارا شکوہ کی ریشہ دوانیوں اور لگائی بجھائی سے درہم برہم ہو کر دکن کی نیابت سے استعفیٰ دیدیا۔ اور ترکِ دنیا اختیار کر کے درویشانہ زندگی اپنانے کا عزم کیا۔ اس پر شاہجہان نے ناراض ہو کر اس کے تمام مناصب چھین لئے مگر فروری ۱۶۴۵ء میں معاف کر کے بحال کر دیئے۔ اور گجرات کا صوبیدار مقرر کر دیا۔ جہاں وہ اپنی وسط ایشیا (بلخ و بدخشاں) کی مہم پر تعیناتی (۱۶۴۷ء) تک مامور رہا۔

وسط ایشیا کی مہم کے دوران اورنگزیب نے اپنے غیر متزلزل عزم، جرأت و استقامت اسلامی شعار اور مستقل مزاجی کا ایسا سکہ بٹھایا کہ دشمن بھی دنگ رہ گیا۔ اس مہم سے واپسی پر اسے ۱۶۴۸ء میں ملتان اور سندھ کا گورنر مقرر کر دیا گیا جہاں وہ ۱۶۵۲ء تک برسر اقتدار رہا۔ اس دوران اس نے کھٹھڑ میں نیا قلعہ تعمیر کروایا اور قندھار کی بازیابی کی مہمات کی قیادت کی۔ قندھار کی دوسری مہم ۱۶۵۲ء میں ناکامی کے بعد شاہجہان نے اسے واپس بلا کر نیابتِ دکن پر دوبارہ متعین کیا۔ اس نیابت کے دوران اس نے دکن کے نظم و نسق کو درست کیا اور مرشد قلی خاں کی مدد سے مالیاتی نظام میں اصلاحات نافذ کر کے نہ صرف زراعت کو ترقی پذیر کیا بلکہ دکن میں خوشحالی اور فارغ البالی کی فضا پیدا کی۔ اس نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں کو تسخیر کر کے ان کا باقاعدہ الحاق کرنا چاہا۔ مگر دارا شکوہ کی مخالفت کی وجہ سے وہ ایسا کرنے سے باز رہا۔ ۱۶۵۸ء تک وہ دکن کا صوبیدار رہا۔ دکن میں ہی اس نے سیاسی جوڑ توڑ کر کے جنگ تخت نشینی میں اپنی کامیابی کو یقینی بنایا اور اورنگ شاہجہان کو نظر بند اور اپنے بھائیوں کو راستے سے ہٹا کر برصغیر کا شہنشاہ بن گیا۔

تخت نشینی
۱۵ مئی ۱۶۵۹ء

اورنگ زیب نے ۳۱ جولائی ۱۶۵۸ء کو دہلی میں اپنی بادشاہت کا ابتدائی اعلان کیا۔ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کا لقب اختیار کیا۔ تاجپوشی کی تقریب باقاعدہ طور پر تخت کے تمام دعویداروں کا صفایا کرنے کے بعد ۱۵ مئی ۱۶۵۹ء کو شاہانہ تزک و احتشام سے منائی گئی۔ تختِ طاؤس پر جلوہ افروز ہونے کے بعد اس نے سرداروں کو خلعتِ فاخرہ، انعامات اور خطابات سے نوازا۔

Marfat.com

نظریۂ بادشاہت

اورنگ زیب عالمگیر جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک احیائے دین کا علمبردار تھا اور جس نے اپنی پالیسی کو شریعت کے اصولوں پر استوار کیا بادشاہت کے متعلق بہت بلند تصور رکھتا تھا اس نے ہمیشہ خلفائے راشدین کی سیرت و کردار کے اتباع کو اپنے لئے مشعلِ راہ سمجھا۔ اگرچہ وہ شاہجہان جیسے سطوت پسند اور عظیم المرتبت بادشاہ کا جانشین تھا لیکن اپنے ذاتی مصارف کیلئے اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں سیتا اور قرآن حکیم کی کتابت کرتا تھا۔

بادشاہت کے متعلق اس کا نظریہ تھا کہ بادشاہ کو کبھی تن آسانی، خلوت پسندی اور عیش کوشی کا دلدادہ نہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ عملی طور پر زندگی بھر اسی اصول پر کاربند رہا۔ وہ اس قدر محنت پسند اور فرض شناس حکمران تھا کہ صرف تین گھنٹے سوتا تھا۔ یورپی سیاحوں کے لئے یہ مشاہدہ بے حد پیران کن تھا کہ برصغیر کا یہ بوڑھا بادشاہ روزانہ کھلا دربار کرتا اور تمام شکایات اور کاغذات کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتا اور ان پر اپنے ہاتھ سے احکام صادر کرتا تھا۔

اورنگ زیب نے اپنے دورِ اقتدار میں ہمیشہ اس اصول کو مدنظر رکھا کہ رعایا کے تمام طبقے مطمئن رہیں۔ بادشاہت کے متعلق اس کا یہ قول تھا کہ "حقیقی عظیم بادشاہ وہ ہے جس کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین یہ بن جائے کہ وہ رعایا پر عدل و انصاف سے حکومت کرے۔" ایکبار ایک امیر نے اسے اپنی صحت کا خیال رکھنے کا مشورہ دیا تو اس نے جواب دیا کہ "ایک بادشاہ کا فرزند اور تخت کا مالک ہونے کی حیثیت سے خدا مجھے اس لئے دنیا میں لایا کہ اپنے لئے نہیں، دوسروں کے لئے زندہ رہوں اور محنت و مشقت اٹھاؤں۔ میرا فرض ہے کہ اپنی راحت کا خیال صرف اس حد تک کروں جس حد تک اسے رعایا کی خوشی سے گہرا تعلق ہے۔" اورنگزیب نے اسی نصب العین کے مطابق اپنی زندگی بسر کی اور تخت نشینی کے فوراً بعد اس نے ایسے محاصل منسوخ کر دیئے جو از روئے شریعت ناجائز تھے ان میں سے اکثر محاصل کا اطلاق ہندو تاجروں پر ہوتا تھا۔ اورنگ زیب کو مزارعین کی بہبود کا بھی خاص خیال تھا۔ عمالِ حکومت کے نام اپنے ایک فرمان میں اس نے لکھا: "شہنشاہ کی تمام آرزوؤں اور مقاصد کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ زراعت ترقی پذیر ہو اور کسانوں نیز عوام کی بہبود کو تقویت پہنچے۔ کیونکہ یہ لوگ خدا کی مقدس امانت ہیں۔" اورنگزیب نے ہمیشہ اپنے عاملوں کو تاکید کی کہ وہ رعایا اور عزبار سے ہمیشہ ہمدردانہ اور مشفقانہ سلوک کریں۔ رعایا کے حالات سے آگاہی حاصل کریں اور جو لوگ ان کے پاس دادرسی کے لئے آئیں انہیں بہرحال باریابی اور گذارشِ احوال کا موقع دیں تاکہ وہ متعلقہ حکام تک دوسروں کی وساطت سے اپنے مسائل پیش کرنے کے محتاج نہ رہیں۔ عدل گستری میں عالمگیر حق شناس غیر جانبدار اور رنگ و نسل اور مذہب و ملت کی تمیز سے قطعی بالاتر تھا۔

Marfat.com

اورنگ زیب کے ابتدائی اقدامات

تخت نشین ہونے کے بعد اورنگزیب نے سلطنت کے نظم ونسق کی طرف اپنی خاص توجہ مبذول کی۔ جنگِ تخت نشینی کے دوران نظم ونسق تباہ و برباد اور شاہی افسر اپنے فرائض سے غافل اور تساہل پسند ہوگئے تھے۔ اشیائے ضروریات نایاب اور مہنگی ہوگئی تھیں۔ نیز عوام بدحالی کا شکار ہوکر رہ گئے تھے۔ چنانچہ اورنگزیب نے اولاً نظم ونسق کے سلسلے میں وسیع پیمانے پر شاہی افسران کے تبادلے اور اہم صوبوں میں اعلیٰ تنظیمی قابلیت رکھنے والے صوبیدار مقرر کئے اور انہیں امن وسکون کی بحالی کی تاکید کی۔ ثانیاً اس نے عوام کی فلاح و بہبود اور ملک میں خوشحالی کی بحالی کے لئے اکثر غیر شرعی ٹیکس (محاصل) معاف کر دیئے جن میں راہداری[1] پنڈاری[2] ابواب[3] (بیس ٹیکس) اور بچے کی پیدائش ٹیکس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نتیجۃً اگرچہ حکومت کی آمدنی کم ہوگئی مگر تجارت و صنعت ترقی پذیر اور عوام کی معاشی حالت بہتر ہوگئی۔

مذہبی پالیسی اور احیائے دین

اورنگ زیب ایک راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھا۔ اس نے پختہ عزم کر رکھا تھا کہ وہ شریعتِ اسلامی کے مطابق حکومت کرے گا وہ عالم طفلی ہی سے تمام مذہبی واجبات پابندی سے ادا کیا کرتا تھا اور برصغیر میں احیائے دین کو اپنا فریضہ سمجھتا تھا اور سلطنت کی حکمتِ عملی کو اسلامی قوانین و روایات کے عین مطابق نشکیل دینے کا خواہاں تھا۔ مشہور مؤرخ لین پول کا قول ہے کہ اورنگ زیب مذہب کے سامنے سلطنت (ریاست) یعنی سیاست کو ہیچ تصور کرتا تھا۔

جب اورنگ زیب نشین ہوا اکبر کی روادارانہ پالیسی، جہانگیر اور شاہجہان کی چشم پوشی اور داراشکوہ کی ہندومت سے لگاؤ کی وجہ سے مسلم معاشرہ بڑی تیزی سے زوال پذیر ہو رہا تھا۔ صحیح اسلامی اقدار مسخ اور اسلامی تہذیب کے نقوش و آثار غیر مؤثر اور مفقود ہوتے جا رہے تھے۔ ہندو تہذیب ترقی پذیر تھی۔ نیز ہندوؤں میں مذہبی اعتبار سے اپنے برتر ہونے کا احساس بیدار ہو رہا تھا اور وہ سرکش ہوکر مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم کا شکار بنا رہے تھے۔ چنانچہ ہندوؤں میں مسلمان عورتوں سے جبراً شادی کر لینے، مساجد کو منہدم کرکے انہیں رہائشی مکانوں اور بت خانوں میں تبدیل کر لینے کا رجحان عام ہوگیا تھا۔ علاوہ ازیں درباری لباس گھیرے دار پائجامہ اور ہندوانی وضع کی پگڑی پر مشتمل تھا۔ بادشاہ

---

[1] یہ ٹیکس ہر شاہراہ اور کشتی پر دس فیصد شرح سے وصول کیا جاتا تھا۔

[2] یہ محصول شہروں میں فروخت کیلئے آمدہ اشیائے خوردنی پر وصول کیا جاتا تھا۔

[3] یہ مشترک محصول تھا جو عموماً تاجروں سے اشیا کی فروخت پر وصول کیا جاتا تھا۔

Marfat.com

اور درباری امرا ہندو راجاؤں کی مانند زیور اور ریشمی ملبوسات زیب تن کرتے تھے۔ نیز دربار میں اسلامی طریقہ تعظیم کی بجائے بادشاہ کو سجدہ کرنے کا رواج درباری روایت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ علاوہ ازیں جھروکہ درشن سے شخصیت پرستی رواج پا رہی تھی۔ ایک اسلامی سلطنت کا مسلمان فرمانروا ہونے کی حیثیت سے اورنگ زیب اس امر کو اپنا فرض سمجھتا تھا کہ وہ حکومت میں اسلامی شان کو برقرار رکھے۔ اسلامی اقدار کو زندہ کرنے کی کوشش کرے اور اسلامی طرزِ زندگی کو رواج دے۔ چنانچہ اس نے نہ صرف تیموری روایات کے مطابق رواداری کی پالیسی اختیار کی اور غیر مسلموں کو مذہبی آزادی دی بلکہ اسلامی روایات اور اقدار کو قرآن و سنت کے مطابق زندہ کرنے کی کوشش کی اور اسلامی معاشرہ کی اصلاح کی طرف اپنی خاص توجہ مبذول کرتے ہوئے احیائے دین کے سلسلے میں درج ذیل احکامات جاری کئے۔

۱۔ سکوں پر کلمہ طیبہ کندہ کرنے کی ممانعت کر دی تاکہ ناپاک ہاتھوں میں جانے اور ناپاک جگہوں پر گرنے سے بے حرمتی نہ ہو۔

۲۔ قحبہ خانوں اور شراب خانوں سے محاصل کی وصولی بند کر دی۔

۳۔ جشن نوروز جو کہ ایرانی روایات سے لیا گیا تھا موقوف کر دیا۔ نیز سن شمسی کو سن ہجری میں بدل دیا گیا۔

۴۔ تخت نشینی کے موقع پر کئی روز تک عیش و نشاط کی محفلیں گرم کرنے کی ناپاک رسوم کو یکسر ختم کر دیا۔ نیز محرم اور دسہرہ کے جلوس بند کر دیئے۔ دیوالی اور ہولی کے تہواروں پر رنگ رلیوں اور قمار بازی کو ممنوع قرار دیا۔

۵۔ ۱۶۶۴ء میں ہندوؤں کی قدیم ظالمانہ رسم ستی[1] پر پابندی عائد کر دی۔

۶۔ ۱۶۷۹ء میں جزیہ[2] ٹیکس کو غیر مسلموں پر دوبارہ عائد کر دیا لیکن قبل ازیں راہداری، بنڈاری ابواب (سیل ٹیکس)، یاترا اور گنگا میں اشنان کرنے، مردوں کی ہڈیاں بہانے اور لڑکوں کی پیدائش کا ٹیکس جیسے ۸۰ غیر شرعی ٹیکس معاف کر دیئے۔

۷۔ ۱۶۷۹ء میں سالگرہ کے موقع پر سونے چاندی اور ریشمی پارچات سے بادشاہ کے تلنے کی غیر اسلامی رسم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار دیدی گئی۔

۸۔ ۱۶۸۸ء میں موسیقی اور علم نجوم کی شاہی سرپرستی بند کر دی اور درباری موسیقاروں اور

---

[1] ایک ہندو رسم، جس میں ہندو بیوہ کو اپنے شوہر کے ساتھ زندہ جل مرنا ہوتا تھا۔

[2] ایک اسلامی ٹیکس جو اسلامی حکومت غیر مسلموں کے تحفظ کے عوضانہ کے طور پر وصول کرتی تھی۔

Marfat.com

منجمیوں کو دربار سے فارغ کر دیا۔

۹۔ ۱۶۸۶ء میں رعایا کی اخلاقی حالت کی اصلاح کے لئے محتسب مقرر کئے جن کے فرائض میں شراب اور دیگر منشیات کے استعمال کا سختی سے انسداد اور مسلمانوں میں شریعت کی پابندی اور شعائر اسلامی کے احترام کو عام کرنا شامل تھا۔

۱۰۔ رکن سجدہ کو ممنوع قرار دیتے ہوئے اسلامی طریق تعظیم کا حکم دیا۔ نیز جھروکہ درشن کی قدیم روایت کو یکسر ختم کر دیا۔ کیونکہ یہ روایت سراسر غیر اسلامی اور شخصیت پرستی کی علامت بن کر رہ گئی تھی۔

۱۱۔ مساجد اور مذہبی خانقاہوں کی مرمت کے احکام جاری کئے نیز فروغ تعلیم کے سلسلہ میں علماء اساتذہ اور طلباء کے لئے وظائف مقرر کئے۔

۱۲۔ اخلاقی برائیوں کی روک تھام کی غرض سے طوائفوں پر عورتوں کا جانا ممنوع قرار دیا اور شراب چرس اور بھنگ کی کاشت اور استعمال کو قانوناً قابل مواخذہ قرار دیا۔ علاوہ ازیں قحبہ خانوں کو بند کروا دیا گیا۔ قمار بازی کی ممانعت کر دی اور رقاصاؤں اور طوائفوں کو حکم دیا کہ یا تو وہ گناہ آلود زندگی ترک کر کے ازدواجی زندگی گذاریں ورنہ ملک چھوڑ کر چلی جائیں۔

۱۳۔ شاہی محل میں سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال قطعی ممنوع قرار دیا۔ نیز مردوں کے لئے ریشمی لباس زیب تن کرنا اور زیور پہننا ناجائز قرار دیا۔

۱۴۔ مسلم فقہ کی ایک جامع اور مستند کتاب "فتاویٰ عالمگیری" مرتب کرائی۔

غیر مسلموں کے ساتھ سلوک

اورنگ زیب نے اپنے باپ دادا کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے کئی فرامین جاری کر کے غیر مسلم رعایا سے رواداری پر زور دیا۔ لیکن رواداری سے مراد یہ نہ تھی کہ ہندو من مانی کارروائیاں کریں یا اسلامی قوانین کی خلاف ورزیاں کریں۔ اس کا حکم تھا کہ ہندوؤں کے قدیم مندروں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے اور ان کی مرمت کروائی جائے۔ نیز ان مندروں کے نام جاگیریں بحال رکھی جائیں۔ لیکن ایسے مندر جو حکومت سے اجازت حاصل کئے بغیر یا ناجائز ذرائع سے پیدا کردہ روپے سے تعمیر کئے گئے ہیں انہیں منہدم کر دیا جائے۔

اورنگ زیب مذہبی آزادی اور رواداری کی پالیسی کا حامی تھا اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ رواداری کے بہانے ہندوؤں کو سرکش و منہ زور ہونے کا موقع نہ دیا جائے چونکہ اس کی حکومت اسلامی اصولوں پر مبنی تھی اس لئے اس نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ رواداری کا سلوک روا رکھا بعض مورخین اورنگ زیب پر الزام لگاتے ہیں کہ اس نے مذہبی تعصب سے متاثر ہو کر ہندوؤں پر

Marfat.com

نہ صرف جزیہ ٹیکس لگا کر انہیں اپنی مذہبی تنگ نظری کا شکار بنایا بلکہ ان پر سرکاری ملازمت کے دروازے بھی بند کر دیئے اور ان کے متبرک مقامات اور مندروں کی نہ صرف بے حرمتی کی بلکہ انہیں منہدم بھی کروا دیا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب پر عائد کئے گئے الزامات کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے۔

الزامات اور اُن کا تجزیہ

۱۔ جزیہ

اورنگ زیب عالمگیر کے خلاف سب سے بڑا الزام جزیہ ٹیکس کا دوبارہ اجراء ہے۔ جزیہ وہ ٹیکس تھا جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا سے اسکی حفاظت کے عوضانہ کے طور پر اور لازمی فوجی خدمت کے عوض وصول کرتی تھی۔ جب عربوں نے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ فتح کیا تو یہ ٹیکس غیر مسلم رعایا پر عائد کیا گیا۔ اور یہ ٹیکس بدستور برصغیر میں جاری رہا۔ مگر اکبر نے ۱۵۶۴ء میں اسے منسوخ کر دیا۔ اور اورنگ زیب نے جس کی حکومت کی پالیسی شریعت کے تابع تھی اسے دوبارہ ۱۶۷۹ء میں نافذ کر دیا۔ عالمگیر اس تنسیخ کو اسلام کے منافی سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ غیر مسلموں سے جبراً فوجی خدمت نہیں لے سکتا تھا جزیہ کا اطلاق صرف ان لوگوں پر ہوتا تھا جو سال بھر میں کم از کم ۵۳ روپے بچا سکتے تھے جس کے بدلے حکومت وقت ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار تھی۔ نیز اورنگ زیب نے دکن میں اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص بھی مرہٹوں کی لوٹ مار کا شکار ہو جائے وہ اپنے علاقے کے عامل سے ہرجانہ وصول کرنے کا مجاز ہے۔ بوڑھے بچے۔ عورتیں۔ بیمار، مفلس، اپاہج اور مذہبی پیشوا یا وہ غیر مسلم جو فوجی خدمات سے وابستہ تھے یا سرکاری ملازمت میں تھے جزیہ ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ ایک عرصے تک موقوف رہنے کے باعث اس کا دوبارہ اجراء غیر مسلموں کو ناگوار گذرا۔ اورنگ زیب نے یہ ٹیکس اس وقت نافذ کیا جبکہ غیر مسلموں میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے وہ جزیہ ٹیکس کے دوبارہ نفاذ پر سیخ پا ہوئے۔ ان حقائق کی موجودگی میں مورخین کا یہ کہنا کہ اورنگ زیب مذہبی لحاظ سے تنگ نظر اور ہندوؤں کا دشمن تھا اور دشمنی کے جذبے کے تحت ان پر جزیہ ٹیکس عائد کیا گیا بالکل غلط ہے اگر وہ متعصب ہوتا تو پھر وہ ۸۰ غیر شرعی ٹیکس منسوخ کیوں کرتا جن میں سے بیشتر کا تعلق صرف ہندوؤں سے تھا اور جو حکومت کی آمدنی کا ایک خاص ذریعہ تھے۔

۲۔ غیر مسلموں سے امتیازی سلوک

اورنگ زیب کے خلاف یہ بھی ایک الزام ہے کہ اس نے غیر مسلموں سے متعصبانہ

Marfat.com

سلوک روا رکھا۔ بالفاظ دیگر غیر مسلموں سے مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ محاصل وصول کئے۔ لیکن مورخین یہ الزام لگاتے ہوئے اس حقیقت کو ایک سرے سے ہی نظر انداز کر جاتے ہیں کہ مسلمان تاجروں سے دیگر محاصل کے علاوہ زکوٰۃ ٹیکس بھی وصول کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں سے عالمگیر کا سلوک انصاف اور رواداری پر مبنی تھا۔ جزیہ ٹیکس ہی ایسا زائد ٹیکس تھا جو ہندوؤں سے اس کے تحفظ و سلامتی کے عوض لینے کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔

۳۔ مندر

جادوناتھ سرکار اور دیگر ہندو مورخین اورنگ زیب پر ایک الزام یہ بھی عائد کرتے ہیں کہ اس نے بڑے منظم طریقے سے ہندوؤں کے لاتعداد مندروں کو مسمار کرایا اور غیر مسلم رعایا کا مذہبی تنگ نظری کی بنا پر قافیہ تنگ کئے رکھا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اورنگزیب مذہبی رواداری کا حامی تھا۔ البتہ وہ اپنی تمام تر فراخدلانہ رواداری کے باوجود ہندوؤں کو ایسی کارروائیاں کرنے کی اجازت دینے کے حق میں نہ تھا۔ اس نے ایک فرمان کے ذریعے حکم صادر کیا کہ ہندوؤں کے قدیم مندروں اور عبادت گاہوں کا تحفظ کیا جائے اور ان کے نام وقف جاگیر لیا بدستور بحال رکھی جائیں۔ اس نے ہندوؤں کے مندروں کے انہدام کے متعلق کوئی حکم صادر نہیں کیا۔ ورنہ آج اس زمانے کا کوئی مندر نظر نہ آتا۔ لیکن اس نے ایسے مندروں کو ضرور مسمار کرا دیا جو حکومت سے اجازت حاصل کئے بغیر تعمیر کئے گئے تھے۔

اورنگ زیب نے متھرا میں بیر سنگھ بندیلہ کا تعمیر کردہ مندر منہدم کروا دیا کیونکہ یہ مندر ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی رقم سے تعمیر ہوا تھا۔ جو بیر سنگھ بندیلہ کو ابوالفضل کے قتل کے عوض بطور انعام دی تھی۔ مزید برآں ایسے مندروں کو بھی گرا دیا جو حکومت وقت کے خلاف سازش کے اڈے بن چکے تھے۔ ہندو مورخین واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور اورنگزیب عالمگیر کے خلاف الزامات عائد کرتے وقت تصویر کا صحیح رخ پیش نہیں کرتے وہی اسے متعصب، جادوناتھ سرکار، سری رام شرما اور اے ایل واشم جیسے مورخین نے بھی اورنگ زیب کے فرمانوں کا بغور اور حقیقت پسندانہ مطالعہ نہیں کیا۔

۴۔ درسگاہیں

اورنگ زیب کے خلاف غیر مسلم مورخین کے عائد کردہ الزامات کی فہرست میں ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس نے ہندوؤں کی درسگاہوں کو بند کروا دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کو یہ بتایا گیا کہ ملتان اور بنارس میں برہمنوں نے ایسی درسگاہیں قائم کر رکھی ہیں جہاں مسلمان طلباء کو گمراہ کیا جاتا ہے چونکہ ارتداد اسلام میں ایک سنگین جرم ہے اس لئے اورنگ زیب نے ایک فرمان کے ذریعے صرف انہی درسگاہوں کو بند کرنے کا حکم جاری کیا جبکہ ہندو مورخین نے اس فرمان کو برصغیر کی تمام غیر اسلامی درسگاہوں

Marfat.com

کے لئے منعقد کرلیا ہے۔

۵۔ سرکاری ملازمتیں

یہ الزام کہ اس نے غیر مسلموں (ہندوؤں) پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے تھے سراسر لغو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے عہد سے محکمۂ مال میں ہندوؤں کی اجارہ داری قائم تھی۔ اورنگ زیب کے عہد تک یہ ہندو ملازمین بددیانت اور رشوت خور بن چکے تھے اور ذاتی نفع کی خاطر من مانی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ اورنگ زیب نے غیر مسلموں کی اس اجارہ داری کو ختم کرنے کا حکم صادر کیا کہ محکمۂ مال کے دفاتر میں آدھی تعداد مسلمان ملازمین کی ہونا چاہیئے۔ اس کے اس اقدام سے رشوت کافی حد تک ختم ہوگئی علاوہ ازیں اس نے یہ اقدام ہندوؤں کی سرکشی اور سیاسی بیداری کے پیش نظر کیا تھا۔ چنانچہ اس حقیقت حال سے واضح ہے کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں پر تعلم روا نہیں رکھا تھا۔ اس کا یہ اقدام محض انتظامی مشینری کی اصلاح کی خاطر اور ہندوؤں کی خود سر قسم کی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لئے تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ہندوؤں کی یہ اجارہ داری عوام اور حکومت دونوں کے لئے پریشانی کا باعث بن سکتی تھی اس اصلاحی اقدام کے باوجود اہل اور صاحب استعداد غیر مسلم حکومت کے اکثر و بیشتر کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔

۶۔ ہندو تہوار

متعصب ہندو مؤرخین کی جانب سے یہ بہتان بھی لگایا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے ہندو تہواروں کو نیست و نابود کر دیا۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ صرف ان تہواروں پر پابندی عائد کی گئی تھی جو بدنظمی اور ہنگامہ و فساد کا باعث بنتے تھے ان میں دیوالی اور ہولی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن ہندوؤں کو ان تہواروں کو شہری حدود کے باہر منانے کی مکمل آزادی تھی۔

تنقیدی جائزہ

مندرجہ بالا تجزیہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اورنگ زیب پر تعصب کا الزام عائد کرنے والوں نے خود اپنے تعصب کا مظاہرہ کیا ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اورنگ زیب ایک راسخ العقیدہ اور پابند شریعت مسلمان تھا جس نے حکمرانی کرتے وقت شریعت کے اصولوں کی پوری طرح پیروی کی۔ اس نے احیائے شریعت کے لئے نہ صرف غیر شرعی رسومات کو ختم کر کے معاشرہ کی تطہیر کے لئے اصلاحات نافذ کیں بلکہ ایک اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے ۸۰ غیر شرعی ٹیکس بھی معاف کر دیئے۔ بعض غیر مسلم مورخین اس کے ان اصلاحی اقدامات کو مکر و فریب اور ریاکاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ رائے قطعی طور پر حقیقت سے عاری ہے۔ اورنگ زیب زہد و تقویٰ، سادگی، مشقت اور عزم و استقلال کا پیکر تھا اور کاروبار سلطنت میں شرعی اصولوں کو مدنظر رکھتا تھا۔ بقول مشہور مؤرخ لین پول:

Marfat.com

"اورنگ زیب اپنی جان اور تخت سے مذہب کو مقدس، برتر اور مقدم سمجھتا تھا۔"[1]

اس نے اپنی غیر مسلم رعایا کے لئے روادارانہ حکمت عملی اپنائی۔ انہیں مذہبی آزادی اور شہریت کی مراعات عطا کیں۔ جن سے وہ قبل ازیں محروم تھے۔ اس نے ۸۰ غیر شرعی ٹیکسوں کے علاوہ گنگا یاترا ٹیکس، گنگا اشنان ٹیکس اور گنگا میں مردوں کی ہڈیاں بہانے کے ٹیکس تک معاف کر دیئے۔ اس نے غیر مسلموں میں فروغ تعلیم کے لئے اہم مندروں اور درسگاہوں کے نام جاگیریں وقف کیں اس کے یہ فراخدلانہ اقدامات بلاشبہ اس کی روادارانہ حکمت عملی اور عدل گستری پر شاہد ہیں۔ اسے ہمیشہ رعایا کی بہبود کا خیال ملحوظ رہا۔ اس کے ہاں قانون کی نگاہ میں مذہب و ملت کا کوئی حائل دارانہ امتیاز نہ تھا۔ لیکن ہندو جو ایک مدت دراز سے حکومت کی نرم پالیسی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دیدہ دلیری اور من مانیوں پر اتر آئے تھے اور سیاسی شعور کی بیداری کے نام پر اپنے آپ کو ایک برتر قوم سمجھنے اور مسلم راج کے قیام کے خواب دیکھنے لگے تھے اورنگ زیب کی سخت گیری اور قانونی حکومت سے بدک اٹھے۔ انہیں پہلے ہی اسلامی حکومت سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اب اورنگ زیب کی حکومت کی اصول پسندانہ پالیسی سے ان کی نفرت شدت اختیار کر گئی اور انہوں نے اورنگ زیب اور اس کی پالیسی کے خلاف نہ مذمت سازشیں کرنی شروع کر دیں بلکہ بغاوتیں کر کے اس دامان کو بھی تباہ کرنے کی کوششیں کیں۔ الغرض اورنگ زیب پر ہندو مورخین کے تمام الزامات بے بنیاد اور مذہبی تعصب پر مبنی ہیں۔

اورنگ زیب کی فتوحات

اورنگ زیب عالمگیر نے پچاس سال برصغیر پاک و ہند پر حکومت کی۔ وہ چالیس برس کی عمر میں تختِ طاؤس پر متمکن ہوا۔ اس کے عہد میں مغلیہ سلطنت وسعت کے لحاظ سے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ عالمگیر کے عہد اقتدار کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی ۲۵ سال اس نے شمالی برصغیر میں گذارے۔ جس کے دوران وہ نظم و نسق کو مستحکم کرنے اور بغاوتوں کے انسداد میں سرگرم عمل رہا۔ عہد کے دوسرے دور میں وہ دکن کے مسائل طے کرنے میں مصروف رہا۔ چنانچہ وہ اپنی وفات (۱۷۰۷ء) تک بیجاپور اور گولکنڈہ کی خود مختاری کو ختم کرنے اور سرکش مرہٹہ طاقت کی بیخ کنی میں مصروف رہا۔ اس کی فتوحات کا جائزہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ کوچ بہار اور آسام کی تسخیر مارچ ۱۶۶۲ء: تخت نشینی سے قبل اورنگ زیب

---

[1] میڈیول انڈیا انڈر محمڈن رول۔ (ایڈیشن اول) صفحہ ۳۵۹

Marfat.com

کو شمال مشرقی سرحد کی طرف خاص توجہ مبذول کرنی پڑی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر کوچ بہار اور آسام کی تسخیر عمل میں آئی۔ آسام پر ایک منگول قبیلہ "اہوم" کے سردار پریم نارائن کی حکومت تھی جس نے شاہ شجاع کی کمزور حکومت اور مغل شہزادوں کی باہمی کشمکش اقتدار سے فائدہ اٹھا کر مغلیہ علاقہ کا مروپ پر قبضہ جما لیا تھا۔ اورنگ زیب نے میر جملہ کو بنگال کا گورنر مقرر کرتے ہوئے پریم نارائن کی گوشمالی اور مقبوضہ علاقے کی بازیابی کا حکم دیا۔

۱۲ مارچ ۱۶۶۲ء کو میر جملہ نے راستے کی دشواریوں کے باوجود راجہ پریم نارائن کو شکست دیکر کوچ بہار کے صدر مقام گڑھ گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں اگرچہ موسم برسات اور اہوم (AHOMS) قوم کے حملوں نے مغل جرنیل کے لئے بہت دشواریاں پیدا کیں۔ اور مغلیہ فوج کو نقصان پہنچایا لیکن میر جملہ نے آسام کی جانب پیش قدمی جاری رکھی۔ حتیٰ کہ آسامی قبائلیوں نے مغلیہ اطاعت قبول کر لی۔ راجہ نے بھاری تاوان جنگ ادا کرنے کے علاوہ بہت سا علاقہ مغلوں کے حوالے کیا۔ مگر ۱۰۔ اپریل ۱۶۶۳ء کو میر جملہ نے واپسی پر راستے میں خضر پور کے مقام پر وفات پائی۔

۲۔ چاٹگام کی فتح ۱۶۶۶ء

۱۶۶۳ء میں اورنگ زیب نے اپنے ماموں شائستہ خاں کو بنگال کا گورنر مقرر کیا جس نے چاٹگام پر حملہ آور ہو کر پرتگیزی بحری قزاقوں کا صفایا کر دیا۔ شائستہ خاں نے اراکان کے راجہ کو بھی شکست دی اور چاٹگام کے علاوہ جزیرہ سراندیپ پر بھی قبضہ کر لیا۔

افغان قبائل کی بغاوت ۱۶۶۷ء

۱۶۶۷ء میں برصغیر کی شمال مغربی سرحد کے یوسف زئی افغان قبیلہ نے اپنے سردار بھاگو کی سرکردگی میں مغلیہ سیادت کے خلاف بغاوت کر دی اور اٹک کے نزدیک دریائے سندھ کو عبور کر کے مغلیہ ضلع ہزارہ پر حملہ آور ہو کر لوٹ مار کا بازار گرم کیا اس پر میر جملہ کے لڑکے محمد امین خان نے قبائلیوں کی گوشمالی کر کے بغاوت کو کچل دیا۔ اور امن و امان بحال کیا یہ باغی قبیلہ اس کے بعد پانچ سال تک دوبارہ سر نہ اٹھا سکا۔

۱۶۷۲ء میں آفریدی سردار اکمل خاں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے اور دوسرے قبائل کو ساتھ ملا کر مغلوں کے خلاف عام بغاوت کر دی۔ باغی قبائل نے مغل گورنر محمد امین خان کو درۂ خیبر میں علی مسجد کے مقام پر شکست فاش دی۔ اس جنگ میں دس ہزار مغل مارے گئے اور بیس ہزار قید ہو کر غلاموں کی طرح وسط ایشیا میں فروخت ہوئے۔ خٹک قبیلہ کے سردار خوشحال خاں خٹک نے جو پشتو زبان کا ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ اپنی ولولہ آفرین شاعری سے قبائلیوں میں بلا کا جوش بھر دیا۔ اس پر اورنگ زیب نے مہابت خاں کو قبائلیوں کی گوشمالی پر مامور کیا اور شجاعت خاں

Marfat.com

اور راجہ جسونت سنگھ کو مزید کمک کے ساتھ اس کی امداد کے لئے روانہ کیا۔ ۱۶۷۴ء میں اورنگزیب عالمگیر خود بھی مہم کی نگرانی کے لئے حسن ابدال پہنچا اور ڈیڑھ سال تک وہیں قیام پذیر رہا۔ اس دوران اس نے اپنی دانشمندی اور سیاسی تدبر سے قبائلی سرداروں کو اپنا دوست بنالیا اور ان کو وظیفے عطا کئے۔ ۱۶۶۷ء میں امیر خاں کو کابل کا گورنر مقرر کیا گیا جس نے ۱۶۹۸ء تک کمال تدبر و دانشمندی سے اپنے فرائض سرانجام دیئے اور قبائلیوں کو اپنے قابو میں رکھا۔ خٹک قبیلہ کا سردار خوشحال خاں ایک عرصہ تک باغی رہا۔ یہ انقلابی شاعر زندگی بھر اپنے جوشیلے کلام سے قبائلیوں میں جذبۂ حریت پیدا کرتا رہا لیکن انجام کار گرفتار ہو کر قید ہوا۔ اس نے ۱۶۸۰ء میں وفات پائی۔

غیر مسلموں کی بغاوتیں

اورنگ زیب کے دور حکومت میں متعدد غیر مسلم فرقوں نے شورشیں اور بغاوتیں برپا کیں۔ گو ہندو مورخین ان بغاوتوں کا سبب اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو گردانتے ہیں لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ اس کی مذہبی پالیسی ہر قسم کے تعصب سے پاک اور روادارانہ تھی۔ مگر وہ اکبر اور داراشکوہ کی طرح اس پالیسی کی بنیاد اسلامی اصولوں سے انحراف پر قائم نہ کرنا چاہتا تھا۔ اکبر نے اپنی سیاسی مصلحت کی بنا پر ہندو عقائد اور رسومات کو اپنا لیا تھا جس سے ہندوؤں کے دلوں میں یہ خیال جاگزین ہو گیا تھا کہ شاید دیگر بیرونی اقوام کی طرح مسلمان بھی ہندو سوسائٹی میں مدغم ہو جائیں گے۔ جب انہوں نے اورنگ زیب کو مذہبی عقائد کا پابند اور نظم و ضبط میں سخت گیر پایا تو وہ اس کے دشمن ہو گئے۔ اکبر کی صلح کل اور مصالحت کی پالیسی سے ہندوؤں کو اپنی قوت کا احساس ہونے لگا تھا اور انہیں یہ زعم لاحق ہو گیا کہ مغل حکمران ان کے محتاج ہیں اور حکومت کے استحکام میں انہیں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ شاہجہان کے بعد دارا شکوہ کو برصغیر کا حکمران تصور کرتے تھے لیکن جب اورنگ زیب جیسا راسخ العقیدہ مسلمان بادشاہ تخت نشین ہوا تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ چنانچہ اپنی امیدیں خاک میں ملتی دیکھ کر بغاوت و سرکشی پر آمادہ ہوئے۔ لیکن اورنگ زیب نے ان کی سختی سے گوشمالی کی اور ان کی بغاوتوں کو فرو کر کے امن و امان کو بحال رکھا۔

جاٹوں کی بغاوت

۱۶۶۹ء تا ۱۶۹۱ء

۱۶۶۹ء میں متھرا کے ہندو جاٹوں نے تاپٹ کے ایک زمیندار گوکل کی سرکردگی میں علم بغاوت بلند کیا اور متھرا کے فوجدار عبدالنبی کو ہلاک کر دیا۔ نیز سعد آباد کے پرگنہ کو تاخت و تاراج کیا۔ متھرا کے جاٹ بہت سرکش اور خود سر تھے اور بقول جادوناتھ سرکار "وہ عرصے سے حکومت کو مالیہ ادا نہیں کر رہے تھے"۔ اورنگ زیب نے بذات خود وہاں پہنچ کر اس بغاوت کو کچل دیا۔ باغی گوکل گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ ۱۶۸۶ء میں راجا رام کی قیادت میں جاٹوں نے سر اٹھایا اور سکندرہ

Marfat.com

پہنچ کر اکبر کے مقبرے کو اپنی غارتگری کا شکار بنایا۔ منوچی کے قول کے مطابق جاٹوں نے اکبر کی قبر کھود کر اس کی ہڈیوں کو جلا ڈالا۔ لیکن ہماری رائے میں یہ بات سراسر غلط ہے۔ کیونکہ اس کے عہد کی تمام تاریخی کتب اس بارے میں خاموش ہیں۔ ۱۶۸۸ء میں اورنگ زیب کے پوتے بیدار بخت نے یشمن سنگھ والیٔ امبر کی ہمراہی میں پہنچ کر باغیوں کی گوشمالی کی۔

ست نامیوں کی بغاوت
۱۶۷۲ء

ایک دوسری خطرناک بغاوت نارنول اور میوات کے اضلاع کے ست نامیوں کی تھی۔ یہ ہندوؤں کا ایک تشدد پسند اور متعصب فرقہ تھا۔ ست نامی اپنے گیروا رنگ کے مخصوص لباس اور طرز رہائش کی وجہ سے تمام ہندوؤں سے منفرد تھے۔ اور بقول ایک ہندو مؤرخ ایشور داس نگار "انتہائی غلیظ اور بدطینت" تھے۔ ۱۶۷۲ء میں ایک سرکاری پیادے اور ایک ست نامی کسان کے مابین معمولی جھگڑا ہو گیا۔ اس پر مشتعل ہو کر ست نامیوں نے شاہی پیادے کو ہلاک کر دیا۔ اور جب حکومت نے ان مجرموں کے خلاف تادیبی کارروائی کرنی چاہی تو انہوں نے بغاوت برپا کر دی۔ اور مقامی فوج کو شکست دی۔ انہوں نے مساجد کو منہدم کرنے اور لوٹ مار کرنے کے علاوہ نارنول کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ ست نامی جادوگر ہیں اور انہیں کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ اس پر اورنگ زیب نے ان کی سرکوبی کیلئے ایک عظیم فوج رعد انداز خاں کی زیر کمان مامور کی اور مغلیہ فوج کے نفسیاتی علاج کے لئے قرآن حکیم کی چند آیات کے تعویذ بنا کر فوج کے جھنڈوں کے ساتھ باندھ دیئے۔ ست نامیوں نے مغلیہ فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن بری طرح پسپا ہوئے اور اس طرح یہ بغاوت کچل دی گئی۔ اس جنگ میں کم و بیش دو ہزار ست نامی باغی ہلاک ہوئے۔

بندھیلوں کی بغاوت
۱۶۷۱ء

بندھیل کھنڈ کے بندھیلہ سردار چمپت رائے نے اورنگ زیب علم بغاوت بلند کیا۔ اورنگ زیب نے اس کی گوشمالی پر ایک بھاری لشکر مامور کیا۔ بندھیلہ سردار شاہی فوج کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور عبرتناک شکست سے دوچار ہوا۔ بعد میں اورنگ زیب کے عتاب کے خوف سے اس نے خودکشی کر لی۔ لیکن اس کے لڑکے چھترسال نے مغلیہ ملازمت اختیار کر لی۔

سکھوں کی بغاوت
۱۶۶۴ء

سکھ مذہب کے بانی بابا گورو نانک امن و آشتی کے پیکر تھے۔ وہ ۱۵ اپریل ۱۴۶۹ء کو ضلع شیخوپورہ میں ننکانہ (تلونڈی) کے مقام پر پیدا ہوئے وہ معاشرہ کی اصلاح کے خواہاں تھے اور ذات پات، بے معنی رسوم اور برہمنوں کے غلبہ کے سخت خلاف تھے۔ انہوں

Marfat.com

نے خدا کی وحدانیت کا پرچار کرتے ہوئے بت پرستی کو ممنوع قرار دیا۔ بابا نانک نے ہمایوں کے عہد حکومت میں ۱۵۳۹ء میں وفات پائی۔ بابا گورو نانک کی وفات کے کافی عرصہ بعد تک سکھ مذہب کے پیروکار تنظیم و ضبط کے پابند اور امن پسند رعایا بنے رہے لیکن سکھوں کے پانچویں گورو ارجن دیو جو ۱۵۸۰ء میں اکال تخت پر بیٹھے، نے جہانگیر کے عہد میں باغی شہزادہ خسرو کی امداد کر کے پہلی بار سیاست میں حصہ لیا جس کی بنا پر جہانگیر نے اسے موت کی سزا دی۔ اس کی موت کے بعد اس کے جانشین گورو ہرگوبند سنگھ نے سکھوں میں عسکری جذبہ پیدا کر کے انہیں باقاعدہ ایک فوجی تنظیم بنا دیا۔ سکھ گورو ہرگوبند سنگھ کو اکال تخت کا بانی اور سچا بادشاہ شمار کرتے ہیں۔ انہوں نے اس کی جائیداد کو بحق سرکار ضبط کرنے کا حکم دیا۔ گورو نے گرنتھ پوتھی جا پہنچا دی۔ اور وہیں ۱۶۲۵ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد ہر رتے لگاتار اس کی موت کے بعد ہر گیارہ سکھوں کے گورو مقرر ہوتے۔

۱۶۶۴ء میں سکھوں کا نواں گورو تیغ بہادر گدی پر بیٹھا۔ وہ شروع ہی سے اورنگ زیب عالمگیر کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ اس نے باغیانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے پنجاب اور کشمیر میں شورش برپا کر دی اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اس پر شاہی فوج نے اسے گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا۔ جہاں اس نے اورنگ زیب عالمگیر کے سامنے بھی بڑی گستاخی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ ۱۶۷۵ء میں بغاوت اور لوٹ مار کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔ جمہور مورخین کی یہ رائے ہے کہ گورو تیغ بہادر اورنگ زیب کی مذہبی تنگ نظری کا شکار ہوا۔ اور یہ الزام کہ اورنگ زیب نے اسے اسلام قبول کرنے کے لئے کہا اور گورو کے انکار پر اسے قتل کر دیا گیا۔ تاریخی اعتبار سے قطعی بے بنیاد اور غلط ہے گورو حکومت کا باغی تھا اس لئے بغاوت اور لوٹ مار کے جرم کی پاداش میں اسے موت کی سزا دی گئی۔

تیغ بہادر کے قتل کے بعد سکھوں کا دسواں گورو گوبند سنگھ اکال تخت پر متمکن ہوا وہ مغلوں کا جانی دشمن تھا۔ اس نے سکھوں کو عسکری تربیت دیکر انہیں ایک جنگجو قوم بنا دیا۔ اسی زمانے میں سکھوں نے موجودہ ضلع لاہور (حیثیت ظاہری) اختیار کی، یعنی خالصہ کہلائے۔ نیز انہوں نے گورو کے حکم پر کچھا، کڑا، کنگھا، کیس اور کرپان کو نمایاں قومی نشان کے طور پر رکھنا شروع کر دیا۔ گورو نے اپنے گرد ۸۰ ہزار جنگجو جاں نثاروں کی جمعیت اکٹھی کر لی۔ اور پنجاب میں انند پور کو اپنا صدر مقام بنا کر لوٹ مار اور غارت گری شروع کر دی۔ نتیجتہً اورنگزیب کے حکم پر اس کے خلاف فوجی کارروائی کی گئی۔ گورو گوبند سنگھ کو شکست ہوئی اور اس کے دو لڑکے گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔ ازاں بعد گورو نے اطاعت قبول کر لی۔ ۱۷۰۷ء میں بادشاہ نے اسے اپنے پاس دکن میں طلب کیا۔ لیکن ابھی وہ راستے میں تھا کہ اورنگ زیب نے وفات پائی۔ گورو نے اس کے جانشین بہادر شاہ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔ ۱۷۰۸ء میں گورو گوبند سنگھ پٹیالہ، افغان کے

Marfat.com

ہاتھوں ہلاک ہوا۔

گورو گوبند سنگھ سکھوں کا دسواں اور آخری گورو تھا۔ وفات سے پہلے اس نے گورو کے عہدے کو ختم کرتے ہوئے سکھوں کو عسکری تنظیم قائم کرنے کی تلقین کی۔ گورو گوبند سنگھ کی وفات کے بعد لچھمن داس بیراگی نامی ایک ڈوگرا راجپوت سکھوں کا لیڈر بن گیا۔ وہ اپنے آپ کو آخری گورو کا بندہ یعنی غلام کہتا تھا اور اسی لئے تاریخ میں بندہ بیراگی کے نام سے مشہور ہے اس نے پنجاب میں دوبارہ یورش کا بازار گرم کیا لیکن جون ۱۷۱۶ء میں نواب عبدالصمد نے سکھوں کو شکست دیکر بندہ بیراگی کو گرفتار کر لیا اور بادشاہ فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

اورنگ زیب اور راجپوت

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے وقت برصغیر میں تین اہم ترین ریاستیں میواڑ۔ مارواڑ اور امبر تھیں۔ امبر کے حکمران راجہ جے سنگھ اور اس کا جانشین رام سنگھ تاحیات عالمگیر کے اطاعت گذار اور وفادار رہے۔ اورنگزیب نے انہیں اعلیٰ مناصب و مراتب سے نوازا۔ میواڑ کے رانا جہانگیر کے عہد سے مغلوں کے اطاعت گذار اور باجگذار چلے آرہے تھے۔ مگر اورنگ زیب کے عہد میں رانا راج سنگھ نے بلا وجہ قدیم معاہدے سے روگردانی کرتے ہوئے مارواڑ کی حمایت میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ تاہم راج سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رانا جے سنگھ ۱۶۸۱ء میں شہزادہ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور معافی و جاں بخشی کا خواستگار ہوا۔

مارواڑ کا راجہ جسونت سنگھ داراشکوہ کا حامی تھا لیکن اورنگ زیب کی کامیابی کے بعد اس نے اورنگ زیب سے معافی مانگ لی۔ مغل شہنشاہ نے اس کا منصب اور مرتبہ بحال رکھا۔ لیکن راجہ جسونت سنگھ نے متعدد بار عالمگیر سے غداری کی۔ کھجواہ کی لڑائی کے عین دوران وہ شاہی کیمپ کو لوٹتے ہوئے اور بادشاہ سے غداری کرتے ہوئے فرار ہو گیا۔ اس نے دکن میں سیواجی مرہٹہ سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا اور وہ گاہے بگاہے خفیہ طور پر اس کی امداد کرتا رہتا تھا۔ اس نے شہزادہ معظم کو باپ کے خلاف ورغلایا۔ مگر عالمگیر نے ہر بار معاف کر دیا اور دربار سے دور رکھنے کی غرض سے اسے کابل کا گورنر مقرر کر دیا۔ جسونت سنگھ نے ۱۶۷۸ء میں جمرود کے مقام پر وفات پائی۔ چونکہ وہ لاولد فوت ہوا تھا اس لئے عالمگیر نے اجمیر کو ریاست مارواڑ کے نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کی غرض سے اس کے بھتیجے اندر سنگھ کو ریاست کی راج گدی پر بٹھا دیا۔

اسی دوران راٹھور راجپوتوں نے اورنگ زیب کو مطلع کیا کہ راجہ جسونت سنگھ کی وفات کے بعد اس کے اہل و عیال لاہور پہنچے تو اس کی دونوں رانیوں کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے ان میں سے ایک لڑکا چند روز کے بعد ہی مر گیا تھا۔ اور دوسرا لڑکا زندہ رہا۔ اسے مارواڑ کے تخت کا

Marfat.com

وارث قرار دیئے جانیکا مطالبہ کیا۔ اس اطلاع پر اورنگ زیب نے منصور راجپوتوں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا لیکن وہ کافی عرصہ تک ٹال مٹول کرتے رہے آخر ان کے دہلی پہنچنے پر عالمگیر نے اجیت سنگھ کو مارواڑ کی راج گدی کا وارث قرار دیتے ہوئے قدیم شاہی دستور کے مطابق اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور وعدہ کیا کہ اجیت سنگھ کے سن بلوغت کو پہنچنے پر اس کی گدی اور مناصب بحال کر دیئے جائینگے۔

ادھر راجہ جسونت سنگھ کا ایک ملازم درگا داس ریاست مارواڑ میں اپنے اقتدار کے نواب دیکھ رہا تھا وہ راجہ جسونت سنگھ کے نابالغ لڑکے اجیت سنگھ کا خود ساختہ سرپرست بن گیا اور شاہی اجازت حاصل کئے بغیر اجیت اور راجہ جسونت کے افراد کنبہ کو لیکر چپکے سے جودھپور روانہ ہو گیا۔ شاہی افواج نے ان کو گرفتار کرنے کے لئے تعاقب کیا لیکن درگا داس اور اس کے ہمراہی جودھپور پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ درگا داس نے عیارانہ فطرت سے کام لیتے ہوئے یہ مشہور کر دیا کہ اورنگزیب اجیت سنگھ کو اپنی سرپرستی میں رکھ کر مسلمان بنانا چاہتا ہے اور ریاست مارواڑ کا مغلیہ سلطنت کے ساتھ الحاق کرنے کا خواہاں ہے اس سے راجپوت بھڑک اٹھے۔ چنانچہ راجپوتوں کی حمایت حاصل کر کے ۱۶۷۹ء میں درگا داس نے اجیت کے نام پر علم بغاوت بلند کر دیا۔

مارواڑ کی بغاوت
۱۶۷۹ء

درگا داس کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے اورنگ زیب خود دارالسلطنت سے اجمیر پہنچا۔ اس نے نااہلی کی بنا پر اندر سنگھ ناگور کو معزول کر دیا اور شہزادہ اکبر کو درگا داس کی بغاوت کو کچلنے پر مامور کیا۔ ۱۶۷۹ء میں شہزادہ اکبر کی سرکردگی میں مغل فوج نے درگا داس کو پشکر کے قریب شکست دی شکست کھا کر درگا داس اور اس کے ساتھیوں نے راہِ فرار اختیار کی اور پہاڑوں اور جنگلوں میں جا پناہ گزین ہوئے۔ مغل فوج نے سارے مارواڑ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن راجپوتوں نے قزاقانہ طریق جنگ (گوریلا طریق جنگ) اختیار کر کے مغلوں کے خلاف اپنی باغیانہ جدوجہد کو جاری رکھا۔

میواڑ کی بغاوت
۱۶۸۱ء

نابالغ اجیت سنگھ کی ماں میواڑ کی راجکماری تھی۔ اس نے میواڑ کے سسرڈیا حکمران سے مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ میواڑ کے رانا راج سنگھ نے قدیم معاہدے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مارواڑ کی حمایت میں مغلیہ سلطنت کے خلاف اعلانِ بغاوت کر دیا اس پر شہزادہ اکبر کی قیادت میں مغل افواج میواڑ میں داخل ہو گئیں۔ رانا دارالحکومت سے فرار ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپا اور مغل شہزادہ نے بڑی آسانی سے اودھے پور اور چتوڑ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن سسرڈیا راجپوتوں نے قزاقانہ طریق جنگ اختیار کر کے اور مغل دستوں پر چوطرفہ اچانک حملے کر کے شہزادہ اکبر کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ شہزادہ اکبر وہاں کے حالات پر قابو

Marfat.com

پانے میں ناکام رہا۔ اسلئے عالمگیر نے اُسے اودھے پور (مارواڑ) منتقل کر دیا۔ اور شہزادہ اعظم کو چتوڑ کا حاکم مقرر کیا۔ ساتھ ہی بادشاہ نے میواڑ پر بیک وقت تین اطراف سے حملہ آور ہونے کا منصوبہ مرتب کیا۔ ۱۶۸۱ء میں خونریز معرکہ ہوا۔ مغلوں نے اودھے پور اور جتوڑ کو فتح کر لیا۔ اورنگ زیب شہزادہ اکبر کو چتوڑ کا حاکم مقرر کر کے اجمیر واپس آگیا۔ بعد ازاں راجپوتوں نے شہزادہ اکبر کو ایک خونیں معرکہ میں زبردست شکست دی۔ اس پر اورنگ زیب نے اسے تبدیل کر کے مارواڑ بھیج دیا۔

میواڑ کے رانا راج سنگھ نے یکم نومبر ۱۶۸۰ء کو وفات پائی۔ اس کے بعد رانا جے سنگھ راج گدی پر بیٹھا۔ نئے رانا اور درگا داس نے شہزادہ اکبر کے سالار تہور خاں سے گٹھ جوڑ کر کے اس کی وساطت سے نوعمر شہزادہ اکبر کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ چنانچہ راجپوتوں کی شہ پر شہزادہ اکبر نے جنوری ۱۶۸۱ء میں اپنے باپ اورنگ زیب کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اور بتیس ہزار راجپوتوں کی معیت میں بادشاہ کی فرودگاہ اجمیر کی طرف بڑھا۔ اورنگ زیب کے لئے یہ مرحلہ سخت نازک اور پریشان کن تھا۔ کیونکہ اس کے پاس خواجہ سراؤں اور اہل دفتر سمیت صرف آٹھ سو آدمیوں کی جمعیت تھی مگر اورنگ زیب نے ہمت نہ ہاری اور بکمال سکون و اطمینان بنظر غائر صورت حال کا جائزہ لیتا رہا حتیٰ کہ شہزادہ معظم اپنی دس ہزار فوج کے ساتھ اجمیر آن پہنچا۔ علاوہ ازیں شہزادہ اکبر کا سالار تہور خاں بھی اپنے خسر کی جانب سے وطکی آمیز پیغام پہنچنے پر اپنے خاندان کے تحفظ کے پیش نظر شہزادہ اکبر کا ساتھ چھوڑ کر شاہی کیمپ میں آگیا۔ لیکن بادشاہ کی فرودگاہ میں پہنچتے ہی محافظ دستہ کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔

بادشاہ باغی شہزادہ اکبر کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے اجمیر سے دس میل آگے بڑھ کر دوراہا کے مقام پر مورچہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی اس نے سیاسی پیش بندی کے طور پر ایک خط شہزادہ اکبر کے نام اس مضمون کا لکھا کہ "بلاشبہ تم تحسین و انعام کے مستحق ہو کہ تم نہایت چالاکی سے اہم ترین راجپوتوں کو بیوقوف بنا کر یہاں لانے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ یقیناً اب وہ نہایت آسانی سے کچلے جا سکیں گے۔" اس خط کو کمال صفائی اور ہوشیاری سے راجپوتوں کے کیمپ میں پھینکوا دیا، جہاں وہ درگا داس راٹھور کے ہاتھ لگا جسے پڑھ کر درگا داس اور دیگر راجپوتوں کے اوسان خطا ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ شہزادہ اکبر ان سے کوئی نہایت گہری اور ہلاکت خیز چال چل رہا ہے چنانچہ وہ اس خط کی وضاحت کیلئے شہزادہ کے سالار تہور خاں کے خیمے میں پہنچے۔ لیکن جب انہوں نے اسے وہاں سے غائب پایا تو ان کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا اور وہ شہزادہ سے بدظن ہو گئے اور

Marfat.com

شہزادے کے کیمپ میں لوٹ مار کرنے کے بعد واپس میواڑ لوٹ گئے۔ دریں اثنا اکبر کے اور بہت سے ساتھی بھی شہزادہ کا ساتھ چھوڑ کر شاہی کیمپ میں جا چکے تھے۔ اس پر شہزادہ اکبر کو بھی شدید پریشانی کی حالت میں شاہی عتاب سے بچنے کے لئے واپس میواڑ کو لوٹنا پڑا۔ ازاں بعد وہ دکن میں پہنچ کر سنبھاجی مرہٹہ کے دربار میں پناہ گزین ہوا۔ لیکن جب شاہی افواج اس کے تعاقب میں دکن پہنچیں تو وہ سمندر کے راستے ایران بھاگ گیا اور وہیں اس نے وفات پائی۔

میواڑ کی اطاعت ۱۶۸۱ء

اورنگ زیب نے سرکش راجپوتوں کے خلاف سرگرمی سے فوجی کارروائی جاری رکھی اور بالآخر انہیں مغلیہ سیادت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ جون ۱۶۸۱ء میں میواڑ کے رانا جے سنگھ نے مصالحہ کی تاب نہ لاتے ہوئے شہزادہ معظم کی وساطت سے شہنشاہ سے معافی مانگ لی۔ اس نے جزیہ کی بحالی کے عوض اپنی ریاست کے دو پرگنے میڈل پور اور ہڈنور مغلیہ حکومت کے حوالے کر دیئے بادشاہ نے اسے پانچ ہزاری منصب اور رانا کے خطاب سے نوازتے ہوئے اس کی ریاست کو بحال کر دیا۔ رانا جے سنگھ ہمیشہ اورنگ زیب کا وفادار رہا۔

مارواڑ کی شکست ۱۶۹۸ء

میواڑ کے اطاعت گذار بن جانے سے اگرچہ بار مار کے راٹھور بددل ہو گئے لیکن انہوں نے اپنی ریاست کی بحالی کے لئے جدوجہد کو جاری رکھا۔ چنانچہ درگا داس اور اجیت سنگھ کی سرکردگی میں ایک مدت تک فدائانہ طریق جنگ سے برسرپیکار رہے لیکن آخر کار ۱۶۸۷ء میں انہوں نے ہتھیار ڈال کر بادشاہ سے معافی مانگ لی اورنگ زیب نے اجیت سنگھ کو معافی دیتے ہوئے اسے تین پرگنوں پر مشتمل ایک جاگیر عطا کی اور پنج ہزاری منصب سے بھی نوازا۔ بادشاہ نے درگا داس کو بھی معاف کر دیا اور اسے سہ ہزاری منصب عطا کر کے ہتن (گجرات) کا فوجدار مقرر کر دیا مگر راٹھوروں نے ۱۷۰۲ء میں پھر غداری کی اور بغاوت کر دی لیکن انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی اور وہ بادشاہ سے معافی کے خواستگار ہوئے اورنگزیب نے ایک بار پھر انہیں فیاضی اور فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں معاف کر دیا۔

راجپوت پالیسی کا تنقیدی جائزہ

راجپوتوں سے جنگ کے بڑے افسوسناک نتائج برآمد ہوئے۔ مغلوں اور راجپوتوں کے قدیمی تعلقات جو باہمی دوستی اور تعاون پر مبنی تھے، خراب ہو گئے۔ اورنگزیب کو انہیں اطاعت گذار بنانے پر قیمتی وقت کے ساتھ کثیر تعداد میں روپیہ بھی خرچ کرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے نہ صرف شمالی برصغیر کا امن متاثر ہوا اور غیر مسلموں میں باغیانہ عزائم اور سرکشی نے جنم لیا بلکہ ملکی نظام

Marfat.com

پر بھی ناقابل برداشت بوجھ پڑا۔

شہزادہ اکبر کی بغاوت سے جہاں مغلیہ وقار کو ناقابلِ برداشت نقصان پہنچا وہاں راجپوتوں کا باہمی اتفاد بھی بہت بری طرح متاثر ہوا۔ اور وہ نفاق کا شکار ہو گئے۔ نتیجۃً میواڑ کے رانا نے بادشاہ سے معافی مانگ کر اطاعت قبول کر لی۔ راجپوتوں کی بغاوت کے باعث اورنگزیب دکنی مہمات میں راجپوت فوج کو بڑی تعداد میں استعمال نہ کر سکا۔ مندرجہ بالا واقعات کے جائزے سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اشتعال انگیزی کس کی جانب سے ہوئی اور اس سلسلے میں اورنگ زیب کا طرزِ عمل کیا رہا۔ اکثر ہندو مؤرخین خاص طور پہ جادو ناتھ سرکار کی طرف سے اورنگ زیب پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے طرزِ عمل سے راجپوت سرداروں کو جو اب تک حکومت مغلیہ کے دست و بازو رہے تھے ناراض کر دیا۔ اور اس نے راجا جسونت سنگھ کی وفات کے بعد ریاست مارواڑ کا سلطنتِ مغلیہ سے الحاق کرنا چاہا تاکہ راجپوت نفاق کا شکار ہوں اور ان کی قوتِ مدافعت ختم ہو کر رہ جائے۔ نیز آئندہ مارواڑ کا کوئی راجہ برصغیر کے مظلوم ہندوؤں کا قائد نہ بن سکے۔ لیکن راجپوتوں کی بغاوت کے واقعات سے ان بے بنیاد الزامات کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے۔ اگر اورنگ زیب کا ارادہ ریاست مارواڑ کے الحاق کا ہوتا تو راجہ جسونت سنگھ کی وفات کے بعد وہ بڑی آسانی سے مارواڑ کو مغلیہ سلطنت میں مدغم کر سکتا تھا مگر اس نے راجپوتوں کو مستقل اپنا دوست اور وفادار بنانے کی پالیسی پر کاربند رہتے ہوئے راجہ جسونت سنگھ کے بھتیجے اندر سنگھ کو مارواڑ کی راج گدی پر بٹھا دیا کیونکہ ریاست میں نظم و نسق کی بحالی ضروری تھی۔ نیز شاہی ریکارڈ کے مطابق جسونت سنگھ لاولد تھا۔ مگر جونہی بادشاہ کو اجیت سنگھ کی پیدائش کا علم ہوا، اس نے شاہی فرمان کے ذریعے وعدہ کیا کہ سن تمیز کو پہنچنے پر اس کی ریاست، منصب اور خطاب شاہی سب کچھ بحال کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی اس نے تیموری روایات کے مطابق اجیت سنگھ کو دربار میں بھیجنے کا حکم دیا تاکہ اسے شاہی سرپرستی میں رکھا جائے لیکن درگا داس راٹھوڑ نے جو خود ریاست مارواڑ میں اقتدار کا خواہاں تھا۔ اجیت سنگھ اور رانی کو جودھپور سے بھاگا اور یہ جھوٹی خبر مشہور کر دی کہ اورنگ زیب راجکمار کو شاہی سرپرستی میں رکھنے کے بہانے مسلمان بنانا اور مارواڑ کو مغلیہ سلطنت میں مدغم کرنا چاہتا ہے جس سے راجپوتوں نے مشتعل ہو کر علمِ بغاوت بلند کر دیا اور اورنگزیب کو مجبوراً ان کی گوشمالی کے لئے فوجی کارروائی کرنی پڑی۔

درحقیقت مغل حکومت کا یہ عام دستور تھا کہ جب کوئی بڑا منصبدار کمسن بچوں کو چھوڑ کر مر جاتا تو بادشاہ ان بچوں کو شاہی سرپرستی میں لے لیتا تھا جس طرح کہ اکبر نے بیرم خاں کے لڑکے عبدالرحیم کو پالا تھا۔ اورنگ زیب نے اجیت سنگھ کو اسی قدیم تیموری روایت کے تحت دربار

Marfat.com

میں طلب کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اورنگ زیب کا مقصد اس کی سرپرستی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بادشاہ نے سیواجی کے پوتے ساہو جی کو گرفتار کیا تو اس کی عمر سات برس تھی۔ اورنگ زیب نے اس کی تربیت اپنی نگرانی میں کی اور اس کے بالغ ہونے پر اسے ہفت ہزاری منصب سے نوازا لیکن اسے مسلمان نہ کیا حالانکہ وہ سلطنت مغلیہ کے خطرناک ترین دشمن سیواجی کا پوتا تھا۔ اپنے متبنیٰ اور فراغدلانہ کردار کی اس قدر واضح روایت کی موجودگی میں یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ عالمگیر اجیت سنگھ سے اس قسم کا ناروا اور جابرانہ سلوک کرتا جبکہ وہ اس کے ایک وفادار راجپوت منصبدار کا بیٹا تھا وہ تو کہیں بہتر سلوک کا مستحق تھا۔

راجپوت بغاوت کا اصل سبب درحقیقت راجپوتوں کا وہ احساس تھا جو شروع ہی سے وہ مغلیہ حکومت کے بارے میں رکھتے تھے۔ وہ روز اول ہی سے مسلمانوں کو اجنبی اور غاصب تصور کرتے تھے۔ انہوں نے اب تک کسی مسلم حکومت کو دل سے تسلیم نہ کیا تھا۔ علاوہ ازیں اکبر کی بیجا مراعات اور غلط بخششوں نیز جہانگیر اور شاہجہان کی غلط پالیسی نے انہیں مزید زور بنا دیا تھا اور ان میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ ان کے تعاون کے بغیر مغلیہ حکومت ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اورنگ زیب نے جس کی حکمتِ عملی اسلامی رواداری اور شریعت کے بیحد مطابق تھی جب ملکی نظم و نسق کو شریعت کے اصولوں کے مطابق استوار کرنے کے لئے ذرا سختی اختیار کی تو راجپوت مشتعل ہو گئے اور انہوں نے باغیانہ رویہ اختیار کر لیا۔ ان کے جذبات کا صحیح ترجمان مان سنگھ نہیں رانا پرتاپ تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی فوجی قوت اور سیاسی بصیرت سے ایک بار پھر انہیں اطاعت گذار بنا تو لیا مگر وہ کسی مناسب موقع کے انتظار میں رہے تاکہ اسلامی حکومت کو ختم کر کے رام راجیہ قائم کر سکیں۔

دکن پالیسی

۱۶۸۱ء میں ریاست مارواڑ کے راٹھور راجپوتوں کو گوشمالی کرنے اور میواڑ کے رانا کو اطاعت گذار بنانے کے بعد اورنگ زیب بہ نفس نفیس باغی شہزادہ اکبر کی سرزنش کے لئے دکن روانہ ہوا۔ جہاں اس کی زندگی کے بقیہ پچیس سال سرکش اور باغی دشمنوں سے جنگ و جدل میں بسر ہوئے۔ دکنی مسائل جو گذشتہ ایک صدی سے مغلیہ سلطنت کو درپیش تھے کو حل کرنے میں اس نے پیرانہ سالی میں جس ثابت قدمی اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا وہ برصغیر کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے اس دوران اس نے دکنی ریاستوں بیجاپور اور گولکنڈہ کے الحاق اور مرہٹوں کے قلع قمع کا اہتمام کیا۔

اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کے بعد پورے اٹھائیس برس تک دکنی ریاستوں کو جاگذار رہنے دیا۔ لیکن مرہٹوں کی مسلسل شورشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے نیز بیجاپور اور

Marfat.com

گولکنڈہ کے حکمرانوں کی وعدہ خلافیوں سے تنگ آکر اس نے دکنی ریاستوں کے الحاق کو ناگزیر قرار دیا جس کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں:۔

۱۔ اورنگ زیب کی دکنی پالیسی کا سب سے بڑا ہدف مرہٹوں کا مکمل استیصال تھا جنہوں نے مسلمانوں کو تنگ کرنا اور لوٹ کھسوٹ کو اپنا شیوہ بنا رکھا تھا۔ علاوہ ازیں مرہٹے مغلیہ اسلامی سلطنت کو ختم کرکے رام راجیہ کے قیام کے خواہاں تھے۔

۲۔ دکن کی دونوں مسلم ریاستیں بیجاپور اور گولکنڈہ عہد شاہجہانی سے مغلیہ سلطنت کی باجگذار تھیں باوجودیکہ یہ ریاستیں بدنظمی، ابتری اور انتشار کا شکار ہو چکی تھیں اورنگ زیب نے انہیں مزید اٹھائیس سال تک باجگذار رہنے دیا۔ ان ریاستوں کے شاہی دربار امرا کی باہمی سازشوں کے اڈے بن چکے تھے۔ ان کے حکمرانوں نے معاہدوں کی خلاف ورزی کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا وہ باج کی رقم کے بقایا جات ادا نہیں کرتے تھے۔ مرہٹے ان ریاستوں کی سیاسی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ مرہٹہ فوجیں مغلوں سے پٹ پٹا کر ان ریاستوں میں پناہ گزیں ہو جاتی تھیں اور ان ریاستوں سے فوجی امداد حاصل کرکے دوبارہ تازہ دم ہو کر مغلوں کے مقابل آجاتی تھیں۔ گویا ریاستیں ایک لحاظ سے مرہٹوں کی حلیف تھیں۔

۳۔ دکن کی یہ دونوں ریاستیں نہ صرف کمزور تھیں بلکہ ان کے حکمران انتہائی درجہ کے نااہل تھے۔ انہوں نے عیش و نشاط کو ہی اپنا مقصدِ حیات بنا رکھا تھا علاوہ ازیں مغلیہ سلطنت کے تمام باغی ان ریاستوں میں جا کر پناہ گزیں ہو جاتے تھے۔

ریاست بیجاپور کا الحاق ۱۶۸۶ء

۱۶۵۷ء میں عادل شاہ والیٔ بیجاپور سے صلحنامہ طے کرنے کے بعد اورنگ زیب کو جنگ تخت نشینی کے باعث تیزی سے واپس دارالسلطنت کو لوٹنا پڑا تھا۔ عادل شاہ نے ملک میں خانہ جنگی اور شمالی برصغیر کے نظم و نسق میں اورنگ زیب کی مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے باج کی رقم ادا نہ کی اس پر مستزاد یہ کہ مغلوں کے دشمن مرہٹہ سردار سیواجی کی پشت پناہی کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ اس پر ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب نے راجہ جے سنگھ کو ریاست بیجاپور کے خلاف فوجی کارروائی پر مامور کیا جے سنگھ نے عادل شاہی فوج کو پسپا کرکے ریاست بیجاپور کا محاصرہ کر لیا۔ عادل شاہ نے بیجاپور کے گرد و نواح کے علاقوں کو ویران کر دیا۔ جس کی وجہ سے مغلیہ فوج کے لئے رسد کا حصول بیحد محال ہو گیا لاچار راجہ جے سنگھ کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔

۱۶۷۲ء میں عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا چار سالہ لڑکا سکندر عادل شاہ بیجاپور

Marfat.com

سکے تخت پر بیٹھا۔ اس سے ریاست کا جملہ اقتدار امرار کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ نتیجتہً بیجاپوری دربار امرار کی باہمی سازشوں کا اڈہ بن گیا۔ مسلمان امرار دو گروہوں میں بٹ گئے۔ یعنی افغان اور حبشی امرار۔ علاوہ ازیں دکنی وغیر دکنی کا امتیاز بھی پیدا ہو گیا۔ اس سے ریاست کا نظم و نسق درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ ان حالات میں ریاست کا وجود مغلوں کے لئے ایک نا سور بن گیا۔ چنانچہ مغل فوج نے ۹-۱۶۹۸ء میں دلیر خاں کی زیر قیادت دوسری بار بیجاپور پر حملہ کیا اور دکنی فوج کو شکست فاش دی۔ نتیجہ میں یہ معاہدہ طے پایا کہ سلطنتِ بیجاپور مرہٹہ سردار سیواجی کے خلاف مغلوں کی حمایت کرے اور مرہٹوں کے خلاف جنگ میں باقاعدہ حصہ لے۔ نیز بیجاپور کی شہزادی شہر بانو (بادشاہ بی بی) کی شادی مغل شہزادہ معظم سے کر دی جائے۔

اورنگ زیب دکن میں مرہٹوں کے مکمل استیصال کا نصب العین لیکر گیا تھا۔ اس نے سلطان سے تعاون کی پُرزور درخواست کی۔ مگر سلطان نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا جبکہ بیجاپور کے شاہی سالار شرزہ خاں نے کھلے طور پر مرہٹوں سے گٹھ جوڑ کئے رکھا۔ اس پر مغل شہنشاہ نے اپریل ۱۶۸۵ء میں شہزادہ اعظم کو سلطان کی گوشمالی پر مامور کیا۔ شہزادے نے بیجاپور کا محاصرہ کر لیا۔ جولائی ۱۶۸۶ء میں عالمگیر خود بھی بیجاپور پہنچ گیا۔ آخر ڈیڑھ سال کے طویل محاصرے کے بعد ستمبر ۱۶۸۶ء میں بیجاپور فتح ہو کر مغلیہ سلطنت میں شامل ہوا۔ سلطان سکندر عادل شاہ گرفتار ہو کر مغلوں کا پنشن خوار بن گیا۔ اورنگ زیب نے ایک لاکھ روپیہ وظیفہ مقرر کر کے اسے دولت آباد کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔

ریاست گولکنڈہ کا الحاق ۱۶۸۷ء

ریاست گولکنڈہ کے حکمران قطب شاہ نے ۱۶۷۲ء میں وفات پائی۔ اولاد نرینہ نہ ہونے کے باعث اس کے ایک دُور کے رشتہ دار ابوالحسن کو گولکنڈہ کے تخت پر متمکن کیا گیا۔ اس کی گذشتہ زندگی قلندروں اور درویشوں کی صحبت میں بسر ہوئی تھی بادشاہ بننے کے بعد اس نے عیش و نشاط کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ وہ عوام میں "تاناشاہ" کے لقب سے مشہور تھا اور شاہد و شراب کا رسیا تھا۔ صدر مقام حیدر آباد میں اس کے حرم میں کم و بیش بیس ہزار رقاصائیں موجود تھیں۔ وہ کیف و نشاط کے مشاغل میں اس قدر کھویا رہتا کہ اپنے پندرہ سالہ دورِ حکومت میں وہ ایک بار بھی دارالسلطنت سے باہر نہیں گیا تھا۔ حکومت کا جملہ کاروبار ایک متعصب ہندو وزیر مدنا کے ہاتھ میں تھا جو درپردہ مرہٹوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ اس نے نہ صرف مسلمانوں کو اپنے تعصب کا شکار بنایا بلکہ مغلوں کے خلاف مرہٹوں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ محاذ بھی قائم کیا۔

Marfat.com

۱۶۶۶ء میں جب مرہٹہ سردار سیواجی مغلیہ دربار سے فرار ہو کر دکن پہنچا تو قطب شاہ نے اس کی ہر طرح سے مدد کی۔ جس سے سیواجی کو اپنی طاقت کو مستحکم کرنے کا خاطر خواہ موقع مل گیا اور ۱۶۷۷ء میں جب وہ حیدر آباد آیا تو قطب شاہ نے نہ صرف اس کا شایان شان استقبال کیا اور اس کی مالی و فوجی امداد کی، بلکہ اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کے لئے اس سے دفاعی معاہدہ بھی کیا۔ اس گٹھ جوڑ اور معاہدہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیواجی کھل کھیلا اور اپنے ہی سال سلطنتِ مغلیہ کے ایک پرگنہ کو لوٹ مار کا نشانہ بنایا اور غارتگری شروع کر دی۔ ۱۶۷۹ء میں سیواجی کی موت کے بعد سنبھا جی مرہٹہ راج گدی پر بیٹھا تو ابوالحسن قطب شاہ نے ایک لاکھ ہون (طلائی سکہ) سالانہ اس کی مالی امداد کے طور پر مقرر کئے۔ علاوہ ازیں جب مغل فوج بیجاپور پر حملہ آور ہوئی تو اس نے عادل شاہ کی بھی ہر طرح سے امداد کی۔ چنانچہ فروری ۱۶۸۷ء میں بیجاپور کی تسخیر کے بعد اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر حملہ آور ہو کر اس کے پایہ تخت کا محاصرہ کر لیا۔ اسی دوران بادشاہ کو اطلاع ملی کہ شہزادہ معظم ابوالحسن قطب شاہ سے خفیہ گٹھ جوڑ کر رہا ہے۔ اس پر شہزادے کو نظر بند کر دیا گیا اور سات سال کے بعد اسے اس نظر بندی سے رہائی ملی۔ بالآخر ستمبر ۱۶۸۷ء میں ریاست گولکنڈہ کو فتح کر کے باقاعدہ اس کا مغلیہ سلطنت سے الحاق کر لیا گیا۔ ابوالحسن قطب شاہ کو دولت آباد کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا اور پچاس ہزار روپیہ اس کا سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ گولکنڈہ کی تسخیر کے دوران عبدالرزاق لاری قطب شاہ کا واحد فوجی افسر تھا جس نے مغلوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور میدان جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے ستر زخم کھائے اورنگ زیب نے اس کی قدر افزائی کرتے ہوئے اسکے علاج معالجہ کا مناسب بندوبست کیا اور صحتیاب ہونے پر اعلیٰ منصب سے نوازا۔

نتائج

ریاست بیجاپور اور گولکنڈہ کی تسخیر سے اگرچہ مغلیہ سلطنت بہت وسیع ہو گئی اور انتظامی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں مگر مرہٹوں کے استیصال کے لئے آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ کیونکہ اب مغلیہ سلطنت اور مرہٹوں کے درمیان کوئی دوسری ریاست حائل نہ تھی اور مرہٹوں کو پناہ لینے کے لئے پہاڑی علاقوں میں بھٹکنا پڑا۔

۱۶۸۷ء کے بعد اورنگ زیب نے مرہٹوں کی مکمل سرکوبی کیلئے ان کے خلاف سخت فوجی کارروائی کی اور ان کا کچومر نکال کر رکھ دیا۔ لیکن وہ مرہٹوں کی طاقت کا مکمل صفایا نہ کر سکا۔ ۲۶ سال تک دکن میں مصروفِ جنگ رہنے کی وجہ سے تمام سلطنت کا نظم و نسق سخت متاثر ہوا۔ حکومت کی آمدنی کم ہو گئی اور خزانہ خالی ہو گیا۔ علاوہ ازیں مسلسل فوجی کارروائیوں سے جنگلات اور مزروعہ زمینیں تباہ ہو گئیں۔ نتیجۃً زراعت اور تجارت تباہ ہو کر رہ گئی۔ عوام کی خوشحالی سخت متاثر ہوئی۔ بالخصوص دیہاتی عوام سخت پریشانی کا شکار ہوئے۔ نیز مرہٹوں کے مکمل استیصال

Marfat.com

نہ ہو سکنے کی وجہ سے مغلیہ فوج کا وقار اور دبدبہ بھی متاثر ہوا۔ اگرچہ اورنگزیب نے بار بار مرہٹوں کا سر کچلا مگر وہ پورے طور پر انہیں ختم نہ کر سکا۔ اس لحاظ سے اس کی دکن پالیسی ناکام ثابت ہوئی لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اکبر نے اپنی وسعت پذیری کی پالیسی کے تحت تسخیر دکن کے کام کو شروع کیا تھا جسے جہانگیر اور شاہجہان نے جاری رکھا لیکن وہ دکن کی مکمل تسخیر کر کے اسے مغلیہ سلطنت میں مدغم نہ کر سکے مگر اورنگ زیب نے پیرانہ سالی کے باوجود ذہانت قدمی اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کر کے دکنی ریاستوں کو فتح کر لیا اور ان کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر کے اکبر کے ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اسی لئے ایڈورڈ اور گیرٹ لکھتے ہیں کہ "اورنگ زیب کی دکنی پالیسی اس کے جد امجد اکبر کی سولھویں صدی میں شروع کردہ امپیریلزم کی پالیسی کی پیروی اور جہانگیر و شاہجہان کے محرک کردہ حکمت عملی کی روئیداد ہے"[1]

مرہٹوں کا عروج و زوال

اورنگ زیب اور مرہٹے

مرہٹہ قوم جنوبی برصغیر پاک و ہند کے علاقہ مہاراشٹر کی ایک قدیم قوم تھی۔ مہاراشٹر کا علاقہ کوہ بندھیا چل سے مغربی گھاٹ تک پھیلا ہوا تھا اس علاقے کا بیشتر حصہ احمد نگر اور بیجاپور کی سلطنتوں کے زیر نگیں تھا۔ نیز یہ علاقہ دشوار گذار پہاڑوں، تند و تیز ندی نالوں اور سطح مرتفع پر مشتمل تھا۔ یہاں کے باشندوں کو ضروریات زندگی کے حصول کے لئے سخت محنت اور جد و جہد کرنی پڑتی تھی جس کی وجہ سے وہ سخت کوش، جفاکش و جنگجو، بلند ہمت اور چاک و چوبند واقع ہوئے تھے۔ یہ لوگ عموماً پست قامت اور گٹھے ہوئے جسم کے ہوتے تھے۔ کھیتی باڑی اور قتل و غارتگری ان کے مرغوب مشغلے تھے۔

سترھویں صدی عیسوی سے قبل اس قوم کی کوئی سیاسی اہمیت نہ تھی۔ احمد نگر کے حبشی نژاد وزیر ملک عنبر نے مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مرہٹوں کو نظام شاہی فوج میں بھرتی کیا اور ان کے علاقے کے جغرافیائی خدوخال اور ان کی عادات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں قزاقانہ (گوریلا) طرز جنگ کی تربیت دی۔ کیونکہ علاقائی ماحول اور حالات کے پیش نظر یہی طرز جنگ مرہٹوں کے لئے موزوں تر بھی تھی۔ مہاراشٹر کے دشوار گذار پہاڑ، تند و تیز ندی نالے گھنے جنگلات اور غاریں ان کی کمین گاہیں تھیں جہاں سے وہ اچانک نمودار ہو کر مغل فوج پر جھپٹ سکتے تھے۔ ملک عنبر کے دور اقتدار

---

[1] "مغل رول ان انڈیا"

Marfat.com

میں بہت سے مرہٹہ سردار احمد نگر اور بیجاپور کی افواج میں ملازم ہو گئے تھے۔ جن میں مالوجی نامی ایک فوجی افسر بھی تھا جو سیواجی کا دادا اور شاہ جی بھونسلہ کا باپ تھا۔

شاہ جی بھونسلہ

شاہ جی بھونسلہ (ساہوجی) ۱۵۹۴ء میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام مالوجی تھا جو احمد نگر میں نظام شاہی فوج میں اچھے عہدے پر ملازم تھا۔ شاہ جی بھونسلہ کی شادی احمد نگر کے ایک مرہٹہ جاگیردار جے دیوراؤ کی لڑکی جیجا بائی سے ہوئی۔ مالوجی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے فتح خاں نے شاہ جی بھونسلہ کو نظام شاہی ملازمت میں لے لیا اور اسے خاندیش کے مغل علاقے کی غارتگری پر مامور کیا۔ جن دنوں شاہ جہان احمد نگر کی تسخیر پر مامور تھا، شاہ جی بھونسلہ نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد نگر کے علاقہ جنار پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں اس نے شاہجہان کی ملازمت اختیار کر لی جس نے اسے پنج ہزاری منصب عطا کیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد شاہ جی بھونسلہ ناراض ہو کر عادل شاہ والیٔ بیجاپور کی ملازمت میں چلا گیا۔ جب عہدِ شاہجہانی میں احمد نگر کی ریاست کا الحاق عمل میں آیا اور نظام شاہ کو قید کر دیا گیا تو شاہ جی نے ایک غیر معروف لڑکے کو نظام شاہ کا جانشین قرار دیکر اور خود اس کا سرپرست بن کر مغلوں کے خلاف جنگ کو جاری رکھا۔ اور احمد نگر کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس پر مغلیہ فوج نے اس کے خلاف فوجی کارروائی کر کے اس کے تلعوں پر قبضہ کر لیا اور وہ بیجاپور بھاگ گیا جہاں اس نے سلطان عادل شاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ سلطان نے اسے پونا اور سوپا کے پرگنے بطور جاگیر عطا کئے۔

سیواجی مرہٹہ
۱۶۲۷ء تا ۱۶۸۰ء

مرہٹہ لیڈر سیواجی، شاہ جی بھونسلہ کا لڑکا تھا جو عادل شاہ والیٔ بیجاپور کے ہاں ملازم تھا۔ سیواجی مشہور مؤرخ سر جادو ناتھ سرکار کے قول کے مطابق ۱۰۔ اپریل ۱۶۲۷ء کو پونا کے جنوب میں واقع ایک پہاڑی قلعہ شوِنر (SHIVNER) میں پیدا ہوا تھا اس کی والدہ کا نام جیجا بائی تھا جو ایک مرہٹہ جاگیردار کی بیٹی تھی۔ شاہ جی بھونسلہ اپنے بیٹے کی پرورش سے بالکل غافل تھا چنانچہ سیواجی نے بیجاپور (جہاں شاہ جی ملازم تھا) کی بجائے پونا میں اپنی ماں کے زیرِ سایہ تربیت حاصل کی۔ سیواجی کی ماں جیجا بائی ایک کٹر مذہبی عورت تھی۔ چنانچہ جیجا بائی اور سیواجی کے اتالیق پنڈت دادو جی کونڈہ دیو نے بچپن میں ہی سیواجی کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تعصب کے شدید جذبات بھر دیئے تھے۔

جب سیواجی جوان ہوا تو اس نے مرہٹہ نوجوانوں کا ایک دستہ تیار کر کے لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیا اور بیجاپور کی سیاسی و عسکری کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی قوت کو اس قدر

Marfat.com

بڑھا لیا کہ ۱۶۴۶ء میں اس نے ٹورنا کے قلعہ جسے بیجاپوری گماشتہ کو شکست دیکر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ جہاں سے اسے دو لاکھ روپیہ بطور مال غنیمت ہاتھ لگا جس سے اس نے اپنی فوجی پوزیشن کو مزید مضبوط کیا اور قلعہ راج گڑھ تعمیر کیا۔ نیز اس نے جلد ہی پورن در کلیان، سنگھرہ اور کونڈانہ کے اہم قلعے بھی فتح کر لئے۔ اس پر جولائی ۱۶۴۸ء میں اس کے باپ شاہ جی بھونسلہ کو گرفتار کر کے بیجاپور میں قید کر دیا گیا۔ سیواجی نے دکن کے صوبیدار شہزادہ مراد کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی وساطت سے اپنے باپ شاہ جی بھونسلہ کو رہائی دلائی۔ لیکن اسے بنگلور اور کنڈانہ کے دو قلعے عادل شاہ والئے بیجاپور کے حوالے کرنے پڑے۔ رہا ہونے پر شاہ جی مرہٹہ نے اپنے بیٹے کے متعلق والئے بیجاپور کو یقین دہانی کرائی کہ وہ آئندہ امن و امان سے رہے گا۔ چنانچہ سیواجی آئندہ چھ سال تک خاموش رہا۔

۱۶۵۶ء میں سیواجی نے ریاست ستارا کے شمال مغرب میں واقع ہندو ریاست جاولی کو دھوکے سے فتح کیا۔ یہ اورنگ زیب کی نیابتِ دکن کا زمانہ تھا۔ نیز شاہجہان کے بیٹوں کے مابین حصول تخت نشینی کی جنگ سے فائدہ اٹھا کر متعدد مغل علاقوں کو اپنی غارتگری کا نشانہ بنایا لیکن بعد میں اورنگزیب سے معافی مانگ لی۔ سیواجی کی باغیانہ سرگرمیوں سے تنگ آکر والئے بیجاپور نے اس کی گوشمالی کے لئے افضل خان کی کمان میں ایک بھاری فوج روانہ کی۔ سیواجی نے افضل خاں سے ملاقات کی درخواست کی اور ملاقات کے وقت آہنی پنجوں سے اس کے پیٹ کو چاک کر دیا جس سے بیجاپوری فوج میں افراتفری اور بددلی پھیل گئی اور وہ اپنے سالار کی ہلاکت سے سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ سیواجی نے دریائے کرشنا تک تمام علاقے بیجاپور سے چھین لئے والئے بیجاپور نے تین بار سیواجی کے خلاف فوج کشی کی لیکن شکست کھائی اور آخر کار صلح کر کے مفتوحہ علاقے مرہٹوں کے قبضے میں رہنے دیئے۔

اب سیواجی طاقت کے زعم میں اور بھی سرکش ہو گیا۔ چنانچہ اس نے مغل علاقوں کو بھی تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ اس پر اورنگ زیب نے ۱۶۶۰ء میں اپنے ماموں شائستہ خاں کو جو ان دنوں دکن کا وائسرائے (نگران حکومت) تھا، سیواجی مرہٹہ کی گوشمالی پر مامور کیا۔ شائستہ خاں نے نہ صرف سیواجی کے متعدد غصب کردہ اور مفتوحہ قلعوں پر قبضہ کر لیا بلکہ اس کے صدر مقام پونا پر بھی قابض ہو گیا اور اس کے محل میں مقیم ہو گیا۔ سیواجی حسب عادت عیاری سے کام لیتے ہوئے ۵-اپریل ۱۶۶۳ء کی رات کو دو سو جانباز مرہٹہ سپاہیوں کو عورتوں کا لباس پہنا کر ایک بارات کی صورت میں پونا میں داخل ہوا اور آدھی رات کے وقت مغل فوج پر کامیاب شبخون مارا جس میں بہت سے مغل فوجی ہلاک ہوئے۔ شائستہ خاں کی تین انگلیاں کٹ گئیں اور اس کا بیٹا بھی مارا گیا۔ دراصل یہ سب کچھ شائستہ خاں کے معاون راجہ جسونت سنگھ کے ایما پر ہوا جس نے در پردہ سیواجی سے ساز باز کر رکھی تھی۔

Marfat.com

عالمگیر نے شائستہ خاں کی جگہ شہزادہ معظم کو دکن کا صوبیدار مقرر کیا۔ اب بھی راجہ جسونت سنگھ شہزادہ کا معاون اور نائب تھا۔ چنانچہ سیواجی کی باغیانہ سرگرمیاں بدستور جاری رہیں انہی ایام میں اس نے سورت کے خوبصورت اور متمول شہر میں زبردست لوٹ مار مچائی اور وہاں کے باشندوں کے مکانوں کو نذر آتش کر دیا۔ آخر ۱۶۶۵ء میں بادشاہ نے راجہ جسونت سنگھ کو دکن سے واپس بلا لیا اور راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں کو سیواجی کی سرکوبی پر مامور کیا۔ چنانچہ اب مغل فوج کے مقابلے میں اپنی عسکری پوزیشن کو کمزور پا کر سیواجی نے تین ماہ کے اندر اندر جے سنگھ کے سامنے خود حاضر ہو کر صلح نامہ کی رو سے مغلیہ حکومت کی اطاعت قبول کر لی اور اپنے تیس ۳۵ قلعوں میں سے ۲۳ قلعے مغلوں کے حوالے کر دیئے۔ ۱۶۶۶ء میں راجہ جے سنگھ نے اسے مغلیہ دربار میں حاضر ہونے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ سیواجی اپنے بیٹے سمیت آگرہ پہنچا جہاں اسے پنج ہزاری منصب عطا ہوا اور دربار میں پنج ہزاری امراء میں بیٹھنے کو جگہ ملی۔ چونکہ قبل ازیں اس کے کمسن بیٹے سنبھاجی کو یہی منصب مل چکا تھا اس لئے سیواجی نے اس مرتبے کو حقیر جانا۔

ہندو اور انگریز مورخین اس بات پر مصر ہیں کہ سنبھاجی کو جو منصب عطا ہوا تھا سیواجی کو اس سے بڑا منصب ملنا چاہیئے تھا۔ لیکن دربار تیموری کا یہ ایک قدیم دستور تھا کہ باپ اور بیٹے کو یکساں درجہ کا منصب و اعزاز عطا کیا جاتا تھا۔ اور چونکہ ابتداء میں کسی شخص کو پنج ہزاری سے زیادہ منصب نہیں مل سکتا تھا اس لئے سیواجی کو بھی پہلے پہل یہی منصب دیا جا سکتا تھا۔ جن لوگوں کو ہفت ہزاری اور دہ ہزاری مناصب ملے وہ سب بتدریج ترقی کر کے حسب استحقاق ان بلند مناصب تک پہنچے تھے۔ خود سیواجی مرہٹہ کے فاتح راجہ جے سنگھ کا اس سے پہلے یہی منصب (پنج ہزاری) تھا۔ لیکن سیواجی کی توقعات اس سے کہیں زیادہ تھیں۔ اس لئے اس نے راہ فرار اختیار کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ وہ دربار شاہی میں دردِ شکم کا بہانہ کر کے لیٹ گیا۔ اس پر بادشاہ نے اسے اپنی قیام گاہ پر جانے کی اجازت دیدی۔ بادشاہ نے اس کے متعلق راجہ جے سنگھ سے مشورہ طلب کیا اور جواب آنے تک اس کی قیام گاہ پر پہرہ بٹھا دیا۔ لیکن سنبھاجی کو دربار میں حاضری کی اجازت دیدی۔ اب سیواجی نے سازشی دماغ سے کام لیتے ہوئے ایک نئی چال چلی۔ اس نے اپنی اچانک اور شدید بیماری کا بہانہ بنایا اور مٹھائی کے بڑے بڑے ٹوکرے منگوا کر خیرات تقسیم کرانی شروع کر دی اور پھر ایک دن موقع پا کر انہی ٹوکروں میں اپنے بیٹے سمیت بیٹھ کر شاہی پہرہ داروں کو چکمہ دے کر فرار ہو گیا اور سنیاسیوں یعنی سادھوؤں کا روپ دھار کر دکن پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے تین سال تک مغلوں کے خلاف کسی تخریبی کارروائی میں حصہ نہیں لیا، بلکہ اپنی

Marfat.com

وفاداری کا یقین دلا کر قطب شاہ والئے گولکنڈہ کی اعانت سے اپنی پوزیشن کو بحال کرتا رہا۔ ۱۶۶۷ء میں راجہ جسونت سنگھ کی سفارش پر اورنگ زیب نے اسے "راجہ" کا خطاب بھی دیا۔ سیواجی مرہٹہ کی فوجی قوت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی روز افزوں قوت کے بل پر نواحی علاقوں سے "چوتھ" (ایک قسم کا جابرانہ ٹیکس) وصول کرنا شروع کر دیا۔ جس علاقہ سے اسے "چوتھ" نہ ملتی اسے لوٹ لیتا۔ علاوہ ازیں اس نے والئے گولکنڈہ کی مدد سے اپنے تمام قلعے دوبارہ حاصل کر لئے۔ ازاں بعد ۱۶۷۴ء میں اس نے رائے گڑھ کے مقام پر اپنی تاجپوشی کی تقریب منعقد کر کے باقاعدہ طور پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ مزید برآں ۱۶۷۷ء میں اس نے کرناٹک کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اپنی حکومت کا نام "سوراجیہ" رکھا اور اپنی ریاست کے نظم و نسق کو از سر نو منظم کر کے مستحکم کیا۔ اس کا وزیر پیشوا کہلاتا تھا۔ اس نے اپنی ریاست کے دفاع کے لئے متعدد قلعے تعمیر کروائے۔ وہ ۱۶۸۰ء میں ۵۳ سال کی عمر میں فوت ہوا۔

مشہور مورخ سمتھ کے قول کے مطابق "سیواجی ایک ڈاکو سردار تھا اور اس نے جس ریاست کی بنا ڈالی وہ ڈاکو ریاست تھی۔" اگرچہ سیواجی نے مرہٹوں میں خود مختاری کا جذبہ پیدا کیا۔ ان کی ایک منظم فوج تیار کی۔ نیز اس نے مرہٹوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے انہیں ایک عظیم مسلح قوت بنا دیا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی تمام زندگی قتل و غارت، شہروں کی ویرانی، مظلوموں کے قتل، قافلوں کے لئے قزاقانہ کردار اور فریب کاری کے واقعات سے عبارت تھی۔ اس نے ایک ایسے طرز عمل کی بنا ڈالی جس پر اس کے جانشین بھی کاربند رہے اور ہمیشہ گرد و نواح کے علاقوں اور ریاستوں کی تاخت و تاراج میں مصروف رہے۔

بعض مورخین سیواجی مرہٹہ کو حقارت سے 'پہاڑی چوہا' کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوٹ مار کرنے کے بعد چوہے کی مانند پہاڑوں میں روپوش ہو جاتا تھا۔ تاہم یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ اعلیٰ عسکری صلاحیتوں کا مالک تھا اور اس میں اپنی قوم کے لئے لیڈر شپ کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ اسلام دشمنی اور قزاقانہ و مکارانہ کردار کا پیکر ہونے کے باوجود سیواجی کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے مرہٹوں میں حصول آزادی کی روح پھونک کر ان میں جذبہ قومیت پیدا کیا اور اپنے بعد باقاعدہ ایک منظم مرہٹہ حکومت چھوڑی۔ اس لحاظ سے سیواجی کو مرہٹوں کا لیڈر کہنا درست ہے۔

سنبھاجی
۱۶۸۰ء تا ۱۶۸۹ء

سیواجی کی وفات ۱۶۸۰ء کے بعد اس کا لڑکا سنبھاجی مرہٹہ سلطنت کی راج گدی پر بیٹھا۔ وہ ایک عیاش اور بدمست نوجوان تھا۔ وہ اپنے باپ کے اوصاف سے عاری محض عیش و نشاط کا رسیا تھا۔ تاہم اس نے اپنے

Marfat.com

باپ کی روایات کو برقرار رکھا اور اس کی زیر قیادت مرہٹہ سپاہی آبادیوں کو تاخت و تاراج کرتے رہے۔ ۱۶۸۲ء میں اس نے برہان پور پر حملہ کر دیا۔ اور مسلمانوں کے قتل سے ہاتھ رنگے۔

انہی ایام میں اس نے باغی شہزادہ اکبر کو اپنے ہاں پناہ دی۔ سنبھاجی نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں سے گٹھ جوڑ کر کے ان کی ریاستوں کے وسائل کو مغلوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔

سنبھاجی اور دکنی ریاستوں کے اس گٹھ جوڑ نے اورنگ زیب کو مشتعل کر دیا۔ چنانچہ وہ مارچ ۱۶۸۲ء میں باغی شہزادہ اکبر کی سرکوبی اور مرہٹوں کے استیصال کے لئے خود دکن پہنچا۔ اور اورنگ آباد میں قیام پذیر ہو کر مرہٹوں کے خلاف باقاعدہ فوجی کارروائی کا آغاز کیا۔ مغل افواج نے مختلف اطراف سے مرہٹوں پر حملہ کیا اور ان کے متعدد قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا مگر بادشاہ نے محسوس کیا کہ دکنی ریاستوں کی مکمل تسخیر کے بغیر مرہٹوں کا استیصال ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں ریاستیں (بیجاپور اور گولکنڈہ) درپردہ مرہٹوں کو فوجی اور مالی امداد دے کر مغلوں کے خلاف اکسا رہی تھیں۔

۱۶۸۷ء کے آخر تک اورنگ زیب دکنی ریاستوں کی تسخیر سے فارغ ہو گیا۔ مفتوحہ علاقوں کے نظم و نسق کو درست کرنے کے بعد بادشاہ دوبارہ یکسوئی کے ساتھ مرہٹہ طاقت کی بیخ کنی کی طرف متوجہ ہوا۔ شاہی سالار مقرب خاں نے ۱۱ فروری ۱۶۸۹ء کو اچانک حملہ کر کے رتنا گڑھی سے بائیس میل دور واقع سنگامیشور کے مقام پر سنبھاجی اور اس کے وزیر کوی کیلاش کو مع ۲۵ مرہٹہ سرداروں کے گرفتار کر لیا جہاں وہ پناہ گزین تھے اور عیش و عشرت میں مصروف تھے۔ چونکہ سنبھا سخت سفاک اور ظالم تھا اور نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی اس کی سفاکیوں اور بے رحمانہ غارتگریوں سے نالاں تھے اس لئے جب اس کی گرفتاری کی خبر مشہور ہوئی تو تمام ملک میں خوشی کے غلغلے بلند ہوئے۔ جب وہ پابہ زنجیر عالمگیر کے دربار کو روانہ ہوا تو راستہ میں جدھر سے گذرتا تھا شریف عورتیں تک گھروں سے نکل آتی تھیں اور اس کی گرفتاری پر اپنی خوشیوں کا اظہار کرتی تھیں۔" [1]

بادشاہ بہادر گڑھ میں مقیم تھا جہاں اس کے حضور سنبھا کو پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے اس کی جان بخشی کے لئے تین شرطیں پیش کیں۔ اولاً وہ اپنے قلعے حکومت کے حوالے کر دے ثانیاً تمام خزانہ پیش کرے ثالثاً ان مغل جرنیلوں کے نام ظاہر کرے جو پس پردہ اس کی اعانت کرتے رہے۔ لیکن سنبھا نے ان شرائط کو ماننے کی بجائے "رو در رو عالمگیر کو سخت گالیاں دیں۔ عالمگیر نے اس کی زبان کاٹنے کا حکم دیا۔ پھر آنکھیں نکلوا کر قتل کر دیا گیا اس موقع پر یہ یاد

---

[1] علامہ شبلی نعمانی (اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر) صفحہ ۳۵، ۳۶

Marfat.com

رکھنا چاہیئے کہ عالمگیر کے پچاس برسوں کی حکومت کا صرف یہ ایک مستثنیٰ واقعہ ہے ورنہ اس نے کبھی کسی کو وحشیانہ سزا نہیں دی۔" [1]

راجہ رام
۱۶۸۹ء تا ۱۷۰۰ء

سنبھا کی گرفتاری اور ہلاکت کے بعد ۱۹۔ فروری ۱۶۸۹ء کو اس کے سوتیلے بھائی راجہ رام کو رائے گڑھ میں راج گدی پر بٹھا دیا گیا۔ کیونکہ سنبھا کا بیٹا ساہو جی ابھی کمسن تھا۔ راجہ رام نے پرہلاد نیراجی اور دیگر اعلیٰ افسروں کو رہا کر دیا جن کو سنبھا جی نے بے گناہ نظر بند کیا ہوا تھا اور راجدھانی کے دفاعی انتظامات کئے۔ جس کا ذوالفقار خاں نے محاصرہ کر رکھا تھا۔ دریں اثنا سنبھا جی کی بیوہ یسوبائی نے راجہ رام کو فرار ہونے اور دشوار گڑھ میں پناہ گزین ہونے کا مشورہ دیا۔ مرہٹہ فوج کے دو بڑے سرداروں پرہلاد نیراجی اور شنکر جی ملہار نے سنبھا جی کی بیوہ کے ایما پر مغلیہ علاقے کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ ان کا اس قدر رعب چھا گیا کہ سرکاری افسر بھی ان کے مقابلے سے جی چرانے لگے انہوں نے مغل سپہ سالار ذوالفقار خاں کی سپلائی لائن کو بھی کاٹنے کی کوشش کی۔ مگر محصور مرہٹہ سردار راجہ رام۔ جوگیوں کا بھیس بدل کر قلعہ رائے گڑھ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور مرہٹہ حکومت کے پایہ تخت رائے گڑھ پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ شاہی حکومت کے اکثر افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ قیدیوں میں سنبھا جی کا لڑکا ساہو جی بھی تھا۔ اورنگ زیب نے ساہو جی اور مرہٹہ بیگمات کے ساتھ نہایت شریفانہ سلوک روا رکھا۔ ازاں بعد مرہٹوں کے متعدد قلعے یکے بعد دیگرے فتح ہونے لگے۔ راجہ رام فرار ہو کر جنجی کے قلعہ میں جا پناہ گزیں ہوا۔ شاہی سالار ذوالفقار خاں نے جنجی کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن محاصرہ نے طول کھینچا۔ آخر آٹھ سال بعد ۱۶۹۸ء میں قلعہ فتح ہوا۔ مگر راجہ رام وہاں سے بھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

جنجی سے فرار ہونے کے بعد راجہ رام نے ستارا کے قلعہ کو اپنا مرکز بنایا اس وقت مرہٹہ سپاہی کونکن کی دشوار گذار گھاٹیوں میں چھپے ہوئے تھے جہاں سے وہ موقع پا کر مغل علاقوں پر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ عالمگیر کو محسوس ہوا کہ مغل افسر تساہل پسند اور آرام طلب ہو چکے ہیں اور وہ دشوار گذار علاقوں میں جا کر مرہٹوں کے خلاف فوج کشی سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے پیرانہ سالی کے باوجود مرہٹوں کے خلاف فوج کی کمان خود سنبھال لی۔ عالمگیر نے سب سے پہلے ستارا کا محاصرہ کیا۔ اس محاصرہ کے دوران راجہ رام وفات پا گیا۔

تارا بائی ۱۷۰۰ء تا ۱۷۰۷ء : راجہ رام کی وفات کے بعد اس کی بیوہ تارا بائی نے اس

---

[1] علامہ شبلی نعمانی (اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر) صفحہ ۳۰۶

Marfat.com

کے کمسن لڑکے کے نام پر عنانِ اقتدار خود سنبھال لی اور بڑی دانشمندی اور فہم و فراست سے مرہٹہ قوم کی قیادت کرنے لگی۔ تاہم ساڑھے پانچ سال کے عرصہ میں عالمگیر نے مرہٹوں کے اکثر و بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مغلوں سے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے مجبور ہو کر تارا بائی نے بادشاہ سے صلح کی درخواست کی۔ اور "سردیش مکھی" (مرہٹہ سرداروں کا مقرر کردہ ایک ٹیکس) کی وصولی کی اجازت چاہی۔ مگر اورنگ زیب نے صلح کی درخواست رد کر دی۔ ۱۷۰۵ء میں اورنگ زیب نے واکھن کھیڑہ کے اہم قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اگرچہ یہ اورنگ زیب کی آخری فتح تھی مگر اس نے شمالی دکن سے لیکر مدراس تک مرہٹوں کی تمام خفیہ پناہ گاہوں پر قبضہ کرنے کے بعد ان کی قوت کو بالکل مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ ابھی وہ مرہٹہ اقتدار کے رہے سہے اقتدار کی مکمل بیخ کنی میں مصروف تھا کہ موت نے اسے آ لیا۔

"اب مرہٹے کوئی قوم یا حکومت نہ رہے تھے بلکہ صرف خانہ بدوش، رہزن تھے جو ادھر ادھر آوارہ پھرتے تھے اور موقع پا کر چوری چھپے لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔" [1]

اورنگ زیب کی وفات

۲۱ - فروری ۱۷۰۷ء

اورنگ زیب عالمگیر نے پچاس سال اور ڈھائی ماہ تک حکومت کرنے کے بعد ۲۱ فروری ۱۷۰۷ء[2] کو ۹۰ سال اور چند ماہ کی عمر میں وفات پائی۔ مرہٹہ اقتدار کے مکمل خاتمہ کے بعد اورنگ زیب احمد نگر لوٹ آیا اور ایک سال سے زیادہ عرصہ تک وہاں مقیم رہا۔ فروری ۱۷۰۷ء کے اوائل میں بخار کے عارضہ میں مبتلا ہوا۔ لیکن مسلسل علالت، نقاہت اور پیرانہ سالی کے باوجود وہ حسبِ معمول باقاعدگی سے امورِ سلطنت کی انجام دہی میں مصروف رہا۔ ۲۱ فروری بروز جمعہ نماز صبح کے بعد وظائف پڑھنے میں مصروف تھا کہ زندگی کی آخری ساعت آن پہنچی۔ کلمۂ طیبہ اس کے لبوں پر جاری تھا کہ قریباً آٹھ بجے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ مرنے سے قبل اس نے وصیت کی کہ:

"چار روپے دو آنے جو ٹوپیوں کی سلائی کے محنتانہ میں سے بچے ہیں اور جو

---

[1] مولانا شبلی نعمانی (اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر) صفحہ ۴۱

[2] وی اے سمتھ، ایس آر شرما، ایس ایم اکرام اور شیخ اے رشید ——— لیکن جادوناتھ سرکار کے بقول اورنگ زیب نے ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء میں بروز جمعہ وفات پائی۔ جبکہ اے ایل سری واستوا نے عالمگیر کی تاریخ وفات ۳ مارچ ۱۷۰۷ء لکھی ہے۔ "دی مغل ایمپائر" صفحہ ۳۷۹

Marfat.com

اعیا بیگ محل دار کے پاس ہیں میری تکفین پہ خرچ کئے جائیں اور تین سو پانچ روپے جو میں نے قرآن حکیم کی کتابت کر کے کمائے ہیں میری وفات کے دن فقراء میں بطور صدقہ تقسیم کئے جائیں۔ میرے جسد خاکی کو دولت آباد کے قریب خلد آباد میں شیخ برہان الدین رح کے پاؤں کی طرف دفن کیا جائے اور میرے مدفن پہ کوئی پختہ قبر یا مقبرہ تعمیر نہ کیا جائے۔"

چنانچہ اس کی وصیت کے مطابق اسے دولت آباد کے قریب خلد آباد میں شیخ برہان الدین رح کے مقبرے کے نزدیک ہی دفن کیا گیا۔

سیرت و کردار

اورنگ زیب عالمگیر کا شمار برصغیر پاک و ہند کے عظیم المرتبت حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ اس کا ۵۰ سالہ دورِ حکومت برصغیر کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہے اس کے عہد میں مغلیہ سلطنت وسعت پذیری کے لحاظ سے اپنے انتہائی عروج کو پہنچی وہ غزنی سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک تک پھیلی ہوئی اس عظیم الوسعت سلطنت کا مطلق العنان بادشاہ تھا جہاں نہ صرف اس کے نام کا سکہ جاری تھا بلکہ مساجد میں اس کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جاتا تھا۔ ایک مثالی حکمران، دین اسلام کے شیدائی، سادہ مزاج انسان اور رعایا پرور بادشاہ کی حیثیت سے عالمگیر تاریخ عالم میں ایک بلند مقام کا مستحق ہے۔

بحیثیت انسان

بحیثیت انسان اورنگ زیب کا کردار بے داغ اور مثالی تھا۔ وہ ایک فرشتہ سیرت انسان تھا۔ بلاشبہ خورد سالی اور لڑکپن ہی میں وہ ذہنی کمالات، شعائرِ اسلامی، قوتِ عزم اور جرأت و شجاعت کا پیکر نظر آتا تھا۔ چودہ سال کی عمر میں ایک مست ہاتھی سے مقابلہ کر کے اس نے اپنے باپ شاہجہان سے "بہادر" کا خطاب حاصل کیا۔ فطری طور پر لڑکپن سے ہی عیش و نشاط اور لہو و لعب سے سخت نفرت تھی۔ وہ دیگر تیموری شہزادوں کی مانند عیش کوشی کی محفلوں، مصوری، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کا قطعی دلدادہ نہ تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند اور حافظِ قرآن تھا برصغیر کی وسیع و عریض سلطنت کا ایک عظیم بادشاہ ہونے اور ملک کے طول و عرض میں اقتدار کلی رکھنے کے باوجود وہ شعائرِ اسلامی پہ کاربند اور سادہ زندگی کا خوگر تھا۔ خزانۂ شاہی کو عوام کا سرمایہ اور ان کی امانت سمجھتا تھا۔ وہ ذاتی مصارف کے لئے نہایت معمولی رقم شاہی خزانہ سے لیتا تھا۔ ٹوپیاں سی کر اور قرآن مجید کی کتابت کر کے ذاتی محنت کی اس محدود آمدن میں اپنے گھر کا گذارہ کرتا تھا۔ عوام میں اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر وہ زندہ پیر، مشہور تھا۔

بحیثیت انسان اورنگ زیب بے حد محنتی، دیانتدار اور فرض شناس تھا۔ مورِ سلطنت خود

Marfat.com

سرانجام دیتا تھا۔ نوے سال کی عمر میں بھی اس کے ذہنی اور جسمانی قویٰ صحیح و سلامت تھے۔ آخری عمر تک اس کا حافظہ نہایت عمدہ رہا۔ وہ انکساری اور انصاف کا پیکر اور پاکیزہ دل و دماغ کا مالک تھا اور اسے اپنے جذبات اور اپنی زبان پر پورا قابو تھا۔

مذہب

وہ ایک راسخ العقیدہ سنی مسلمان اور بلاشبہ ایک صالح و دیندار انسان تھا۔ خلفائے راشدین کی سیرتوں کو اپنے لئے مشعلِ راہ اور ان کے اتباع کو باعثِ نجات سمجھتا تھا۔ تمام مذہبی فرائض کی باقاعدہ بجاآوری اور تہجد گذاری ایام علالت اور عمر کے آخری دنوں میں بھی اس کا شیوۂ حیات رہی۔ عہد طفلی سے ہی وہ غیر شرعی افعال و مشاغل سے اجتناب کرتا تھا۔ انصائے ملک میں اس کے زہد و تقویٰ کی دھوم تھی۔ ماہ رمضان کے آخری دس دن اورنگ زیب مسجد میں بہ حالتِ اعتکاف گذارتا تھا۔ وہ ہمیشہ باوضو رہتا اور ماہِ رمضان کے علاوہ ہر جمعہ کو روزہ رکھتا تھا۔ وہ تیموری روایات کے مطابق روادارانہ پالیسی کا حامی تھا۔ اس نے اکبر کی صلح کل پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے غیر مسلموں، بالخصوص راجپوتوں کو حکومت کے اہم عہدوں پر نہ صرف بحال رکھا بلکہ ان کے استحقاق کے مطابق انہیں اعلیٰ مناصب سے بھی نوازا۔ اس نے اپنی تمام رعایا کو مذہبی آزادی عطا کی۔ اس نے اپنی پالیسی کو اسلامی شرع کے عین مطابق استوار کیا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے اسّی غیر شرعی ٹیکس معاف کر دیئے۔ لیکن جزیہ ٹیکس جو اسلامی شریعت کے عین مطابق تھا دوبارہ نافذ کر دیا۔ مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ سید محمد معصوم شاہ صاحب کا مرید اور برصغیر میں احیائے دین کا علمبردار تھا۔ اس نے مسلم فقہ کی ایک جامع و مستند کتاب "فتاویٰ عالمگیر" کے عنوان سے مرتب کروا کر اسلام کی ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دی۔

بحیثیتِ جرنیل

اورنگ زیب بطور جرنیل نہایت زیرک اور ہوشمند تھا وہ فنون حرب کا ماہر، نڈر اور بے باک جرنیل تھا۔ زمانۂ شہزادگی میں ہی اس نے شجاعت، مستقل مزاجی و خود اعتمادی جرأت مندانہ عسکری قیادت، تنظیمی لیاقت اور تدبر و سیاست میں نمایاں شہرت حاصل کر لی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ شاہجہانی عہد کے اکثر اہم واقعات اور مہمات کی اہمیت و شہرت اورنگ زیب کی ذات سے وابستہ ہے۔ دکن کی جنگوں، وسط ایشیائی مہموں اور تخت نشینی کی کشمکش کے زمانے میں اس نے حیرت انگیز عسکری صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔

وہ عزم و شجاعت کا پیکر تھا۔ شہزادگی کے زمانے میں وہ بلخ کی انتہائی مشکل اور ہمت آزما مہم پر گیا جہاں اس نے کمال پامردی و جرأت مندی سے اپنی عسکری قائدانہ صلاحیتوں

Marfat.com

کا مظاہرہ کیا۔ وہ شاہِ بلخ عبدالعزیز خاں سے نبرد آزمائی میں مصروف تھا کہ عین حالت جنگ میں نماز ظہر کا وقت آگیا۔ دشمن کی فوجیں چاروں طرف سے تیر برسا رہی تھیں۔ عزم و استقلال کا پیکر اورنگ زیب گھوڑے سے بکمال متانت اترا۔ نماز کی صف قائم کی اور نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ فرائض و نوافل ادا کیئے۔ عبدالعزیز خاں یہ حیرت انگیز اور ایمان افروز سماں دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ "مآثر عالمگیری" کے مصنف مستعد خاں کے بقول بیساختہ پکار اٹھا "ایسے شخص سے لڑنا تقدیر سے لڑنا ہے۔"

بحیثیت حکمران

اورنگ زیب بحیثیت ایک بادشاہ کے نہایت کامیاب حکمران تھا۔ وہ عدل و انصاف کا پتلا تھا۔ عدل و انصاف کے معاملے میں اپنے بیگانے، امیر و غریب اور دوست دشمن کی کوئی تخصیص و تمیز اس کے نزدیک روا نہ تھی۔ ایک رقعہ میں اورنگ زیب خود لکھتا ہے "میں معاملات انصاف میں شہزادوں کو عام آدمیوں کے برابر سمجھتا ہوں۔" اورنگ زیب کی نگاہوں میں حکمرانی ایک نہایت اہم ذمہ داری تھی اور بادشاہت ایک مقدس منصب تھا اس نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ بادشاہ کو کبھی تن آسان یا گوشہ نشینی کا مشتاق نہ ہونا چاہیئے۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد سلطنت کے جاہ و جلال، شان و شوکت اور ناز و نعم کے بجائے صرف رعایا کی خدمت و راحت رسانی کو قرار دیا۔ پیرانہ سالی کے باوجود اس کے معمولات میں کبھی کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ ڈاکٹر جملی کریری جس نے ۷۸ برس کی عمر میں عالمگیر کو دیکھا تھا، بیان کرتا ہے کہ

"وہ صاف، شفاف ململ کی پوشاک پہنے ہوتے عصائے پیری کے سہارے امیروں کے جھرمٹ میں کھڑا ہوا تھا اور اسکی پگڑی میں بڑا الماس کا ٹنکا ہوا تھا۔ داد خواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا تھا اور بلا عینک پڑھ کر خاص اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا جاتا تھا اور اس کے ہشاش بشاش چہرے سے صاف مترشح تھا کہ وہ مصروفیت سے نہایت شاداں و فرحاں ہے۔"[1]

وہ دن میں دو تین دفعہ دربار عام کرتا تھا جس میں بلا روک ٹوک ہر خاص و عام کو آنے کی اجازت تھی اور ہر فریادی بلا جھجک اپنی درخواست بادشاہ کے حضور گذار سکتا تھا۔ اورنگ زیب بھی نہایت توجہ سے سنتا تھا اور مناسب احکام صادر کرتا تھا مدعا کا دن عدل گستری کیلئے مقرر تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر اس قدر محنتی اور فرض شناس حکمران تھا کہ شب و

---

[1] ترجمہ تاریخ الفنسٹن صاحب مطبوعہ علی گڑھ صفحہ ۱۳۳

Marfat.com

روز امور مملکت کی انجام دہی میں مصروف رہتا اور رات کو صرف تین گھنٹے آرام کرتا تھا اس نے ایک فرمان جاری کیا کہ تمام اضلاع میں سرکاری وکیل مقرر کئے جائیں اور عام منادی کرا دی جائے کہ جس کسی کو بادشاہ پر کوئی دعویٰ ہو پیش کرے۔ سرکاری وکیل اس کی جواب دہی کرے اور اس کا حق ثابت ہو تو سرکاری وکیل سے اپنا مطالبہ حاصل کرے۔ اس نے حکام اور عمالِ حکومت کو رعایا سے ہمیشہ مشفقانہ سلوک روا رکھنے پر زور دیا۔ وہ کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کا خواہاں اور ان کے حقوق کے تحفظ کا حامی تھا۔ اس کے عہد کی ترقی و خوشحالی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں لگانِ اراضی عہدِ اکبری کے مقابلے میں دوگنا سے زیادہ ہو گیا تھا۔

اورنگ زیب نے امراء کی وفات پر ان کی جائیدادیں بحق سرکار ضبط کرنے کا قدیم مغلیہ دستور منسوخ کر دیا۔ علاوہ ازیں بادشاہ کی خدمت میں منصبداروں کی جانب سے قیمتی نذرانے پیش کرنے کی رسم کی بھی ممانعت کر دی۔ اورنگ زیب نے رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے بڑی تعداد میں معتبر پرچہ نویس (رپورٹر) مقرر کئے جن کی تحریروں کے ذریعہ اُسے ملک کے گوشہ گوشہ سے حکام کے طرزِ عمل اور رعایا کے حالات کی خبر رہتی تھی وہ اس قدر مستعد اور فرض شناس تھا کہ نظامِ مملکت کی معمولی معمولی جزئیات بھی اس کی نگاہ میں رہتی تھیں۔

بحیثیت صاحب علم و ادب

اورنگ زیب خود صاحب علم تھا اور اہل علم حضرات کی قدر کرتا تھا۔ اس نے تعلیم اور درس و تدریس کو جس قدر ترقی دی اتنی برصغیر پاک و ہند میں کبھی کسی عہد میں نہیں ہوئی تھی۔ ہر شہر اور قصبے میں تمام علماء اور فضلاء کے وظائف اور روزینے مقرر تھے جس کی وجہ سے وہ مطمئن ہو کر تعلیم و تعلم میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ طلباء کے لئے بھی وظائف مقرر تھے علاوہ ازیں علم و ادب کی ترقی کے لئے متعدد مساجد اور مندروں کے نام زمینیں وقف تھیں تاکہ ان کی آمدنی ان درسگاہوں کی مالی کفالت کر سکے۔ جہاں رعایا کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔

اورنگزیب کی شخصیت جہاں گوناگوں خوبیوں سے مزین نظر آتی ہے۔ وہاں اس میں چند ایک خامیاں بھی تھیں وہ حد سے زیادہ شکی مزاج تھا اور دوسروں پر بھروسہ نہ کرتا تھا حتیٰ کہ اپنے لڑکوں پر بھی اسے اعتماد نہ تھا جس کی وجہ سے اس کے بیٹے اورنگ بغاوتیں کرنے پر مجبور ہوئے اورنگزیب کے بیٹے نالائق اور نااہل اور اسکے حکام و امراء تساہل پسند اور غیر ذمہ دار تھے بدیں وجہ اورنگزیب خود کاروبار سلطنت میں دلچسپی لینے پر مجبور تھا۔ مولانا شبلی نعمانی کے الفاظ میں "اسلامی دنیا میں اس کے بعد آج تک کوئی اس کے برابر کا شخص پیدا نہیں ہوا۔" [1]

---

[1] "اورنگ زیب پر ایک نظر"

Marfat.com

اہم تاریخیں

۱۶۵۸ء دھرمت اور ساموگڑھ کی جنگیں، اورنگ زیب کی تخت نشینی۔

۱۶۵۹ء معرکۂ کھجوا ہ میں شاہ شجاع کی شکست۔ دارا شکوہ کا قتل۔ شہزادہ مراد اور شاہجہان کی نظر بندی۔ اورنگ زیب کی دوسری تاجپوشی۔ سیواجی کا افضل خاں کو ہلاک کرنا۔

۱۶۶۰ء شاہ شجاع کا اراکان کی طرف فرار۔ بنگال کی صوبیداری پر میر جملہ کا تقرر، سکھ گورو ہر رائے کے بعد گورو ہرکشن کی مسند نشینی۔

۱۶۶۱ء شہزادہ مراد کا قتل۔ کوچ بہار پر مغلیہ قبضہ۔ شاہِ انگلستان چارلس ثانی اور کیتھرائن براگنزہ کی شادی اور بمبئی کا انگریزوں کے حوالے ہونا۔

۱۶۶۲ء آسام پر میر جملہ کا حملہ۔ اورنگ زیب کا شدید بیمار ہونا۔ شہزادہ سلیمان شکوہ کی وفات۔

۱۶۶۳ء کوچ بہار میں میر جملہ کی وفات۔ بنگال کی گورنری پر شائستہ خاں کا تقرر۔

۱۶۶۶ء آگرہ کے مقام پر ۷۵ برس کی عمر میں شاہجہان کی وفات۔ چٹاگانگ پر مغلیہ قبضہ۔ سیواجی مرہٹہ کی دربار شاہی آگرہ میں آمد اور فرار۔

۱۶۶۸ء بمبئی کا ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے ہونا۔ سورت کے مقام پر پہلے فرانسیسی تجارتی مرکز کا قیام۔

۱۶۷۱ء سیواجی مرہٹہ کے باپ شاہ جی کی وفات۔

۱۶۷۵ء کابل میں راجہ جسونت سنگھ کا تقرر، گورو تیغ بہادر کا قتل اور گورو گوبند سنگھ کی مسند نشینی۔

۱۶۷۹ء اورنگ زیب کے عہد میں جزیہ ٹیکس کا نفاذ۔

۱۶۸۰ء رائے گڑھ کے مقام پر سیواجی کی وفات۔

۱۶۸۷ء گولکنڈہ کی تسخیر۔ ابوالحسن کی دولت آباد کے قلعہ میں نظر بندی۔

۱۶۹۰ء شہر کلکتہ کی بنا پڑی۔

۱۷۰۳ء شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی پیدائش۔

۱۷۰۷ء اردو شاعر ولی دکنی کی وفات، اورنگ زیب عالمگیر کی وفات اور بہادر شاہ اول کی تخت نشینی۔

Marfat.com

امتحانی سوالات

۱۔ اورنگ زیب عالمگیر کے ابتدائی حالات بیان کیجیے۔

۲۔ اورنگ زیب کے نظریۂ بادشاہت پر روشنی ڈالیئے۔ اور واضح کیجیے کہ وہ اپنے دور اقتدار کے دوران کس حد تک اس پر عمل پیرا رہا۔

۳۔ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کا تنقیدی جائزہ لیجیے اور غیر مسلم رعایا سے اس کے سلوک پر روشنی ڈالیئے نیز اس کے خلاف غیر مسلم مورخین کے عائد کردہ الزامات کا تجزیہ کیجیے۔

۴۔ راجپوتوں اور عالمگیر کے تعلقات کا تنقیدی جائزہ لیں۔ آپ کی رائے میں راجپوتوں کے خلاف فوجی کارروائی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔

۵۔ اورنگ زیب کی دکن پالیسی پر تبصرہ کیجیے اور یہ بتایئے کہ اسے کس حد تک دکنی ریاستوں کو اپنا مخالف بنانے کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔

۶۔ "سیوا ایک ڈاکو سردار تھا۔ اس نے جس ریاست کی بنیاد ڈالی وہ ڈاکو ریاست تھی"۔ (ڈاکٹر وی۔ اے سمتھ) تبصرہ کیجیے۔

۷۔ عالمگیر اور مرہٹوں کے تعلقات کا جائزہ لیجیے۔

۸۔ مرہٹوں کے عروج و زوال پر ایک مدلل مضمون تحریر کیجیے۔

۹۔ سکھوں کے عروج پر روشنی ڈالتے ہوئے اورنگزیب کے خلاف ان کی بغاوت کا حال لکھیے۔

۱۰۔ اورنگ زیب عالمگیر کی سیرت و کردار پر روشنی ڈالیئے۔ بحیثیت انسان اور بحیثیت حکمران برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں اسے کیا مقام حاصل ہے۔

۱۱۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ تحریر کیجیے:۔

(ا) اورنگ زیب کی شمال مغربی سرحدی پالیسی۔

(ب) سیواجی مرہٹہ۔

(ج) میر جملہ۔

Marfat.com

نواں باب

مُغلیہ اقتدار کا دورِ انحطاط

(۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء)

شاہ عالم بہادر شاہ اوّل
(۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء)

مئی ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اس کا دوسرا لڑکا محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے تختِ طاؤس پر بیٹھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر تریسٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور وہ شہزادہ محمد سلطان کی وفات کے بعد اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ شاہ عالم کا خطاب اسے اپنے باپ کی طرف سے ملا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے وقت محمد معظم کابل کا گورنر تھا۔ ۲۲ مارچ ۱۷۰۷ء کو جمرود کے مقام پر اُسے اپنے باپ کی وفات کی خبر ملی۔ جس پر وہ تیزی سے دارالسلطنت دہلی کی طرف بڑھا۔ لاہور پہنچ کر اس نے بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا بعد ازاں آگے بڑھ کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔

دکن میں شہزادہ اعظم نے 'اعظم شاہ' کے لقب سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور ایک بھاری فوج کے ساتھ شمالی ہندوستان کی طرف بڑھا۔ بہادر شاہ نے اسے صلح جوئی سے سلطنت کی تقسیم پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور دکن کے چھ صوبوں میں سے چار صوبے اور گجرات کا صوبہ دینے کی پیشکش کی۔ مگر اُس نے بہادر شاہ کی اس صلح پسندانہ پیش کش کو اس کی بزدلی اور مقابلہ کی سکت نہ رکھنے پر محمول کرتے ہوئے رد کر دیا لیکن ۱۴ جون ۱۷۰۸ء کو سامو گڑھ کے قریب باجو کے مقام پر شکست کھا کر مع اپنے دو بیٹوں کے مارا گیا۔

راجپوت: شہزادہ اعظم پر فتح پانے کے بعد بہادر شاہ راجپوتانہ کی طرف متوجہ ہوا۔ جب جودھپور کے راجہ اجیت سنگھ نے علم بغاوت بلند کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ جنوری ۱۷۰۹ء میں بادشاہ اجمیر پہنچا۔ شاہی فوج نے اجیت سنگھ کو مرتکے کے مقام پر شکست دی۔ اس پر اس نے بادشاہ سے معافی مانگ لی۔ بادشاہ نے اسے 'مہاراج' کے لقب سے نوازا اور ساڑھے تین ہزاری منصب عطا کیا۔ بعد ازاں جب بہادر شاہ شہزادہ کام بخش کی گوشمالی کے لئے دکن روانہ ہوا تو راجپوت سردار اجیت سنگھ، درگا داس اور راجہ جے سنگھ نے

Marfat.com

پھر غداری کی اور ۳۰۔ اپریل ۱۷۰۸ء کو شاہی لشکر سے فرار ہو کر میواڑ کے رانا امر سنگھ سے جا ملے۔ اور مغلوں کے مقابلہ کے لئے متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ لیکن بہادر شاہ کے دکن سے کامیاب لوٹنے کے بعد دوبارہ مغلیہ اطاعت قبول کر لی۔ اس پر بادشاہ نے ان کے خطابات اور مراتب بحال کر دیئے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے سب سے چھوٹے لڑکے شہزادہ کام بخش نے بھی بیجاپور میں اپنی خود مختاری اور بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بہادر شاہ نے ایک پیغام کے ذریعہ دکن کے دو صوبے بیجاپور اور حیدر آباد اس شرط پر دینے کی آمادگی ظاہر کی کہ خطبہ اور سکہ اسی (بہادر شاہ) کے نام کا جاری رہے۔ مگر کام بخش نے اپنی خود مختاری پر مصر رہ کر بہادر شاہ کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور حیدر آباد پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر بہادر شاہ نے دکن پہنچ کر ۱۳۔ جنوری ۱۷۰۹ء کو اسے حیدر آباد کے قریب شکست فاش دی۔ کام بخش نے شدید زخمی ہو کر وفات پائی۔ اس طرح بہادر شاہ تختِ طاؤس کے تمام دعویداروں کو اپنے راستے سے ہٹا کر بلا شرکتِ غیرے برصغیر پاک و ہند کا بادشاہ بنا۔

مرہٹے: بہادر شاہ نے میر بخشی ذوالفقار کے مشورے پر مرہٹہ سردار ساہو جی کو رہا کر کے اسے دکن کے صوبوں سے چوتھ[1] اور سردیش مکھی[2] وصول کرنے کے حقوق عطا کیے۔ ساہو جی کی رہائی بہادر شاہ کی سیاسی بصیرت و تدبر کا ایک کارنامہ تھی۔ اس سے ساہو اور تارا بائی کے درمیان حصول اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی۔ کیونکہ قبل ازیں تارا بائی مرہٹوں کی سربراہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹے باہمی رقابت کا شکار ہوئے اور بہادر شاہ کے عہد تک دونوں فریق مغل بادشاہ کی نگاہِ شفقت کے آرزو مند رہے اس طرح مرہٹوں کی خانہ جنگی سے مغلوں کو بہت فائدہ پہنچا۔

سکھ: اورنگ زیب کی وفات کے بعد سکھ گورو گوبند سنگھ نے بہادر شاہ کے حضور حاضر ہو کر مغلیہ اطاعت قبول کر لی۔ بادشاہ نے اسے منصب عطا کیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد جب گورو نے وفات پائی تو سکھوں کی قیادت بندہ بیراگی کے ہاتھ آئی جس نے سرہند کے علاقہ میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اس پر منعم خاں خانخاناں نے اس کے خلاف سخت فوجی کارروائی کی۔ مگر وہ شکست کھا کر پہاڑیوں میں روپوش ہو گیا۔ بہادر شاہ کی وفات کے بعد فرخ سیر کے عہد میں گرفتار ہو کر قتل ہوا۔

بہادر شاہ نرم اور لطیف الطبع ہونے کے علاوہ ایک عالم شخص تھا۔ وہ ہمایوں کی طرح

---

[1] مالیہ کا ¼ حصہ [2] مالیہ کا ⅒ حصہ

Marfat.com

قوت فیصلہ سے محروم صلح و آشتی کی حکمت عملی کا حامی تھا۔ غیر مسلموں کے ساتھ اس کا سلوک روادارانہ تھا۔ وہ کسی کی درخواست کو رد نہ کرتا تھا۔ یہ اس کی نرم مزاجی اور حلیم الطبعی کا ہی اثر تھا کہ ملک میں بدنظمی کا آغاز ہوا۔ عوام میں وہ شاہِ بے خبر کے نام سے بھی مشہور تھا۔ تاہم وہ اورنگ زیب کے تمام جانشینوں میں کامیاب حکمران ثابت ہوا۔ اس نے مغلیہ وقار کو کسی حد تک برقرار رکھا۔

جہاندار شاہ
۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۳ء

بہادر شاہ کی وفات کے بعد اس کا لڑکا جہاندار شاہ اپنے بھائیوں رفیع الشان اور جہان شاہ کو مات دیکر وزیر اعظم ذوالفقار خاں کی مدد سے ۲۶ مارچ ۱۷۱۲ء کو تخت نشین ہوا۔ وہ سخت نااہل، تن آسان، عیش و نشاط اور اوباش لوگوں کی صحبت کا دلدادہ تھا۔ اسے امور سلطنت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ایک حسینہ لال کماری کا سیدِ محبت تھا جو کہ ملائے میں سیاہ و سفید کی مالک تھی اس نے اپنے اکثر رشتہ داروں کو کلیدی عہدوں پر متعین کر رکھا تھا۔ جہاندار شاہ کے عہد میں دو سید برادران حسین علی خاں بارہ اور حسن علی گورنر اودھ کو بہت عروج حاصل ہوا۔ انہوں نے جہاندار شاہ کو مع وزیر ذوالفقار علی خاں کے قتل کر دیا اور بہادر شاہ کے پوتے فرخ سیر کو تخت نشین کر دیا۔ فرخ سیر نے اپنے باپ عزیز الشان کے قتل کے بعد بنگال میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ جہاندار شاہ نے صرف ایک سال حکومت کی۔

فرخ سیر
۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء

۱۱ جنوری ۱۷۱۳ء کو فرخ سیر ۳۰ سال کی عمر میں تختِ طاؤس پہ متمکن ہوا۔ اس نے صرف چھ سال حکومت کی۔ اس نے سید برادران کو علی مناصب عطا کئے۔ بڑے بھائی حسین علی خاں کو قطب الملک عبداللہ خاں کے خطاب سے وزیر مقرر کیا اور چھوٹے بھائی حسن علی خاں کو امیر الامرار کے خطاب سے نواز کر میر بخشی کے عہدے پر فائز کیا۔ فرخ سیر ناتجربہ کار، نااہل اور قوت فیصلہ سے عاری ایک کمزور طبع انسان تھا۔ چنانچہ حکومت کے جملہ اختیارات سید برادران کے قبضۂ اختیار میں چلے گئے اور انہوں نے سیاہ و سپید کا مالک بن کر بادشاہ گر کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس سے ملک میں بدنظمی اور سازشوں کو فروغ حاصل ہوا۔

فرخ سیر سید برادران کے روز افزوں اقتدار کو ناپسند کرتا تھا اور ان کی گرفت سے آزاد ہونے کا آرزومند تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے خلاف سازشیں کرنی شروع کر دیں۔ بادشاہ نے تورانی امرا کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے ان کے سرغنہ میر قمر الدین نظام الملک کو دکن کے چھ صوبوں پر وائسرائے مقرر کیا۔ اس پر سید برادران نے ہندوستانی امرا کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی پوزیشن کو مضبوط کر لیا۔ بادشاہ نے ایک سازش کے تحت امیر الامرا حسین علی خاں کو مارواڑ کے باغی راجہ اجیت سنگھ

Marfat.com

کی گوشمالی پر مامور کیا اور ساتھ ہی اجیت سنگھ کو کہلا بھیجا کہ امیرالامراء کو قتل کردو تو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیئے جاؤ گے لیکن اجیت سنگھ کو شکست ہوئی اور وہ معافی مانگنے پر مجبور ہوا۔ بغاوت کو فرو کرنے کے بعد امیرالامراء حسین علی خاں تیزی سے دارالسلطنت کی طرف پلٹا کیونکہ بادشاہ نے اس کے بھائی حسن علی خاں کو جشنِ نوروز کے موقع پر قید کرنے کی سازش کی تھی۔ بادشاہ نے سید برادران کو خوش کرنے اور ان کے دلوں سے شکوک کو مٹانے کی غرض سے ان کے مخالف گروہ کے سرغنہ وزیر حمیلہ کو دربار سے ہٹا کر بہار کا گورنر مقرر کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی دونوں بھائیوں کے زور کو کم کرنے کے لئے حسین علی خاں کو مرکز کے دور دراز علاقے کا وائسرائے مقرر کر دیا اور درپردہ شاہی سالار داؤد خاں کو اسے راستے ہی میں ختم کرنے کا حکم دیا۔ مگر بادشاہ کی نااہلی اور ناتجربہ کاری کی بنا پر یہ سازش بھی ظاہر ہو گئی۔ اب سید برادران بہت سیخ پا ہوئے اور انہوں نے اپنی حامی فوج کی معیت میں شاہی محل کا گھیراؤ کر لیا اور بادشاہ فرخ سیر کو معزول کر دیا پھر حرم شاہی میں گھس کر بادشاہ کو گرفتار کر کے اندھا کر دیا۔ فرخ سیر نے اپریل ۱۷۱۹ء میں قید ہی میں وفات پائی اور ہمایوں کے مقبرے میں دفن ہوا۔

رفیع الدرجات

۲۸ فروری تا ۴ جون ۱۷۱۹ء

فرخ سیر کو معزول کرنے کے بعد سید برادران نے ۲۸ فروری ۱۷۱۹ء کو بہادر شاہ اول کے پوتے، فرخ سیر کے بھتیجے اور رفیع الشان کے لڑکے رفیع الدرجات کو تخت شاہی پر بٹھایا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر صرف بیس برس تھی وہ تپ دق کا مریض تھا اس نے محض تین ماہ اور چھ دن حکومت کی۔ اس عرصہ میں وہ ایک کٹھ پتلی حکمران کی حیثیت سے سید برادران کے اشاروں پر امورِ سلطنت انجام دیتا رہا۔ ۴ جون ۱۷۱۹ء کو سید برادران نے اسے قریب المرگ سمجھ کر تخت سے معزول کر دیا چنانچہ ایک ہفتہ کے بعد ہی وہ وفات پا گیا۔

رفیع الدرجات کے عہدِ حکومت کے دوران اورنگ زیب کے باغی لڑکے شہزادہ اکبر کے بیٹے شہزادہ نکوسیر نے متریسین نامی ایک برہمن کی مدد سے قلعہ آگرہ پر قبضہ کر لیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہوئے متریسین کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا مگر قطب الملک عبداللہ خاں سید حسن علی نے اسے شکست دیکر سلیم گڑھ کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔

رفیع الدولہ شاہجہان ثانی

۶ جون تا ۱۷ ستمبر ۱۷۱۹ء

۶ جون ۱۷۱۹ء کو رفیع الدرجات کے بعد سید برادران نے اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو شاہجہان ثانی کے لقب سے تختِ طاؤس پر بٹھایا۔ وہ بھی اپنے بھائی کی مانند دائمی مریض تھا اور قریب المرگ تھا اس لئے وہ بھی

Marfat.com

کٹھ پتلی حکمران بنا رہا اور اصل اقتدار سید برادران کے ہاتھوں میں رہا۔ رفیع الدولہ نے تین ماہ کی بادشاہت کے بعد ۱۷۔ ستمبر ۱۷۱۹ء کو وفات پائی۔

محمد شاہ رنگیلا ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء

ستمبر ۱۷۱۹ء میں رفیع الدولہ شاہجہان ثانی کی موت کے بعد ۲۸ ستمبر ۱۷۱۹ء کو سید برادران نے بہادر شاہ اول کے چوتھے لڑکے جہان شاہ کے اٹھارہ سالہ فرزند شہزادہ روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے تخت نشین کیا وہ ناتجربہ کار اور ایک کمزور طبع شہزادہ تھا اس لئے سابق سید برادران نے بادشاہ کو کٹھ پتلی بنا کر خود سیاہ و سفید کے مالک ہونے کی کوشش کی۔ مگر محمد شاہ نے جلد ہی فہم و فراست کا ثبوت دیتے ہوئے دیگر امرا کی مدد سے سید برادران کے اقتدار کو ختم کرنے اور ان کی گرفت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا عزم مصمم کر لیا بالآخر تورانی امرا کے سرغنہ محمد امین خاں کی وساطت سے ۱۷۲۲ء میں ان کے اقتدار کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

محمد شاہ نے برصغیر پر انتیس سال حکومت کی لیکن اس کا طویل عہد حکومت عیش و نشاط اور رنگ رلیوں کی ایک تاریخ ہے۔ بادشاہ کو امور سلطنت سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ ہمہ وقت عیش کوشی اور عیش و نشاط کی محفلوں میں مستغرق رہتا تھا۔ اس لئے وہ برصغیر کی تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے عہد کے دوران بدنظمی اور لامرکزیت کو فروغ ہوا۔ اکثر صوبے مغلیہ سلطنت سے خود مختار ہو کر علیحدہ ہو گئے۔ دربار سازشوں کا اڈہ بن کر رہ گیا۔ مرہٹوں نے اپنی چیرہ دستیوں سے مغلوں کا ناک میں دم کر دیا۔ یورپی باشندے جو تجارت کی غرض سے برصغیر میں وارد ہوئے تھے مقامی سیاسی حالات سے فائدہ اٹھا کر ایک حکمران قوت بنتے جا رہے تھے۔ مغلیہ سلطنت تیزی سے روبہ تنزل ہونی شروع ہوئی۔ تاہم بادشاہ کئی ایک اچھے اوصاف کا حامل تھا۔ ظلم و تکبر سے مبرا رواداری کا حامل ایک آزاد خیال حکمران تھا وہ آخری مغل بادشاہ تھا جسے تخت طاؤس پر بیٹھنا نصیب ہوا۔ اور جس کے عہد حکومت میں ایک حد تک بادشاہت کا ظاہری دبدبہ اور وقار برقرار رہا۔ اگرچہ مغلیہ حکومت کی جڑیں سیاسی اور معاشی لحاظ سے کھوکھلی اور کمزور ہو چکی تھیں مگر اس نے بڑی ہوشیاری اور دانشمندی سے اس کمزور عمارت کو سنبھالے رکھا۔

سید برادران کا زوال

آغاز بادشاہت سے ہی محمد شاہ اور سید برادران میں ٹھن گئی کیونکہ بادشاہ ان کے اقتدار کو ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور ان کے چنگل سے آزادی حاصل کرنے کا خواہاں تھا چنانچہ بادشاہ نے سید برادران

Marfat.com

کے حامیوں کو دربار سے دُور رکھنے کی سکیم کے تحت مارچ ۱۷۱۹ء میں نظام الملک کو مالوہ کا گورنر مقرر کیا اور اپریل ۱۷۲۰ء میں گردھار بہار کو اودھ کا گورنر متعین کر کے روانہ کیا گیا۔ اس اثنا میں سید برادران اور نظام الملک کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ نظام الملک نے مئی ۱۷۲۰ء میں حسین علی خاں کے علاقہ خاندیش پر قبضہ کر لیا اور بعد ازاں برہانپور پر اپنا تسلط قائم کر لیا اس پر سید برادران کے ایما پر ان کے بھائی دلاور علی خاں نے نظام الملک کے خلاف فوجی کارروائی کی لیکن شکست کھا کر مارا گیا۔ اس پر سید برادران نے نظام الملک کی گوشمالی کا عزم کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ چھوٹا بھائی امیر الامرا حسین علی خاں بادشاہ کی معیت میں نظام الملک کی گوشمالی کے لئے جائے جبکہ بڑا بھائی قطب الملک عبداللہ خاں دارالسلطنت میں مقیم رہ کر امور سلطنت کی انجام دہی کرے۔

امیر الامرا حسین علی خاں بادشاہ کی معیت میں نظام الملک کی سرکوبی کے لئے دکن روانہ ہوا، راستے میں ۹ اکتوبر ۱۷۲۰ء کو علی الصباح تورانی امرا اعتماد الدولہ محمد امین خاں، حیدر قلی خاں اور میر جملہ کی سازش کے تحت محمد امین خاں کے دستہ کا ایک سپاہی حیدر بیگ ایک درخواست لیکر حسین علی خاں کے حضور پیش ہوا۔ جب حسین علی خاں درخواست پڑھنے میں مصروف ہوا تو سپاہی حیدر بیگ نے خنجر سے اسے ہلاک کر دیا۔ اس پر دارالسلطنت میں وزیر اعظم حسن علی قطب الملک عبداللہ خاں نے اپنے بھائی کی ہلاکت کے انتقام کے طور پر رفیع الشان کے بیٹے ابراہیم شاہ کو تخت پر بٹھا کر اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ مگر محمد شاہ نے واپس پہنچ کر دریائے جمنا کے دائیں کنارے شاہ پور کے قریب قطب الملک کو شکست دیکر گرفتار کر لیا۔ اس طرح ۱۷۲۰ء میں سید برادران کا اقتدار ختم ہوا۔ محمد شاہ نے محمد امین خاں کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ ۳۰۔ جنوری ۱۷۲۱ء کو اس کی وفات پر نظام الملک کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

سید برادران ہندوستانی امرا کے سرکردہ گروہ کے سربراہ تھے اور روادارانہ حکمت عملی کے حامی تھے انہوں نے اپنے دور اقتدار میں نہ صرف جزیہ ٹیکس معاف کیا بلکہ اپنی صلح کل پالیسی سے راجپوتوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ مرہٹوں کو چوتھ لکھی وصول کرنے کے حقوق عطا کئے ان کے دور میں مغلیہ دربار سازشوں کا مرکز بن گیا۔ اور ملک میں بدنظمی و انتشار کا دور دورہ ہو گیا جس سے مغلیہ سلطنت تیزی سے روبہ زوال ہونے لگی۔ قطب الملک عبداللہ خاں کو دوران قید زہر دے کر ہلاک کروا دیا گیا۔

نظام الملک آصف جاہ

میر قمر الدین نظام الملک آصف جاہ ۱۶۷۱ء میں پیدا ہوا۔ اس کے آبا و اجداد توران (وسط ایشیا) سے تعلق رکھتے تھے۔ نظام الملک آصف جاہ کا باپ میر غازی الدین فیروز جنگ اورنگ زیب عالمگیر کا منصب دار

Marfat.com

تھا اور عالمگیر کی وفات کے وقت صوبہ بیجاپور کا گورنر تھا۔ نظام الملک نے تیرہ سال کی عمر میں مغلیہ ملازمت اختیار کی اور بتدریج ترقی کر کے بہادر شاہ اول کے عہد میں اودھ کا صوبیدار متعین ہوا۔ فرخ سیر نے اسے نظام الملک کے خطاب سے نوازا اور ۱۷۱۳ء میں دکن کا وائسرائے مقرر کیا۔ بعد ازاں جب بادشاہ نے سید حسین علی خاں کو دکن کا وائسرائے مقرر کیا تو نظام الملک سادات کے ساتھ مل گیا۔ چنانچہ بادشاہ فرخ سیر کی معزولی کے بعد سید برادران نے اسے مالوہ کا گورنر مقرر کیا۔ لیکن جب محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں اس کی وفاداری کو مشکوک سمجھتے ہوئے سید برادران نے اسے مالوہ سے واپس بلانا چاہا تو اس نے خاندیش پر حملہ کر کے اسے زیر نگیں کر لیا اور سید برادران کے بھانجے دلاور خاں کو شکست دیکر ہلاک کر دیا۔ اس پر امیر الامرا حسین علی خاں بذات خود اس کی گوشمالی کے لئے دکن روانہ ہوا۔ لیکن راستے میں بادشاہ محمد شاہ کی سازش کا شکار ہو کر قتل ہوا اس سے مغل دربار میں تورانی گروہ برسر اقتدار آ گیا۔

۱۷۲۱ء میں محمد شاہ نے نظام الملک کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ نظام الملک نے نظام سلطنت کی درستی میں اپنی اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور درباری سازشوں کو دبا کر ملک میں امن و سکون کی فضا قائم کرنے کی پوری کوشش کی۔ وہ اورنگ زیب کی حکمت عملی کا بڑا مداح تھا لیکن جب اس نے اورنگ زیب کی حکمت عملی کو اپناتے ہوئے انتظامی اصلاحات اور جزیہ ٹیکس کے نفاذ کی کوشش کی تو بادشاہ اور درباری امرا نے نہ صرف اس کا تمسخر اڑایا بلکہ اس کی راہ میں کئی ایک مشکلات پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن دربار کے سازشی ماحول اور اپنے اصلاحی اقدامات کی ناکامی سے دل برداشتہ ہو کر وہ دو آبہ میں شکار کے بہانے دہلی سے نکل کر دکن روانہ ہو گیا جہاں اسے مختار کل کی سی حیثیت حاصل تھی۔ صرف خطبہ اور سکہ میں بادشاہ کا نام چلتا تھا۔

نظام الملک کے جانے کے بعد ملک میں دوبارہ طوائف الملوکی پھیل گئی۔ مرہٹوں نے دریائے نربدا کو عبور کر کے مغل علاقوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ ایک مرتبہ مرہٹہ سردار باجی راؤ پیشوا غارتگری کرتا ہوا دہلی تک بڑھ آیا۔ اس پر محمد شاہ نے نظام الملک کو دوبارہ وزیر اعظم مقرر کیا اور آصف جاہ کے خطاب سے نوازا۔ مگر وہ مرہٹوں کو مالوہ سے نہ نکال سکا۔ یہاں تک کہ ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے برصغیر پر حملہ آور ہو کر مغلیہ سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ نادر شاہ کی واپسی کے بعد نظام الملک مرکزی حکومت کی بے بسی سے مایوس ہو کر اگست ۱۷۴۸ء میں دوبارہ دکن چلا گیا جہاں اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے یکم جون ۱۷۴۸ء کو وفات پائی۔ نظام الملک آصف جاہ کا خاندان ہی حیدر آباد دکن پر حکمران رہا۔

Marfat.com

نادر شاہ کا حملہ ۱۷۳۹ء

۱۷۳۹ء میں محمد شاہ کے عہدِ حکومت میں ایران کا حکمران نادر شاہ برِصغیر پر حملہ آور ہوا۔ اس کے حملے نے زوال پذیر مغلیہ سلطنت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ نادر شاہ جو ایران کے 'نپولین' کے نام سے مشہور ہے قبیلۂ افشار کا فرد تھا۔ اس کا اصلی نام نادر قلی تھا۔ وہ ۱۶۸۸ء میں ایک غریب گڈریئے کے گھر پیدا ہوا۔ وہ بلا کا زیرک، جنگجو، بہادر اور نڈر تھا۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک قزاق کی حیثیت سے کیا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی خداداد جنگی قابلیت، فطری استعداد اور تنظیمی صلاحیت کی بدولت ایک بھاری سپاہ اپنے جھنڈے تلے جمع کر لی اور ایرانی فوج کا سالار بن گیا۔ اس نے اپنی عسکری قوت کے بل بوتے پر ایران کے داخلی خلفشار اور بغاوتوں کا قلع قمع کیا اور افغان حملہ آوروں کو شکست دیکر ایران کو محفوظ کیا۔ علاوہ ازیں حیرتناک فتوحات حاصل کرکے ایران کو براعظم ایشیا کی ایک عظیم قوت بنا دیا۔ ۱۷۳۲ء میں اس نے ایران کے بادشاہ طہماسپ کو جو عوام میں غیر مقبول ہو چکا تھا تخت سے اتار کر اس کے چار ماہ کی عمر کے نوزائیدہ بچے کو تخت نشین کر دیا اور جملہ امورِ حکومت خود سنبھال لئے۔ لیکن ۱۷۳۶ء میں اس کی اچانک وفات کے بعد نادر شاہ کا لقب اختیار کرکے ایران کے تخت پر متمکن ہوا۔ ۲۴ مارچ ۱۷۳۸ء کو اس نے افغانوں کو شکست دے کر قندھار پر قبضہ کر لیا۔ اور جون ۱۷۳۸ء میں افغانوں کے تعاقب کے بہانے حملہ آور ہو کر کابل پر قبضہ کر لیا۔ ازاں بعد جلال آباد اور پشاور پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۲۷ دسمبر ۱۷۳۸ء کو اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کرکے برصغیر پر حملہ آور ہوا۔

حملہ کے اسباب

۱۔ مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا نے نادر شاہ کی حکومت کو تسلیم نہ کیا تھا۔

۲۔ محمد شاہ نے نادر شاہ سے اس کی خواہش کے مطابق سفارتی تعلقات استوار نہ کئے۔

۳۔ نادر شاہ کی تاکید و تنبیہہ کے باوجود محمد شاہ نے اس کے باغی افغان سرداروں کو پناہ دی۔

۴۔ نادر شاہ نے متعدد خطوط کے علاوہ تین سفارتیں مغل دربار میں بھیجیں لیکن محمد شاہ نے انہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اس کے خطوط تک کا جواب نہ دیا۔

۵۔ مغل حکومت زوال پذیر اور غیر مستحکم ہوتی جا رہی تھی اور انتشار و بدنظمی کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان حالات کے تحت برِصغیر کی دولت کے حصول کی خواہش نے نادر شاہ کو برِصغیر پاک و ہند پر حملہ آور ہونے پر اکسایا۔

واقعات

پنجاب کے صوبیدار زکریا خاں کو شکست دے کر نادر شاہ نے وزیر آباد

Marfat.com

اور لاہور کے رستے دہلی کا رخ کیا۔ وہیں اثنا محمد شاہ رنگیلا بدستور اپنی عیش کوشی میں مصروف رہا۔ جب بھی اسے نادر شاہ کے حملے کے متعلق بتلایا جاتا وہ "ہنوز دہلی دور است" کہہ کر بات کو ٹال دیتا۔ لیکن بعد ازاں جب اسے فی الواقعی اس عظیم خطرے کا احساس ہوا تو وہ ایک لشکر جرار لیکر نادر شاہ کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے دارالخلافہ سے نکلا اور کرنال کے مقام پر علی مردان خاں کی سفر کے نزدیک پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔ ۲۴۔ فروری ۱۷۳۹ء کو سعادت خاں برہان الملک صوبیدار اودھ کے رستے اور ایرانی سپاہ کے درمیان پہلی جھڑپ ہوئی۔ خانِ دوراں، نظام الملک اور بادشاہ بھی برہان الملک کی امداد کو پہنچ گئے۔ اس طرح کرنال کی لڑائی معرضِ وجود میں آئی جس میں برہان الملک زخمی ہو کر دشمن کے ہاتھوں قید ہوا۔ خان دوراں شدید زخمی ہو کر ہلاک ہوا اور میدان نادر شاہ کے ہاتھ رہا۔ محمد شاہ نے دل شکستہ ہو کر نظام الملک کو نادر شاہ سے صلح کی گفتگو کے لئے روانہ کیا۔ بعد ازاں بادشاہ خود بھی نادر شاہ کے پاس پہنچا۔ طویل بحث کے بعد نظام الملک نے نادر شاہ کو اس پر راضی کرایا کہ وہ پچاس لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ وصول کر کے یہیں سے واپس لوٹ جائے۔

گورنر اودھ سعادت خاں برہان الملک جو نادر شاہ کی قید میں تھا اور نظام الملک کا رقیب اور مخالف تھا نظام الملک کی اس کامیابی کو برداشت نہ کر سکا۔ لہٰذا اس نے نادر شاہ کو دہلی جانے کا مشورہ دیا اور اس کو بتایا کہ وہاں پچاس لاکھ روپے سے کہیں زیادہ زر و جواہرات اس کے ہاتھ آئیں گے۔ اس پر نادر شاہ نے بیس کروڑ روپے کا مطالبہ کرتے ہوئے نظام الملک کے ذریعہ بادشاہ کو دوبارہ ایرانی کیمپ میں آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ جونہی بادشاہ نظام الملک کی معیت میں خیمہ میں پہنچا گرفتار کر لیا گیا۔ اب نادر شاہ بادشاہ کی ہمراہی میں دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ شالامار باغ میں خیمہ زن ہو کر نادر شاہ نے بادشاہ کو آگے روانہ کر دیا تاکہ وہ اس کے استقبال کا انتظام کرے۔

۲۰۔ مارچ ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ جلوس کی شکل میں فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوا اور محمد شاہ کے محل میں مقیم ہوا۔ دہلی کی تمام مساجد میں نادر شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا یا گیا۔ ۲۲ مارچ کو جب ایرانی سپاہ دہلی کے بازاروں میں سیر و تفریح کے طور پر گھوم رہی تھی، اچانک یہ افواہ پھیل گئی کہ محمد شاہ نے دھوکے سے نادر شاہ کو ہلاک کر دیا ہے اس افواہ کے پھیلتے ہی دہلی کے شہریوں نے ایرانیوں پر حملے کرنا اور انہیں قتل کرنا شروع کر دیا۔ تین ہزار ایرانی سپاہی ہلاک ہو گئے نادر شاہ امن و امان کی بحالی کے لئے خود بہ نفسِ نفیس چاندنی چوک پہنچا لیکن اسے بھی گرفتی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس پر اس نے مشتعل ہو کر قتل عام کا حکم دیدیا۔ چنانچہ آٹھ گھنٹے لگاتار قتل و غارت کا بازار گرم رہا اور تیس ہزار کے قریب باشندگان دہلی قتل ہو گئے۔ آخر محمد شاہ کی

Marfat.com

ذاتی درخواست پر نادر شاہ نے قتل عام کو روک دیا۔

نادر شاہ ۱۵ مئی ۱۷۳۹ء تک دہلی میں مقیم رہا اور بے اندازہ مال و دولت کے ساتھ واپس عازمِ ایران ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق وہ ستر کروڑ روپے کی مالیت کا سونا، چاندی اور جواہرات کے علاوہ تختِ طاؤس اور دنیا کا مشہور و معروف "کوہِ نور" ہیرا بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ نیز سوہا تھی، سات ہزار گھوڑے، دس ہزار اونٹ اور بے شمار صاحبِ ہنر کاریگروں کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ شہزادہ کام بخش کی پوتی سے نادر شاہ کے بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اٹک پار کا سارا علاقہ اور صوبہ ٹھٹھہ پر نادر شاہ کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا اس کے عوض نادر شاہ نے محمد شاہ کو تختِ دہلی بحال کر دیا۔

نتائج و اثرات

برِ صغیر پر نادر شاہ کا حملہ "قہرِ خداوندی" سے کم نہ تھا۔ نادر شاہ ستاون دن دہلی میں مقیم رہا جس کے دوران دہلی میں قیامتِ صغریٰ کا سماں قائم رہا۔ نادر شاہ کی فوج نے دہلی کے تاریخی شہر کو بے دریغ لوٹا اور نادر شاہ خود برِ صغیر کی بے شمار دولت سے لدا واپس ایران پہنچا۔ مغلیہ شاہی خزانہ خالی ہو گیا۔ مغلیہ سلطنت کا رہا سہا دبدبہ اور وقار ختم ہو کر رہ گیا۔ صوبائی گورنروں میں خود مختاری کا رجحان پیدا ہو گیا۔ لامرکزیت اور انتشار کو فروغ ہوا۔ دہلی کا خوبصورت شہر اجڑ کر رہ گیا۔ بیشتر مغل فوج تباہ ہو گئی۔ مغلیہ سلطنت کی کمزوری سے آگاہ ہو کر مرہٹوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے مغل علاقوں میں لوٹ مار اور غارتگری شروع کر دی۔ مزید برآں حملہ آور فوج جن علاقوں سے گذری وہ بری طرح متاثر ہوئے اور ملک میں بدنظمی اور قحط کا سماں پھیل گیا۔ پنجاب میں سکھوں نے پر پرزے نکال کر تاخت و تاراج کا بازار گرم کر دیا۔ مغل امراء باہمی سازشوں کا شکار ہو کر ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے الغرض محمد شاہ کے عہد میں مغلیہ سلطنت کا وقار اور دبدبہ یکسر ختم ہو کر رہ گیا۔ نیز مغلیہ سلطنت کے زوال کی رفتار میں تیزی پیدا ہو گئی۔

احمد شاہ ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء

۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ مغل تخت پر متمکن ہوا۔ اس نے چھ سال تک حکومت کی اسے امورِ سلطنت سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ مہینوں حرم سے باہر نہ آتا اور کیف و نشاط کے ہنگاموں اور عیش کوشیوں میں مصروف رہتا تھا۔ حکومت کا جملہ کاروبار اس کی والدہ اور داروغہ سرا جاوید خاں کے ہاتھوں میں تھا۔ احمد شاہ کے عہد میں دربار امراء کی باہمی سازشوں کا مرکز بن کر رہ گیا۔ تورانی امراء کے قائد غازی الدین عماد الملک نے وزیرِ اعظم صوبیدار اودھ صفدر جنگ کے اقتدار کو ختم کرنے کے لئے مرہٹوں سے سازباز کی۔ اس پر صفدر جنگ قلمدانِ

Marfat.com

وزارت چھوڑ کر اودھ چلا گیا اور بادشاہ محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا اور حکومت کے جملہ اختیارات عماد الملک کے ہاتھ میں آ گئے۔ اس نے ۲ رجون ۱۷۵۴ء کو اپنے حامی امرار کی مدد سے احمد شاہ کو معزول کر کے اور اسے اندھا کر کے سلیم گڑھ کے قلعہ میں نظر بند کر دیا اور جہاندار کے بیٹے عزیز الدین کو تخت نشین کر دیا جس نے عالمگیر ثانی کا لقب اختیار کیا۔

عالمگیر ثانی
۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء

عالمگیر ثانی نیک طبع، دیندار اور ایک صالح انسان تھا وہ اپنے وزیر عماد الملک کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا جو بیباک و سفید کا مالک تھا اس نے عماد الملک کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کے لئے روہیلہ سردار نجیب الدولہ سے ساز باز کی مگر ناکام رہا۔ اس پر عماد الملک نے ایک سازش کے تحت شہزادہ اعلیٰ گوہر کو ٹیلہ فیروز شاہ بلا بھیجا کہ قندھار سے ایک قابل زیارت درویش وارد ہوا ہے۔ جب بادشاہ متذکرہ درویش سے ملنے کے لئے کوٹلہ فیروز شاہ پہنچا تو اس پر قاتلانہ حملہ کر کے ہلاک کروا دیا گیا۔ اب عماد الملک نے کام بخش کے ایک پوتے کو شاہجہان ثالث کے خطاب سے تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن ابھی اس کی بادشاہت کا اعلان نہیں ہوا تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے برصغیر پر حملہ کر دیا (جس کی تفصیل ہم بعد میں دیں گے) ادھر بہار میں مقیم عالمگیر ثانی کے بیٹے شہزادہ علی گوہر نے شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

شاہ عالم ثانی
۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء

شہزادہ علی گوہر شاہ عالم ثانی پٹنہ (بہار) میں مقیم تھا کہ اسے اپنے باپ عالمگیر ثانی کی وفات کی خبر ملی۔ چنانچہ اس نے وہیں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اودھ کے صوبیدار شجاع الدولہ کو اپنا وزیر مقرر کر دیا۔ وہ بادشاہ ہونے کے باوجود دس سال تک دارالسلطنت دہلی میں داخل نہ ہو سکا وہ اپنے امرار اور مرہٹوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہا۔ اس کے عہد کے دوران پانی پت کی تیسری تاریخی جنگ لڑی گئی جس میں افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست دے کر ان کا کچومر نکال دیا۔ اس نے برصغیر سے واپس جاتے ہوئے شاہ عالم ثانی کو دہلی کا مستقل بادشاہ نامزد کیا لیکن اس کے باوجود وہ ۱۷۷۲ء تک دہلی میں داخل ہونے سے ڈرتا رہا اور اپنے امرار اور مرہٹوں کا دست نگر بنا رہا۔

۱۷۶۴ء میں عالم شاہ ثانی نے اپنے وزیر شجاع الدولہ کی ہمراہی میں بنگال کے نواب میر قاسم کی مدد کرتے ہوئے بکسر کی لڑائی میں انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اس پر اسے بنگال و بہار کی دیوانی کے حقوق انگریزوں کو عطا کرنے پڑے اور انگریزوں نے اسے چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ دینا منظور کیا۔ شاہ عالم ثانی ۱۷۷۲ء تک الہ آباد میں مقیم رہا۔ آخر مرہٹہ سردار مادوجی سندھیا

Marfat.com

لے لئے۔ اس کے بعد دن بدن مرہٹے طاقتور ہوتے چلے گئے۔ تاہم ۱۷۵۲ء سے پنجاب اور ملتان کا الحاق افغانستان سے ہو گیا۔

چوتھا حملہ: ۱۷۵۲ء سے پنجاب احمد شاہ ابدالی کے زیر نگین تھا اور اس کی طرف سے معین الملک پنجاب کا صوبیدار تھا۔ نومبر ۱۷۵۳ء میں معین الملک نے وفات پائی تو احمد شاہ ابدالی نے اس کے کمسن بیٹے کو اس کی ماں مغلانی بیگم کی نگرانی میں پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا۔ مگر مختصر سے عرصہ بعد کمسن صوبیدار نے بھی وفات پائی اس پر مغلانی بیگم کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا گیا جس کے عہد اقتدار میں پنجاب بدنظمی کا شکار ہوا۔ ان حالات کے پیش نظر عالمگیر ثانی کے وزیر عماد الملک نے پنجاب پر قبضہ کرنے کا عزم کیا۔ چنانچہ وہ بادشاہ کی معیت میں پنجاب کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا۔ مگر فوج میں بغاوت کے رجحانات کو دیکھ کر پانی پت کے مقام سے ہی واپس پلٹ گیا۔ بعد ازاں اس نے ایک بھاری فوج بھیج کر لاہور پر قبضہ کر لیا اور مغلانی بیگم کو قید کر کے اس کی جگہ ادینہ بیگ خاں کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس پر احمد شاہ ابدالی نے برہم ہو کر ۱۷۵۶ء میں چوتھی بار برصغیر پاک و ہند پر حملہ کیا اور پنجاب پر قبضہ کر کے دہلی کی طرف پیش قدمی کی۔ اور ۲۸ جنوری ۱۷۵۷ء کو دارالسلطنت دہلی میں فاتحانہ داخل ہوا۔ وزیر عماد الملک نے مغلانی بیگم کی وساطت سے ابدالی کی اطاعت قبول کر لی اور احمد شاہ ابدالی نے اسے وزارتِ عظمیٰ پر بحال رکھا۔

فاتح احمد شاہ ابدالی نے دہلی کے شہر کو تاخت و تاراج کرنے کے علاوہ ہندوؤں کے متبرک شہر متھرا کو بھی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا۔ نیز مغل بادشاہ عالمگیر ثانی کی بادشاہت کو تسلیم کیا اور اس کی لڑکی سے اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شادی کی۔ تیمور شاہ کو لاہور کا حاکم مقرر کیا۔ احمد شاہ ابدالی نے کابل کو مراجعت سے قبل نجیب خاں روہیلہ کو نجیب الدولہ کا خطاب عطا کر کے مغل بادشاہ عالمگیر ثانی کا میر بخشی مقرر کیا اور اسے بادشاہ کی حفاظت کی تاکید کی۔

پانچواں حملہ: احمد شاہ ابدالی کے واپس جانے کے فوراً بعد مغل بادشاہ کے دربار میں وزارت کے حصول کے لئے سازشیں ہونے لگیں۔ عماد الملک نے مرہٹوں سے پھر ساز باز کر لی اور ان کی مدد سے میر بخشی نجیب الدولہ کو معزول کرا کر اپنے معتمد احمد خاں بنگش کو میر بخشی مقرر کرا لیا اس پر نجیب الدولہ اپنی ریاست سہارنپور اور نجیب آباد چلا گیا اب مغل دربار میں مرہٹوں کو بہت اثر و اقتدار حاصل ہو گیا۔ اپریل ۱۷۵۸ء میں مرہٹہ سردار رگھوناتھ راؤ نے پنجاب پر حملہ آور ہو کر احمد شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کو مار بھگایا اور پنجاب پر قبضہ کر لیا اس پر مرہٹہ اقتدار انتہائی عروج کو پہنچ گیا اور پنجاب سے دکن تک ان کا طوطی بولنے لگا۔ مالیہ اور ٹیکس وصول کرنے کے بہانے انہوں نے لوگوں کو اپنی غارتگری کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اور

Marfat.com

برصغیر پاک و ہند میں رام راجیہ کے قیام کے خواب دیکھنے لگا۔

۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء کو عماد الملک نے مغل بادشاہ عالمگیر ثانی کو قتل کروا دیا اور رام بخش کے پوتے محی الملت کو شاہجہان ثالث کے لقب سے تخت نشین کر دیا۔ لیکن بہار میں شہزادہ علی گوہر نے شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ان حالات کے تحت نجیب الدولہ کی درخواست پر اگست ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانچویں بار برصغیر پاک و ہند پر حملہ کر دیا۔ اس نے مرہٹہ سردار سابھاجی سندھیا کو شکست دیکر لاہور پر قبضہ کر لیا اور دہلی کی جانب بڑھا۔ دہلی کے نواح میں نجیب الدولہ احمد خاں بنگش، سعادت اللہ خاں اور روہیلکھنڈ کے دیگر روہیلہ سردار احمد شاہ ابدالی سے مل گئے۔ چنانچہ ۹ جنوری ۱۷۶۰ء کو احمد شاہ ابدالی نے دہلی کے قریب برادی گھاٹ کے مقام پر مرہٹہ سردار دتاجی سندھیا کو شکست فاش دی۔ دتاجی سندھیا لڑتا ہوا ہلاک ہو گیا اس فتح کے بعد ۱۴ جنوری ۱۷۶۰ء کو احمد شاہ ابدالی حیدر آباد پہنچا جہاں اس نے سورج مل جاٹ اور راجستھان کے دوسرے حکمرانوں کو خراج ادا کرنے اور مرہٹوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے لئے امداد دینے کا حکم دیا۔ اسی اثنا میں ملہار راؤ ہلکر نے احمد شاہ ابدالی کو پریشان کرنے کی غرض سے دوآب میں پہنچ کر احمد خاں بنگش کے بھیجے ہوئے قافلے کو لوٹ لیا جو احمد شاہ ابدالی کے لئے امداد لے کر جا رہا تھا مگر سکندر آباد کے قریب احمد شاہ ابدالی کے جرنیل جہان خان سے شکست کھائی اس طرح ایک ہی ریلے میں شمالی برصغیر سے مرہٹہ اقتدار ختم ہو کر رہ گیا۔ احمد شاہ ابدالی دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد موسم برسات کی وجہ سے سکندر آباد میں خیمہ زن ہوا تاکہ وہ دوآب اور روہیلکھنڈ کے افغانوں کی بروقت امداد کر سکے۔

پانی پت کی تیسری لڑائی

۱۴- جنوری ۱۷۶۱ء

احمد شاہ ابدالی کے برصغیر پر حملے اور مرہٹہ فوج کی برادی گھاٹ پر شکست کی خبر جب پونا پہنچی تو مرہٹوں کے پیشوا بالاجی باجی راؤ (نانا صاحب) نے ایک عظیم فوج اپنے رشتہ دار سداشو راؤ بھاؤ کی سرکردگی میں شمال کی جانب روانہ کی تاکہ شمالی ہند میں مرہٹوں کا اقتدار بحال کیا جا سکے اور احمد شاہ ابدالی کا اخراج کیا جا سکے۔ اس مرہٹہ فوج میں پیشوا کے لڑکے وشواس راؤ کے علاوہ کئی دیگر اہم مرہٹہ سردار شامل تھے۔ جونہی اس فوج نے دریائے چنبل کو عبور کیا بھرت پور کا راجپوت حکمران سورج مل جاٹ بھی اپنی تیس ہزار فوج کے ساتھ مرہٹہ فوج میں شامل ہو گیا۔ عماد الملک نے بھی مرہٹوں کا ساتھ دیا۔ علاوہ ازیں ابراہیم گاردی کا فوجی دستہ اور توپ خانہ بھی مرہٹوں کے ہمراہ تھا۔ اس طرح مرہٹہ لشکر کی تعداد تین لاکھ کے قریب تھی جبکہ احمد شاہ ابدالی کی فوج کی تعداد صرف اسی ہزار تھی جس میں بیالیس ہزار سوار تھے اور باقی پیادہ فوج تھی۔

Marfat.com

جولائی ۱۷۶۰ء میں مرہٹوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور حسب عادت خوب غارتگری کا بازار گرم کیا انہوں نے احمد شاہ ابدالی کے سفیروں کو بھی دہلی سے نکال دیا۔ مرہٹوں نے مغل بادشاہ شاہجہان ثالث کو معزول کر کے شاہ عالم ثانی کی حمایت میں اس کے بیٹے جیون بخت کو وقتی طور پر تخت نشین کر دیا۔ اور شجاع الدولہ کو وزیر مقرر کیا۔ اس اثنا میں احمد شاہ ابدالی انوپ پور (ضلع بلند شہر) میں قیام پذیر ہو کر والیٔ اودھ شجاع الدولہ کو ساتھ ملانے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر نجیب الدولہ کی کوشش سے شجاع الدولہ نے مرہٹوں کے مقابل احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دینا منظور کر لیا۔

موسم برسات کے اختتام پر طرفین کی افواج حرکت میں آئیں۔ مرہٹہ افواج دہلی سے سرہند کی جانب روانہ ہو گئیں تاکہ احمد شاہ ابدالی کے واپسی کے رستے پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ پانی پت کے تاریخی میدان میں جا خیمہ زن ہوئیں اور خندقیں کھود کر مورچہ بند ہو بیٹھیں۔ احمد شاہ ابدالی نے تین دن بعد دریائے جمنا کو عبور کر کے دہلی اور پانی پت کے درمیان پہنچ کر مرہٹوں کے سامنے جا ڈیرے ڈالے۔ اس طرح اس نے مرہٹوں کی سپلائی لائن پر قبضہ کر لیا۔ جنگ سے قبل مرہٹوں اور ان کے حلیفوں کے مابین طریق جنگ کے بارے میں اختلاف رونما ہوا۔ بڑی بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے ہوا کہ جنگ لڑنے کا طے ہوا۔ لیکن اس پر سورج مل جاٹ اور وزیر عماد الملک راضی نہ تھے۔ چنانچہ وہ مرہٹوں سے علیحدہ ہو کر اپنی افواج سمیت بلب گڑھ کے قلعہ میں قلعہ بند ہو گئے ازاں بعد دونوں لشکروں کے مابین معمولی جھڑپیں ہونے لگیں۔

۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کی افواج کے درمیان خونریز جنگ ہوئی جو شام تک جاری رہی۔ شام سے قبل مرہٹوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے دور تک ان کا تعاقب کیا مرہٹہ سردار سدا سبھاؤ اور پیشوا کا لڑکا وشواس راؤ دونوں دیگر اہم سرداروں کے ساتھ جنگ میں ہلاک ہو گئے۔ ملہار راؤ ہلکر اور کھادھاجی سندھیا نے بھاگ کر جان بچائی۔ پیشوا بالاجی باجی راؤ مرہٹہ فوج کی تباہی کی خبر سنکر تیزی سے شمال کی طرف بڑھا۔ لیکن دریائے نربدا کے کنارے جب اسے مرہٹوں کی شکست فاش کی خبر ہوئی تو واپس لوٹ گیا۔ لڑائی پر تبصرہ کرتے ہوئے پیشوا نے حسرت سے کہا:

"دو ہیرے (بھاؤ اور وشواس راؤ) بالکل برباد ہوئے۔ ستائیس اشرفیاں (۲۷ مرہٹہ سردار) کھو گئیں۔ چاندی اور تانبے کے سکوں (عام فوجیوں) کے نقصان کا اندازہ مشکل ہے۔"

مرہٹوں پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے برصغیر پاک و ہند میں اپنی

Marfat.com

مستقل حکومت قائم کرنے کا عزم کیا۔ مگر اس کی فوج نے بھی سکندر اعظم یونانی کی فوج کی طرح واپس وطن جانے کا مطالبہ کیا اس پر احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم ثانی کو دہلی کا بادشاہ نامزد کیا اور عماد الملک کو اس کا وزیر مقرر کیا۔ نجیب الدولہ کو دہلی کا ناظم متعین کرتے ہوئے اسے امیر الامرار کا خطاب عطا کیا اور ۲۰ مارچ ۱۷۶۱ء کو واپس کابل لوٹ گیا۔

نتائج و اثرات

پانی پت کی تیسری لڑائی فیصلہ کن ثابت ہوئی مرہٹوں کی مرکزی قوت انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی۔ پیشوا کی حیثیت بالکل کمزور ہو گئی اور بہت سے مرہٹہ سردار خود مختار ہو گئے اس شکست کے بعد مرہٹوں کو بھی پھر کبھی استحکام نصیب نہ ہوا۔ پنجاب، ملتان اور دہلی سے مرہٹہ اقتدار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور شمالی برصغیر پر رام راجیہ کے قیام کا خواب منتشر ہو کر رہ گیا۔ ۱۴ فروری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے تاریخی میدان میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کے مقابل آکر درحقیقت مرہٹوں کے اس چیلنج کا جواب دیا تھا جو انہوں نے زوال پذیر مغل اقتدار کو دیکھ کر دیا تھا کہ مغلوں کے بعد اب برصغیر کے حکمران مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہوں گے۔ جنگِ کنواہہ کے بعد یہ دوسری کفر اور اسلام کی جنگ ہوئی جو پوری تیاری اور آغاز سے انجام تک پورے زور سے لڑی گئی جس میں بارِ دیگر مسلمان کامران رہے لیکن احمد شاہ ابدالی کو اپنی فوج کے اصرار پر واپس کابل جانا پڑا اور اس طرح اس نے برصغیر پاک و ہند میں درانی خاندان کی اسلامی حکومت قائم کرنے کا سنہری موقع کھو دیا۔ پانی پت کی تیسری فیصلہ کن لڑائی میں مرہٹوں کی شکستِ فاش اور احمد شاہ ابدالی کی واپسی سے برصغیر کی سیاست میں ایک خلا رونما ہوا جسے زوال پذیر مغلیہ سلطنت کے حکمران پُر کرنے سے قاصر رہے چنانچہ اس سیاسی تعطل سے انگریزوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی فتوحات سے اس خلا کو پُر کر کے برصغیر پاک و ہند میں انگریزی اقتدار کی بنیاد رکھی۔

مرہٹوں کی شکست کے اسباب

نیا طریق جنگ: اس جنگ میں عسکری طاقت کے زعم میں مرہٹوں نے اپنے قدیم طریق جنگ یعنی قزاقانہ طرزِ جنگ کو خیرباد کہتے ہوئے میدان میں جم کر مقابلہ کرنے کا عزم کیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ اپنے اعلیٰ توپ خانے اور فوج کی تعداد کی برتری کے پیشِ نظر کیا تھا۔ لیکن وہ میدانی جنگ کی ماہر ابدالی فوج کے سامنے جم کر لڑنے اور شکست سے دوچار ہوئے۔

Marfat.com

باہمی انتشار: طریق جنگ کے بارے میں مرہٹہ جرنیل اور مرہٹوں کے حلیفوں میں اختلافِ رائے پیدا ہو گیا۔ مرہٹہ جرنیل بھاؤ کی میدانی جنگ لڑنے کی ضد سے دل برداشتہ ہو کر سورج مل جاٹ اور عماد الملک اپنی فوج کی معیت میں مرہٹوں سے علیحدہ ہو گئے اور بلب گڑھ میں قلعہ بند ہو بیٹھے۔ چنانچہ باہمی اتحاد اور یگانگت کے فقدان کے باعث مرہٹوں کو بھرت پور کی بیس ہزار فوج کے بغیر درانی فوج کا مقابلہ کرنا پڑا۔

مقامی باشندوں کی مخاصمت: مرہٹوں کی آئے دن کی تاخت و تاراج اور لوٹ مار سے دہلی اور نواحی علاقوں کے باشندے سخت نالاں تھے۔ اسی طرح راجپوت اور جاٹ بھی ان کی غارتگری کے زخم خوردہ تھے احمد شاہ ابدالی نے جب مرہٹوں کی ناکہ بندی کی تو ان کے لئے مقامی باشندوں سے رسد حاصل کرنا محال ہو گیا کیونکہ مقامی لوگ مرہٹوں کی بربریت اور غارتگری کی وجہ سے ان سے شدید بیزار تھے۔ مرہٹوں کی شکست پر انہیں ذرہ بھر بھی افسوس نہ ہوا۔ اس کے برعکس احمد شاہ ابدالی مسلمانوں کے نجات دہندہ کی حیثیت سے نہ صرف روہیلوں کے علاقوں سے رسد حاصل کر سکتا تھا بلکہ اس سلسلہ میں وہ دہلی سے بھی رابطہ قائم کئے ہوئے تھا۔

رسد کی فراہمی: احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کی رسد کی سپلائی لائن کی اس شدت سے ناکہ بندی کی کہ ان کے لئے خوراک کی فراہمی ناممکن ہو کر رہ گئی۔ دسمبر ۱۷۶۰ء میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کے سامانِ رسد پہ قبضہ کر کے انہیں مزید بے بس کر کے رکھ دیا۔ اور وہ مورچوں میں فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے اس پر مرہٹوں نے صلح کے لئے کوششیں شروع کیں۔ لیکن احمد شاہ ابدالی نے ان پر کاری ضرب لگاتے ہوئے انہیں شکستِ فاش دی۔

ابدالی کی عسکری صلاحیت: احمد شاہ ابدالی کی عسکری صلاحیت مسلمہ تھی وہ فنونِ حرب کا ماہر، جنگی چالوں میں یکتا ٹھنڈے دل و دماغ کا حامل، ایک تجربہ کار جرنیل تھا۔ اس نے اپنی عسکری ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مرہٹوں کی رسد رسانی کے سلسلے کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ان کے سامان رسد پر قبضہ کر کے اور ان کی صلح کی پیشکش کو رد کر کے ان پر اس قدر شدید حملہ کیا کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔

Marfat.com

مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد اس کے جانشین مغلیہ سلطنت کو سنبھال نہ سکے۔ جنگ تخت نشینی، مرکز کی کمزوری، غیر مسلموں کی سیاسی بیداری اور متعدد دیگر اسباب نے بتدریج اس سلطنت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔ حتیٰ کہ ستمبر ۱۸۵۷ء میں آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور نومبر ۱۸۵۸ء میں اس کی جلاوطنی کے ساتھ ہی یہ عظیم سلطنت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ گئی اور بالآخر برطانوی اقتدار نے مغلیہ سلطنت کی جگہ لے لی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال میں داخلی و خارجی دونوں اسباب کارفرما تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

داخلی اسباب

قانونِ وراثت کی عدم موجودگی

مغلوں کے ہاں تخت نشینی کے سلسلے میں کوئی متعینہ ضابطہ نہ تھا کہ جس کی رو سے صرف بڑا لڑکا ہی تخت و تاج کا صحیح وارث متصور ہوتا۔ قانون وراثت کی عدم موجودگی کی وجہ سے شاہی خاندان کے جملہ افراد تخت و تاج کو اپنا موروثی حق خیال کرتے تھے جس کے حصول کی خاطر ہر مغل شہزادہ قسمت آزمائی کرتا تھا۔ تخت کے مستقبل کے بارے میں تلوار کا فیصلہ آخری فیصلہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ ہر مغل بادشاہ کی وفات پر بادشاہت کے دعویداروں میں تخت یا تختہ کے اصول کے تحت حصولِ اقتدار کی جنگ ہوتی تھی اور کامیاب شہزادہ اپنے حریفوں کو بہ نوکِ شمشیر ختم کر کے تخت پر قابض ہو جاتا تھا۔ مغلوں کی تاریخ ایسی خانہ جنگیوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ جنگیں نہ صرف مغلیہ سلطنت کے لئے تباہ کن ثابت ہوئیں بلکہ ان کے باعث مغلیہ خاندان اندرونی خلفشار، نااتفاقی، حسد و رقابت اور باہمی سازشوں کا شکار ہو کر رہ گیا اور بالآخر اس خاندان کی کمزوری اور زوال پر منتج ہوئیں۔

نااہل جانشین

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شخصی اور مطلق العنان حکومت کا دارومدار حکمران کی اہلیت پر ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اورنگزیب کے تمام جانشین کمزور اور نااہل واقع ہوئے تھے وہ ان تمام صلاحیتوں سے عاری تھے۔

Marfat.com

جن کی بنا پر بابر، اکبر، شاہجہان اور اورنگ زیب نہایت کامیاب حکمران ثابت ہوئے تھے۔ اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ اول عمر کے لحاظ سے تو بوڑھا تھا لیکن انتظامی تجربہ کے لحاظ سے بالکل ناپختہ بلکہ بچہ تھا اور انتظام سلطنت میں ناتجربہ کاری کی بنا پر "شاہِ بے خبر" کے نام سے مشہور تھا۔ تاہم اس نے کسی حد تک مغلیہ وقار کو برقرار رکھا۔ لیکن اس کے بعد کے تمام مغل بادشاہ بالکل نااہل ثابت ہوئے۔ وہ نہ صرف امرار کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے بلکہ امورِ سلطنت میں دلچسپی لینے کی بجائے انہوں نے شاہد و شراب کی محفلوں اور عیش و نشاط کی بزم آرائیوں کو اپنا شعار بنایا۔ بہادر شاہ کا جانشین جہاندار شاہ اپنی محبوبہ لال کنور کے دامِ محبت میں ایسا اسیر ہوا کہ سلطنت بدنظمی اور انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اسی طرح فرخ سیر نہ صرف نالائق بلکہ حد درجے کا بزدل تھا۔ اورنگ زیب کے جانشینوں میں محمد شاہ رنگیلا بھی تھا جو ہر وقت حرم سرا میں مصروفِ عیش رہتا تھا اور جس نے نادر شاہ کی یلغار کی خبر کو یہ کہکر ٹال دیا تھا "ہنوز دلی دور است"۔ غرضیکہ اورنگ زیب کے تمام جانشین نہ صرف نالائق تن آسان اور عیش کوش تھے بلکہ انتظامی قابلیت سے بھی یکسر محروم تھے۔ چنانچہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد سے مغلیہ سلطنت تیزی سے زوال پذیر ہونے لگی۔

مالی ابتری

ملکی نظام میں مالیات کو ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت حاصل ہے مغلیہ اقتدار کے آخری دور میں اورنگ زیب کے کمزور اور غیر مدبر جانشینوں کی نااہلی کے باعث مغلیہ سلطنت کا مالی نظام بالکل تباہ و برباد ہو کر رہ گیا تھا۔ مرکز کی کمزوری مالیہ کی عدم وصولی، درباری شان و شوکت، جاگیروں اور مناصب کی فیاضانہ تقسیم اور صوبوں کے خود مختاری کی طرف رجحان نے سلطنت کے مالی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ مزید برآں درباری سازشوں اور سید برادران کی ریشہ دوانیوں سے بھی مالی حالت بہت متاثر ہوئی۔ نادر شاہ کے حملے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی وہ دہلی سے واپسی پر اپنے ہوئے تیس کروڑ روپے کا مال غنیمت، بے شمار ہیرے اور جواہرات جن میں دنیا کا مشہور ہیرا "کوہِ نور" بھی شامل تھا، مع تختِ طاؤس اپنے ساتھ لے گیا۔ اس حملے سے مغلیہ سلطنت کی مالی حالت پر کاری ضرب لگی اور سلطنت بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی۔

وسعتِ سلطنت

بعض مورخین وسعتِ سلطنت کو بھی مغلیہ سلطنت کے زوال کا اہم سبب قرار دیتے ہیں۔ اورنگ زیب کے عہد میں مغل سلطنت اپنی عظمت کی آخری حد تک پہنچ گئی تھی اور اس کی حدود بہت وسیع ہو گئی تھیں اس میں سارے برصغیر کے علاوہ کابل بھی شامل تھا۔ اتنی وسیع و عریض سلطنت میں امن و امان

Marfat.com

اور بہتر نظام قائم رکھنے کے لئے نہ صرف وصول ورسائل اور عمدہ آمدورفت کے بہتر ذرائع کی ضرورت تھی بلکہ علاؤالدین خلجی، شیر شاہ سوری، اکبر اعظم اور اورنگ زیب جیسے عظیم بادشاہوں کی ضرورت تھی مگر آخری تیموری بادشاہ اپنی بے تدبیری اور نااہلی کے باعث اس وسیع سلطنت کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ نتیجتہً مرکز کی کمزوری کی وجہ سے متعدد صوبیدار خود مختار ہو گئے اور ملک میں بدنظمی اور انتشار کے دور کا آغاز ہوا۔

صوبائی خود مختاری

آخری مغل بادشاہوں کی کمزوری اور نااہلی اور مغل امراء کے باہمی حسد و نفاق کے باعث مغلیہ سلطنت کی مرکزی قوت کمزور، غیر مؤثر اور انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی جس سے بہت سے صوبائی گورنروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ابتدا میں دکن، بہار، بنگال اور اڑیسہ جیسے صوبے خود مختار رہے۔ بعد ازاں اودھ نے بھی خود مختاری اختیار کر لی۔ پنجاب پر سکھوں نے قبضہ کر لیا۔ جنوب میں مرہٹوں نے اقتدار قائم کر لیا اس طرح عظیم مغل سلطنت پارہ پارہ ہو گئی۔

مغل امراء

اورنگ زیب کے بعد شاہی دربار سازشوں اور مغل امراء کی جتھہ بندیوں کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ اب مغل دربار میں بیرم خاں، بھگوان داس، مان سنگھ، عبدالرحیم خانخاناں، راجہ ٹوڈرمل، ابوالفضل، آصف جاہ، ہدایت خاں اور سعداللہ خاں چنیوٹی جیسے مخلص، وفادار اور مدبر امراء نہ تھے جو نہ صرف مغل حکومت کے ستون تھے بلکہ جن کی کوششوں سے مغلیہ سلطنت مستحکم بنیادوں پر استوار ہوئی اور انتہائی عروج کو پہنچی۔ اب مغل امراء عیش کوش اور تساہل پسند ہو گئے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ دربار میں تورانی، ایرانی اور ہندوستانی امراء کے تین گروپ تھے۔ مغل بادشاہوں کی نااہلی اور کمزوری کے باعث ان گروہوں میں رقابت اور کشمکش کا نہ ختم ہونیوالا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جس سے مغل حکومت مزید کمزور ہوتی چلی گئی۔ سید برادران نے برسر اقتدار آ کر مغل حکومت کا جنازہ نکال دیا اور رہی سہی کسر وزراء کے باہمی حسد اور نفاق نے پوری کر دی جس سے نظام سلطنت درہم برہم اور عظیم تیموری سلطنت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔

بحری طاقت کا فقدان

برصغیر پاک و ہند کے مسلم حکمرانوں کے ہاں بحری طاقت کا فقدان تھا۔ مغل بادشاہوں نے وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دیا اور بحری طاقت کے قائم کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یورپی اقوام کے بحری بیڑوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور یورپی اقوام نے اپنی بحری طاقت کے بل بوتے پر ساحلی علاقوں میں قلعہ نما تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں اور آہستہ آہستہ انہوں نے

Marfat.com

اتنی قوت حاصل کر لی کہ براہِ راست ملکی سیاست میں بھی مداخلت کرنی شروع کر دی۔ غیر ملکیوں کے ان عزائم سے آگاہ ہونے کے باوجود مغل حکمران ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہ کر سکے نتیجتہً ان کی سیاسی چالوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی۔

فوجی طاقت کا انحطاط

فوجی طاقت کے انحطاط نے بھی مغلیہ سلطنت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔ ہندو اور انگریز مؤرخین فوجی طاقت کے انحطاط کی ذمہ داری اورنگ زیب عالمگیر کے سر تھوپتے ہیں۔ حالانکہ یہ الزام سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مغلوں نے وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو نہ سمجھا اور جدید فنونِ حرب اور نئے ہتھیاروں کو نہ اپنایا۔ مغلیہ فوج اپنی کثرتِ تعداد اور قدیم فنونِ حرب میں مہارت کے زعم میں بہت زیادہ مغرور ہو گئی تھی۔ شاہجہان کے عہد سے مغل جرنیل اور سپاہی نیز منصبدار تن آسان اور تساہل پسند ہو گئے تھے وہ اب جنگ سے جی چرانے لگے تھے اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے عیش پسند ہو کر رہ گئے تھے اورنگ زیب کے جرنیل ریشمی لباس پہن کر اور پالکیوں میں سوار ہو کر میدانِ جنگ میں جاتے تھے۔ ان کے ساتھ بیوی بچے اور ملازمین بھی ہوتے تھے۔ اور اس طرح مغل فوجی کیمپ میلہ کی سی صورت اختیار کر لیتا تھا اس کے علاوہ مغل فوج سست رفتار اور مہارت سے بھی نابلد ہو کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ وہ مرہٹوں کی غارتگری اور گوریلا طریقِ جنگ کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئی۔ اکبری دستور کے مطابق فوج کی کمان دو سالاروں کے سپرد کی جاتی تھی۔ ان میں عموماً ایک مسلمان اور دوسرا غیر مسلم ہوتا تھا۔ شروع میں یہ دستور کامیاب رہا۔ کیونکہ اس سے فوجی سپہ سالاروں کی سرکشی اور بغاوت کا سدباب ہو گیا تھا۔ لیکن اب مغل سالار باہمی رقابت کا شکار ہو کر اپنے فرائض سے غافل ہو چکے تھے یہی وجہ تھی کہ اب مہموں میں کامیابی نہ ہوتی تھی۔

غیر مسلم اقوام

ہندوؤں نے کبھی مسلم حکومت کو دل سے تسلیم نہ کیا تھا بلکہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کو اجنبی اور غاصب تصور کرتے رہے۔ سلاطینِ دہلی نے انہیں برسرِ شمشیر دیئے رکھا۔ لیکن اکبر نے انتہائی فراخدلی سے کام لیکر اپنی رواداری پالیسی سے انہیں خاص اہمیت اور آزادی دیکر ان کے خفیہ عزائم کی حوصلہ افزائی کی۔ اکبر نے انہیں اہم عہدوں سے نواز کر اور شاہجہان نے انہیں مزید مراعات دیکر اس قدر با اختیار اور زور آور بنا دیا کہ ان میں سیاسی شعور کے نام پر متعصبانہ مذہبی جذبہ پیدا ہو گیا اور جب اورنگ زیب نے انہیں قانون کی حدود میں رکھنے کی کوشش کی تو وہ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب ان کی ساری توجہ اور کوشش نہ صرف مسلم حکومت کے

Marfat.com

خاتمے کے لئے صرف ہونے لگی بلکہ اب وہ رام راج قائم کرنے کے بھی خواب دیکھنے لگے انہوں نے انگریزوں کو اپنا ہم خیال پاکر مسلم حکومت کے خلاف اپنی سازشوں کو مزید تیز کر دیا اور جنگ پلاسی میں انہوں نے انگریزی سیادت کو قبول کرکے اور انگریزوں سے تعاون کی پالیسی اپنا کر مسلم حکومت کے اقتدار پر کاری ضرب لگائی۔ اس طرح غیر مسلم اقوام کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں نے بھی مغلیہ سلطنت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

مسلم معاشرہ

صدیوں پہلے مسلمان جس بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرکے اقلیت میں ہونے کے باوجود برصغیر پر چھا گئے تھے، اب اٹھارہویں صدی میں اس کا نام و نشان باقی نہ رہا تھا۔ مسلم معاشرہ بے عمل بگڑ چکا تھا۔ جرأت و ایثار، سخت کوشی اور غیرتِ قومی کی جگہ رشوت ستانی، نااہلی اور کاہلی نے لے لی تھی۔ شروع میں انہوں نے اقلیت میں ہونے کے باوجود اکثریت پر حکمرانی کی تھی لیکن اب باہمی نااتفاقی، آزاد روی اور غیر اسلامی افکار و اعمال نیز غیرتِ ملی کے فقدان کے باعث نہ صرف مسلم معاشرہ تنزل پذیر ہوا بلکہ اس تنزل پذیر مسلم معاشرہ سے غیر مسلم رعایا خود سر اور بیدار ہو گئی۔ مسلم معاشرہ کی اس زوال پذیری نے بھی مغل سلطنت کے زوال کو ناگزیر بنا دیا۔

خارجی وجوہات

نادر شاہ کا حملہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خارجی اعتبار سے جس امر نے تنزل پذیر مغل اقتدار اور وقار پر کاری ضرب لگائی وہ نادر شاہ کا حملہ تھا۔ وسط ایشیا اور قندھار کی تسخیر میں شاہجہان کی ناکامی سے نہ صرف مغلیہ سلطنت کا وقار بری طرح متاثر ہوا تھا بلکہ اس ناکامی سے مغلوں کی فوجی عظمت کا پول بھی کھل گیا تھا جس سے شمال مغربی سرحد غیر محفوظ ہو کر رہ گئی تھی اور ایرانی حملے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا جو محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس حملے سے مغل حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ کیونکہ اس حملے سے مغل حکومت کی عسکری اور مرکزی کمزوری سب پر عیاں ہو گئی۔ نتیجتہً نہ صرف صوبائی خود مختاری اور مرہٹوں کی لوٹ مار کی حوصلہ افزائی بلکہ مالی ابتری نے بھی خطرناک صورت اختیار کر لی۔ نادر شاہ دہلی کو لوٹنے اور قتل عام کرنے کے علاوہ مغلوں کا تمام شاہی خزانہ مع تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا ساتھ لے گیا۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے

نادر شاہ کے حملے کے بعد رہی سہی کسر احمد شاہ ابدالی

Marfat.com

نے اپنے پانچویں حملے کے دوران مرہٹہ قوت کا قلع قمع کر دیا تھا لیکن اس کے بعد اس نے اپنی حکومت قائم نہ کر کے برصغیر کی سیاست میں جو خلا پیدا کیا اسے زوال پذیر مغل خاندان کے کمزور اور نااہل جانشین پُر نہ کر سکے اور انگریزوں نے میدان خالی پا کر معمولی سی عسکری طاقت کا مظاہرہ کر کے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

انگریز مغلوں کی کمزوری اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی شکست سے برصغیر کی سیاست میں جو خلا پیدا ہوا۔ انگریز قوم نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا انگریز برصغیر پاک و ہند میں تاجروں کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے شاطرانہ چالوں سے کام لے کر عوام کی بے بسی، امراء کی خود غرضی اور مغل حکومت کے دورِ انحطاط سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف یہاں نو آبادیات قائم کر لیں بلکہ مغل حکومت کو ختم کر کے برصغیر میں برطانوی تاج کا تسلط قائم کر دیا۔

اہم تاریخیں

۱۷۰۷ء اورنگ زیب کی وفات کے بعد بہادر شاہ اول کا تختِ طاؤس پر متمکن ہونا۔
مرہٹہ سردار ساہو کا مہاراشٹر واپس آنا۔

۱۷۰۸-۹ء شہزادہ کام بخش کی بغاوت و وفات، گورو گوبند سنگھ کا بمقام تندر قتل، بندہ بیراگی کی سرکردگی میں سکھوں کی بغاوت۔

۱۷۱۲ء بہادر شاہ اول کی وفات اور جہاندار شاہ کا سریر آرائے تخت ہونا۔

۱۷۱۳ء جہاندار شاہ کی معزولی اور فرخ سیر کا تختِ طاؤس پر بیٹھنا۔ سید برادران کا عروج

۱۷۱۴ء ہولی کے تہوار کے موقعہ پر احمد آباد میں ہندو مسلم فساد۔ مرہٹہ سردار بالاجی باجی راؤ کا پیشوا مقرر ہونا۔

۱۷۱۵ء اجیت سنگھ کا گجرات کا گورنر مقرر ہونا۔ انگریز سرجن ولیم ہملٹن کا مغل بادشاہ فرخ سیر کا آپریشن کرنا

۱۷۱۹ء فرخ سیر کی معزولی اور رفیع الدرجات کی تخت نشینی۔ سید برادران کی مدد سے محمد شاہ رنگیلا کا تختِ طاؤس پر متمکن ہونا۔

۱۷۲۰ء نظام الملک کا دکن چلا جانا۔ سید حسین علی خاں کا قتل۔ دہلی میں زلزلہ۔ سید

Marfat.com

عبداللہ خاں کی محمد شاہ کے ہاتھوں شکست اور سید برادران کا زوال، پیشوا بالاجی وبیشوا ناتھ کی وفات۔

۱۷۲۵ء دکن میں نظام الملک کا خود مختار ہونا۔ مرہٹوں کا گجرات سے چوتھ وصول کرنا ساحل مالابار پر ماہی کے مقام پر فرانسیسی تجارتی مرکز کا قیام۔

۱۷۳۰ء نادر شاہ کے ہاتھوں شاہ ایران طہماسپ کا قتل۔

۱۷۳۰ء نادر شاہ کا ایران کے تخت پر متمکن ہونا۔

۱۷۳۹ء برصغیر پر نادر شاہ کا حملہ، دہلی کا قتل عام۔ کاریکل کے مقام پر فرانسیسی تجارتی مرکز کا قیام۔

۱۷۴۰ء مرہٹہ سردار باجی راؤ کی وفات، علی وردی خاں کا بنگال، بہار اور اڑیسہ کا خود مختار نواب بننا۔

۱۷۴۸ء محمد شاہ رنگیلا کی وفات۔ احمد شاہ کا تخت نشین ہونا۔ برصغیر پاک و ہند پر احمد شاہ ابدالی کا پہلا حملہ۔

۱۷۵۳ء علی وردی خاں کی وفات کے بعد سراج الدولہ کا بنگال کے تخت پر متمکن ہونا۔ رگھوجی بھوسلہ کی وفات۔

۱۷۵۶ء مرہٹہ سردار کا اوجِ کمال۔ یورپ میں ہفت سالہ جنگ کا آغاز۔ حادثہ بلیک ہول۔

۱۷۵۷ء انگریزوں اور سراج الدولہ کے مابین جنگ پلاسی۔

۱۷۶۱ء پانی پت کی تیسری لڑائی۔ برصغیر میں فرانسیسی اقتدار کا خاتمہ۔ شاہ ولی اللہ کی وفات۔

۱۷۶۴ء جنگ بکسر۔

۱۸۳۷ء بہادر شاہ ظفر کا سریر آرائے تخت ہونا۔

۱۸۵۷ء جنگِ آزادی۔

۱۸۵۸ء بہادر شاہ ظفر کی معزولی اور رنگون میں جلاوطنی۔

Marfat.com

امتحانی سوالات

۱۔ برصغیر پاک و ہند پر نادر شاہ کے حملے کی وجوہات اور واقعات بیان کرتے ہوئے اس کے نتائج و اثرات پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ پانی پت کی تیسری لڑائی کا حال بیان کیجیے۔ نیز مرہٹوں کی شکست کے اسباب بیان کیجیے۔

۳۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کو ایسی شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا کہ جس کے بعد وہ سنبھل نہ سکے اور پاک و ہند میں رام راجیہ کے قیام کا خواب ہمیشہ کے لئے منتشر ہو گیا۔ تشریح کیجیے۔

۴۔ مغل سلطنت کے زوال کے اسباب کا مختصراً جائزہ لیجیے۔

۵۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیے:۔

(ا) شاہ عالم ہمایوں شاہ اول (ب) سید برادران

(ج) نظام الملک آصف جاہ (د) محمد شاہ رنگیلا

(ہ) برہان الملک مجیب الدولہ (س) بہادر شاہ ظفر

Marfat.com

دسواں باب

برِصغیر میں اہلِ یورپ کی آمد

ازمنۂ قدیم سے ہی برصغیر پاک و ہند اور یورپ کے مابین تجارتی تعلقات قائم تھے۔ کیونکہ پاک و ہند کی مصنوعات اور دیگر اشیاء کی یورپی منڈیوں میں بہت مانگ تھی۔ برصغیر پر سکندرِ اعظم کے حملے سے ان تعلقات میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ بعدازاں رومن فرمانرواؤں نے اپنی فتوحات سے ان تجارتی تعلقات کو مزید استوار کیا۔ بابل اور نینوا کے علاوہ بحیرۂ روم کے ساحلوں پر واقع افریقی، ایشیائی اور یورپی شہر، برصغیر کی مصنوعات اور مالِ تجارت کی اہم منڈیاں شمار ہوتے تھے۔ یہ مال تجارت مندرجہ ذیل تین راستوں سے یہاں پہنچتا تھا۔

قدیم تجارتی شاہراہیں

۱۔ شمالی برصغیر سے مالِ تجارت کابل اور قندھار کے راستے بلخ، سمرقند اور بحیرۂ کیسپین سے ہوتا ہوا بحیرۂ اسود تک پہنچ جاتا تھا۔

۲۔ مالِ تجارت کابل یا قندھار سے ایران اور پھر دمشق یا سکندریہ پہنچایا جاتا تھا۔ مصر، شام اور ایشیائے کوچک کے ساحلی شہر برصغیر اور یورپ کے مابین تجارتی مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔

۳۔ برصغیر پاک و ہند کے جنوبی اور مرکزی علاقوں کے علاوہ مشرقی حصوں کی تجارت زیادہ تر بحری راستوں سے ہوتی تھی۔ شمال مشرقی مون سون ہواؤں کے موسم میں برصغیر کے تجارتی جہاز کوچین، کالی کٹ، گوا اور گجرات کی بندرگاہوں سے روانہ ہوتے اور تیزی سے سفر کرتے ہوئے خلیج فارس میں داخل ہو جاتے اس راستے کی دو شاخیں تھیں:

(ا) مالِ تجارت خلیج فارس کے راستے بصرہ اور بغداد پہنچتا اور وہاں سے دمشق اور مصر سے ہوتا ہوا وینس اور جنیوا پہنچ جاتا۔

(ب) مالِ تجارت خلیج فارس سے عدن پہنچ جاتا جہاں سے مصر کی بندرگاہ سکندریہ سے ہوتا ہوا وینس اور جنیوا پہنچا دیا جاتا اور وہاں سے یورپ کی تمام منڈیوں میں بھیج دیا جاتا۔

ساتویں صدی عیسوی میں جب عربوں نے ان تمام ممالک پر قبضہ کر لیا جن سے مذکورہ بالا تجارتی راستے سے گذرتے تھے تو انہیں مشرق و مغرب کی تجارت کی اجارہ داری بھی حاصل ہو گئی۔ اب

Marfat.com

عرب تاجر برِصغیر پاک و ہند اور مشرقی ممالک سے مالِ تجارت لاتے اور وینس اور جینوا کے تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے اس اجارہ داری کو اہلِ یورپ حسد و رقابت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور برِصغیر سے براہِ راست تجارتی تعلقات قائم کرنے کے متمنی تھے لیکن ۱۴۵۳ء میں جب عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور بعد ازاں مشرقی یورپ کے بیشتر علاقوں کے علاوہ شام جزیرہ نمائے عرب اور مصر کو بھی زیرِ نگیں کر کے بحیرۂ روم کے مالک بن گئے تو اہلِ یورپ کا قدیم راستوں کے ذریعہ پاک و ہند کے ساتھ تجارتی تعلقات استوار کرنے کا خواب منتشر ہو کر رہ گیا۔

اب ان کے لئے صرف دو صورتیں تھیں یا تو وہ برصغیر کے گرم مصالحہ، موتی، جواہرات اور سونے چاندی کی نفع بخش تجارت سے قطع تعلق کر لیتیں یا برصغیر پاک و ہند کا ایسا متبادل بحری راستہ دریافت کرتیں جو ترکوں کے تسلط سے قطعی آزاد ہو۔ اس پر اسلام سے دشمنی اور عیسائیت کی اشاعت کے جذبہ نے جغرافیائی دریافتوں کی جانب ان کے جذبہ و شوق کو مزید ابھارا۔[1]

نیا بحری راستہ

یورپ میں تحریک احیائے علوم کے آغاز سے اہلِ یورپ کی ذہنی بیداری کا آغاز ہوا۔ اور وہ تحقیق و طلب آزمائی کے جذبہ سے سرشار ہو کر نئی دریافتوں کی جستجو میں لگ گئے۔ ان کا یہی جذبہ بالآخر نئے بحری راستے کی دریافت کا موجب بنا۔ اس سلسلے میں ہسپانیہ اور پرتگال پیش پیش رہے۔ پرتگال کے شہزادہ ہنری (۱۳۹۴ء تا ۱۴۶۰ء) جسے یورپی تاریخ میں جہاز ران بادشاہ بھی کہا جاتا ہے نے اس میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اس نے نہ صرف جدید سائنسی بنیادوں پر جہاز رانوں کی تربیت کے لئے ایک سکول قائم کیا بلکہ دور دراز سمندروں میں بحر پیمائی کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ نتیجۃً ۱۴۴۴ء میں پرتگال کے جہاز رانوں نے خلیج گنی میں پہنچ کر حبشیوں کا ملک دریافت کیا۔ ۱۴۸۷ء میں بارتھولومیو ڈائز نامی ایک پرتگیزی جہاز ران براعظم افریقہ کے انتہائی جنوبی مقام راس امید تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس سلسلہ میں ہسپانیہ کی ملکہ ازابیلہ (ISABELLA) کی سرپرستی میں کرسٹوفر کولمبس نے جو جینوا کا باشندہ تھا۔ پاک و ہند کا بحری راستہ دریافت کرنے کی جدوجہد میں امریکہ دریافت کر لیا۔ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو جزیرہ بہاماس (BAHAMAS) پہنچا جس کا نام اس نے جزیرہ سان سالوڈیڈر (SAN SALVADOR) رکھا بالآخر تین مزید سمندری سفروں کے بعد وہ شمالی امریکہ پہنچ گیا۔ جس کو اس نے برصغیر پاک و ہند سمجھا۔ لیکن

---

[1] "شارٹ ہسٹری آف پاکستان" جلد چہارم، صفحہ ۱۰

Marfat.com

اس کی موت کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ اس نے برِصغیر کی بجائے ایک نیا برِاعظم دریافت کیا ہے جس کا نام فلورنٹائن (جرمنی) کے ایک جہاز ران امریگو ویسپوکی (AMERIGO VISPUCCI) کے نام پر امریکہ رکھا گیا۔ اسی نے سب سے پہلے اس نئے برِاعظم کے جغرافیائی حالات مرتب کئے۔

۱۴۹۷ء میں شہنشاہ عمانوائیل کے عہدِ حکومت میں ایک پرتگیزی جہاز ران واسکوڈے گاما چار جہازوں کی معیت میں افریقہ کے راستے برصغیر کا نیا بحری راستہ معلوم کرنے کی غرض سے روانہ ہوا۔ وہ ایک جہاز ران کی مدد سے راس امید کا چکر کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ بالآخر واسکوڈے گاما نے برصغیر کا نیا بحری راستہ دریافت کر لیا اور ۲۷۔ مئی ۱۴۹۸ء کو برصغیر کی مشہور بندرگاہ کالی کٹ میں لنگر انداز ہوا۔

راس امید (افریقہ) کے راستے برصغیر کے نئے بحری راستے کی دریافت نے نہ صرف اہل یورپ پر مشرق کے دروازے کھول دیئے بلکہ اس سے ذرائع آمدورفت اور تجارتی دنیا میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بالآخر یہی واقعہ برصغیر کی سیاسیات میں اہل یورپ کی مداخلت اور برطانوی راج کے قیام کا موجب بنا۔

پرتگیزوں نے سب سے پہلے برصغیر کا بحری راستہ دریافت کیا اور انہوں نے ہی پہلے پہل برصغیر سے تجارتی روابط قائم کئے۔ واسکوڈے گاما نے مقامی ہندو راجہ زمبورن سے تجارتی مراعات حاصل کر کے ساحلی علاقے میں کئی ایک نوآبادیات قائم کیں۔ ۱۴۹۹ء میں عرب تاجروں کی مخالفت کے باوجود برصغیر میں تین ماہ رہنے کے بعد واسکوڈے گاما برصغیر کے مال سے مالا مال ہو کر واپس وطن لوٹا۔

۱۵۰۱ء میں واسکوڈے گاما بارِ دیگر پاک و ہند میں آیا اور تجارتی نوآبادیات قائم کر کے ۱۵۰۳ء میں واپس ہوا۔ شروع میں پرتگیزوں کو عرب اور ایرانی تاجروں کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے مخالفین کو نیچا دکھا دیا۔ پرتگیزوں نے اپنے اقتدار کی خاطر اپنے محسن میزبان راجہ زمبورن کو شکست دی اور جلد ہی کالی کٹ۔ کوچین، گوا، دمن، دیو، سالسٹے بسین، بمبئی، سیلون، چاٹگام اور ہگلی جیسے اہم مقامات پر اپنے تجارتی مراکز قائم کر لئے۔ راجہ زمبورن کو شکست دینے کے بعد اب ساحلِ مالابار پر کوئی ایسی قوت نہ تھی جو ان کا مقابلہ کر سکتی۔ چنانچہ برصغیر میں پرتگیزوں کا اقتدار قائم ہو گیا اور وہ برصغیر کی تجارت کے واحد مالک بن گئے۔ پوپ آف روم نے بھی مشرقی ممالک کی تجارتی اجارہ داری کا پروانہ پرتگیزوں کو سونپ دیا چنانچہ دوسری یورپی اقوام نے پوپ کے حکم کی خلاف ورزی کے ڈر سے ان کے مقابل آنے کی جرأت نہ کی اور اس طرح تقریباً ایک صدی تک مشرقِ بعید کی تجارت پر پرتگیزوں کی اجارہ داری قائم

Marfat.com

ہوگئی - پرتگیزی حکومت نے ۱۵۰۵ء میں اپنے مشرقی مقبوضات پہ ڈی ایلمیڈا کو گورنر مقرر کیا۔

ڈی ایلمیڈا
۱۵۰۵ تا ۱۵۰۹ء

ڈی ایلمیڈا برصغیر میں پرتگیزی مقبوضات کا پہلا گورنر تھا اسے پرتگیزی بحری قوت کا بانی قرار دیا جاتا ہے - ڈی ایلمیڈا نے عرب تاجروں کو دیو کے مقام پر شکست دے کر پاک و ہند کے سمندروں میں پرتگیزی قوت قائم کی - اس نے ۱۵۰۹ء میں مصریوں سے لڑتے ہوئے وفات پائی۔

البوقرق
۱۵۰۹ تا ۱۵۱۵ء

ڈی ایلمیڈا کے بعد البوقرق پاک و ہند میں پرتگیزی مقبوضات کا گورنر مقرر ہوا اسے برصغیر میں پرتگیزی اقتدار کا معمار شمار کیا جاتا ہے - اس نے اپنے دورِ اقتدار میں نہ صرف پرتگیزی مقبوضات کو وسعت دی اور اہم مقامات پر قلعے تعمیر کروائے بلکہ خلیج فارس میں بھی پرتگیزی اقتدار قائم کیا - البوقرق نے گوا کو پرتگیزی مقبوضات کا دارالخلافہ قرار دیا اس نے اپنی قوم کو برصغیر میں مستقل رہائش رکھنے اور مقامی لوگوں کے ہاں شادیاں کرنے کا مشورہ دیکر پرتگیزی اقتدار کو مزید مستحکم بنایا - البوقرق محض ایک عظیم فاتح ہی نہ تھا بلکہ اعلیٰ درجے کا منتظم بھی تھا - اس نے پرتگیزی مقبوضات میں بہتر نظام سلطنت نافذ کیا اور مقامی لوگوں کو پرتگیزی حکومت میں ملازمتیں دیں - اس کا عہد برصغیر میں پرتگیزی اقتدار کے انتہائی عروج کا دور تھا - ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اس نے ستی کی ظالمانہ رسم کو ممنوع قرار دیا لیکن وہ مسلمانوں کا بڑا دشمن تھا ان کے ساتھ نہ صرف سخت سلوک روا رکھتا تھا بلکہ انہیں جبراً عیسائی بناتا تھا۔
البوقرق نے ۱۵۱۵ء میں وفات پائی اور گوا میں دفن ہوا۔

پرتگیزوں کا زوال

البوقرق کے بعد بھی پرتگیزی اقتدار عروج کی منازل طے کرتا رہا اور پرتگیزوں نے نہ صرف پاک و ہند کی تجارت سے خوب دولت پیدا کی بلکہ اپنے حریفوں ایرانیوں، عربوں اور ترکوں کو بھی شکستِ فاش دی اور ہرمز ملاکا (ملایا) سماٹرا اور جاوا وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا - انہوں نے گرم مصالحہ کی تجارت سے خوب دولت پیدا کی - چنانچہ ان کے دارالخلافہ لزبن میں ہن برسنے لگا - مگر بعد ازاں وہ حد سے زیادہ لالچی بن گئے اور اپنے اصلی مقصد (برصغیر میں پرتگیزی اقتدار کے قیام) سے ہٹ کر انہوں نے سمندری قزاقی کا پیشہ اپنا لیا - اس سے برصغیر پاک و ہند میں پرتگیزی حکومت قائم کرنے کا خواب منتشر ہو کر رہ گیا - ۱۵۲۶ء میں برصغیر میں مغل حکومت کے قیام ۱۵۸۰ء میں پرتگال اور سپین کے سیاسی اتحاد سے برصغیر پاک و ہند میں پرتگیزی اقتدار روبہ زوال ہوا - پرتگیزی اقتدار کے زوال پذیر ہونے کے اسباب حسب ذیل تھے :-

۱- برصغیر پاک و ہند میں پرتگیزی اقتدار کے زوال کا اہم اور فوری سبب پرتگال اور سپین کا

Marfat.com

سیاسی اتحاد تھا جس کی وجہ سے ۱۵۸۰ میں پرتگال کامل طور پر شاہ سپین فلپ ثانی کے ماتحت ہو گیا حکومت سپین کا زیادہ تر مفاد امریکی نوآبادیات سے وابستہ تھا جس کی وجہ سے برصغیر میں پرتگیزی مفادات بے توجہی کا شکار ہو گئے۔ اس اتحاد کے بعد برصغیر میں پرتگیزی مقبوضات پر ہسپانوی افسر مقرر کیے گئے جنہیں پرتگیزی مفاد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس حکمت عملی سے پرتگیزی مقبوضات بالکل بے حیثیت ہو کر رہ گئے۔

۲۔ البوقرق کی موت کے بعد پرتگیزی حکومت نے کسی لائق آدمی کو برصغیر میں پرتگیزی مقبوضات کی دیکھ بھال کے لئے نہ بھیجا۔ اس سے پرتگیزی مقبوضات میں نظم و نسق متاثر ہوا اور ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ البوقرق کے تمام جانشین نااہل اور رشوت خور واقع ہوئے تھے انہوں نے قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینا شروع کر دیا تھا۔

۳۔ پرتگیزوں کا مذہبی تعصب بھی ان کے زوال کا باعث بنا۔ پرتگیزی مقامی لوگوں کو زبردستی عیسائی بناتے تھے۔ جس کی وجہ سے مقامی لوگ ان سے متنفر ہو گئے۔

۴۔ پرتگیز بڑے ظالم اور خونخوار تھے۔ مقامی لوگوں سے ان کا سلوک ظالمانہ تھا۔ گرم مصالحے کی تجارت سے انہوں نے خوب دولت پیدا کی تھی۔ دولت کی ہوس نے انہیں اس حد تک لالچی بنا دیا تھا کہ انہوں نے سمندری قزاقی کا پیشہ اپنا لیا۔ چنانچہ وہ حاجیوں کے جہازوں کو لوٹ لیتے اور ساحلی علاقوں سے عورتوں اور بچوں کو اغوا کرتے اور انہیں بیرونی ممالک میں جا کر فروخت کر دیتے تھے۔

۵۔ پرتگیزوں نے برصغیر میں ہندو عورتوں سے شادیاں کرنی شروع کر دیں جس کی وجہ سے ان میں نسلی تنزل شروع ہوا۔ چنانچہ ان میں پہلی جیسی اہلیت باقی نہ رہی۔ نئی پود تساہل پسند، عیش و عشرت کی دلدادہ اور عدسے زیادہ لالچی تھی۔ نیز ان میں روایتی جوانمردی، جفاکشی، مہم جوئی اور جذبۂ قومیت کا فقدان تھا۔

۶۔ ۱۵۲۶ء میں برصغیر میں مغل حکومت کے قیام نے پرتگیزی اقتدار کے زوال کو ناگزیر بنا دیا۔ مغلیہ حکومت مضبوط اور مستحکم تھی چنانچہ مغل حکومت نے بہت جلد پورے برصغیر کو زیر نگین کر لیا۔

۷۔ سترھویں صدی کے آغاز میں یورپ کی دوسری قومیں ولندیز، فرانسیسی اور انگریز جو پرتگیزوں سے زیادہ طاقتور تھیں۔ برصغیر میں تجارت کی غرض سے آنے لگیں ان کی آمد سے برصغیر میں پرتگیزی اقتدار زوال پذیر ہونا شروع ہو گیا۔ چنانچہ ۱۶۰۴ء میں ولندیزیوں نے پرتگیزوں سے امبوائنہ چھین لیا۔ ۱۶۲۲ء میں ایرانیوں نے ہرمز پر قبضہ کر کے انہیں،

Marfat.com

خلیج فارس سے نکال باہر کیا۔ ۱۶۴۱ء میں ولندیزیوں نے نہ صرف ان سے ملاکا (ملایا) چھین لیا بلکہ ۱۵۵۶ء میں لنکا سے بھی انہیں مار بھگایا۔

۸۔ پرتگیزوں کی لوٹ کھسوٹ اور ظالمانہ مذہبی پالیسی کے باعث ۱۶۳۱ء میں مغل شہنشاہ شاہجہان نے ہگلی کو تاخت و تاراج کر کے پرتگیزوں کی طاقت کو کچل کر رکھ دیا۔ بعد ازاں انہیں انگریزوں نے بنگال سے نکال باہر کیا۔

۹۔ ۱۷۳۹ء میں مرہٹوں نے سلسین پر قبضہ کر کے پرتگیزی اقتدار پر کاری ضرب لگائی۔ حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی کے دوران ہی دیگر یورپی اقوام نے ایک ایک کر کے تمام پرتگیزی مقبوضات پر قبضہ کر لیا اور ساحلِ مالابار پر صرف نین مقامات گوا، دمن اور دیو ان کے قبضے میں رہ گئے۔ حتیٰ کہ ۱۹۔ دسمبر ۱۹۶۱ء کو نہرو وزارت کے دوران بھارت نے پرتگیزوں کے خلاف پولیس ایکشن کر کے برصغیر سے پرتگیزی اقتدار کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا۔

ولندیزی

ولندیزی (اہل ہالینڈ) یورپ کی پہلی قوم تھی جس نے مشرقی تجارت میں پرتگیزوں کی اجارہ داری کو ختم کرنے کی جرأت کی۔ سولھویں صدی کے ربع آخر میں ولندیزیوں نے شاہ فلپ ثانی کے عہد میں ہسپانیہ کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں پر سے اتار پھینکا۔ آزادی کے بعد ان کی بحری طاقت میں زبردست اضافہ ہوا۔ اس سے ان کے دلوں میں برصغیر سے تجارت کے میدان میں طالع آزمائی کا ولولہ و عزم پیدا ہوا۔

۱۵۹۶ء میں کارنیلس آوٹے مین چار جہازوں کی معیت میں راس امید کے راستے پرتگیزوں کی مخالفت کے باوجود جاوا پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۵۹۸ء میں کئی مزید تجارتی مہمیں برصغیر پہنچیں ابتدائی مہمات میں کامیابی کی بنا پر بیشمار ولندیزی تجارتی کمپنیاں معرضِ وجود میں آئیں۔ ۱۶۰۲ء میں ان تمام ولندیزی تجارتی کمپنیوں کو ڈچ انڈیا کمپنی میں مدغم کر دیا گیا۔ اسے حکومت ہالینڈ کی سرپرستی حاصل تھی۔ ولندیزی گرم مصالحہ کی تجارت میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے لہٰذا ان کی زیادہ تر توجہ جزائر ملایا پر مرکوز رہی۔ تاہم انہوں نے برصغیر پاک و ہند میں بھی سورت، کالی کٹ، کوچین سرنگاپٹم، سیلون (لنکا) چنسرہ، قاسم بازار اور پٹنہ میں تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ چنسرہ (بنگال) کا مقام ان کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ انہوں نے بحرِ ہند کے پرتگیزی مقبوضات بھی چھین لئے اور اسمبوائنہ جاوا، ملاکا، سماٹرا اور دوسرے جزیروں پر تسلط جما لیا۔

انگریز اور ولندیزی مشرق میں بغرضِ تجارت دوستوں کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے۔ ہر دو اقوام کے لوگ کیتھولک ہسپانیہ کے خلاف پروٹسٹنٹ حقائق کے علمبردار تھے لیکن ۱۶۲۳ء میں دونوں ملکوں کے درمیان مخالفت پیدا ہو جانے کی وجہ سے تعلقات کشیدہ ہو گئے ولندیزیوں

Marfat.com

نے امبوائنہ کے مقام پر ۹ انگریزوں، ۹ جاپانیوں اور ایک پرتگیز کو گرفتار کر کے ہلاک کر دیا۔ یہ واقعہ تاریخ میں قتلِ امبوائنہ کے نام سے مشہور ہے اس پر یورپ میں انگلستان اور ہالینڈ کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ ازاں بعد ۱۶۵۴ء میں صلح ہوئی تو ہالینڈ کو پچاس ہزار پونڈ انگلستان کو بطور تاوان ادا کرنا پڑے سانحہ امبوائنہ کے بعد انگریزوں کو جزائر ملایا سے نکلنا پڑا۔ مجبوراً انگریزوں کو برصغیر پاک و ہند میں اپنی نوآبادیات کے فروغ پر اپنی توجہ مرکوز کرنی پڑی بعدازاں ان کے اسی اقدام نے انہیں مشرق کی ایک عکمران قوت بنا دیا۔ اٹھارویں صدی میں ولندیزیوں کی تجارت کو زوال آنا شروع ہوا۔ دریں اثنا برصغیر پاک و ہند میں برطانوی اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ پاک و ہند میں بیشتر ولندیزی مقبوضات انگریزوں کے تسلط میں آ گئے تاہم جاوا اور سماٹرا پر ولندیزیوں کا تسلط قائم رہا۔

ڈینز اہل ڈنمارک جو عموماً جہازران تھے نے بھی دیگر یورپی اقوام کی طرح نفع بخش مشرقی تجارت سے فائدہ اٹھانے کا عزم کیا۔ چنانچہ ۱۶۱۶ء میں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور اس امید کے راستے برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے۔ ۱۶۲۰ء میں انہوں نے مشرقی ساحل پر ضلع تنجور میں ٹرانکوبار کے مقام پر تجارتی مرکز قائم کیا۔ ان کا اہم ترین مرکز بنگال میں سیرام پور تھا جسے انہوں نے ۱۷۵۵ء میں نواب علی وردی کے عہد میں قائم کیا۔ اگرچہ برصغیر میں اہل ڈنمارک کی تجارت فروغ نہ پا سکی۔ تاہم ان کے پادریوں نے عیسائیت کی تبلیغ میں اہم کردار ادا کیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۴۵ء میں انہوں نے اپنے تجارتی مراکز انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔

جرمن یورپ کی دیگر اقوام کی طرح جرمنوں نے بھی مشرقی تجارت میں دلچسپی لی۔ انہوں نے ہگلی میں تجارتی کوٹھی قائم کی۔ ۱۷۴۴ء میں جرمن تاجروں کا ہگلی کے فوجدار سابٹ جنگ سے محاصل کی ادائیگی پر جھگڑا ہو گیا۔ اور انہوں نے ایک رات قلعہ ہگلی پر حملہ کر دیا لیکن ناکام ہو گئے۔ اس پر فوجدار کے حکم سے نائب فوجدار سوجان سنگھ جرمنی تجارتی کوٹھی پر حملہ آور ہوا لیکن پسپا ہوا۔ اس پر نواب علی وردی خاں نے اپنے جرنیل میر جعفر کو جرمنوں کی گوشمالی پر مامور کیا۔ میر جعفر نے جرمنوں کی تجارتی کوٹھی کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن جرمنوں نے اپنے جہازوں میں بیٹھ کر راہ فرار اختیار کی۔ اس کے بعد بنگال میں جرمن تجارت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

انگریز ۱۵۸۸ء میں انگریزوں کے بحری بیڑے نے سپین کے بحری بیڑے آرمیڈا کو تباہ و برباد کیا تو انگریزوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور انہوں نے مشرقی ممالک کی تجارت سے مستفید ہونے کا عزم صمیم کیا چنانچہ ۱۶۰۰ء میں لندن کے چند بااثر تاجروں نے ملکہ الزبتھ سے برصغیر پاک و ہند کے ساتھ تجارت کرنے کی اجازت حاصل کر کے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی اور چند جہاز مشرق کی جانب روانہ کئے گئے۔ ابتدا میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی زیادہ تر توجہ ملایا کی طرف

Marfat.com

تھی تاکہ گرم مصالحہ کی تجارت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن وہاں اہل ہالینڈ (ولندیزیوں) کی سخت مخالفت کی بنا پر انہوں نے پاک و ہند کے ساتھ تجارت کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۶۰۸ء میں کیپٹن ہاکنز انگلستان کے بادشاہ جیمز اول کا خط لے کر برصغیر میں مغل بادشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) کے دربار میں حاضر ہوا۔ مغل شہنشاہ نے ان کی درخواست پر سورت کے مقام پر انگریز تاجروں کو تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت عطا کی۔ گو کچھ عرصہ کے بعد پرتگیزوں کی سازش کی بنا پر یہ اجازت منسوخ کر دی گئی۔ ۱۶۱۲ء میں انگریزوں نے سورت کے مقام پر پرتگیزوں کو شکست دے کر اپنے وقار اور دبدبہ میں اضافہ کیا۔

۱۶۱۵ء میں سر تھامس رو جیمز اول شاہ انگلستان کے سفیر کی حیثیت سے برصغیر میں وارد ہوا اور کئی سال تک جہانگیر کے دربار میں رہا۔ اس کی کوشش سے برطانوی تاجروں کے لئے تجارتی مراعات حاصل ہو گئیں اور سورت انگریزوں کے تجارتی مقبوضات کا صدر مقام قرار پایا۔ ۱۶۳۲ء میں انگریز تاجروں نے مسولی پٹم میں اپنا تجارتی مرکز قائم کیا۔ ازاں بعد تھوڑے ہی عرصہ میں مدراس بالاسور، ہری ہرپورہ کے مقامات پر تجارتی مراکز قائم کر لئے۔

شاہجہان (۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء) کے عہد میں انگریزوں کو بنگال میں بھی عمل دخل حاصل ہو گیا۔ ۱۶۴۴ء میں شاہجہان کی بیٹی جہاں آرا بیگم کپڑوں میں آگ لگ جانے کے باعث سخت زخمی ہوئی تو ایک انگریز ڈاکٹر بائٹن نے شہزادی کا کامیاب علاج کیا۔ شاہجہان نے خوش ہو کر اسے انعام سے نوازنا چاہا تو جذبۂ قوم پرستی سے سرشار ڈاکٹر نے اپنی ذات کے لئے انعام حاصل کرنے کی بجائے شاہجہان سے مطالبہ کیا کہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں بلا محصول تجارت کی اجازت دی جائے۔ نیز بنگال میں تجارتی مراکز قائم کرنے اور ہگلی تک انگریزی جہازوں کو آنے کی اجازت عطا کی جائے۔ شاہجہان نے ڈاکٹر بائٹن کی خواہش کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں تجارتی مراعات عطا کیں۔ بنگال کے صدر مقام راج محل میں ڈاکٹر بائٹن نے وہاں کے گورنر شاہ شجاع کے حرم کی ایک عورت کا بھی کامیاب علاج کیا۔ اس پر شاہی فرمان کے نفاذ میں شاہ شجاع نے پورا تعاون کیا۔ ۱۶۶۱ء میں شاہِ انگلستان چارلس دوم نے بھی بمبئی کا شہر دس پونڈ سالانہ کرایہ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کیا یہ شہر اسے پرتگال کی طرف سے ملکہ کیتھرائن کے جہیز میں ملا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) کے عہد میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نامساعد حالات سے دوچار ہوئی۔ کمپنی کے مقبوضات کے گورنر سرجان چائلڈ نے شائستہ خاں گورنر بنگال سے ناراض ہو کر حاجیوں کے جہازوں کو لوٹا تو مغل حکومت نے انگریزوں کے خلاف سخت

Marfat.com

نادیہی کارروائی کی۔ بالآخر ایسٹ انڈیا کمپنی نے سترہ ہزار پونڈ تاوان جنگ ادا کر کے اورنگزیب سے معافی نامہ حاصل کیا۔ ۱۶۹۰ء میں کمپنی نے موجودہ شہر کلکتہ کی جگہ ایک کارخانہ قائم کیا۔ جس کی بعدازاں قلعہ بندی کی گئی اس کا نام فورٹ ولیم رکھا گیا۔

مغل بادشاہ فرخ سیر (۱۷۱۳ تا ۱۷۱۹ء) کے عہدِ حکومت میں ایک انگریز ڈاکٹر ہملٹن نے بادشاہ کا علاج کر کے تین ہزار سالانہ کی معمولی رقم کے عوض سارے بنگال میں کمپنی کے لئے آزادانہ تجارت کا فرمان حاصل کیا۔ ۱۶۹۸ء میں نفع بخش مشرقی تجارت میں کمپنی کی اجارہ داری سے حسد کرتے ہوئے چند دیگر انگریز تاجروں نے ایک نئی کمپنی قائم کر لی۔ چنانچہ ایک عرصہ تک دونوں کمپنیوں کے مابین سخت تجارتی مقابلہ رہا۔ بالآخر ۱۷۰۸ء میں حکومت برطانیہ نے دونوں کمپنیوں کو آپس میں ملا دیا۔ اور نئی کمپنی کا نام متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی رکھا گیا۔ اس سے کمپنی اپنے خوشحالی کے دور میں داخل ہوئی اور جلد ہی کمپنی نے سورت، بمبئی۔ احمد آباد۔ بروچ۔ کالی کٹ۔ مدراس سینٹ ڈیوڈ۔ فورٹ ولیم (کلکتہ) ڈھاکہ۔ بالاسور۔ مسولی پٹم۔ ہگلی اور پٹنہ جیسے مقامات پر تجارتی مراکز قائم کر لئے۔

فرانسیسی

فرانسیسی تاجر اگرچہ طویل عرصہ سے برصغیر پاک و ہند کے ساتھ براہ راست تجارت کے خواہشمند تھے۔ مگر وہ برصغیر میں سب سے آخر پہنچے جین بپٹسٹ ٹیورنیئر (JEAN BAPTISTE TAVERNIER) اور فرینکوئس برنیئر جیسے فرانسیسی تاجر انفرادی حیثیت سے سترھویں صدی کے وسط میں برصغیر میں وارد ہوئے۔ ۱۶۴۰ء تا ۱۶۶۶ء کے دوران ٹیورنیئر نے بغرض تجارت پانچ بار برصغیر کا سفر اختیار کیا۔ سب سے پہلے ۱۶۴۲ء میں فرانس کے وزیر ریشلو (RICHELIEU) کو مشرق میں تجارت کی غرض سے باقاعدہ ایسٹ انڈیا تجارتی کمپنی قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ بالآخر ۱۶۶۴ء میں فرانس کے بادشاہ لوئیس چہارم اور وزیر کولبرٹ (COLBERT) کے ایما پر فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی (COMPAGNIE DES INDES ORIENTALES) قائم کی گئی۔ فرانسیسی تاجروں نے جلد ہی ۱۶۶۸ء میں سورت اور ۱۶۶۹ء میں مسولی پٹم میں تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ ازاں بعد ۱۶۷۳ء میں فرانسس مارٹن نے مدراس کے نزدیک پانڈیچری کے مقام پر ایک نوآبادی قائم کی جس نے جلد ہی ترقی کر کے ایک شہر کی حیثیت اختیار کر لی، جو فرانسیسی مقبوضات کا صدر مقام قرار پایا۔ ۱۶۷۴ء میں بنگال میں چندرنگر کے مقام پر تجارتی کوٹھی قائم کی گئی۔ اس طرح فرانسیسیوں نے ۱۷۲۱ء میں ماریشش۔ ۱۷۲۵ء میں

Marfat.com

ساحل مالابار پر ماہی اور ۱۷۳۹ء میں کاریکل کے مقام پر تجارتی مراکز قائم کرلئے اگرچہ ابتدا میں فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ولندیزیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے جرأت مندی سے اپنی تجارت کو جاری رکھا اور تجارتی لحاظ سے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حریف بن گئی۔

۱۷۳۵ء میں ڈیوما فرانسیسی مفوضات کا گورنر بن کر آیا۔ اس نے دکن میں دیسی حکمرانوں سے دوستانہ مراسم قائم کرلئے تاکہ برصغیر میں فرانسیسی اقتدار آسانی سے قائم ہو سکے۔ اس کے بعد ۱۷۴۲ء میں اس کے جانشین ڈوپلے نے انگریزوں کو مات دینے اور فرانسیسی اقتدار کے مقام کے لئے اپنی جدوجہد کو تیز تر کر دیا اس پر جلد ہی دونوں کمپنیوں کی تجارتی رقابت نے سیاسی رقابت کی شکل اختیار کرلی جو انجام کار کناٹک کی لڑائیوں پر منتج ہوئی۔

امتحانی سوالات

۱۔ مغربی ممالک اور برصغیر پاک و ہند کے درمیان قدیم تجارتی شاہراہیں کونسی تھیں اور نئے بحری راستے کی دریافت اور اس کی اہمیت پر تبصرہ کیجئے۔

۲۔ برصغیر میں پرتگیزوں کے عروج و زوال کا مختصر حال قلمبند کیجئے۔

۳۔ پاک و ہند میں یورپی اقوام کی آمد اور ان کی نوآبادیات پر روشنی ڈالئے۔

۴۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کی تاریخ مفصل بیان کیجئے۔

۵۔ برصغیر میں فرانسیسیوں کی آمد اور فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کا حال قلمبند کیجئے۔

۶۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھئے۔

(ا) واسکوڈے گاما۔ (ب) البوقرق۔

(ج) ولندیزیوں کی برصغیر میں آمد۔ (د) ڈینز (اہل ڈنمارک)

Marfat.com

گیارھواں باب

مُغلیہ عہد کی ثقافت

"مغلوں کا معاشرہ اعلیٰ پیمانے پر ثقافت پرور اور ترقی پذیر تھا۔ شہنشاہ، شہزادے، شہزادیاں اور امرا اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور ثقافت پرور تھے۔ انہوں نے علوم کو نشو و نما دی، مزاح و خطوط نگاری کی حوصلہ افزائی کی وہ آداب اور مہذب طور طریقوں کے قدر شناس تھے۔ انکے دربار اور محلات کمال تہذیب و شائستگی کے مراکز تھے۔"

برصغیر پاک و ہند کے ثقافتی ارتقار کی تاریخ میں مغلیہ عہد کو ایک اہم مقام حاصل ہے مغل بادشاہوں نے ہمیشہ ثقافت اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کی۔ ان کا عہد علم و فن کا نہایت ہی جلیل القدر اور تابناک عہد تھا۔ ان کے درباروں میں اہل علم کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ خود اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ، روشن خیال اور صاحبِ ذوق فرمانروا تھے۔ وہ نہ صرف خود بلکہ ان کے امرا بھی اہل علوم و فنون کو کمال فیاضی، انعام و اکرام سے نوازتے رہتے تھے۔ ان کی ادب پروری کی شہرت برصغیر سے نکل کر عالم اسلام کے مختلف حصوں میں پہنچی تو ایران، توران اور عالم اسلام کے دیگر حصوں سے علما، فضلا، شعرا اور باکمال فنکار مغلیہ دربار میں کھنچے چلے آئے۔ اس طرح بہت جلد برصغیر اسلامی دنیا کے ثقافتی رشتے میں منسلک ہوگیا۔ چونکہ مغل بادشاہ بالخصوص بابر، ہمایوں، جہانگیر، شاہجہان اور عالمگیر خود صاحبِ علم و دانش تھے۔ اور علوم و فنون میں بدرجۂ غایت دلچسپی رکھتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی سرپرستی سے ثقافتی ارتقار کو منتہائے کمال تک پہنچا دیا۔

اکبر اگرچہ ان پڑھ تھا لیکن علمی و ادبی مباحث اور تنقید میں گہری دلچسپی رکھتا تھا اس کا اپنا دور سالہ عہد برصغیر کی ثقافتی ترقی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہجہانی دور میں علوم و فنون کی ترقی منتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اورنگ زیب نے لہو و لعب اور رقص و موسیقی پر پابندی عائد کر دی مگر اس کے عہد میں بھی اہل علم اور دانشوروں کی سرکاری سرپرستی کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا لہذا اس نے اسلامی تہذیب اور صحت مند ثقافتی قدروں کی ترویج پر زور دیا۔

علم و ادب، فن تعمیر، فن مصوری اور موسیقی عہد مغلیہ کی ثقافت کے اہم پہلو ہیں جن کا ذیل میں الگ الگ اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:۔

Marfat.com

علم و ادب

نظامِ تعلیم

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ برصغیر میں عہدِ اسلامی کے زوال پذیر ہونے پر مسلمانوں کا نظام تعلیم تباہ ہو گیا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اشاعتِ تعلیم کو مسلمانوں کا ہر طبقہ اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتا تھا۔ عہد مغلیہ میں سرکاری ملازمتوں کی کمی کی وجہ سے مسلمانوں کی بھاری تعداد تعلیم و تدریس اور ادبی مشاغل میں مصروف ہو گئی جس کے باعث متعدد تعلیمی ادارے معرضِ وجود میں آئے۔ حکومت کے علاوہ تمام صاحبِ استطاعت افراد نے فروغِ تعلیم میں حصہ لیا گاؤں کی ہر مسجد مکتب کا کام دیتی تھی۔ جہاں بچوں کو ابتدائی تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ حکومت اور امراء کی طرف سے طلباء کو وظائف اور معلموں کو عطیات ملتے تھے۔ شہزادوں اور امراء کے بچوں کی تعلیم کے لئے خاص معلمین کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ گرد و نواح کے دوسرے بچے بھی ان سے مفت استفادہ کرتے تھے۔ اگرچہ نظامِ حکومت میں کوئی علیحدہ شعبۂ تعلیم نہ تھا مگر حکومت کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ حکومت صدر الصدور کی نگرانی میں عوام کے بچوں کی تعلیم کے لئے مدرسوں کے قیام اور فروغِ تعلیم کے لئے بھاری رقوم اور جاگیریں وقف کرتی تھی۔ مسلم طلباء کے لئے ہر مسجد کے ساتھ بھی درسگاہ ہوتی تھی۔ جامع مسجد کو کالج یا یونیورسٹی کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ ان تعلیمی اداروں کی جانب سے فارغ التحصیل طلباء کو اسناد دی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں اساتذہ کی جانب سے ان کی دستار بندی بھی ہوتی تھی۔

بعض درسگاہوں میں مخلوط تعلیم کا رواج تھا یعنی ان میں ہندو اور مسلمان طلباء اکٹھے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ہندوؤں نے اپنے بچوں کے لئے الگ پاٹ شالائیں بھی قائم کر رکھی تھیں۔ درسگاہوں اور پاٹ شالوں کے علاوہ مشہور صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین نے بھی جگہ جگہ درس و تدریس کے مراکز (مشنری ادارے) قائم کر رکھے تھے۔ یہ مراکز خانقاہیں کہلاتے تھے۔ ان خانقاہوں میں مروجہ علوم کی تدریس کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام پر بھی زور دیا جاتا تھا۔ مزید برآں مغل امراء، شہزادے اور شہزادیاں بھی اشاعتِ تعلیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔

درس گاہوں میں عموماً فارسی کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ سرکاری زبان تھی۔ علاوہ ازیں قرآن حکیم، حدیث، فقہ، طب، منطق، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات اور سائنسی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ علمِ قیافہ اور علمِ نجوم کی تعلیم بھی عام تھی۔ اس دور میں فلسفہ پر بھی زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

Marfat.com

تعلیم نسواں

تعلیم مردوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ خواتین میں بھی حصولِ تعلیم کا ذوق و شوق موجود تھا۔ گو تعلیم نسواں کے لئے درس گاہوں کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہ تھا لیکن عالم اور مہذب شہزادیاں اور علم دوست گھرانوں کی باعلم خواتین موجود تھیں جو حتی الوسع تعلیم نسواں کے لئے کوشاں رہتی تھیں۔ طبقہ امراء میں لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ پردہ کی سخت پابندی کے باعث عورتیں عام اداروں میں حصولِ تعلیم کے لئے نہ جا سکتی تھیں اس لئے ہر امیر گھرانے میں ایک معلمہ کا انتظام ہوتا تھا جس سے غریب گھرانوں کی لڑکیاں بھی استفادہ کر لیتی تھیں۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اکبر نے فتحپور سیکری میں ایک اسکول قائم کیا۔ اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم اور اس کی رضاعی ماں ماہم انگہ نے دہلی میں ایک بہت بڑا تعلیمی ادارہ (کالج) قائم کیا جس میں اعلیٰ پیمانے پر تعلیم نسواں کا بندوبست تھا۔ اکبر کی بیوی سلیمہ سلطانہ نے بھی فروغ تعلیم میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔ نور جہاں، ممتاز محل اور شہزادی جہاں آرا بیگم جو خود بھی علم و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں، نے بھی ثقافتی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ الغرض مغلیہ دور علم و ادب کی ترقی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس کا اعتراف یورپین مؤرخین بھی کرتے ہیں۔

لائبریری

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علوم کی تشہیر عوام کی ذہنی و فکری ترقی اور ادبی استعداد اشاعت کتب اور علمی مطالعہ کی مرہون منت ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں لائبریریاں (دارالمطالعہ) بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مغلیہ دورِ حکومت میں کتابوں کی اشاعت (چھپائی) نہ ہونے کے باوجود تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا رجحان روز افزوں ترقی پذیر تھا۔ اگرچہ مغلیہ عہد کے کچھ عرصہ بعد تک برصغیر میں چھاپہ خانے کا اجرا نہیں ہوا تھا۔ لیکن ہر بڑے شہر میں سینکڑوں کاتب اور خوشنویس موجود تھے۔ اس دور میں کوئی بھی صاحب استطاعت مسلمان اس وقت تک مہذب و تعلیم یافتہ نہ سمجھا جاتا تھا جب تک کہ وہ اپنے گھر میں ایک عمدہ اور معیاری کتب پر مشتمل لائبریری نہ رکھتا ہو۔ چنانچہ اکثر و بیشتر امراء شاندار لائبریریاں رکھتے تھے۔ جادوناتھ سرکار رقمطراز ہے کہ:

"شاہی محلات میں اعلیٰ قسم کی لائبریریاں موجود تھیں۔" بقول فادر منیرتی "۱۶۴۱ء میں آگرہ کی سرکاری لائبریری چوبیس ہزار کتابوں پر مشتمل تھی۔ جن کی مالیت ۶۵ لاکھ روپے (ساڑھے سات لاکھ پونڈ سٹرلنگ) تھی۔"[1]

ادبی ترقی:

مشہور مؤرخ کرنل سالیمن (COL. SLEEMAN) نے برصغیر پاک و ہند

---

[1] 'انڈیا تھرو ایجز' صفحہ ۶۴

Marfat.com

ہیں مسلمانوں کی علمی و ادبی ترقی کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

"دنیا میں شاید بہت کم قومیں ایسی ہوں گی جن میں تعلیم کی اشاعت اس قدر عام ہے جس قدر برصغیر کے مسلمانوں میں۔ وہ شخص جو بیس روپے ماہوار تنخواہ پاتا ہے اپنے بچوں کو اتنی تعلیم دلاتا ہے جو وزیر اعظم کی تعلیم کے برابر ہے۔ وہ عربی اور فارسی زبانوں کے ذریعے وہی علوم سیکھتے ہیں جو ہمارے کالجوں میں نوجوان یونانی اور لاطینی زبانوں کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ یعنی گرامر، فصاحت اور منطق۔ سات سالہ تعلیم کے بعد ایک مسلم طالب علم کی دستار بندی ہوتی ہے۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ طالب علم کی طرح مروجہ علوم میں خاص دستگاہ رکھتا ہے۔ وہ سقراط اور ارسطو، افلاطون اور بقراط، جالینوس اور ابوعلی سینا کے بارے میں روانی سے گفتگو کرتا ہے۔ علم ہیئت، منطق، اخلاقیات، فلسفہ، سائنس اور دیگر فنون میں مکمل مہارت رکھتا اور ان پر فاضلانہ بحث کر سکتا ہے۔" [1]

مغلیہ عہد میں علم تاریخ، فلسفہ، شعر و شاعری اور نثر نگاری کو بھی بہت عروج حاصل ہوا جس کے نتیجے کے طور پر متعدد ادبی شاہکار معرض وجود میں آئے۔ ذیل میں اس ادبی ترقی کا عہد بہ عہد ذکر کیا جاتا ہے۔

عہدِ بابر و ہمایوں

بابر علوم و فنون کا سرپرست اور ایک بلند پایہ عالم تھا۔ اس نے علم پرور خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس کی خود نوشت "تزک بابری" اس کی علمی و ادبی قابلیت کی ایک مایۂ ناز یادگار ہے۔ اور بلاشبہ یہ ترکی زبان میں ادبیات عالیہ کا ایک چھوٹا شاہکار ہے۔ بابر نثر نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا۔ اس کا دیوان اردو ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی (مبین) اس کے بلند پایہ شاعر ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ میر علی شیر نوائی کے بعد بابر ترکی زبان کا سب سے بڑا ادیب اور شاعر تھا۔

ہمایوں کو فارسی زبان اور شعر گوئی پر پورا عبور حاصل تھا۔ علوم و فنون سے اس کی شیفتگی جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ اکثر کئی کئی روز تک لائبریری میں بیٹھا مطالعۂ کتب میں مصروف رہتا۔ میدان جنگ میں بھی کتابیں اپنے ساتھ لے جاتا۔ صحرانوردی کے صعوبت ناک ایام میں بھی اس نے کتب خانہ کو اپنے سے جدا نہ کیا۔ علمی مجالس کا بہت زیادہ شائق تھا اس نے دہلی میں ایک مدرسہ اور "دین پناہ" میں ایک عظیم کتب خانہ قائم کیا جس میں سینکڑوں کتب موجود تھیں۔ اسکے عہد

---

[1] "ریمبلز اینڈ ریکولیکشنز" صفحہ ۲۴-۵۲۳

Marfat.com

حکومت میں متعدد معیاری کتب تصنیف ہوئیں۔ "تذکرۃ الواقعات" عہد ہمایوں کی مشہور تاریخ ہے جس کا مصنف جوہر ہمایوں کا آفتابچی تھا۔

عہد اکبری: اکبر گو کتابی علوم سے بے بہرہ تھا لیکن تیموری روایات کے مطابق علوم و فنون کی سرپرستی کرنے میں اس نے جس خصوصی توجہ اور والہانہ فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی مثال کسی مغل فرمانروا کے عہد میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد میں تمام مروجہ زبانوں (فارسی، ہندی اور سنسکرت) میں لاتعداد گراں مایہ ادبی شاہکار تخلیق ہوئے اور ہندی و سنسکرت کی کئی ایک مشہور کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ علاوہ ازیں شعر گوئی اور فن تاریخ نویسی نے بھی خوب فروغ پایا۔ اکبر نے فتحپور سیکری میں لڑکیوں کے لئے ایک علیحدہ مدرسہ قائم کرنے کے علاوہ ایک عالیشان لائبریری بھی قائم کی جس میں مستند علماء مقرر کئے تاکہ چیدہ چیدہ کتابیں اسے پڑھ کر سنائیں۔ شیخ فیضی کو ہیڈ لائبریرین مقرر کیا۔ ابوالفضل لکھتا ہے "شاید ہی کوئی مستند و معروف کتاب ہوگی جو جہاں پناہ (اکبر) کے سامنے نہ پڑھی گئی ہو۔"

اکبر کے دربار میں شیخ مبارک ناگوری، ابوالفضل، عبدالرحیم خان خاناں، غزالی مشہدی شیخ فیضی، حکیم ابوالفتح، فتح اللہ شیرازی، ملا قاسم کاہی، شیری سیالکوٹی اور نظیری نیشاپوری جیسے بلند مرتبت دانشور اور اہل علم موجود تھے جو نہ صرف عہد اکبری میں سپہر ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر جگمگائے بلکہ جن کی ادبی و علمی عظمتوں میں آج بھی کوئی کلام نہیں انہوں نے دنیائے علم و ادب میں بلند پایہ شاہکار تخلیق کر کے عہد اکبری کو ادبی و ثقافتی ترقی کا بے مثال اور تابناک دور بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے عہد میں اہم ترین تاریخی کتب لکھی گئیں ابوالفضل کے تاریخی شاہکار 'اکبرنامہ' اور 'آئین اکبری' ملا احمد مٹھوی کی 'تاریخ الفی' ملا عبدالقادر بدایونی کی 'منتخب التواریخ' عبدالباقی کا 'مآثر رحیمی' نظام الدین احمد کی 'طبقات اکبری' اور فیضی سرہندی کا 'اکبرنامہ' عہد اکبری کی اہم ترین تاریخی کتب ہیں۔ جو سب کی سب فارسی نثر کے عظیم الشان شاہکار ہیں۔

عبدالقادر بدایونی نے رامائن کا فارسی میں ترجمہ کیا اور مہابھارت کا بھی ترجمہ "رزم نامہ" کے نام سے کیا گیا۔ علاوہ ازیں حاجی ابراہیم سرہندی نے اتھروید، فیضی نے ریاضی کی مشہور کتاب 'لیلاوتی'، عبدالرحیم خان خاناں نے 'واقعات بابری' 'تزک بابری'، اور مولانا شاہ محمد نے 'تاریخ کشمیر' کا ترجمہ کر کے اکبر کے عہد کو علوم و فنون کا ایک عظیم ترین دور بنا دیا۔

عہد جہانگیری: جہانگیر کو فارسی زبان اور شعر گوئی پر پوری قدرت حاصل تھی اس نے بھی اپنے جد امجد بابر کی طرح "تزک جہانگیری" کے نام سے اپنی سوانح حیات تحریر کی جو اس کے عہد کی ایک مستند اور جامع تاریخی کتاب ہے۔ اس کے عہد میں عبدالحق

Marfat.com

محدث دہلوی، غیاث بیگ، نقیب خاں، معتمد خاں اور نعمت اللہ جیسے بلند پایہ جید علماء موجود تھے جنہوں نے اپنی علمی و ادبی استعداد سے علوم و فنون کے لئے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ معتمد خاں نے جو بخشی کے عہدے پر فائز تھا 'اقبال نامہ جہانگیری' لکھا جو اس عہد کی مستند تاریخ متصور ہوتی ہے۔ نعمت اللہ نے خان جہان لودھی کی فرمائش پر "مخزن افغانی" تحریر کی اس کے علاوہ 'مآثرِ جہانگیری' اور 'زبدۃ التواریخ' اس دور کے عظیم تاریخی شاہکار ہیں۔ جہانگیر نے مشہور ایرانی شاعر طالب آملی کو جو اس کے دربار سے وابستہ تھا ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا۔ جہانگیر کے عہد کا دوسرا مشہور شاعر حیاتی کاشی تھا جس نے امیر خسرو کی مثنوی، تغلق نامہ کو اس کے تلف شدہ اوراق کی جگہ اسی معیار و اسلوب کے ساتھ لکھ کر مکمل کیا تھا اور اپنے اسی ادبی و شعری کارنامے پر اس نے جہانگیر سے چھ ہزار اشرفیاں بطور انعام حاصل کیں۔

عہدِ شاہجہانی: شاہجہان کا عہدِ حکومت علم و ادب، تعمیرات، تاریخ اور اسلامیات کا عہد کہلاتا ہے اس نے علوم و فنون کی سرپرستی میں اپنے پیشروؤں سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چونکہ وہ خود صاحبِ علم اور ادب دوست تھا اس لئے اس نے عالموں، دانشوروں اور شاعروں کی خوب قدر افزائی کی۔ فن تاریخ نویسی کو اس کے عہد میں بہت فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ عبدالحمید لاہوری کا 'بادشاہ نامہ' محمد صالح کا 'عملِ صالح'، امین قزوینی کا 'بادشاہ نامہ'، اور عنایت خاں کا 'ملخص بادشاہ نامہ' اسی دور کی نمایاں آفاق تاریخی کتب ہیں۔ اس عہد میں علمِ طب نے بھی خوب ترقی پائی۔ امیر الامراء مہابت خان کے لڑکے امان اللہ خاں نے "ام العلاج" کے نام سے ایک مشہور کتاب مرتب کی۔ علاوہ ازیں اس نے سنسکرت زبان کی ایک کتاب کا 'دستور الہنود' کے نام سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اس عہد کا مشہور ترین عالم و فاضل تھا۔ شاہجہان نے اسے دو دفعہ ہموزن سونا بطور انعام عطا کیا۔ شمس بازغہ کا مصنف محمود جونپوری اور شاہجہان کا وزیر علامی سعداللہ خاں چینوٹی اس عہد کے بلند پایہ عالم تھے۔

شہزادہ دارا شکوہ گو آزاد خیال تھا مگر علم دوست اور صاحبِ علم و ادب تھا۔ اس نے اپنی سرپرستی میں اپنشد اور بھگوت گیتا کا فارسی میں ترجمہ کروایا وہ خود بھی کئی ایک کتابوں کا مصنف تھا۔ جن میں سفینۃ الاولیاء (صوفیائے کرام کے حالات پر مشتمل)، سکینۃ الاولیاء (حضرت میاں میر اور ان کے خلفاء کے حالات پر مشتمل)، اور مجمع البحرین (ویدانتی فلسفہ پر مشتمل) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے حسنات العارفین (اولیائے کرام کے شطحیات پر مشتمل) نادر النکات اور رسالہ حق نما، جیسی گرانمایہ کتب تحریر کیں۔

Marfat.com

قدسی اور کلیم عہد شاہجہانی کے مشہور ترین شاعر تھے۔ اس دور کے دیگر جلیل القدر شعراء میں سید اکبر آبادی، شیخ محمد علی ماہر، سعید اے گیلانی، غنی کاشمیری اور سرمد قابل ذکر ہیں۔

عہد عالمگیری: اورنگ زیب عالمگیر کا عہد علم پروری کا عہد منصور ہوتا ہے سلطنت کے تمام صدور کو سرکاری طور پر یہ ہدایت تھی کہ ملک کا کوئی طالب علم اور درس گاہ شاہی عطیات (مالی امداد) سے محروم نہ رہے۔ "فتاوی عالمگیری" اس عہد کا ایک عظیم ترین شاہکار اور بلاشبہ ایک مستند علمی کارنامہ متصور ہوتا ہے۔ یہ اسلامی فقہ پر ایک جامع و مستند کتاب ہے۔ عالمگیر اسلامی اور دیگر علوم میں اپنے پیشروؤں پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس کے رقعات فارسی زبان پر اس کے عبور اور اسلوب نگارش کی خوبیوں کے مظہر ہیں اگرچہ اس نے فن تاریخ نویسی کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی نہ کی تاہم اس کے عہد میں متعدد مستند تاریخی کتب معرض وجود میں آئیں جن میں مرزا محمد کاظم کا 'عالمگیر نامہ'۔ خافی خاں کی 'منتخب اللباب'، متعد خاں کی 'مآثر عالمگیری' سبحان کھتری کی 'خلاصۃ التواریخ'، بھیم سین کا 'نسخہ دلکشا' اور ایشور داس کی 'فتوحات عالمگیری' مشہور ترین تاریخی شاہکاروں کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس عہد میں علم طب میں نمایاں ترقی ہوئی۔ حکیم محمد اکبر عرف ارزانی نے طب اکبر، میزان الطب، مفرح القلوب، تاریخ الامراض، مجربات اکبری، طب النبی جیسی مقبول عام اور مایہ ناز طبی کتب مرتب کیں۔ علاوہ ازیں حکیم محمد رضا شیرازی نے جو علم لب کا ایک بلند پایہ محقق تھا۔ دس سال کی سعی و کاوش کے بعد بادشاہ کی زیر سرپرستی 'ریاض عالمگیری' کے نام سے خواص الادویہ پر ایک جامع کتاب تصنیف کی۔

گو عالمگیر شعر و سخن کا رسیا نہ تھا لیکن اس کے عہد میں امراء اور شہزادوں کی سرپرستی میں شعر و سخن کا ادبی ماحول برقرار رہا۔ اس عہد کا عظیم ترین اور مشہور شاعر عبد القادر بیدل تھا جس کا کلام فلسفہ، غنائی کیفیات اور رفعت تخیل کا حامل تھا۔ علاوہ ازیں ناصر علی سرہندی نعمت خاں عالی اور میر عبد الجلیل بلگرامی بھی عہد عالمگیری کے مشہور سخنور تھے۔

مغل شہزادیاں: مغل شہزادیاں بھی علم دوست اور علوم و فنون کی سرپرستی کی دلدادہ تھیں۔ چنانچہ انہوں نے علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کی ترقی و سرپرستی میں نمایاں دلچسپی لی۔ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے اکبر کی فرمائش پر ہمایوں کے حالات زندگی پر مشتمل "ہمایوں نامہ" لکھ کر اس عہد کا ایک مستند تاریخی ماخذ مہیا کیا۔ اکبر کی بیگم سلیمہ سلطانہ بھی شعر و ادب کا معیاری ذوق رکھتی تھی۔ اکبر کی رضائی ماں ماہم انگہ ایک علم پرور خاتون تھی۔ اس نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کر کے ثقافتی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ نور جہاں، ارجمند بانو بیگم ممتاز محل، جہاں آرا بیگم اورنگ زیب کی لڑکی زیب النساء بر جستہ

Marfat.com

شعر گوئی اور بذلہ سنجی میں لاثانی تھیں۔ شاہجہان کی بڑی لڑکی جہاں آرا بیگم نے بزرگان دین کے سوانح حیات پر مشتمل "مونس الارواح" لکھ کر علم و ادب کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی اورنگزیب کی بیٹی زیب النساء ایک باکمال شاعرہ تھی اور مخفی تخلص کرتی تھی۔ اس نے اپنی سرپرستی میں 'زیب التفاسیر' کے نام سے امام رازی کی تفسیر کا فارسی زبان میں ترجمہ کرایا اور ایک کتب خانہ اور اکیڈمی بھی قائم کی۔

ہندی اور بنگالی ادب

اگرچہ مغل عہد میں فارسی زبان کو سرکاری زبان ہونے کی حیثیت حاصل تھی مگر بادشاہوں نے اپنی روادارانہ پالیسی کے تحت ہندی و بنگالی ادب کی ترقی و سرپرستی کے لئے انتہائی فیاضی و فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر لچھمی رقمطراز ہے:

"یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ علاقائی زبان ہندی کو سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی تحریر و تقریر میں استعمال کرنا شروع کیا ورنہ برہمنوں نے تو اس کی ترویج و ترقی کو درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔"

مغلیہ دور میں ہندی اور بنگالی زبانوں میں متعدد علمی و ادبی شاہکار معرض وجود میں آئے شیر شاہ سوری کے ہمعصر ملک محمد جائسی نے علاؤالدین خلجی اور چتوڑ کی رانی پدمنی کی داستان محبت (پدماوت) کو ہندی میں نہایت عمدہ پیرائے میں تحریر کر کے ہندی ادب میں ایک گرانقدر شاہکار کا اضافہ کیا۔ مغل بادشاہ ہندی زبان کے نامور اور عظیم شاعر کو "کوی راج" کے خطاب سے نوازتے تھے۔ چنانچہ اکبر نے راجہ بیربل کو اس کی علمی استعداد کی بنا پر کویراج کا خطاب عطا کیا۔ اکبر کا منصبدار عبدالرحیم خان خاناں ہندی زبان کا ایک بہت بڑا شاعر اور سرپرست تھا۔ ہندی میں اس کے دوہے آج تک مشہور ہیں۔ کئی ایک ہندی شعراء اس کی مجلس ادب کے رکن تھے۔ اکبر کے عہد میں عبدالرحیم خان خاناں، بیربل، راجہ مان سنگھ اور بھگوان داس ہندی شعر و ادب کے عظیم اساتذہ کا درجہ رکھتے تھے۔ شہنشاہ جہانگیر، شاہجہان اور عالمگیر کے عہد حکومت میں بھی ہندی ادب کی ترقی اور حوصلہ افزائی کے لئے گہری دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ اورنگزیب کے بیٹے شہزادہ معظم اور اعظم ہندی ادب کی ترویج و سرپرستی کے لئے بہت مشہور تھے۔

دیگر مشہور ہندی شعراء میں سنت تلسی داس اور بھگت سورداس کے نام سرفہرست ہیں۔ تلسی داس نے ۱۶۲۳ء میں بنارس میں وفات پائی۔ اس نے ہندوؤں کے اوتار رامچندر کے کارنامول کو 'رامائن' کے نام سے بڑے ہی فنکارانہ اسلوب میں ہندی نظم کے روپ میں پیش کر کے شہرت دوام حاصل کی۔ اسی طرح سورداس نے رادھا کرشن کے حالات کو دلکش

Marfat.com

اور والہانہ پیرائے میں نظم کرکے ہندی ادب کی بہت بڑی خدمت کی۔

اس دور میں بنگالی ادب کو بھی خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا۔ کرشن داس، پرندوان داس ترلوچن داس اور نرہری چکرورتی جیسے بلند پایہ اہل علم و ذوق نے بھگتی تحریک کے مشہور راہنما چیتنیہ کی کئی ایک سوانح عمریاں لکھ کر بنگالی ادب کی ترقی کے لئے گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔

فارسی کی ترقی

اگرچہ گیارھویں صدی کے ربع اول میں لاہور پر سلطنت غزنہ کے قبضہ کے وقت سے فارسی زبان، مسلم حکومت کی سرکاری زبان تھی۔ لیکن برصغیر میں مغلیہ دور کا آغاز ہوتے ہی یہ اپنے انتہائی عروج کے دور میں داخل ہوئی چنانچہ دربار کی سرپرستی کی بدولت اسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مغلیہ عہد فارسی زبان میں تاریخی ادب کے نزدغ و ارتقار کا بہترین دور متصور ہوتا ہے۔ عہد اکبری میں ابوالفضل نے 'اکبرنامہ' اور 'آئین اکبری' نظام الدین نے 'طبقات اکبری' عبدالقادر بدایونی نے 'منتخب التواریخ' اور عباس سروانی نے تاریخ شیر شاہی' عہد جہانگیری میں معتمد خاں نے اقبال نامہ، عبدالباقی نے مآثر رحیمی اور عبداللہ نے تاریخ داؤدی' عہد شاہجہانی میں مرزا امین قزوینی نے 'بادشاہ نامہ' عبدالحمید لاہوری نے بھی بادشاہ نامہ' محمد صادق نے شاہجہان نامہ اور محمد صالح کمبوہ نے عمل صالح اور عہد عالمگیری میں محمد کاظم نے عالمگیر نامہ، مستعد خاں نے مآثر عالمگیری، سبحان رائے نے خلاصۃ التواریخ، خافی خاں نے منتخب اللباب اور مغلوں کے آخری دور میں غلام حسین طباطبائی نے سیرۃ المتاخرین جیسی مستند تاریخی کتب لکھ کر فارسی زبان کی ادبی اور تاریخی حیثیت کو منتہائے کمال کو پہنچا دیا۔

مغلوں کے عہد میں نثر فارسی کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کو بھی بڑا فروغ ہوا کیونکہ شہنشاہ اور امرار شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ غزالی، نظیری، عرفی، طالب اور کلیم جیسے ممتاز ترین شعرار ایران سے ہجرت کرکے مغلیہ دربار سے منسلک ہوگئے۔ دربار اکبری کے ملک الشعرار فیضی نے فارسی زبان میں ایک سو ایک شاہکار تصنیف کئے جن میں اس کا فارسی دیوان اور مثنوی نل و دمن آج بھی دنیائے شعر و سخن میں بہت مشہور ہیں۔ غزالی نے چار ہزار اشعار کہے شہنشاہ جہانگیر نے طالب آملی کو اور شاہجہان نے ابو طالب کلیم کو ملک الشعرار کا خطاب دیکر فارسی ادب کی خاطر خواہ قدر افزائی کی۔

اردو کی ترقی

مغلیہ سلطنت کے انحطاط تک مغل دربار میں اردو کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ یوں بھی یہ وہ دور تھا جب اردو زبان ابھی بیان و اظہار کی ابتدائی منزلوں سے گذر رہی تھی۔ تاہم اردو دکنی ریاستوں کے درباروں میں بار پاتی رہی اردو کا پہلا نامور شاعر نصرتی دکنی ریاست بیجاپور کے دربار سے وابستہ تھا۔ اصناف سخن میں اسکی

Marfat.com

سب سے پسندیدہ صنف مثنوی تھی چنانچہ اس نے زیادہ تر مثنویاں ہی لکھیں۔ اس کی زبان عربی سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ اردو غزلیات پر مشتمل پہلا دیوان سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۱ء تا ۱۶۱۱ء) والیٔ گولکنڈہ نے مرتب کیا۔ اگرچہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباروں میں اردو زبان کے متعدد شاعر موجود تھے۔ مگر جدید اردو شاعری کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کی مہمات دکن کے دوران ولی دکنی سے ہوا۔ جس نے ۱۷۰۷ء میں وفات پائی۔ ولی ایک بلند خیال اور اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ اس کے جدید طرزِ سخن سے متاثر ہو کر دہلی میں بھی فارسی کی بجائے اردو میں شعر و سخن کا آغاز ہوا اور اظہارِ خیالات کے لئے اردو زبان کو اپنایا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ اردو زبان کا دامن وسیع ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ مغلوں کے دورِ انحطاط میں فارسی کے مقابلہ میں اردو نثر اور شاعری کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ محمد شاہ رنگیلا (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) پہلا مغل بادشاہ تھا جس نے اردو زبان کی ترقی میں گہری دلچسپی لی۔ یہی وہ دور تھا جب آبرو، مظہر، حاتم، ناجی، معظم، سودا، درد، میر اور غالب جیسے جلیل القدر شعراء نے اپنے شاعرانہ کمالات کے اظہار کے لئے اردو زبان کو منتخب کیا۔ نتیجہ اردو زبان بہت جلد ایک بلند پایہ ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی۔ انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اسے درباری زبان کے طور پر استعمال کیا۔

مغلیہ فنِ تعمیر

"عظیم مغلوں کی سلطنت سے برصغیر میں فنون لطیفہ اور تزئین و آرائش کے تاریخ ساز دور کا آغاز ہوا۔ اس مسلم خاندان (مغلیہ خاندان) کی زیرِ سرپرستی شمالی ہند میں فنِ تعمیر نے شکوہ، ارتقاء کے اعتبار سے منتہائے کمال کو پہنچا۔" [1]

(پرسی براؤن)

کسی دور کی عظمتِ رفتہ کے مطالعہ کے لئے جہاں اس دور کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تمدنی پہلوؤں کا بغور مطالعہ ضروری ہے۔ وہاں اس دور کے سلاطین کے ذوق اور کردار کا پتہ لگانے کے لئے ان کے فنِ تعمیر کا جاننا بھی لازمی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے قیام سے برصغیر نے جہاں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ترقی کی، وہاں فنِ تعمیر کے میدان میں بھی خاص شہرت حاصل کی کیونکہ مغلیہ خاندان کے اکثر بادشاہوں نے ایرانی اور ہندی طرزِ تعمیر کے امتزاج سے برصغیر کو ایک نئے فنِ

---

[1] 'انڈین آرکیٹیکچر' (اسلامک پیریڈ)، صفحہ ۹۵

Marfat.com

تعمیر سے روشناس کرایا جو مغلیہ فن تعمیر کے نام سے مشہور ہوا۔ مغلیہ دور کی ہر عمارت نہ صرف اپنے تعمیر کنندہ کے ذوق و کردار کے ہر پہلو کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ اس عہد کے تہذیب و تمدن پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

اگر برصغیر میں عظیم مغل اپنے خاندان کا سنگِ بنیاد نہ رکھتے تو برصغیر پاک و ہند ایک بہت بڑے تعمیری ورثے سے جو مغلوں نے اسے عطا کیا محروم رہ جاتا۔ بابر سے لے کر اورنگ زیب کے دور تک بھی مغل بادشاہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس میدان میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب جیسا پابند شریعت شہنشاہ بھی اس دوڑ میں اپنے پیشروؤں سے پیچھے نظر نہیں آتا۔ لاہور کی بادشاہی مسجد اس کے ذوق تعمیر کا ایک نادر شاہکار ہے۔ مغلیہ فن تعمیر کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس فن نے بتدریج ارتقاء کی کئی منزلیں طے کیں اور آخر کار شاہجہانی عہد میں اپنے منتہائے کمال کو پہنچا۔ مغلیہ فن تعمیر کے مختلف ادوار مندرجہ ذیل ہیں :-

بابر اور ہمایوں :

مغلیہ فن تعمیر کا آغاز بابر کی پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی پر فتحیابی کے بعد سے ہوتا ہے "تزک بابری" کے مطالعہ سے صاف عیاں ہے کہ بابر تیموری روایات کا صحیح مقلد اور سرپرست تھا اسے نہ صرف علوم و فنون اور قدرتی مناظر سے ہی دلچسپی تھی بلکہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق اسے فن تعمیر سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ بابر کی آمد سے قبل مسلمان برصغیر میں وسط ایشیا کا فن تعمیر اپنے ساتھ لائے تھے اور ہندو رواۃ اور اسلامی فن تعمیر کے متعلق بابر کی رائے اچھی نہ تھی۔ اگرچہ وہ گوالیار میں مان سنگھ اور بکرماجیت کے محلات کی خوبصورتی اور انوکھے طرز تعمیر سے بہت متاثر ہوا۔ لیکن وہ یہاں کی عمارات سے مطمئن نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ کسی پلان کے تحت تعمیر نہ کی گئی تھیں۔ بابر نے برصغیر میں بارہ دریاں اور باغات (چہار باغ) بنوا کر اپنے ذوق کو تسکین دی۔ اس کا خیال تھا کہ سمرقند اور قسطنطنیہ سے معمار بلوا کر عمدہ گنبد اور محلات تعمیر کروائے لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی۔ البتہ بابر کے زمانے میں مغلیہ باغات اور بارہ دریوں کا طرز تعمیر وجود میں آگیا۔ مغلیہ باغ چار حصوں میں منقسم ہوتا تھا اور "چہار باغ" کہلاتا تھا۔ بابر نے باغات میں سدا بہار اور پھل دار درخت لگوانے کے علاوہ انہیں مختلف قسم کے پھولوں سے بھی سجایا۔ باغ کے درمیان ایک بلند کرسی پر سنگِ مرمر کی بارہ دری تعمیر کی جاتی تھی۔ باغ میں داخلے کے لئے پختہ اینٹوں کی روشیں ہوتی تھیں۔ دو رویہ روشوں کے بیچوں بیچ پانی کی نہر اور فوارے چلتے تھے۔ نیز روشوں کے قریب سرو کے درخت لگائے جاتے تھے جو عجب بہار دکھاتے تھے۔ ان باغات کے علاوہ بابر کے عہد کی صرف دو مسجدیں آج

Marfat.com

تک محفوظ ہیں۔ ان میں ایک پانی پت اور دوسری سنبھل کے مقام پر ہے۔

ہمایوں نے اپنے ابتدائی دور میں دین پناہ کا شہر تعمیر کروایا۔ لیکن شیر شاہ سوری نے اسے منہدم کروا دیا۔ اور اس کی جگہ پر دہلی کا موجودہ پرانا قلعہ تعمیر کروایا جو اب بھی جمنا کے کنارے عظمتِ رفتہ کی یاد دلا رہا ہے۔

شیر شاہ سوری: شیر شاہ سوری کے عہد کی عمارات ہندو اور مسلم فن تعمیر کے امتزاج کا اعلیٰ نمونہ اور فن تعمیر کے ارتقا میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سوری کی عمارات میں شیر شاہ کا مقبرہ جو سہسرام میں ایک مصنوعی جھیل کے درمیان ایک بلند کرسی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ فنی لحاظ نگاہ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ عمارت اگرچہ مسلم طرزِ تعمیر کے مطابق ہے لیکن اس کا اندرونی حصّہ ہندووانہ طرز کی غمازی کرتا ہے اور "یہ تغلق عمارات کی سادگی اور شاہجہانی شاہکار کے نسوانی حسن و نزاکت کے مابین ایک کڑی ہے"۔

عہدِ اکبری: اکبر کو بھی فن تعمیر سے خاص لگاؤ تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں نہ صرف مساجد اور محلات تعمیر ہوئے بلکہ بے شمار قلعے، مینار، سرائیں، تالاب اور باغات تعمیر ہوئے اس عہد کی عمارات میں سے آگرہ اور لاہور کا قلعہ، لاہور میں بیگم شاہی مسجد آگرہ کا جہانگیری محل، فتح پور سیکری میں مریم زمانی اور بیربل کے محلات اور خاص طور پر شیخ سلیم چشتی کا مزار قابلِ ذکر ہیں۔ اس عہد کی عمارات نہ صرف ہندو اثرات کی غمازی کرتی ہیں بلکہ ان میں سرخ پتھر کا استعمال ایک امتیازی حیثیت کا مظہر ہے۔

عہدِ اکبری کے ابتدائی دور کی اہم ترین اور مشہور عمارات ہمایوں کا مقبرہ ہے جسے ہمایوں کی بیوی اور اکبر کی سوتیلی والدہ حاجی بیگم نے اپنی نگرانی میں تعمیر کروایا تھا۔ ہمایوں کا مقبرہ دہلی میں واقع ہے۔ بعض مورخین کے خیال کے مطابق یہ مقبرہ ۱۵۶۵ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا لیکن مشہور مؤرخ پرسی براؤن اپنی کتاب "انڈین آرکی ٹیکچر" (اسلامک پیریڈ) میں رقمطراز ہے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر ہمایوں کی وفات کے آٹھ سال بعد یعنی ۱۵۶۴ء میں شروع ہوئی"۔ اس مقبرے کی کرسی ۲۲ فٹ بلند ہے اور پختہ کرسی کے گرداگرد قرآن خوانی کے لئے چھوٹے چھوٹے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ نیز قبر کے چاروں طرف مسقّف برآمدے بھی ہیں۔ عمارت کے چاروں کونوں پر مینار ہیں۔ اصل قبر کے اوپر ایک بلند و بالا گنبد ہے جس کے کندھے پہلوانوں کی طرح ابھرے ہوتے ہیں۔ بیرونی جانب سے یہ گنبد غیر معمولی طور پر بلند نظر آتا ہے لیکن اندر کی جانب سے اس گنبد کی تہہ دوہری ہے۔

اس گنبد کی تعمیر میں ایک خاص جدّت ہے اور اس کے طرزِ تعمیر کے عام تاثر سے ایرانی طرز

Marfat.com

تعمیر اور انداز جھلکتا ہے۔ اس عمارت میں رنگین اینٹوں کی بجائے سنگ مرمر لگایا گیا ہے۔ ہمایوں کے مقبرے میں گنبد کا پچلا ڈھول (گردن) دمشق کی اموی مسجد کی مانند ہے جس طرز پر سمرقند میں امیر تیمور کا مقبرہ بنایا گیا تھا۔ ہمایوں کا مقبرہ روش دار باغ کے درمیان واقع ہے جس کے چوکور فلعہ نما بلند فصیل کھڑی کر دی گئی ہے۔

اکبری دور سے دوہرے گنبد اور عمارات کی اس قدر بلندی کا صدیوں ترک کر دیا گیا۔ نیز اکبر کے عہد میں سرخ پتھر کا استعمال بہت ہوا۔ عمارتوں میں ہندو وانہ طرز کے ستون اور برآمدوں کے سردارزوں کی ڈاٹیں سپاٹ یعنی شہتر نما ہیں۔ اکبری عمارات میں راجپوت فن تعمیر کے نشانات نمایاں ہیں۔ اس دور کی عمارات کی چھتوں کی کم بلندی اور چھتوں کے درمیان "سولر" کی تعمیر جو کہ خاص طور پر راجپوت فن تعمیر کی غمازی کرتا ہے اور تزئین کے لئے گہرے نقش کے علاوہ پتھر کے تراشیدہ مور، گھوڑے، شیر اور ہاتھی موجود ہیں۔ یہ اکبر کی ہندو بیویوں کے اثر کا نتیجہ تھا۔ نیز یہ سنگ تراش دستکاروں کی فنی روایات کے مظہر ہیں۔ اکبری دور کی عمارتیں نہایت پائیدار بنیادوں پر تعمیر کی گئیں۔ چنانچہ آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں اکبری دور کی اکثر عمارتیں شاہجہان کے عہد میں گرا کر از سر نو بنائی گئیں۔

عہدِ جہانگیری: جہانگیر کے عہد میں مغلیہ فنِ تعمیر میں لاتعداد جدتیں رونما ہوئیں اس زمانے میں زنگدار ٹیبشوں سے چھتوں کو اندر سے آراستہ کیا گیا یعنی فن نقاشی عام ہوا۔ عمارتوں میں روغنی اینٹیں بھی استعمال ہونے لگیں اور مصورانہ آرائش پر زور دیا گیا۔ کیونکہ جہانگیر کو فنِ تعمیر سے کم اور فنِ مصوری سے زیادہ لگاؤ تھا۔ کاشی کاری کی ابتدا بھی جہانگیر ہی کے عہد میں ہوئی۔ جہانگیری عہد کی عمارتوں میں سکندرہ آباد میں اکبر کا مقبرہ اور آگرہ میں اعتماد الدولہ کا مقبرہ اہم ہیں۔ اعتماد الدولہ کا مقبرہ سنگ مرمر کا ہے لیکن اسے بیش بہا پتھروں کی بجائے معمولی قیمت کے پتھروں سے سجایا گیا ہے۔ گویا کہ اس دور سے پچی کاری کی ابتدا ہوئی۔ فنی ارتقا میں جہانگیر کا عہد خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جہانگیر کو باغات لگوانے کا بھی بہت شوق تھا کشمیر میں شالامار باغ، نسیم باغ اور نشاط باغ اس عہد کی یادگاریں ہیں۔ اسی طرز پر بعد میں شاہجہان نے لاہور میں شہرۂ آفاق شالامار باغ تعمیر کروایا۔

عہدِ شاہجہانی: شاہجہان کا دور مغلیہ فنِ تعمیر کے ارتقا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے جونہی ہم اس حصہ میں داخل ہوتے ہیں ہمیں مغلیہ فن تعمیر منتہائے عروج پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ عمارات میں سفید سنگِ مرمر کا فراوانی سے استعمال شاہجہان کے اعلیٰ اور پاکیزہ ذوق پر دلالت کرتا ہے۔ شاہجہانی دور کی عمارات عام طور پر سنگِ مرمر سے تعمیر ہوئیں جو اس عہد کے فنِ تعمیر کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ شاہجہان کی بنوائی ہوئی عمارات میں

Marfat.com

نفاست، پاکیزگی اور محبت جھلکتی نظر آتی ہے۔ شاہجہان کو بجا طور پہ عمارات کا شہزادہ اور انجینئر بادشاہ کہا جاتا ہے۔ مؤرخین نے عہد شاہجہانی کو فن تعمیر کا سنہری زمانہ کہا ہے بلکہ اس عہد میں فن تعمیر کا معیار ہر اعتبار سے بلند اور اپنی نزاکت و باریکی اور مضبوطی کی وجہ سے ضرب المثل ہو گیا تھا۔ اس کی عمارتوں میں تنوع اور زیبائش، توازن، موزونیت اور رعنائی حسن موجود ہے۔ عمارتوں کی نزاکت و نفاست اور ان کے دلکش و حسین تاثر کو دیکھ کر انسان عش عش کر اٹھتا ہے۔ شاہجہانی عمارات کی خاص خوبی یہ ہے کہ عمارات میں اصفت جاہ کے منبرہ کی تعمیر کے بعد غیر معمولی بلندی یا دوہری ساخت قطعی طور پہ ترک کر دی گئی۔ شاہجہان نے سنگ مرمر کے علاوہ صوبہ بہار کا سرخ پتھر بھی استعمال کیا ہے۔ ٹھٹھہ کی مسجدوں میں رنگین اینٹوں کا استعمال جو علاقہ کی آب و ہوا کو مدنظر رکھ کر کیا گیا تھا اب بھی آنکھوں کو سرور بخشتا ہے۔ شاہجہان کے عہد میں عمارتوں کو کاشی کاری اور پچی کاری سے بھی سجایا گیا جس کے چند نمونے لاہور میں موجود ہیں۔ قلعہ لاہور کی وہ دیوار جو قلعہ کے ٹکٹ گھر کے سامنے اور شاہ برج کے دروازے کے شمال میں واقع ہے کاشی کاری (MOSAIC) کے چند نمونوں سے مزین ہے۔

شاہجہانی عمارات میں گنبد، مناسب محرابیں، عمارتوں کا فرش اور دیواروں کی چوڑائی اور دروازوں کے برج سب کچھ سوچ سمجھ کر بنائے گئے ہیں۔ نیز ستونوں میں ایک خاص قسم کی دلکش جدت پائی جاتی ہے۔ شاہجہانی عمارتوں میں ہندووانہ اثرات بالکل غائب ہیں بلکہ ان میں خاص اسلامی طرز کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی تمام عمارات، کا ماحول بڑا حسین اور دلآویز ہے۔ عمارات عام طور پہ باغات کے وسط میں تعمیر کی گئی ہیں جہاں پانی کا فواروں کے ذریعے خاص طور پہ اہتمام کیا گیا ہے۔ شاہی قلعوں سے رعب جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پہ دہلی کا لال قلعہ قابل ذکر ہے۔ قلعہ کے اندر دیوان عام، دیوان خاص، خواب گاہیں، حمام اور نشست محل موجود ہیں اس کے علاوہ قلعہ لاہور میں مثمن برج اور نولکھا پویلین سجاوٹ کے اعتبار سے فن تعمیر کے نادر ترین نمونے ہیں یہ تعمیرات شاہجہان کے شاعرانہ دماغ اور مصورانہ ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔

سعد اللہ خاں چنیوٹی نے لال قلعہ دہلی کے دیوانِ خاص کی دیوار پہ مندرجہ ذیل شعر کندہ کر کے شاہجہان کے فن تعمیر کے کمال کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اگر میں اس عہد کا تعمیری شاہکار روضہ تاج محل ہے یہ روضہ شاہجہان نے اپنی چہیتی ملکہ ارجمند بانو بیگم المعروف ممتاز محل کی آخری آرامگاہ پہ تعمیر کرایا جو دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہلاتا ہے۔

Marfat.com

ممتاز محل تھے ۱۶۳۱ء میں وفات پائی اور بادشاہ نے اگلے سال ملکہ کی آخری آرامگاہ پر اس عالیشان روضہ کی تعمیر شروع کرادی۔ تاج محل کے بیرونی دروازے پر جو کتبہ نصب ہے اس کے مطابق روضہ کی تاریخ تکمیل ۱۶۴۷ء ہے یعنی یہ روضہ سترہ برس میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ "شاہجہان نامہ" کا مصنف عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے کہ اس پر بچاس لاکھ روپیہ صرف ہوا جبکہ پیٹر منڈی لکھتا ہے کہ اس روضہ پر تین کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ ایک اطالوی جیرونیمو ویرونیو (GERONIMO VERONEO) نے اس کا ماڈل تیار کیا تھا۔ بعض مورخین کی رائے میں تاج محل کا ڈیزائنر ایک ترکستانی انجینئر آسٹن دی بولڈیو تھا۔ لیکن فن تعمیر کے ماہر مؤرخ ہیول کے نزدیک تاج محل کا ڈیزائن کسی یورپی باشندے کی دماغی اختراع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تاج محل کے ڈیزائن سے خالص اسلامی طرز تعمیر جھلکتا ہے۔ لہٰذا معین الدین احمد کی یہ رائے مبنی بر حقیقت ہے کہ اس کا ماڈل تیار کرنے والا استاد عیسیٰ ہی تھا جو ایک ایرانی نژاد انجینئر تھا۔ اس کے کہنے امانت خاں شیرازی نے تحریر کیے اور گنبد کی تعمیر اسماعیل خاں ردی کے ہاتھوں انجام پائی۔ تاج محل یقیناً ازدواجی محبت کی ایک حسین یادگار ہے اور شاہجہان کے جذبۂ محبت کی ایک بے مثل تصویر ہے جو سنگ مرمر پر منقش کی گئی ہے۔ روضہ تاج محل مغلیہ عہد کی عظیم ترین اور حسین ترین عمارات میں سب سے ممتاز، مثالی اور جدتِ فن کے لحاظ سے بے نظیر ہے اس کا ہو بہو ماڈل (REPLICA) قلعہ لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے جو پاکستان کو ملکہ الزبتھ ثانی سے بطورِ تحفہ ملا تھا۔

شاہجہانی عہد کی دیگر عمارتوں میں جہانگیر کا مقبرہ آصف جاہ کا مقبرہ اور دہلی کی جامع مسجد قابلِ ذکر ہیں۔ اس عہد میں رنگین ٹائلوں کا رواج عام ہوا۔ ٹھٹھہ میں شاہجہان کی تعمیر کردہ جامع مسجد اور مسجد وزیر خاں لاہور ان رنگین ٹائلوں کے استعمال اور ان کی مقبولیت کی زندہ جاوید مثالیں ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور کا شالامار باغ عہدِ شاہجہانی کی ایک شہرۂ آفاق یادگار ہے جو اپنی طرزِ تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ فنِ تعمیر کا ایک منفرد اور اچھوتا شاہکار ہے۔

عہدِ عالمگیری: اگرچہ عالمگیر مؤدد و تمائش سے طبعی بیگانگی اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث اپنے پیشروؤں کی طرح فنِ تعمیر کی سرپرستی پر خصوصی توجہ نہ دے سکا لیکن اس کے باوجود لاہور میں بادشاہی مسجد تعمیر کروا کر اس نے فنِ تعمیر کے اپنے قدرتی لگاؤ اور اعلیٰ جمالیاتی ذوق کا غیر فانی ثبوت دیا۔ یہ مسجد مغلیہ فنِ تعمیر کی ایک بہترین مثال ہے۔ شاہی قلعہ لاہور کا عالمگیری دروازہ نہ صرف عہدِ عالمگیری کے فنِ تعمیر کی غمازی کرتا ہے بلکہ اورنگزیب کے رعب اور شاہی دبدبے کا بھی مظہر ہے۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی اپنی کتاب "فنونِ لطیفہ بعہد اورنگزیب"

Marfat.com

ہیں یوں رقمطراز ہیں :

"اورنگ زیب عالمگیر کا عہد فن تعمیر کے ضمن میں ایک عجیب و غریب زمانہ ہے۔ کیونکہ ظاہراً تو ہم اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ اس عہد میں فنون عام طور پہ تنزل پذیر ہو چکے تھے۔ مگر جب اس کی وسیع تر سلطنت کے حدود میں تعمیرات پہ نظر ڈالتے ہیں تو وہ شاہکار ملتے ہیں کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"

اس لئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر بھی اپنے آباؤ اجداد کی مانند فن تعمیر میں خاصی دلچسپی رکھتا تھا۔ عہدِ عالمگیری کی عظیم ترین تعمیر بادشاہی مسجد لاہور کا اجمالی تذکرہ طلبار تاریخ کی معلومات کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

بادشاہی مسجد لاہور

بادشاہی مسجد کو عالمگیری مسجد بھی کہتے ہیں کیونکہ اسے اورنگزیب عالمگیر نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ مسجد لاہور قلعہ کے عالمگیری دروازہ کے سامنے مغرب کی جانب ۱۵ فٹ بلند چبوترے پر واقع ہے۔ قلعہ اور مسجد کے درمیان حضوری باغ اور رنجیت سنگھ کی بارہ دری ہے جسے علونانہ بھی کہتے ہیں۔ مسجد کا عالیشان اور پُرشکوہ بڑا دروازہ جانب مشرق سنگ سُرخ اور سنگِ مرمر سے بنایا گیا ہے۔ صدر دروازے میں داخل ہونے سے پیشتر سنگ سرخ کی بائیس سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں سب سے پہلی (نچلی) سیڑھی ۱۲۶ فٹ ۶ انچ لمبی اور سب سے اوپر والی ۷۶ فٹ ۳ انچ لمبی ہے اور ۳۴ فٹ چوڑی ہے۔ ان سیڑھیوں پر کابلی سنگِ ابری استعمال کیا گیا تھا لیکن اب مرمت کے وقت سنگِ سرخ لگا دیا گیا ہے یہ مسجد مکہ کی مشہور مسجد الولید کی نقل ہے۔ صدر دروازہ اپنی شان و شوکت اور رفعت کے لحاظ سے بے مثال ہے۔ یہ سنگ سرخ اور سنگ مرمر سے بنا ہے۔ دروازے کی ڈیوڑھی تقریباً مربع ہے۔ جس کے اوپر دو منزلہ عمارت ہے جس میں اب تبرکات برائے نمائش رکھے ہوئے ہیں دروازے کے عین وسط میں محراب کی پیشانی پر سنگ مرمر کا ایک تختہ نصب ہے جس پر کلمہ طیبہ اور اس کے نیچے مندرجہ ذیل عبارت بخط طغرا کندہ ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ

مسید ابو المظفر محی الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی

سنہ ہزار و ہشتاد و چہار ہجری اتمام یافت

بہ اہتمام کمترین خانہ زادان خان کوکہ اتمام یافت

یہ مسجد اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ۱۰۸۴ھ یعنی ۱۶۷۳ء میں تیار کی گئی اور اس پر چھ لاکھ روپیہ سے زیادہ خرچ ہوا۔ خلاصۃ التواریخ کا مصنف منشی سبحان رائے بٹالوی لکھتا ہے کہ

Marfat.com

مسجد کے اخراجات کے لئے ملتان کا مالیہ وقف تھا۔

مسجد کا صحن شمالاً و جنوباً ۵۲۸ فٹ ۸ انچ اور شرقاً غرباً ۵۲۸ فٹ ۴ انچ ہے۔ اس کا فرش اب سنگ سرخ کا ہے اگرچہ پہلے پختہ اینٹوں کا تھا۔ مسجد کے صحن کے وسط میں وضو کے لئے مربع شکل کا ایک حوض ہے۔ تازہ مرمت کے بعد حوض کے گرد جنگلہ لگا دیا گیا ہے اور وضو کے لئے صدر دروازے کے دائیں جانب ۱۲۸ ٹونٹیوں کا ایک جدید طریقے سے انتظام کیا گیا ہے جس میں خوبصورتی کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ پینے کے لئے پانی کے نل علیحدہ ہیں۔ مسجد کی عمارت صحن کے مغرب میں ہے یہ بلند محرابوں اور تین سفید سنگ مرمر کے گنبدوں پر مشتمل ہے جس کے سنہری کلس نہ صرف سورج کی روشنی میں چمکتے ہیں بلکہ مسجد کی شان کو دوبالا کرتے ہیں۔ مسجد کا دالان ۲۲۵ × ۱۱۵ فٹ ہے اس کی کرسی عید گاہ کے فرش سے چھ فٹ اونچی ہے۔ چھت اور دیواروں کو مختلف قسم کے پتھروں اور رنگین نقاشی اور پچی کاری سے مزین کیا گیا ہے۔ مرکزی دروازہ میں منبر ہے جس پر خطیب کھڑا ہو کر خطبہ پڑھتا ہے۔ مسجد کے چاروں طرف چار بلند مینار سنگِ سرخ کے ہیں ہر ایک مینار کا طول ۱۰۶ فٹ ۴ انچ اور سیڑھیاں تعداد میں ۲۰۴ ہیں۔ چاروں میناروں کی چوٹیوں پر سنگ مرمر کے گنبد ہیں یہ مینار اپنی بناوٹ کے لحاظ سے اگرچہ سادہ ہیں لیکن میلوں دور سے دکھائی دیتے ہیں اور مسجد کی خوبصورتی اور عظمت کو چار چاند لگاتے ہیں۔ یہ مینار مقبرہ جہانگیر کے مینارں سے کچھ عجیب نسبت رکھتے ہیں اور اس طرح جیومیٹریکل بنائے گئے ہیں کہ اگر کسی بھی مینار پہ چڑھ کر جہانگیر کے مقبرہ کے مینارں کو دیکھا جائے تو وہ چار کی بجائے تین ہی نظر آتے ہیں اسی طرح اگر جہانگیر کے مقبرے کے کسی مینار پہ چڑھ کر دیکھا جائے تو شاہی مسجد کے بھی تین ہی مینار نظر آتے ہیں۔ یعنی ایک اوجھل رہتا ہے۔ میناروں پر اب روشنی کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ یہ مینار تاریخی اہمیت کے بھی حامل ہیں۔ انہی میناروں پر چڑھ کر شیر سنگھ نے ۱۸۴۱ء میں مہارانی چندر کور پر جو قلعہ میں اپنی ڈوگرہ فوج کے ساتھ محصور تھی گولیاں چلائی تھیں جس کے نتیجہ کے طور پر رانی کو شکست ہوئی اور شیر سنگھ نے رنجیت سنگھ کی گدی سنبھال لی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اس مسجد کے صحن سے اصطبل کا کام لیتا تھا اور مسلمانوں پر اس کے دروازے بند تھے ۱۸۵۶ء میں سرکار انگلشیہ نے اسے مسلمانوں کے حق میں واگذار کیا۔ مسجد کے شمالی اور جنوبی حصہ میں کئی حجرے بنے ہوئے ہیں جن میں شاہی زمانہ میں طالب علم قرآن شریف کا درس لیتے تھے۔

محمد لطیف تاریخِ لاہور میں لکھتے ہیں کہ اس مسجد کا سنگ سرخ شہزادہ داراشکوہ نے اپنے روحانی پیشوا حضرت میاں میرؒ صاحب کے مزار کے لئے منگوایا تھا۔ جب اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے اس پتھر سے دریائے راوی کے کنارے پر ایک جامع مسجد کی تعمیر

Marfat.com

کا حکم دیا تاکہ لاہور کے مسلمان یکجا ہو کر نماز ادا کر سکیں۔

۱۹۳۹ء میں مسجد کی خستہ حالی کے پیش نظر پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں نے سرکاری طور پر اس کی مرمت کا کام شروع کروایا۔ جو اکیس سال کی لگاتار محنت کے بعد ۱۹۶۱ء کو پایہ تکمیل کو پہنچا۔ سر سکندر حیات خاں نے مرمت کے اخراجات کے لئے مسلمان زمینداروں پر ایک خاص ٹیکس عائد کیا تھا۔ ابتدا میں مرمت کا کام محکمۂ آثار قدیمہ کو سونپا گیا تاکہ مرمت میں مسجد کے قدیم فن تعمیر کو مدنظر رکھا جائے لیکن بعد ازاں یہ کام مرکزی محکمۂ تعمیرات عامہ کو منتقل کر دیا گیا۔ اس مسجد کی دیکھ بھال پہلے انجمن اسلامیہ پنجاب کرتی تھی۔ لیکن اب محکمۂ اوقاف نے اس کا انتظام سنبھال لیا ہے۔

لاہور کی بادشاہی مسجد وسعت کے لحاظ سے ایشیا کی تمام مساجد میں سب سے بڑی مسجد ہے اس میں تقریباً پچھتر ہزار نمازی بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔

مصوّری

سلاطین دہلی کے دور میں فن مصوری کی خاطر خواہ سرپرستی اور حوصلہ افزائی نہ کی گئی۔ کیونکہ اولاً تصویر کشی از روئے اسلام خلاف شرع یت گری کے مترادف تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سلاطین دہلی کے عہد کے فن مصوری کا کوئی شاہکار نہیں ملتا لیکن اسلام کی طرف سے پابندی عائد ہونے کے باوجود حیا لیاتی ذوق رکھنے کے باعث مغل بادشاہ فن تعمیر کی مانند فن مصوّری میں بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

فن مصوری تیرھویں صدی عیسوی میں معرض وجود آیا جسے سب سے پہلے منگول فاتحین نے ایران میں رائج کیا۔ تاریخی تحقیقات کے مطابق درحقیقت یہ چینی دبستان صناعی (آرٹ) کی ایک شکل ہے جو ہندوستانی، بدھ مت، ایرانی، باختری اور منگولائی تہذیبی آثار کا امتزاج ہے۔ وسط ایشیا کے تیموری تاجداروں نے اس کی خوب سرپرستی کی اور وہی اسے برصغیر پاکستان و ہند میں لانے کا موجب بنے۔ مورخین کا خیال ہے کہ برصغیر میں مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر مصوری کے متعدد نادر شاہکار اپنے ساتھ لایا تھا جنہیں تیموری حکمرانوں نے محفوظ کر رکھا تھا۔ نیز وہ اپنے سفر ہرات کے دوران اس فن سے متعارف ہوا۔ جس کے بعد اس نے اس فن کی خوب سرپرستی کی۔

ہمایوں کو بھی اپنے باپ کی مانند موسیقی، شاعری اور مصوری سے بڑا گہرا لگاؤ تھا وہ اپنے زمانۂ جلاوطنی میں ایران کے دو مشہور زمانہ مصوروں میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد سے روشناس ہوا۔ ان کے کمالات فن سے متاثر ہو کر ۱۵۵۰ء میں انہیں کابل مدعو کیا۔ میر سید علی ہرات کے ایک شہرۂ آفاق استادِ فن بہزاد (BIHZAD) کا شاگرد تھا۔ بہزاد سلطان حسین بایقرا اور شاہ اسماعیل صفوی کے درباروں سے وابستہ رہا تھا۔ ہمایوں نے ان سے فنِ مصوّری کی تعلیم

Marfat.com

حاصل کی اور اس کے بیٹے اکبر نے کچھ اسباق لئے جب ہمایوں برصغیر میں دوبارہ وارد ہوا تو وہ دونوں فنکار اس کے ساتھ ہی برصغیر میں آئے عہد اکبری میں ان کی فنی شہرت اپنے عروج کو پہنچی۔

اکبر کو عہد طفلی ہی سے مصوری کے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وجہ اس کے عہد میں اس فن کی بہت زیادہ قدر و منزلت ہوئی۔ اکبر نے نقش و نگار کا ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا اور خواجہ عبدالصمد کو اس کا ناظم مقرر کیا اور اسے "شیریں قلم" کا خطاب عطا کیا۔ مصوری سے اکبر کی دلچسپی اور سرپرستی نے نہ صرف فن مصوری کو بام عروج پر پہنچا دیا بلکہ سرکاری سرپرستی میں فن مصوری کی باقاعدہ ایک عالیشان درس گاہ بھی قائم کی گئی جو دربار اکبری میں بلا تمیز مذہب و ملت لاتعداد فنکاروں کے اجتماع کا موجب ہوئی۔ اکبر کے عہد میں ہی چین اور ایران کے دبستان مصوری، ہندوستانی خیالات و روایات سے متاثر ہوئے جس سے ایک نئے مکتب فکر کی تخلیق ہوئی جو بعد میں مصوری کے نام سے مشہور ہوا لیکن اکبر عہد تک اس میں راجپوتی آرٹ کے گہرے اثرات موجود رہے۔

اکبر نے ایرانی اور ہندوستانی فنکاروں کی متحدہ کاوشوں سے فتح پور سیکری میں اپنے محل کی دیواروں کو نقش و نگار سے مزین کروایا۔ لاہور میں موتی گیٹ کے متصل بیگم شاہی مسجد کے اندرونی حصے کو بھی نقش و نگار سے سجایا گیا۔ علاوہ ازیں عہد اکبری میں متعدد کتابوں کے مصور نسخے تیار ہوئے ایسی مصور کتابوں میں جنگیز نامہ، ظفر نامہ، داستان امیر حمزہ، رامائن، مہابھارت اور عیار دانش قابل ذکر ہیں۔ آئین اکبری میں ابوالفضل رقمطراز ہے کہ "اکبر کے دربار میں مصوروں کی تعداد ایک سو سے زیادہ تھی جنہوں نے اپنے فن میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔" اس عہد کے مصوروں میں عبدالصمد (شیریں قلم)، میر سید علی، فرخ بیگ، وسوتت، تارا چند، بساون اور جگن ناتھ بطور خاص مشہور ہیں۔

شہنشاہ جہانگیر فن مصوری سے بہت گہری دلبستگی رکھتا تھا وہ اس فن کا استاد اور نقاد تھا اور اسے فن کاروں کا شہزادہ (PRINCE OF ARTISTS) کہا جاتا ہے۔ وہ خود "تزک جہانگیری" میں لکھتا ہے کہ "وہ محض تصویر کو دیکھ کر مصور کا نام بتا سکتا ہے اور اگر کوئی تصویر متعدد فنکاروں کا شاہکار ہو تو وہ بلا تامل بتا سکتا ہے کہ کونسا حصہ کس مصور کے موئے قلم کا بنایا ہوا ہے۔" جہانگیر کے عہد میں فن مصوری اپنے منتہائے کمال کو پہنچا۔ جہانگیری عہد میں مناظر قدرت، پھولوں اور پرندوں کی نہایت خوبصورت تصاویر تخلیق ہوئیں۔ فرخ بیگ، محمد نادر، محمد مراد، آغا رضا، منصور اور بشن داس عہد جہانگیری کے مشہور فنکار تھے۔ آغا رضا کو جہانگیر نے "نادر الزمان" کے خطاب سے نوازا اور منصور کو جو پرندوں کی تصویریں بنانے میں یکتائے روزگار تھا "نادر العصر" کا خطاب عطا کیا۔

Marfat.com

اگرچہ شاہجہان کو "تعمیرات کا شہزادہ" کہا جاتا ہے مگر اس نے فن مصوری کی بھی خاطر خواہ سرپرستی کی اور حوصلہ افزائی کی۔ اس کے عہد میں رنگ آمیزی اور حاشیہ آرائی کے اعتبار سے مصوری زیادہ پرکشش اور سحر انگیز ہو گئی۔ اس نے دیواروں کے علاوہ طاقچوں اور محرابوں پر سنہری تابناک رنگوں میں کاشی کی پچی کاری سے منفرد انداز کی تصاویر بنوائیں جن کی چند ایک جھلکیاں قلعہ لاہور کے شاہ برج کی دیوار پر آج بھی اہلِ ذوق کو دعوتِ فکر و نظارہ دیتی ہیں۔ فقیر اللہ، میر ہاشم، انوپ چھترا اور چترامنی شاہجہانی عہد کے مشہور فنکار تھے۔ شاہجہان کے عہد میں آصف خاں اور شہزادہ دارا شکوہ نے بھی فن مصوری کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ لاہور میں آصف خاں کی حویلی آرائش، نقش و نگار کے لحاظ سے خوبصورت ترین عمارت متصور ہوتی تھی۔

اورنگ زیب فن مصوری میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں مذہب اور مصوری کے تصادم کی وجہ سے اس فن کو زوال و انحطاط سے دوچار ہونا پڑا۔ اس نے تمام درباری مصوروں کو دربار سے الگ کر دیا۔ چنانچہ اکثر مصور حیدر آباد دکن، لکھنؤ اور بنگال چلے گئے تاہم عالمگیری عہد کی بے شمار تصاویر موجود ہیں جن میں جنگوں اور مے صروں کی تصاویر کے علاوہ اورنگ زیب کے فرزندوں بالخصوص شہزادہ سلطان محمد کی تصاویر ہیں لیکن فن مصوری راجپوتانہ میں اپنی ترقی کے منازل طے کرتا رہا اور یہ مکتبۂ فکر راجپوت فن مصوری کے نام سے مشہور ہوا۔

موسیقی

تمام مغل تاجدار موسیقی کے بہت دلدادہ تھے۔ مغلیہ عہد میں موسیقی تہذیب کا ایک اہم جزو سمجھی جاتی تھی۔ مغلیہ سلطنت کا بانی بابر موسیقی سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتا تھا وہ نہ صرف خود ایک بہت اچھا موسیقار تھا بلکہ اس نے خود کئی گیت اور ان کی دھنیں تخلیق کیں ہمایوں نے بھی موسیقی کی بہت سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی۔ اس کے دربار میں موسیقاروں کی ایک جماعت موجود تھی اور اس نے پیر اور بدھ کے دن محفلِ موسیقی کے لئے مقرر کر رکھے تھے۔

سوری سلاطین نے بھی موسیقی کی ترقی و نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ اسلام شاہ اور عادل شاہ فن موسیقی کے مربی تھے۔ عادل شاہ خود ایک عظیم موسیقار تھا اور اپنے فن کا شہرہ آفاق استاد تھا۔ باز بہادر اور تان سین اس کے شاگرد تھے۔

دربار اکبری متعدد مشہورِ زمانہ موسیقاروں سے مزین تھا ان میں میاں تان سین اور باز بہادر حد درجہ ممتاز تھے۔ علاوہ ازیں بیجو باورا، سورداس اور رام داس جیسے شہرہ آفاق موسیقار بھی اکبری دربار کی زینت بنے ہوتے تھے۔ میاں تان سین عرف تنو گوالیار کا نومسلم تھا اور اکبر کے نورتنوں میں شامل تھا۔ اکبر نے اسے مرزا کا خطاب عطا کیا وہ تمام عمر اکبری دربار سے وابستہ رہا۔ ملہار، میاں کی ٹوڈی اور میاں کی سارنگ جیسی راگنیاں اس کی ایجاد کردہ ہیں۔ اس نے اپریل

Marfat.com

۱۵۸۹ء میں وفات پائی اور گوالیار میں مدفون ہوا۔ اکبر خود بھی موسیقی کا بہت ماہر تھا اور نقارہ بڑی عمدگی سے بجاتا تھا۔ وہ راگ راگنیاں بڑے ذوق و شوق سے سنتا تھا۔ اکبری عہد کے امراء میں عبدالرحیم خان خاناں موسیقی کا بہت بڑا سرپرست اور مربی تھا۔ متعدد موسیقار اس کی ملازمت میں تھے۔

جہانگیر بھی موسیقی کا بہت دلدادہ تھا۔ موسیقاروں کی ایک بھاری تعداد اس کے دربار سے وابستہ تھی۔ تان سین کا لڑکا بلاس خاں اس عہد کا ایک عظیم فنکار تھا۔ یورپی سیاح ولیم فنچ (WILLIAMS FINTCH) رقمطراز ہے کہ "سینکڑوں موسیقار اور رقاصائیں فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے خدمت شاہی میں ہمہ وقت موجود رہتی تھیں۔ جنہیں بادشاہ یا حرم شاہی کی طلبی پر کسی وقت بھی مظاہرۂ فن کے لئے مستعد رہنے کا حکم تھا۔" [1]

عہدِ شاہجہان میں اس فن کی حوصلہ افزائی میں مزید اضافہ ہوا۔ بادشاہ بذات خود اس فن میں مہارت کامل رکھتا تھا۔ اس نے خود کئی ہندی گیت مرتب کئے۔ تان سین کا داماد لال خاں اس کے دربار کا موسیقارِ اعظم تھا۔ شاہجہان نے اسے "گن سمندر" کا خطاب عطا کیا۔ جگن ناتھ بھی شاہجہانی عہد کا ایک مشہور موسیقار تھا۔ وہ سنسکرت زبان کا ایک بلند پایہ شاعر اور کئی زبانوں کا موجد تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے اس کے فن سے متاثر ہو کر اسے اس کے وزن کے برابر سونا بطور انعام عطا کیا۔

اورنگ زیب عالمگیر بھی فن موسیقی کا ماہر تھا اور اپنے عہد کے ابتدائی دس سال تک وہ اس فن کا مربی رہا۔ "مآثر عالمگیری" کا مصنف ساقی مستعد خاں لکھتا ہے کہ "اس کے دربار میں موسیقاروں کی ایک بھاری تعداد جمع ہو گئی تھی اور وہ اپنے عہد کے ابتدائی سالوں میں موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ لیکن ۱۶۸۸ء میں جونہی وہ سن رسیدہ ہوا اس نے دربار کے تمام موسیقاروں کو برخواست کر دیا اور موسیقی کی شاہی سرپرستی یکسر ختم کر دی۔" اس پر جمعہ کے روز جب بادشاہ نماز کے لئے جامع مسجد کی طرف جا رہا تھا کچھ لوگ ایک جنازہ اٹھائے اور زور سے مرثیہ خوانی کرتے ہوئے گذرے۔ بادشاہ نے اس ماتم سرائی کی وجہ دریافت کی تو اسے بتایا گیا کہ بادشاہ کے حکم سے فن موسیقی مر چکا ہے اور اب اسے دفن کرنے جا رہے ہیں۔ بادشاہ نے برملا جواب دیا کہ وہ موسیقی کی روح کیلئے دعا کریں اور اسے (موسیقی) بہت زیادہ گہرائی میں دفن کریں۔ تاکہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔ لیکن شاہی سرپرستی کے ختم ہونے کے باوجود موسیقی ترقی پذیر رہی اور اب شہزادوں اور امراء کے علاوہ

---

[1] ڈبلیو فوسٹر "ارلی ٹریولز" صفحہ ۱۸۳

Marfat.com

عوام بھی اس کے مربّی بن گئے۔ اورنگزیب کے جانشین باقاعدہ طور پہ موسیقی کی قدر افزائی کرتے رہے۔ تختِ طاؤس کا آخری وارث محمد شاہ رنگیلا موسیقی کی سرپرستی کرتے ہیں سب پر سبقت لے گیا۔

امتحانی سوالات

۱۔ "برِّصغیر پاک و ہند کے ثقافتی ارتقاء کی تاریخ میں مغلیہ عہد کو ایک اہم مقام حاصل ہے"۔ بحث کیجئے۔

۲۔ عہد مغلیہ میں علم و ادب کی ترقی کا تذکرہ کیجئے۔

۳۔ مغلیہ عہد کے نظامِ تعلیم پر ایک مدلل مضمون لکھئے۔

۴۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں ادبی ترقی کا عہد بہ عہد جائزہ لیجئے۔

۵۔ مغلیہ دور میں فنِ تعمیر، مصوّری اور موسیقی کی ترقی کا حال بیان کیجئے۔

۶۔ مغلیہ فنِ تعمیر پہ ایک جامع مضمون تحریر کرتے ہوئے مغلیہ عہد کی اہم عمارات کا تذکرہ کیجئے۔

۷۔ "شاہجہان کا دور مغلیہ فنِ تعمیر کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جونہی ہم اس دور میں داخل ہوتے ہیں ہمیں مغلیہ فنِ تعمیر منتہائے عروج پہ پہنچا ہوا نظر آتا ہے"۔ (پرسی براؤن) تشریح کیجئے۔

۹۔ مندرجہ ذیل پہ نوٹ لکھئے:

(ا) مغل عہد میں تعلیم نسواں۔ (ب) مغلیہ دور میں ہندی و بنگالی ادب کی ترقی۔

(ج) مغلیہ عہد میں فارسی اور اردو ادب کا ارتقاء۔

(د) فنِ موسیقی۔ (ر) روضۂ تاج محل۔

(س) بادشاہی مسجد لاہور۔

Marfat.com

بارھواں باب

معاشرتی اور اقتصادی حالات

مغلیہ عہد جس میں زندگی کے ہر شعبہ میں بہت کچھ ترقی ہوئی، مختلف رنگ کے لحاظ سے بھی تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔

معاشرتی زندگی

عہد مغلیہ کا معاشرہ اگرچہ بہت سی جزوی باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف تھا لیکن مجموعی حیثیت سے اس میں ایک خاص یکسانیت پائی جاتی تھی۔ علوم و فنون کی سرپرستی، فنون لطیفہ کی ترویج و اشاعت، ذوق سلیم کی نشوونما، شعر و ادب کی قدردانی، ان سب کی وجہ سے ہر شخص کی زندگی میں ایک خاص رچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ہر شخص کی زندگی میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور وضع داری پائی جاتی تھی

۲- امراء: بادشاہ اور خاندان شاہی کے بعد امرار کا طبقہ تھا۔ اس طبقہ میں منصبدار، وزراء اور جاگیردار شامل تھے۔ یہ ملک کا امیر ترین طبقہ تھا اور عیش و عشرت کی زندگی گزارتا تھا۔ حکومت کا اقتدار زیادہ تر انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس وجہ سے یہ لوگ حکمران طبقہ بھی کہلاتے تھے۔ امرار کارکردگی کے اعتبار سے اہم عہدے اور مراتب پاتے تھے۔ عہدے اور مناصب موروثی نہ ہوتے تھے۔ بلکہ محض استحقاق کی بنا پر عطا ہوتے تھے امرار کی اولاد کو منصب اور جاگیر میراث میں نہیں ملتی تھی۔ امرار کے بیٹے نچلے درجے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کرتے اور صرف صلاحیت اور قابلیت کی بنا پر بتدریج ترقی کر کے اہم مناصب تک پہنچتے۔ گویا شاہی ملازمت محض استحقاق یعنی صلاحیت و قابلیت کی بنا پر ملتی تھی۔ شمس الدین محمد اتکہ خاں ایک معمولی سپاہی سے ترقی کر کے اکبر کا وکیل سلطنت بنا۔ جہانگیر کا وزیر اعلیٰ مرزا غیاث بیگ (اعتماد الدولہ) اور شاہجہان کے وزیر اعظم علامی سعد اللہ خاں چغتائی نے معمولی محرر کی حیثیت سے ترقی کرتے ہوئے وزارت عظمیٰ جیسا اعلیٰ منصب پایا۔ الغرض امرار صرف صلاحیت کی بنا پر ہی بنتے تھے۔ ترقی کے دروازے بلا تمیز رنگ و نسل ہر ایک کیلئے کھلے تھے۔

حکومت کی طرف سے امرار کو بیش قرار مشاہرے ملتے تھے۔ ہر بات میں شہنشاہ کی پیروی کرنا اور شکوہ و تجمل اور اسراف و تعیش کی زندگی بسر کرنا ان کا معمول حیات تھا چونکہ منصبدار کی وفات پر اس کی جائداد ازروئے قانونِ اشچیٹ بحق سرکار ضبط ہو جاتی تھی اس لئے امرار بچت کے قائل نہ تھے اور اپنی دولت کو عیش و عشرت اور رنگ رلیوں میں بے دریغ صرف کرتے تھے۔ اکثر منصبدار ملک کی ثقافتی اور تعلیمی ترقی میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ اس طبقہ میں مختلف قوموں (ایرانی۔ افغانی، تورانی اور ہندوستانی) کے افراد شامل تھے۔ یہ طبقہ رفاہِ عامہ کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ نیز اس کے باحیثیت افراد مساجد، مندر، تالاب، باغات اور اپنے لئے یا اپنے بزرگوں کے لئے مقبرے تعمیر کراتے تھے۔

۳- متوسط طبقہ: یہ طبقہ اہل علم اور اعلیٰ قابلیت رکھنے والے لوگوں مثلاً اساتذہ، علماء اطباء۔ سرکاری ملازمین، تاجروں، فنکاروں اور دستکاروں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ اپنے اپنے پیشے کے لحاظ سے معاشرہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لہذا متوسط طبقہ کے افراد عموماً اپنی حیثیت کے مطابق سادہ مگر راحت و آرائش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف مطمئن، فارغ البال اور آسودہ حال تھے بلکہ بے پناہ دولت کے مالک تھے۔ انگریز سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ تاجروں میں ایسے

Marfat.com

تاجر بھی تھے جن کے پاس اس عہد کے بنک آف انگلینڈ سے زیادہ سرمایہ موجود تھا۔ سورت کا ویرجی دنیا کا امیر ترین تاجر متصور ہوتا تھا۔ مرشد آباد کے ماروا ڑی سیٹھ کروڑوں کے مالک تھے اور ہنڈیوں، بنک کاری اور درآمد برآمد کا کاروبار کرتے تھے۔

متوسط طبقہ کے بعد غریب مزدوروں، کاریگروں، گھریلو ملازمین اور مزارعین کا

۴۔ عوام: طبقہ تھا جو طبقۂ عوام کہلاتا تھا۔ مغل دور کے عوام موجودہ دور کے عوام کی طرح مفلس اور دست نگر نہ تھے بلکہ اطمینان اور قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس طبقہ کے لوگ کفایت شعار اور ایماندار تھے۔ مسلم عوام عموماً فوجی ملازمت کے شائق تھے۔ مغلوں کے عہد میں قابل کاشت زمین کی فراوانی کے مقابلے میں آبادی کم تھی۔ کاشتکار طبقہ خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ کاشتکار لوگوں کی ضروریات زندگی محدود اور سادہ تھیں۔ اگرچہ فصلوں کی تباہی یا قحط سالی کے باعث انہیں تکالیف اور مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا لیکن ایسے مواقع پر مغل بادشاہ کمال فیاضی سے تو ری امدادی اقدامات کرتے اور محتاجوں اور قحط زدگان کے لئے ملک میں جا بجا لنگر خانے کھول دیئے جاتے تھے۔ نیز ایام قحط سالی میں حکومت کی جانب سے نہ صرف مالیہ معاف کر دیا جاتا بلکہ ان کی از سر نو معیشتی بحالی کے لئے تقاوی قرضے بھی جاری کئے جاتے تھے علاوہ ازیں بے روزگاری کے سدباب کے لئے حکومت ملک میں تعمیرات کی طرف خاص توجہ دیتی تھی اس طرح نہ صرف مزدور لوگ آبرومندانہ روزی حاصل کرتے تھے بلکہ متعدد فنکاروں کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

طرز زندگی

مغل امراء کی طرز زندگی میں نمود و نمائش اور شان و شوکت کو بہت دخل تھا۔ وہ عالیشان، خوبصورت پرشکوہ محلات میں رہائش رکھتے تھے۔ مغل بادشاہ تعصب سے یکسر بیگانہ اور رواداری کے علمبردار تھے۔ غیر مسلموں کو اپنی مذہبی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی پوری آزادی تھی۔ اس فراخدلانہ رویہ کی بدولت ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ ان کے باہمی تعلقات خوشگوار تھے۔ دونوں قومیں اچھے ہمسایوں کی مانند زندگی گزارتی تھیں اور تہواروں اور میلوں میں باہمی حصہ لیتی تھیں۔ ان کے باہمی تعلقات کی خوشگواری اس حد تک بڑھی کہ کہیں کہیں آپس میں رشتے ناطے بھی ہونے لگے۔ دونوں قوموں نے ایک دوسرے کا ادب پڑھا جس سے ہر دو اقوام کی تہذیبیں متاثر ہوئیں، اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوؤں میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی اور انہوں نے سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی شروع کر دی۔ اس دور میں غیر مسلموں میں جذبۂ قومیت پیدا ہونے کے باعث مذہبی

Marfat.com

نفاق پیدا ہوا۔ تاہم مغل دور میں عوام امن و آشتی کی زندگی بسر کرتے تھے اور فرقہ وارانہ فسادات قطعی رونما نہ ہوتے تھے۔

مسلمان لباس میں بالعموم شلوار قمیض اور دستار استعمال کرتے تھے اور عام طور پر داڑھی رکھتے تھے۔ امرا بیش قیمت قبا اور اس پر لمبا چست چغہ پہنتے تھے۔ سرکاری افسران امتیازی نشان کے طور پر سرخ دستار باندھتے تھے۔ ہندو مرد دھوتی، قمیض اور پگڑی پہنتے تھے اور ہندو عورتیں ساڑھی باندھتی تھیں۔ مرد اور عورتیں دونوں زیورات بھی پہنتے تھے۔

گوشت، چاول روٹی اور مچھلی مسلمانوں کی عام غذائیں تھیں۔ ان کے علاوہ پلاؤ، کباب بریانی، زردہ، کوفتہ اور مختلف اقسام کے پکے ہوئے مرغ بھی بطور غذا استعمال ہوتے تھے۔ چاول اور دال کی کھچڑی دیہات اور شہر دونوں جگہ مرغوب تھی۔ شادی بیاہ کے رسم و رواج بالکل آجکل کی طرح تھے۔ مسلمان عیدین، شب برات، میلاد النبی جیسی اسلامی تقریبات بڑے اہتمام سے مناتے تھے۔ خوشی کی تفریحات میں عام لوگ پتنگ بازی، کبڈی اور کشتی گیری کے کھیلوں سے دل بہلاتے تھے۔ دیہات کے لوگ آنکھ مچولی، گلی ڈنڈا اور گیند کھنڈی (ہاکی) کے بہت شوقین تھے۔ امرا میں چوگان، ہاتھیوں کی لڑائی اور شکار وغیرہ کے تفریحی مشاغل پسندیدہ تھے۔

مغل بادشاہوں اور امرا میں حرم کا رواج عام تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق اکبر کے حرم میں پانچ ہزار کے قریب عورتیں تھیں۔ اسی طرح جہانگیر کے حرم میں بھی لاتعداد عورتیں تھیں۔ امرا میں بھی بادشاہوں کی پیروی میں ایک سے زائد شادیاں رچانے کا رجحان عام تھا۔ بادشاہ اور امرا کے حرم میں رقاصاؤں اور مغنیاؤں کی خاصی تعداد موجود ہوتی تھی۔

ہندوؤں میں بچپن کی شادی کا رواج عام تھا۔ عموماً سات سال کی عمر میں لڑکی کو بیاہ دیا جاتا تھا۔ اگرچہ ہندو معاشرہ میں صرف ایک بیوی کی اجازت تھی، مگر ہندو امرا میں تعدد ازدواج کا رواج عام تھا۔ ہندوؤں میں ستی کی ظالمانہ رسم بھی موجود تھی۔ گو اکبر سے اورنگ زیب تک تمام مغل فرمانرواؤں نے اسے ختم کرنے کے لئے موثر اقدامات کئے، مگر یہ رسم کلی طور پر ختم نہ ہو سکی۔ ہندو سوسائٹی میں توہم پرستی عام تھی۔ علاوہ ازیں اہل ہنود جادو اور ہیئت و نجوم پر ایمان کی حد تک اعتماد رکھتے تھے۔

مسلم امرا میں تہذیب و آداب کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ غیر ملکی سیاح اور مورخ ان کی شائستگی اور خوش اطواری سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ان کی گفتگو میں بے حد مٹھاس اور دھیما پن تھا۔ مہمان کی تواضع پان کی گلوری سے کی جاتی تھی۔

مغل دور میں عورتیں پردے کی سخت پابند تھیں انہیں اعلیٰ تہذیب و اخلاق سے آراستہ

Marfat.com

کرنے کے لئے تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ علم و ادب اور تہذیب و شائستگی اور سلیقہ مندی کی بدولت انہیں نہ صرف مقتدر حیثیت بلکہ معاشرے میں بھی خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا۔

سلطنت مغلیہ کی آبادی زیادہ تر ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ برصغیر کے بعض مقامات پر بدھ، جین، پارسی اور عیسائی بھی آباد تھے لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ بھاری اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ ملک کی کل آبادی دس کروڑ تھی جس میں مسلمان ایک تہائی کے لگ بھگ تھے۔

مذہب اسلام کے زیر اثر ہندوؤں میں نئی مذہبی تحریک نے جنم لیا۔ چنانچہ ہندو معاشرہ کی اصلاح کا آغاز ہوا۔ ہندوؤں نے نہ صرف فارسی زبان سیکھی بلکہ انہوں نے مسلم تمدن کو بھی اپنانا شروع کر دیا۔ اس سے ہندو معاشرہ میں ایک روشن خیال طبقہ پیدا ہو گیا۔ یہ لوگ کائستھ کہلاتے تھے۔ مغل بادشاہوں نے قابل ہندو افراد کی سرپرستی کی اور انہیں امراء کا درجہ دیا۔ نتیجتہً کائستھ اور کھشتری اپنے اپنے جوہر استعداد کے بل بوتے پر سیاسی و مجلسی اہمیت کے اہم مقامات پر پہنچ گئے۔ مغل بادشاہوں نے رسم ستی کی روک تھام، بچہ کشی کی ممانعت اور اوہام پرستانہ رسومات کی تنسیخ سے ہندو معاشرہ میں روشن خیالی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ مجلسی اور ثقافتی روابط قائم کر کے ان سے تہذیبی اور تمدنی مفاہمت کا ماحول بھی استوار کیا۔ چنانچہ بہت سے شہزادوں اور امراء نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں۔ ہندو فلسفے کا مطالعہ کیا اور ہندوؤں کے مذہبی تہواروں مثلاً ہولی، دیوالی، دسہرہ اور راکھی بندھن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نتیجتہً اس دور میں بحیثیت مجموعی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلوص و محبت پر مبنی خوشگوار تعلقات استوار ہوئے۔

اقتصادی حالت

اقتصادی لحاظ سے برصغیر پاک و ہند اتنا خوشحال کبھی نہ ہوا تھا جتنا مغلوں کے دور میں تھا۔ بقول ولیم ہاکنز "برصغیر سونے اور چاندی سے بھرپور ہے۔ برصغیر کی خوشحالی اس کی متنوع چیزوں کی آئینہ دار تھی، پیداوار کی فراوانی، اشیاء کی ارزانی، تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی۔

پیداوار کی فراوانی:

مذہ زمانۂ قدیم سے پیداواری لحاظ سے برصغیر پاک و ہند ایک زرعی ملک ہے اسی لئے شروع ہی سے زراعت کو ملک کی اقتصادیات کی کنجی ہونے کا درجہ حاصل رہا ہے۔ مغلیہ دور میں اقتصادی لحاظ سے ملک خود کفیل تھا۔ قابل کاشت اراضی کی فراوانی کی وجہ سے پیداوار کی اس قدر بہتات تھی کہ دنیا بھر میں برصغیر پاک و ہند "سونے کی چڑیا" کے نام سے مشہور تھا۔ غیر ملکی سیاحوں نے بھی اپنے سفرناموں میں

Marfat.com

اس کی غذائی اجناس کی افراط اور معمتوعات کی بے انتہا فراوانی کا ذکر کیا ہے۔ سباسٹین منریق رقمطراز ہے کہ :

"میں ہر جا اشیائے خوردنی، گندم، چاول، گھی، سبزیوں، گنا اور مختلف اقسام کے تیل وغیرہ کی فراوانی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہر منڈی میں ان چیزوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ کئی جہاز بھرے جا سکتے تھے۔"

پاک و ہند کی زمین زرخیز اور باشندے محنتی تھے۔ بارش بکثرت ہوتی تھی۔ اگرچہ بہم رسانی آب کے لئے موجودہ زمانے کا ترقی یافتہ اور سائنٹیفک طریقہ یعنی (ڈیم سسٹم)، اور نہروں کا سلسلہ نہ تھا تاہم کاشتکار رہٹ کے ذریعے آبپاشی کرتے تھے اس لئے پیداوار کی فراوانی تھی۔ گرم و مرطوب آب و ہوا اور زمین کی زرخیزی نے عوام کو خوشحال بنا دیا تھا۔ مغلیہ دور کی پیداوار زیادہ تر گندم، چاول سبزیوں، گنا، تیل نکالنے کے بیج، کپاس اور تمباکو پر مشتمل تھی۔ علاوہ ازیں ملک کی ہر منڈی میں سوتی کپڑوں، دواؤں، تمباکو، افیون اور خوشبودار تیلوں کی انتہائی فراوانی وارزانی تھی۔ مغل بادشاہ زراعت کی ترقی اور کاشتکار طبقہ کی فلاح و بہبود پر خاص توجہ دیتے تھے۔ قحط سالی کے ایام میں نہ صرف کاشتکاروں کا مالیہ معاف کر دیا جاتا، بلکہ انہیں بلا سود تقاوی قرضے بھی مہیا کئے جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ کاشتکار پیداواری ترقی میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔

اشیاء کی ارزانی :

پیداوار کی کثرت کے باعث اور ملکی منڈیوں میں مال کی افراط کی وجہ سے اشیاء کی قیمتیں بہت معمولی تھیں۔ پیداوار کی فراوانی اور اشیاء کی ارزانی نیز سونے چاندی اور دوسری قیمتی اشیاء کی بہتات پر غیر ملکی سیاح بے حد متعجب ہوتے تھے۔ سباسٹین منریق راج محل (بنگال) میں اشیاء کی بے حد افزائش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-

"شہر میں تجارت کی ہر شے خصوصاً اشیائے خوردنی برائے فروخت بہ افراط موجود تھیں، جن کی قیمتیں بہت کم تھیں۔"

اطالوی سیاح برنیئر بھی برصغیر میں غیر معمولی ارزانی کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ:

"ایک روپیہ میں بیس یا اس سے بھی زیادہ عمدہ مرغ خریدے جا سکتے ہیں۔ بھینس بطخیں، بکریاں، بھیڑیں اور مچھلی بہت معمولی قیمت پر بکثرت مل سکتی ہیں۔"

پیداواری افراط اور اشیاء کی ارزانی کے باعث عوام الناس مطمئن اور آسودہ حال تھے اور حکومت کی معاشی حالت بھی مستحکم تھی۔

تجارت :

یورپ اور ایشیاء کے متعدد ممالک سے نفع بخش تجارتی تعلقات قائم تھے۔

Marfat.com

برصغیر عہدِ مغلیہ میں فرنگا، برما، جاپان، جزائر شرق الہند، نیپال، ایران، وسطِ ایشیا، عرب اور مشرقی افریقہ کے ممالک سے تجارتی لحاظ سے منسلک تھا۔ غیر ممالک میں پاک و ہند کی مصنوعات کی بڑی مانگ تھی۔ غیر ملکی تجارت کی بدولت برصغیر کافی امیر ملک بن گیا تھا۔ دولت کی فراوانی کی وجہ سے یورپ والے برصغیر کو سونے کی چڑیا سمجھتے تھے۔ سورت، کھمبات، گوا، کالی کٹ، کوچین چٹاگانگ اور ستارگاؤں مشہور بندرگاہیں تھیں۔ سوتی بارچات، گرم مصالحہ جات، تیل، افیون، ابریشم، نیل، اونی اور ریشمی کپڑا، ہینگ، نمک اور سینکڑوں دوسری اشیاء اور ادویہ وغیرہ غیر ممالک کو برآمد کی جاتی تھیں۔ درآمدی اشیاء میں سونا، جواہرات، عنبر، مرجان، عطریات، چینی کے برتن، شراب اور گھوڑے قابلِ ذکر ہیں۔ ملکی منڈیوں میں ہر قسم کے مال کی کثرت تھی۔ ملکی تاجر برآمدی مال کے عوض سونا اور چاندی کی وصولی کو ترجیح دیتے تھے۔

غیر ملکی سیاحوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ مغلیہ عہد میں تجارت کے میدان میں ہندوؤں کی اجارہ داری تھی اور تاجر طبقہ کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ اکثر تاجروں کا کاروبار ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ اکثر تاجر درآمدی اور برآمدی تجارت کے علاوہ ہنڈیوں کا کام بھی کرتے تھے۔ غیر ملکی تاجر اپنا مال و اسباب ان کے حوالے کر دیتے اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر وصول کر لیتے تھے۔ سورت کا ایک تاجر ویرجی وہرہ دنیا کا امیر ترین تاجر تھا۔ وہ تجارت کے ساتھ ساتھ بنک کاری اور ہنڈی کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ اسی طرح مرشد آباد کے ماروا ڑی سیٹھ بھی کروڑ پتی تھے اور کروڑوں روپے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے گودام ہمہ وقت سامانِ تجارت سے بھرپور رہتے تھے۔

برصغیر کے تمام مسلمان حکمرانوں بالخصوص مغل بادشاہوں نے تجارتی فروغ کے لئے مؤثر اقدامات کئے۔ شیر شاہ سوری نے اہم تجارتی شہروں کو سڑکوں کے ذریعے مربوط کیا اور تاجروں کے تحفظ کے لئے نہ صرف سڑکوں پر جا بجا سرائیں تعمیر کرائیں بلکہ محصولات بھی ختم کر دیئے۔ غیر ملکی تاجروں سے اچھا سلوک روا رکھتے ہوئے انہیں متعدد تجارتی مراعات عطا کیں اور درآمدی اشیاء پر معمولی محصول عائد کیا۔ اس طرح نہ صرف تجارتی اور اقتصادی حالت مضبوط ہوئی بلکہ متعدد غیر ممالک سے تجارتی تعلقات بھی استوار ہو گئے۔

صنعت و حرفت :

چونکہ مغلیہ دور میں اقتصادی حالت بہت مستحکم تھی اس لئے تجارتی ترقی اور غیر ممالک میں برصغیر پاک و ہند کی مصنوعات کی مانگ بڑھ جانے سے صنعت و حرفت کو خوب فروغ ہوا۔ اس ترقی کا اعتراف کرتے ہوئے مورلینڈ رقمطراز ہے کہ "میرے دماغ میں یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ آجکل کی بجائے مغل دور کا برصغیر

Marfat.com

صنعتی لحاظ سے دیبیڑن یورپ سے کہیں افضل تھا۔" برصغیر کی سوتی کپڑے کی صنعت اس قدر ترقی پذیر تھی کہ برصغیر اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ کم و بیش نصف دنیا کو کپڑا مہیا کرتا تھا۔ مشرقی افریقہ، مصر، عرب، یورپ، برما، جاپان اور بعض دیگر ممالک کی منڈیاں برصغیر کے مال سے بھری رہتی تھیں۔ ریشمی کپڑے کی صنعت کو بھی بہت ترقی ہوئی۔ بنگال اس صنعت کا خصوصی مرکز تھا۔ صنعتی مصنوعات میں سوتی، ریشمی اور اونی کپڑا، ریشمی شالیں، قالین، لوہے، پیتل، تانبہ اور سونے چاندی کے ظروف اور چمڑے کا سامان خاص طور پر قابل ذکر تھا۔ برصغیر پاک و ہند کی بنی ہوئی تلواریں اور دوسرے جنگی ہتھیاروں کی بھی بہت مانگ تھی۔ کپڑے کی صنعت کے اہم مراکز ڈھاکہ بنارس، آگرہ، ملتان، برہان پور، لاہور گجرات، احمد آباد، پٹنہ، بروچ اور سورت تھے۔ سوتی کپڑے کی تقریباً آٹھ ہزار گانٹھیں، ہر سال یورپ کو برآمد کی جاتی تھیں۔ چٹاگانگ میں جہاز سازی کا کام بھی ہوتا تھا اور اس صنعت میں بقول بارکنسن "ہندوستانیوں نے انگریزوں کو بہت کچھ بتایا۔"

مغل حکومت نے خود کئی ایک صنعتوں کے کارخانے قائم کر رکھے تھے جن میں مغلیہ دربار اور مغل فوج کی ضروریات کا سامان تیار ہوتا تھا۔ یہ کارخانے زیادہ تر لاہور، احمد آباد، فتح پور اور آگرہ میں قائم تھے۔ یہ سرکاری کارخانے خانِ سامان کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ اکبر نے سوتی کپڑے کی صنعت کے فروغ کے لئے متعدد موثر اقدامات کئے۔ نتیجتہً یورپ میں برصغیر کے سوتی کپڑے کی اس قدر مانگ بڑھ گئی کہ پیداوار میں اضافے کے لئے مزید کارخانے قائم کرنے پڑے۔ اکبر نے مصنوعات کے معیار کو بلند کرنے کے لئے نہ صرف فنکاروں کو مزید صنعتی تربیت کے لئے بیرونی ممالک میں بھیجا بلکہ کشمیر، ایران اور ترکستان سے باہر ماہر فنکار بھی بلوائے۔ اکبر صنعتی ترقی میں اس قدر دلچسپی لیتا تھا کہ بسا اوقات کارخانوں میں خود جا کر مزدوروں کے کام کا معائنہ کرتا تھا۔ اس نے شال زری اور قالین سازی کی صنعت کے متعدد کارخانے لاہور اور آگرہ میں قائم کئے۔

شہر اور قصبات

مغلیہ سلطنت میں متعدد گنجان آباد، بارونق اور خوبصورت شہر تھے جن کی خوشحالی اور دولت کی تمام غیر ملکی سیاح تعریفیں کرتے ہیں۔ جیونٹ، منشی کلپادری مانسیرٹے جو کابل کے سفر میں اکبر کے ہمراہ تھا لاہور کے متعلق لکھتا ہے کہ "۱۵۸۱ء میں لاہور، یورپ اور ایشیا کے کسی شہر سے کم نہیں ہے۔" جہانگیر کے ابتدائی عہد میں فنچ نے برصغیر پاک و ہند کی سیاحت کی۔ اس کی رائے میں آگرہ اور لاہور، لندن سے کہیں عظیم شہر تھے۔ برصغیر کے دوسرے بڑے شہر یعنی صنعتی مراکز اور تاجروں کے مسکن سورت احمد آباد، الہ آباد، بنارس اور پٹنہ تھے جن کی تعریف میں اکثر یورپی سیاح رطب اللسان ہیں۔ بعد میں کلکتہ، مدراس اور کراچی دورِ انگلشیہ کی بندرگاہیں ہیں۔ مغل دور کی بندرگاہوں میں سورت، کھمبایت

Marfat.com

لاری بند اور سنار گاؤں قابل ذکر ہیں۔

مغل شہروں کی رونق اور خوشحالی کی اہم وجہ صنعت و تجارت کی ترقی اور ملک میں امن و امان کا قیام تھا۔ شہروں میں عمدہ نظم و نسق کے نفاذ نے بھی ان کی رونق اور خوشحالی کو دوبالا کیا ہوا تھا۔ دور کے میونسپل بورڈ اور کارپوریشن کے متعدد فرائض کوتوال شہر کو انجام دینا پڑتے تھے۔ صفائی کا انتظام، امن و امان کی بحالی، اشیاء کے نرخوں کی نگرانی اور اوزان کی جانچ پڑتال کرنا بھی کوتوال کے فرائض میں داخل تھا۔

الغرض مغل دور میں برصغیر پاک و ہند کی اقتصادی حالت مستحکم اور پائیدار تھی۔ تجارت و صنعت ترقی پذیر، پیداوار بافراط اور اشیائے ضرورت ارزاں تھیں۔ شہر پررونق اور گنجان آباد تھے۔ ملک میں دولت کی ریل پیل تھی۔ بیرونی ممالک سے تجارت کا توازن کافی عرصہ تک پاک و ہند کے حق میں تھا۔ ایگزانڈر ڈوَر رقمطراز ہے کہ:

"جب تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی اجارہ داری قائم نہ کرلی بنگال ایک ایسا گڑھا متصور ہوتا تھا جس میں سونا اور چاندی غائب ہوتے رہتے تھے اور ان کے واپس ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔"

پاک و ہند میں دنیا بھر کے تاجروں اور سونے چاندی کے ذخائر کی آمد اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ مغلیہ عہد اقتصادی لحاظ سے مستحکم اور خوشحال تھا۔

امتحانی سوالات

۱۔ مغلیہ عہد کی معاشرتی زندگی کے خد و خال بیان کیجئے۔
۲۔ مغلیہ عہد کی اقتصادی حالت کی قلمی تصویر کھینچئے۔
۳۔ مغلیہ دور میں پیداوار کی فراوانی اور اشیاء کی ارزانی پر روشنی ڈالئے۔
۴۔ مغلیہ عہد کے چند ترقی پذیر شہروں کا حال لکھئے۔

Marfat.com

تیرھواں باب

مغلیہ نظامِ حکومت

"وہ انتظامی ڈھانچہ جو مغلیہ نظامِ حکومت کے نام سے مشہور ہے اور جس سے اٹھارہویں صدی عیسوی میں انگریزوں نے بھی استفادہ کیا، اسلامی سلطنت کے صدہا سالوں کے تجربات کا ماحصل ہے۔" [1] (ایس۔ ایم۔ اکرام)

سلطنتِ مغلیہ کا نظامِ حکومت مشرقِ وسطیٰ کی قدیم اسلامی تہذیبی روایات اور برصغیر پاک و ہند کے قدیم طرزِ حکومت کے ایک خوبصورت امتزاج کا آئینہ دار تھا۔ اس نظام کے خدوخال میں اگرچہ زیادہ تر اسلامی ممالک کی ترقی یافتہ تہذیب کا عنصر غالب تھا۔ تاہم اس میں برصغیر کی قدیم روایات اور ثقافتی اقدار کا اثر و نفوذ بھی موجود تھا۔

اکبر اعظم سے پہلے مغلیہ نظام حکومت کوئی خصوصی اور مربوط شکل نہ رکھتا تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے پیش رو بابر اور ہمایوں اس نئی قائم شدہ حکومت کو درپیش گوناگوں سیاسی مسائل سلجھانے میں ہی مصروف رہے اور سلطنت مغلیہ کے نظامِ حکومت کو صحیح معنوں میں منظم و مربوط خطوط پر استوار نہ کر سکے۔ اکبر اعظم نے اس کی تنظیمِ نو کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اکبر کے تشکیل کردہ نظام حکومت کے ڈھانچہ میں ایرانی اور عربی اثرات زیادہ غالب تھے۔ اسی بنا پر اسے ہندوستانی طرز پر منظم کردہ عربی، ایرانی طرز کی حکومت بھی کہتے ہیں اس نظام میں جملہ سیاسی اقتدار کا مرکز بادشاہ تھا۔ مغلیہ حکومت اور اس کا نظام عدل گستری روشن خیالی، رواداری اور عوام کی فلاح و بہبود کے اصولوں پر مبنی تھا جس میں رعایا کے ہر فرد کو شخصی و مذہبی آزادی حاصل تھی رعایا کے ہر فرد کے ساتھ بلا تمیز مذہب و ملت اور رنگ و نسل مساوی سلوک روا رکھا جاتا تھا اور سرکاری ملازمتوں کے دروازے بلحاظ نسل و قومیت محض اہلیت، قابلیت اور استحقاق کے اصولوں کے تحت سب پر یکساں طور پر کھلے ہوتے تھے۔ مغلیہ حکومت کا نظامِ رواداری صلح کل پالیسی اور وسیع النظری پر مبنی تھا۔ اس اعتبار سے مغلیہ حکومت کو ایک فلاحی حکومت کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] ہسٹری آف مسلم سوسائٹی ان انڈیا اینڈ پاکستان"، صفحہ ۴۲۲

Marfat.com

مغل بادشاہ

سلاطین دہلی (۱۲۰۶ء تا ۱۵۲۶ء) سلطان کہلاتے تھے۔ لیکن مغل حکومت کے سربراہ بادشاہ کہلائے۔ بادشاہ کا لقب مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر نے اختیار کیا تھا اور جس کو مغلیہ سلطنت کے زوال پذیر ہونے تک تمام مغل سربراہوں نے اختیار کئے رکھا۔ مغل بادشاہ خود کو سلاطین دہلی کی مانند خلیفۃ الاسلام (امیر المومنین) کا نمائندہ تسلیم نہیں کرتے تھے بہر حال ماسوائے اکبر کے تمام مغل شہنشاہ قانونِ شریعت کی بالادستی کے قائل تھے۔ اکبر کے نزدیک بادشاہ تمام مخلوقات سے افضل اور ظل اللہ (خدا کا سایہ) ہوتا ہے۔

اسی بنا پر اکبر اپنے آپ کو مسلم اور غیر مسلم رعایا کا دنیوی اور روحانی سربراہ سمجھتا تھا۔ اکبر کے بعد اس کے بادشاہت کے نظریے کو جہانگیر نے بھی معمولی سی ترمیم و اصلاح کے بعد جوں کا توں قائم رکھا لیکن شاہجہان اور اورنگ زیب نے شریعت کی بالادستی کو دوبارہ قائم کر دیا۔

مغل بادشاہ اپنے فکر و عمل میں قطعی طور پر مطلق العنان اور خود مختار تھے۔ خطبہ میں ان کا نام شامل اور سکوں پر ان کا نام کندہ ہوتا تھا۔ حکومت کے تمام شعبہ جات مثلاً انتظامیہ۔ عدلیہ اور فوج براہِ راست ان کے تحت تھے۔ وہ تمام طاقت و قوت کا سرچشمہ تھے ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ مختارِ مطلق ہونے کے باوجود مغل بادشاہ شریعت اسلام کے پابند، عدل و انصاف کے پیکر اور رواداری کے حامی تھے۔ مزید برآں فیض رساں مشفق اور رعیت پرور تھے۔ مغل بادشاہ کو اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ہونے کی حیثیت سے بعض اختیاری حقوق حاصل تھے۔ جن میں مرصع تخت پر بیٹھ کر دربار منعقد کرنا، جھروکہ درشن، تسلیم و کورنش اور سفر کے دوران چتر شاہی، نقارہ، سرخ خیمہ کا استعمال اور جمعہ کے روز پالکی میں بیٹھ کر مسجد میں جانا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہر صبح جھروکہ میں بیٹھ کر درشن دینے کی رسم اکبر نے جاری کی تھی جو اکبر کے جانشینوں کے عہد میں ایک روایت کی صورت اختیار کر گئی۔ مگر عالمگیر نے اس رسم کو قطعی طور پر ختم کر دیا کیونکہ اس میں انسانی پرستش کا رنگ جھلکتا تھا۔

مغل بادشاہ لامحدود اختیارات کے حامل تھے۔ سربراہ مملکت ہونے کے علاوہ وہ فوج کے سالارِ اعظم اور عدل و انصاف کا سرچشمہ تھے۔ امورِ مملکت میں مختارِ کل کی حیثیت رکھتے تھے وزراء سے مشورے ضرور لیتے تھے لیکن ان کے پابند نہ تھے۔ سرکاری خزانہ شاہی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ مغل بادشاہ احکام عموماً فرامین کی شکل میں جاری کرتے تھے۔ فرامین پر ثبت ہونے والی پانچ اقسام کی مہریں تھیں اہم مہر "آزک" کہلاتی تھی جو عموماً ملکہ کے قبضہ میں رہتی تھی اور کم اہمیت کے فرامین پر جو مہر ثبت کی جاتی تھی وہ "پنجۂ مبارک[1]" کہلاتی تھی۔

---

[1] بادشاہ کے ہاتھ کا نشان

Marfat.com

مغل بادشاہ شان وشوکت کے دلدادہ اور عیش وعشرت کی محفلوں کے رسیا تھے وہ باقاعدہ تاج پہن کر اور قیمتی جڑاؤ تخت پر بیٹھ کر دربار منعقد کرتے تھے۔ ہندو راجاؤں کی مانند زیور اور ریشمی لباس پہنتے تھے اور کھانے میں سونے و چاندی کے برتنوں کا استعمال کرتے تھے لیکن اورنگزیب نے تخت نشین ہونے کے بعد اس تمام شان وشوکت کو یکسر ختم کر ڈالا اور ریشمی لباس اور سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع قرار دیا۔

اکبر نے مملکت کا نظم ونسق چلانے کے لئے مرکز میں متعدد محکمہ جات قائم کئے جن پر مختلف عہدیدار مقرر تھے۔

۱۔ وکیلِ سلطنت

وکیل سلطنت بادشاہ کا نائب ہوتا تھا۔ بیرم خاں اس عہدے پر فائز رہا۔ وکیلِ سلطنت کی حیثیت وزیر اعظم کی سی تھی اور وہ لا محدود اختیارات کا حامل تھا۔ لیکن بیرم خاں کے زوال کے بعد اکبر نے وکیل سلطنت کا عہدہ ختم کر دیا۔ اور اس کے اختیارات دیوان اور میر بخشی کے سپرد کر دیئے۔ اس اقدام سے وکیل سلطنت کی انتظامی حیثیت ختم ہو گئی۔ البتہ عہدہ اعزازی حیثیت میں قائم رہا۔

۲۔ دیوان

دیوان محکمہ مال کا سربراہ ہوتا تھا۔ اسے وزیر اعظم، وزیر خزانہ، وکیل سلطنت یا وکیل مطلق بھی کہتے تھے۔ حکومت کی آمدن اور خرچ کا حساب رکھنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ کوئی ادائیگی خواہ کسی شعبہ سے متعلق ہو اس کے دستخطوں کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ سلطنت کے تمام محکمے اس کے زیر اثر تھے اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی قدم بھی نہ اٹھا سکتے تھے۔ وہ بالعموم ایک سول افسر ہوا کرتا تھا اور اسے شاذ ہی فوج کی کمان پر مامور کیا جاتا تھا۔ اس کا اہم فرض مملکت کی فلاح وبہبود کے جملہ امور میں بادشاہ کو مشورہ دینا ہوتا تھا۔" وہ بادشاہ اور جملہ افسران کے مابین ایک رابطہ افسر کی حیثیت رکھتا تھا۔"

محکمہ مال کے متعلق تمام جملہ امور کی انجام دہی کے علاوہ وہ سالاروں اور صوبیداروں کے تبادلے کے احکام بھی جاری کر سکتا تھا۔ مرکز میں بادشاہ کی عدم موجودگی اور بیماری کے دوران دیوان ہی شاہی اختیارات کی نمائندگی کرتا تھا۔

۳۔ میر بخشی

میر بخشی فوجی امور کا وزیر تھا۔ وہ فوج کی بھرتی، اس کی تنظیم اور اس کے لئے ساز وسامان کی فراہمی کا ذمہ دار تھا۔ منصبداروں کا مکمل ریکارڈ، ان تنخواہیں، الاؤنس ادا کرنا، منصبداری فوج کا معائنہ اور منصبداروں کے حساب کتاب اور ان کے گھوڑوں کی جانچ پڑتال کرنا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ فوج کے مختلف دستوں کے کمانڈروں کا تقرر بھی اسی کے ذمے تھا۔ صوبائی بخشی اور وقائع نویس اسی کے تحت

Marfat.com

کام کرتے تھے۔ چونکہ حکومت کے جملہ افسران منصبدار تھے بدیں وجہ میر بخشی کا عہدہ کافی اثر و رسوخ کا حامل تھا۔ تمام عہدیداروں کی تنخواہوں کے بل میر بخشی ہی پاس کرتا تھا۔ انگریز مورخین میر بخشی کو "ملٹری پے ماسٹر" کہتے ہیں۔

۴۔ خانِ سامان

یہ میر سامانِ رسد اور صنعت و حرفت کا وزیر تھا۔ شاہی محل کے تمام مصارف اور شہنشاہی عملہ کی ضروری اشیا مہیا کرنے کے علاوہ سرکاری کارخانوں، گوداموں اور باغات کا انتظام بھی اسی کے سپرد تھا۔ خانِ سامان سفر و حضر میں ہمیشہ بادشاہ کے ہمراہ ہوتا تھا۔ بادشاہ سے قرب کی بنا پر میر سامانِ رسد کا عہدہ کافی اہمیت کا حامل تھا اور اس عہدے پر خاص معتمد منصبداروں کو مقرر کیا جاتا تھا۔

۵۔ صدر الصدور

مذہبی اور مرکزی محکمۂ خیرات، وظائف اور اوقاف کا نگران وزیر صدر الصدور کہلاتا تھا۔ اس عہدے پر ہمیشہ علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں ممتاز جید عالم کو متعین کیا جاتا تھا۔ صدر الصدور امورِ شریعت کا محافظ اور علماء کا ترجمان ہوتا تھا۔ وہ حکومت کی طرف سے یتیموں، بیواؤں اور حاجتمندوں اور مسکینوں کو خیرات و صدقات، طلباء کو وظائف اور علماء کو جاگیریں عطا کرنے پر مامور تھا۔ مساجد، مدارس اور مندروں کو ہر قسم کی سرکاری امداد اسی کی سفارش پر دی جاتی تھی۔ صوبائی صدر اس کے ماتحت کام کرتا تھا۔ صدر الصدور کو عوام میں بڑی احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

۶۔ قاضی القضاۃ

عدلیہ کا اعلیٰ ترین افسر یعنی محکمۂ انصاف کا سربراہ قاضی القضاۃ کہلاتا تھا۔ سلطنت کے عظیم اور جید عالم کو اس عہدے پر متعین کیا جاتا تھا۔ مملکت میں تمام قاضیوں کا تقرر اسی کے حکم سے ہوتا تھا۔ قاضی القضاۃ قانون فوجداری، دیوانی اور قانون فقہ کا ماہر ہوتا تھا۔ تمام ملک کے قاضیوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں اسی کی عدالت میں پیش ہوتی تھیں اور اس کے تمام فیصلے قانونِ شرع اور بادشاہ کے نافذ کردہ قوانین کے تابع ہوتے تھے۔ مقدمات کے فیصلے جلد سے جلد کرنے کی غرض سے قاضی القضاۃ کی امداد کیلئے مزید دو افسر ایک مفتی اور دوسرا میر عدل مقرر تھے۔

سرکاری افسروں کے خلاف شکایات کی سماعت کے لئے خاص عدالت قائم تھی، جسے عدالت مظالم کہتے تھے جس کی صدارت ہر بدھ (چہار شنبہ) کے روز بادشاہ کرتا تھا۔

۷۔ محتسب

یہ وزیر انتظامیہ کے فرائض سرانجام دیتا تھا وہ عوام کو آداب و شائستگی کا پابند رکھنے، اشیاء کی قیمتیں مقرر کرنے اور بازار میں زیرِ استعمال پیمانوں اور اوزان کی جانچ پڑتال کرنے پر مامور تھا۔ وہ مسلمانوں میں شعائرِ اسلامی کے احترام، مذہبی

Marfat.com

فرائض کی پابندی، احترام رمضان ایسی مقدس اسلامی اقدار و روایات کو فروغ دیتا تھا۔ نیز قمار بازی اور شراب نوشی کے اڈوں پہ چھاپہ مار کر ملزموں کو سزا دلوا سکتا تھا اور نماز سے لاپرواہی برتنے پر سنگسار کروا سکتا تھا۔

۸۔ دیوانِ بیوتات

میر سامان کے ماتحت محکموں کے مالی معاملات کا ذمہ دار اور مرنے والوں کے ریکارڈ کی دولت اور جائداد کا نگران وزیر دیوانِ بیوتات کہلاتا تھا۔ دیوان بیوتات جہاں متوفی کے صحیح وارث کا پتہ چلاتا تھا وہاں ساتھ ہی اس بات کی بھی تحقیق کرتا تھا کہ حکومت کی کتنی رقم متوفی کے ذمے واجب الادا تھی۔ سرکاری واجبات وصول کرنے کے بعد جائداد اصل وارثوں کے سپرد کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ بعض اوقات دیوانِ بیوتات مختلف اشیاء کی قیمتیں بھی مقرر کرتا تھا اور سرکاری کارخانوں کی آمدن کے گوشوارے بادشاہ کے حضور پیش کرنا بھی اس کا اہم فرض تھا۔

۹۔ دیوانِ برید

ڈاک اور خفیہ پولیس کے شعبے کا افسر اعلیٰ دیوان برید یا داروغہ ڈاک چوکی کہلاتا تھا۔ ساری سلطنت کے جملہ خبر رساں اور جاسوس اس کے ماتحت تھے۔ ڈاک چوکیوں کا انتظام و انصرام اس کے فرائض میں داخل تھا۔ دیوان برید ہر ہفتہ تمام اہم خبروں کا خلاصہ بادشاہ کے حضور پیش کرتا تھا۔

۱۰۔ میرِ آتش

میر آتش توپ خانہ کا نگران وزیر تھا۔ شروع میں یہ محکمہ میر بخشی کے سپرد تھا۔ لیکن توپ خانہ کی روز افزوں اہمیت کے پیش نظر اسے ایک الگ شعبے کی حیثیت دیدی گئی۔ میر آتش کے فرائض میں توپخانہ کی نگہداشت، اسے مزید ترقی دینا اور اس کے لئے گولہ بارود فراہم کرنا اور قلعہ کی حفاظت کے انتظامات کرنا شامل تھا۔ مغل بادشاہ توپ خانہ میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے اس لئے میر آتش کو بادشاہ تک رسائی تھی۔

مغلوں کا صوبائی نظامِ سلطنت

مغلوں نے انتظام سلطنت کی سہولت کے پیش نظر تمام سلطنت کو مختلف صوبوں میں اور صوبوں کو سرکاروں اور پرگنوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ہر صوبے کا سربراہ گورنر یا صوبیدار کہلاتا تھا جسے بادشاہ خود مقرر کرتا تھا۔ سرحدی علاقوں میں فوجی گورنر بھیجے جاتے تھے۔ گورنروں کے تبادلے بھی ہوتے تھے اکبر کے زمانے میں مغلیہ سلطنت پندرہ صوبوں میں منقسم تھی جبکہ اورنگزیب کے عہد میں ان کی تعداد اکیس تھی۔ صوبائی نظام ایک طرح سے مرکزی نظام ہی

Marfat.com

کی نقل تھا۔ مرکز کے تمام شعبوں کی شاخیں صوبوں میں قائم تھیں۔ البتہ چند محکمے مختلف تھے صوبائی انتظامی ڈھانچے کی یہ ایک خصوصیت تھی کہ صوبے کے ہر افسر اعلیٰ کے کام کی نگرانی متعلقہ مرکزی محکمے کا افسر اعلیٰ کرتا تھا۔ صوبے کے افسران مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ صوبیدار

صوبے کا سربراہ صوبیدار کہلاتا تھا۔ اسے انتظامیہ، عدلیہ اور فوج کے اختیارات حاصل تھے۔ وہ صوبے میں شاہی نمائندے کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ باقاعدہ دربار منعقد کرتا اور شان و شوکت سے رہتا تھا۔ وہ مرکزی احکام کے مطابق صوبے میں انتظامی مشینری چلاتا تھا۔ صوبیدار اپنے صوبے میں انتظامیہ کے افسروں کا تقرر بھی کرتا تھا۔ لیکن صوبے میں بعض افسروں کا تقرر بادشاہ کی طرف سے ہوتا تھا جن کی معزولی کا اختیار صوبیدار کو نہ تھا۔ صوبائی محکمہ خفیہ پولیس براہِ راست اس کے ماتحت تھا۔ صوبیدار اپنے صوبے کی فوج کا سپہ سالار بھی ہوتا تھا۔ باغیوں کی گوشمالی کے سلسلے میں وہ صوبائی فوج کی کمان خود کرتا تھا۔ وہ صوبائی قاضیوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سننے کا مجاز تھا۔ لیکن بادشاہ کی منظوری کے بغیر سزائے موت دینے کا مجاز نہ تھا۔ نیز اسے جنگ یا صلح کرنے کا بھی اختیار نہ تھا اور نہ ہی بادشاہ کی مانند جھروکہ درشن دینے کا مجاز تھا۔ صوبیدار بھی منصبدار ہوتا تھا اور صوبے میں اپنے منصب کے مطابق فوج رکھتا تھا۔

۲۔ دیوان

صوبیدار کے بعد صوبے کا دوسرا اہم افسر دیوان تھا۔ اس کی تقرری مرکز کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس کا رابطہ براہِ راست مرکز سے قائم ہوتا تھا اور وہ مرکزی احکام کے مطابق عمل پیرا ہوتا تھا۔ دیوان کی پوزیشن صوبیدار کے ہر کام کی نہ صرف نگرانی کرتا تھا بلکہ بادشاہ کو باخبر بھی رکھتا تھا۔ مالیہ کی وصولی۔ مالیہ کے متعلق مقدمات کا فیصلہ کرنا۔ مالیہ وصول کرنے والے افسران کا تقرر کرنا اور ان کے کام کی نگرانی۔ نیز صوبے میں زراعت کی ترقی کا اہتمام کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ ہر سرکاری ادائیگی کے لئے اس کے دستخطوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ صوبیدار اور دیوان کے مابین اختلافی مسائل بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ صوبیدار کے اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے اور آمادۂ بغاوت ہونے کی صورت میں صوبائی دیوان کا وجود مرکز کی جانب سے ایک نہایت ہی موثر اقدام تھا۔

۳۔ صدر

صوبائی محکمۂ اوقاف و خیرات کا افسر اعلیٰ صدر کہلاتا تھا جسے صدر الصدور مقرر کرتا تھا۔ کسی جید عالم کو مرکزی حکومت کے ایماء پر صدر مقرر کر دیا جاتا تھا۔ وہ اوقاف اور وظائف کی دیکھ بھال کرتا تھا لیکن خود نہ زمین وقف کر سکتا تھا اور نہ ہی وظیفہ مقرر کرنے کا مجاز تھا۔ البتہ مذہبی مسائل کا فیصلہ کرنیکا اختیار رکھتا تھا۔

Marfat.com

۴۔ بخشی وہ صوبائی فوج کی تنظیم کا ذمہ دار تھا اور اپنے تمام فرائض صوبیدار کی نگرانی میں سرانجام دیتا تھا لیکن براہِ راست مرکز کے تابع تھا اور تمام حالات سے بادشاہ کو باخبر رکھتا تھا۔

۵۔ کوتوال شہر کی پولیس کا افسر کوتوال کہلاتا تھا۔ کوتوال ہر شہر میں مقرر کیا جاتا تھا۔ اسے بعض اوقات عدالتی فرائض بھی سرانجام دینا پڑتے تھے۔ شہر میں امن و امان برقرار رکھنا، مکانات کی فہرست تیار کرنا، رسم ستی کا انسداد، بازار کے پیمانوں اور ان کی پڑتال اور چوری و بدکاری کا سدِباب کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا وہ اپنے جاسوسوں کے ذریعے نہ صرف چوروں اور ٹھگوں کا سدباب کرتا بلکہ شراب نوشی کا بھی استیصال کرتا تھا جیل خانہ کا انتظام اور شہر کے دروازے بند کرنا اور کھولنا بھی اس کا فرض تھا۔ کوتوال قاضی کے ماتحت ہوتا تھا۔ بدیں وجہ قاضی کے احکام اور فیصلوں کو نافذ کرانا بھی اسکے سپرد تھا۔

۶۔ وقائع نویس صوبے میں سب سے اہم سرکاری شخص وقائع نویس تھا جو صوبے کے جملہ حالات سے بادشاہ کو باخبر رکھتا تھا۔ وہ نہ صرف صوبیدار کے دربار کی کارروائی ریکارڈ کرتا تھا بلکہ تمام تقریبات میں شمولیت کرتا اور ہر کارروائی سے بادشاہ کو آگاہ رکھتا تھا۔ وقائع نویس چونکہ صوبیدار کے تمام کاروبار کی نگرانی کرتا تھا اس لیے کافی اثر و رسوخ کا مالک ہوتا تھا۔ بعض مورخین وقائع نویس کو بادشاہ کی آنکھ اور کان شمار کرتے تھے۔ کیونکہ اسی کی کارروائی اور مہیا کردہ اطلاعات پر بادشاہ مناسب احکام و فرامین جاری کرتا تھا۔

۷۔ خزانچی یا قوطہ دار یہ افسر خزانہ کا نگران ہوتا تھا۔ مالیہ وصول کرنا، اس کا حساب کتاب رکھنا اور کاشتکار کو وصولی کی رسید جاری کرنا اس کا اہم فرض تھا۔ آمد و خرچ کے رجسٹر کا اہتمام بھی خزانچی ہی کرتا تھا۔ لیکن دیوان کے دستخطوں اور منظوری کے بغیر کسی قسم کی ادائیگی کا مجاز نہ تھا۔

۸۔ فوجدار سرکار کا اعلیٰ ترین افسر فوجدار کہلاتا تھا۔ یہ ایک فوجی افسر ہوتا تھا جس کا تقرر براہ راست بادشاہ ہی کرتا تھا۔ فوجدار سرکار میں متعین فوج کا کمانڈر بھی ہوتا تھا۔ وہ اپنے علاقے میں امن و امان، مقامی باغیوں کی گوشمالی، شورش و فساد اور چوری و رہزنی اور اسی نوعیت کے دیگر جرائم کے انسداد کا ذمہ دار تھا۔ فوجدار عامل کی نگرانی میں نہ صرف سرکار (ضلع) کا انتظام کرتا بلکہ عامل کیلئے مالیہ کی وصولی میں فوجی امداد کا بندوبست بھی کرتا تھا۔

۹۔ عامل وہ پرگنہ (تحصیل) کا افسر اعلیٰ تھا۔ مالیہ کی وصولی کے علاوہ انتظامی امور کا نگران

Marfat.com

بھی تھا اس کے دیگر فرائض منصبی میں قیام امن، چوری ڈکیتی کا انسداد، زراعت کی ترقی، غیر مزروعہ زمینوں کی آبادکاری، زمین کی پیمائش اور کارکن، مقدم اور پٹواری کے جھگڑوں کی پڑتال کرنا شامل تھا۔ وہ اپنے علاقے میں دورے کر کے مارکیٹ، جاگیرداروں اور عوام کی حالت کے متعلق ماہوار تفصیلی رپورٹ تیار کر کے مرکز کو بھیجتا تھا وہ اپنی رپورٹ میں اشیا کے نرخ اور فصلوں کی حالت بھی تحریر کرتا تھا۔ اس عہدے پر معتمول اور باحیثیت شخص کو ہی تعینات کیا جاتا تھا تاکہ رشوت خوری کا امکان نہ رہے۔

۱۰۔ تیقچی تیقچی پرگنہ میں عامل کا ہم مرتبہ افسر تھا۔ اس کے اختیارات و فرائض میں مالیہ کے متعلق حکومت کو سالانہ گوشوارہ مہیا کرنا، فارسی زبان میں اراضی کا ریکارڈ رکھنا اور قانونگو، مقدم اور پٹواریوں کے کام کی نگرانی شامل تھی۔ تیقچی کے عہدے پر عموماً مقامی رسم و رواج سے واقف ماہر حساب اور ادیب شخص کو تعینات کیا جاتا تھا۔

مغلیہ نظامِ حکومت کی خصوصیات

۱۔ مغلوں کا انتظامی ڈھانچہ نہایت عمدہ اور روشن خیالی پر مبنی تھا۔ اس سے سلطنت کو استحکام حاصل ہوا اور عوامی بہبود کے عوامل کو تقویت پہنچی۔ نیز اس سے انتظامیہ میں مرکزیت پیدا ہو گئی۔

۲۔ مغلیہ نظام حکومت ایک توازن کے ماتحت قائم تھا۔ بادشاہ تمام قوت کا منبع تھا حکومت کے جملہ افسرانِ اعلیٰ مذہبی لحاظ سے غیر معمولی اختیارات حاصل ہونے کے باوجود اس قدر طاقت کے حامل نہ تھے کہ حکومت کے لئے خطرہ ثابت ہوتے۔ سلطنت کے جملہ افسران ایک دوسرے کے اختیارات کی روک تھام کا ذریعہ تھے اور تمام ایک دوسرے کی مدد کے بغیر بے بس اور مجبور تھے۔ مغل بادشاہ کافی طاقت کے مظہر تھے۔

۳۔ امرار کے لئے ناجائز فائدہ اٹھانے کے مواقع ختم ہو گئے اور گورنروں کے لئے صوبوں میں خود مختار حکومت قائم کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

۴۔ چونکہ مغلیہ نظام حکومت عدل و انصاف، عوام کی فلاح و بہبود اور رواداری کے اصولوں پر مبنی تھا اس لئے افسروں کو سخت تاکید تھی کہ لوگوں کی بہبود، زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کا خاص خیال رکھیں۔

۵۔ اس کے قیام سے نہ صرف اقتصادی حالت مستحکم اور معاشرہ ترقی پذیر ہوا بلکہ سلطنتِ

Marfat.com

مغلیہ کو پائیداری اور استحکام نصیب ہوا۔

امتحانی سوالات

۱۔ مغلیہ نظامِ سلطنت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالئے۔ نیز اس کی نمایاں خصوصیات بیان کیجئے۔

۲۔ سلطنت مغلیہ کے مرکزی انتظامی ڈھانچہ کے خدوخال قلمبند کیجئے۔

۳۔ مغلیہ سلطنت کے صوبائی انتظامی ڈھانچہ کا جائزہ لیجئے۔

۴۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھئے :۔

(ا) مغل بادشاہ۔ (ب) دیوان۔

(ج) میر بخشی۔ (د) صدر الصدور۔

(ر) وقائع نویس۔

Marfat.com

Marfat.com

طلبائے انٹرمیڈیٹ کے لئے بلند پایہ کتب!

تمدن و تاریخ اسلام

پروفیسر خالد بزمی ایم اے
پروفیسر منظور حسین ایم اے

تاریخ پاک و ہند

پروفیسر محمد عبداللہ ملک ایم اے

تاریخ پاکستان

پروفیسر محمد عبداللہ ملک ایم اے

قریشی پریکٹیکل کیمسٹری

(نوٹ بک)

پروفیسر ایم ایچ حیدر و پروفیسر غلام محمد

کالج اردو گرامر اینڈ کمپوزیشن

پروفیسر عبدالخالق عزمی و پروفیسر جمیل احمد انجم

قریشی ماڈل ٹیسٹ پیپرز (مضامین آرٹس اور سائنس)

کتب و سنت

پروفیسر خالد بزمی ایم اے
پروفیسر صلاح الدین قاضی ایم اے

تاریخ اسلام

پروفیسر محمد عبداللہ ملک ایم اے

رہبر شہریت

(حصہ اول - دہم)

پروفیسر صابر حسین و پروفیسر محمد جہانگیر عالم

قریشی پریکٹیکل فزکس

(نوٹ بک)

پروفیسر شبیر حسین چوہدری (ایم ایس سی)

قریشی سالٹ سسٹم

پروفیسر ظفر حیدر و پروفیسر غلام محمد

قریشی برادرز پبلشرز ○ چوک اردو بازار لاہور

Marfat.com

طلبائے انٹرمیڈیٹ کے لئے بلند پایہ کتب!

تمدن و تاریخ اسلام

پروفیسر خالد بزمی ایم اے
پروفیسر منظور حسین ایم اے

تاریخ پاک و ہند

پروفیسر محمد عبداللہ ملک ایم اے

تاریخ پاکستان

پروفیسر محمد عبداللہ ملک ایم اے

قریشی پریکٹیکل کیمسٹری

(نوٹ بک)

پروفیسر ایم ایچ حیدر و پروفیسر غلام محمد

کالج اردو گرامر اینڈ کمپوزیشن

پروفیسر عبدالخالق عزمی و پروفیسر جمیل احمد انجم

قریشی ماڈل ٹیسٹ پیپرز (مضامین آرٹس اور سائنس)

کتب و سنت

پروفیسر خالد بزمی ایم اے
پروفیسر صلاح الدین قاضی ایم اے

تاریخ اسلام

پروفیسر محمد عبداللہ ملک ایم اے

رہبر شہریت

(حصہ اول - دہم)

پروفیسر صابر حسین و پروفیسر محمد جہانگیر عالم

قریشی پریکٹیکل فزکس

(نوٹ بک)

پروفیسر شبیر حسین چوہدری (ایم ایس سی)

قریشی سالٹ سسٹم

پروفیسر ظفر حیدر و پروفیسر غلام محمد

قریشی برادرز پبلشرز ○ چوک اردو بازار لاہور

Marfat.com